عشق
کا
شین
PDFBOOKSFREE.PK
حصہ اول
علیم الحق حقی

پیش لفظ

ھذا من فضل ربی
الحمد للہ

بے شک، یہ میرے رب کا فضل ہے کہ ''عشق کا شین'' کا پہلا حصہ کتابی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اچھا لکھا، وہ اللہ کی توفیق سے ہے۔ اس کی عطا ہے۔ میں پوری سچائی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ ایک عام انسان اور نفس کا غلام ہونے کے ناتے میں کبھی اللہ کی عطا کی ہوئی توفیق سے مکمل طور پر استفادہ نہیں کر پاتا۔ اس کے نتیجے میں کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں اور کام میں کمزوریاں اور خامیاں در آتی ہیں۔ آپ سب...... میرے قارئین ان خامیوں سے صرفِ نظر فرماتے ہوئے میرے کام کو والہانہ سراہتے ہیں اور مجھے اپنی بے پایاں محبتوں سے اور محبت بھری دعاؤں سے نوازتے ہیں۔ یہ آپ کا احسان ہے۔ میں بھی آپ سب اَن دیکھے، اَن جانے لوگوں سے ایسی ہی محبت کرتا ہوں۔ اس پر میرا اللہ گواہ ہے۔ جو کچھ میں لکھتا ہوں، وہ آپ سب کے لیے میری اُسی محبت کا سچا اظہار ہے۔

اس کہانی کو میں اب تک اپنے چار برس دے چکا ہوں اور ابھی یہ مکمل نہیں ہوئی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ آپ بھی اس کا انتظار کم از کم مہینوں سے کر رہے ہیں۔

میں انتظار کی لذت سے بھی واقف ہوں اور اس کے کرب سے بھی آگاہ ہوں۔ دل تو چاہتا تھا کہ کہانی مکمل ہونے کے بعد ہی شائع کراؤں لیکن پھر سوچا کہ آپ کو آپ کے انتظار کا کچھ صلہ تو ملے اور انتظار اتنا طویل بھی نہ ہو جائے کہ میرے لیے آپ کی محبت آزمائش میں پڑ جائے۔ اس لیے کہانی کا یہ پہلا حصہ جناب آفتاب ھاشمی کی محنت اور محبت سے مزین و آراستہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ سے امید رکھتے ہوئے اور مدد چاہتے ہوئے، اس کے بھروسے پر آپ سے وعدہ کر رہا ہوں کہ آخری حصے کے لیے آپ کو بہت طویل انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ یہ بہت طویل کہانی ہے۔ ایسی کہانیاں لفظ لفظ ہی لکھی جاتی ہیں اور لفظ لفظ ہی پڑھی جاتی ہیں۔ شاید اسی لیے مسبب الاسباب نے اسے روزنامہ ''امت'' میں اشاعت نصیب فرمائی۔ روزنامہ امت شاید سندھ سے باہر کم ہی جاتا ہے۔ بہرحال امت کی ویب سائٹ پر آپ اس کہانی کو روز پڑھ سکتے ہیں......

www.ummat.com.pk.

میرا یہ منصب نہیں کہ میں کہانی کے بارے میں کچھ کہوں۔ کوئی بھی لکھنے والا نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کیا لکھا ہے اور کیسا لکھا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنی یہ تحریر مجھے بہت پسند ہے۔ کہانی کو سندِ اعتبار تو آپ لوگ ہی دیتے ہیں اور کہانی کو قبولِ عام عطا کرنے والا تو صرف اور صرف اللہ ہے۔ میں تو بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنا کام محنت، جاں فشانی اور سچائی سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ صلہ اور قبولیت اب اللہ کے اور آپ کے ہاتھ ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اب تک میں اپنی توقع سے بہت بڑھ کر نوازا گیا ہوں۔

آپ سب جانتے ہیں کہ بنیادی طور پر میں شاعر ہوں۔ شامؔ تخلص کرتا ہوں۔ کہانی کا میڈیم تو میں نے بہت بعد میں اپنایا۔ میری کچھ نظمیں اور اشعار میری کہانیوں میں آپ نے پڑھے۔ شعر کو میں کیونکہ اظہارِ ذات سمجھتا ہوں اور وہ مجھے بہت ذاتی لگتا ہے۔ اس لیے میں نے کبھی مجموعہ کلام کی اشاعت میں دلچسپی نہیں لی۔ لیکن اب بہت سے چاہنے والوں کے اصرار پر ارادہ کرلیا ہے کہ اللہ توفیق اور وسائل عطا فرمائے تو پہلا مجموعہ کلام بھی آپ تک پہنچا دیا جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ آپ کی آراء کی میرے لیے کتنی اہمیت ہے۔ آپ کی تنقید کی مدد سے میں اپنی خامیاں دور کرتا ہوں۔ آپ کی حوصلہ افزائی مجھے اور اچھا لکھنے کی ترغیب دیتی ہے اور آپ غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہیں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ آپ مجھے کتنی توجہ اور باریک بینی سے پڑھتے ہیں۔ آپ کی سہولت کے لیے اپنا ای میل ایڈریس بھی دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ آپ ایچ اینڈ ایچ پبلشرز کی معرفت بھی مجھے خط لکھ سکتے ہیں۔ میں عشق کا شین پر آپ کی آرا اور تبصروں کا بے چینی سے منتظر ہوں۔

مجھے درازیِ عمرِ کارآمد بالخیر کی دعاؤں سے نوازتے رہیے۔ تاکہ میں آپ کے لیے اور اپنے لیے لکھتا رہوں۔

والسلام
آپ کا اپنا
علیم الحق حقی

aleem-haqqi@hotmail.com
ah-haqqi@yahoo.com

کتابِ اوّل

مجذوب یوں تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا، جیسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہو۔ پھر وہ ایک دم سے بیٹھ گیا۔ بیٹھ کیا گیا، ساکت ہوگیا۔ اس کے جسم میں تو کجا، کپڑوں میں بھی جنبش نہیں تھی۔ حالانکہ خاصی تیز ہوا چل رہی تھی۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ تیزی سے آگے بڑھا۔ نجانے کیوں وہ پریشان ہوگیا تھا۔ مجذوب اس سے کوئی بیس قدم دور تھا۔ ٹھاکر اس کے پاس پہنچا اور اس کے آگے کی طرف پھیلے ہوئے ہاتھ کو چھو کر دیکھا۔ وہ حیران ہوگیا۔ مجذوب کا ہاتھ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

ٹھاکر سیدھا کھڑا ہوا اور اس نے مجذوب کو غور سے دیکھا۔ اس کا دل تاسف سے بھر گیا۔ مجذوب کے سینے میں سانسوں کا تموج بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا، یہ تو کوئی اچھا شگون نہیں۔ آج کے شبھ دن تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا اور ہونا تھا تو کم از کم یہاں نہ ہوتا۔

مجذوب کا چہرہ اور ہاتھ پیر دھول میں اَٹے تھے۔ اس کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور پاجامے سے اگر پیوند نکال دیے جاتے تو شاید کچھ بھی نہ بچتا۔ اس کے سر کے بالوں اور بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی میں نام کو بھی سیاہ بال نہیں تھا۔ لیکن اس کا چہرہ جوان تھا بلکہ اس پر بچوں کی سی معصومیت تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

ٹھاکر بڑا دبدبے والا آدمی تھا۔ لیکن اس چہرے کو دیکھ کر مرعوب ہوگیا۔ وہاں مرنے کے بعد بھی عجیب طرح کا جاہ و جلال تھا۔ چہرے کا ایک ایک نقش ڈانٹتا گرجتا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اسی لمحے ٹھاکر کے دماغ میں ایک شک نے سر ابھارا۔ آدمی یوں تو نہیں مرتا۔ اگر یہ مر گیا ہے تو اس کا جسم ڈھلکا کیوں نہیں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر مجذوب کی پیشانی کو چھوا۔ لیکن وہ بھی برف کی طرح سرد تھی۔ پھر اگلے ہی پل اس سرد پیشانی میں جیسے بجلی کا بے حد طاقت ور کرنٹ دوڑ گیا۔ ٹھاکر کو بہت شدید جھٹکا لگا۔ وہ بے ساختہ، بلا ارادہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایسی سوزش ہو رہی تھی، جو جلنے پر ہوتی ہے۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں جلنے کا نشان ہوگا۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

چند لمحوں میں سوزش ختم ہوگئی اور اس کی گھبراہٹ بھی بتدریج دور ہوگئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ مجذوب مرا نہیں ہے بلکہ زندہ ہے۔ مگر اب وہ مجذوب کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس
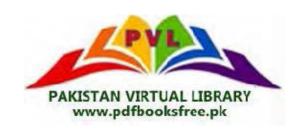
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

طرف سے توجہ ہٹی تو اسے احساس ہوا کہ اندھیرا چھا رہا ہے۔ ابھی اس طرف آتے ہوئے اس نے دیکھا تھا کہ سورج دیوتا اپنی کرنوں کی فوجیں سمیٹ کر دوسری طرف چڑھائی کرنے کے لیے چلا جا رہا ہے اور اب اس کے تاراج کیے ہوئے آکاش پر اس کے قدموں سے سرخ نشان بھی مٹے جا رہے تھے۔ اندھیرا کسی بہت بڑے باز کی طرح پَر پھیلائے دھرتی پر اترا چلا آ رہا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ٹھاکر کی نظر مجذوب کے چہرے کی طرف اٹھی اور اس نے سوچا کہ واپس لوٹ جائے۔ وہ جو سمجھ کر آیا تھا، یہ پُراسرار مجذوب وہ نہیں تھا مگر دوسری نظر میں اسے لگا کہ یہ وہی ہے یہ عجیب معما تھا۔

اب ٹھاکر کو خیال آیا کہ وہ اپنی حویلی سے نکل کر، کھیتوں سے گزر کر اس طرف آیا ہی کیوں تھا۔ اس کی کوئی تک ہی نہیں تھی۔ حویلی مہمانوں سے بھری تھی۔ باہر پکوان تیار ہو رہے تھے۔ گاؤں بھر میں میلے کا سماں تھا۔ اسے تو وہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ مگر دل میں ایک لہر سی اٹھی تھی اور وہ بہتا ہوا حویلی سے نکلا تھا اور کھیتوں کی طرف چل دیا تھا اور اس کے قدم وہاں بھی نہیں رُکے تھے۔ وہ بے اختیار بڑھ رہے تھے۔ اس وقت بھی اس نے سوچا تھا کہ آخر وہ کہاں جا رہا ہے۔ اسے واپس جانا چاہیے لیکن خواہش اور کوشش کے باوجود وہ خود کو روک نہیں سکا تھا۔ قدم تھے کہ بہے جا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔

اسے خوب یاد تھا۔ وہ سامنے غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک اسے وہ مجذوب دکھائی دیا۔ وہ اچانک ہی نمودار ہوا اس لیے کہ سامنے حدِ نظر تک کہیں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کوئی ایسی آڑ، ایسا موڑ نہیں تھا، جہاں سے وہ سامنے آتا۔ اس نے سوچا کہ اس کی کیفیت ہی کچھ عجیب تھی۔ ممکن ہے، اس نے مجذوب کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھا ہو۔ کوئی جادو تو نہیں ہو سکتا اور مجذوب زمین سے تو اُگنے سے رہا۔

مجذوب بہت دور تھا...... اتنا دور کہ نہ اسے اس کے چہرے کے نقوش نظر آ رہے تھے، نہ اس کا کرتہ پھٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے میں وہ اسے مجذوب کیوں سمجھ رہا ہے۔ اسے تو اس کو کوئی جوگی سمجھنا چاہیے تھا۔ اس معترضانہ سوال نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا۔ ہونا تو نہیں چاہیے تھا سچ یہ تھا کہ مجذوب 'وہ' سمجھتا تھا۔ بہت برس پہلے زمانہ تعلیم میں اس نے ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ تب اس کے ہم جماعت مسلمان دوست امان اللہ نے اسے بتایا تھا کہ ایسے لوگ صاحبِ حال ہوتے ہیں اور مجذوب کہلاتے ہیں۔ برسوں پرانا وہ حوالہ اس کے ذہن میں محفوظ نہ ہوتا تو شاید وہ اسے جوگی ہی سمجھتا۔ سو اس کے اندر موجود یقین نے اس سوال کو بہ جبر مٹا دیا۔

پھر اس یقین کے اندر سے ایک اور یقین نے سر ابھارا۔ اس نے سوچا، یہ وہی بزرگ ہستی ہے، جسے اس نے ٹھیک ایک سال پہلے خواب میں دیکھا تھا۔ اس یقین کے ساتھ ہی پچھلے

معترضانہ سوال نے پھر سر اٹھانے کی کوشش کی۔ یہ کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ یہ وہی بزرگ ہے۔ جبکہ آنے والے کا چہرہ تک دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اندر کے یقین نے پھر اس سوال کے سر پر دھپ سے ہاتھ مار دیا...... خاموش بے ادب، یہ وہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ٹھاکر کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ آگے بڑھنے کی وہ لہر غائب ہو گئی جو اسے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ وہ مجذوب کو آگے بڑھتے دیکھتا رہا۔ مجذوب کے چہرے کے نقوش واضح ہوئے تو اس نے دل میں کہا...... نہیں، یہ وہ خواب والا بزرگ نہیں ہے۔

یہ ایک بات بھی عجیب تھی۔ ہر شخص بارہا کسی نہ کسی اجنبی کو خواب میں دیکھتا ہے۔ سو کر اٹھتا ہے تو وہ چہرہ اسے یاد نہیں ہوتا۔ یاد بھی ہو تو تھوڑی دیر میں محو ہو جاتا ہے لیکن ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے ایک سال پہلے جس بزرگ کو خواب میں دیکھا تھا، اسے اس کا چہرہ اب بھی یاد تھا۔ وہ جب تصور کرتا، اس کا جیتا جاگتا چہرہ اس کے سامنے آ جاتا...... چہرے کے ہر نقش اور تاثر سمیت۔ اس لیے تو اس نے جان لیا کہ یہ مجذوب وہ نہیں ہے۔

مگر مجذوب دو قدم آگے آیا تو ٹھاکر کو لگا کہ یہ وہی بزرگ ہے۔ اگلے لمحے نے اس کی نفی کر دی۔ شاید کسی خاص زاویے سے وہ اس بزرگ جیسا لگتا تھا۔ شاید کوئی مشابہت تھی ان دونوں میں...... مگر دور کی۔

اور پھر مجذوب اچانک بیٹھ گیا تھا...... مر گیا تھا......!

''ٹھاکر...... تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

یہ آواز سن کر ٹھاکر اچھل پڑا۔ سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مجذوب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ''آپ کے سواگت کے لیے آیا ہوں'' ٹھاکر نے بے ساختہ کہا۔ کہنے کے فوراً بعد اس نے سوچا کہ یہ درست نہیں ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ کوئی انجانی طاقت اسے کھینچ کر لے آئی ہے۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم تو خود خیر مقدم کے لیے یہاں آئے تھے۔ کچھ ضروری کام بھی تھے جو نمٹا لیے۔ اب ہمیں جانا ہے۔'' مجذوب کی آواز میں گہرائی تھی...... اور گونج تھی...... صحراؤں کی گونج!

''میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔'' ٹھاکر نے پھر بلا ارادہ کہا۔ اب اسے اپنی از خود رفتگی سے خوف آنے لگا تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' مجذوب نے پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں مہاراج کہ آپ میری خوشیوں میں شریک ہوں۔ میرے بچے کی صورت دیکھیں اور اس کو دعا دیں۔''

''ہم تمھاری اور اپنی خوشی میں شریک ہو چکے ہیں۔ بچے کی صورت دیکھ لی اور دعا بھی

دے دی۔ ''مجذوب نے بڑی تمکنت سے کہا۔ ''ہم وہیں سے آرہے ہیں۔''

ٹھاکر حیران رہ گیا۔ ''مگر مہاراج، آپ تو ادھر سے آرہے ہیں۔''

''ہر سمت اسی کی ہے۔'' مجذوب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''باقی سب نظر کا دھوکہ ہے۔''

ٹھاکر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لیکن اس نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ''چل کے کچھ جل پان تو کرلیں مہاراج۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''نہیں ابھی نہیں۔ وہ بڑا ہوگا اور دعوت کرے گا تو ہم ضرور آئیں گے۔''

''تو مجھے کس لیے بلایا تھا مہاراج؟'' ٹھاکر کی زبان پھر پھسلی۔ اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

''راجپوت میں ایسی عاجزی، سب اس کی شان ہے۔'' مجذوب نے انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر یوں بولا، جیسے سچ مچ ٹھاکر اسی کے بلاوے پر آیا ہو۔ ''کچھ باتیں سمجھانی تھیں۔ پہلے یہ بتا، اس جگہ کا نام کیا ہے؟'' مجذوب نے ٹھاکر سے گاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ جگہ جہاں وہ چراغ روشن ہے۔''

ٹھاکر نے اشارے کی سمت دیکھا اور بڑے فخر سے بولا۔ ''چراغ! وہاں تو چراغاں ہو رہا ہے مہاراج۔''

''نہیں۔ ابھی تو وہاں اندھیرا ہے۔ بس وہی ایک چراغ روشن ہے۔ چراغاں تو بعد میں ہوگا۔''

ٹھاکر نے حیرت سے اپنی حویلی کو دیکھا جو روشنی میں نہائی ہوئی تھی اور مجذوب کہہ رہا تھا کہ وہاں اندھیرا ہے۔ وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اندر سے کسی نے اسے روکا اور اسی نے ایک بار پھر خود کو مجبت سے بچالیا۔ برسوں پہلے امان اللہ نے نصیحت کی تھی کہ ایسے لوگوں سے الجھنا اچھا نہیں ہوتا۔ جو بھی کہیں چپ چاپ سن لو۔ ''وہ میرا گاؤں ہے مہاراج۔ اس نے کہا۔ ''اس کا نام ٹھاکروں کی گڑھی ہے۔''

''نہیں رہے گا۔ نہ یہ گاؤں، نہ یہ نام، یہ اجڑ جائے گا۔ پھر دوبارہ آباد ہوگا اور اس کا نام حق نگر ہوگا۔ بڑی رونق ہوگی یہاں۔''

ٹھاکر کو برا تو بہت لگا۔ مگر وہ برداشت کر گیا۔

''دیکھ، میری باتیں غور سے سن اور بھولنا مت۔'' مجذوب نے ٹھاکر سے کہا۔ ''وہ چراغ جس نے روشن کیا ہے اس کی حفاظت بھی وہی کرے گا۔ لیکن تو اس کے سامنے ہوا کے لیے آڑ بن کر کھڑا ہوگا تو تیرا ہی بھلا ہوگا۔ چراغ کو تو روشن ہی رہنا ہے۔ اسے کوئی نہیں بجھا سکتا۔''

ٹھاکر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مگر اس نے عاجزی سے کہا۔ ''میں سمجھ گیا مہاراج۔''

''اور سن۔ وہ تجھے ملا۔ یہ رب کا احسان ہے تجھ پر۔ تیری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آئیں گی۔ تو نہ اس سے بحث کرنا اور نہ سختی کرنا اس پر۔ اسے کسی بات سے مت روکنا۔ اس کی بات مان لیا کرنا۔ اس کا دل میلا نہ ہونے دینا۔ اس کا بن کر رہنا۔ تیرا ہی بھلا ہے اس میں۔ جان دے دینا اس کے لیے۔ پھر تیرا کھوٹا سکہ بھی اشرفی کے مول چل جائے گا۔''

اس بار ٹھاکر کی سمجھ میں بات پوری طرح آئی تھی۔ ''وہ تو میری جان ہے مہاراج۔''

''کچھ بھی ہو جائے، وہ کچھ بھی کرے، ہمیشہ اسے جان ہی سمجھنا۔'' مجذوب کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''بس اب چلا جا۔ وہاں حویلی میں تیری ضرورت ہے۔ وہاں ڈھونڈ پڑی ہے۔ تیرا بچہ کھو گیا ہے۔''

ٹھاکر کے ہوش اڑ گئے۔ ''میرا بچہ......''

''گھبرا مت۔'' مجذوب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''تیرا بچہ محفوظ ہے۔ وہ اس کمرے میں ہے، جسے اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اب وہی اس کا کمرا ہے۔ جب تک وہ اس حویلی میں ہے، اس کمرے میں رہے گا۔''

ٹھاکر کا راجپوتی خون جوش کھا گیا۔ یہ کیسا مذاق ہے۔ بائیس سال بعد اسے بیٹا ملا ہے تو اس کے فیصلے دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ اسے بتایا جا رہا ہے کہ اس کی اپنی حویلی میں اس کے بیٹے کو کس کمرے میں رہنا ہے۔ ''شما کرنا مہاراج'' اس نے بڑے دبدبے سے کہا۔ ''ہم ٹھاکر لوگ اپنے معاملات میں دوسروں کی مداخلت قبول نہیں کرتے۔''

مجذوب کو جلال آ گیا۔ ''ادھر دیکھ میری طرف۔'' اس کے لہجے میں بجلی کی کڑک تھی۔

''اور میری بات غور سے سن۔ اپنی ٹھاکری کو بھول جا۔ یہ بچہ تجھے تیری ٹھاکری کی قیمت پر ملا ہے۔''

ٹھاکر نے سر اٹھایا۔ پہلی بار وہ براہ راست مجذوب کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تو دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ ان آنکھوں کے سوا اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ اور وہ آنکھیں عجیب تھیں۔ ان میں بلا کی چمک تھی، جو مجذوب کے جوان چہرے سے ہم آہنگ تھی۔ اور ان میں جہاں دیدگی تھی، دانش تھی، جو مجذوب کے سر اور داڑھی کے سفید بالوں سے میچ کر رہی تھی۔ وہ آنکھیں بوڑھی بھی تھیں اور جوان بھی......

''میری بات غور سے سُن۔ میں یہاں یونہی وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔''

مجذوب کی آواز اسے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ وہ ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

''حویلی میں سب پریشان ہیں۔ پاگلوں کی طرح بچے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن وہ اسے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ تجھے جا کر سب کو مطمئن کرنا ہے۔''

"وہ کمرا کون سا ہے مہاراج؟" ٹھاکر اب بھی ان آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"پچھواڑے کی طرف جو کونے والا کمرا ہے......"

ٹھاکر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے دہشت جھلکنے لگی۔ اس نے اس کمرے کا تصور کیا، جو ہر وقت مقفل رہتا تھا تو اس پر لرزہ چڑھ گیا۔ "غضب ہو گیا مہاراج۔" اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔ "اس کمرے میں تو بھوت پریت......"

مجذوب آپے سے باہر ہو گیا۔ "بکواس مت کر بدبخت، ملعون، گستاخ، زبان دراز۔ تو نہیں جانتا......" وہ کہتے کہتے رکا۔ اور دوبارہ بولا تو اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔ "وہاں ایسا کچھ نہیں ہے ٹھاکر۔ بس یہ یاد رکھ کہ اب وہ تیرے بیٹے کا کمرا ہے۔ تو اس کمرے کو کھول کر دیکھنا۔ بچہ جس رخ سے لیٹا ملے، اسے ہمیشہ اسی رخ لٹانا۔ کبھی اس کے خلاف نہ کرنا۔ ورنہ بہت برا ہوگا اور اس کمرے میں پچھواڑے کے رخ پر چھوٹا سا دروازہ ہے نا، اسے کبھی نہ کھولنا۔ اور اس دروازے کے چاروں طرف دو دو فٹ کی جگہ چھوڑ دینا۔ اس طرف کوئی نہ جائے۔ باقی کمرا تمہارا ہے۔ کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ سمجھ گیا؟"

اس کمرے کا تصور کر کے ٹھاکر کا دل لرزا جا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے دل کڑا کر کے کہا۔

"میں سمجھ گیا مہاراج۔"

"اور سن۔ تیرا بیٹا ضدی نہیں ہوگا، لیکن کبھی ضد کرے تو اس کے خلاف نہ کرنا۔ اس کی ضد پوری کر دینا۔ نشانیاں نظر آتی رہیں گی۔ ان کو مانتے رہنا اور ہاں، وہاں شہد ملے گا، وہ بچے کو چٹاتے رہنا۔"

حواس باختہ ٹھاکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ذہن میں اٹھنے والا ایک سوال اس کی زبان پر آ گیا۔ "تم مس......" وہ کہتے کہتے رکا۔ وہ مسلا کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے اندر کی کسی قوت نے اسے ٹوک دیا کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔ اس نے جلدی سے تصحیح کی۔ "تم مسلمان ہو مہاراج؟"

مجذوب مسکرایا۔ "ہم مسلم ہیں......اللہ کے فرماں بردار۔"

"بچہ تو ہمارا ہی ہے نا مہاراج؟" ٹھاکر کے لہجے میں اندیشے تھے۔

"وہ خوش نصیب ہے ٹھاکر پرتاپ سنگھ۔ وہ نہ تمہارا ہے نہ ہمارا ہے۔ وہ اس کا ہے، جس کا ہر بندے کو ہونا چاہیے لیکن بدنصیب اسی کو چھوڑ کر سب کے ہو جاتے ہیں۔ بس اس کے نہیں بنتے۔ اچھا اب تو جا۔"

ٹھاکر کو اب حویلی کی فکر تھی۔ وہاں کی پریشانی کا خیال تھا۔ وہ جانے کو بے تاب تھا۔ چنانچہ جانے کے لیے پلٹا۔ مگر مجذوب کی آواز نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

"ایک آخری بات، میرے متعلق کبھی کسی کو نہ بتانا۔ ہاں ضروری ہو تو بیوی کو بتا سکتا ہے۔"

"جو حکم مہاراج۔"

"بس اب چلا جا۔ اور میری ہر بات یاد رکھنا۔ بھولنا مت۔"

ٹھاکر پلٹ کر تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چل دیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ بھاگنے لگتا۔

کچھ دور جانے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مگر وہاں مجذوب کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ کھلا میدان تھا اور ابھی اتنا اندھیرا بھی نہیں ہوا تھا کہ مجذوب نظر نہ آتا لیکن وہ جیسے نمودار ہوا تھا، ویسے ہی غائب بھی ہو گیا تھا۔ گاؤں کی طرف کچھ اور بڑھنے کے بعد ٹھاکر کو ایسا لگا کہ جو کچھ اس نے دیکھا، جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ مجذوب کو اس کا نام بھی معلوم تھا۔ چنانچہ اس کا یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس کے قدم سست پڑ گئے۔ اس نے سوچا، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ سب میرا واہمہ تھا۔ بچہ وہیں ٹھاکرانی کے پاس ہی لیٹا ہوگا۔

مگر وہ گاؤں میں داخل ہوا تو اسے دور ہی سے احساس ہو گیا کہ وہاں غیر معمولی صورت حال ہے۔ لوگ پریشانی میں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ حویلی میں بھی بھگدڑ کا سماں تھا۔ اس کے قدم پھر تیز ہو گئے......

❀......❀......❀

ٹھاکرانی رنجیتا کا عجیب حال تھا۔ مختلف اور متضاد کیفیات تھیں، جو اس کے اندر گھل مل گئی تھیں۔ وہ تھکن سے چور تھی، خوشی اور طمانیت سے سرشار تھی۔ ایسی طمانیت، جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ مگر اس کا احساس زیادہ نہیں تھا۔

ابھی ذرا دیر پہلے کمرا لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ دور دور سے ان کے رشتے دار یہاں آئے ہوئے تھے۔ دن سے مہمان داری چل رہی تھی اور جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے سب بچے کو دیکھنے اور اسے بدھائی دینے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ وہ خوشی اور فخر میں تکلیف کو بھی بھول گئی تھی۔ وہ بدھائیاں لے رہی تھی۔ ٹھاکر کا چہرہ دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ جیسے پھر سے جوان ہو گیا تھا۔

ٹھاکر اور سب مہمان کمرے سے نکلے تو دائی راجو نے اسے لٹا دیا۔ اسے اچھا لگا کیونکہ بیٹھے بیٹھے اسے تھکن ہو گئی تھی۔

"میں جا رہی ہوں مالکن" دائی نے اس سے کہا۔ "ذرا گھر کو بھی دیکھ لوں۔ بس ترنت آ جاؤں گی۔"

"چلی جا، پر شانتا کو ادھر بھیج دے۔" ٹھاکرانی نے کہا۔

دائی راجو کمرے سے نکلی۔ ٹھاکرانی کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ غشی کی اس کیفیت سے لڑتی رہی جس میں اترنے کو اس کا جی بھی چاہ رہا تھا۔ مگر بچہ اکیلا ہو جاتا۔ شانتا آ جائے تو......

اور اگلے ہی لمحے شانتا کمرے میں آ گئی۔ وہ شاید کمرے کے باہر ہی تھی۔ دائی راجو کے نکلتے ہی آ گئی تھی۔ ٹھاکرانی نے اسے کونے میں فرش پر بیٹھتے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ سکون سے سو سکتی تھی۔

ٹھاکرانی کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ غشی کی وہ کیفیت کتنی دیر رہی۔ اچانک اسے اپنے بچے کا خیال آیا۔ کوئی پریشانی کی بات تھی، جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ ''شانتا...... او شانتا'' اس نے پکارا۔

شانتا بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ ''جی مالکن؟''

''ذرا چھوٹے ٹھاکر کو میرے پاس لٹا دے۔''

ٹھاکرانی کی مسہری دیوار سے لگی تھی۔ بچے کا پنگھوڑا اس کے برابر تھا۔ درمیان میں اتنی جگہ چھوڑی گئی تھی کہ ٹھاکرانی کو اٹھنے کی ضرورت پڑے تو وہ مسہری سے اتر سکے۔ وہ چاہتی تو اٹھ کر بچے کو خود بھی اٹھا لیتی۔ لیکن ایک تو وہ نڈھال ہو رہی تھی دوسرے راجو نے اسے چھ دن احتیاط کرنے کو کہا تھا۔

''جی مالکن۔'' شانتا نے کہا۔

ٹھاکرانی کی آنکھیں پھر مند گئیں۔ لیکن شانتا کی چیخ سن کر وہ گھبرائی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''کیا ہوا شانتا؟''

''جی...... مالکن...... وہ...... چھوٹے ٹھاکر......'' شانتا سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

ٹھاکرانی سب کچھ بھول کر ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا...... کیا ہوا چھوٹے ٹھاکر کو؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں...... بلکہ پھٹ سی گئی تھیں۔

شانتا بت بنی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ لیکن آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟ بولتی کیوں نہیں؟'' ٹھاکرانی نے اسے ڈانٹا۔

''وہ...... چھوٹے ٹھاکر...... چھوٹے ٹھاکر یہاں نہیں ہیں۔'' شانتا نے بڑی مشکل سے کہا۔

ٹھاکرانی کو لگا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ ''کیا بکتی ہے۔ یہیں تو تھے چھوٹے ٹھاکر۔'' اس نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''جھولا خالی پڑا ہے مالکن۔''

ٹھاکرانی نے بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کی۔ مگر بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ راجو گئی ہے تو بچہ یہیں تھا۔ ورنہ راجو ہی شور مچا دیتی اور راجو کے جانے کے ایک منٹ بعد شانتا کمرے میں آ گئی تھی اور اس دوران وہ خود آنکھیں کھولے لیٹی رہی تھی۔ اس ایک منٹ میں

بچہ کہاں جا سکتا ہے۔ ''کمرے میں دیکھو ادھر ادھر۔'' اس نے شانتا سے کہا۔

لیکن کمرے میں ایسی کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ پھر بھی شانتا نے کمرا چھان مارا۔ اس دوران ٹھاکرانی سوچتی رہی۔ مگر اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

''جا...... جا کے ٹھاکر جی کو بلا کر لا۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

چند منٹ بعد ٹھاکرانی کا کمرا بھر گیا۔ سب مہمانوں کو پتا چل گیا تھا۔ سب آ گئے تھے۔

لیکن ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ٹھاکرانی کا برا حال تھا۔ مہمانوں میں ٹھاکر کے چچیرے بھائی بلبیر سنگھ بھی تھے۔ انھوں نے اسے دلاسہ دیا۔ ''بچہ کہاں جائے گا دیورانی جی، خود کو ہلکان مت کرو۔''

پوری حویلی چھان ماری گئی۔ بچے کا کہیں پتا نہیں چلا۔ ٹھاکر بھی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ٹھاکرانی پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی۔ ٹھاکرانی کو سنبھالا جائے یا بچے کو تلاش کیا جائے۔ ایسے میں دلاسہ ہی دیا جا سکتا ہے۔

ٹھاکرانی کی بہن کو راجو کا خیال آیا۔ ''دائی کو بلاؤ۔ اس سے پوچھو۔''

شانتا راجو کو بلانے کے لیے دوڑ گئی۔ راستے میں اسے جو بھی ملا، اس نے اسے بچے کی گمشدگی کا بتا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پورے گاؤں کو پتا چل گیا۔ گاؤں والے ٹھاکر سے محبت کرتے تھے۔ وہ پریشان ہو گئے اور ادھر ادھر بچے کو ڈھونڈنے لگے۔

ادھر ٹھاکرانی کو ایک اور خیال سوجھا۔ ڈوبنے والا تنکے کا سہارا تلاش کر رہا تھا۔ ''ہو سکتا ہے، وہ بچے کو کہیں لے گئے ہوں۔'' وہ بولی۔ اس کا اشارہ ٹھاکر کی طرف تھا۔

اس پر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ٹھاکر کو باہر جاتے ان میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے، ایسا ہی ہوا ہو۔

لیکن راجو نے آ کر وہ تنکا بھی توڑ دیا۔ ''میں گئی ہوں مالکن تو چھوٹے ٹھاکر پنگھوڑے میں تھے۔''

ٹھاکرانی جانتی تھی کہ ٹھاکر راجو کے جانے سے پہلے ہی کمرے سے چلے گئے تھے۔ تو پھر؟ راجو گئی اور ایک منٹ بعد شانتا کمرے میں آ گئی۔ اس ایک منٹ میں بچہ کیسے غائب ہو گیا! اس نے یہی بات بلند آواز میں کہہ بھی دی۔

اس پر سب لوگ دائی راجو کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ''تو جھوٹ بول رہی ہے۔'' بلبیر سنگھ نے راجو سے کہا۔

راجو بوکھلا گئی۔ ''مالکن سے پوچھ لیں۔ میں گئی ہوں تو میرے ہاتھ خالی تھے۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' ٹھاکرانی نے گواہی دی۔

اب سب شانتا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''تو پھر تو بتا۔'' ٹھاکر ارجن سنگھ نے اسے ڈپٹا۔

"مم...... میں کیا بتاؤں مالک۔"

"تو اور کون بتائے گا۔ راجو کے جانے کے بعد کمرے میں تیرے سوا کون تھا۔" ٹھاکر کی بہن کویتا بولی۔

"بتا، کس نے دشمنی کی ہے ہم سے۔ کون تھا، جسے تو نے بچہ دے کر بھگا دیا۔ بتا، ورنہ میں تیری کھال کھینچ لوں گا۔" بلبیر سنگھ بولے۔

"رام جی کی سوگند۔ یہاں کوئی نہیں آیا ٹھاکر جی۔" شانتا گڑگڑائی۔ "اور میں نے دیکھا تو جھولا خالی تھا۔"

"بتا حرام......"

شانتا نے ہاتھ جوڑ لیے۔ "مالکن، مجھ پر شبہ کرنے کے بجائے آپ مجھے جان سے مار دیں۔" وہ رونے لگی۔ "میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔ ہم تو نسلوں سے ٹھاکروں کا نمک کھا رہے ہیں......"

"نمک حرامی میں دیر کتنی لگتی ہے۔" ارجن سنگھ نے کہا۔

ٹھاکرانی کو شانتا پر ترس آنے لگا۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ "اسے کچھ نہ کہیں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ یہ میرے بچے کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"خیر...... بعد میں دیکھیں گے۔ ان دونوں کو کہیں جانے نہ دینا۔" بلبیر سنگھ بولے۔ اشارہ شانتا اور راجو کی طرف تھا۔ "ہم ذرا باہر دیکھتے ہیں۔"

مرد باہر چلے گئے۔ کمرے میں عورتیں رہ گئیں۔ شانتا روئے جا رہی تھی۔ راجو سر جھکائے کھڑی تھی۔

اچانک باہر شور مچا۔ "ٹھاکر جی آ گئے۔ ٹھاکر جی آ گئے......"

ٹھاکرانی کے دل میں امید جاگ اٹھی......

❁......❁......❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ حویلی کی طرف بڑھتا رہا۔ اس نے کسی سے ہنگامے کا سبب نہیں پوچھا کیونکہ اسے معلوم تھا اور کسی کو اسے بتانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سب اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے اور اسے جاتا دیکھتے رہے۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا ارجن سنگھ اور بلبیر سنگھ سے ہوا۔ "کاکا...... تمہارا بالک غائب ہو گیا ہے۔" بلبیر سنگھ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"پریشان نہ ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔" پرتاپ سنگھ نے کہا۔ "آپ سب کو سمجھا دیں ویر جی کہ اس کی چنتا نہ کریں۔" یہ کہہ کر ٹھاکر آگے بڑھ گیا۔

بلبیر سنگھ اور ارجن سنگھ نے سب کو سمجھایا۔ ستے ہوئے چہروں کی رونق واپس آنے لگی۔

اُدھر ٹھاکر پرتاپ سنگھ ٹھاکرانی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انھیں دیکھ کر ٹھاکرانی رونے لگی۔ شانتا اور دائی راجو کے چہروں پر زردی کھنڈ گئی۔ ٹھاکر نے پتنی سے کہا۔ "رنجیتا...... رونے کی ضرورت نہیں۔ چھوٹا ٹھاکر خیریت سے ہے۔ اس کی چنتا مت کرو۔"

"کہاں ہے میرا پتر؟"

"بتاتا ہوں۔ دھیرج رکھو۔" ٹھاکر نے کہا۔ پھر عورتوں کی طرف مڑے۔ "تم لوگ جا کر جشن کی فکر کرو۔"

سب سمجھ گئے کہ ٹھاکر جی کو ٹھاکرانی سے بات کرنی ہے۔ شانتا اور راجو کی بھی جان میں جان آ گئی۔

تخلیہ ہونے کے بعد ٹھاکر نے ٹھاکرانی سے کہا۔ "ہمارا پتر اس کمرے میں ہے، جہاں ہر وقت تالا لگا رہتا ہے...... وہی کونے والا کمرا۔"

"ہائے رام۔" ٹھاکرانی بوکھلا کر اٹھنے لگی۔ "یہ کیا غضب کیا آپ نے؟"

"بیٹھی رہو۔" ٹھاکر نے کہا۔ "اور اسے میں وہاں نہیں لے کر گیا۔ کسی نے اسے وہاں پہنچا دیا ہے۔ مگر تم ڈرو مت۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔"

"کیا بات کرتے ہیں آپ۔ وہاں تو آسیب......"

ٹھاکر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا مت کہو۔ کبھی نہ کہنا۔ کسی کو کہنے بھی نہ دینا۔" اسے مجذوب کا ردعمل یاد آ گیا تھا۔ "اب وہی ہمارے پتر کا کمرا ہے۔"

"آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ اسے لائیں وہاں سے۔" ٹھاکرانی بپھر گئی۔

"رنجیتا...... میری بات سنو سکون سے۔" ٹھاکر کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "تمھیں وہ خواب یاد ہے؟"

❁......❁......❁

وہ خواب ٹھاکر نے ٹھیک ایک سال پہلے دیکھا تھا۔ یہی مہینہ تھا...... یہی تاریخ تھی......

اس صبح ٹھاکر نے ٹھاکرانی کو وہ خواب سنانے کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے ہی ٹھاکرانی بول اٹھی۔ "ناتھ...... رات میں نے ایک سپنا دیکھا۔"

"میں نے بھی دیکھا۔ میرا من کہتا ہے کہ وہ بہت شبھ سپنا ہے۔ پہلے تم میرا سپنا سن لو۔" ٹھاکر نے کہا۔

"سپنا میرا بھی شبھ ہے۔ چلیں...... پہلے آپ سنا دیں۔"

"میں نے دیکھا کہ کونے والے بند کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور میں وہاں کھڑا ہوں......"

"وہ آسیب والا کمرا؟" ٹھاکرانی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں وہی۔ اب ٹوکو مت۔ سنتی رہو۔'' ٹھاکر نے ناگواری سے کہا۔ ''اچانک کرے میں ایک بزرگ آتے ہیں۔ ان کا سر بھی سفید ہے اور داڑھی بھی......''

''اور ماتھے پر مسلمانوں والا نماز کا ٹیکہ ہے۔'' ٹھاکرانی بولی۔

''ہاں۔'' ٹھاکر نے روانی میں کہا۔ پھر چونک کر اسے دیکھا اور اچنبھے سے بولا۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟''

ٹھاکرانی کی نگاہوں میں بھی حیرت تھی۔ ''ایسے کہ میں نے بھی یہی دیکھا تھا۔''

ٹھاکر حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، انھوں نے تم سے کیا کہا؟''

''وہ بولے...... تم اس برگد کے درخت سے بیٹا مانگ رہی تھیں نا؟ میں نے کہا...... ہمیں تو بیس سال ہو گئے مانگتے مانگتے۔ جو جہاں کا بتاتا ہے، ہم وہاں چلے جاتے ہیں۔ نگر نگر کی خاک چھان لی۔ پر منوکامنا پوری نہیں ہوتی......''

ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے بھی خواب میں یہی کہا تھا رنجو۔ اس پر وہ بولے، درخت کے مالک نے تمہاری سن لی ہے۔ تمھیں بیٹا ملے گا...... نصیبوں والا بیٹا......''

''مجھ سے بھی یہی کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کی پرورش کرنا، اس سے محبت کرنا تمہارا کام ہے......''

''اور اس کی تعلیم و تربیت میں دخل نہ دینا۔ اس کی مرضی کے خلاف نہ کرنا۔ بس یہ یاد رکھنا، کسی بھی معاملے میں اس کے ساتھ زبردستی نہ کرنا...... کسی بھی معاملے میں۔'' ٹھاکر نے کہا۔

''جی ہاں۔ بالکل یہی...... اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔''

انھوں نے ٹکڑے لگا لگا کر خواب بیان کیا...... ایک دوسرے کی بات بڑھاتے ہوئے۔

پھر دونوں دیر تک بیٹھے سوچتے رہے...... خاموشی سے۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ شاید ان کی آرزو پوری ہونے والی ہے۔ لیکن انھیں یقین کیسے آتا۔ بائیس سال کی محرومی ختم ہونے پر خود بھگوان آ کر بدھائی دے تو بھی محروم کو تو اس وقت اعتبار آئے گا، جب جھولی سچ مچ بھر جائے گی۔ پھر بھی ان کے دل امید سے بھر گئے تھے۔ وہ تاریخ جب انھوں نے یہ خواب دیکھا تھا، ان کے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ انھیں احساس تھا کہ ایک ہی وقت میں بالکل ایک سا خواب ان دونوں نے دیکھا تھا اور یہ غیر معمولی بات تھی۔

اب یہ روز کا معمول ہو گیا کہ ٹھاکر سو کر اٹھتا تو اس خیال کے ساتھ کہ شاید آج پتنی اسے کوئی اچھی خبر سنائے گی۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ مگر ٹھاکرانی کے سامنے آتا تو نظریں کیا، ایک زبان کو چھوڑ کر اس کے جسم کا ہر عضو سوال بن جاتا اور ٹھاکرانی خوب جانتی تھی کہ زبانِ خامشی سے وہ کیا پوچھ رہا ہے۔ وہ ایک آہ بھر کے نظریں جھکا لیتی یا وہاں سے ہٹ جاتی۔ اس صبح کے بعد ان کے درمیان اس سلسلے میں کبھی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ نہ بالواسطہ نہ بلاواسطہ۔

دونوں ڈرتے تھے کہ امید نہ ٹوٹ جائے۔ دل میں مایوسی جگہ نہ بنا لے۔ حالانکہ ہو یہی رہا تھا۔ ہر گزرتا دن امید کو کمزور کر رہا تھا اور مایوسی چپکے چپکے دل میں سرایت کر رہی تھی۔ ایک مہینہ ہو گیا اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر ایک رات ٹھاکر آیا تو بجھا بجھا تھا...... خاموش، دل گرفتہ اور ملول، ٹھاکرانی نے کریدا تو وہ اسے ٹالنے لگا۔ ''نہیں رنجو۔ کوئی خاص بات نہیں۔ بس تھکن سی ہو گئی ہے۔''

''تھکن تو روز ہوتی ہے جی۔ پر ایسا تو نہیں ہوتا۔''

''اب بڑھاپے کا احساس بھی ستاتا ہے۔''

ٹھاکرانی سمجھ گئی کہ کوئی تازہ بات ہے۔ بڑھاپے کا تذکرہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ''ایسے نہ کہو ناتھ۔ بڑھاپا ابھی بہت دور ہے۔'' وہ سمجھ گئی کہ آج پھر محرومی نے ڈنک چبھویا ہے۔

ٹھاکر وہ بات اسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس سے یہ بوجھ اٹھایا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''رنجو...... آج میں اس درخت کی طرف گیا تھا۔''

''کون سا درخت؟''

''وہی برگد کا درخت، جہاں ہم نے نذر چڑھائی تھی...... پرارتھنا کی تھی بچے کے لیے۔''

''اچھا۔'' ٹھاکرانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''پتا ہے۔ وہ پیڑ سوکھ چکا ہے۔'' ٹھاکر نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''بالکل سوکھ چکا ہے۔ بہار کے موسم میں جل گیا۔ ایک پتا بھی نہیں بچا۔''

ٹھاکرانی کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ ''چلو...... جو بھگوان کی اِچھا۔'' بظاہر تو اس نے یہ بات پیڑ کے سوکھنے پر کہی تھی۔ مگر اصل میں وہ اولاد کے امکان کو رو بیٹھی تھی۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' ٹھاکر بولا۔ ''جس سے ہم نے مانگا، وہ خود ہی لٹ گیا۔''

اس دن کے بعد وہ چپ چپ رہنے لگے۔ ٹھاکر تو بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ امید کی شاخ اس بار یوں سوکھی تھی کہ اس کے ہرے ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں رہا تھا۔ خواب دیکھے تین مہینے ہوئے تھے کہ ٹھاکرانی نے اسے خوش خبری سنا دی۔

اب وہ خوش تھے۔ لیکن ٹھاکر کو اندیشے بھی ستاتے تھے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ مگر چھ مہینے خیریت سے گزر گئے تو اسے اعتبار آنے لگا کہ خواب سچا تھا اور آج وہی تاریخ تھی، جس تاریخ کو ایک سال پہلے اس نے خواب دیکھا تھا اور اسے تعبیر مل گئی تھی......

❁......❁......❁

''یاد ہے مجھے۔ اس خواب کو بھلا بھول سکتی ہوں میں!'' ٹھاکرانی نے کہا۔

''شاید ابھی میں اس خواب والے سے مل کر آ رہا ہوں۔''

''شاید کا مطلب؟''

''اس کی صورت الگ تھی۔ پر کبھی مجھے لگتا تھا، وہ وہی ہے جسے خواب میں دیکھا تھا۔''

''اسے چھوڑو۔ میرے پتر کو اس کمرے سے نکالو نا۔''

''وہی تو میں بتا رہا ہوں۔'' ٹھاکر نے کہا۔ مجذوب نے سختی سے کہا تھا کہ کسی کو کچھ نہ بتانا۔ ہاں ضروری ہو تو اپنی بیوی کو بتا دینا۔ تو ضروری تو تھا۔ وہ ٹھاکرانی کو نہ بتاتا تو وہ بچے کو اس کمرے میں کبھی نہ رہنے دیتی۔ جبکہ یہ مجذوب کا حکم تھا کہ بچہ اسی کمرے میں رہے گا۔

سو ٹھاکر نے ٹھاکرانی کو سب کچھ کہہ سنایا۔ ''اور یہ بات کسی کو بھی نہیں بتانی ہے۔'' اس نے آخر میں کہا۔

''لیکن وہ کمرا تو......''

''رنجو۔ یہ مت بھولو کہ بچے کی خبر بھی ہمیں اسی کمرے میں ملی تھی۔ مجھے وشواس ہے کہ کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' ٹھاکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں جا کر کمرا کھولتا ہوں۔ اسے ٹھیک کراتا ہوں۔ پھر تمھیں وہاں لے جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے ناتھ۔''

ٹھاکر اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

وہ اس مقفل کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ بلبیر سنگھ اور ارجن سنگھ آ گئے۔ ''تمہارا پتر کہاں ہے کاکا؟'' بلبیر سنگھ نے پوچھا۔

''وہ کونے والے کمرے میں ہے۔''

''وہ دونوں ٹھاکر کے ساتھ چلتے رہے۔ انھیں اس کمرے کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ بات تو ٹھاکر نے اپنے کسی ملازم کو بھی پتا نہیں چلنے دی تھی۔ بس وہ اور ٹھاکرانی جانتے تھے اس بارے میں۔ وہ بند دروازے کے پاس رکا اور اس نے چابی نکالی۔

''پر کاکا، تم اسے یہاں لائے کیوں؟'' بلبیر سنگھ نے پوچھا۔

''وہ...... ویر جی...... بات یہ ہے کہ...... یہ کمرا الگ تھلگ ہے اور زیادہ آرام دہ بھی ہے۔'' ٹھاکر پرتاپ نے تیزی سے بات بنائی۔

اسی وقت ارجن سنگھ کی نظر دروازے کے تالے پر پڑی۔ ''اور تم نے تالا بھی ڈال دیا۔ ارے بچہ بند کمرے میں اکیلا ہے۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟'' اس نے کہا۔

''وہ...... مجھے تو......'' ٹھاکر گڑبڑا گیا۔ اس کے منہ سے سچ نکلنے ہی والا تھا کہ اس نے خود کو روک لیا۔ ''عادت ہے نا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تالا لگا رہا ہوں۔'' اس نے چابی تالے میں لگائی۔ پھر اسے خیال آیا کہ برسوں سے یہ کمرا نہیں کھلا ہے۔ اندر کا تو حال بہت برا ہوگا۔ دھول مٹی، مکڑی کے جالے، وہ اس سلسلے میں بھائیوں کو کیا جواب دے گا۔ پھر اس کا دل یہ سوچ کر کانپ گیا کہ، ہاں اس کا ننھا سا بچہ بھی ہے۔

لیکن اس نے دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گیا۔ کمرا صاف ستھرا بھی تھا اور جگمگا بھی رہا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی کمرا ہے۔ وہ اتنا روشن اور ہوادار تو نہیں تھا۔ مگر اس وقت اس کمرے میں قدم رکھتے ہوئے تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر خوبصورت پردے پڑے تھے۔ پچھواڑے کے رخ پر کھلنے والی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔

کمرے کا حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ اگر اس میں بچہ موجود نہ ہوتا تو ٹھاکر یہی سمجھتا کہ وہ کسی اور کمرے میں آ گیا ہے۔ وہ بے حد وسیع و عریض کمرا تھا۔ لیکن اس وقت اتنا بڑا نہیں لگ رہا تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ پہلے اس میں ایک بڑی مسہری کے سوا کچھ نہیں تھا جبکہ اب وہاں بچے کا پنگھوڑا بھی تھا، کرسیاں بھی تھیں......اور ایک بڑا تخت بھی موجود تھا۔

ٹھاکر چند لمحے تو سکتے کی سی حالت میں دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر وہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور پنگھوڑے کے پاس جا کر بچے کو دیکھا۔ وہ سو رہا تھا اور پنگھوڑے کے پاس ایک تپائی تھی، جس پر چاندی کی ایک کٹوری رکھی تھی۔ اس کٹوری میں شہد تھا۔

❀......❀......❀

ایک گھنٹے کے اندر کمرا رونقوں سے بھر گیا۔ ٹھاکرانی کو بھی وہاں منتقل کر دیا گیا۔ ادھر حویلی میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اس روز دعوتِ عام تھی حویلی میں۔ گاؤں کے کسی گھر میں چولہا نہیں جلا تھا۔ ٹھاکر نے سختی سے منع کیا تھا۔ پورا گاؤں حویلی میں جمع تھا۔

پھر راگ رنگ کی محفل جم گئی۔ بنارس سے ناچنے گانے والیاں آئی ہوئی تھیں۔ سب مہمان وہاں بیٹھے تھے۔ ٹھاکر میر محفل تھا۔ فن کاروں کو داد بھی مل رہی تھی اور پیسہ بھی۔ چنانچہ وہ جم کر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

وہیں جمال دین بھی تھا۔ وہ دوسرے درجے کے تماشائیوں میں تھا۔ وہاں تماشائیوں کے تین درجے تھے۔ ٹھاکر کے مہمان درجہ اول میں اس کے ساتھ تھے۔ دوسرا درجہ مزارعین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ٹھاکر کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ ان کے لیے سائیڈ میں بڑی سی دری بچھا دی گئی تھی۔ تیسرا درجہ حویلی میں کام کرنے والوں یا اوپر کے کام کرنے والوں کا تھا۔ وہ آزاد تھے۔ چاہیں تو کھڑے ہو کر ناچ گانا دیکھیں اور تھک جائیں تو بے شک زمین پر بیٹھ جائیں۔

جمال دین اس گاؤں میں واحد مسلمان تھا۔ شاید اس لیے وہ ٹھاکر کا منہ چڑھا بھی تھا۔ اس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ جیسے وہ ٹھاکر کا منہ چڑھا تھا، ویسے ہی اس کی بیوی ٹھاکرانی کے بہت قریب تھی۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا، جو شادی کے چھ سال بعد پیدا ہوا تھا۔ اب وہ دس ماہ کا ہونے والا تھا۔

ٹھاکر نے برسوں پہلے جمال دین کے باپ مہر دین پر ایک احسان کیا تھا۔ مہر دین پڑوس کے گاؤں میں رہتا تھا۔ اوروں کی طرح وہ بھی مہاجن کا مقروض تھا۔ لیکن مہاجن خاص طور پر اسے بہت پریشان کرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی بیٹی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

ایک دن مہاجن سود کی رقم وصول کرنے آیا۔ مہر دین کے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ مہاجن موقع پا کر دل کی بات زبان پر لے آیا۔ ''سن مہر دین۔ تو اپنی پتری کو کام کرنے کے لیے میرے ہاں بھیج دیا کر۔ تو میں سود معاف کر دوں گا۔ اصل رقم تو تھوڑی تھوڑی کر کے......''

مہر دین بیٹی کا نام سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے مہاجن کی مرمت لگا دی۔ ''اب تو اصل رقم اور سود تیار رکھ مہر دین۔'' مہاجن نے جاتے جاتے کہا۔ ''اب کے میں تیاری سے آؤں گا۔ پوری رقم نہ ملی تو تجھے گھر سے نکلوا دوں گا۔''

مہر دین اپنے زمین دار کے پاس گیا، جس کی زمین پر وہ کام کرتا تھا...... اور اس سے مدد چاہی۔

زمین دار نے بے مہری سے کہا۔ ''مہر دین، میں اس طرح کے معاملے میں نہیں پڑتا۔''

''راجا صاحب، آپ مجھے قرض دے دو۔ میں آپ کی پائی پائی اتار دوں گا۔'' مہر دین نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی مہر دین۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں۔''

''مائی باپ، آپ میری مدد نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔'' مہر دین گھگھیانے لگا۔

''آخر آپ کی زمینوں پر ہی کام کرتا ہوں میں۔''

''مفت تو نہیں کرتا۔ پورا محنتانہ دیتا ہوں میں۔'' راجا صاحب نے بگڑ کر کہا۔

''مگر میں تو قرض مانگ رہا ہوں۔''

''قرض دینا میرا نہیں، مہاجن کا کام ہے۔'' راجا صاحب نے بے رحمی سے کہا۔

''مہاجن سے بگاڑی کیوں تھی۔''

''عزت کی بات تھی راجا جی......''

''تو اب بیوی بچوں کو گھر سے باہر آسمان کے نیچے رکھے گا تو وہی عزت دوسری طرح جائے گی۔ جانے والی چیز تو نہیں بچ سکتی عقل کے دشمن۔''

مہر دین لوٹ آیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ راجا صاحب اور مہاجن کی ملی بھگت ہے اور مہاجن اپنی نہیں، پردہ رکھتے ہوئے راجا صاحب کے دل کی بات کر رہا تھا۔ وہ ڈر گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ پھیلائے لیکن کہیں سے دھیلا بھی نہیں ملا۔

اور پھر ایک دن مہاجن ڈگری لے کر آ گیا۔ اس نے گھر کا سامان باہر پھنکوا دیا۔ عدالت کے اہل کار اس کے ساتھ تھے۔ خوش قسمتی سے عین وقت پر ٹھاکر پرتاپ سنگھ ادھر آ نکلا۔ وہ کسی کام سے آیا تھا۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر رک گیا۔ پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ ظلم ہو رہا ہے۔ اس نے ہاتھ کے ہاتھ قرض مع سود کے چکا دیا۔ مہاجن اور اہل کار چلے گئے تو اس نے مہر دین سے کہا۔ ''اب تو یہاں آرام سے رہ......''

''پر ٹھاکر جی، اب میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔''

''کیوں؟''

مہر دین نے تفصیل سے اسے وجہ بتا دی۔

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا۔ نجانے کیوں، مہر دین اسے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا...... بھلا مانس اور وفادار۔ پھر وہ بولا۔ ''تو چاہتا کیا ہے؟''

''آپ اپنی کوئی زمین مجھے کام کے لیے دے دیں۔ ایک احسان کیا ہے تو دوسرا بھی کر دیں۔ یہاں تو میں لٹ جاؤں گا۔''

یوں یہ گھرانا ٹھاکروں کی گڑھی میں آ کر آباد ہو گیا۔ یہیں مہر دین نے بیٹی کی اور پھر بیٹے کی شادی کی۔ دو سال پہلے وہ گزر گیا۔ اس کی موت کے بعد ٹھاکر نے جمال دین کو بلوایا۔

''اب تو نے کیا سوچا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں ٹھاکر جی۔''

''دیکھو میں جانتا ہوں، تو نماز پڑھتا ہے۔ اپنے دھرم کا پکا ہے اور یہاں تیرے سوا کوئی تیرے دھرم کا نہیں۔ مسجد بھی نہیں ہے......''

جمال دین کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ سمجھا کہ نماز پڑھنا اس کا جرم بن گیا ہے۔ ''آپ مجھے نکال رہے ہیں ٹھاکر جی۔'' اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

''یہ بات نہیں۔ میں تیرے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

''میرا بھلا تو یہاں رہنے میں ہے۔'' جمال دین بولا۔ ''ابا نے کہا تھا، یہ در کبھی نہ چھوڑنا۔''

''میں تجھے کچھ رقم دوں گا۔ کسی ایسے گاؤں چلا جا، جہاں تیرے دھرم والے رہتے ہوں۔''

''آپ دھکے دے کر نکالیں تو مجبوری ہے ٹھاکر جی۔ ورنہ میں تو آپ کی رعیت بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں کوئی تکلیف، کوئی پریشانی نہیں۔ اللہ کا قبلہ ہر جگہ موجود ہے۔ مسجد نہ سہی۔ میں کہیں بھی کھڑا ہو کر اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیتا ہوں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''ابا کہتے تھے، احسان کرنے والے کو کبھی نہیں چھوڑتے۔''

اسی بات کا ٹھاکر کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ جمال دین جس زمین پر کام کرتا تھا، وہ اس نے اسی کے نام کر دی اور وضع دار آدمی تھا۔ اس کے بعد اس نے کبھی جمال دین کے ساتھ ملازموں اور مزارعوں والا سلوک نہیں کیا۔ وہ اسے ایک زمین دار کا مقام دیتا تھا لیکن جمال دین کو بھی وضع داری اپنے باپ سے ملی تھی۔ اس نے خود کو کبھی دوسرے درجے سے نہیں نکالا۔ بہر حال یہ بات گاؤں کے سب لوگوں نے جان لی۔ اب کسی کو ٹھاکر سے کچھ کہنا ہوتا اور ہمت نہ ہوتی، تو جمال

دین کی سیڑھی لگاتا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ جمال دین کی بات کم ہی ٹالتا تھا۔

اس وقت بھی یہی کچھ ہوا؟

شانتا باہر آئی اور اس طرف گئی، جہاں ملازمین کھڑے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک سے کہا۔ ''ٹھاکر جی کو بولو، مالکن انھیں بلاتی ہیں۔''

''پاگل ہوئی ہے۔'' ملازم نے اسے گھور کر دیکھا۔

''کہنا، کوئی بہت ضروری بات ہے۔''

اس بار ملازم نے اسے غور سے دیکھا۔ شانتا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لیکن ایسے میں ٹھاکر کے پاس جانا اور یہ پیغام پہنچانا رنگ میں بھنگ ڈالنے کے برابر تھا، یہ خطرناک کام وہ کیسے کرتا۔ ''نا بابا نا۔'' اس نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''اتنے مہمانوں کے بیچ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔''

''مالکن کا حکم ٹالتا ہے۔'' شانتا نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ٹھاکر جی کو پتا چلا تو......''

اب دوسرے بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ لیکن ٹھاکر کے لیے اس محفل سے اٹھنے کا پیغام لے کر جانے کی کسی میں ہمت نہیں تھی اور وہ اس سے بھی ڈر رہے تھے کہ پیغام نہ پہنچانے کی صورت میں ٹھاکرانی ٹھاکر جی سے شکایت کرے گی اور پھر ٹھاکر جی کا عتاب...... یعنی آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ تھا۔

ایسے میں گنگو کو جمال دین کا خیال آ گیا۔ ''آؤ جمال دین سے بات کرو نا۔''

جمال دین کو صورتِ حال بتائی گئی۔ وہ پہلے تو ہچکچایا لیکن پھر راضی ہو گیا۔

جمال دین ٹھاکر کی طرف گیا تو ٹھاکر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تجھ سے کہا تھا جمال دین کہ تو ادھر کرسی پر بیٹھ۔ کہاں گرتا پھر رہا ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں سرکار۔ بہت خوش ہوں۔'' جمال دین نے کہا۔ پھر سرگوشی میں بولا۔ ''ٹھاکرانی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔''

ٹھاکر کچھ بدمزہ ہو گیا۔ ''اس وقت مہمانوں کو چھوڑ کر نہیں اٹھ سکتا میں۔ تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔''

یہ وہ مرحلہ تھا، جس سے کوئی نوکر، کوئی مزارع نہیں گزر سکتا تھا۔ جمال دین صرف ایک لمحے کو ہچکچایا۔ پھر اس نے کہا۔ ''ٹھاکر جی۔ ضرور کوئی بڑی بات ہے۔ ورنہ وہ آپ کو نہیں بلاتیں۔ انھوں نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔''

ایک لمحے کو ٹھاکر کے چہرے پر سختی ابھری۔ مگر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اچھا...... تو چل۔ میں آتا ہوں۔''

جمال دین فوراً ہی درجہ اول سے باہر آ گیا......

❀......❀......❀

ٹھاکرانی رنجیتا کو ایک پل کے لیے بھی یقین نہیں آیا کہ یہ وہی کمرا ہے۔ عجیب بات تھی کہ اپنے کمرے کے مقابلے میں یہاں اسے زیادہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اور ایک احساس اس سے زیادہ گہرائی میں اور اس سے زیادہ طاقت ور تھا۔ وہ تحفظ کا احساس تھا۔ جیسے یہاں کوئی اسے اور اس کے بچے کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

بچے کے رونے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اچانک ہی بلک بلک کر رونے لگا تھا۔

دائی راجو نے کہا۔ ''مالکن، چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کی کوشش کریں۔''

یہ ایک عجیب بات تھی۔ ٹھاکرانی کی چھاتیوں میں ممتا کے سوتے پھوٹ چکے تھے۔ اب تک وہ کئی بار بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کر چکی تھی لیکن بچے نے منہ بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ پوری طاقت سے منہ موڑ لیتا تھا۔

عورت کہیں کی بھی ہو۔ کسی بھی مذہب، رنگ یا نسل سے تعلق رکھتی ہو، ماں کی حیثیت میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ اپنے بچے کو دودھ پلانا اس کے لیے زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ ٹھاکرانی کے لیے تو اس کی اہمیت اور زیادہ تھی۔ بائیس سال کی محرومی کے بعد اسے یہ موقع ملا تھا۔ مگر بچہ تھا کہ اسے یہ اعزاز دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ٹھاکرانی کو اس پر رنج تھا۔ ادھر دودھ اب رک نہیں رہا تھا۔ بہنے لگا تھا۔ یہ اس کے لیے جسمانی اذیت کا سبب بھی تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ جن ماؤں کے بچے مردہ پیدا ہوں یا شیر خواری میں مر جائیں، انھیں لازمی یہ اذیت اٹھانی پڑتی ہے۔ دودھ کے جاری سوتے آسانی سے نہیں رکتے۔ پینے والا منہ موڑ جائے تو ماں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ٹھاکرانی اسی تکلیف سے بھی دوچار تھی۔ ننھا دیوتا ماں کی پہلی بھینٹ سوئیکار کر لے، اس میں اس کی مکتی تھی۔

''ٹھیک ہے راجو۔ ادھر لے آ چھوٹے ٹھاکر کو۔'' اس نے پکارا۔

راجو نے بڑی نزاکت سے بچے کو لا کر ٹھاکرانی کو دیا۔ ٹھاکرانی نے بڑی چاہت سے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن بچہ اب بھی انکاری تھا۔ ٹھاکرانی نے لاکھ کوشش کر لی۔ لیکن بچے نے ہر بار منہ موڑ لیا۔ گردن بھی اکڑا لی۔ ''کیا بات ہے؟ یہ میرا دودھ کیوں نہیں پیتا؟'' ٹھاکرانی نے افسردگی سے کہا۔

راجو بڑی تجربہ کار عورت تھی۔ ''آپ دل چھوٹا نہ کریں مالکن'' وہ بولی۔ ''کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دودھ کسی وجہ سے کڑوا ہوتا ہے۔ بچہ اسے قبول نہیں کرتا۔ پھر کڑواہٹ دور ہو جاتی ہے تو پینے لگتا ہے۔''

''تو کڑواہٹ کیسے دور ہوگی؟''

''کچھ جڑی بوٹیاں ہوتی ہیں۔ میں ان کی پھنکی بنا کر آپ کو دوں گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

بچہ ماں کے دودھ کو مسترد کرنے کے بعد چیخ چیخ کر روئے جا رہا تھا۔ ''مگر یہ بہت بھوکا ہے۔'' ٹھاکرانی نے تڑپ کر کہا۔

''تب تک کے لیے بکری کا دودھ دے دیں انھیں۔'' راجو نے تجویز پیش کی۔ ''میں دوا کوٹتی ہوں۔ پھر بھگوان نے چاہا تو یہ آپ کا دودھ پینے لگیں گے۔''

''ابھی تو تم انھیں انگلی سے شہد چٹا دو۔ یہ ٹھاکر جی کا حکم ہے۔''

''مالکن، برا نہ ماننا۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' راجو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''عمر ہو گئی مجھے یہی کرتے۔ پر ایسا کبھی نہیں دیکھا۔ اپنے لوگوں میں بچے کو شہد نہیں چٹایا جاتا۔ یہ تو مسلموں میں ہوتا ہے۔''

بات سچی تھی مگر ٹھاکرانی کو بہت برا لگا۔ ''تجھ سے جو کہا جائے، وہ کر راجو۔ زیادہ بات کرنے والا بولنے کا ہی نہیں رہتا۔''

راجو ڈر گئی۔ اس نے خاموشی سے بچے کو اٹھایا اور لے جا کر پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ پھر وہ انگلی سے بچے کو شہد چٹانے لگی۔ روتا ہوا بچہ ایک دم چپ ہو گیا۔ چند منٹ بعد وہ قلقاریاں مارنے لگا...... اور پھر سو گیا۔

تھوڑی دیر بعد بچہ پھر چنگھاڑنے لگا۔ ٹھاکرانی نے شانتا سے کہا۔ ''دیکھ تو۔ شاید چھوٹے ٹھاکر گیلے ہو گئے ہیں۔ کپڑے بدلا دے۔''

شانتا پنگھوڑے کی طرف بڑھی۔ ''مالکن، میں گھر جاؤں۔ آپ کے لیے دوا بناؤں گی۔'' دائی راجو نے ٹھاکرانی سے پوچھا۔ ''صبح سویرے آجاؤں گی۔''

ٹھاکرانی جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ پنگھوڑے کے پاس سے شانتا کی چیخ سنائی دی۔ ''ہائے رام......''

''کیا ہوا؟'' ٹھاکرانی نے گھبرا کر پوچھا۔

مگر شانتا کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کے ہونٹ البتہ لرز رہے تھے۔ ایک ہاتھ سینے پر رکھا تھا۔

ٹھاکرانی کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ ''بچہ خیریت سے تو ہے نا؟'' اس کا دل اندیشوں کے بوجھ سے لرزنے لگا۔

''ج...... جی...... چھ...... چھوٹے ٹھاکر ٹھیک ہیں۔ پر......''

راجو دوڑ کر اس طرف گئی اور پنگھوڑے میں پڑے بچے کو دیکھتی رہی، جس کا نچلا دھڑ برہنہ تھا۔ وہ بھی پریشان ہو گئی۔

''کیا ہوا؟ بولتی کیوں نہیں؟ کیا بات ہے شانتا؟'' ٹھاکرانی چلائی۔

شانتا اب بھی جواب نہ دے سکی۔ ٹھاکرانی نے راجو کو پکارا۔ ''راجو، تو بتا۔ کیا بات

ہے؟''

''وہ...... مالکن...... وہ...... آپ خود ہی دیکھ لیں۔'' راجو نے جواب دیا۔ وہ گڑبڑائی ہوئی تھی۔

ٹھاکرانی کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ ساری احتیاط بھول کر اٹھی اور پنگھوڑے کی طرف لپکی۔ بچے کو دیکھنے کے بعد اس کے منہ سے بھی بے ساختہ...... ''ہائے رام، یہ کیا......؟'' نکلا۔

تینوں دیر تک بچے کے جسم کے، ناف سے نیچے والے حصے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔ پھر راجو منمنائی۔ ''میں گھر جاؤں مالکن؟''

ٹھاکرانی نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔ اچانک اس کی آنکھیں جیسے شعلے اگلنے لگیں۔ اس نے کہا۔ ''راجو، پہلے تجھے یہ بتانا ہوگا کہ یہ کیا ہے؟''

راجو نے اس کے تیور دیکھے تو تھر تھر کانپنے لگی۔ ''م...... میں...... میں کیا جانوں مالکن۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا ہے۔''

''تو پھر؟''

''مجھے...... مجھے کچھ پتا نہیں مالکن۔'' راجو کا چہرہ فق ہو گیا۔

ٹھاکرانی شانتا کی طرف مڑی۔ ''شانتا، تو جا کے ٹھاکر جی کو بلا کر لا۔''

''مالکن، باہر مجرا ہو رہا ہے۔ ٹھاکر جی مہمانوں کے ساتھ ہیں۔'' شانتا نے گھبرا کر کہا۔

ٹھاکرانی عام حالات میں نرم مزاج تھی لیکن اس وقت صورتِ حال ایسی تھی کہ اسے جلال آ گیا۔ اس نے درشت لہجے میں شانتا کو ڈپٹا۔ ''مجھے بھی معلوم ہے۔ تو مجھے مت پڑھا جا ان سے کہنا، بہت ضروری بات ہے۔ فوراً آ جائیں۔ تو خود جا کر ان سے کہنا۔''

اب کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ شانتا مرے مرے قدموں سے یوں چلی، جیسے مقتل کی طرف جا رہی ہو۔

ٹھاکرانی کو اس پر ترس آ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس بے چاری پر بچے کے غائب ہونے کے سلسلے میں شبہ کیا جا رہا تھا۔ اس وقت خوف سے کیا حال ہوگا اس کا! اور اب یہ مصیبت۔ ''کسی نوکر سے کہہ دینا۔ وہ بلا دے گا۔ پر یہ بات منہ سے نہ نکلے۔ بس ان کو بلانا ہے۔ جلدی جا۔''

شانتا کے قدموں میں کچھ جان سی پڑ گئی......

❀......❀......❀

ٹھاکر مہمانوں سے معذرت کر کے حویلی کی طرف چلا تو جھنجلایا ہوا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ اس بات پر ٹھاکرانی کی اچھی طرح خبر لے گا۔ ایسے ذرا ذرا سی بات پر مہمانوں کے بیچ سے بلوا لینا۔ ٹھاکروں کے ہاں یہ سب چونچلے تو جوانی میں بھی نہیں ہوتے۔ جبکہ اب تو بڑھاپا

آن لگا ہے چوکھٹ پر۔

مگر فوراً ہی اس کے دل میں نرمی سی پھوٹ نکلی۔ بے چاری رنجیتا! بہت اچھی پتنی تھی وہ۔ چونچلوں کا عرصہ...... امنگوں بھری جوانی تو اس نے دَبے دَبے گزار دی تھی۔ صرف اس لیے کہ بھگوان نے اسے اولاد نہیں دی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ یہ اس کی اپنی نااہلی ہے۔ اس لیے وہ کبھی کچھ مانگتی ہی نہیں تھی۔ کوئی مطالبہ نہیں کرتی تھی۔ کسی چیز پر حق نہیں جتاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس پر بھی...... اپنے پتی پر بھی!

یہ سوچتے ہوئے ٹھاکر کو اپنا خیال آیا۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔ اولاد سے محرومی کا ذمے دار وہ خود کو سمجھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس میں یہ اہلیت ہی نہیں ہے اور وہ راجپوت تھا۔ آن بان والا۔ وہ یہ بات کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا...... پتنی سے بھی نہیں۔ اس نے کبھی اپنا معائنہ بھی نہیں کرایا۔ اگر رپورٹ صاف بتا دیتی کہ وہ اس جوہر سے محروم ہے تو اس کے سامنے مر جانے کے سوا کوئی راستہ نہ رہتا۔ چنانچہ وہ خاموش رہا اور اندر ہی اندر احساس کمتری پالتا رہا۔

شاید اس کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ یہ کہ وہ ایک اچھا انسان بن گیا۔ وہ بہت بڑا زمین دار تھا۔ دور تک اس کی زمینیں تھیں۔ بیسیوں گاؤں تھے اس کے۔ بڑی رعیت تھی۔ پر اس نے کبھی زمین داروں کی روایتی عادتیں نہیں اپنائیں۔ وہ ظالم و جابر نہیں بنا۔ کبھی ناچ گانا دیکھ لینا الگ بات ہے۔ مگر اس نے کبھی کسی عورت پر بری نظر نہیں ڈالی۔ ہوس میں کبھی مبتلا نہیں ہوا۔ رعیت کی بہو بیٹیوں کو میلی نظر سے نہیں دیکھا جبکہ زمین دار تو پسند کی لڑکیوں کو گھر سے اٹھوا لیتے ہیں۔ اس نے تو کبھی کسی ناچنے والی کی خواہش بھی نہیں کی۔ کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا۔ اس کے مزارعے، ملازمین، گھر کے نوکر چاکر، سب ہمیشہ اس سے خوش رہے۔ اسے دعائیں دیتے رہے۔ وہ اس کی عزت کرتے تھے۔ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ حالانکہ اس نے کبھی کسی کو سزا نہیں دی تھی۔ وہ تو ہر پریشانی میں ان کے کام آتا تھا۔ ان کی مدد کرتا تھا۔ فصل خراب ہوئی تو اس نے اپنا حصہ معاف کر دیا۔ الٹا مزارعوں کو کچھ پلے سے دے دیا۔ کسی کے گھر میں پریشانی ہوئی تو وہ اس کے کام آیا۔ شاید صرف اس لیے کہ وہ بائیس سال اولاد سے محروم رہا اور خود کو کمتر سمجھتا رہا۔ ورنہ شاید وہ بھی دوسرے زمین داروں کی طرح ہوتا۔

یہ بھی ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی اچھائی تھی کہ وہ اس انداز میں سوچتا تھا۔ اس کی طبیعت میں راجپوتوں کی ضد اور اکڑپن کے ساتھ ایسا انکسار، ایسی عاجزی تھی، جسے راجپوت توہین سمجھتے ہیں۔ جو راجپوتوں میں ہوتی ہی نہیں۔ ورنہ اگر وہ پیچھے کی طرف دیکھتا تو اکڑ جاتا۔ اس نے اپنے باپ ٹھاکر رندھیر سنگھ کو دیکھا تھا۔ وہ اولاد سے محروم نہ ہونے کے باوجود ایسے ہی تھے۔ رعایا کو اولاد کی طرح سمجھتے اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ عیاش طبع بھی نہیں تھے۔ ان کی شرافت اور عزت کی مثالیں دی جاتی تھیں اور ٹھاکر پرتاپ سنگھ انہی کا بیٹا تھا۔

اور پھر ٹھاکر پرتاپ سنگھ اپنے ماضی کو دیکھتا تو بھی اس میں اکڑ پیدا ہو جاتی۔ اپنے بیاہ سے پہلے وہ جوانی کے نو سال گزار چکا تھا۔ بیاہ تو اس کا پچیس سال کی عمر میں ہوا تھا۔ زمین داروں کے جوان بیٹے تو طاقت کے نشے میں چور ہو کر اپنے گلشن عمل داری میں کسی کلی، کسی پھول کو شاخ پر نہیں رہنے دیتے۔

ٹھاکر پرتاپ چاہتا تو کیا نہیں کر سکتا تھا۔ بیاہ سے پہلے کتنی لڑکیاں اس کی نظر التفات کی آرزو کرتی تھیں۔ مگر اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھا۔ اس لیے کہ یہ اس کی فطرت ہی نہیں تھی۔ محرومی تو بعد کی بات تھی۔

اور بیاہ کے پانچ سال بعد تو ٹھاکرانی رنجیتا ہی دوسرے بیاہ کے لیے اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ مگر اس نے ہی ہمیشہ انکار کیا...... اور بہت درشتی سے انکار کیا۔ اسے رنجیتا سے بہت محبت تھی۔ وہ اسے سوکن کا دکھ کیسے دے سکتا تھا!

''مجھے بیٹا چاہیے ناتھ۔'' رنجیتا اکثر جھنجھلا کر کہتی۔ ''تمہارا بیٹا۔ میری کوکھ سے نہ سہی، کسی اور کی کوکھ سے سہی۔ تمہارا بیٹا میرا بیٹا ہوگا۔''

''میں نے کہہ دیا نا۔ مجھے یہ سننا بھی برا لگتا ہے۔''

''مگر کیوں ناتھ؟''

''دیکھو رنجو، بیٹے کو میرا من بھی بہت چاہتا ہے۔ پر میں کہتا ہوں، بھگوان کو دینا ہی ہے تو تم سے دے۔ ورنہ مجھے نہیں چاہیے۔''

تو ٹھیک ہے۔ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ٹھاکر نے دل میں کہا۔ بائیس برس کی دبی ہوئی رنجیتا اب توجہ کی حق دار ہوئی ہے۔ وہ تمھیں محفل سے بھی بلائے تو ہنسی خوشی جاؤ۔ ماتھے پر بل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ توجہ، یہ نخرے...... اب اسے ان کا ادھیکار ہے۔ وہ تمہاری پتنی ہی نہیں۔ تمھارے چھوٹے ٹھاکر کی ماں بھی ہے۔

اس نے دروازہ دھکیلا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ مسئلہ رنجیتا کے توجہ حاصل کرنے کا نہیں بلکہ سنگین ہے۔ رنجیتا بستر پر نہیں تھی بلکہ پنگھوڑے کے پاس کھڑی بچے کو دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ اس کے پاس ہی دائی راجو اور شانتا کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔

ٹھاکر کا دل وسوسوں سے بھر گیا۔ بچے کو کچھ ہو گیا ہے؟ یہ سوچ کر ہی اسے لگا کہ اس کا دل بند ہو رہا ہے۔ سانسیں رکی جا رہی ہیں۔ مگر اسی لمحے اسے مجذوب کی بات یاد آ گئی۔ بچہ اسے جس طرح ملا ہے، دیا گیا ہے، بھگوان نے چاہا تو وہ لمبی عمر پائے گا۔

اس نے کھنکھار کر گویا اپنے آنے کا اعلان کیا۔ رنجیتا نے چونک کر اسے دیکھا اور شانتا

اور راجو سے کہا۔ ''تم باہر جاؤ۔ جب تک میں نہ بلاؤں، اندر نہ آنا۔''

راجو اور شانتا نظریں جھکائے ٹھاکر کے قریب سے گزر کر باہر چلی گئیں۔

''کیا بات ہے رنجو۔'' ٹھاکر نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ اسے آگے جانے اور بچے کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ نجانے کیا دیکھنے کو ملے۔

''اِدھر آئیں ناتھ۔''

ٹھاکر دھڑکتے دل سے بڑھا اور پنگھوڑے کے پاس پہنچ گیا۔

''اِدھر دیکھیں بچے کو۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

ٹھاکر نے بچے کو دیکھا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا اور سو رہا تھا۔ اس نے سکون کی سانس لی۔

''ٹھیک تو ہے۔ سو رہا ہے۔ تم پریشان کیوں ہو؟'' اس نے کہا۔

''اِدھر دیکھیں...... نچلے دھڑ کو۔''

تب ٹھاکر نے دیکھا کہ بچہ نیچے سے کھلا ہوا ہے اور پھر اس نے دیکھا اور گڑبڑا گیا۔

''یہ...... یہ کیا؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''بچہ ایسا پیدا تو نہیں ہوتا۔''

''ہاں۔ ایسا ہوتا نہیں۔ مگر مُسلوں کے ہاں بچے کو ایسا کر دیتے ہیں۔''

اس لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ اس پریشانی میں بھی ٹھاکر کو لفظ مسلا برا لگا۔ ''سنو رنجیتا، ہم لوگ نفرت سے، ان کی توہین کرنے کے لیے مسلمانوں کو ایسے پکارتے ہیں اب تم آئندہ کبھی یہ لفظ زبان پر نہ لانا۔''

ٹھاکرانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''دیکھو نا، ہمیں خواب میں جنھوں نے بڑی خبر دی، وہ مسلمان بزرگ تھے۔ پھر آج جس مجذوب سے میں ملا، وہ بھی مسلمان تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بھگوان کی اِچھا سے ہمارا اور ہمارے بیٹے کا مسلمانوں سے کوئی سمبندھ ہو گیا ہے۔ اب انھیں کبھی ایسے نہ پکارنا۔ کبھی برا نہ کہنا۔''

ٹھاکرانی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ ٹھاکر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ''مگر یہ......؟'' اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ہے؟''

دونوں چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر ٹھاکرانی نے کہا۔ ''بچے کو یہاں کون لایا تھا؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو مجذوب نے بتایا تھا کہ بچہ یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ اور اب یہی اس کا کمرا ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر اسے یاد آیا کہ جب اس نے مجذوب سے پوچھا تھا

کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے تو اس نے حویلی کی طرف اشارہ کیا تھا اور اس نے کہا تھا...... ہم تو خود خیر مقدم کے لیے یہاں آئے تھے۔ کچھ ضروری کام بھی تھے۔ نمٹا لیے۔ اب ہمیں جانا ہے۔ یہ تو ٹھاکر اب سوچ رہا تھا کہ وہ کون سے کام تھے جو مجذوب نے نمٹا لیے تھے۔ بچے کو اس کمرے میں پہنچانا...... شہد چٹانا...... اور...... اور...... ؟ اور پھر مجذوب نے یہ بھی کہا تھا...... بچے کی صورت دیکھ لی اور دعا بھی دے دی۔ ہم وہیں سے آ رہے ہیں...... تو یہ تو تھا کہ مجذوب یہاں آیا تھا۔ ''میرا خیال ہے رنجو کہ بچے کو مجذوب نے ہی یہاں پہنچایا تھا۔''

''تو ہو سکتا ہے، انھوں نے ہی......'' ٹھاکرانی نے جان بوجھ کر جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''پاگل ہوئی ہو۔'' ٹھاکر نے بگڑ کر کہا۔ ''کوئی ایسا کرتا تو کوئی نشان ہوتا، کٹا ہوتا، زخم ہوتا، اتنی جلدی ٹھیک تو نہیں ہو سکتا۔''

''میں تو اب بھی یہی کہوں گی۔'' ٹھاکرانی بولی۔ ''آپ بتائیں، آپ جب اس کمرے میں آئے تھے تو دروازے پر تالا تھا۔''

''ہاں۔ میں نے چابی سے تالا کھولا تھا۔ مگر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔''

''دیکھیں ناتھ۔ اگر وہ سب کی آنکھوں کے سامنے بچے کو اٹھا کر یہاں لا سکتے ہیں۔ تالا کھولے بغیر اسے اندر لا سکتے ہیں، تو یہ بھی کر سکتے ہیں، اچھا، ایک بات بتائیں۔ یہ کمرا تو برسوں سے بند تھا۔ یہاں تو گرد، مٹی ہوگی۔ مکڑی کے جالے ہوں گے۔ گھٹن ہوگی، اندھیرا ہوگا۔''

''ایسا کچھ نہیں تھا۔'' ٹھاکر نے کمرے کا نقشہ بیان کیا۔

''ہم اگر برسوں سے بند کسی کمرے کی صفائی کریں تو پورا دن لگ جائے۔ مگر یہ کمرا منٹوں میں صاف ہو گیا۔ تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ زخم منٹوں میں ٹھیک ہو جائے۔''

بات ٹھاکر کے دل کو لگی۔ لیکن پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''اچھا، تم راجو کو بلاؤ۔ میں اس سے بات کروں گا۔''

ٹھاکرانی نے آواز دی تو راجو اندر آ گئی۔ وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ ''راجو، تو کیا کہتی ہے اس معاملے میں۔'' ٹھاکر نے پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں مالک۔'' راجو گڑگڑائی۔

''تو جانتی ہے، میں کیا پوچھ رہا ہوں۔'' ٹھاکر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''اس میں میرا کوئی قصور نہیں مالک۔''

''وہ تو میں جانتا ہوں۔ تیرا کسی طرح بھی کوئی قصور نہیں۔'' ٹھاکر نے لہجہ نرم کر لیا۔

''بس میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ پیدا ہی ایسا ہوا ہے۔ یا بعد میں ایسا ہوا؟''

''مم...... مجھے...... مجھے معلوم نہیں ٹھاکر جی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تیرے ہاتھوں کی پیدائش ہے۔''

"وہ..... ٹھاکر جی..... میں نے تو اس بات پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔"

"جھوٹ بولتی ہے تو۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔" ٹھاکر کو غصہ آ گیا۔ "سچ بتا دے۔ نہیں تو میں تجھے شکاری کتوں کے آگے ڈلوادوں گا۔"

راجو تھر تھر کانپنے لگی۔ لگتا تھا، بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ "سچ بتا دے۔ تجھے کچھ نہیں ہوگا راجو۔" ٹھاکرانی نے اسے دلاسہ دیا۔

"مالکن..... اگر آپ کو وشواس نہیں ہوا تو؟" راجو نے کہا۔

"کیوں نہیں ہوگا وشواس۔ سچ بولے گی تو ضرور ہوگا۔"

"وہ جی بات ہی ایسی ہے مالکن۔ جیون گزر گیا اس کام میں۔ پر پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"صاف بات کر..... سیدھی بات۔" ٹھاکر نے ڈپٹ کر کہا۔

"سچ یہ ہے مالک کہ چھوٹے ٹھاکر ایسے ہی پیدا ہوئے تھے۔ میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ لیکن ٹھاکرانی کو غصہ آ گیا۔ "یہ تو پہلے بتانے والی بات تھی۔ تو نے چھپائی کیوں؟ ایسی بات چھپ سکتی ہے بھلا۔"

"ایک تو مجھے ڈر تھا کہ یہ بدشگونی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ ٹھاکر جی ناراض ہو کر مجھے کتوں کے سامنے نہ ڈلوادیں۔ اتنے برسوں کے بعد منتوں مرادوں کا بچہ ہے۔ پھر میں نے سوچا، مجھے انعام بھی نہیں ملے گا۔"

ٹھاکر مسکرایا۔ "تو تجھے انعام ملا یا نہیں؟"

"بہت ملا مالک۔ جھولی بھر کے ملا۔"

"نہیں۔ جھولی بھر کے تو اب ملے گا۔ کل تو آئے گی تو سچ مچ تیری جھولی بھر دوں گا۔" ٹھاکر نے کہا۔ پھر سخت لہجے میں بولا۔ "لیکن غور سے سن راجو۔ یہ بھگوان کی اِچھا تھی۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ ورنہ تیری خیر نہیں۔"

"میری زبان نہیں کھلے گی مالک۔ پر شانتا....."

"تو اس کی فکر نہ کر۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔" ٹھاکرانی نے کہا۔ "بس اب تو جا۔"

راجو چلی گئی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ اپنی اپنی سوچوں میں گم۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے کہنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے..... یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ ایک دن میں کتنا کچھ ہو گیا۔ مگر خیر..... جیون اکارت تو نہیں گیا۔ من کی سب سے بڑی مراد تو پوری ہوگئی۔

یہ سچی بات تھی۔ وہ اولاد پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے..... کچھ بھی!

چند منٹ بعد ٹھاکرانی نے آواز دے کر شانتا کو بلایا۔ "شانتا..... چھوٹے ٹھاکر کو کپڑے بدلا دے۔"

شانتا بچے کے پاس جا کر مصروف ہوگئی۔ ٹھاکرانی اور ٹھاکر مسہری پر آ بیٹھے۔ "سن شانتا، اس بات کا کبھی کسی سے نہ کہنا۔" ٹھاکرانی نے پکار کر کہا۔

شانتا نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ "کون سی بات مالکن؟"

"یہی والی بات..... چھوٹے ٹھاکر والی۔"

"مجھے تو ایسی کسی بات کا خود بھی پتا نہیں مالکن۔ اور جو بات مجھے نہیں پتا، وہ میں کسی کو کیسے بتا سکتی ہوں۔" شانتا نے معصومیت سے کہا۔

"اور سن۔ چھوٹے ٹھاکر کا یہ کام اب صرف تیرے ذمے ہے۔ پھر کبھی کسی کے سامنے ان کا گیلا سوکھا نہ کرنا۔"

شانتا بچے کو کپڑے پہنا کر مڑی۔ "مالکن، وہ حمیدہ دیدی آئی ہوئی ہیں۔"

"تو جا کر اسے بھیج دے اور گھنٹا دو گھنٹا سو جا۔ تب تک حمیدہ میرے پاس رہ لے گی۔"

"حمیدہ کون؟ جمال دین کی گھر والی؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

ٹھاکرانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شانتا کے جانے کے بعد ٹھاکر نے کہا۔ "رنجو، اکیلی شانتا تو بچے کو نہیں سنبھال سکے گی اور کوئی اور بچے کا کام کرے گا تو راز راز نہیں رہے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں ناتھ۔ تھوڑے دن کی تو بات ہے۔ راجو شانتا کا ہاتھ بٹا دے گی۔ ایک، دن میں میرے پاس رہے گی تو دوسری رات میں۔ اور پھر بعد میں تو میں اپنے راج دلارے کا ہر کام خود ہی کروں گی۔ کسی کو چھونے بھی نہ دوں گی اسے۔"

ٹھاکر مطمئن ہوگیا۔ مگر پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اس نے کہا۔ "اور کوئی بات تو نہیں رنجو..... پریشانی والی؟"

ٹھاکرانی ایک لمحے کو ہچکچائی۔ پھر بولی تو اس کے لہجے میں فخر تھا۔ "آپ کا بیٹا راج پوت ہے۔ بہت ضدی ہے۔ پتا ہے، اب تک میرا دودھ نہیں پیا ہے اس نے۔ بھوک سے تڑپ رہا ہوتا ہے۔ مگر دودھ کو منہ نہیں لگاتا۔ بس شہد پر گزارہ ہو رہا ہے۔"

"یہ تو پریشانی کی بات ہے۔ ایسا کب تک چلے گا۔ دودھ کے بغیر تو بچے کا گزارہ نہیں ہوتا۔" ٹھاکر پریشان ہوگیا۔

"بھگوان جانے....."

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ "آ جا حمیدہ۔" ٹھاکرانی نے پکارا۔

دروازہ کھلا اور حمیدہ اندر آئی۔ ٹھاکر کو دیکھ کر وہ جھجکی۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "مبارک

ہو ٹھاکر جی۔ بدھائی ہو مالکن۔"

ٹھاکر مسکرایا اور ٹھاکرانی نے شکریہ کہا۔ پھر پوچھا۔"تو اپنے بچے کو نہیں لائی؟"

"یہاں آتے ہوئے ان کے پاس چھوڑ آئی ہوں مالکن۔"حمیدہ نے محجوب لہجے میں کہا۔

"لے آتی تو اچھا تھا۔ اب اگر میں تجھے کچھ دیر روک لوں تو؟"

"آپ حکم کریں تو میں پوری رات رکی رہوں۔"حمیدہ نے بے ساختہ کہا۔

ٹھاکر اٹھ کھڑا ہوا۔"میں جا رہا ہوں ٹھاکرانی۔ مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ بری بات ہے۔"

"ٹھیک ہے ناتھ۔"

❁......❁......❁

حمیدہ کو بیٹھے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ بچہ بلک بلک کر رونے لگا۔"چھوٹے ٹھاکر اٹھ گئے۔"حمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔"دیکھوں...... گیلے تو نہیں ہو گئے۔" وہ اٹھ کر پنگھوڑے کی طرف چلی۔

ٹھاکرانی بوکھلا گئی۔"حمیدہ...... گیلا ہو تو تم ہاتھ نہ لگانا۔ میں آپ ہی بدل دوں گی۔" اس نے لہجے کو عام سا رکھنے کی کوشش کی تھی۔

حمیدہ کو اس کے لہجے کی وحشت نے حیران کر دیا۔ اس میں کیا حرج ہے کہ میں...... پھر اس نے سوچا۔ مالکوں کی باتیں مالک جانے۔ کیا پتا، کوئی دھرم کا معاملہ ہو۔ اس نے پنگھوڑے میں لیٹے بچے کو دیکھا اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ بہت خوب صورت بچہ تھا۔ پیشانی بہت کشادہ تھی۔ اس کی۔ نقوش کھڑے اور بہت پیارے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بلک بلک کر روئے جا رہا تھا۔ حمیدہ نے دیکھ لیا کہ وہ گیلا نہیں ہے۔

"چھوٹے ٹھاکر گیلے نہیں ہیں مالکن۔ بھوکے ہو رہے ہیں۔"اس نے ٹھاکرانی کو بتایا۔

"اٹھا کر لے آؤ۔ پھر کوشش کرتی ہوں۔ اب تک انھوں نے دودھ نہیں پیا ہے۔" ٹھاکرانی نے کہا۔

"یہ تو اچھی بات نہیں۔"حمیدہ نے بچے کو اٹھائے ہوئے کہا۔

بچے نے حمیدہ کی گود میں آتے ہی ہاتھ چلانے شروع کیے اور پھر اس کے ننھے ننھے ہاتھ حمیدہ کی چھاتیوں پر رک گئے۔ پھر جیسے وہ بار بار ہاتھ مار کر دودھ کا مطالبہ کرنے لگا"یہ تو صاف صاف دودھ مانگ رہے ہیں۔"حمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا اور دل میں سوچا، کتنے عقل مند ہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ابھی سے اتنی سمجھ ہے!

"اچھا شگون ہے۔ شاید اب دودھ پی ہی لیں۔"ٹھاکرانی نے ہاتھ پھیلائے۔

لیکن ٹھاکرانی کے ساتھ بچے کا رویہ اب بھی پہلے جیسا تھا۔ ٹھاکرانی اسے زبردستی اپنی طرف کرتی اور وہ پوری طاقت سے منہ موڑ لیتا۔ یہی نہیں۔ وہ بار بار پاس کھڑی حمیدہ کی طرف

ہاتھ بڑھاتا تھا۔

ٹھاکرانی کا چہرہ خفت سے تمتما اٹھا۔"پتا نہیں، کیا بات ہے۔ کوئی خرابی ہے میرے دودھ میں۔"

"یہ بات نہیں مالکن۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔"

بچہ اب چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ضد کر رہا ہے۔ اس نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔"حمیدہ...... اسے لے جا کر لٹا دے اور شہد چٹا دے۔ اس پر گزارہ ہو رہا ہے میرے بچے کا۔"

مگر حمیدہ نے جیسے ہی بچے کو گود میں لیا، بچہ یک لخت چپ ہو گیا۔ اس کے ننھے منے ہاتھ پھر حمیدہ کی چھاتیوں کو ٹٹولنے لگے۔ حمیدہ کا اپنا دودھ پیتا بچہ تھا۔ وہ ممتا سے بھری تھی۔ اس کا دل پگھلنے لگا۔ لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ بچے کو گود میں لیے وہیں کھڑی رہی۔

ٹھاکرانی کوئی بچی نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی۔ اس کا دل رنج اور حسد سے بھر گیا۔ میرا بچہ...... اور میرا دودھ ٹھکرا کر کسی اور کا دودھ مانگے۔ یہ کیسی توہین ہے ممتا کی۔ وہ سوچتی اور دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ چباتی رہی۔

ننھے منے ہاتھوں کی چھیڑ خانی نے ممتا سے لدی پھندی حمیدہ کو بے حال کر دیا۔ بچے پکاریں، دودھ مانگیں تو رکی ہوئی ممتا آتش فشاں کی طرح ہو جاتی ہے۔ اب مالکن کا رعب بھی حمیدہ کو باز نہ رکھ سکا۔ اس نے ملتجیانہ لہجے میں ٹھاکرانی سے کہا۔"چھوٹے ٹھاکر تو مجھ سے دودھ مانگ رہے ہیں۔"

ٹھاکرانی کا جواب بے حد مختصر اور فیصلہ کن تھا۔"اسے پنگھوڑے میں لٹا دے اور انگلی سے شہد چٹا۔"

حمیدہ کسی اور ہی کیفیت میں تھی۔ وہ بچے کو لپٹائے کھڑی رہی۔ پھر بولی۔"پلانے دیں نا مالکن۔"

"میں کہتی ہوں، لٹا دے اسے۔"اس بار ٹھاکرانی نے گرج کر کہا۔

حمیدہ کی کیفیت ختم ہو گئی۔ اس نے بڑی نزاکت سے بچے کو خود سے دور کیا۔ پھر اسے پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ بچے نے پھر رونا شروع کر دیا۔ ایک منٹ بعد تو یہ حال ہوا کہ اس کی چیخیں چھت پھاڑے ڈال رہی تھیں۔

"حمیدہ، اسے شہد چٹا۔"ٹھاکرانی نے پکارا۔

لیکن اس بار بچہ شہد میں ڈوبی ہوئی انگلی سے بھی منہ موڑ رہا تھا۔ بلکہ اس نے ایک اور ادا سیکھ لی تھی۔ اب وہ ہونٹ سختی سے بھینچ لیتا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ آگے کی سمت مسلسل کچھ تلاش کر رہے تھے۔ وہ ننھے ننھے ہاتھ اپنی منزل کو نہیں چھو سکتے تھے۔ لیکن کوشش کیے جا رہے تھے اور

حمیدہ ان کے معصوم لمس کو، ان کے جان دار مطالبے کو صاف اپنی چھاتیوں پر محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا۔

بچہ اتنے زور سے رو رہا تھا کہ اتنے فاصلے سے بات کرنا ممکن نہیں تھا۔ حمیدہ ٹھاکرانی کے پاس چلی گئی۔ ''مالکن...... چھوٹے ٹھاکر شہد بھی نہیں لے رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

ٹھاکرانی نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا اور جان لیا کہ وہ اس کے بچے کو دودھ پلانے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ حمیدہ نے بچے کو شہد چٹانے کی کوشش ہی نہیں کی ہے تاکہ وہ بچے کو اس سے دودھ پلوانے پر مجبور ہو جائے۔ راجپوت خون جوش مارنے لگا۔ پھر بھی اس نے تحمل سے کام لیا۔ معاملہ منتوں مرادوں والے بچے کا جی تھا۔

''مالکن مجھے دودھ پلانے دیں، نا۔'' حمیدہ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''سن حمیدہ، یہ جو دودھ ہوتا ہے نا، یہ اصل میں خون ہوتا ہے۔'' ٹھاکرانی نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ ''اور ہم راجپوت لوگ اپنے خون میں ملاوٹ کرنے سے اچھا مر جانے کو سمجھتے ہیں۔'' ٹھاکرانی کہہ تو گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے لرز گئی۔ یہ کیسی منحوس بات منہ سے نکالی ہے اس نے۔ اس بچے پر تو سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔

ادھر حمیدہ کچھ سننے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھی۔ وہ بولی۔ ''خدا کی قسم، میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی مالکن۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خون میں ملاوٹ تو ہو جائے گی نا۔''

اب کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ حمیدہ ٹھاکرانی کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہیں جیسے بھیک مانگ رہی تھیں۔

اُدھر بچے کی چیخیں، اِدھر حمیدہ کی نظریں...... ٹھاکرانی کا دل کٹنے لگا۔ بیک وقت دونوں چیزیں برداشت کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس نے حمیدہ سے کہا۔ ''تو اب گھر جا حمیدہ اور یہ بات کسی سے نہ کہنا۔''

''نہیں کہوں گی مالکن۔ مگر آپ ایک بار......'' بات پوری کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

''ٹھاکر کو پتا چل گیا کہ تو یہ چاہتی ہے تو وہ تیرا خون پی جائیں گے...... اور میرا بھی۔''

ٹھاکرانی نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ یہ سن کر حمیدہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ''بس اب تو جا اور جاتے ہوئے شانتا کو جگا دے۔ کہنا، میں بلا رہی ہوں۔''

حمیدہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ ٹھاکرانی نے اسے پکارا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''اور سن، جب تک میں خود نہ بلواؤں، حویلی میں قدم نہ رکھنا۔''

حمیدہ باہر نکل گئی۔ ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔ بچے کے رونے کی آواز سے اب

بھی اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ لیکن یہ اطمینان تھا کہ اب شانتا آ کر اسے شہد چٹائے گی اور وہ چپ ہو جائے گا۔ حمیدہ نے تو شہد چٹایا ہی نہیں۔

شانتا کمرے میں آئی تو ٹھاکرانی نے اس کی خوب خبر لی۔ ''کیسے سوتی ہے تو۔ برابر والے کمرے میں تھی اور چھوٹے ٹھاکر کے رونے کی آواز سے بھی تیری آنکھ نہیں کھلی۔''

''شما کر دیں مالکن۔'' شانتا نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور پنگھوڑے کی طرف چلی گئی۔ اس نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ ''چھوٹے ٹھاکر بھوکے ہیں مالکن۔''

''پتا ہے مجھے۔ شہد چٹا دے۔''

لیکن بچہ چپ نہیں ہوا۔ ایک منٹ بعد شانتا نے کہا۔ ''مالکن، چھوٹے ٹھاکر کی طرف انگلی بڑھاؤں تو ہونٹ بھینچ لیتے ہیں۔ شہد نہیں لے رہے ہیں۔''

ٹھاکرانی کو افسوس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ حمیدہ پر شک کیا، اسے جھوٹا سمجھا۔ اب کیا کیا جائے۔ ''اچھا...... یہاں میرے پاس لے آ چھوٹے ٹھاکر کو۔''

❁......❁......❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دیوان خانے میں تھا۔ پنڈت روپ سہائے اس کے سامنے، جنم کنڈلی پھیلائے، اس پر جھکا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔ ''پہلی بار ایسی جنم کنڈلی دیکھی ہے ٹھاکر جی۔ چھوٹے ٹھاکر بڑے بھاگوان ہیں۔'' اس نے ایسے موقعوں کے لیے رٹا رٹایا جملہ دہرایا۔ لیکن اس کا پہلا حصہ بالکل سچ تھا۔

''مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ پنڈت جی۔''

''زیادہ نہیں بتا سکتا ٹھاکر جی۔ میرا علم کم پڑ رہا ہے۔ یہ جنم کنڈلی تو میں اپنے گرو کو دکھاؤں گا۔ وہ زیادہ بتا سکیں گے۔'' پنڈت نے عاجزی سے کہا۔

''وہ تو جب بتائیں گے، تب بتائیں گے۔' ٹھاکر نے خشک لہجے میں کہا۔ ''جو تم بتا سکتے ہو، وہ تو بتاؤ۔ رکاوٹ کیا ہے آخر۔''

پنڈت نے گہری سانس لی اور ٹھاکر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''کبھی کوئی ایسی جنم کنڈلی بھی دکھائی دے جاتی ہے ٹھاکر جی، جس میں بڑے پیچ ہوتے ہیں۔ ستاروں کو کھوجنے نکلو تو اندھیرا نظر آنے لگتا ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہاں معاملہ الٹ ہے۔ روشنی اتنی ہے کہ آنکھیں چندھیا جائیں اور کچھ دکھائی نہ دے۔''

''پھر وہی گھماؤ پھراؤ والی بات۔'' ٹھاکر جھنجلا گیا۔

''جنم کنڈلی میں راج یوگ بھی ہے اور'' پنڈت کہتے کہتے رک گیا۔ اب وہ یوگ بتائے گا تو ٹھاکر کچھ سمجھ نہیں پائے گا۔ لہٰذا سیدھی سیدھی بات کی جائے۔ بتانے کو تو کچھ زیادہ ہے بھی نہیں۔ ''جنم کنڈلی بتاتی ہے کہ چھوٹے ٹھاکر بھگوان نہیں، پر بھگوان جیسے ہیں۔ اوتار نہیں، پر اوتار

جیسے ہیں۔ وہ راجہ بھی ہوں گے اور فقیر بھی۔ وہ سب کچھ ہوگا ان کے پاس، جس کی انھیں پروا نہیں ہوگی اور جو وہ چاہیں گے، اس کے لیے انھیں بڑی تپسیا کرنی ہوگی۔ بڑا کشٹ اٹھانا ہوگا۔ کنڈلی بتاتی ہے کہ وہ کچھ کھوجتے، کچھ ڈھونڈتے پھریں گے۔ وہ جو ارادہ کرلیں گے، اس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ان کے جیون کی کہانی پریم کہانی ہوگی۔ اور......اور......'' پنڈت ہچکچانے لگا۔

''بتاؤ مجھے۔ بےفکر ہوکر بتاؤ۔''

''آپ کے جیون میں چھوٹے ٹھاکر کی وجہ سے بڑی کٹھنائیاں آئیں گی۔ اور...... اور......''

''اور کیا؟'' ٹھاکر نے بےتاب ہوکر پوچھا۔

''اور آپ اپنا جیون ان کی بھینٹ کردیں گے۔''

ٹھاکر تو اب بھی بچے پر اپنا جیون بھینٹ کرنے کو تیار تھا۔ اس نے بغیر کسی تردد کے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ پر بھاگیہ کا تو بتاؤ۔''

''بھگوان نے بڑی شکتی دی ہے چھوٹے ٹھاکر کو۔ ان کے بھاگیہ کا کوئی نہیں بتا سکتا۔ وہ اپنا بھاگیہ آپ لکھیں گے۔ جو چاہیں گے، لکھیں گے اور وہی کچھ ہوگا بھی۔''

''تم نے بتایا تو کچھ بھی نہیں۔'' ٹھاکر نے شکایتی لہجے میں کہا۔

پنڈت نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔ گروجی کو لاؤں گا آپ کے پاس۔''

''اچھا کوئی شبھ نام تو نکال دو میرے پتر کا۔''

''ٹھاکر اوتار سنگھ سے شبھ نام کوئی نہیں۔ اگر چھوٹے ٹھاکر سوئیکار کرلیں تو......''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''ان کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلے گی ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر کو نام اچھا لگا تھا۔ اس نے مسخرے پن سے کہا۔ ''اچھا۔ میں ان سے پوچھ لوں گا۔ وہ مجھے انکار نہیں کریں گے۔''

ٹھاکر نے پنڈت کو اتنا دیا کہ وہ خوش ہوگیا۔ پنڈت کے جانے کے بعد ٹھاکر بیٹے کے پاس جانے کو بےتاب ہوگیا۔ رات وہ دیر سے سویا تھا۔ صبح اٹھتے ہی وہ اس کے درشن کرنا چاہتا تھا لیکن پنڈت کو آنا تھا۔ وہ یہ سوچ کر رک گیا کہ اب بچے کے پاس اس کا نام لے کر ہی جائیں گے۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کا جسم اور دماغ شل ہورہا تھا۔ اتنی بڑی خوشی نہ ہوتی تو اس وقت اس کے چڑچڑے پن سے حویلی کے نوکر لرزتے پھر رہے ہوتے۔

وہ دیوان خانے سے نکلا اور ٹھاکر اوتار سنگھ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ دور سے ہی اسے اس کے رونے کی آواز سنائی دی۔ یہ کیا؟ ٹھاکر نے خود سے کہا۔ چھوٹے ٹھاکر اتنی بری طرح

کیوں رو رہے ہیں۔ کیا ابھی سے ضد شروع کردی ہے؟

❁......❁......❁

ٹھاکرانی اور شانتا ایک پل بھی نہیں سو سکی تھیں۔ رات بھر جاگتی رہی تھیں۔ اس لیے کہ بچہ رات بھر روتا رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی شہد قبول نہیں کیا تھا۔ ٹھاکرانی نے کئی بار اسے دودھ پلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر ناکام رہی۔ آخر اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے سوچا، شاید بات بن جائے۔

اس نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلو میں چھپا لیا۔ پھر وہ نیچے قالین پر بیٹھ گئی...... وہیں جہاں حمیدہ بیٹھی تھی۔ پھر اس نے شانتا سے کہا کہ وہ بچے کو لاکر اس کی گود میں دے دے۔

اس کا خیال تھا کہ ناسمجھ بچہ دھوکہ کھا جائے گا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ بچے نے دودھ کو منہ بھی نہیں لگایا۔

ننھے بچے میں جان ہی کتنی ہوتی ہے۔ پھر وہ بچہ جس نے بارہ گھنٹے سے کچھ کھایا ہی نہ ہو۔ مگر راجپوت بچہ تھا۔ اپنی طاقت سے بڑھ کر روتا رہا۔ کوئی اور بچہ ہوتا تو اب وہ بہت پہلے نڈھال ہوکر چپ ہوچکا ہوتا۔

ٹھاکرانی کے لیے وہ بڑی کشمکش کی رات تھی۔ بچے کے رونے سے اس کے دل پر چوٹ لگتی۔ کلیجے سے ہوک اٹھتی۔ بےبسی کے احساس نے اسے اور نڈھال کردیا تھا۔ دودھ کی کمی نہیں تھی۔ مگر ضدی بچہ دودھ قبول نہیں کررہا تھا۔ بھوک سے روئے جارہا تھا۔ اور وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ ہر پل وہ یہی سوچتی کہ بھوک سے بچے پر کیا گزر رہی ہوگی۔ کہتے ہیں کہ کوئی کسی سے کتنی ہی محبت کرتا ہو، اس کی تکلیف کا اندازہ نہیں کرسکتا کیونکہ اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے لیکن ماں اس کلیے سے مستثنیٰ ہے۔ بچے کو جتنی تکلیف ہوتی ہے، ماں اس سے بڑھ کر قیاس کرتی، اس سے بڑھ کر محسوس کرتی اور اس کے بارے میں سوچ کر اس سے زیادہ اذیت اٹھاتی ہے۔ اسی لیے تو اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ صبح ہوتے ہوتے ٹھاکرانی بچے سے بڑھ کر نڈھال ہوگئی۔

روتے روتے بچے کا گلا بیٹھ گیا۔ اس میں رونے کی طاقت ہی نہیں رہی۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ ٹھاکرانی نے اس کی نیند گہری ہونے کا انتظار کیا۔ پھر خود جاکر اپنی انگلی شہد میں ڈبوئی اور اس سے ہونٹوں پر دباؤ ڈالا۔ ننھا سا منہ کھلا۔ بھوکا بچہ سوتے میں تو مزاحمت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن شہد کا ذائقہ ہی دہن میں اترا، وہ جاگ گیا، اور لگا پھر چنگھاڑنے۔ ٹھاکرانی نے پھر شہد چٹانا چاہا۔ لیکن بچہ پھر اکڑ گیا تھا۔

اس ایک رات میں ٹھاکرانی ماتا کے ہر مرحلے سے گزر گئی۔ ابتداء میں وہ بائیس برس کے طویل انتظار کے بعد نوازی جانے والی وہ ماں تھی، جس میں عورت کی پوری تنگ نظری موجود تھی۔ جو اپنا اعزاز کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ محرومی کے احساس سے چور تھی کہ اس

کے بچے نے اس کی ماما کا پہلا تحفہ ہی قبول نہیں کیا تھا۔اور وہ ایک اور عورت سے دودھ مانگ رہا تھا اور وہ عورت نہ صرف غیر تھی بلکہ مسلمان تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسے اپنے بچے کو دودھ پلانے دیتی۔وہ تو کسی کو بھی یہ اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

سو پہلے مرحلے میں وہ اس بات کو قبول نہیں کر سکی تھی۔مگر پھر اسے احساس ہوا کہ بچہ بھوکا ہے اور اگر یہ صورتِ حال جاری رہی تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔اس احساس کے بعد پہلے تو وہ گھبرائی۔ یہ تصور اس کے لیے جان لیوا تھا کہ بچے کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔یہ بات سمجھ میں آئی کہ بات کو وہاں تک پہنچنے سے روکنا ہے۔اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔وہ یہ توہین بھی گوارا کر سکتی ہے کہ اس کا بچہ اس کا دودھ ٹھکرا رہا ہے۔کوئی بھی...... ہاں کوئی بھی اسے دودھ پلا دے۔بس اس کا پیٹ بھر جائے اور وہ جیتا رہے۔عورت اپنے شوہر کی سیج نہیں سجا سکتی۔اپنے اوپر سوکن نہیں لا سکتی۔لیکن وہ بچے کے لیے یہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی...... بلکہ مصر تھی۔تو اب اپنے بچے کی زندگی بچانے کے لیے اسے اس کی من پسند ماں نہیں دے سکتی! اسے دودھ نہیں دلا سکتی اس کا! کیوں نہیں۔بس اس کا بچہ جیتا رہے۔چاہے کسی اور کا بچہ بن کر جیے۔چاہے اسے ماں بھی نہ کہے۔

مگر بچہ ایک مسلمان عورت کا دودھ مانگ رہا تھا۔اس کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔کوئی بات نہیں۔یہ بھی سہی۔بس وہ زندہ رہے۔اس کے زندہ رہنے کی زیادہ اہمیت ہے۔چاہے وہ اُدھرمی بن کر جیے۔راجپوت کہتا ہے، جان چلی جائے پر آن نہ جائے اور راجپوت ماں ہو تو کہتی ہے کہ آن بے شک چلی جائے، بچے کی جان نہ جائے۔

اس کی سوچ پتا نہیں کب بدل گئی۔اس کا ننھا سا بچہ ہندو بعد میں ہے، راجپوت بعد میں ہے۔سب سے پہلے بس وہ اس کا بچہ ہے۔یہ بنیادی بات ہے۔اس کی زندگی پر، اس کی زندگی کے لیے سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔

اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ابھی حمیدہ کو بلاتی اور بچے کو اس کی گود میں دے کر کہتی کہ اسے پیٹ بھر کر دودھ پلا دے۔لیکن اس کے پاس یہ اختیار نہیں تھا۔فیصلہ بچے کے باپ کو کرنا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ کیا فیصلہ کرے گا۔ فیصلہ تو وہ بعد میں کرے گا۔ پہلے تو وہ یہ سوچنے پر اس کی گردن اُڑا دے گا۔وہ آن والا راجپوت ہے اور ماں نہیں ہے۔

ابتداء میں وہ خوف زدہ تھی۔اس میں ٹھاکر سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ پھر بچے کی چیخوں کی پے در پے...... نے اسے طاقت دے دی۔اس نے سوچا، نتیجہ کچھ بھی ہو، وہ صبح ٹھاکر سے بات ضرور کرے گی اور اگر ٹھاکر نہ مانا تو بچے کی جان بچانے کے لیے چپکے سے وہ کچھ کر گزرے گی، جو اسے کرنا چاہیے۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ چونکی اور دروازے کی سمت دیکھا۔ٹھاکر کمرے میں داخل

ہوا۔اس نے نہ ٹھاکرانی کو دیکھا، نہ نمسکار کرتی ہوئی شانتا پر نظر ڈالی۔وہ سیدھا پنگھوڑے کی طرف گیا۔ٹھاکرانی نے شانتا کو آنکھ کا اشارہ کیا۔شانتا کمرے میں چلی گئی۔

ٹھاکر نے ایک نظر روتے ہوئے بچے کو دیکھا۔پھر ٹھاکرانی کی طرف مڑا۔"میں اسے گود میں لے سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

ٹھاکرانی نے حیرت سے اسے دیکھا۔"ایسے کیوں کہہ رہے ہیں؟ آپ پِتا ہیں اس کے۔"

ٹھاکر جھینپ سا گیا۔"اتنا چھوٹا سا ہے نا۔لگتا ہے، میری گود میں دب نہ جائے، کوئی نقصان نہ ہو جائے اسے۔ڈر لگتا ہے اس سے۔"

"جی نہیں۔دیکھنے میں چھوٹا سہی۔ پر راج پوت بچہ ہے۔" ٹھاکرانی کے لہجے میں فخر تھا۔"اور باپ کی گود کی سختی سے بھی بچوں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔"

"رنجو...... تم اسے میری گود میں دے دو ذرا۔"

ٹھاکرانی اٹھ کر اس طرف گئی۔اس نے بچے کو نزاکت سے اٹھا کر ٹھاکر کی گود میں دے دیا۔

ٹھاکر نے بچے کو غور سے دیکھا۔"کیا بات ہے ٹھاکر اوتار سنگھ جی۔کیوں روئے جا رہے ہیں آپ؟ کوئی ضد کر لی ہے کیا؟" ٹھاکر نے بچے سے کہا۔تو یہ ہے میرے بچے کا نام......اوتار سنگھ! پیارا نام ہے۔ٹھاکرانی نے سوچا، دل میں عجیب سی خوشی جاگی۔"ہاں ناتھ۔آپ کے ٹھاکر اوتار سنگھ ابھی دو دن کے ہوئے نہیں ہیں اور انھوں نے ضد بھی شروع کر دی ہے۔" اس نے کہا۔

ٹھاکر نے حیرت سے اسے دیکھا۔وہ خود تو جنم کنڈلی کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔مگر رنجو یہ بات کیوں کہہ رہی ہے۔اتنا سا بچہ ضد کیسے کر سکتا ہے۔یہ تو ان ہونی ہے۔"کیسی ضد؟" اس نے پوچھا۔

"بیٹھ کر سکون سے سنیں تو بتاؤں۔" ٹھاکرانی بولی۔

❁......❁......❁

جمال دین نے عادت کے مطابق چنگیر پیچھے ہٹائی اور بیوی کو پکارا۔"حمیدہ...... برتن اٹھا لو۔"

روز حمیدہ اس کی ایک آواز پر برتن سمیٹنے کے لیے آ جاتی تھی لیکن اس روز ایسا نہیں ہوا۔جمال دین چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔مگر کب تک؟ جھوٹے برتن پھیلے ہوئے اسے بہت برے لگتے تھے۔وہ انھیں برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔پھر اسے چلم کی طلب بھی ہو رہی تھی۔ جب تک دو کش نہ لے لیتا، اس کا ناشتہ مکمل ہی نہیں ہوتا تھا۔اس نے پھر آواز لگائی۔"حمیدہ، او بھئی حمیدہ، کہاں ہو۔یہ برتن اٹھا لو نا۔"

حمیدہ تو اب بھی نہیں آئی لیکن کمرے کی طرف سے اس کی آواز آئی۔"آتی ہوں جی۔ ابھی آتی ہوں۔"

''ایسا کیا کر رہی ہو اس وقت؟'' جمال دین کو حیرت ہوئی۔ برسوں کا بنا معمول آج پہلی بار ٹوٹا تھا۔

ایک لمحے جھجکتی سی خاموشی رہی۔ پھر حمیدہ نے پکارا۔ ''وصال کو ناشتہ کرا رہی ہوں جی۔ ابھی آتی ہوں۔''

اس جواب نے جمال دین کی الجھن دور نہیں کی۔ بلکہ اس کی الجھن اور حیرت اور بڑھا دی۔ حمیدہ بہت اچھی عورت اور بہت اچھی بیوی تھی۔ عقل مند، محبت کرنے والی اور خیال رکھنے والی۔ چھ سال بعد اللہ نے انہیں اولاد سے نوازا تھا۔ اتنے عرصے کے بعد اولاد ہو تو عورتیں ان کے لیے پاگل ہو جاتی ہیں۔ مگر حمیدہ ایسی نہیں تھی۔ اس کا اصول تھا کہ بچہ شوہر سے ہے، نہ کہ شوہر بچے سے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ہر معاملے میں شوہر کو بچے پر فوقیت دیتی تھی۔ پہلے اس کی ضرورت پوری کرتی، پھر بچے کی فکر کرتی۔ صبح بھی یہی ہوتا تھا۔ جمال دین اور بچہ، دونوں ایک ہی وقت اٹھتے تھے۔ حمیدہ ان دونوں سے پہلے اٹھتی تھی۔ سب سے پہلے وہ بچے کو صاف ستھرا کرتی، اس کے کپڑے بدلا دیتی۔ یہ اس لیے کہ وہ خود ہاتھ منہ نہیں دھو سکتا تھا۔ پھر وہ خود ہاتھ منہ دھوتی اور ناشتہ بنانے لگتی۔ اس دوران وہ دونوں اٹھ جاتے تھے۔ وہ جمال دین کو ناشتہ دیتی، اس کے لیے چلم تیار کرتی۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوتا تو وہ برتن سمیٹتی اور اس کے سامنے چلم لا کر رکھ دیتی۔ اس کے بعد وہ بچے کی طرف توجہ دیتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ جمال دین ناشتہ کر رہا ہے اور بچہ رونے لگا ہے۔ تو برتن سمیٹنے کے انتظار میں کھڑی حمیدہ لپک کر اندر جاتی اور بچے سے کہتی...... بے صبرا پن نہ کر وصال۔ ابھی تیرے ابا ناشتہ کر رہے ہیں۔ ان سے پہلے تجھے ناشتہ نہیں مل سکتا۔ چپ کر جا اور وہ فوراً باہر آ جاتی لیکن اس کے انگ انگ سے بے چینی اور اضطراب ٹپکتا۔ وہ ٹہل نہیں رہی ہوتی۔ بلکہ ساکت کھڑی ہوتی لیکن اس کا جسم پھڑکتا، جیسے وہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل رہی ہو۔ جمال دین کہتا...... ''جاؤ حمیدہ، دودھ پلا دو وصال کو......، اور حمیدہ کہتی...... نا جی نا۔ آپ فارغ ہو جاؤ۔ پھر اسے ناشتہ ملے گا۔''

بچہ روتا رہتا اور جمال دین کا دل کٹنے لگتا۔ ''پلا دو نا۔ اتنا چھوٹا بچہ ہے۔ معصوم ہے ابھی۔''

''ابھی سے سکھانا پڑے گا۔ تبھی تو سمجھے گا کہ باپ بڑا ہوتا ہے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے بعد سب سے بڑے درجے والا۔''

جمال دین کو اپنی بیوی کی عقل پر فخر محسوس ہوتا۔ اسے یقین ہو جاتا کہ اس کے بیٹے کی تربیت بہت اچھی ہوگی۔ وہ سعادت مند اور فرماں بردار اٹھے گا۔ اندر بچہ روتا رہتا۔ باہر حمیدہ پہلو بدلتی، کسمساتی۔ لیکن اس کے قدم کبھی کمرے کی طرف نہ اٹھتے۔ جمال دین جلدی سے ناشتہ بھگتاتا۔ تاکہ حمیدہ فارغ ہو جائے۔ وہ چنگیر پرے ہٹا دیتا۔ حمیدہ برتن سمیٹتی، اسے چلم لا کر دیتی،

پھر بے تابی سے کمرے کی طرف لپکتی۔ چند لمحے بعد کمرے کی طرف سے اس کی محبت میں لپٹی آواز سنائی دیتی۔ وہ دودھ پیتے ہوئے بچے کو ڈانٹ رہی ہوتی۔ ''وصال دین، آپ بہت برے بچے ہو۔ اپنے ابا کو ٹھیک سے ناشتہ بھی نہیں کرنے دیتے۔ بے صبرے کہیں کے۔ اگلی بار ایسا کرو گے تو آپ کی پٹائی ہوگی۔ اور دودھ بھی نہیں ملے گا آپ کو۔''

جمال دین نے حیرت سے سامنے پڑے برتنوں کو دیکھا۔ آج اتنے دنوں کے بعد ایسا کیا ہو گیا کہ حمیدہ اس کے ناشتہ کرنے کے دوران وصال کو دودھ پلانے لگی ہے۔ یہ تبدیلی کیسی؟ کیا مطلب ہے اس کا؟ ضرور کوئی بڑی بات ہے اس کے پیچھے۔

اچانک جمال دین کو دھندلی دھندلی سی پچھلی رات یاد آنے لگی۔ دھندلی اس لیے کہ اس وقت وہ نیند میں تھا۔

اس لمحے خجل خجل سی حمیدہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے خاموشی سے برتن سمیٹے۔ پھر وہ بولی تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ ''معاف کر دینا جی۔ وہ وصال بھوکا ہو رہا تھا، اس لیے......''

''میں نے تو اس کے رونے کی آواز نہیں سنی۔'' جمال دین بولا۔

''رونے سے پہلے بچوں کا پیٹ بھر دینا چاہیے۔''

''لیکن پہلے وہ روتا تھا، تب بھی تم اسے دودھ نہیں دیتی تھیں۔'' جمال دین نے اعتراض کیا۔

''غلطی کرتی تھی جی۔ اب نہیں کروں گی۔'' حمیدہ نے بڑے وثوق سے کہا۔ پھر وہ اس کے لیے چلم لے آئی۔ ''یہ لو جی۔''

جمال دین نے چلم سنبھالی اور ایک کش لیا۔ پھر کچھ سوچتے اور دھواں چھوڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''وصال دین کیا کر رہا ہے حمیدہ؟''

''سو رہا ہے جی۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تم یہاں بیٹھو تھوڑی دیر۔''

حمیدہ پلنگ کے پائینتی والی پٹی پر ٹک گئی۔ جمال دین نے دوسرا کش لیا اور پچھلی رات کو یاد کیا۔ دھندلی دھندلی سی یاد پھر تازہ ہونے لگی۔ اس نے ایک اور کش لیا اور بولا۔ ''تم رات کو ٹھیک سے نہیں سوئی تھیں حمیدہ۔''

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''سوئی تو تھی۔ بس ذرا بے چینی سی تھی۔''

''تم بار بار اٹھ کیوں رہی تھیں؟''

''دودھ پلانے کے لیے۔''

جمال دین کی یاد کا دھندلا پن ذرا کم ہوا۔ ہاں واقعی...... حمیدہ بار بار بچے پر جھک رہی

تھی۔ تو وہ دودھ پلانے کے لیے تھا..... مگر بار بار؟ اس کی الجھن اور گہری ہوگئی۔ ''بچے کو اتنی بار دودھ تو نہیں پلاتے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ دور ہی نہیں ہوتی تھی کسی طرح۔''

''بے چینی! کس بات کی؟''

''مجھے لگتا تھا کہ میرا بچہ مجھ سے ناراض ہے۔ بہت بھوکا ہے اور رو رہا ہے۔''

جمال دین کو ایک اور دھندلی سی بات یاد آئی۔ حمیدہ رات بچے سے کہہ رہی تھی...... وصال دین، میرے بچے، مجھ سے کبھی ناراض نہ ہونا۔ دودھ سے منہ نہ موڑنا کبھی۔ ''لیکن حمیدہ، وصال رو تو نہیں رہا تھا۔ بھوکا تو نہیں تھا۔''

''وہ تو نہیں تھا جی۔ مگر مجھے تو ایسا ہی لگ رہا تھا نا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بچہ بھوک سے تڑپے اور دودھ نہ پیے تو ماں کیسے سو سکتی ہے۔''

''مگر جب ایسا نہیں تھا تو پھر؟ تم پگلی ہو حمیدہ۔''

جمال دین چلم ٹھنڈی کر کے اٹھا۔ اسے زمین پر جانا تھا۔ اس کے جانے کے بعد حمیدہ بیٹھی سوچتی رہی۔ چھوٹے ٹھاکر کی صورت اس کی نگاہوں میں پھر رہی تھی۔ کیسے وہ اس سے دودھ مانگ رہے تھے۔ کیسے چھو رہے تھے اسے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ مجھی سے کیوں..... اپنی ماں سے کیوں نہیں۔ اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس لمحے میں میں جیسے سچ مچ ان کی ماں بن گئی اور وہ میری اولاد بن گئے۔ تبھی تو رات بھر بے چینی رہی۔

اور چھوٹے ٹھاکر نے اسے چھونے کے بعد شہد بھی نہیں لیا تھا۔ تو اب کیا ہوگا؟ کیا وہ بھوکے ہوں گے؟ رات بھر بھوکے رہے ہوں گے؟ مگر نہیں...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ننھی سی جان اتنا تو برداشت نہیں کر سکتی۔ چھوٹا سا بچہ اتنی ضد نہیں کر سکتا۔ مگر اس کی بے چینی اسے کچھ اور ہی بتا رہی تھی۔

اور یہ کیسا تعلق تھا۔ ایک اجنبی نوزائیدہ بچہ اس کی گود میں آیا... ننھا بے زبان بچہ... اور اس سے دودھ مانگنے لگا اور وہ یوں تڑپ گئی، جیسے سچ مچ اس کی ماں ہو جبکہ یہ بے حد خطرناک تعلق تھا۔ کہاں ٹھاکر، گاؤں کا مالک، اور کہاں وہ، ان کی رعایا۔ یہ تو ان کی مہربانی تھی کہ انھوں نے زیر کاشت زمین ان کے نام کر دی تھی اور پھر سب سے بڑا فرق تو مذہب کا تھا۔ لیکن تعلق جڑتا ہے تو یہ سب سوچنے کی مہلت کہاں ملتی ہے۔

وصال جاگا تو وہ اس کے پاس گئی۔ اس کی ضرورتیں پوری کیں۔ پھر اسے گھر میں چلنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ابھی وہ گھٹنوں چل رہا تھا۔ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر ابھی اس کے چلنے میں کچھ دیر تھی۔

وہ ٹہلتی اور سوچتی رہی کہ حویلی میں کیا ہو رہا ہوگا۔ ٹھاکرانی نے اسے وہاں آنے سے منع

کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر بچے نے دودھ نہ پیا تو اسے بلوا لیا جائے گا۔ اور بلوائے نہ جانے کا مطلب یہی ہوگا کہ بچے نے دودھ پی لیا ہے۔

جمال دین گھر واپس آیا تو حمیدہ کو احساس ہوا کہ بہت دیر ہوگئی ہے۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ دھوپ چڑھ آئی ہے۔ اس نے ابھی تک کھانے کی فکر بھی نہیں کی تھی۔ اس نے خود تو ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ بھوک ہی نہیں تھی۔ اسے تو بس چھوٹے ٹھاکر کی بھوک کا خیال ستا رہا تھا۔

وہ باورچی خانے میں گئی۔ تھالی میں دال اور چاول نکالے اور انھیں چننے بیٹھ گئی۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی اور حویلی سے اس کا بلاوا نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا...... اپنی مایوسی نے اسے خود بھی حیران کر دیا۔ اسے احساس ہوا کہ اب زندگی کی سب سے بڑی خوشی اس کے لیے چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانا ہے۔

بظاہر وہ مایوس تھی۔ لیکن شاید اندر اسے کچھ اور یقین تھا۔ وہ دال چاول چنتے چنتے اٹھ کر دروازے پر جاتی کہ کہیں بلاوا تو نہیں آ گیا۔ ہر بار وہ تھکے قدموں سے باورچی خانے میں واپس آ جاتی۔ آخر اس نے دال چاول پکنے کے لیے چڑھا دیے۔

جمال دین کو اس کا بار بار دروازے پر جانا غیر معمولی لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''حمیدہ، کوئی آنے والا ہے کیا؟''

''نہیں جی۔ پر صبح سویرے منڈیر پر کاگا بولا تھا۔''

تھوڑی دیر بعد جمال دین نے پکارا۔ ''حمیدہ، وصال گندا ہو رہا ہے۔ اسے صاف کر دو۔''

حمیدہ نے بچے کو دھلایا۔ کپڑے بدلوائے اور پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔ کھانا تیار ہو گیا تھا۔ ''سنیں جی، کھانا تیار ہے۔'' اس نے پکارا۔

''تھوڑی دیر بعد کھاؤں گا۔''

اسی لمحے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ جمال دین باہر گیا۔ حمیدہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ جلدی سے کمرے میں گئی اور کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ باہر آئی تو جمال دین اندر آ رہا تھا۔ ''تمھیں ٹھاکرانی نے بلایا ہے حمیدہ۔'' اس نے کہا۔

''آپ کھانا کھا لینا جی۔ اور بچے کا خیال رکھنا۔ میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔'' اس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

❀......❀......❀

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے بڑے تحمل سے پوری روداد سنی۔ پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ ''تمہارا مطلب ہے، ہمارا بچہ حمیدہ کا دودھ پینا چاہتا ہے؟''

''ہاں ناتھ۔ حمیدہ کی گود میں جانے کے بعد سے اس نے شہد بھی نہیں لیا ہے۔ رو رو کر

بے حال ہوگیا ہے۔“

ٹھاکر کے ماتھے پر ناگواری کی سلوٹیں ابھر آئیں۔ ”ایسا کبھی نہیں ہوسکتا ٹھاکرانی۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

ٹھاکرانی کا دل لرزنے لگا۔ وہ ٹھاکر کا مزاج پہچانتی تھی۔ اس کا اکیلے میں ٹھاکرانی کہہ کر پکارنا اس بات کی دلیل تھا کہ اس وقت وہ غصے میں ہے۔ اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ناتھ، یہ بات آپ سے بڑھ کر میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ آپ جس وجہ سے غصہ کر رہے ہیں، وہ میرے پاس بھی ہے اور میرے پاس غصے کی وہ وجہ بھی ہے، جو آپ کے پاس نہیں۔“

ٹھاکر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

”دیکھیں، میں اوتار سنگھ کی ماں ہوں۔ بھگوان نے مجھے دودھ بھی دیا ہے، اور یہ میرا ارمان بھی ہے۔ لیکن چھوٹا وہ دودھ نہیں پی رہا ہے کچھ اور مانگ رہا ہے۔ یہ میری بے عزتی ہے۔ میری ممتا کی بے عزتی۔ مجھے اس کا دکھ بھی ہے اور سوچ کر غصہ بھی آتا ہے۔ پر......“

”پوری بات کرو۔“

”رات گزر گئی۔ چھوٹے کے پیٹ میں کچھ بھی نہیں گیا۔ ننھا بچہ ہے۔ ایسے تو نہیں چلے گا؟“

ٹھاکر نے اسی بات پر غور کیا۔ بچے کا چہرہ وہ دیکھ چکا تھا۔ اب پہلی بار اس نے بیوی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت کمزور اور نڈھال لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ ظاہر ہے، وہ رات بھر نہ صرف جاگی تھی۔ بلکہ پریشان بھی رہی تھی۔ چنانچہ اس نے لہجہ نرم رکھتے ہوئے کہا۔ ”سنو رنجو، تم جلد بازی میں فیصلہ کر رہی ہو۔ ممکن ہے، تمھارے دودھ میں کڑواہٹ ہو، جو بعد میں دور ہو جائے۔ ایسے میں بچہ جس کی گود میں بھی جائے گا، اس سے دودھ تو مانگے گا نا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف حمیدہ کا دودھ چاہتا ہے۔“

ٹھاکرانی کو ٹھاکر کی بات معقول لگی۔ ”پھر آپ کیا بولتے ہیں؟“

”دیکھو، بغیر بتائے اسے دوسری عورتوں کی گود میں دے کر دیکھو۔ ہم کسی راجپوت عورت سے اسے دودھ پلوا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ دوسرے میں ابھی جا کر شہر سے ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں کہ حل نہ ہو سکے۔“

ٹھاکرانی کی ڈھارس بندھی۔ ”کچھ بھی ہو۔ میرے بچے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“

”بائیس سال بعد یہ پھول کھلا ہے۔ میں اسے مرجھانے تو نہیں دوں گا۔“

ٹھاکر شہر چلا گیا۔ اسی دوران ٹھاکرانی نے تمام تجربے کر لیے۔ دائی راجو کی بنائی ہوئی دوا وہ پہلے ہی لے چکی تھی۔ بچے کو بچوں والی بیسیوں عورتوں کی گود میں دے کر دیکھ لیا گیا۔ مگر اس نے کسی سے دودھ نہیں مانگا۔ وہ بس روئے جا رہا تھا۔ روتے روتے نڈھال ہو جاتا تو اس کی آواز بند ہو جاتی۔ اس دوران اس نے بس ایک بار ذرا سا شہد چاٹا تھا۔ ورنہ وہ بھوکا ہی تھا۔

ٹھاکر شہر سے آیا تو اس کے ساتھ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ ڈاکٹر جولیا نے بچے کا معائنہ کیا اور بولی۔ ”یہ بہت کمزور ہوگیا ہے بھوک سے۔ آپ ایسا کریں کہ اسے بکری کا دودھ دیں۔ نہ لے تو گائے اور بھینس کا دودھ آزمائیں...... لیکن پانی ملا کر۔ آدھا دودھ آدھا پانی اور اس دوران میں ٹھاکرانی کا دودھ لے جا کر لیبارٹری میں ٹیسٹ کراؤں گی۔ آپ میرے ساتھ چلیے گا۔“ یہ تخاطب ٹھاکر سے تھا۔

ٹھاکر ڈاکٹر کے ساتھ چلا گیا ادھر بچہ ہر ترکیب کو ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے کسی دودھ کو بھی منہ نہیں لگایا۔ ہر بوتل کو پرے کر دیا اور جب تک اس میں رونے کی طاقت ہوتی تھی، وہ روتا رہتا تھا۔ ٹھاکرانی نے ایک نوکر کو شہر دوڑایا تاکہ وہ ٹھاکر کو صورتِ حال بتا سکے۔

آخر دوپہر کے قریب ٹھاکرانی نے حمیدہ کو بلوا لیا۔ اس کی آمد سے پہلے ٹھاکرانی نے حیلے بہانے سے سب لوگوں کو کمرے سے ہٹا دیا تھا۔

حمیدہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے سے، جسم کی ہر حرکت سے، ہر عضو سے ہیجان جھلک رہا تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کو سلام کیا اور توقعات سے چھلکتے لہجے میں بولی۔ ”کیا حکم ہے ٹھاکرانی جی؟“

”کل رات سے اب تک میرے بچے کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا ہے حمیدہ۔“ ٹھاکرانی نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ اس پر اسے خود بھی حیرت ہوئی۔ وہ بڑے ضبط کی، بڑے رکھ رکھاؤ والی عورت تھی لیکن حمیدہ کو دیکھتے ہی وہ ایسی دکھیاری بن گئی۔ جسے دنیا میں اپنا اور غمگسار مل گیا ہو، جسے وہ اپنا ہر دکھڑا سنا سکتی ہے۔ ورنہ اب تک اس نے اپنی سگی بہن سے بھی ایسے ٹوٹے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ”رو رو کر نڈھال ہوگیا ہے میرا بچہ اب تو رونے جتنی جان بھی نہیں ہے اس میں۔“

حمیدہ کے دل میں پھول سے کھل اٹھے۔ اسے یاد تھا کہ گزشتہ رات ٹھاکرانی نے کتنی بے رخی سے اسے دودھ پلانے سے روکا تھا۔ مگر کوئی بات نہیں۔ اب اس کی تلافی ہونے والی تھی۔ اب ٹھاکرانی خود ہی اسے دودھ پلانے کو کہے گی۔ اس کی خودداری کا سرا اونچا رہے گا۔

”تو اپنے خدا سے دعا کر میرے بچے کے لیے۔“ ٹھاکرانی نے کہا۔

حمیدہ کو مایوسی ہوئی۔ ”چھوٹے ٹھاکر کے لیے میری جان بھی حاضر ہے ٹھاکرانی جی۔“

”بس تو دعا کر۔“ ٹھاکرانی کا لہجہ پھر خشک سا ہوگیا...... موہوم سی بے رخی سے بھرپور۔

اب حمیدہ ضبط نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے خودداری کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ ”میں دودھ پلا دوں چھوٹے ٹھاکر کو؟“

”نہیں حمیدہ۔ بس تو اسے گود میں لے لے میرے سامنے۔“

مایوسی اپنی جگہ تھی۔ مگر حمیدہ بچے کو دیکھنے کے لیے تیزی سے پنگھوڑے کی طرف بڑھی۔ اسے دیکھا تو کلیجے میں ہوک سی اٹھی۔ دل کٹنے لگا۔ ننھا ٹھاکر رو رہا تھا۔ مگر آواز نہیں نکل رہی

تھی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں سے نقاہت جھلک رہی تھی۔ ''مالکن، یہ تو رو رہے ہیں۔ پر آواز نہیں نکل رہی ہے۔ اس نے ٹھاکرانی کو بتایا۔

روتے روتے گلا بیٹھ گیا ہے۔ ٹھاکرانی نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''ہائے رام، کیا کروں؟''

حمیدہ نے بچے کو گود میں لے لیا اور ٹھاکرانی کے پاس چلی آئی۔ ٹھاکرانی بچے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ حمیدہ کی گود میں آتے ہی وہ بے تابی سے اس کی چھاتیوں پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اس کا ننھا سا دہن بار بار یوں کھلتا تھا، جیسے پانی سے نکلی ہوئی مچھلی ہو اور کل کے مقابلے میں آج اس کے ہاتھوں کی بے تابی بہت نمایاں اور رلا دینے والی تھی۔ ٹھاکرانی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر کر آنکھیں پونچھ لیں۔ حمیدہ کو اس کا خیال ہی نہیں تھا۔ وہ تو ننھے ٹھاکر میں گم تھی۔ وہ بچے کو والہانہ انداز سے تک رہی تھی۔

اس کی نظروں کو دیکھ کر ٹھاکرانی متضاد جذبوں میں گھر گئی۔ حمیدہ کی ماتا بھری نگاہ نے اسے حسد اور رقابت میں مبتلا کر دیا۔ وہ کون ہوتی ہے اس کے بچے کو اس طرح دیکھنے والی۔ پھر اسے حمیدہ پر پیار آنے لگا۔ کوئی کسی دوسرے کے بچے کو اتنی چاہت سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ حمیدہ کا انداز ایسا تھا کہ اس کا بس چلے تو خود کو بچے پر قربان کر دے۔

مدعا پورا نہ ہوا تو بچے کے ہاتھوں کی بے تابی وحشت میں تبدیل ہونے لگی۔ اُدھر حمیدہ کے جسم کی اینٹھن بھی واضح ہو گئی تھی۔

پھر حمیدہ کا ضبط جواب دے گیا۔ ''مجھ پر رحم کریں مالکن۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں مر جاؤں گی۔'' وہ گڑگڑائی۔

''برداشت تو مجھ سے بھی نہیں ہوتا حمیدہ۔ پر یہ ہو نہیں سکتا۔'' ٹھاکرانی نے کمزور لہجے میں کہا۔ ٹھاکر کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ابھی بچے کو دودھ پلوا دیتی۔

''تو پھر آپ ہی کوشش کریں ٹھاکرانی جی۔'' حمیدہ کے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے۔

''تو، بچے کو میرے پاس لٹا دے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔ اب وہ حمیدہ کے سامنے اپنی ماتا کی توہین کرانا نہیں چاہتی تھی۔

حمیدہ نے کانپتے ہاتھوں سے بچے کو ٹھاکرانی کے پہلو میں لٹا دیا۔ بچے کو پھر آواز مل گئی۔ حمیدہ کی آغوش سے جدا ہوتے ہی وہ پھر رونے لگا۔ مگر آواز کمزور تھی۔

''ٹھاکرانی جی، مجھے چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے دیں...... خدا کے لیے۔'' حمیدہ پھر گڑگڑائی۔

''دیکھ حمیدہ۔ تو ماں ہے۔ جانتی ہے کہ ماں کیا ہوتی ہے۔'' ٹھاکرانی نے بکھرتے لہجے کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ ''اور میں تو وہ ماں ہوں، جسے بائیس برس بعد بچہ ملا ہے۔ تیرا دودھ پلوانا تو بہت چھوٹی بات ہے۔ اس کے لیے تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنے شریر کے ٹکڑے کر سکتی

ہوں۔ پر پتی کی بات ماننا میرا دھرم ہے۔''

حمیدہ اب رو رہی تھی۔

''میں ٹھاکر جی کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ وہ مان گئے تو تجھے بلوا لوں گی۔''

ٹھاکرانی صرف اسے نہیں، خود کو بھی دلاسہ دے رہی تھی۔ ''پر ایسا ہو بھی تو یاد رکھنا'' کسی کو کبھی پتا نہ چلے، بس اب تو جا۔''

حمیدہ کا دل نہیں مانتا تھا۔ مگر اب وہ رک نہیں سکتی تھی۔ دروازے تک اس قدم کے فاصلے میں اس نے دس بار، روتے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کو پلٹ کر دیکھا تھا۔ مگر ٹھاکرانی نے منہ پھیر لیا تھا۔ کمرے سے نکل کر اس نے جلدی جلدی آنکھیں پونچھیں اور آگے بڑھ گئی۔

کمرے میں ٹھاکرانی نے بچے کو پھر دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن بچہ اور زیادہ رونے لگا۔ ٹھاکرانی بے بسی سے اپنی انگلیاں چباتی رہی۔

❀.....❀.....❀

ٹھاکر پرتاپ سنگھ شہر میں تھا۔ رامو کے ذریعے اسے اطلاع مل چکی تھی کہ ننھے ٹھاکر نے کسی کا دودھ بھی قبول نہیں کیا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں ڈاکٹر جولیا سے بات بھی کی۔

''میرا خیال ہے، بچہ ضد کر رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے رائے دی۔ ''کوئی طبی وجہ تو نظر نہیں آتی۔ دودھ کی رپورٹ آ جائے تو بات واضح ہو جائے گی۔''

''اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''اس کی ضد کا پتا چلائیں اور اسے پورا کریں۔'' ڈاکٹر جولیا کے لہجے میں الجھن تھی۔

''مگر اتنے چھوٹے بچے ضد نہیں کرتے۔''

ٹھاکر جانتا تھا کہ بچہ ضد کر رہا ہے لیکن وہ ڈاکٹر کو نہیں بتا سکتا تھا۔ ''کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی۔'' اس نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اتنے چھوٹے بچے کو ڈرپ بھی نہیں لگائی جا سکتی۔''

''کیوں؟''

''بچہ روئے گا۔ ہاتھ پاؤں چلائے گا۔ تو الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور پھر غذا کا کوئی بدل نہیں۔ آپ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ زبردستی چمچے سے اسے دودھ دیں۔''

ذرا دیر میں دودھ کی رپورٹ بھی آ گئی۔ رپورٹ کے مطابق دودھ میں کوئی کمی کوئی خرابی نہیں تھی۔ ''میں نے کہا تھا نا۔'' ڈاکٹر نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھیں مسٹر ٹھاکر بچے کی کنڈیشن میں دیکھ چکی ہوں۔ اتنا سا بچہ اور پھر غذا نہ لینا اور رونا۔ یہ تو دُہرا نقصان ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

ٹھاکر کے تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ ''ڈاکٹر، آپ میرے ساتھ چل نہیں سکتیں؟''

''چل تو سکتی ہوں لیکن فائدہ کچھ نہیں۔ بچے کو کوئی بیماری نہیں۔ وہ پوری طرح صحت مند ہے۔ میں کوئی مدد نہیں کرسکوں گی۔ بس آپ زبردستی اسے دودھ اور گلوکوز پلانے کی کوشش کریں اور کوئی صورت نہیں۔''

ٹھاکر گاؤں کی طرف جاتے ہوئے مایوس تھا!

❀......❀......❀

شام ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بچہ کلی کر کے سب کچھ نکال دیتا تھا۔ اس کا رونے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بس گھنٹے دو گھنٹے میں وہ ذرا سا شہد قبول کر لیتا تھا۔

پھر ایک تجربہ کار عورت نے ایک ترکیب بتائی۔ ''بچے کا منہ کھول کر زبردستی چمچے سے دودھ اس کے منہ میں ڈالو۔ پھر اس کے کھلے منہ میں پھونک مارو۔ دودھ اس کے حلق سے اتر جائے گا۔''

اس ترکیب سے ابتدا میں فائدہ ہوا۔ دو چمچے دودھ ننھے ٹھاکر کے حلق سے اتر گیا۔ مگر پھر اسے پھندا لگ گیا۔ اس پھندے نے اسے اور نڈھال کر دیا۔ اب اس پر ایسی نقاہت طاری تھی کہ اسے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اب وہ رونے سے بھی گیا۔ اس میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت بھی نہیں رہی۔ ایک خرابی اور تھی۔ وہ رات سے اب تک جاگتا رہا تھا جبکہ اتنے چھوٹے بچے زیادہ وقت سوتے ہیں۔

رات ہونے کو تھی۔ ٹھاکر کمرے میں موجود تھا۔ بچہ ٹھاکرانی کے پہلو میں بے سدھ لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان میں دھندلاہٹ نظر آ رہی تھی۔ اب اس میں کسی طرح کی سکت نہیں تھی۔ کمرے میں ٹھاکر، ٹھاکرانی اور بچے کے سوا کوئی نہیں تھا۔

ٹھاکر نے اسے ایک نظر دیکھا اور اس کے بعد ٹھاکرانی سے نظریں چرانے لگا۔ ''بائیس سال بعد بھگوان نے ہم پر دیا کی ہے ناتھ۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔ ''پھر ایسا کیوں ہے کہ آپ کو اس سے محبت نہیں ہے۔''

ٹھاکر کو ان لفظوں نے تڑپا دیا۔ ''راجپوتوں کی محبت کا کب کسی کو پتا چلتا ہے رنجو۔'' اس نے شاکی لہجے میں کہا۔

''یہ محبت ہے کہ آپ کا بچہ بھوک سے مر جائے۔ آپ کے پاس دولت ہو'' دنیا کی ہر چیز ہو اور آپ اسے دودھ بھی نہ دے سکیں۔''

ٹھاکر کو غصہ آ گیا۔ ''ہوش میں رہو ٹھاکرانی۔ تم کس سے بات کر رہی ہو۔'' اس نے پرجلال لہجے میں کہا۔ ''اور تمھیں احساس بھی نہیں کہ تم غلط بات کر رہی ہو۔ سب کچھ موجود ہے۔ ہر طرح کا دودھ میسر ہے۔ بچہ دودھ نہیں پی رہا ہے تو اس میں میرا کیا دوش۔ اور یہ بیماری بھی نہیں۔

ورنہ میں اپنی جاگیر لٹا کر بھی اس کا علاج کراتا۔''

''دودھ میسر ہے۔ بچہ پینا بھی چاہتا ہے۔'' ٹھاکرانی کی رگوں میں بھی راجپوتی خون دوڑ رہا تھا۔ ''لیکن آپ اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ سچ سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیجیے ناتھ۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنے بچے کو اس حمیدہ کا دودھ پینے دوں!'' ٹھاکر کا لہجہ زہریلا تھا۔

''آپ کا بچہ یہی چاہتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ اس کی پہلی ضد ہے۔''

''یہ ضد پوری نہیں کی جاسکتی۔ دودھ خون ہوتا ہے پاگل عورت اور تم خوب جانتی ہو کہ یہ دھرم کی بات بھی ہے۔''

''معصوم بچہ یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ وہ ضد کر رہا ہے۔ وہ اپنی ضد نہیں چھوڑے گا۔ آپ ہی کا بچہ ہے وہ...... راجپوت بچہ۔ میں اس پر حیران ہوں کہ آپ اتنے چھوٹے سے بچے سے ضد کر رہے ہیں۔ کیسے پتا ہیں آپ۔''

''راجپوت بچہ!'' ٹھاکر نے غصے سے کہا۔ ''جمال دین کی بیوی کا دودھ پینے کے بعد وہ راجپوت بچہ نہیں رہے گا۔ خون میں ملاوٹ ہو جائے گی...... اور وہ بھی دوسرے دھرم کی۔ پھر تو وہ ہمارا بچہ بھی نہیں رہے گا۔ حمیدہ کا ہو جائے گا۔''

ٹھاکرانی کو بھی طیش آ گیا۔ ''آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ اس طرح تو بکری کا دودھ پینے سے وہ منش ہی نہیں رہے گا۔ کیا بکری کا بچہ ہو جائے گا وہ؟ ایسا ہے تو اسے بکری کا دودھ پلانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ اس طرح تو وہ بکری اس کی ماں ہو جائے گی۔''

ٹھاکرانی کی دلیل ایسی تھی کہ ٹھاکر کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ مگر معاملہ سنگین تھا۔ اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا ''دیکھو رنجو، جانور اور منش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ منش کے دودھ میں تاثیر ہوتی ہے، جانور کے دودھ میں نہیں۔ جس عورت کا دودھ پیے گا بچہ، اسی کی فطرت اختیار کرے گا، اس کی عادتیں، اس کے طور طریقے، اس کا رنگ ڈھنگ اپنائے گا۔''

''بچے کا جیون زیادہ ضروری ہے یا ان باتوں کا دھیان رکھنا؟'' ٹھاکرانی نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''جیون تو بھگوان کی دین ہے، وہ جانے۔'' ٹھاکر نے ہٹیلے پن سے کہا۔ ''ہمیں تو انہی باتوں کا دھیان رکھنا ہے۔''

''تو اس کے لیے ہر مندر، ہر استھان پر جا کر پرارتھنا کیوں کی تھی؟''

''پرکھوں کی آن، پرکھوں کا مان ختم کرنے کے لیے نہیں کی تھی۔''

"چاہے نسل ختم ہو جائے۔" ٹھاکرانی نے ترکی بہ ترکی کہا۔

ٹھاکر لاجواب ہو گیا اور اس کے نتیجے میں جھنجلا گیا۔ "کچھ بھی ہو ٹھاکرانی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

ٹھاکرانی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر وہ بچے پر جھک گئی۔ اس نے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن بچے کی نقاہت اپنی جگہ، منہ پھیرنے کی طاقت اس میں اب بھی موجود تھی۔

"ضد چھوڑ دو میرے لال۔ برسوں کے بعد جنم جلی ماں کے بھاگ جاگے ہیں تو تم اسے دکھ دے رہے ہو۔"

ٹھاکرانی اس وقت بچے کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ بچے کی آنکھوں میں واضح طور پر ایک پل کے لیے ایک تاثر سا چمکا۔ وہ اسے کوئی مفہوم نہ پہنا سکی۔ اور اگلے ہی لمحے بچے کی آنکھوں میں نقاہت کے سوا کچھ نہیں رہا۔

ٹھاکرانی منہ چھپا کر رونے لگی۔

❀……❀……❀

ٹھاکر اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ یہ اس کی خواب گاہ تھی۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ کئی گھنٹوں سے وہ اس کمرے میں بیٹھا تھا۔ کبھی وہ اٹھتا اور ٹہلنے لگتا، کبھی بیٹھ جاتا اور کبھی لیٹ جاتا۔ وہ بہت پریشان اور مضطرب تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایسی کشمکش بپا تھی، جس کا اس نے پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس کمرے میں اس کا اتنی جلدی آنا ایک نئی بات تھی۔ یہاں وہ صرف سونے کے لیے آتا تھا۔ آتا، لیٹتا اور سو جاتا۔ کبھی ٹھاکرانی اس کی سیوا کے لیے آ جاتی۔ اس کے سر میں تیل لگاتی، سر تھپکتی، ٹانگیں اور جسم دباتی اور وہ سو جاتا تو کمرے سے چلی جاتی۔

یہ کمرا ٹھاکر کی ذاتی ملکیت تھا۔ خاص ملکیت۔ اس کے بلائے بغیر یہاں ٹھاکرانی کے سوا کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ کسی کو بلانا ہوتا تو وہ بٹن دبا کر گھنٹی بجاتا۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ جاگیر کے معاملات وہ اس کمرے سے باہر ہی نمٹاتا تھا۔ وہ عام طور پر اپنے سارے کام، معاملات اور مشاغل سے نمٹ کر رات گئے ہی یہاں آتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ سرِ شام ہی یہاں آ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بہت پریشان تھا اور اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔

ٹھاکر کی کشمکش بہت بڑی تھی۔ وہ اپنے پرکھوں کے ورثے کا امین تھا۔ بے شمار روایات تھیں۔ بہت بڑی جاگیر تھی۔ پرجا تھی۔ ٹھاکروں کی آن بان تھی۔

جب وہ ادھیڑ عمری کی سرحد میں داخل ہو گیا اور وارث نہ ملا تو اسے دنیا کے سب سے بڑے خوف نے گھیر لیا۔ کیا اس کی نسل اسی پر ختم ہو جائے گی؟ اس کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کا، اس کی نسل کا، اس کے پرکھوں کا نام و نشان مٹ جائے گا؟ یہ جاگیر مالک سے محروم ہو کر مزارعوں میں

بٹ جائے گی؟ رشتے دار تو بہت تھے لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر بھگوان نے اسے اولاد نہیں دی تو یہی ہوگا۔ وہ ساری کی ساری زمین مزارعوں میں تقسیم کر دے گا۔ جاگیردار رشتے داروں کی جاگیر بڑھانے کا فائدہ؟ یوں کم از کم مزارعے ہی اسے یاد رکھیں گے۔ اس کا نام تو لیتے رہیں گے۔

شادی کے تین سال بعد سے اسے الجھن شروع ہو گئی تھی۔ پہلی بار اسے پتا چلا کہ جینے کی خواہش کے بعد انسان کے اندر سب سے توانا خواہش اولاد کی ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ اولاد کے ذریعے وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ بہرحال اس خواہش میں وہ بے چین رہنے لگا۔ ادھر ٹھاکرانی بھی اپنے عورت پن کی تکمیل کے لیے تڑپ رہی تھی۔

اس کے بعد طلب اور خوف کے انیس سال ایسے گزرے کہ جس نے جہاں کا بتایا کہ وہاں من کی مراد ملتی ہے، وہ اور ٹھاکرانی وہاں گئے۔ کوئی مندر، کوئی استھان، حتیٰ کہ کوئی مزار نہیں چھوڑا انھوں نے۔ لیکن مراد پوری نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ ان دونوں نے ایک ہی رات، ایک ہی خواب دیکھ لیا اور خوش خبری دینے والے اس خواب میں حوالہ کسی بڑے استھان کا نہیں، برگد کے اس درخت کا تھا، جہاں انھوں نے چڑھاوا چڑھایا تھا۔ منت مانی تھی۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو احساس تھا کہ بھگوان نے اسے ایک غیر معمولی بچہ دیا ہے۔ شروع ہی سے واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ جہاں انھوں نے اولاد کے لیے منت مانی تھی، وہ درخت ہی جل گیا تھا اور اس درخت کے جلنے کے بعد میں بچہ ٹھاکرانی کے پیٹ میں آیا تھا اور اس سے پہلے اس نے اور ٹھاکرانی نے بیک وقت خوش خبری والا وہ خواب دیکھا تھا۔ اس خواب میں خوش خبری کے ساتھ انھیں ہدایات بھی دی گئی تھیں۔ ان ہدایات کا خلاصہ یہ تھا کہ بچے کی پرورش کرنا اور اس سے محبت کرنا ان کا کام ہے۔ لیکن اس کی تعلیم و تربیت میں انھیں دخل نہیں دینا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف نہیں کرنا ہے۔ پھر زور دے کر کہا گیا تھا کہ بچے کے ساتھ کسی بھی معاملے میں زبردستی نہ کی جائے۔

اب ٹھاکر ان ہدایات پر غور کر رہا تھا۔ بچے کی پرورش اور اس سے محبت کرنے کی ہدایت! لیکن کیوں؟ یہ دونوں کام تو ہر بچے کے ماں باپ کرتے ہیں۔ کون ہے جو اپنے بچے کی پرورش نہیں کرتا۔ کون ہے جو اپنے بچے سے محبت نہیں کرتا اور پھر وہ لوگ جو بائیس برس سے اولاد کے لیے ترس رہے ہیں۔ ان کی محبت کی تو کوئی حد ہی نہیں ہوگی۔ وہ تو اور کچھ کر ہی نہیں سکتے محبت کے سوا۔ پھر یہ ہدایت کیوں ...... یہ تاکید کیوں؟ کوئی نکتہ ہے اس میں۔ بہت غور کرنے پر تعلیم یافتہ ٹھاکر کی سمجھ میں بس اتنا آیا کہ شاید یہ کوئی پیش گوئی ہے۔ پیش گوئی کہ یہ بچہ شاید ایسا ہو کہ ماں باپ اس کی پرورش سے گھبرا جائیں۔ بائیس برس بعد ملنے والی اولاد ایسی ہو کہ ان کے لیے اس سے محبت کرنا ممکن نہ رہے۔ اسی صورت میں انھیں اس بات کی تاکید کی جا سکتی ہے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ خود سے اس سے محبت، نہ کر پائیں۔ بلکہ تاکید کی وجہ سے محبت کریں۔

ٹھاکر نے خود کو ٹٹولا۔ ایک دن کے بیٹے پر اسے ایسی محبت آئی تھی کہ بیٹا اس محبت کے عملی اظہار کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور بچے کے لیے ٹھاکرانی کی محبت تو اس کے انگ انگ سے بول رہی تھی۔ وہ تو برستی محسوس ہو رہی تھی۔

تو اب...... کسی بھی معاملے میں زبردستی نہ کی جائے...... کا مطلب یہ ہے کہ بچے کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے جائیں؟ بچے کی زبردستی کے سامنے سر جھکا دیا جائے؟ اور پرکھوں کی آتماؤں کو ہمیشہ کے لیے دکھ میں مبتلا کر دیا جائے؟ اپنی آن...... اپنے خالص اور پوتر خون کا غرور خاک میں ملا دیا جائے؟ نہیں...... نہیں...... یہ تو ممکن ہی نہیں۔

پھر اسے مجذوب کی باتیں یاد آئیں۔ مجذوب نے کہا تھا...... وہ تجھے ملا، یہ رب کا احسان ہے تجھ پر۔ تیری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آئیں گی۔ بحث نہ کرنا۔ سختی نہ کرنا اس پر اس کو کسی بات سے مت روکنا۔ اس کی بات مان لیا کرنا۔ اس کا دل میلا نہ ہونے دینا۔ اس کا بن کر رہنا۔ تیرا ہی بھلا ہے اس میں۔

اب ٹھاکر ان باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اتنے چھوٹے سے بچے سے نہ بحث کی جا سکتی ہے، نہ اس پر سختی کی جا سکتی ہے۔ مگر وہ ننھا نا سمجھ وہ مانگ رہا تھا جو اسے نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اور وہ چیز بھی کوئی معمولی چیز نہیں، جیون دھارا تھی وہ۔ جس کے بغیر جیا ہی نہیں جا سکتا۔ اب یہ کیسے مان لیا جائے۔ ٹھاکر کی سمجھ میں یہ نکتہ یوں آیا کہ بچے کو اس کی مرضی کا دودھ نہ دینا سختی ہی ہے اس کے لیے...... یہ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔

اور پھر ٹھاکر کو آج صبح کی بات یاد آئی...... پنڈت روپ سہائے کی بات! پنڈت نے جو آگے کی باتیں کی تھیں، وہ تو کہانی لگتی تھی۔ پر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر اپنا بھاگیہ آپ لکھیں گے۔ جو چاہیں گے، لکھیں گے...... اور وہی کچھ ہوگا۔ بھگوان نے بڑی شکتی دی ہے انھیں۔

یہ سب باتیں پریشان کرنے والی تھیں۔ بچے کی زندگی خطرے میں تھی، اس بچے کی جو ٹھاکر کی زندگی کی اکلوتی کمائی تھا۔ ایسے میں اسے مجذوب کی ایک بات یاد آئی تو اس کی ڈھارس بندھی۔ مجذوب نے کہا تھا...... چراغ جس نے روشن کیا ہے، اس کی حفاظت بھی وہی کرے گا لیکن تو اس کے سامنے ہوا کے لیے آڑ بن کر کھڑا ہوگا تو تیرا ہی بھلا ہوگا۔ چراغ کو تو روشن ہی رہنا ہے اور کوئی نہیں بجھا سکتا۔

ٹھاکر کے ذہن میں ایک ہی جملہ گونجتا رہا۔ ''چراغ کو تو روشن ہی رہنا ہے۔'' باقی سب کچھ مٹ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ بچے کو کچھ نہیں ہوگا۔ بس پھر ٹھیک ہے اور کیا چاہیے مجھے۔

اس جملے نے ٹھاکر کی پریشانی دور کی اور اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ پھر اچانک ہی وہ خواب شروع ہو گیا مگر اس بار بشارت دینے والی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ''کیوں رے ناشکرے۔'' اس نے گرج کر کہا۔ ''آ گیا نا اپنی اوقات پر...

احسان فراموش۔''

ٹھاکر سہم گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ لیے۔ مجھ سے کیا بھول ہو گئی مہاراج۔''

''اکڑ کو بھول کہتا ہے۔ بچے کی جان پر بن گئی اور تو کہتا ہے کہ کیا بھول ہو گئی۔''

''میں کیا کروں مہاراج؟''

''دودھ پلوا بچے کو۔''

''وہ پیتا ہی نہیں۔''

''جو مانگتا ہے، وہ دے اسے۔''

''یہ نہیں ہو سکتا مہاراج۔'' ٹھاکر ہاتھ جوڑ کر گھگھیایا ''ٹھاکروں کے خون میں ملاوٹ کیسے کروں۔ پرکھوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

''اس وقت تیری ٹھاکری کہاں تھی، جب تو بچے کے لیے بے جان اور حقیر چیزوں کے سامنے ماتھا ٹیکتا تھا۔ منتیں مانتا تھا۔'' بزرگ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''وہ مل گیا تو تیری ٹھاکری جاگ اٹھی۔ احسان بھول گیا۔ کیا اب اسے مارنا چاہتا ہے۔''

ٹھاکر مسکرایا۔ ''میں جانتا ہوں مہاراج۔ وہ جیے گا۔ بھگوان اسے مرنے نہیں دے گا۔'' اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''اوہ...... تو یہ اکڑ بھی ہے۔'' بزرگ نے پر جلال لہجے میں کہا۔ ''تو ٹھیک کہتا ہے۔ وہ جیے گا۔ لیکن تیرا نہیں رہے گا۔''

ٹھاکر لرز کر رہ گیا۔ ''کیا مطلب مہاراج؟''

''جیسے اس کا کمرا بدلا جا سکتا ہے، ویسے ہی گھر بھی بدلا جا سکتا ہے۔''

ٹھاکر گنگ ہو کر رہ گیا۔ یہ بات وہ کیسے بھول سکتا تھا۔

''اور ایک بات سن۔ تجھے بچہ برگد کے اس پیڑ نے نہیں دیا تھا، جہاں تو نے منت مانی تھی۔''

ٹھاکر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''تجھے خوش خبری ملنے سے پہلے ہی وہ تو جل گیا تھا نا۔''

ٹھاکر کو یاد تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جو اپنی زندگی کے لیے خود محتاج ہے، وہ کسی کو کچھ دے سکتا ہے۔ تجھے یہ بیٹا اس نے دیا ٹھاکر، جو سب کا مالک ہے۔ جو نہ سوتا ہے، نہ اونگھتا ہے۔ موت اس کے حکم کی محتاج ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں۔ یہ بچہ اس کی دَین ہے۔ زندگی اس کے حکم سے ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ تیرے بچے کے معاملے میں اسی کا فیصلہ چلے گا۔ جیسے کمرا بدلا تھا، گھر بھی بدل سکتا ہے۔ تیرے بچے کو اس کا من پسند دودھ پلوانے کے لیے لے جایا بھی جا سکتا ہے۔ کون روکے ٹھاکر اسے؟ تو روک سکتا ہے۔ زندگی تو جاری رہے گی۔ ماں باپ بدل جائیں گے۔ یہ بھی کوئی بڑی

بات نہیں۔"

"تجھ پر احسان کیا گیا تو احسان مان۔ تجھے امانت دی گئی تو اس کی قدر کر۔ اس کے سوا سب کچھ بھول جا۔ زندگی سنور جائے گی۔"

"ٹھیک ہے مہاراج۔ میں ایسا ہی کروں گا۔"

"اور خود سے سمجھنے کی عادت ڈال۔ کیا ہمیں ہی زحمت دیتا رہے گا؟"

"نہیں مہاراج۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔"

اور ٹھاکر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چند منٹ وہ اس خواب پر غور کرتا رہا...... اور پھر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ سچی بات تو یہی تھی کہ بچے کی زندگی سب سے اہم تھی۔ وہ اسے کیسے کھونے دیتا۔ اس کی زندگی بچانے کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ واقعی ناقدری کر رہا تھا۔ خوامخواہ بچے کو اتنی تکلیف دی اس نے۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا!

ٹھاکرانی رو رہی تھی۔ اسے ٹھاکر کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ مایوس تھی۔ ٹھاکر فیصلہ کر چکا تھا اور اب اس سے ہٹنے والا نہیں تھا اور ٹھاکرانی جانتی تھی کہ بچہ اب زیادہ دیر بھوک نہیں جھیل سکے گا۔ ایک ہی امید تھی...... اور وہ یہ کہ بچہ ضد چھوڑ دے...... اور یہ نہ پیتا تو...... اس کے بعد کی بات ٹھاکرانی سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ بس رو سکتی تھی۔

ٹھاکر کمرے میں آیا تو وہ حیران ہوئی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ شانتا ایک کونے میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ ٹھاکر کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پرنام مالک۔" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر نے بچے کو دیکھا جو ٹھاکرانی کے پہلو میں لیٹا تھا۔ پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"شانتا، جا...... تو جا کر سو جا آرام سے۔"

شانتا نے یوں دیکھا، جیسے اس کی سمجھ میں بات نہیں آئی ہو۔

"اب تیری ضرورت صبح کے وقت پڑے گی۔ رات کی تیری چھٹی۔"

شانتا کمرے سے چلی گئی تو ٹھاکر نے ٹھاکرانی سے وضاحت کی۔ "اس کے سامنے بات نہیں کی جا سکتی تھی۔"

ٹھاکرانی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ مگر سچ یہ ہے کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

ٹھاکر چند لمحے کھڑا بچے کو غور سے دیکھتا رہا۔ بچے کے چہرے سے نقاہت عیاں تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ٹھاکر نے بڑی محبت سے اسے پکارا۔ "چھوٹے ٹھاکر، کیا بات ہے۔ آپ ایسے کیوں ہو گئے؟ ٹھاکر لوگ ایسے ہمت نہیں ہارتے۔"

یہ کہنا غضب ہو گیا۔ بچے نے آنکھیں کھولیں اور اگلے ہی لمحے چنگھاڑ چنگھاڑ کر رونے

لگا۔ یہ گویا باپ کی بات کا جواب تھا۔ ٹھاکر بچے نے نہ ہمت ہاری تھی اور نہ ہی اپنی ضد چھوڑی تھی۔

ٹھاکر کو حیرت ہوئی۔ بچے کی آنکھوں سے جھلکنے والی نقاہت بہت خوفناک تھی اور اس نقاہت میں وہ اپنی پوری طاقت سے رو رہا تھا۔ ٹھاکر کو خوف آنے لگا۔ کہیں بچے کو کچھ ہو نہ جائے۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا کر چمکارا۔ "نا چھوٹے ٹھاکر، نا۔ آپ کو رونے کی ضرورت نہیں۔"

روتا ہوا بچہ ایک دم چپ ہو گیا۔

"میں نادان تھا چھوٹے ٹھاکر۔" ٹھاکر پرتاپ سنگھ اب خود کلامی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "مجھے سب کچھ بتا دیا گیا۔ لیکن میں سمجھا کچھ نہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ سے ضد نہیں کرنی، بس آپ کی ماننی ہے۔ میں نے سوچا، آپ اتنے چھوٹے ہیں۔ ضد نہیں کر سکتے۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ اپنا بھاگیہ خود لکھیں گے۔ میں نے سوچا، اس وقت نا جب لکھنا سیکھیں گے۔ میں نادان تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ نے اپنا بھاگیہ آپ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اب میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ جو آپ مانگیں گے، ملے گا آپ کو۔ اب روئیے گا نہیں۔"

ٹھاکرانی یہ سب کچھ سن اور دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مگر آخری بات اس کی سمجھ میں خوب آ گئی۔ "تو ٹھاکر جی، کیا حمیدہ......؟"

"ہاں رنجو۔ میں ابھی حمیدہ کو لینے جا رہا ہوں۔"

"آپ؟" ٹھاکرانی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں رنجو، میں خود جاؤں گا۔"

"شانتا کو بھیج دیں۔ کسی نوکر کو بھیج دیں۔"

"نہیں رنجو، غرض میری ہے۔ میں خود جاؤں گا۔ جب کسی سے کچھ مانگنا ہو...... اور وہ بھی جیون جیسی چیز، تو بھکاری بن کر مانگنا چاہیے۔ بادشاہ بن کر نہیں۔ میرا بس چلتا تو میں چھوٹے کو لے کر حمیدہ کے دروازے پر جاتا۔" وہ کہتے کہتے رکا اور چند لمحے سوچ کر بولا۔ "لیکن رنجو! ایک بات یاد رکھنا، یہ بات سب سے چھپانی ہے سب سے۔ کسی کو پتا نہ چلے کہ چھوٹا حمیدہ کا دودھ پیتا ہے۔ یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو چھوٹا خود جا کر حمیدہ سے دودھ مانگتا۔"

"آپ فکر نہ کریں ناتھ۔" ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔

"میں چلتا ہوں" ٹھاکر نے کہا۔ پھر اس نے جھک کر بچے کی پیشانی چوم لی۔ "اب رونا مت چھوٹے" اس نے کہا۔ "میں تمہاری من پسند چیز لینے جا رہا ہوں۔"

ٹھاکر حویلی سے نکلا تو رات کے دس بجنے والے تھے۔ "گاؤں میں یہ وقت آدھی رات کے برابر تھا۔"

❀......❀......❀

ننھا وصال دودھ پی کر سو چکا تھا۔ حمیدہ اور جمال دین سونے کے لیے لیٹ چکے

تھے۔ لیکن نیند حمیدہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بہت بے چین تھی۔ سینے میں جیسے لاوا سا دہک رہا تھا۔ سکون صرف ایک ہی صورت میں مل سکتا تھا اور وہ یہ کہ وہ دھماکے سے پھٹ جاتی اور اندر کھولنے والا لاوا باہر نکل آتا۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ عجیب سی اذیت سے دوچار تھی وہ۔ دودھ پلانے کی ایسی طلب اسے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی کہ دودھ پلا کر بھی اسے چین نہیں آتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بستر پر لیٹنا بھی اس کے لیے اذیت ناک ہو گیا۔ لیکن وہ اٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جمال دین کی آنکھ کھلے اور اس کی نیند خراب ہو۔ مگر جب یہ اذیت اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ بستر سے اٹھ گئی۔ ویسے بھی اس کا اندازہ تھا کہ جمال دین اب تک سو چکا ہو گا۔

وہ کمرے سے نکلی اور گھر کے صحن میں آ گئی۔

اُدھر جمال دین کو نیند تو آ رہی تھی۔ لیکن پلنگ پر زلزلہ سا آیا ہوا ہو تو آدمی کیسے سو سکتا ہے۔ حمیدہ بے چین تھی اور کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔ جمال دین کی نیند گہری ہونے سے پہلے ہی اُچٹ جاتی تھی۔ آخر میں اس کی نیند بالکل ہی اُڑ گئی۔ وہ حمیدہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

ضرور کوئی خاص بات تھی۔ ورنہ حمیدہ تو بے سدھ ہو کر سونے والی تھی۔ جس کروٹ سے سوتی، جاگتی بھی اسی کروٹ سے تھی اور یہ تبدیلی گزشتہ رات سے آئی تھی۔ کل رات بھی وہ بے چین تھی۔ بار بار اٹھ کر وصال دین کو دودھ پلاتی تھی۔ پھر دن میں بھی اس کا حال عجیب رہا تھا۔ کئی غیر معمولی باتیں ہوئی تھیں دن میں۔ اور لگتا تھا کہ حمیدہ کو کسی کا انتظار ہے۔ پھر جب حویلی سے بلاوا آیا تھا تو دستک ہوتے ہی اس نے کپڑے بدلے تھے اور تیار ہو گئی تھی، جیسے وہ اس دستک ہی کی منتظر ہو اور وہ کیسی بے قرار ہو کر حویلی جانے کے لیے نکلی تھی۔

یہ سب یاد کر کے جمال دین کے دل میں ہول اٹھنے لگا۔ دماغ میں اندیشے سرسرانے لگے۔ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں...... کل رات حویلی سے واپسی پر ہی حمیدہ بے چین ہوئی تھی۔ وہاں کوئی بات......

اسی لمحے حمیدہ بڑی آہستگی سے بستر سے اٹھی اور صحن کی طرف چل دی۔

جمال دین کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔ اب وہ شک کی آگ میں جل رہا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ وہ بھی بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں صحن کی طرف چل دیا۔ کمرے کے دروازے کی چوکھٹ پر وہ ٹھٹھک گیا۔

اس کا خیال تھا کہ حمیدہ دروازہ کھول کر گھر سے باہر گئی ہو گی۔ لیکن وہ تو صحن میں ہی تھی۔

وہ پورے چاند کی رات تھی۔ صحن چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ سب کچھ بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کھیت کرتی چاندنی میں جمال دین نے حمیدہ کو دیکھا اور دہل کر رہ گیا۔ وہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر یوں تیز قدموں سے ٹہل رہی تھی، جیسے اس کے پیروں کے نیچے

انگارے بچھے ہوں۔ اس کے چہرے پر ایسی وحشت تھی کہ جمال دین نے پہلے نہیں دیکھی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو نوچ رہی تھی۔

حمیدہ کی اس کیفیت نے جمال دین کو اور ہراساں کر دیا۔ ''حمیدہ...... او حمیدہ'' اس نے سرگوشی میں پکارا۔

اس کی آواز سنتے ہی حمیدہ جیسے بت بن گئی۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ ہاتھ سینے پر جمے رہے۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ جمال دین وہاں ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ ''آپ کیوں اٹھ گئے ہو جی؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

جمال دین نے قدم بڑھایا اور صحن میں آ گیا۔ ''بات کیا ہے حمیدہ؟ کل سے تمہارا یہی حال ہے۔''

''کوئی بات نہیں جی۔ بس نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''بات تو ہے۔ کل رات تم حویلی سے آئی ہو تو اس حال میں ہو۔'' اب کے جمال دین کا لہجہ سخت تھا۔

حویلی کے حوالے پر حمیدہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ''کک...... کچھ...... کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ ہکلائی۔

جمال دین کا دل بیٹھنے لگا۔ ''حمیدہ...... کوئی روگ تو نہیں لگا لائی تو؟'' اس کے لہجے میں اندیشوں کی سرسراہٹ تھی۔

حمیدہ کو جھٹکا سا لگا۔ جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو۔ اس نے شکایتی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔ ''آپ میرے بارے میں ایسا بھی سوچ سکتے ہو جی!''

''تو تیری حالت دیکھ کر اور کیا سوچوں۔''

''روگ تو لگا ہے جی۔ پر عزت کا، آبرو کا نہیں۔ ایسا ہونے سے پہلے تو میں مر جاؤں۔''

حمیدہ کے لہجے کی سچائی نے جمال دین کے دل کو چھو لیا۔ اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ''تو پھر کیسا روگ لگا ہے ری۔''

''یہ ممتا کا روگ ہے وصال کے ابا۔''

یہ جواب جمال دین کے لیے اور معما تھا۔ وہ جھنجھلا گیا۔ ''صاف بات کر حمیدہ۔''

''اتنا کافی نہیں کہ بات تمہاری عزت اور میری آبرو کی نہیں؟''

''نہیں۔ تو مجھے سب کچھ بتا دے۔''

حمیدہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ''پر کسی کو بتانا نہیں۔''

حمیدہ بولتی رہی۔ جمال دین سنتا رہا۔ اس کا دل خوف سے بھرتا جا رہا تھا۔ سب کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''تو آگ سے کھیل رہی ہے حمیدہ۔ دیکھ یہ دین دھرم کے گورکھ دھندے

ہیں۔ان میں خود کو الجھانا ٹھیک نہیں۔"

"میں بھی جانتی ہوں۔ پر کیا کروں۔ میں مجبور ہوں۔"

"یہ خیال دل سے نکال دے۔ یہ تیرا حق بھی نہیں ہے۔"

"میں یہی چاہتی ہوں۔مگر مجبور ہوں۔خود پر زور بھی تو نہیں چلتا۔" حمیدہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"کیسے نہیں چلتا۔ تجھے خود کو سنبھالنا ہوگا۔ میں کوئی مجبوری نہیں جانتا۔ پھر یہ تو سوچ کہ ٹھاکر جی کے کتنے احسان ہیں ہم پر۔"

"تم کیسے سمجھو گے۔ مرد ہو نا، تمھیں کیا معلوم۔ دودھ کا ابال کیا ہوتا ہے۔ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔"

"میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ٹھاکر جی کو پتا چل گیا تو وہ ہمیں تباہ کر دیں گے۔"

"میں نہیں جانتی کہ میں ایسی بے بس کیوں ہو گئی ہوں......"

یہ وہ لمحہ تھا کہ جمال دین کا ہاتھ اٹھنے والا تھا۔ مگر اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بے وقت کی دستک تھی۔ جمال دین گھبرا گیا۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ جیسے پتھر کا بن گیا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو وہ چونکا۔ "تو اندر جا حمیدہ میں دیکھتا ہوں۔ اتنی رات کو کسی کا آنا خیر تو نہیں۔"

حمیدہ کمرے میں چلی گئی۔ جمال دین دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے کنڈی کھولی۔ مگر دروازہ کھلتے ہی وہ حیران رہ گیا۔ ایک بار پھر وہ بت بن کر رہ گیا......

❁......❁......❁

گاؤں میں سناٹا تھا۔ اِدھر اُدھر گھومنے والے آوارہ کتوں کے سوا کہیں کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو جمال دین کے دروازے پر جاتے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ اس وقت متضاد جذبوں کا اسیر تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کچھ مانگنے کی، اسی لیے پہلی بار جب اولاد کے لیے منت ماننے وہ مندر گیا تو اسے عجیب سا لگا۔ اسے حیرت بھی ہوئی کہ اس سے پہلے اس نے بھی بھگوان سے بھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ وہ راجپوت تھا اور اس کے پاس دو طرح کی طاقت تھی۔ ایک دولت کی، جس کے زور پر کچھ بھی خریدا جا سکتا تھا۔ اور دوسری طاقت اپنے بازوؤں کی تھی۔ لیکن ان دونوں کے استعمال کی بھی اسے کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ طبعاً وہ نیک اور شریف النفس تھا۔ اس نے کبھی ایسی کوئی خواہش ہی نہیں کی۔ وہ تو ہمیشہ دوسروں کو دیتا ہی رہا تھا۔

تو جب پہلی بار مندر میں اس نے بھگوان کی مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک کر اولاد کے لیے پرارتھنا کی تو وہ اپنے اندر بہت شرمندہ ہوا۔ شرمندگی اس بات کی بھی تھی کہ وہ کچھ مانگ رہا ہے اور

اس بات کی بھی کہ اس سے پہلے اس نے بھگوان سے کسی بھی طرح کا تعلق رکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے کبھی پوجا بھی نہیں کی تھی اور اس وقت اپنی غرض سے اس کے سامنے سر جھکاتے ہوئے بھی اس کے دل میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔ عبودیت کا احساس تک نہیں تھا اسے۔

پہلی بار اسے پتا چلا کہ منش کے پاس کتنی ہی طاقت ہو، وہ بہرحال غرض مند ہوتا ہے اور اس پر بے بسی پر طاری ہوتی ہے۔ اگلے اٹھارہ برسوں میں کون سی ایسی چوکھٹ تھی، جہاں اس نے سر نہ جھکایا ہو۔ اس نے سادھوؤں کے پیر چھوئے، درختوں کے سامنے ماتھا ٹیکا، اولاد کی طلب نے اسے بھکاری بنا دیا۔ کبھی کبھی راج پوت کی انا کے زخم سے ٹیسیں اٹھتیں تو وہ سوچتا...... کوئی بات نہیں۔ بھگوان کے سامنے ہی تو ہاتھ پھیلائے ہیں نا، جس سے راجے مہاراجے بھی بھیک مانگتے ہیں۔ یہی ایک مقام تو ہے، جہاں ہر منش جھکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

وہ بھکاری بن کر پھرتا رہا۔ آخر اسے بیٹا مل گیا اور اب وہ بیٹا اس سے ایک ایسی چیز مانگ رہا تھا، جو اس کے اور اس کی پتنی کے پاس نہیں تھی۔ وہ چیز بھگوان کے پاس بھی نہیں تھی۔ ہاں...... ایک منش کے پاس تھی۔ سو اس کے لیے اب اسے ایک منش کے سامنے ہاتھ پھیلانا تھا اور منش بھی وہ جس کا دھرم ہی دوسرا تھا اور وہ اس کا مزارعہ تھا، جسے اس نے زمین بخش دی تھی۔ وہ منش آج تک اس کا احساس مانتا تھا۔ مگر آج کے بعد صورت حال الٹ جائے گی۔ اب وہ اس کا احساس مانے گا...... مانتا رہے گا...... جیون بھر!

یہ سوچتے ہوئے ٹھاکر کا جی چاہا کہ پلٹ جائے۔ مگر کم وقت میں اتنا کچھ ہو چکا تھا، اس نے اتنا کچھ دیکھ لیا تھا کہ باتیں۔ مشکل باتیں بھی اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں...... بھگوان کی باتیں! اور وہ اتنی مشکل سے ہاتھ آنے والے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ سچ سہی کہ جس نے چراغ جلایا ہے، وہ اسے بجھنے نہیں دے گا۔ لیکن وہ اسے ناقدرا سمجھ کر اسے اس سے چھین لے اور کسی قدرداں کو دے دے تو اسے کون روک سکتا ہے اسے؟ پھر اس کی حویلی میں تو اندھیرا ہوگا، اور چراغ کسی اور کے گھر کو روشن کر دے گا۔ نہیں...... یہ تو وہ گوارا نہیں کر سکتا۔ اتنے برسوں کے بعد تو کہیں ہردے میں روشنی ہوئی ہے......

اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اس کے گاؤں میں وہی ایک مسلمان پریوار تھا۔ وہ خود اس پریوار کو دوسرے گاؤں سے، ان پر مہربانی کر کے، انھیں بچا کے یہاں لایا تھا۔ اس دن کے لیے! یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر بھگوان تو جانتا تھا۔ یہ تو وہ اب سمجھ رہا تھا کہ اس وقت اس نے ان پر نہیں، خود پر احسان کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کا احسان مانتے ہیں۔ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ شاید اگر وہ جمال دین سے جان بھی مانگ لے تو وہ انکار نہ کرے۔ لیکن وہ...... ٹھاکر پرتاپ سنگھ مانگنے والا تو نہیں تھا۔ یہ الگ بات کہ مانگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چھوٹے نے...... اس کے چھوٹے ٹھاکر نے اپنے دودھ کے لیے اسی گھر کی عورت کو پسند کیا تھا۔

تو اب وہ ان کے سامنے جھولی پھیلائے گا۔ان سے بھیک مانگے گا!

یہ سوچ کر اس کے قدم پھر ٹھٹکے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ خود جا کر سوال کرے، ضرورت کی جھولی پھیلائے۔وہ ٹھاکرانی سے کہہ کر حمیدہ کو حویلی میں بلوا بھی سکتا ہے۔کیوں نہیں۔ وہ یہاں کا مالک ہے۔ٹھاکرانی نے بھی تو یہی کہا تھا لیکن اس نے خود ہی تو منع کر دیا تھا۔مانگنا ہے تو آدمی مانگنے والوں کی طرح مانگے۔مانگنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں۔

پھر ایک اور بات بھی تھی۔اس طرح دوسروں کو شبہ ہو سکتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ منہ چھپانا بزدلی ہے جو راجپوتوں کے شایانِ شان نہیں اور وہ بازار میں ملنے والی کوئی عام چیز تو نہیں مانگ رہا ہے۔ورنہ وہ اس چیز کو خرید ہی نہ لیتا۔اس عورت حمیدہ کا اپنا ایک بچہ ہے،جس کا اس کے دودھ پر حق ہے اور اس کا پتی ہے،جس کی اجازت کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔اس سے اجازت لینا بھی ضروری ہے اور پھر اس کا صلہ دینا بھی ضروری ہے۔

ٹھاکروں کی گڑھی کے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ مانگنے کے آداب خود بہ خود سیکھ رہا ہے۔

ٹھاکر چونک کر رکا۔وہ منزل پر پہنچ چکا تھا۔سامنے جمال دین کے گھر کا دروازہ تھا۔ ایک بار پھر اس کی راجپوتی آن نے اسے اکسایا کہ وہ پلٹ جائے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔وہ ایک قدم آگے بڑھا اور کنڈی ہلا دی......

❀......❀......❀

اتنی رات کو ٹھاکر کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر جمال دین کے اوسان خطا ہو گئے۔ ابھی تو حمیدہ نے دھماکہ کیا تھا۔وہ سمجھا کہ ٹھاکر کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔"ٹھاکر جی،آپ......؟ اور اس وقت؟"اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔پھر اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔"خیریت تو ہے ٹھاکر جی؟"

ٹھاکر نے جمال دین کو بہت غور سے دیکھا۔دروازہ کھلنے میں دیر لگی تو اس نے سوچا کہ وہ لوگ یقیناً سو رہے ہوں گے۔کام اتنا ضروری نہ ہوا تو وہ واپس چلا جاتا مگر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی دوبارہ دستک دینی پڑی لیکن جمال دین کا چہرہ دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سوتے سے اٹھا ہے۔وہاں تو جگار ہی جگار تھی۔

ٹھاکر کو اس طرح گھورتے دیکھ کر جمال دین اور گڑبڑا گیا۔اسے بس یہی خیال آیا کہ ٹھاکر کو حمیدہ کی خواہش اور ارادے کا پتا چل گیا ہے اور اب وہ انھیں سزا دینے کے لیے آیا ہے۔ ورنہ اتنی رات کو وہ یہاں کیوں آتا۔"حکم کریں ٹھاکر جی۔"اس نے کہا۔پھر فوراً ہی اسے اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا۔وہ بیچ دروازے میں کھڑا تھا اور اس نے ٹھاکر کو اندر آنے کے لیے بھی نہیں پوچھا تھا۔اس نے جلدی سے دروازے سے ہٹ کر ٹھاکر کو راستہ دیا۔"اندر آئیں نا ٹھاکر جی۔"

ٹھاکر نے چوکھٹ پار کی اور صحن میں آیا۔جمال دین نے صحن میں پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔"بیٹھیں ٹھاکر جی۔"

ٹھاکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔مگر وہ مضطرب تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح شروع کرے۔

جمال دین اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔"میں کیا خدمت کروں آپ کی ٹھاکر جی۔"

"وہ......میں......تمہاری بیوی کہاں ہے جمال دین؟"ٹھاکر کو کہتے کہتے خود بھی اپنی بات کے احمقانہ ہونے کا احساس ہونے لگا۔ظاہر ہے،وہ سو رہی ہوگی۔

لیکن جمال دین بیوی کے حوالے پر اور بوکھلا گیا۔اس کا خدشہ سچ ثابت ہو رہا تھا۔

"اسے معاف کر دیں ٹھاکر جی۔وہ نادان ہے......دیوانی ہے۔جو سوچنا بھی نہیں چاہیے،وہ،وہ کرنا چاہتی ہے۔آپ معاف کر دیں اسے۔میں اب اسے ایسا سوچنے بھی نہیں دوں گا۔"

ٹھاکر اچنبھے میں پڑ گیا۔اس نے کہا۔"مجھے نہیں پتا جمال دین کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔پر میں تو حمیدہ سے ملنے آیا ہوں۔مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے،اس سے۔ایک بنتی کرنی ہے۔وہ سو رہی ہے کیا؟"

"جج......ہاں......جی......نہیں۔وہ سو رہی ہے۔"جمال دین بوکھلا گیا۔

"میں اتنی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔پر یہ ضروری ہے۔تم جگا دو اسے۔"

ٹھاکر کے جملے کا پہلا حصہ تو جمال دین کے سر پر سے گزر گیا۔اس نے آخری حصہ سنا اور دہل گیا۔وہ جلدی سے لپکا اور ٹھاکر کے پاؤں پکڑ لیے۔"معاف کر دیں ٹھاکر جی۔وہ تو پاگل ہے۔آپ ہمیں معاف کر دیں۔"

ٹھاکر جھنجھلا گیا۔یہ آدمی نہ سیدھی بات کرتا ہے،نہ اس کی سنتا ہے۔مگر اس نے فوراً ہی خود کو یاد دلایا کہ غرض مند لوگ ان لوگوں پر غصہ نہیں کرتے،جن سے کوئی غرض ہو۔"تمھیں کیا ہو گیا ہے جمال دین۔"اس نے لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"چلو خیر۔حمیدہ کو چھوڑو۔اصل بات تو تم سے ہی کرنی ہے۔"

جمال دین پوری جان سے لرزنے لگا۔"رحم کر دیں ٹھاکر جی۔ہم ہمیشہ سے آپ کے وفادار ہیں۔"

"اسی لیے تو تمھارے پاس آیا ہوں سوالی بن کر۔مجھے تم سے کچھ مانگنا ہے۔"

جمال دین کو یوں لگا جیسے ٹھاکر کی پوری حویلی اس کے سر پر آ گری ہے۔چند لمحے تو وہ گنگ رہا۔پھر بولا۔"آپ کیسی بات کرتے ہیں ٹھاکر جی۔میرے پاس ہے ہی کیا اور جو کچھ ہے، وہ آپ چھیننے کا اختیار رکھتے ہیں۔"

''لیکن میں مانگ رہا ہوں۔''

''شرمندہ نہ کریں ٹھاکر جی۔'' جمال دین نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''حکم کریں۔''

''مجھے اپنے بچے کا جیون چاہیے۔''

''زندگی دینے والا تو رب ہے ٹھاکر جی......'' جمال دین نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

''میں دھرتی کی بات کرتا ہوں جمال دین۔ یہاں تم اور حمیدہ ہی اسے جیون دان کر سکتے ہو۔ حمیدہ اسے دودھ پلا کر اور تم حمیدہ کو دودھ پلانے کی اجازت دے کر۔''

جمال دین کا ذہن شکوک و شبہات سے بھر گیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ٹھاکر ان سے سچ اگلوانے کے لیے جال بچھا رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے ٹھاکر جی؟ یہ تو دھرم کا معاملہ ہے۔''

''یہ نہ ہوا تو میرا بچہ بھوک سے مر جائے گا جمال دین۔ وہ کل سے بھوکا ہے اور وہ صرف حمیدہ کا دودھ مانگ رہا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی مر جاؤں گا جمال دین۔''

ٹھاکر کے لہجے کی تڑپ اور سچائی نے جمال دین کو ہلا کر رکھ دیا۔ پھر بھی وہ ہچکچا رہا تھا۔

''لیکن......لیکن ٹھاکر جی......''

ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے لیے وہ لمحہ بہت کڑا تھا۔ اس کے پرکھوں کی آن، راجپوتوں کی شان......اس نے سب کو جھٹک دیا اور جمال دین کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں تم سے بنتی کرتا ہوں جمال دین۔ مجھے خالی ہاتھ مت......''

جمال دین نے جھپٹ کر اس کے دونوں ہاتھ کھولے اور انہیں بے تابانہ چومنے لگا۔

''ایسا نہ کریں ٹھاکر جی......ایسا نہ کہیں۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر کے لیے ہم سب کی جان حاضر ہے۔ لیکن......''

اسی لمحے حمیدہ کمرے سے نکل آئی۔ ''اب تو آپ اجازت دے دو نا جی۔ اب تو کوئی حرج، کوئی ڈر نہیں۔ مالک خود کہہ رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''ٹھیک ہے حمیدہ۔''

ٹھاکر نے حمیدہ کے لہجے کی بے تابی محسوس کی۔ پھر اسے غور سے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ حمیدہ کی آنکھوں میں نیند کا نشان بھی نہیں تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ بھی سوئی ہوئی نہیں تھی۔ اسے یہ بات عجیب لگی کہ وہ دونوں جاگ رہے تھے۔ ''اجازت دے دو جمال دین۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''یہ مجھ پر اُپکار ہوگا تمہارا۔''

''مجھے گناہگار نہ کریں ٹھاکر جی۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔'' جمال دین نے گڑگڑا کر کہا۔ پھر وہ بیوی سے مخاطب ہوا۔ ''جاؤ حمیدہ۔ تم ٹھاکر جی کے ساتھ چلی جاؤ۔''

''نہیں جمال دین۔ مجھے اپنی آن کا خیال بھی رکھنا ہے اور تمہاری عزت کا بھی۔ تم بھی اپنے بچے کو ساتھ لے کر چلو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اکیلی حمیدہ کو میرے ساتھ دیکھے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ بات کسی کو پتا نہ چلے کہ حمیدہ اوتار سنگھ کو دودھ پلاتی ہے۔''

''کبھی کسی کو پتا نہیں چلے گا مالک۔'' حمیدہ نے جلدی سے کہا۔

جمال دین کو ٹھاکر کا بڑا پن بہت اچھا لگا۔ وہ اپنی آن کی فکر کرتا تھا تو دوسروں کی عزت کا بھی اسے دھیان رہتا تھا۔ وہ کمرے میں گیا اور سوتے ہوئے وصال دین کو گود میں اٹھا لایا۔ پھر وہ گھر سے نکل آئے۔

''راستے میں ٹھاکر نے کہا۔ ''آج جیسی بے وقت تکلیف تمہیں کبھی نہیں ہوگی۔''

''تکلیف کیسی ٹھاکر جی۔ یہ تو ہمارے لیے خوشی کی بات ہے۔'' جمال دین نے کہا۔

ٹھاکر کو پھر اس بات کا خیال آ گیا، جو اسے رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ ''ایک بات بتاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''تم دونوں اتنی رات کو جاگ کیوں رہے تھے؟''

''حمیدہ تو کل سے بے کل ہے ٹھاکر جی۔'' یہ چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کو تڑپ رہی تھی۔ اور......'' جمال دین کہتے کہتے رک گیا۔

یہ ٹھاکر کے لیے انکشاف تھا۔ حمیدہ چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کے لیے......''اور کیا۔ بتاؤ مجھے۔''

لیکن جمال دین چپ رہا۔

''بتاؤ نا جمال دین۔'' ٹھاکر نے اصرار کیا۔

''آپ خفا ہو جائیں گے ٹھاکر جی اور یہ میں نہیں چاہتا۔''

''تم بتاؤ۔ میں خفا نہیں ہوں گا۔''

جمال دین چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''یہ حمیدہ اس وقت غور کر رہی تھی......کہتی تھی، حویلی جاؤں گی۔''

ٹھاکر کی حیرت دوچند ہو گئی۔ ''کیوں؟''

''کہتی تھی۔'' اس وقت سب سو رہے ہوں گے۔ چپکے سے جا کر چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلا دوں گی۔ وہ بھوکے ہوں گے۔''

ٹھاکر کے دل کو اس لمحے کچھ ہو گیا۔ وہ پگھلنے لگا۔ یہ عورت جو اس کی کچھ نہیں لگتی، اس کے بچے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ یہ جانتی ہے کہ اس کو کسی نے دیکھ لیا اس کا پورا پریوار ختم کر دیا جائے گا۔ پھر بھی......! یہ کونسا جذبہ ہے؟ اس نے بڑی ممنونیت سے حمیدہ کو دیکھا۔ اب اس کی سمجھ میں حمیدہ کی اس وقت کی پہلی بات بھی آ گئی جو اس نے کمرے سے باہر آ کر جمال دین سے کہی تھی......اب تو اجازت دے دو نا جی۔ مالک خود کہہ رہے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ حمیدہ حویلی جانے اور

بچے کو چھپ کر دودھ پلانے پر اصرار کر رہی تھی اور جمال دین جو اس بات کے نتائج سمجھتا تھا، بجا طور پر اسے روک رہا تھا۔ ''لیکن کیا دہ......'' اسی لمحے جمال دین نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے من میں آئی ہوئی بات اپنے منہ سے کہہ دی۔ ''یہ تو پاگل ہو رہی تھی ٹھاکر جی۔ مجھے ڈر تھا کہ میری آنکھ لگ گئی تو یہ چپکے سے نکل جائے گی، اور اپنے دل کی کر کے رہے گی اور پھر......'' جمال دین نے جھرجھری لی اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ٹھاکر کو کوئی شبہ نہیں تھا کہ حمیدہ ایسا ہی کرتی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بھگوان کے کھیل ہیں۔ بچے کے من میں جس کے دودھ کی طلب ڈالی، اس کے من میں بچے کو دودھ پلانے کی طلب بھی ڈال دی۔ اسے خوشی ہوئی کہ یہ عورت صرف اس کے حکم کی وجہ سے اس کے بچے کو دودھ نہیں پلائے گی۔ بلکہ محبت سے پلائے گی۔ ''دیکھو اس کا صلہ تو میں کیا، کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ مگر میں تم دونوں کا یہ اپکار ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' اس نے کہا۔

وہ حویلی کی طرف بڑھتے رہے۔

پورا گاؤں نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں وہ منظر دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن کوئی دیکھتا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اور تجسس سے بھی نہ بچ پاتا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ اکیلا آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے جمال دین اور حمیدہ قدم سے قدم ملائے چل رہے تھے اور جمال دین کی گود میں ننھا وصال دین تھا۔

وہ حویلی میں داخل ہوئے۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ در و دیوار بھی لگتا تھا کہ بے خبر سو رہے ہیں۔ راہداری میں ٹھاکر رکا۔ ''حمیدہ، وہ رہا میرے اوتار سنگھ کا کمرا۔'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جاؤ۔ جمال دین میرے ساتھ ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہاری خبر لینے آؤں گا۔''

حمیدہ تیز قدموں سے کمرے کی طرف بڑھی۔ مگر تیزی کے باوجود اس کے قدموں میں ہچکچاہٹ تھی۔ ذرا آگے جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹھاکر وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بچے کو گود میں اٹھائے جمال دین اس کے پیچھے تھا۔ ٹھاکر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ حمیدہ۔ ڈرو مت۔ اندر تمہارا انتظار ہو رہا ہوگا۔''

حمیدہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھاکر پلٹا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

''آؤ جمال دین۔ تم میرے ساتھ چلو۔''

❀......❀......❀

ٹھاکرانی کے کمرے میں جو کچھ ہوا، ٹھاکر پرتاپ سنگھ دیکھ لیتا تو راجپوتوں کی ایک روایت ٹوٹ جاتی۔ وہ یہ کہ راجپوت کبھی نہیں روتے۔

حمیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ ٹھاکرانی مسہری پر بیٹھی

پہلو میں لیٹے بچے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف جیسے جم کر رہ گیا تھا۔ اس کی محویت ایسی تھی کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سے بھی نہیں ٹوٹی۔ ''سلام مالکن۔'' حمیدہ نے کہا۔

اس پر ٹھاکرانی نے چونک کر سر گھمایا۔ حمیدہ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ''آ جا حمیدہ۔ ہم کب سے تیری راہ تک رہے ہیں...... میں اور میرا بچہ۔'' اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔ ''مگر سن، دروازے کی چٹخنی لگا دے پہلے۔''

حمیدہ کچھ سمجھی نہیں۔ مگر حکم کی تعمیل کرنا اس کے خون میں شامل تھا۔ چٹخنی چڑھا کر وہ واپس آئی اور مسہری کے پاس کھڑے ہو کر ایک نظر بچے پر ڈالی۔ پھر اس نے ٹھاکرانی سے پوچھا۔ ''کیسے ہیں چھوٹے ٹھاکر۔''

''پوری رات، پورا دن گزر گیا۔ بھوکا ہے میرا بچہ۔ تو جلدی سے یہاں بیٹھ جا حمیدہ۔'' ٹھاکرانی نے مسہری کے پائینتی والے حصے کی طرف اشارہ کیا۔

حمیدہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''نہیں مالکن، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''جیسا میں کہتی ہوں، ویسا کر۔'' ٹھاکرانی نے درشت لہجے میں کہا۔ پھر لہجہ نرم رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو بھگوان کی دیا ہے تجھ پر۔ جب میرے حصے کا کام کرے گی تو میری جگہ پر ہی بیٹھے گی نا۔''

حمیدہ نے ٹھاکرانی کے تیور بھانپے اور سہمتے جھجکتے مسہری پر بیٹھ گئی۔ اس کے پاؤں نیچے لٹکے ہوئے تھے۔

''پاؤں اوپر کر کے آرام سے بیٹھ۔ لگتا ہے، تجھے تو دودھ پلانا بھی نہیں آتا۔''

حمیدہ کو یہ بات کوڑے کی طرح لگی۔ بات غلط اور توہین آمیز بھی تھی۔ وہ اپنے وصال کو دس ماہ سے دودھ پلا رہی تھی۔ اور ٹھاکرانی کہہ رہی تھی کہ اسے دودھ پلانا بھی نہیں آتا۔ مگر وہ عورت تھی۔ ٹھاکرانی کے اندر کا دکھ سمجھ گئی۔ وہ محروم عورت جو برسوں سے اپنے بچے کو دودھ پلانے کی آرزو کر رہی تھی۔ اب اسے بچہ بھی میسر تھا اور پلانے کے لیے دودھ بھی۔ لیکن اس کا بچہ اس کا دودھ پینے سے انکاری تھا۔ ایسے میں اسے حسد تو ہونا ہی تھا۔ یہ تو ماتا کی عظمت تھی کہ وہ اسے اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجازت دے کر اتنی بڑی شکست قبول کر رہی تھی۔ ورنہ عورت محبت کے معاملے میں ہمیشہ کی محرومی کو ساجھے پر ترجیح دیتی ہے۔

حمیدہ مسہری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے بچے کو دیکھا۔ اس پر غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں نقاہت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ پا رہا ہے۔ اسے خوف آنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جلدی سے اسے گود میں لے اور دودھ پلانے لگے۔ لیکن اس نے یہ بات کہی بھی نہیں۔ بس وہ منتظر بیٹھی رہی۔

کچھ لمحے یونہی اس انتظار میں گزر گئے۔ اور وہ بہت طویل لمحے تھے۔ حمیدہ کو لگتا تھا کہ

کسی بھی لمحے ٹھاکرانی کا ارادہ بدل جائے گا اور وہ اسے رخصت کر دے گی۔ وہ اپنے حصے کا اعزاز اسے کبھی نہیں دے گی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ نظریں اٹھا کر ٹھاکرانی کے چہرے کا تاثر ہی دیکھ لیتی۔

بالآخر ٹھاکرانی نے بڑی نرمی سے بچے کو اپنی گود میں اٹھایا اور جیسے خود سے بولی۔
''بہت ہٹیلے بالک ہو راج کمار جی۔'' پھر اس نے بڑی نزاکت سے بچے کو حمیدہ کی گود میں لٹا دیا۔ پھر وہ عجیب سی نظروں سے بچے کو دیکھنے لگی۔

حمیدہ کی گود کا لمس پاتے ہی بچے کے ننھے سے وجود میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ اس کی ادھ کھلی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ کمزوری کے ساتھ سہی، مگر اس کے ننھے منے ہاتھ مچلے اور حمیدہ کے سینے کو چھونے لگے۔

حمیدہ کا دل پھٹنے لگا۔ بچہ صاف صاف دودھ مانگ رہا تھا اس سے۔ مگر وہ حکم کی منتظر تھی۔ معاملے کی نزاکت اور راجپوتوں کی آن، دونوں کو سمجھتی تھی۔ بغیر حکم کے وہ دودھ کیسے پلاتی۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

ٹھاکرانی نے بھی بچے کا کیمیاوی ردِعمل دیکھا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے سینے کی طرف لپکا۔ ہے بھگوان۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ میرا پوت تو سب کچھ جانتا ہے۔ پھر یہ اس طرح مجھے کیوں نہیں چھوتا اور یہ...... یہ انجان ناری! اس نے حقارت سے سوچا اور وہ بھی دوسرے دھرم کی۔ اس سے کیسے لپٹ رہا ہے۔

ایک دم سے رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔ آگ بھی ایسی کہ ٹھاکرانی کو کبھی اس سے واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ بچے کو اپنی گود میں اٹھا لے اور حمیدہ کو دھکے دے کر کمرے سے نکال دے۔ مگر فوراً ہی یہ خیال بھی آ گیا کہ بچے کی زندگی خطرے میں ہے۔ مگر اس لمحے اسے حمیدہ سے نفرت...... شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی اور اس نفرت کو اظہار کی ضرورت بھی تھی۔ ورنہ ٹھاکرانی کو کچھ ہو جاتا۔ چنانچہ اس نے اس نفرت کو کسی اور طریقے سے نکالا۔ ''میں نے بچے کو تیری گود میں اس کا منہ دیکھنے کے لیے نہیں دیا ہے حمیدہ۔ دودھ کیوں نہیں پلاتی اسے۔'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

حمیدہ اس کی منتظر تھی۔ نفرت سے سہی، مگر حکم تو ہوا!

شاید کوئی بھی انسان دو متضاد کیفیات کے درمیان اس قدر برابر سے کبھی تقسیم نہیں ہوا ہوگا، جیسا اس وقت ٹھاکرانی ہوئی تھی۔ اس کے منقسم وجود کا ایک حصہ اس پر مصر تھا کہ وہ دودھ پیتے بچے کو چھوڑ کر کمرے سے نکل جائے کیونکہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے دیکھنا...... بلکہ سننا بھی نہیں چاہتی تھی اور منقسم وجود کا دوسرا حصہ وہی سب کچھ دیکھنے اور سننے پر اصرار کر رہا تھا۔ پہلا حصہ اس کے اندر کی عورت کے قبضے میں تھا اور دوسرا اس کے اندر کی ماں کے تصرف میں تھا۔ رقابت کی

آگ میں جلتی ہوئی عورت کے لیے بچہ اس کا محبوب تھا، جو اس سے بے وفائی کر رہا تھا۔ وہ اس کی مسرت بھری چہکاریں سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی بے تابیاں دیکھنا نہیں چاہتی تھی جبکہ ماں اپنے بچے کی پہلی سچی خوشی کے اظہار کے ایک ایک لمحے کو اپنی یادداشت پر نقش کر لینا چاہتی تھی۔

اس جنگ میں ماں کو ہی جیتنا تھا...... اور وہ جیت گئی۔

ٹھاکرانی رنجیتا جو کر نہیں سکتی تھی، اسے محسوس تو کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس وقت وہ ٹھاکرانی نہ رہی، حمیدہ بن گئی۔ اب وہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اور وہ محبت ہی محبت تھی...... ماماتا ہی ماماتا۔ رقابت کی آگ سرد پڑ گئی۔ خود سے بھی کوئی رقابت کرتا ہے۔

ننھا ٹھاکر بے سدھ ہو کر سو گیا۔ پیٹ بھرنے کی لذت اسے پہلی بار ملی تھی۔

سکون صرف ننھے بچے کو نہیں ہوا تھا۔ سکون تو شاید اس کمرے میں مینہ کی طرح برسا تھا۔ وہاں موجود دونوں عورتیں بھی شرابور ہو گئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ ان کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ ان کے مذہب جدا تھے۔ ان کی حیثیتیں جدا تھیں تو ان کا سکون بھی الگ الگ تھا۔ حمیدہ کا حال اس بستی کا سا تھا، جس کے پاس بہتا ہوا دریا چڑھ گیا ہو اور حفاظتی پشتے کو خطرہ ہو کہ کسی بھی لمحے پانی کا بہاؤ اسے توڑ دے گا۔ اور پھر چڑھا ہوا دریا پشتے کو توڑ کر بستی پر سے گزر گیا ہو...... لیکن معجزاتی طور پر بستی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر۔ ایک فرض تھا، جو اسے پورا کرنا تھا...... اور وہ اس کے اختیار میں بھی نہیں تھا اور وہ اتنا سنگین تھا کہ اسے پورا کرنا آگ کے دریا کو پار کرنے کے برابر تھا۔ فرض پورا کر کے وہ صرف پُرسکون نہیں ہوئی، ڈھیر ہو گئی۔ دو دن کے تنے، کھنچے ہوئے اعصاب جیسے سو گئے۔ اس میں سکت ہی نہیں رہی۔ بھوکے ننھے بچے نے دودھ کیا، اسے نچوڑ ڈالا۔ اب وہ صرف سو جانا چاہتی تھی۔

اُدھر ٹھاکرانی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ نیند اور آرام کجا، وہ تو سکون کو بھی ترس رہی تھی۔ اتنے برسوں کے بعد خزاں میں کھلنے والا پھول کھلنے سے پہلے مرجھا جانے کے خطرے سے دوچار تھا۔ اس کا بچہ اب تک صحیح معنوں میں سویا بھی نہیں تھا۔ اس کی تو جان سولی پر ٹنگی ہوئی تھی۔

وہ دودھ پیتے بچے کو دیکھتی، اس کی مسرت بھری آوازیں سنتی رہی تھی۔ وہ دید اس کی آنکھوں میں، وہ آوازیں اس کی سماعت میں بس گئی تھیں۔ خاصی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ بچے کی آواز معدوم ہو گئی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ بچہ دودھ پیتے پیتے سو گیا ہے۔ اس کے ہونٹ اب ہل نہیں رہے ہیں۔

اس نے بڑی نرمی، بڑی آہستگی سے بچے کو حمیدہ کی گود سے اٹھایا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بچہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ کسمسایا تک نہیں۔ ٹھاکرانی نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ چھاتیوں میں ابلتا ہوا دودھ جو کہ آتش فشاں بن چکا تھا، ایک پل میں سرد ہو گیا اور [illegible]

نکلا۔ پہلی بار ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔ اس کا بچہ زندہ رہے گا۔ اس کا پیٹ بھر گیا ہے اور وہ سو رہا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی اپنی آنکھیں بھی مندنے لگیں۔ اُدھر حمیدہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ جسم بے جان ہو گیا ہے۔ ہلنے کی سکت بھی نہیں تھی لیکن اسے احساس تھا کہ وہ ٹھاکرانی کی مسہری پر بیٹھی ہے...... اور یہ بے ادبی ہے۔ ٹھاکرانی کو جلال آ گیا تو خیر نہیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ٹھاکرانی کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔

جیسے تیسے وہ مسہری سے اتری ''چٹخنی گرا دوں مالکن؟'' اس نے ٹھاکرانی سے پوچھا۔

ٹھاکرانی نے بڑی مشکل سے اثبات میں سر ہلایا...... اور نندا سی آواز میں بولی۔

''کھول دے حمیدہ۔'' اور یہ کہتے ہی وہ سو گئی۔

حمیدہ نے چٹخنی گرائی۔ پھر وہ آ کر فرش پر، دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

❀......❀......❀

جمال دین نے ٹھاکر کی خواب گاہ جیسی کوئی جگہ خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی اور وہ مسہری تو اتنی بڑی تھی کہ اس پر گاؤں کے آدھے لوگ سو سکتے تھے۔

''اپنے بیٹے کو یہاں لٹا دے جمال دین۔'' ٹھاکر نے مسہری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جمال دین کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے ٹھاکر جی؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''یہ سوتے میں پیشاب بھی کر سکتا ہے ٹھاکر جی۔''

ایک لمحے کو ٹھاکر کو اس خیال سے گھن آئی۔ مگر فوراً ہی اس کے اندر سے کسی نے للکار کر کہا...... اس بچے کے حصے کا دودھ جیون بن کر تیرے پتر کو مل سکتا ہے ٹھاکر۔ لیکن یہ تیرے بستر کو گندا کرنے کا حق نہیں رکھتا!

ٹھاکر نے جھرجھری سی لی اور تحکمانہ لہجے میں جمال دین سے کہا۔ ''جیسا میں کہتا ہوں، کر جمال دین۔ اسے یہاں لٹا دے۔''

جمال دین میں انکار کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے بیٹے کو لٹا دیا لیکن اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔

وہ نیچے بیٹھنے لگا تو ٹھاکر نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تو بھی یہاں پاؤں پھیلا کر لیٹ جا بچے کے ساتھ۔''

جمال دین کی تو جان پر بن آئی۔ ''مجھے اس پر مجبور نہ کریں ٹھاکر جی۔ میں اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں۔''

''اب یہ نہیں ہو سکتا۔ تجھے میری بات ماننا ہو گی۔'' ٹھاکر کے لہجے میں قطعیت تھی۔

جمال دین نے تعمیل کی۔ لیکن اس کی کوشش تھی کہ اس کا جسم گدے سے نہ ٹکنے پائے۔

ٹھاکر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ ''نیند آ رہی ہے جمال دین تو سو جا۔'' اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔''

ٹھاکر کو اس پر ترس آنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لحاظ میں جھوٹ بول رہا ہے۔ ''جھوٹ مت بول جمال دین۔ نیند تیری آنکھوں میں بھری ہوئی ہے۔'' ٹھاکر اس کے معمولات سے واقف تھا۔ صبح سویرے اٹھنے والے تو جلدی سوتے ہیں اور یہاں تو رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ''سو جا۔ یہ میرا حکم ہے۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''کیسے سو جاؤں ٹھاکر جی۔ کوئی آ گیا تو؟''

ٹھاکر کو ہنسی آ گئی۔ ''یہ میرا خاص کمرا ہے۔ سوائے ٹھاکرانی کے یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ بس تو سو جا۔''

جمال دین نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھاکر کو اندازہ ہو گیا۔ ''تو سوتا کیوں نہیں؟'' اس نے ڈپٹ کر کہا۔

''یہاں نیند نہیں آئے گی ٹھاکر جی۔'' جمال دین نے بے بسی سے کہا۔

''کیوں نہیں آئے گی؟''

''میں اپنی کھاٹ پر سونے کا عادی ہوں مالک۔ یہاں تو لگتا ہے کہ میں ڈوب رہا ہوں۔''

یہ بات ٹھاکر کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ آرام دہ بستر پر تو اور گہری نیند آنی چاہیے۔ تاہم اس نے اتمامِ حجت کے طور پر کہا۔ ''اچھا...... تو کہاں نیند آئے گی تجھ کو؟''

''نیچے شاید آ جائے۔'' جمال دین کے لہجے میں یقین نہیں تھا۔

''تو چل۔ نیچے آ جا۔''

جمال دین نیچے آ گیا۔ لیٹنے لگا تو ٹھاکر نے مسہری سے تکیہ اٹھا کر اسے دیا۔ اب جمال دین میں انکار کی جرأت نہیں تھی۔ اس نے تکیہ سر کے نیچے رکھا اور قالین پر لیٹ گیا۔ لیکن نیند آنے کے باوجود وہ سو نہیں سکا۔

ٹھاکر بھی نیچے بیٹھ گیا۔ جمال دین کی وجہ سے اسے اوپر بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد وہ اٹھا اور بچے کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازے پر چند لمحے وہ ہچکچاتا رہا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ مداخلت بے جا کا مرتکب ہو رہا ہے۔ کہیں حمیدہ بچے کو دودھ نہ پلا رہی ہو۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس صورت میں دروازہ اندر سے بند ہو گا۔ ٹھاکرانی یہ خطرہ کبھی مول نہیں لے گی کہ کوئی اتفاقاً بھی حمیدہ کو چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلاتے دیکھ لے۔

اس نے ہلکے سے دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ اور وہاں سچ مچ رات کا تیسرا پہر تھا۔ صرف

بچہ ہی نہیں، دونوں عورتیں بھی بے خبر سو رہی تھیں۔ حمیدہ تو دیوار سے ٹکے ٹکے ہی فرش پر نیم دراز ہو کر سو گئی تھی۔ اس نے اندر جا کر بچے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا اور وہ بے خبر سو رہا تھا۔ ٹھاکر مطمئن ہو گیا۔

اس لمحے حمیدہ کو دیکھ کر ٹھاکر نے بہت کچھ سوچا۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ راجا کون ہوتا ہے اور بھکاری کون۔ دینے والا ہاتھ راجا کا ہوتا ہے اور لینے والا ہاتھ بھکاری کا اور دینے والا ایسا کچھ دے کہ جو کہیں اور سے نہ مل سکتا ہو تو وہ تو مہاراجا ہوا۔ تو یہ حمیدہ مہارانی ہے...... اور بھکاریوں کی طرح فرش پر سو رہی ہے۔ اس کا دل کٹنے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں اسی سلسلے میں کچھ کرے گا۔

اس وقت مخل ہونا مناسب نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا، دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہاں جمال دین بھی سو چکا تھا۔ شاید ٹھاکر کی موجودگی ہی اس کی نیند میں حارج تھی۔ وہ کمرے سے گیا تو فوراً ہی اسے نیند آ گئی۔

ٹھاکر وہیں نیچے لیٹ گیا...... تکیے کے بغیر۔ وہ خود کو یاد دلا رہا تھا کہ اصل میں وہ بھکاری ہے۔ کبھی زندگی چپکے چپکے راستہ بدل لیتی ہے اور آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا اور اس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

❀......❀......❀

یہ دودھ کا مسئلہ ٹھاکر کے لیے بہت بڑی الجھن بن گیا!

زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کا احسان لیا تھا...... اور اب وہ اس کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ اتنا تو اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ احسان کا صلہ دینا ہے۔ مگر کتنا اور کیسے؟ یہ اندازہ وہ کیسے کرتا۔

راجپوتوں کے ہاں بچے کو کسی اور سے دودھ پلوانے کی کوئی روایت نہیں تھی بلکہ ان کے نزدیک تو یہ بہت بڑی برائی ہی ہوتی۔ یہ تو خون کی طاقت کو کم کرنے کی بات تھی۔ تاہم ٹھاکر یہ سمجھتا تھا کہ دودھ انمول شے ہے۔ اس کا کوئی مول نہیں۔ اس کی قیمت چکائی نہیں جا سکتی۔ مگر پھر بھی کچھ کرنا تو تھا۔ وہ اس معاملے کو روایت کی روشنی میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا تھا۔

اب وہ وہاں گاؤں میں، قریب کے لوگوں سے تو کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے اسے کسی مسلمان کی ضرورت تھی...... اور وہ بھی صاحب ثروت اور پڑھے لکھے مسلمان کی۔ وہ سوچتا رہا۔ آخر اسے امان اللہ کا خیال آیا۔ وہ دہلی کا رہنے والا تھا۔ کالج میں اس کے ساتھ پڑھا تھا اور اس کا گہرا دوست بھی تھا۔

چنانچہ ٹھاکر اس سے ملنے کے لیے دہلی چلا گیا۔

امان اللہ اس سے پہلے جیسی گرم جوشی سے ملا۔ لیکن وہ حیران بھی بہت تھا۔ ''اتنے

برسوں کے بعد میری یاد کیسے آ گئی پرتاپ سنگھ؟''

ٹھاکر تھوڑا سا کھسیایا۔ پھر بولا۔ ''یاد کی بات نہیں امان۔ یاد تو میں نے تمھیں ہمیشہ رکھا۔ بس یہ ہے کہ جاگیر کے معاملات میں الجھا رہا۔ کبھی نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بس ایک کام سے دہلی آنا ہو گیا۔ سوچا تم سے مل کر پرانی یادیں ہی تازہ کر لی جائیں۔''

''اچھا کیا۔'' امان اللہ نے بے حد خلوص سے کہا۔ ''پرانے دوستوں سے مل کر آدمی بڑھاپے میں بھی جوان ہو جاتا ہے۔''

''ہاں۔ بیس برس بعد مل رہے ہیں ہم۔ تمھیں تو میرا خیال کبھی نہیں آیا ہو گا۔'' ٹھاکر نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''خیر...... ایسی بات بھی نہیں۔ لیکن تم تو جانتے ہو کہ نوکری میں آدمی کو فرصت کم ہی ملتی ہے۔''

دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پرانی یادوں سے کھیلتے رہے۔ پھر ٹھاکر نے پوچھا۔ ''بچوں کا کیا حال ہے؟''

''سب مزے میں ہیں۔ تین بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی کر دی۔ چھوٹا بیٹا ابھی باقی ہے۔''

''واہ...... تم تو دادا بھی بن گئے اور نانا بھی۔'' ٹھاکر کے لہجے میں رشک تھا۔

''ہاں۔ اللہ کا شکر ہے۔ تم سناؤ پرتاپ سنگھ۔''

ٹھاکر مسکرایا۔ ''ابھی چند دن پہلے ہی تو بھگوان نے دَیا کی ہے مجھ پر۔'' اس نے کہا۔

''بیٹا ہوا ہے میرے ہاں۔''

امان اللہ حیران رہ گیا۔ ''پہلا بچہ! شادی کو تو تمھاری مجھے یاد پڑتا ہے، بائیس تئیس برس ہو گئے۔''

''ہاں امان۔ اب تو میں نراش ہی ہو گیا تھا۔ پر بھگوان نے دَیا کر دی۔''

''بہت بہت مبارک ہو میرے دوست۔'' امان اللہ نے گرم جوشی سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم تو ابھی جوان ہوئے ہو۔''

''مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔''

پھر باتوں باتوں میں ٹھاکر نے دودھ کی بات چھیڑ دی۔ ''تم لوگوں میں تو دودھ باہر سے بھی پلوا دیتے ہیں بچے کو۔'' اس نے کہا۔

''کوئی مجبوری آن پڑے تو اور بات ہے۔'' امان نے کہا۔ ''ورنہ کون ماں اپنے بچے کو دودھ پلانا نہیں چاہے گی۔ میرے ہاں تو ایسا نہیں ہوا۔ اللہ کا شکر ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، تم لوگوں میں

ایسا ہوتا تو ہے نا۔"

"عرب میں یہ رواج عام ہے۔" امان اللہ نے کہا۔ "مگر ہمارے ہاں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن تمھیں یہ خیال کیسے آیا ٹھاکر۔"

"ایسے ہی۔ میں اکثر سوچتا ہوں اس پر۔ مجھے عجیب سا لگتا ہے۔ یہ تو خون میں ملاوٹ کرنا ہوا۔"

ٹھاکر کی امید کے مطابق امان اللہ اپنے ہاں کے اس رواج کا دفاع کرنے پر اتر آیا۔

"ایسا نہیں ہے۔" اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ "عرب اس معاملے میں تم راجپوتوں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ایسے ہی کسی کے ہاں نہیں بھیج دیتے اپنے بچے کو۔ ان کی شرائط ہوتی ہیں۔ حسب نسب بھی دیکھتے ہیں۔ پھر عورت صحت مند ہو۔ یعنی اسے کوئی بیماری نہ ہو۔ اور وہ اعلیٰ کردار کی پاکیزہ عورت ہو۔"

"تو اس عورت کو کیا فائدہ؟" ٹھاکر نے کہا اور دل میں سوچا، اسے تو بن مانگے ہی دودھ پلانے والی میں یہ خوبیاں مل گئیں۔

"بچے کا باپ اس عورت کو اپنی حیثیت کے مطابق طے شدہ محنتانہ دیتا ہے۔"

"نا بھئی۔ دودھ کا تو کوئی مول ہو ہی نہیں سکتا۔" ٹھاکر نے حتمی لہجے میں کہا۔

"بے شک دودھ کا کوئی مول نہیں۔ ایسی عورتیں عام طور پر غریب ہوتی ہیں اور پرتاپ سنگھ، عورت اچھا کھائے پیے گی تو دودھ اترے گا نا۔ بھوکی عورت بچے کو کیا دودھ پلائے گی۔ جو کسی کے بچے کو دودھ پلائے گی تو اسے خرچا بھی ملے گا اور دودھ ہوگا تو اس کا اپنا بچہ بھی دودھ پیے گا۔ ہوا نا فائدہ۔"

ٹھاکر کی معلومات میں اب اضافہ ہونا شروع ہوا۔ مگر ابھی اسے اور کرید کرنی تھی۔

"مگر اس بے چاری کو کوئی حیثیت تو نہیں ملے گی۔" اس نے کہا۔

"یہ کس نے کہہ دیا۔" امان اللہ نے تیز لہجے میں کہا۔ "اس بچے کے لیے اس کا مرتبہ ماں کا ہوتا ہے۔ اور محنتانہ اپنی جگہ۔ دودھ پلانا اس کا ایسا احساس ہے، جس کا بدلہ چکایا نہیں جا سکتا۔"

تو حمیدہ ننھے ٹھاکر اوتار سنگھ کے لیے داتا سمان ہے۔ ٹھاکر نے سوچا۔ پھر بولا۔ "تو وہ دوسرا بچہ...... دودھ پلانے والی کا بچہ......؟"

"ایسے بچے دودھ شریک بہن بھائی ہوتے ہیں...... سگوں کے جیسے۔"

تو وصال دین ٹھاکر اوتار سنگھ کا بھائی ہے...... دودھ شریک بھائی! ٹھاکر پر آگہی کے در کھل رہے تھے۔

"مگر پرتاپ سنگھ، تمھیں اس میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟" امان اللہ کے لہجے میں تجسس

تھا۔ اس لمحے اسے خیال آیا کہ ابھی ذرا دیر پہلے خود ٹھاکر نے ہی بتایا تھا کہ چند روز پہلے اس کے ہاں بیٹا ہوا ہے...... پہلی اولاد۔ اور ٹھاکر کی عمر پچاس کے قریب تو ہے۔ تو ٹھاکرانی بھی 45 سے کم تو نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ دودھ نہیں اترا ہو۔ "کہیں تمھارے ساتھ یہ مسئلہ تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں امان۔ میری پتنی کو تو بھگوان نے اتنا دودھ دیا ہے کہ سات بچے ہوتے تو بھی کمی نہ ہوتی۔" ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ جو بات اسے سب سے چھپانی تھی، اس میں وہ کسی کو راز دار کیسے بنا سکتا تھا۔

امان اللہ کے اصرار پر وہ رات وہاں رکا اور اگلے روز واپس چلا آیا۔ معلومات تو اسے حاصل ہو چکی تھیں۔ اب ان کی روشنی میں عمل کرنا تھا اور سب سے اہم بات ٹھاکرانی کو سمجھانا تھا۔

❁......❁......❁

ٹھاکرانی پہلے ہی اپنے بچے کے معمولات طے کر چکی تھی۔ شروع میں تو وہ ڈر رہی تھی کہ شیر خوار بچے تو بار بار دودھ پیتے ہیں۔ یوں راز کو راز رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ بہر حال اب وہ اٹھنے، چلنے پھرنے اور اپنے بچے کا خیال رکھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ اور یہ تو اس کا جیون بھر کا ارمان بھی تھا۔ چنانچہ پہلے مرحلہ میں اس نے دائی راجو سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اسے کہہ دیا کہ جب کوئی ضرورت ہوگی تو اسے بلا لیا جائے گا۔ دوسرے مرحلے میں اس نے شانتا کو دن کی ڈیوٹی سے آزاد کر دیا۔ وہ رات کو آتی اور صبح سویرے میں چلی جاتی۔ یوں حمیدہ کے لیے دن بھر کی گنجائش نکل آئی۔

ان معمولات کے ساتھ حمیدہ کے بھی نئے معمولات بن گئے۔ جمال دین کھیتوں پر جانے کے لیے نکلتا تو وہ وصال کو لے کر اس کے ساتھ حویلی آ جاتی۔ سات بجے وہ ننھے ٹھاکر کو دودھ پلاتی۔ ٹھاکرانی کے ساتھ رہتی اور ننھے ٹھاکر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ دس بجے وہ پھر بچے کو دودھ پلاتی۔ اس کے بعد وہ گھر واپس جاتی۔ کھانا پکاتی۔ جمال دین آتا تو اسے کھانا دیتی۔ جمال دین ذرا دیر کے لیے کمر ٹکاتا۔ تب وہ پھر حویلی جاتی ایک بجے اور پھر چار بجے ٹھاکر بچے کو دودھ پلاتی۔ پھر گھر واپس آ کر رات کے کھانے کی فکر کرتی۔ شام سات بجے وہ ننھے ٹھاکر کو دن میں آخری بار دودھ پلانے کے لیے جاتی اور اس کے بعد گھر واپسی۔

پہلے دن ٹھاکرانی رنجیتا کو شام سات بجے سے صبح سات بجے تک کے وقفے سے بہت خوف آیا۔ رات کے وہ بارہ گھنٹے بڑی آزمائش کے تھے اگر ضدی بچہ بھوک سے جاگ اٹھا اور اس نے دودھ مانگا تو کیا ہوگا۔ اس کی ضد سے وہ خوب واقف تھی۔

اس خوف سے اس رات اسے نیند ہی نہیں آئی۔ نیند سے لڑتی ہوئی شانتا فرش پر پڑ کر سو گئی۔ مگر ٹھاکرانی جاگتی رہی۔ ادھر ننھا ٹھاکر بے سدھ سو رہا تھا۔ ٹھاکرانی کو بھی جھونک آ گئی۔

مگر وہ رات ٹھاکرانی کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی لانے والی رات تھی!

ٹھاکرانی کی آنکھ اس احساس سے کھلی کہ ننھے ننھے ہاتھ کسی جستجو میں اس کی چھاتیوں کو ٹٹول رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ یہ طے تھا کہ بچے کو بھوک لگی ہے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ اب حمیدہ کو اس وقت تو نہیں بلایا جا سکتا تھا۔ ٹھاکرانی کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ خود کوشش کرے۔

اس سے پہلے اس طرح کی کوششوں کے نتیجے میں مامتا کی تذلیل کے سوا اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تماشہ بننے سے گھبراتی تھی۔ چنانچہ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شانتا سو رہی تھی۔ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس نے بچے کو گود میں لٹاتے ہوئے کہا۔ ''اب تو ماں کی بھینٹ سویکار کر لو میرے ضدی بچے۔''

اگلے ہی لمحے اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ ننھا ٹھاکر بڑی رغبت سے اس کا دودھ پی رہا تھا۔

وہ ٹھاکرانی کی زندگی میں آنے والی سب سے بڑی، سب سے سچی خوشی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ساری دنیا کو وہ منظر دکھائے۔ ڈھنڈورا پٹوائے کہ اس کے بچے نے اس کا دودھ قبول کر لیا ہے۔

بچے کے ماں کے دودھ کو رد کرنے کے تو بہت سے گواہ تھے۔ مگر اس کی قبولیت دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ شانتا تھی۔ مگر وہ سو رہی تھی۔ ٹھاکرانی جھنجلا گئی۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے۔ بچے کے دودھ کے معاملے میں تمام شکوک و شبہات ہمیشہ کے لیے دھل سکتے ہیں۔

اس نے کرخت آواز میں شانتا کو پکارا۔ ''مردار...... یہاں سونے کے لیے آئی ہے تو۔''

شانتا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ''آنکھ لگ گئی تھی مالکن۔ چھوٹے ٹھاکر بھی تو سو رہے تھے۔''

''روز پیتے ہیں۔ تبھی تو خوش رہتے ہیں۔'' ٹھاکرانی نے بڑے غصے سے کہا۔ ''اور اپنی ماں کا دودھ کونسا بچہ نہیں پیتا۔''

''پہلے تو نہیں پیتے تھے مالکن۔'' شانتا نے دبے لہجے میں کہا۔

''میرے دودھ میں کوئی خرابی تھی۔'' ٹھاکرانی بولی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس وقت ہر بات نبھائی جا سکتی ہے۔ اس نے کہا۔ ''حمیدہ نے ایک بوٹی لا کر دی تھی مجھے، جس سے دودھ کی کڑواہٹ دور ہو گئی۔ اسی لیے تو میں نے حمیدہ کو قریب کر لیا ہے۔''

اچانک ٹھاکرانی کو احساس ہوا کہ ننھا ٹھاکر دودھ پیتے پیتے سو چکا ہے۔ اس نے شانتا کو پکارا۔ ''انہیں پنگھوڑے میں لٹا دے شانتا۔''

چند منٹ میں ٹھاکرانی بہت پُراعتماد ہو گئی تھی۔ اس نے بچے کو اپنے پاس سلایا تھا۔ تاکہ تماشہ نہ بنے۔ اب اسے یقین تھا کہ بچہ اس کا دودھ بھی پی لے گا۔ شانتا نے ٹھاکر کو پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ ٹھاکرانی بھی بستر پر دراز ہو گئی۔

لیکن خاصی دیر وہ سو نہ سکی۔ خوشی اور فتح کا احساس اسے ہیجان میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے بہت کچھ سوچا بھی۔ اسے بہت سارے گواہ بنانے ہوں گے۔ پھر کوئی کبھی حمیدہ پر دودھ پلانے کا شبہ بھی نہیں کرے گا۔ اس نے کہا۔ ''کل سے تیرے ساتھ یہاں کوئی اور بھی ہو گا۔ ایک سوئے تو ایک جاگے۔''

شانتا گھبرا گئی۔ ''اب ایسا نہیں ہو گا مالکن۔''

''میں غصے سے نہیں کہہ رہی ہوں۔'' ٹھاکرانی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تو ہر روز ہو گی۔ باقی نوکرانیاں روز بدلتی رہیں گی۔''

''ٹھیک ہے مالکن۔'' شانتا نے شکرگزاری سے کہا۔

اس لمحے ٹھاکرانی کو ایک خیال اور آیا۔ اب جبکہ بچے نے اس کا دودھ قبول کر لیا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے دودھ میں ہی کوئی خرابی رہی ہو، جو اب دور ہو گئی ہو۔ ایسا ہے تو حمیدہ سے دودھ پلوانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

یہ سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ ننھا ٹھاکر ٹھیک چھ بجے اٹھ جاتا ہے۔ اس کی بھی آنکھ کھل گئی۔ شانتا بچے کے کپڑے بدل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''شانتا، چھوٹے ٹھاکر کو میرے پاس لٹا دے اور تو اب چلی جا۔''

شانتا کے جانے کے بعد ٹھاکرانی نے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کی۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے شانتا کے جانے کے بعد وہ کوشش کی تھی۔ ورنہ بھرم ٹوٹ جاتا۔ اب ننھا ٹھاکر پھر اس کے دودھ سے انکاری تھا۔

اور سات بجے حمیدہ کے آتے ہی وہ مشینی انداز میں بہت تیز تیز ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ وہ اس سے دودھ مانگ رہا تھا۔ ٹھاکرانی نے سمجھ لیا کہ اس کے غیر معمولی طور پر سمجھدار بچے نے اسے صرف رات کا اعزاز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ دن میں اس کی ضد برقرار ہے۔ مگر اسے رنج نہیں ہوا۔ یہ خوشی کم نہیں تھی کہ بچے نے اس کی مامتا کو بے عزتی سے بچا لیا تھا اور پردہ بھی رکھ لیا تھا۔

اگلے چند روز میں سب کو معلوم ہو گیا کہ چھوٹے ٹھاکر نے ٹھاکرانی کا دودھ سویکار کر لیا ہے!

❁......❁......❁

ٹھاکر چند روز بہت مصروف رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ رنجیتا سے بات کرنے سے پہلے کچھ

ضروری کارروائیاں مکمل کرلے۔ کچہری کے کام لمبے ہوتے ہیں۔ ٹھاکر کی بڑی بات تھی۔ مگر رسمی کارروائی میں بھی وقت تو لگتا ہے۔

کاغذات مکمل ہوگئے تو اس رات اس نے ٹھاکرانی کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ اب ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ خود دن میں کئی بار ٹھاکرانی کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ بیٹا تھا، جسے دیکھے بغیر اسے چین نہیں آتا تھا اور اب وہ بیٹے کو دیکھ کر خوش بھی بہت ہوتا تھا۔ دودھ کا مسئلہ حل ہوجانے کے بعد ننھا ٹھاکر اوتار سنگھ بہت مختلف، بہت پیارا اور من موہنا بچہ ثابت ہورہا تھا۔ اس کی ادائیں دل جیتنے والی تھیں۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا...... بولنے کی منزل سے بہت دور۔ مگر اس میں اظہار کی غیر معمولی قدرت تھی۔ خوشی، غصہ، محبت، خفگی...... بچوں کے لیے یہی جذبے ہوتے ہیں۔ ننھا ٹھاکران کا بھرپور اظہار کرنا جانتا تھا۔

ٹھاکرانی خاص کمرے میں پہنچی تو ٹھاکر مسہری پر نیم دراز تھا۔ ٹھاکرانی اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور پیر چھوتے ہوئے بولی۔ ''کیا سیوا کروں سوامی جی؟ پیر دبا دوں آپ کے؟''

''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے رنجیتا۔''

''حکم کریں ناتھ۔'' ٹھاکرانی مسکرائی۔ ''ویسے مجھے وشواس ہے کہ بات آپ کے پوت سے متعلق ہی ہوگی۔''

ٹھاکر پرتاپ سنگھ بھی مسکرا دیا۔ ''اب اور کوئی بات تو جیسے ہم کر ہی نہیں سکتے۔''

''سو تو ہے۔ مگر مجھے اچھا لگتا ہے۔ آپ کمرے میں آتے ہیں تو اوتار سنگھ کے سوا کہیں نظر ہی نہیں پڑتی آپ کی۔''

''برسوں کی پیاس ہے نا۔'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر بولا۔ ''جو میں کرنے والا ہوں، بات بہت بڑی ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرنا۔''

''سمجھ میں چاہے نہ آئے، پر آپ کی بات ماننا میرا دھرم ہے۔''

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا کہ بات کہاں سے شروع کرے، کس طرح کرے۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''یہ دودھ والا جو معاملہ ہے، ہمارے لیے تو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ ہمیں تو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ مگر جاننا بھی ضروری ہے۔''

ٹھاکرانی منہ سے کچھ نہ بولی۔ بس مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

''تم جانتی ہو کہ راجپوتوں کو اپکار راس نہیں۔ سر کا جھکنا قبول نہیں ہوتا ہمیں۔ اور احسان سر جھکا دیتا ہے۔ راجپوت کے لیے سر جھکانا موت کے برابر ہے۔ پر جیون بھی عجیب چیز ہے۔ منش کتنا ہی طاقت ور ہو، بھگوان کی اچھا کے آگے بے بس ہوتا ہے۔ منش کا منش سے کام نکلتا ہے۔ پر راجپوت تو کسی سے کچھ نہیں لیتا۔ جیون بھی نہیں۔ لینا پڑ جائے تو اس کا بڑھ چڑھ کر بدلہ دیتا ہے تاکہ سر تھوڑا سا اٹھانے کی گنجائش نکل آئے۔ بس یہ راجپوت کی آن کی بات ہے۔ ورنہ سر کسی

کے آگے جھک جائے تو کبھی نہیں اٹھتا۔ تم سمجھ رہی ہو نا رنجیتا؟''

ٹھاکرانی رنجیتا خوب سمجھ رہی تھی۔ اس کی رگوں میں بھی تو راجپوت خون تھا۔ ''جی ناتھ۔''

''ہمارا یہی حال ہے۔ ہم پر کسی نے اپکار کیا ہے۔ چھوٹا موٹا نہیں، جیون جیسی چیز دان کرنے کا اپکار...... اور وہ بھی ہمارے اس پوت کے لیے جو برسوں سے ہمارا سپنا تھا اور لگتا تھا، پورا کبھی نہیں ہوگا۔ اب اوتار سنگھ کے لیے تو ہم کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ ہے نا رنجیتا۔''

''اَوَش کرسکتے ہیں ناتھ۔''

''میں اس پر سوچتا رہا ہوں ٹھاکرانی۔ میں نے اس کے لیے جان کاری بھی کی ہے۔ مسلمانوں میں ایسے دودھ پلوایا جاتا ہے۔ اس کی اجرت بھی دی جاتی ہے۔ ہر آدمی اپنی حیثیت کے مطابق اجرت دیتا ہے۔ مگر دودھ پلانے کا احساس اپنی جگہ رہتا ہے۔ تو رنجیتا، ہم جمال دین اور حمیدہ کے سامنے سر کبھی نہیں اٹھا سکتے۔ ہمیں ان کو اپنے برابر کا مقام دینا ہے۔''

ٹھاکرانی کچھ دیر سوچتی رہی۔ یہ خیال کئی دن سے اسے بھی ستا رہا تھا۔ اور جو کچھ ٹھاکر کہہ رہا تھا، وہی اس نے بھی سوچا تھا۔ وہ تو ماں تھی۔ یہ کام اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ لیکن ٹھاکر کے لیے آسان نہیں تھا۔ اسے بس یہی فکر تھی۔ اب بھی وہ جو کہہ سوچ رہی تھی، ٹھاکر کے نکتہ نظر سے سوچ رہی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''پر وہ تو ہماری رعیت ہیں نا ناتھ۔ انھیں برابری کیسے دے سکتے ہیں۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ یہی میں نے سوچا تھا۔'' ٹھاکر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس کا اپائے بھی سوچ لیا ہے۔''

''وہ کیا ہے ناتھ؟''

''ہم انھیں دودھ کی اجرت دیں گے۔ اتنی کہ وہ ہماری رعیت نہیں رہیں گے۔ ہمارے برابر کے ہوجائیں گے۔''

ٹھاکرانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ بولی۔ ''میں مطلب نہیں سمجھی ناتھ۔''

''میں اپنی ساری زمین، جائیداد، نقدی، زیورات، سب آدھ سے کچھ زیادہ جمال دین کے نام کررہا ہوں۔ یہ ان کا حق بھی ہے۔ پھر ان کے سامنے ہمیں کبھی بڑائی کا احساس بھی نہیں ہوگا۔''

ٹھاکرانی تو حمیدہ کے سامنے اپنے احساسِ برتری کو پہلے ہی ہار چکی تھی۔ اسے فکر تھی تو بس ٹھاکر کی۔ یہ سن کر اس نے سکون کی سانس لی۔ ٹھاکر بڑے خلوص سے سر جھکانے کا سامان کر رہا تھا۔ مسئلہ حل ہوگیا تھا۔

ٹھاکر بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں رنجیتا؟'' اس نے بہت نرم لہجے میں پوچھا۔

"یہ کیسی بات کی ہے ناتھ۔ میرے لیے تو آپ کے چرنوں کی دھول ہی بہت ہے۔ رہے چھوٹے ٹھاکر، تو ان کی فکر آپ کو مجھ سے زیادہ ہوگی اور یہ تو میں جانتی ہوں کہ بھگوان کا دیا اتنا ہے کہ میرے چھوٹے ٹھاکر کی نسلوں کے لیے کافی ہے۔"

ٹھاکر نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "تم بہت اچھی پتنی ہو رنجو۔"

"یہ بتائیں، آپ نے کاغذات بنوا لیے ہیں؟" ٹھاکرانی نے اچانک کہا۔

"ہاں اور نقدی اور زیورات تو گھر کی بات ہے۔"

ٹھاکرانی سوچ میں پڑ گئی۔ ٹھاکر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد ٹھاکرانی نے سر اٹھایا اور دبے لہجے میں بولی۔ "ابھی آپ نے یہ سب کچھ انھیں دیا تو نہیں؟"

"نہیں۔" ٹھاکر نے کہا۔ "پر یہ تو بتاؤ، بات کیا ہے؟"

"دیکھیں۔ ابھی یہ سب کچھ کریں گے تو سب کو کھوج ہوگی کہ یہ کس بات کا انعام ہے۔ بہت لوگ سمجھ بھی جائیں گے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

ٹھاکر نے بھی ایک لمحے سوچا۔ "تم عقل والی ہو رنجو۔ بات تو ٹھیک ہے۔ پر میں اب یہ کام کر کے رہوں گا۔"

"آپ کریں گے تو ٹھیک ہی ہوگا۔" ٹھاکرانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں جمال دین سے کہہ دوں گا کہ تین چار سال تک کسی کو پتا نہ چلے۔"

"اپنی برائی کوئی نہیں چھپاتا ناتھ۔"

"میں آدمی کو پہچانتا ہوں رنجو۔ جمال دین تو شاید یہ بات کبھی بھی کسی کو نہیں بتائے گا۔ وہ یہ سب کچھ آسانی سے لے گا بھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے ناتھ۔ میرے لیے کوئی اور حکم؟"

"حکم نہیں، بنتی ہے۔ تم حمیدہ کو بھی خود سے کم نہ سمجھنا، ہمیشہ اس کی عزت کرنا اور اپنے بیٹے کو بھی یہی کچھ سکھانا۔ حمیدہ اس کے لیے ماتا سمان ہے اور وصال دین بھائی جیسا ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا سوامی جی۔"

❀……❀……❀

ٹھاکر کا یہ دعویٰ غلط نہیں تھا کہ اسے آدمی کی پہچان ہے!

اسی رات جب پورا گاؤں سو رہا تھا تو ٹھاکر جمال دین کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اس کے کہنے پر جمال دین نے حمیدہ کو بلایا۔ حمیدہ آئی تو ٹھاکر نے نقدی اور زیورات کی گٹھری اس کے قدموں میں ڈال دی۔

حمیدہ تو گنگ ہو کر رہ گئی۔ جمال دین نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے ٹھاکر جی؟"

"کھول کر دیکھو۔ یہ سب حمیدہ کا ہے۔"

حمیدہ بت بنی بیٹھی تھی۔ جمال دین نیچے بیٹھا اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے گٹھری کھولی۔ گٹھری کھلی تو ان دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یہ...... یہ سب......؟" جمال دین نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ حمیدہ اب بھی چپ تھی۔

"یہ اس دودھ کا حق ہے جو حمیدہ نے میرے بچے کو پلایا ہے۔" ٹھاکر نے کہا۔

پھر حمیدہ پہلی بار بولی...... اور اس کے لہجے میں اذیت تھی۔ "قیمت ادا کر رہے ہیں ٹھاکر جی؟"

ٹھاکر تڑپ گیا۔ "نہیں۔ یہ تمھارے ہی ہاں کے رواج کے مطابق ہے۔" اس نے مسلمان دوست سے جو کچھ سنا تھا، اسے استعمال کیا۔ "قیمت تو ادا ہو ہی نہیں سکتی۔" اس نے آخر میں کہا۔ "یہ بات بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں میں۔"

"ٹھاکر جی، میں نے آپ کے کہنے پر نہیں، اپنے دل کے کہنے پر دودھ پلایا ہے چھوٹے ٹھاکر کو۔ میں تو تڑپ رہی تھی۔ مر رہی تھی اس کے لیے۔ آپ نے تو اجازت دے کر احسان کیا ہے مجھ پر۔ اور میں اس کا صلہ نہیں دے سکتی۔ اس لیے میں یہ سب کچھ نہیں لے سکتی۔" حمیدہ نے کہا۔

"مگر اس کا صلہ تو تمھارے رواج کے مطابق تمہارا حق ہے۔"

"یہ ویسی بات نہیں مالک۔ میں سچ کہتی ہوں کہ اگر چھوٹے ٹھاکر کو دودھ نہ پلاتی تو مر جاتی شاید۔"

غیر عورت کی یہ اپنائیت...... بلکہ محبت بھری بات سن کر ٹھاکر کو کچھ ہو گیا۔ اس کے دل میں اس غیر عورت کے لیے عجیب طرح کی محبت پھوٹی۔ "تو حمیدہ، میرے بچے سے کوئی ناتا تو ہے ناتمہارا۔ کوئی کسی کے لیے یوں نہیں تڑپتا، یوں نہیں مرتا۔ اب میں تم سے کہتا ہوں حمیدہ کہ آج سے تم میری بہن ہو۔ اور بہن ہونے کا حق تم پہلے ہی ادا کر چکی ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں مالک؟"

"اب مجھے کبھی مالک نہ کہنا۔ میں بھائی ہوں تمہارا۔ ہم ٹھاکر کبھی کسی سے رشتہ نہیں جوڑتے۔ جوڑ لیں تو جیون بھر نبھاتے ہیں۔"

"ہم اس قابل نہیں مالک۔" اب کے جمال دین ہاتھ جوڑ کے گڑگڑایا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو۔ یہ کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لوں۔" ٹھاکر غرایا۔

جمال دین تھر تھر کانپنے لگا۔ حمیدہ سر جھکا کر بولی۔ "ٹھیک ہے ویر جی۔ پر یہ بوجھ ہم نہیں اٹھا سکتے۔" اس نے گٹھری کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تو اب تمہارا ہے۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی بہن کا حصہ۔ اور اس کے علاوہ بہت کچھ ہے۔" ٹھاکر نے جیب سے کاغذات نکال کر [illegible] پر رکھ دیے۔ "یہ زمین کے کاغذات ہیں۔"

حمیدہ رونے لگی۔ "یہ میں کیسے مان لوں......"

"تو بھائی کی ارتھی اٹھنے پر مانو گی۔" ٹھاکر نے کڑے لہجے میں کہا۔

جمال دین کا چہرہ فق ہو گیا۔ "چلو حمیدہ...... اٹھاؤ اسے۔ اب کوئی بات نہ کرنا۔" اس نے حمیدہ کو ڈانٹا۔ پھر وہ ٹھاکر کی طرف مڑا۔ "اب کوئی بری بات منہ سے نہ نکالنا مالک۔ ہم جاں نثار لوگ ہیں۔ یہ سب نہیں سن سکتے۔"

"تم بھی آئندہ مجھے مالک نہ کہنا۔" ٹھاکر نے جمال دین سے کہا۔

"ت...... تو...... کیا......؟"

"تم کون ہو میرے؟"

"میں آپ کا وفادار غلام ہوں۔"

"نہیں۔ حمیدہ بہن کے رشتے سے اب تم میرے جیجا ہو۔"

"تو میں کیا کہوں مالک؟"

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا۔ پھر بولا۔ "بس ٹھاکر جی کہہ لینا۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔"

"اب میں چلتا ہوں۔" ٹھاکر نے کہا۔ مگر دروازے پر پہنچ کر وہ مڑا۔ "سنو...... اس رشتے سے میرے گھر، میرے پورے پریوار پر تمہارا ادھیکار ہے۔ یہ بات کبھی نہ بھولنا اور میرے گھر میں کوئی بھی اس سے انکار نہیں کرے گا۔ یہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی زبان ہے۔" پھر وہ گھر سے نکل گیا۔

❁......❁......❁

آنے والے وقت میں یہ ثابت ہوتا گیا کہ ننھے ٹھاکر اوتار سنگھ کو کسی کی تربیت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دودھ کے حق کو اور اس کے رشتوں کو خوب پہچانتا تھا۔ اس کی بے معنی غوں غاں بامعنی لفظوں سے قریب ہونے لگی تو کیا ٹھاکرانی اور کیا ملازم، سبھی اسے سکھانے پر تل گئے۔ ٹھاکر کے لیے پتا جی اور ٹھاکرانی کے لیے ماتا جی بس انہی دو لفظوں کی تلقین کی جا رہی تھی اسے۔ لیکن خود اس نے دودھ کا احترام ملحوظ رکھا۔ پہلا لفظ جو اس کی زبان سے ادا ہوا، وہ اماں تھا...... اور حمیدہ کے لیے تھا اور پہلا لفظ ادا کرنے کے بعد وہ دو ماہ تک اور کچھ نہیں بولا۔ سکھانے والوں کو لگتا تھا کہ وہ دیوار سے سر پھوڑ رہے ہیں اور حمیدہ کو اماں کہتے ہوئے اس کی آواز میں لپک، لہجے میں مٹھاس اور آنکھوں میں وارفتگی ہوتی تھی۔

پھر دو ماہ بعد وہ بولا تو خوب بولا۔ ابتداء میں ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ بلا کا ذہین ہے۔ ایک بار سننے کے بعد کوئی لفظ کبھی اس کے حافظے سے محو نہیں ہوا۔ اس کی سیکھنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ بچے کی بڑھوتی کا عمل اتنا خوب صورت ہوتا ہے کہ مائیں اس کے سحر میں گرفتار رہتی

ہیں۔ اور ٹھاکرانی رنجیتا تو وہ ماں تھی، جسے ناامیدی کی انتہا پر پہنچ کر معجزانہ طور پر بیٹا ملا تھا۔ وہ تو زندگی کا سب سے خوب صورت وقت گزار رہی تھی۔ اسے ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ تو جب چھوٹا ٹھاکر پٹ پٹ بولنے لگا اور بولتا چلا گیا تو اچانک ایک دن اسے خیال آیا کہ اب وہ کسی دن، کسی کے بھی سامنے حمیدہ سے دودھ مانگ سکتا ہے۔ تب اس نے پہلی بار اسے سمجھایا۔ "پتر...... کبھی کسی کے سامنے اماں سے دودھ نہ مانگنا اور کبھی کسی کو بتانا بھی نہیں۔"

ننھا ٹھاکر ٹکر ٹکر ماں کو دیکھتا رہا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس نے وجہ بھی نہیں پوچھی۔

وہ تو ٹھاکرانی کو بعد میں احساس ہوا کہ چھوٹے ٹھاکر کی زبان چلے چھ ماہ ہو چکے ہیں اور وہ اب اسے یہ بات سمجھا رہی ہے۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ ان چھ ماہ میں اب تک چھوٹے ٹھاکر نے ایسا نہیں کیا ہے۔ ورنہ تو اس کی بے خبری میں بھانڈا پھوٹ چکا ہوتا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ کے دو سال کا ہوتے ہوتے بہت کچھ واضح ہو چکا تھا۔ وہ حمیدہ کو اپنی ماتا جی سے کم نہیں سمجھتا تھا بلکہ شاید ماتا جی کی نسبت اس سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ دوسرے وہ وصال دین سے بہت قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس سے دوری اسے گوارا نہیں تھی۔ وہی ایک اس کا ہم جولی تھا۔ اپنی ہر چیز، ہر کھلونے میں وہ اسے شریک کرتا تھا۔ اس کے بغیر کھیلتا ہی نہیں تھا اور وہ اپنے سے دس ماہ بڑے وصال دین کو ویر جی کہتا تھا۔ لیکن حمیدہ اور وصال دین سے اس کے تعلق سے بڑھ کر غیر معمولی اس کا جمال دین سے تعلق تھا۔ جمال دین سے اس کا سامنا بہت کم ہوتا تھا لیکن جب بھی ہوتا، وہ جمال دین سے بڑے احترام اور ادب سے ملتا اور کسی کے سمجھائے بغیر وہ خود سے اسے چاچا جی کہتا تھا۔ ہاں، ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے اسے بے حد محبت تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ ان سے ناز برداری کرانا اس کا حق ہے۔ اور لطف یہ کہ اس کے خیال میں ان پر ویر جی...... یعنی وصال دین کا بھی اتنا ہی حق تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ ان دو برسوں میں بہت بدل گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ حویلی سے باہر ہی نہ نکلتا۔ ہر وقت اپنے بیٹے کو دیکھتا رہتا۔ اپنے بچوں کو جسمانی محبت اور قربت دینا راجپوت کا مزاج نہیں۔ لیکن ٹھاکر مختلف تھا۔ وہ بیٹے کو گود میں اٹھاتا، زانو پر بٹھاتا، اسے چومتا، پیار کرتا اور ٹھاکرانی یہ دیکھ کر نہال ہوتی، یہ بیٹا اس کی زندگی میں بہار لایا تھا۔

ٹھاکر کی ایک بات عجیب تھی۔ وہ اپنے ننھے سے بیٹے سے بڑے احترام سے بات کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے آپ کہتا۔ اس نے کبھی اسے تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ سچ یہ ہے کہ اتنی عزت اس نے کبھی کسی کو نہیں دی تھی۔ شاید اس کا سبب وہ واقعات تھے، جو ننھے ٹھاکر کی پیدائش سے پہلے اور فوراً بعد پیش آئے تھے۔ ٹھاکر کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا بہت خاص ہے...... کوئی آسمانی چیز۔

ٹھاکر نے بیٹے کے لیے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ کوئی کھلونا ایسا نہیں، جو وہ اس کے لیے نہیں لایا ہو۔ اور اسے خوشی تھی کہ اس کا بیٹا اپنے دودھ شریک بھائی کو اپنی چیز میں شریک کرتا ہے۔ وہ بہت خوش، مطمئن اور آسودہ تھا۔

ننھے ٹھاکر کو لکڑی کا گھوڑا بہت پسند تھا۔ وہ اس پر بیٹھ کر جھولتا رہتا۔ آگے پیچھے، آگے پیچھے۔ پھر ایک دن اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس تحریک کے باوجود وہ اور اس کا گھوڑا وہیں کے وہیں رہتے ہیں، ذرا سا بھی آگے نہیں بڑھتے۔ شاید اس کا غیر شعوری احساس اسے ویر جی کو گھوڑے پر سواری کرتے دیکھ کر ہو گیا تھا لیکن شعوری طور پر اس نے یہ بات اپنے ہی حوالے سے سمجھی اور پھر اس نے اس گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ وہ اس کے دل سے اتر گیا تھا۔

تب چھوٹے سے ٹھاکر اوتار سنگھ نے ایک بڑی بات سمجھی۔ لکڑی کا وہ گھوڑا اسے بہت محبوب تھا اور اب وہ دل سے اترا تو جیسے اس کے اندر کوئی کمی ہو گئی۔ کوئی خلا پیدا ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں بہت کچھ ہوا۔ وہ چڑچڑا اور اداس ہو گیا۔ اسے جھنجلاہٹ تھی کہ گھوڑا اس کی توقع پر پورا نہیں اترا۔ وہ بے کیف اور ناخوش ہو گیا۔

یہ بات ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے محسوس کر لی۔ ”کیا بات ہے پتر، آپ چپ چپ کیوں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”پتا نہیں پتا جی۔“ تین سالہ اوتار سنگھ نے جواب دیا۔

ٹھاکر نے متروک گھوڑے کو دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ پچھلے کافی دنوں سے اس کے بیٹے کا محبوب ترین مشغلہ اس پر سواری کرنا تھا۔ ”اور آج آپ اس گھوڑے پر بیٹھ کر سیر کو بھی نہیں گئے۔“ اس نے کہا۔

”یہ گھوڑا بہت خراب ہے پتا جی۔“

”کیوں بھئی؟ کیا خرابی ہے اس میں؟“ ٹھاکر نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”یہ ایک جگہ کھڑا رہتا ہے۔ اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھتا۔“

”تو پھر؟“

”میں اس پر بیٹھ کر سیر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں کرا سکتا۔ اب میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔“

”تو پتر، یہ اصلی گھوڑا تو نہیں ہے۔ یہ تو لکڑی کا گھوڑا ہے۔“

”آپ مجھے اصلی گھوڑا لا دیں۔ میں بیٹھوں گا۔“

”ابھی آپ بہت چھوٹے ہو پتر۔ اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ بڑے ہوں گے تو میں خود آپ کو گھڑ سواری سکھاؤں گا۔“

”نہیں پتا جی۔ مجھے تو ابھی گھوڑے پر بیٹھنا ہے۔“

ٹھاکر پرتاپ سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کا بیٹا ضد کم کرتا ہے لیکن

ضد کرے تو پھر پیچھے نہیں ہٹتا۔ اب مزید سمجھانے کا مطلب یہ تھا کہ اس کی ضد بڑھے گی۔ چنانچہ اس سے بچنا ضروری ہے۔ پر اب اسے بہلایا کیسے جائے۔

اچانک وہ مسکرایا۔ وہ کسی بھی رنگ، نسل اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو، ہر باپ کے اندر ایک گھوڑا چھپا ہوتا ہے۔ اس لمحے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے اندر بھی ایک گھوڑا ہنہنایا۔ ”میں آپ کو ابھی ایک ایسا گھوڑا لا کر دیتا ہوں پتر۔“ اس نے کہا اور کمرے کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لمبی ڈوری تھی۔ اس ڈوری کو اس نے درمیان میں سے اپنے دانتوں سے گزارا اور زمین پر گھٹنے ٹکا کر گھوڑا بن گیا۔ ”آؤ پتر، بیٹھ جاؤ اور یہ لگام تھام لو۔“ اس نے بیٹے سے کہا۔

ننھا ٹھاکر بڑے اشتیاق سے اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ وہ اصلی گھوڑے کے مسئلے کو بھول ہی گیا تھا۔ ”یہ لگام کس لیے ہیں پتا جی؟“ اس نے پوچھا۔

”انہیں سیدھے ہاتھ کی طرف جھٹکو گے تو گھوڑا داہنی جانب مڑے گا۔ الٹے ہاتھ کی طرف جھٹکو گے تو گھوڑا بائیں جانب مڑے گا اور لگام اپنی طرف کھینچو گے تو گھوڑا رک جائے گا۔“ ٹھاکر نے اسے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے، گھوڑے میاں، اب چلو۔“ ننھے ٹھاکر نے ڈھیلی لگام کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

اور ٹھاکر نے اپنے لاڈلے بیٹے کو بٹھا کر گھوڑے کی طرح دوڑنا شروع کر دیا۔ بیٹا بھی اپنے اختیار کو چیک کرنے کے لیے کبھی لگام ایک طرف جھٹکتا، کبھی دوسری طرف جھٹکتا اور کبھی کھینچ لیتا۔ وہ بہت خوش تھا۔

وہ دونوں حویلی کے بہت بڑے دالان میں اس طرح دوڑ لگاتے رہے۔ ٹھاکر کو حیرت ہوئی کہ اسے تھکن کیوں نہیں ہوئی ہے۔ اسے احساس تھا کہ حویلی کے سارے نوکر یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ سب خوش ہیں۔ ٹھاکرانی کے چہرے سے تو روشنی پھوٹ رہی تھی۔

”چھوٹے ٹھاکر، اب گھوڑا تھک گیا ہوگا۔ اسے آرام کرنے دو۔“ ٹھاکرانی نے پکار کر کہا۔

ننھے ٹھاکر نے لگام کھینچی اور گھوڑا رک گیا۔ ننھے ٹھاکر نے اوپر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ ”پتا جی، گھوڑے تھک بھی جاتے ہیں؟“

”کیوں نہیں پتر۔ محنت کرنے سے ہر جاندار تھکتا ہے۔ گھوڑے بھی۔ اور بڈھے گھوڑے تو زیادہ جلدی تھک جاتے ہیں۔“

ننھا ٹھاکر باپ کی پیٹھ سے اتر آیا۔ ”آپ بڈھے ہیں پتا جی؟“ اس نے پوچھا۔

”میں بڈھا تھا پتر۔“ ٹھاکر نے بلا جھجک کہا۔ ”پر آپ کے آنے کے بعد میں جوان ہو

گیا ہوں۔"

ٹھاکرانی جلدی سے لسی کا بڑا پیالہ لے کر پہنچی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں تولیا تھا۔ "میرے چھوٹے ٹھاکر، تمھارے پتا جی تو تمھیں نہیں بتائیں گے۔ مجھے بتانا پڑے گا۔" اس نے بیٹے سے کہا۔ "گھوڑے کا کچھ حق بھی ہوتا ہے اپنے سوار پر۔ وہ ہمیشہ پورے کیا کرو۔"

ننھے ٹھاکر نے کچھ نہیں کہا۔ بس ماں کو استفسار طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔

"گھوڑے کے رکتے ہی اس کا پسینہ خشک کرتے ہیں، اس کے جسم کی مالش کرتے ہیں اور اسے کھلاتے بھی ہیں۔" یہ کہہ کر ٹھاکرانی نے ٹھاکر کے پسینے میں نہائے ہوئے جسم کو تولیے سے پونچھا۔ پھر لسی کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ "لو ناتھ، یہ پی لو۔"

ٹھاکر نے ممنونیت سے پتنی کو دیکھا۔ وہ پیالہ منہ سے لگا ہی رہا تھا کہ ننھے ٹھاکر نے اسے ٹوک دیا۔ "پتا جی، گھوڑے تو گھاس کھاتے ہیں۔"

"یہ تو تمھارے پتا جی ہیں پتر۔" ٹھاکرانی نے جلدی سے کہا۔ "تمہاری محبت میں تھوڑی دیر کے لیے گھوڑا بن گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ماتا جی۔" ننھے ٹھاکر نے کہا اور دودھ کے پیالے کو بڑی محبت سے ہاتھ لگایا۔ "پی لیں پتا جی۔" اس کے لہجے میں بھی محبت تھی۔

ٹھاکر کے لیے وہ بڑی خوشی کا دن تھا۔ پہلی بار اس نے اپنے جسم و جاں سے بیٹے کے لیے کچھ کیا تھا۔

دوسرے دن بیٹے نے صبح سویرے ہی ٹھاکر سے گھوڑا بننے کی فرمائش کر دی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس نے باگیں کھینچ لیں۔ "بس پتا جی۔" اس نے کہا اور اس کی پیٹھ سے اتر آیا۔

"کیوں پتر...... بس اتنی سی دیر؟ مجھے تو مزہ نہیں آیا۔" ٹھاکر نے شکایت کی۔

"پتا جی، میں آپ کو بہت تھکانا نہیں چاہتا۔" ننھے ٹھاکر نے کہا۔ "اور اب ویر جی کی باری ہے۔"

گھوڑے کی طرح بیٹھا ہوا ٹھاکر صرف چند لمحوں کے لیے ہچکچایا۔ کوئی دیکھتا تو اس ہچکچاہٹ کا سبب کبھی نہ سمجھ پاتا۔ یہی سمجھتا کہ اپنے سے نیچے کسی شخص کے بچے کو پیٹھ پر بٹھانے سے جھجک رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے ان چند لمحوں میں بہت کچھ سوچا۔ یہ تو اس نے پہلے ہی لمحے میں سمجھ لیا کہ یہ بھگوان نے اسے بہت اچھا موقع دیا ہے۔ پھر اس نے آگے غور کیا۔ جمال دین کے گھرانے پر اس کے پریوار کی عنایت پر سب لوگ سرگوشیوں میں بات کرتے ہوں گے۔ یہ اسے معاملات کو فطری رخ پر لے جانے کا موقع ملا تھا۔ اب وہ وصال دین کا گھوڑا بنے گا تو سب ملازم دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ ٹھاکر جی کو بیٹا ملا ہے تو وہ ایسے نرم ہو گئے ہیں کہ اپنے کارندوں کے بچوں کو بھی اپنا بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ تاثر ایک بار جم گیا تو آگے کے تمام

معاملات کو بھی اسی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ پھر کسی کو کبھی کوئی شبہ نہیں ہوگا۔

چنانچہ ٹھاکر نے سر اٹھا کر بڑی محبت سے وصال دین کو دیکھا اور بولا۔ "آؤ وصال دین، گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ گھوڑا چلانا آتا ہے تمھیں؟"

پونے چار سال کا وصال دین معصوم بچہ ہی تو تھا۔ اتنے چھوٹے بچوں کو کسی کے مقام اور مرتبے کا کہاں پتا ہوتا ہے اور پھر وہ اوتار سنگھ کے تمام کھلونوں سے کھیلتا رہا تھا۔ تو یہ کھلونا کیوں چھوڑتا۔ "آتا ہے ٹھاکر جی۔" اس نے گردن اکڑا کر بڑے فخر سے کہا اور ٹھاکر کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔

"چلو...... گھوڑے میاں۔" اس نے اوتار سنگھ کی طرح آواز لگائی۔

ادھر ٹھاکر نے دوڑ لگائی، اُدھر پوری حویلی میں ہلچل مچ گئی۔ سب کو پتا چل گیا کہ ٹھاکر جی جمال دین کے بیٹے وصال دین کا گھوڑا بن گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو ٹھاکرانی دوڑی آئی۔ وہ منظر دیکھ کر وہ بت بن کر رہ گئی۔ ٹھاکر جی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

حمیدہ نے یہ سنا تو ننگے پاؤں دالان کی طرف لپکی۔ ٹھاکر سب سے بے نیاز گھوڑا بن کر دوڑ رہا تھا۔ حمیدہ ایسے بوکھلا کر آئی تھی کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ٹھاکر کے قریب پہنچ کر وہ وصال دین پر گرجی۔ "یہ کیا کر رہا ہے منحوس۔ تجھے تمیز نہیں۔ یہ ٹھاکر جی ہیں۔"

وصال دین سہم گیا۔ ماں ہمیشہ لاڈ پیار کرتی تھی۔ اس طرح پہلے کبھی نہیں ڈانٹا تھا اس نے۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے باگیں کھینچ لیں۔ ٹھاکر رک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر حمیدہ کو دیکھا۔ "کیوں ڈانٹتی ہو اسے؟"

"میں تو اسے جان سے مار دوں گی۔" حمیدہ غرائی۔ پھر وصال دین کی طرف پلٹی۔ "اترتا ہے کہ نہیں۔"

وصال دین اترنے لگا تو ٹھاکر نے خود کو اونچا کر لیا۔ "نا وصال دین، ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بیٹھا رہ۔ میں تیری ماں کو سمجھا لوں گا۔" اس نے کہا۔

حمیدہ کو بھی کچھ ہوش آیا۔ "اسے یوں سر نہ چڑھائیں ٹھاکر جی۔"

ٹھاکر نے تنبیہی لہجے میں دہرایا۔ "ٹھاکر جی! ایسے بات کرتے ہیں بھلا؟"

حمیدہ اس کی بات سمجھ گئی۔ سرگوشی میں بولی۔ "یہ کیا کرتے ہیں ویر جی۔"

ٹھاکر نے بلند آواز میں کہا تاکہ سب ملازم سن لیں۔ "سن حمیدہ، تیرا بیٹا میرے اوتار سنگھ کا دوست ہے۔ اس ناتے یہ اس کا حق ہے مجھ پر۔ اور میں اپنے اوتار سنگھ کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں۔"

"مگر یہ گستاخی ہے مالک۔" حمیدہ نے بھی بلند آواز میں کہا۔

اس پر ٹھاکر نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ لفظ مالک سننا اسے گوارا نہیں تھا۔ "تو چتا نہ کر حمیدہ۔ میں نے خود اسے اٹھایا ہے۔ یہ میرے حکم کی تعمیل کر رہا ہے اور گستاخی تو میرا حکم نہ

مانے میں ہوتی۔ تو بھی مجھ سے بحث نہ کر۔ جا چلی جا۔" یہ کہہ کر ٹھاکر اوپر بیٹھے وصال دین سے
مخاطب ہوا۔ "ہاں بھئی، چلا گھوڑے کو۔"

مگر وصال دین اب چوکڑی بھول چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے ضرور کوئی غلطی کی
ہے۔ وہ بیٹھا تو رہا۔ مگر اکھڑا اکھڑا تھا۔ دو چکروں کے بعد ٹھاکر نے اسے اتار دیا۔ ٹھاکرانی تو لیا
اور لسی لے کر آ گئی۔

یہ سچ ہے کہ اس روز ٹھاکر نے سب لوگوں کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ مالک کے تیور پہچاننے
والوں نے سمجھ لیا کہ جمال دین، حمیدہ اور وصال دین کی کوئی حیثیت ہے اور اب انھیں اس حیثیت
کا خیال رکھنا ہے۔

❀......❀......❀

اس رات حمیدہ نے یہ روداد جمال دین کو سنا دی۔ جمال دین پریشان ہو گیا۔ "یہ تو
بہت خطرناک بات ہے حمیدہ۔" اس نے متوحش ہو کر کہا۔ "ہم لوگ برسوں سے آگ سے کھیل
رہے ہیں۔ یہ تو اللہ کی مہربانی ہے کہ اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے اور یہ سب کچھ تم نے شروع
کیا ہے۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟" حمیدہ نے بھڑک کر کہا۔

"چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کا شوق تمھیں ہوا تھا۔ یہ سب وہیں سے شروع ہوا ہے۔"

"تم مرد ہو۔ میری مجبوری کیا سمجھو گے۔" حمیدہ بولی۔ "لیکن یہ تو سوچو کہ صرف
میرے چاہنے سے کیا ہوتا۔ چھوٹے ٹھاکر نے خود ضد باندھ لی تھی کہ دودھ میرا ہی پیئیں گے۔" یہ
کہتے ہوئے اس کے لہجے میں فخر تھا۔ "اب یہ تو اللہ کی مرضی ہی تھی ورنہ اتنے چھوٹے بچے ایسی ضد
نہیں کر سکتے۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر......"

"آپ پریشان کیوں ہو۔" حمیدہ نے کہا۔ "اب یہ بھی بڑے ٹھاکر خود ہی کر رہے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ہمارے بیٹے کی تو عادتیں بگڑ جائیں گی اور کسی دن راجپوت کا خون
جوش مار گیا تو کیا ہو گا۔ سوچو تو حمیدہ۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے مجھے اپنی فکر نہیں۔ لیکن میرا بیٹا......"

حمیدہ بھی پریشان ہو گئی۔ "ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے مگر ہم کر کیا سکتے ہیں۔"

"اپنے بیٹے کی تربیت تو کر سکتے ہیں۔ اسے سمجھا تو سکتے ہیں کہ اپنی حیثیت ہمیشہ یاد
رکھے۔ وہ سر چڑھائیں تو بھی نہ چڑھے۔"

"کوئی کسی کو کچھ نہیں سکھا سکتا۔ وقت آپ ہی سکھا دیتا ہے۔ اوپر سے گرے گا تو خود

سمجھ جائے گا۔"

"سکھانا تو ہوتا ہے حمیدہ۔" جمال دین نے آہ بھر کے کہا۔ "ورنہ اللہ تربیت کا حکم کیوں
دیتا۔ پھر آدمی بے خبری میں گرے تو چوٹ لگتی ہے۔ بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ
میرے بیٹے کو کوئی تکلیف ہو۔ اسے گرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا ہوگا۔"

"پر یہ سب کچھ اسے کیسے سمجھاؤ گے؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اب بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ میں دیکھ لوں گا۔" جمال دین نے کہا اور
کروٹ بدل لی۔

❀......❀......❀

جمال دین پر حویلی کے دروازے بہت پہلے کھل چکے تھے۔ وہ حویلی میں جب چاہے آ
سکتا تھا اور جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ٹھاکر کے خاص کمرے میں بھی وہ
بغیر بتائے جا سکتا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر کا پہلا جنم دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا اور اس روز
ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اپنے تمام رشتے داروں پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اس مسلمان پریوار کو اپنے
رشتے داروں سے کم نہیں سمجھتا۔

لیکن جمال دین نے اس رعایت سے کبھی استفادہ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی کھال میں رہنے
والا آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ آسانی اپنے مقام پر رہنے میں ہے۔ انسان کی عنایت کا کچھ اعتبار نہیں۔ کون
جانے کب عتاب میں تبدیل ہو جائے۔ چنانچہ وہ کبھی کبھار ہی حویلی میں جاتا تھا۔

مگر اس صبح وہ حمیدہ اور وصال دین کے ساتھ حویلی میں چلا گیا۔ وہ دونوں تو ہر روز
حویلی میں جاتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر کا دودھ چھڑا دیا گیا تھا۔ مگر معمول پھر بھی نہیں بدلا تھا۔ حیرت
انگیز بات یہ تھی کہ دودھ چھڑانے پر چھوٹے ٹھاکر نے بالکل واویلا نہیں کیا تھا۔ کوئی ضد نہیں کی تھی۔
بس ایک صبح حمیدہ نے اس سے کہا تھا۔ "چھوٹے ٹھاکر، اب آپ خیر سے بڑے ہو گئے ہیں۔ اب
آپ کو ایسے دودھ نہیں پینا ہے۔"

اوتار سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس وہ ٹکر ٹکر اماں کو دیکھتا رہا۔

وصال دین نے کہا۔ "اور کیا چھوٹے ویر۔ دیکھو میں تو پہلے ہی ماں کا دودھ چھوڑ چکا
ہوں۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں نا۔" اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر قد اونچا کر کے دکھایا۔

اوتار سنگھ نے بھی اس کی نقل کی اور پھر طمانیت سے سر ہلایا، جیسے اپنے بڑے ہو جانے کا
یقین آ گیا ہو۔ "اب میں ایسے دودھ نہیں پیوں گا اماں۔" اس نے کہا۔

انداز ایسا تھا کہ حمیدہ نے اس کی بلائیں لے لیں۔ پھر وہ بولی۔ "آپ کو بھوک لگ
رہی ہو گی چھوٹے ٹھاکر۔ دودھ نہیں پیئیں گے؟"

"نہیں اماں۔ بھوک تو لگ رہی ہے۔ پر میں دودھ نہیں پیوں گا۔"

"دودھ نہیں پئیں گے تو اور بڑے کیسے ہوں گے۔"

"پر آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ......"

"ٹھہریں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ اب آپ کو دودھ کیسے پینا ہے۔" یہ کہہ کر حمیدہ چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ ٹھاکرانی کے ساتھ واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا کٹورہ تھا، جس میں دودھ تھا۔ اس نے کٹورہ ٹھاکرانی کو دیا۔ "لیں مالکن، چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلا دیں۔"

ٹھاکرانی دودھ پلانے لگی تو ننھے ٹھاکر نے ہاتھ سے کٹورے کو پرے کر دیا۔ بوا!!۔

"اماں کے ہاتھ سے پیوں گا۔"

ٹھاکرانی ہنسنے لگی۔ "وقت کے بڑے پکے ہیں میرے چھوٹے ٹھاکر۔ لے حمیدہ، یہ وقت تو تیرا ہی ہے۔"

حمیدہ نے دودھ پلا دیا۔ یوں معمول وہی رہا، وقت وہی رہا، بس دودھ پینے کا انداز بدل گیا۔

سو اس صبح جمال دین بیوی اور بیٹے کے ساتھ حویلی میں چلا گیا۔ اس سے پہلے حویلی میں اتنی صبح وہ کبھی نہیں گیا تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ ٹھاکرانی بڑے تپاک سے مسکرائی۔ "آؤ جمال دین، آج کیسے رستہ بھول پڑے۔ تم تو کبھی آتے ہی نہیں۔"

"بس مالکن، مصروفیت ہی اتنی ہے۔ زمین فرصت ہی نہیں دیتی۔"

"جل پان کرو گے۔ کچھ لاؤں؟"

"شکریہ مالکن، ابھی ناشتہ کر کے نکلا ہوں۔"

"ٹھاکر جی تو اپنے کمرے میں ہیں اور راستہ تمھیں معلوم ہی ہے۔" ٹھاکرانی نے کہا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ ٹھاکر جی سو رہے ہیں۔ جانتی تھی کہ ٹھاکر نے اپنے طور پر جمال دین کو یہ ادھیکار دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہے، اس کے کمرے میں آئے اور وہ سو رہا ہو تو اسے جگا دے۔ یہ الگ بات کہ جمال دین نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔

جمال دین کا اب بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "مالکن، اس وقت تو میں چھوٹے ٹھاکر کے دیدار، ان کی سیوا کے لیے آیا ہوں۔"

"ابھی بلاتی ہوں انھیں۔" ٹھاکرانی نے کہا۔

لیکن حمیدہ تڑپ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ننھا ٹھاکر اس وقت بھوکا ہوگا اور اس کے ہاتھ سے ناشتے کا منتظر۔ اس نے شوہر سے کہا۔ "سنو جی، ابھی چھوٹے ٹھاکر کو ناشتہ کرنا ہے۔ تم ذرا دیر انتظار کر لو۔"

جمال دین نے اسے نظر انداز کر دیا اور ٹھاکرانی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"مالکن، چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ پر مجھے ایک بات کہنی ہے۔"

"کہو جمال دین۔"

"ناشتہ کھیل کود کے، کسرت کے بعد اچھا ہوتا ہے۔ پورے کا پورا جسم کو لگ جاتا ہے۔ ناشتے کے بعد کھیل کود اور کسرت صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔" ٹھاکرانی بولی۔

"میرا مطلب ہے، چھوٹے ٹھاکر پہلے مجھ سے مل لیں، کھیل کود لیں، پھر ناشتہ کریں گے تو اچھا ہوگا۔"

حمیدہ احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ مگر اسی لمحے ٹھاکرانی نے اس سے کہا۔ "جاؤ حمیدہ، چھوٹے ٹھاکر کو لے آؤ۔" پھر وہ خود بھی حمیدہ کے ساتھ اندر چلی گئی۔

ننھا ٹھاکر وصال دین کے ساتھ دالان میں آیا تو جمال دین لکڑی کے گھوڑے کے پاس کھڑا اس کی پیٹھ سہلا رہا تھا۔ ننھا ٹھاکر دوڑ کر آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ "آپ کب آئے چاچا جی؟ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اس نے چہک کر کہا۔

"یہ آپ کا گھوڑا رو رہا تھا۔ میں اس کے آنسو پونچھ رہا ہوں۔" جمال دین بولا۔

"یہ رو رہا تھا!" ننھے اوتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ آپ اس سے محبت کرتے تھے نا۔ روز اسے صاف کرتے تھے۔ اس پر بیٹھتے تھے۔ یہ خوش ہوتا تھا۔ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اب آپ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ دیکھیں اس پر کتنی مٹی گرد جمی ہے۔" جمال دین نے گھوڑے پر ہاتھ پھیرا اور اپنا گرد آلود ہاتھ اسے دکھایا۔ "اس لیے یہ اداس رہنے لگا ہے۔"

"اداس رہنے لگا ہے۔" ننھے ٹھاکر نے دہرایا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"آپ خود غور سے دیکھ لیں۔ آپ کو نظر آ جائے گا۔"

ننھے ٹھاکر نے غور سے دیکھا۔ اداسی کا مطلب تو اسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن لکڑی کا وہ گھوڑا اجڑا اجڑا سا لگ رہا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ "لیکن چاچا جی، یہ میرے کام کا نہیں۔ یہ وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ مجھے کہیں لے جاتا نہیں۔"

"یہ سچ ہے میرے چھوٹے ٹھاکر۔ لیکن ہر چیز کی اپنی اوقات ہوتی ہے، اپنی طاقت ہوتی ہے۔ اس میں یہ طاقت نہیں۔ اس لیے اس سے ناراض ہونا ٹھیک نہیں۔ پہلے تو یہ آپ کا دل بہلاتا تھا نا۔ اب آپ بڑے ہو گئے لیکن اس کا تو قصور نہیں۔ اسے سزا نہیں ملنی چاہیے۔ محبت کرتے وقت دیکھ لینا چاہیے کہ کسی کی طاقت کتنی ہے۔ پھر محبت نہ رہے تو بھی ظاہر نہیں ہونے دینا چاہیے۔ دوسرے کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔" جمال دین عدم تحفظ کے احساس کے تحت اپنے بیٹے کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ننھے بچے کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ "ہاتھ تھام کر چھوڑتے نہیں چھوٹے ٹھاکر۔" ننھا ٹھاکر کچھ سمجھا اور

بہت کچھ نہیں سمجھا۔ مگر اس نے جمال دین کی ہر بات پلے سے باندھ لی۔ رائیگاں تو کوئی بات نہیں جاتی۔ بہت سی باتیں بعد میں وقت سمجھاتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ اداس ہو گیا۔ اسے لکڑی کے گھوڑے پر ترس آنے لگا۔ ''پھر میں کیا کروں چاچا جی؟'' اس نے پوچھا۔

''روز صبح سویرے اسے کپڑے سے صاف کریں اور اس پر بیٹھیں، چاہے تھوڑی دیر کے لیے بیٹھیں۔''

''پھر یہ اداس نہیں ہوگا۔ روئے گا تو نہیں۔''

''بالکل نہیں۔ پھر یہ اگلی صبح تک خوش رہے گا۔''

ننھے ٹھاکر نے جلدی سے کپڑا لا کر اپنے گھوڑے کو صاف کیا، اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور پھر اس پر بیٹھ کر جھولنے لگا۔ اسے مزہ تو نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس بات کی خوشی تھی کہ لکڑی کا گھوڑا خوش ہو رہا ہوگا...... اور اب اگلے دن تک خوش رہے گا۔

دو منٹ بعد وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ ''اتنا ٹھیک ہے چاچا جی؟'' اس نے پوچھا۔

''جی میرے راج کمار۔ آیئے، اب اصل گھوڑا حاضر ہے۔'' جمال دین نے جواب دیا اور گھوڑا بن گیا۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کو اٹھا کر دوڑتا رہا۔ اس دوران میں ٹھاکرانی اور حمیدہ بھی باہر دالان میں آ گئی تھیں اور یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ کافی دیر بعد ننھے ٹھاکر کے اصرار پر جمال دین نے اسے اتارا۔

''اب میری باری ہے ابا۔'' وصال دین نے کہا۔

''نہیں بیٹے، میں تھک گیا ہوں۔ تجھے بعد میں سیر کرا دوں گا۔'' جمال دین نے اسے ٹالا۔ اس نے سوچا تھا کہ اسے بعد میں سمجھائے گا۔

ننھے ٹھاکر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر پہلے ٹھاکرانی کو اور پھر حمیدہ کو دیکھتے ہوئے تڑپ کر بولا۔ ''اماں...... جلدی سے تولیا لاؤ اور دودھ بھی۔''

جمال دین کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن دونوں عورتیں سمجھ گئیں۔ ٹھاکرانی نے حمیدہ کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ حمیدہ چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں تولیا اور دوسرے میں دودھ کا پیالہ تھا۔

ننھے ٹھاکر نے چند لمحے ماتا جی اور اماں کو دیکھا۔ پھر تولیہ لیا اور ننھے ننھے ہاتھوں سے جمال دین کا چہرہ اور بازو خشک کرنے لگا۔ جمال دین بوکھلا گیا۔ ''یہ...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں چھوٹے ٹھاکر۔''

ننھے ٹھاکر کے ہاتھ نہیں رکے۔ ''بابا جی کہتے ہیں، گھوڑے کا خیال رکھنا چاہیے۔''

اس دوران ٹھاکرانی مسکراتی رہی اور حمیدہ دودھ کا پیالہ لیے کھڑی رہیں۔ ننھے ٹھاکر

نے ہاتھ روکا اور حمیدہ سے بولا۔ ''اب اپنے ہاتھ سے چاچا جی کو دودھ پلاؤ اماں۔''

''وہ بھی پلا دوں گی۔ اب آپ ناشتہ کر لیں چھوٹے ٹھاکر۔''

ننھا ٹھاکر جمال دین کی طرف مڑا۔ ''میں جاؤں چاچا جی۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''ضرور جائیں چھوٹے ٹھاکر۔ پر پہلے ایک بات کر لیں۔ آج سے میں آپ کا گھوڑا ہوں۔ مگر یہ بتائیں، جب میں بڈھا ہو جاؤں گا اور آپ بڑے ہو جائیں گے تو میں آپ کو پیٹھ پر بٹھا کر دوڑ نہیں سکوں گا۔ تب آپ مجھے لکڑی کے اس گھوڑے کی طرح چھوڑ تو نہیں دیں گے۔''

''نہیں چاچا جی۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں چاچا جی۔''

''شکریہ ٹھاکر۔ اب آپ جائیں۔ ناشتہ کر لیں۔''

❁......❁......❁

اس روز دوپہر کو جمال دین کھانے کے لیے گھر آیا تو اس نے وصال دین کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''بیٹا...... اب میں تجھے بتاؤں گا کہ میں نے حویلی میں تجھے اپنی پیٹھ پر کیوں نہیں بٹھایا تھا۔''

وصال دین استفہامیہ نظروں سے باپ کو دیکھتا رہا۔ ''دیکھ بیٹے، تو میرا بیٹا ہے۔ میرا سب کچھ ہے۔ میں اور تیری ماں تیرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہم تجھ سے محبت کرتے ہیں۔ تو ہمارے لیے شہزادہ ہے۔ ماں باپ کے لیے ان کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے لیکن ایک حقیقت اور ہوتی ہے۔ یہ کہ کوئی دنیا کے لیے کیا ہے۔ اس کی دنیا میں کیا حیثیت ہے۔ تیری سمجھ میں میری بات آسانی سے نہیں آئے گی۔ لیکن غور سے سننا اور ہر بات کو یاد رکھنا۔ آدمی کو اپنی حیثیت ہر جگہ اور ہر حال میں یاد رکھنی چاہیے۔ کوئی اس سے بڑھ کر سمجھے تو یہ اس کی مہربانی، اس کا احسان اور بندے کو احسان کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ ''تو سمجھ رہا ہے میری بات۔''

چار سال کے وصال دین نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں ابا۔''

''کوئی بات نہیں۔ بس غور سے سن اور یاد رکھ۔'' جمال دین نے کہا۔ اسے بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ چار سال کا بچہ تو لفظ حیثیت کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن سمجھانا ضروری ہے۔ گستاخی تو گستاخی ہوتی ہے۔ چاہے چار سال کا بچہ کرے۔ بتانا تو پڑے گا۔ اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''تو بیٹے، تیری حیثیت کیا ہے۔ ابھی تو چھوٹا ہے۔ جب تو دنیا میں کچھ کرے گا تو تیری حیثیت بنے گی۔ اس وقت تک تیری حیثیت وہ ہے جو میری ہے اور میری حیثیت کیا ہے؟ میں کسان ہوں بیٹے۔ غریب کسان۔ مجھ پر ٹھاکر جی نے مہربانی کی کہ مجھے کچھ زمین دے دی۔ میں ویسے ہی ٹھاکر جی کا مزارعہ تھا۔ ان کی مہربانی کے بعد میں ان کا غلام ہو گیا۔ میں نے کہا نا، بندے کو احسان نہیں بھولنا چاہیے۔ تو ٹھاکر جی نے میرے ابا، تیرے دادا پر بھی احسان کیا تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھولتا۔ میں ٹھاکر جی کا کمی ہوں۔ وہ ایسا نہیں سمجھتے۔ مجھے برابری کا، زمین دار والا مقام

دیتے ہیں۔مگر اس سے میری حیثیت نہیں بدلتی۔تو بتایئے، میری حیثیت کیا ہے، میں کون ہوں؟''

چار سال کے لڑکے نے دماغ پر پورا زور دیا...... باپ کو خوش کرنے کے لیے۔ ایسے میں قدرت راہ نمائی کرتی ہے۔ جواب اس کے اندر ابھرا۔ اس نے کہا۔ ''آپ بڑے ٹھاکر جی کے کمی ہیں ابا۔ آپ کسان ہیں۔''

جمال دین اس کے جواب سے بہت خوش ہوا۔ ''شاباش وصال دین شاباش۔'' اس نے بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔ ''اب یہ بتا کہ میری اپنی زمین نہیں ہے۔ میں نے زمین کمائی نہیں ہے۔ اب کوئی مجھے زمین دے دے تو کیا میں زمین دار ہو جاؤں گا؟''

''نہیں ابا۔''

''بالکل ٹھیک۔'' جمال دین نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''ٹھاکر جی چاہے مجھے اپنے برابر میں جگہ دیں۔ مگر میرا مقام تو ان کے قدموں میں ہے نا۔''

''جی ہاں ابا۔''

''اور جو میری حیثیت ہے، تیری بھی وہی ہے تو تو کون ہے؟''

وصال دین نے سینہ پھلا کر بڑے فخر سے کہا۔ ''ابا...... میں کمی ہوں...... کسان ہوں...... آپ کا بیٹا ہوں۔''

''شاباش۔ میں چاہتا ہوں، تو یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ اب تجھے ٹھاکر جی اور مالکن چھوٹے ٹھاکر کے برابر سمجھیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تو کبھی خود کو چھوٹے ٹھاکر کے برابر نہ سمجھنا۔ دیکھ تیرے دادا پر جو احسان تھا، وہ مجھ پر ہے کیونکہ میں ان کا بیٹا ہوں اور جو احسان مجھ پر ہے، وہ تجھ پر ہے۔ کیونکہ تو میرا بیٹا ہے۔ میں اس احسان کے بدلے کیا کرتا ہوں؟ ٹھاکر جی کی ہر بات مانتا ہوں۔ خود کو ان کا غلام سمجھتا ہوں......اور ہمیشہ سمجھوں گا۔

''اب حیثیت کی بات سمجھ۔ وہاں حویلی میں تو اور میں دونوں غلام ہیں۔ یہاں اس گھر میں ٹھاکر جی نہ ہوں تو میں بادشاہ ہوں اور تو شہزادہ ہے۔ تجھ سے بڑھ کر دنیا میں میرے لیے کچھ بھی نہیں۔ یہاں میں تیرا گھوڑا ہوں۔ جب تو کہے میں تجھے سواری کراؤں گا۔ لیکن حویلی میں میں صرف چھوٹے ٹھاکر کا گھوڑا ہوں۔ وہاں تجھے سوار کروں تو تجھے چھوٹے ٹھاکر کے برابر سمجھوں گا اور یہ غلط ہے۔ ٹھیک ہے نا۔''

''میں سمجھ گیا ابا۔''

''اب تیرا دل چاہے تو میں تیرا گھوڑا بن جاؤں؟'' جمال دین نے پوچھا۔

''نہیں ابا۔ مجھے تو اس کا شوق ہی نہیں۔''

''یہ بھی اچھا ہے۔ اب میری آخری بات غور سے سن۔ چھوٹے ٹھاکر نے تیری ماں کا دودھ پیا ہے۔ اس طرح وہ تیری ماں کا بیٹا ہے۔ تیرا بھائی ہے۔ لیکن تو اس کا بھائی نہیں۔ تو غلام ہی

رہنا۔ کبھی اس کی برابری نہ کرنا۔ وہ تجھے اپنا بھائی سمجھے تو یہ اس کی بڑائی ہے۔ پر تو کبھی خود کو اس کا بھائی نہ سمجھنا۔ وہ تجھے کھیل میں، کسی بھی چیز میں شریک کرے، تجھے یہ خیال رکھنا ہے کہ تو زمین ہے اور وہ آسمان اور زمین اور آسمان کبھی نہیں ملتے۔''

چار سال کے بچے نے فوراً چیلنج کیا۔ ''ابا، آسمان اور زمین تو ملتے ہیں۔ وہ دیکھیں۔''

جمال دین نے اس طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ ''اس جگہ کی کوئی نشانی مقرر کر لے بیٹے، جہاں زمین اور آسمان مل رہے ہیں۔''

وصال دین نے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''وہ جو بڑا پیڑ ہے برگد کا، وہاں ابا۔''

جمال دین اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چل بیٹے۔ دیکھ آتے ہیں۔''

دونوں گھر سے نکل آئے۔ وہ پیڑ کوئی میل سوا میل کے فاصلے پر تھا۔ ''تو بس پیڑ پر نظر رکھنا بیٹے۔''

دھوپ میں وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ پسینے میں نہا گئے۔ ''اب دیکھ بیٹے، آسمان کہاں ہے اور زمین کہاں ہے۔'' جمال دین نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

وصال دین شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اور وہ آگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''وہ دیکھو ابا۔ کرتارے کے گھر کی چھت پر۔''

''چل، وہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' جمال دین نے نرمی سے کہا۔

ننھے بچے کے حصے میں وہاں پہنچ کر بھی شرمندگی ہی تھی۔ مگر وہ اب بھی آگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''دیکھ بیٹے، یہ نظر کا دھوکا ہے۔ زمین آسمان کبھی نہیں ملتے۔ دیکھنے والے کو ایسا لگتا ہے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے تو چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ کھیلے تو دیکھنے والوں کو لگے کہ تو اور وہ دوست ہیں لیکن اصل میں وہ مالک ہیں اور تو غلام۔ تجھے یہ بات یاد رکھنی چاہیے بیٹے۔''

''ٹھیک ہے ابا۔'' وصال دین نے کہا۔ اس نے زمین اور آسمان کا فلسفہ بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا......اور ہمیشہ کے لیے سمجھ لیا تھا۔

کہتے ہیں کہ ہر بیٹا اپنے باپ پر جاتا ہے۔ کچھ چیزیں تو پیدائش کے وقت ورثے میں خود بخود مل جاتی ہیں۔ وصال دین بھی جمال دین کا بیٹا تھا۔ جو باپ نے سمجھایا تھا، وہ اپنی جگہ۔ لیکن کچھ تو اس کے اندر پہلے سے موجود تھا۔ ''ابا...... آپ بڑے ٹھاکر جی کی ہر بات مانتے ہو۔ انکار نہیں کرتے؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل بیٹا۔ میں انکار کر ہی نہیں سکتا۔''

''تو میں بھی کبھی انکار نہ کروں۔''

"یہی تو میں سمجھا رہا ہوں تجھے۔"

"وہ گھوڑا بنیں اور مجھ سے بیٹھنے کو کہیں تو۔"

جمال دین لاجواب ہوگیا۔ "ٹھیک ہے۔ پر اپنی حیثیت ہمیشہ یاد رکھنا۔" اس نے بجھے دل سے کہا۔

❀......❀......❀

وہ تیسرا سال تھا کہ ٹھاکر فصلوں کی آمدنی میں جمال دین کا حصہ لے کر اس کے گھر آیا تھا۔ اس نے رقم کی پوٹلی جمال دین کو دیتے ہوئے کہا۔ "تم کب تک اپنے حصے کا کام مجھ سے کراتے رہو گے جمال دین۔ اب مجھے ہلکا کردو۔"

جمال دین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ پوٹلی ہاتھ میں لیے نظر میں جھکائے بیٹھا رہا۔

"تم تو کچھ بولتے ہی نہیں۔ بھئی اپنی زمینوں کا انتظام آپ سنبھالو نا۔"

"مجھے یہ سب کچھ آتا ہی نہیں ٹھاکر جی۔" جمال دین نے دبی آواز میں کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ، اس پیسے کا کیا کرتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ صندوق میں رکھ دیتا ہوں ٹھاکر جی۔"

"اب یہ نہ کہنا کہ تمھیں پیسہ خرچ کرنا بھی نہیں آتا۔"

"سچ ہے ٹھاکر جی۔ مجھے یہ بھی نہیں آتا۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اچھا سا مکان بنواؤ۔ مال مویشی خریدو۔ میری بہن کے لیے زیور گہنا بنواؤ۔ اب تمھارے پاس کمی تو نہیں ہے۔"

"نہیں ٹھاکر جی۔ اب تو زیادتی ہے جی۔ مکان کی ضرورت نہیں۔ یہ مکان کافی ہے ہمارے لیے۔ ابا کے ساتھ یہاں برسوں رہا ہوں میں۔ یہ ابا کی نشانی ہے۔"

"تو زمین کی کمی نہیں تمھارے پاس۔ کسی دوسری جگہ مکان بنوالو۔"

"ہم یہاں خوش ہیں ٹھاکر جی۔ تو دوسرا مکان کس کے لیے بنواؤں اور مال مویشی رکھوں تو اکیلی جان۔ کیسے دیکھ بھال کروں گا ان کی۔"

"نوکر ملازم رکھ لینا۔"

"نہیں ٹھاکر جی۔ میں تو خود نوکر ہوں۔ یہ کام میرے لیے اچھا نہیں اور حمیدہ کو زیور سے دلچسپی نہیں۔"

ٹھاکر کو حیرت ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اب جمال دین کے پاس لاکھوں روپے ہیں، جائیداد ہے لیکن وہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس میں اوپر جانے کی لگن بھی ہی نہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک ٹھاکر کے مقابلے میں کھڑا ہو چکا ہوتا۔ اس نے یہ بات جمال دین سے کہہ دی۔

"میں آپ کے سائے میں رہنا چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ مجھے بڑا نہیں بننا۔ جیسا مجھے رب نے بنایا ہے، میں ویسا ہی اچھا ہوں۔" جمال دین نے کہا۔ "جو زمین آپ نے میرے ابا کو دی تھی، وہ ہماری ضرورت کے لیے بہت کافی ہے۔ باقی سب کچھ تو میں نے صرف آپ کی خوشی کے لیے رکھا ہے۔ ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔"

"اتنا مانتا ہے مجھے۔" ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

"اتنا مانتا ہوں ٹھاکر جی کہ بتا نہیں سکتا۔" جمال دین نے کہا۔ "آپ کے حکم پر میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ جان بھی حاضر ہے۔"

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "اچھا۔ میں کہوں، نماز چھوڑ دے تو تو نماز چھوڑ دے گا۔"

"نہیں ٹھاکر جی۔ نہیں چھوڑوں گا۔"

"تو پھر کیا مانتا ہے مجھے۔"

"ہر ایک کا اپنا مقام ہے ٹھاکر جی۔ اللہ کا حکم سب سے بڑا ہے۔ اس کے حکم پر تو آدمی دوسروں کو مانتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا مقام سمجھتا ہے۔ جیسے آپ کے مقابلے میں کسی اور کی بات نہیں مانوں گا۔ ویسے ہی اللہ کے مقابلے میں آپ کی بات نہیں مانوں گا۔"

ٹھاکر کے تجسس کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے جمال دین کو ہمیشہ وفاداری، عاجزی اور فرماں برداری میں لپٹا دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کررہا تھا اور اس نے صاف انکار کیا تھا۔ "یہ کیا بات ہوئی جمال دین۔"

"اللہ سب سے بڑا ہے ٹھاکر جی۔ سب کچھ اس کے حکم سے ہے۔"

"اور یہ اپنا حکم نہ ماننے کی سزا میں تجھے یہاں سے نکال دوں تو۔"

"میں یہاں سے چلا جاؤں گا ٹھاکر جی۔" جمال دین نے ٹھاکر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔"

"اور جو تیرے اپنے گاؤں میں زمین تیرے باپ پر تنگ ہوئی تھی، تو کس نے اسے سہارا دیا تھا۔"

"آپ نے۔"

"تو تجھے اللہ کے مقابلے میں میرا حکم نہیں ماننا چاہیے؟" ٹھاکر نے بے حد رسان سے کہا۔

"نہیں ٹھاکر جی۔ آپ کو اللہ نے ہمارا وسیلہ بنایا تھا۔ آپ کے دل میں ہماری مدد کا خیال اللہ نے ڈالا تھا۔ ہمیں تو پہلے اللہ کا حکم ماننا ہے۔"

"اور میں تجھے یہاں سے نکال دوں تو تم لوگ بھوکے نہیں مرجاؤ گے۔"

''نہیں سرکار۔ اللہ رزق دینے والا ہے۔''

''تجھے یہ یقین کیسے ہے؟''

''اللہ نے رزق کا وعدہ فرمایا ہے ٹھاکر جی۔ اور دیکھ لیں۔ کہیں کال پڑ جائے تو لوگ بھوک سے مرتے ہیں۔ یہ اللہ کا قہر ہے۔ ورنہ کہیں بھوک سے کوئی نہیں مرتا اور پھر ہم جانتے ہیں کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے۔ مرنا ہے تو مرنا ہے۔'' ''یہ تو ایمان ہے ہمارا ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر بہت حیران تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ راجپوت آن کی خاطر بھگوان سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ذرا سے فائدے کے لیے بھگوان کے حکم کا انکار کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ جمال دین کس مٹی کا بنا ہے۔ پہلی بار اس کے دل کی گہرائیوں میں مسلمان کی عزت پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا، ارے یہ تو ہم سے بڑھ کر اصول کے پکے ہیں۔ ''چھوڑ ان باتوں کو جمال دین۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں یونہی تجھے آزما رہا تھا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تو اچھی طرح رہے۔ اب پیسے کی تو کمی نہیں ہے تجھے۔ تو بڑا زمین وار ہے۔ تجھے شان سے رہنا چاہیے۔''

''ساری شان اس رب کی ہے ٹھاکر جی۔'' جمال دین نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے لیے تو اوپر وہ ہے اور نیچے آپ ہیں۔''

''اچھا۔ میں چلتا ہوں جمال دین۔'' ٹھاکر اٹھ کھڑا ہوا۔

❁……❁……❁

جمال دین کی اس ملاقات اور گفتگو نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ پر بہت گہرا اور اَن مٹ نقش چھوڑا تھا۔ اس رات وہ دیر تک اس سلسلے میں سوچتا اور غور کرتا رہا۔ اسے یاد تھا کہ بچپن ہی سے اس نے مسلمانوں کے لیے لفظ ملیچھ سنا تھا۔ ہندو ان کا ذکر حقارت سے کرتے تھے۔ اب ملیچھ کا مطلب ہی گندا ہے۔ تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ اس سوچ کے ساتھ بڑا ہوا تھا۔ راجپوتوں میں تو ویسے ہی برتری کا احساس بہت ہوتا ہے۔ وہ اپنے سامنے کسی کو نہیں گردانتے۔ اور ایسے ہی نہیں۔ ان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ بات کے سچے، کھرے اور صاف گو ہوتے ہیں۔ بہادر ہوتے ہیں۔ پیچھے سے وار نہیں کرتے اور کمزور پر ہاتھ اٹھانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ آن کے مقابلے میں جان کی بھی انھیں پروا نہیں ہوتی۔ وعدہ وہ کبھی نہیں توڑتے اور دوستی ہر قیمت پر نبھاتے ہیں۔ اور انھیں اپنے ان اوصاف پر فخر ہوتا ہے۔ فخر انھیں اپنے نسب پر بھی ہوتا ہے۔ اور اسی لیے وہ اپنے خون میں ملاوٹ پسند نہیں کرتے اسے خالص رکھنا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ جب چھوٹے کے دودھ کا مسئلہ سامنے آیا تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ آگ بگولا ہو گیا۔ اس کا بیٹا ایک مسلمان عورت کا دودھ پی کر اس کے خالص خون میں ملاوٹ کرے، یہ وہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ مگر وہ بچہ اس کے لیے زندگی، آن، دھرم، ہر چیز سے بڑھ کر تھا۔ وہ اسے

بائیس برس کی منتوں مرادوں کے بعد ملا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ کبھی صاحب اولاد نہیں ہو سکے گا۔ یہ بچہ نہ رہا تو اس کی نسل اسی پر ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اسے بچے کی ضد کے آگے ہارنا پڑا۔

اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے اسے اور ٹھاکرانی کو خواب میں بیک وقت بشارت دینے والا بھی مسلمان تھا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ بشارت سچی تھی۔ پھر اس کی پیدائش والے دن جو مجذوب آیا، وہ بھی مسلمان تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے خواب میں اسی مسلمان بزرگ کو دیکھا تھا۔ اسے ان کی ہر بات، ہر تنبیہ یاد تھی اور وہ بچہ نہیں تھا۔ چاہے وہ شعوری طور پر اعتراف کرنے سے بچے، لیکن اس نے جان لیا تھا کہ اس کے بچے کا مسلمانوں سے کوئی تعلق ہے اور اس کا جھکاؤ بھی مسلمانوں کی طرف ہے۔ یہی سمجھنے کے بعد تو اس نے مسلمانوں کے لیے اپنا رویہ تبدیل کیا تھا بلکہ ٹھاکرانی کو بھی تنبیہ کی تھی۔

بچے کی دودھ کی ضد کے سامنے ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے بری طرح شکست کھائی تھی۔ لیکن ایک سچے اور اچھے راجپوت کی طرح اس نے سر جھکایا تو پوری طرح جھکایا اس نے اس دن کے بعد حمیدہ کو اپنے من میں بہن کا درجہ دیا اور وہ سب کچھ کیا جو ایک احسان مند راجپوت کر سکتا تھا۔ لیکن برسوں کے نظریات جو اس کے باطن میں جڑ پکڑے ہوئے تھے، ایک دم سے نہیں مٹ سکتے تھے۔ چنانچہ یہ خلش اسے ہمیشہ ستاتی رہی کہ اس کا خالص خون خالص نہیں رہا۔ اس میں ملاوٹ ہو گئی ہے۔

قدرتی بات ہے کہ وہ اس پر غور کرتا تھا کہ اس کے خون میں ملاوٹ آخر کس قسم کی ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے بیٹے میں کیسی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کے پاس مسلمانوں کے بس دو ہی حوالے تھے۔ ایک اپنے پرانے کلاس فیلو امان اللہ کا اور دوسرا مہر دین اور اسکے گھرانے کا۔ مگر پہلے اسے ان کے بارے میں غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے وقت میں پیچھے جا کر یاد کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اور اس نے امان اللہ کو نظرانداز کر دیا۔ ایک تو اس کا ساتھ بہت پرانی اور بھولی بسری بات تھی۔ دوسرے اس سے کوئی بالواسطہ تعلق بھی نہیں تھا۔ جبکہ مہر دین کے بیٹے جمال دین سے تھا۔ اس کا بیٹا اسی کی بیوی کا دودھ تو پی رہا تھا۔

سب سے پہلے تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمان گندے ہرگز نہیں ہوتے۔ اس لیے انھیں ملیچھ کہہ کر پکارنا غلط ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ہندوؤں سے کہیں زیادہ صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ ہر نماز سے پہلے، یعنی دن میں کئی مرتبہ تو وہ آدھا اشنان کرتے ہیں۔ اس کے بغیر تو وہ نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔ پھر اپنی عادات میں بھی وہ پاکیزہ ہوتے ہیں۔ اور یہ کھلی ہوئی بات تھی۔

پھر ٹھاکر کو مہر دین سے ملاقات یاد آئی۔ وہ جب اس سے ملا تو مہاجن اس کے گھر پر قبضہ کر رہا تھا اور پوری بات ٹھاکر کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ گاؤں کا زمین دار مہر دین کی بیٹی کے چکر میں تھا اور اس سلسلے میں مہاجن کے قرضے کو استعمال کر رہا تھا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے ایسے کھیل بہت دیکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان کے گاؤں، دیہاتوں بلکہ شہروں میں یہ کھیل کروڑوں بار کھیلا جا چکا ہے اور ہر بار غریب کسان نے شکست کھائی ہے اور ظالم زمین دار فتح یاب ہوا ہے۔ غریب نے ہمیشہ عزت اور آبرو کے بدلے اپنا گھر، اپنا معاش بچایا ہے۔ لیکن مہر دین اس پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ ٹھاکر کو اس کی یہی ادا تو بھائی تھی۔ راجپوت اپنے کردار کے اوصاف پر فخر کرتا ہے۔ مگر اور کسی میں کردار دیکھے اور اوصاف نظر آئیں تو اسے بھی عزت دیتا ہے۔

پھر وہ گھرانہ اس کے گاؤں میں آباد ہو گیا تھا۔ تب اس نے ان کے اور اوصاف دیکھے۔ مگر ان پر غور اب کر رہا تھا۔ وہ وفادار تھے۔ بات کے پکے تھے۔ احسان ماننے والے تھے۔ مطلبی نہیں تھے۔ احسان کرنے والے کے لیے جان دینے میں بھی انھیں عار نہیں تھی۔ یہ چھوٹی خوبیاں نہیں ہوتیں۔

یہ سب پرانی باتیں تھیں۔ مگر اب ٹھاکر پرتاپ سنگھ جمال دین سے اپنی تازہ ترین گفتگو کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ وہ اپنا اور جمال دین کا موازنہ کر رہا تھا۔ اور موازنہ کرنے کے لیے آئینہ دیکھنا ضروری ہے۔ ٹھاکر کو خود کو بھی سمجھنا تھا۔ پہلے ہی مرحلے میں اسے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمانوں کے لیے اس کی ناپسندیدگی کی کوئی ٹھوس اور معقول وجہ نہیں تھی بلکہ اس کا سبب نسل در نسل ورثے میں ملنے والا تعصب تھا اور وہ خود کوئی اچھا ہندو نہیں تھا۔ اس کے خیال میں یہ دیوی دیوتا سب فرسودہ باتیں تھیں۔ اس نے زندگی میں کبھی پوجا نہیں کی تھی۔ مگر جب اسے بیٹے کی آرزو ہوئی اور وہ پوری ہوتی نظر نہیں آئی تو وہ مندروں میں گیا، پوجا کی، چڑھاوے دیے۔ درختوں تک سے اولاد مانگی۔ اس نے یہ سب کچھ کیا تو اپنی غرض، اپنے مطلب سے۔ اس وقت اگر کوئی اس سے کہہ دیتا کہ اپنے گاؤں میں مندر گرا دینے سے، کوئی مورتی توڑ دینے سے اس کی مراد پوری ہو سکتی ہے تو وہ یقیناً ایسا کر گزرتا۔

اور اصل راجپوت ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے برعکس ایک عام مسلمان جمال دین تھا، جس کی ذات کا، حسب نسب کا پتا نہیں تھا، بلکہ یقیناً وہ اونچی ذات کا نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کے ہندو ہونے کے باوجود اس کے احسان کے حوالے سے اس کی ایسی عزت کرتا تھا کہ اس کے لیے جان دے سکتا تھا۔ اس نے خود کہا تھا کہ وہ اللہ کے بعد اسے سب سے بڑا مقام دیتا ہے..... اسے..... ایک ہندو کو! اس کی طاقت کی وجہ سے نہیں۔ صرف اس لیے کہ اس کے اللہ نے احسان ماننے کا حکم دیا ہے اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ چاہے اس سے روزگار چھن جائے، گھربار چھن جائے، بیوی بچے حتیٰ کہ زندگی چھن جائے، پھر بھی وہ نماز چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر وہ اس سے مورتی کی پوجا کرنے کو

کہتا، تب بھی وہ انکار کر دیتا اور وہ منافق بھی نہیں تھا کہ گھر بچانے کے لیے نماز چھوڑنے کی حامی بھر لیتا۔ بعد میں چاہے چھپ کر نماز پڑھتا رہتا۔ یعنی وہ بزدل نہیں تھا۔ بہادر تھا۔ کمزور ہونے کے باوجود طاقت ور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انکار کرتا تھا۔

اور ایک بہت بڑی خوبی جمال دین کا ایمان تھا۔ اللہ رزق دے گا۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہے۔ اس کا حکم ہو گا تو وہ مر جائے گا۔ زندگی بچانے کے لیے اس کے حکم کے خلاف کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ ایمان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مگر اسے ایمان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ اسے جمال دین پر رشک آیا۔ یہ ایمان اس کے پاس ہوتا تو وہ کہتا...... میرے چھوٹے ٹھاکر بھگوان کی مرضی ہوئی تو جئیں گے۔ میں انھیں مسلمان عورت کا دودھ نہیں پینے دوں گا۔ ٹھاکر کو نامعلوم طور پر احساس ہو رہا تھا کہ ایمان والے کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ کیسے؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب جمال دین کے پاس ٹھاکر سے زیادہ زمین تھی، زیادہ پیسہ تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ٹھاکر کی نکالنے کی دھمکی سن کر کہتا، تم مجھے کیا نکالو گے۔ میں مالک ہوں اس زمین کا۔ میں تمھیں نکال دوں گا یہاں سے۔ لیکن جمال دین نے اس کے نکالنے کا حق تسلیم کیا تھا۔ اس نے اپنا ناتا اللہ سے ہی جوڑا۔ اور وہ کیسا آدمی ہے کہ اتنی زمین، اتنے پیسے کا مالک ہونے کے باوجود اپنے حال میں مست ہے۔ اس نے کسی سے نہیں کہا کہ اب میں بہت بڑا زمین دار ہوں۔ اس میں بڑائی نہیں۔ عاجزی ہی عاجزی ہے اور اس نے آخر میں کیسے کہا کہ میرے لیے تو اوپر اللہ ہے اور یہاں آپ ہیں ٹھاکر جی۔

اس عاجزی کے سامنے ٹھاکر کا سر جھک گیا۔ اس نے دل میں تسلیم کر لیا کہ جمال دین اس سے بڑا آدمی ہے۔ اس میں راج پوتوں سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ پہلی بار اسے یہ اطمینان ہوا کہ حمیدہ کے دودھ نے اس کے بیٹے کو اور بہتر انسان بنایا ہو گا اور یہ کہ وصال دین کے ساتھ کھیل کر اسے خوبیاں ہی ملیں گی خرابیاں نہیں۔

اس رات ٹھاکر پرتاپ سنگھ سویا تو اس کی شخصیت میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہو چکا تھا۔

❀ ❀ ❀

ٹھاکرانی رنجیتا ان دنوں بہت پریشان تھی۔ پریشان بھی اور خوف زدہ بھی۔ پریشان وہ اس لیے تھی کہ اس کا ننھا بیٹا حمیدہ اور وصال دین سے بہت قریب ہو گیا تھا بلکہ یوں کہیے کہ وہ انھیں دیکھ کر جیتا تھا۔ اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ زیادہ لوگوں سے گھلتا ملتا نہیں تھا۔ اور جن لوگوں سے تعلق جڑا تو وہ بہت گہرائی تک جڑا تھا اس کی زندگی میں ماتا جی، پتا جی، اماں، ویر جی اور چاچا جی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ گھر میں اتنے ملازم، اتنی نوکرانیاں تھیں۔ مگر اسے کسی سے غرض نہیں تھی۔

اب جبکہ اس کا دودھ چھڑایا جا چکا تھا، تو ٹھاکرانی چاہتی تھی کہ اسے حمیدہ اور اس کے پریوار سے دور کر دے لیکن چھوٹا جس طرح ان کا دیوانہ تھا، اس میں یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا، اور یہ تعلق اسی طرح بڑھتا رہا تو ٹھاکرانی کو خوف تھا کہ کسی دن ٹھاکر بری طرح بھڑک جائے گا۔

ویسے ٹھاکرانی کو اپنے چھوٹے سے بچے پر ترس بھی آتا تھا۔ اپنے بھائی بہن ہوں تو بچہ اتنا تنہا نہیں ہوتا لیکن ننھا اوتار سنگھ تو بالکل اکیلا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ حمیدہ اور وصال دین نہ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ ٹھاکرانی سوچتی تو اسے اس پر شرمندگی ہوتی کہ وہ انھیں بھی اس سے چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔

پھر اسے خوف تھا اوتار سنگھ ساڑھے تین سال کا ہو چکا تھا۔ ٹھاکر پڑھا لکھا آدمی تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو تعلیم دلائے گا۔ اور گاؤں میں کوئی اسکول تھا بھی نہیں۔ تو تعلیم کے لیے چھوٹے کو گھر سے دور جانا ہوگا۔ ابھی تک تو ٹھاکر نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن ٹھاکرانی جانتی تھی کہ اس کے سر پر جدائی کی تلوار لٹک رہی ہے۔ یہ خیال ہی اس کے لیے تڑپا دینے والا تھا کہ ننھا راج کمار اس سے دور ہو جائے گا۔ برسوں کی تنہائی کے بعد وہ اسے ملا تھا۔ وہ تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی خود سے دور کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ٹھاکرانی کو بیٹے سے اپنی جدائی کا خیال آتا تو وہ بے رحم ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ وہ عمر بھر کی ترسی ہوئی ماں ہو کر بھی اپنے بیٹے کی جدائی برداشت کر سکتی ہے تو اس کا بیٹا جو صرف ساڑھے تین سال کا ہے، حمیدہ اور وصال دین کی جدائی برداشت کیوں نہیں کر سکتا۔

یوں سوچتے سوچتے اسے ایک دن اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ مسئلے دو نہیں رہے، ایک ہو گیا۔ اس کے ایک مسئلے میں دوسرے مسئلے کا حل تھا۔ اوتار سنگھ پڑھنے کے لیے شہر جاتا تو وہ حمیدہ اور وصال دین سے بھی دور ہو جاتا لیکن اس سے ٹھاکرانی کی تسلی نہیں ہوئی۔ یوں وہ بھی تو محروم ہو جائے گی اپنے بیٹے سے، ایسا کیوں ہو۔ اس کا دودھ کا مطلب نکل چکا تو وہ پھر سے رقابت کی آگ میں جلنے لگی تھی۔

آدمی جس چیز سے ڈرتا ہے، ڈر بڑھ جائے تو خود اس کی طرف لپکتا ہے۔ ٹھاکرانی کی پریشانی اور خوف اتنا بڑھا کہ اس نے خود ہی آگ میں کودنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس رات ننھے ٹھاکر کو سلانے کے بعد وہ بڑے ٹھاکر کے کمرے کی طرف چل دی۔

اوتار سنگھ کی پیدائش کے بعد بڑے ٹھاکر میں بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس کی باہری مصروفیات کم ہو گئی تھیں۔ شام ہوتے ہی وہ گھر میں آ جاتا اوتار سنگھ کے سونے تک وہ اس کے ساتھ وقت گزارتا۔ یہ اس کا ٹھاکرانی پر احسان تھا۔ کیونکہ ننھا اوتار سنگھ سوال بہت کرتا تھا۔ اور زیادہ تر سوال ایسے ہوتے تھے کہ ٹھاکرانی ان کا جواب نہیں دے سکتی تھی بلکہ وہ دیکھتی تھی کہ بعض اوقات تو ٹھاکر بھی پریشان ہو جاتا ہے کہ کیا جواب دے۔

ٹھاکرانی پورے یقین کے ساتھ ٹھاکر کے کمرے کی طرف گئی اور اس کا یقین غلط بھی نہیں تھا۔ ٹھاکر اپنی مسہری پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ ایسا منہمک تھا کہ اسے ٹھاکرانی کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا۔ ٹھاکرانی کے پکارنے پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”رنجو تم؟ کب آئیں؟“

”دیر ہو گئی ناتھ۔ پر آپ تو ایسے کھوئے ہوئے ہیں۔“ ٹھاکرانی نے شکایتاً کہا۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ پچھلے چند ماہ سے ٹھاکر کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ ہر ہفتے پندرہ دن میں وہ شہر جاتا اور کتابیں خرید کر لاتا۔ اوتار سنگھ کے سونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا۔

ٹھاکر نے کتاب الٹ کر رکھ دی۔ ”ہاں، پڑھتے ہوئے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا۔“

”یہ آپ کو اب پڑھنے کا شوق ہوا ہے۔“

”بڑھاپے میں۔“ ٹھاکر نے ہنستے ہوئے ٹکڑا لگایا۔ ”تمھیں حیرت ہوتی ہے؟“

”ہاں ناتھ۔ میری سمجھ میں اس کی ضرورت نہیں آتی۔ پڑھتے کیا ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں زندگی کو، دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”مگر کس لیے؟“

”تمھارے بیٹے کے لیے رنجو۔“ ٹھاکر مسکرایا۔ ”دیکھتی نہیں، کیسے کیسے سوال کرتا ہے۔ میں جواب نہ دے پاؤں تو سمجھے گا کہ اس کا پتا جاہل ہے۔“

”بھگوان نہ کرے۔“ ٹھاکرانی نے جلدی سے کہا۔ ”ویسے وہ سوال بڑے عجیب کرتا ہے۔“ ٹھاکرانی کے لہجے میں فخر تھا۔

”تو ایسے بچے کے لیے تیاری کرنا ضروری ہے نا۔ ایسی تو میں نے کبھی اپنے امتحان کے لیے بھی تیاری نہیں کی تھی۔“ ٹھاکر ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ”یہ بتاؤ، تم کیسے آئی ہو۔ ویسے تو کبھی خیال ہی نہیں آتا میرا۔ چھوٹے کے بعد تو بس تم اس کی ہو گئیں۔ مجھے تو چھوڑ ہی دیا تم نے۔“

”ایسی باتیں نہ کریں ناتھ۔“ ٹھاکرانی کھسیا گئی۔ ”پر اس وقت تو میں کام سے ہی آئی ہوں۔“

”تو کہہ دو جلدی سے۔“

”میں چاہتی ہوں کہ اپنے چھوٹے کو حمیدہ اور وصال دین سے دور کر دیا جائے۔“

”کیوں بھئی؟“ ٹھاکر حیران رہ گیا۔

”ناتھ، بچہ اب سیکھنے کی عمر میں ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ رہے گا تو انھی کی باتیں سیکھے گا۔“

”یہ تو پہلے سوچنے کی بات تھی ٹھاکرانی۔“ ٹھاکر نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اس نے تو دودھ ہی مسلمان عورت کا پیا ہے۔ اب اتنی فکر کاہے کی کرتی ہو۔“

”وہ تو مجبوری تھی ناتھ۔ بچے کی ضد کے آگے ہارنا پڑا۔ پر اب تو وہ دودھ چھوڑ چکا

ہے۔اب تو اسے آسانی سے ان سے دور کیا جا سکتا ہے۔"

"تم بھول رہی ہو ٹھاکرانی کہ ہم راجپوت آن کے مقابلے میں کسی مجبوری کو نہیں مانتے۔" ٹھاکر کے تیور بہت خراب تھے۔"اور احسان لینا ہمیں منظور نہیں ہوتا۔لیکن احسان لے لیں تو جیون بھر یاد رکھتے ہیں۔سر جھک جائے تو جیون بھر نہیں اٹھتا۔کیا ہم راجپوت عام لوگوں کی طرح مطلبی ہو سکتے ہیں کہ مطلب نکل جانے کے بعد منہ پھیر لیں۔نہیں۔ہرگز نہیں۔ہم نے ایسا کیا تو ہم میں اور ایک نیچ منش میں کیا فرق رہ جائے گا۔"

ٹھاکرانی اس کے تیور دیکھ کر سہم گئی۔"شما کر دیں ناتھ۔میں تو سب کا بھلا سوچ رہی تھی۔"

"اچھا...... یہ تو بتاؤ، تم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتی تھیں۔تمھارے خیال میں چھوٹے ٹھاکر کو ان لوگوں سے کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟"

"حمیدہ اور اس کے بیٹے کو حویلی آنے سے روک دیا جائے۔" ٹھاکرانی نے کہا۔اس کے دل میں امید جاگ اٹھی تھی۔

"تم بڑی نادان ہو رنجو۔اپنے بیٹے کو بھی نہیں جانتیں۔" اس بار ٹھاکر کے لہجے میں پیار تھا۔"جب اسے بولنا نہیں آتا تھا، کچھ بھی نہیں آتا تھا، طاقت بھی نہیں تھی اس میں، تب بھی اس کی ضد نے ہمیں ہرا دیا تھا۔اب کیا ہو سکتا ہے، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔"

ٹھاکرانی کچھ نہ بولی۔یہ بات اس کے دل کو لگی تھی۔لیکن اس کے ترکش میں ایک تیرا بھی باقی تھا۔"اور ناتھ۔دوسری فکر مجھے چھوٹے کی پڑھائی کی ہے۔اب پڑھنے کی عمر میں آ رہا ہے وہ۔"

"ہاں...... بلکہ آ چکا ہے۔" ٹھاکر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔"اس کے سوال، اس کی پوچھ تاچھ سے یہی پتا چلتا ہے۔میرا خیال ہے، کچھ ہی دن بعد میں اس کے سوالوں کے جواب دینے سے ہار جاؤں گا۔ہاں، اب اسے کسی گیانی استاد کی ضرورت ہے۔"

"لیکن یہاں قریب میں کوئی اچھا اسکول نہیں ہے۔"

"یہ درست ہے۔تو پھر؟"

"اسے شہر بھیجنا پڑے گا۔"

ٹھاکر دل ہی دل میں پتنی کی عقل مندی پر مسکرایا۔وہ ہر بات بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔"میں نہیں سمجھتا کہ تم اس سے دوری سہہ سکتی ہو۔اور تم چاہے سہہ لو، یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

اب کے سوال اٹھانے کی باری ٹھاکرانی کی تھی۔"تو پھر؟ اسے پڑھانا تو ضروری ہے۔"

"ہاں۔لیکن میں ابھی تو اسے خود سے دور نہیں کر سکتا۔کچھ بڑا ہو جائے تو دیکھیں گے۔"

"تو پھر؟"

"تم یہ مجھ پر چھوڑ دو رنجو۔" ٹھاکر نے بڑے پیار سے کہا۔"میں خود دہلی جاؤں گا۔اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا۔"

اب ٹھاکرانی کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔"جو آپ کی اچھا سوامی جی۔" اس نے کمزور آواز میں کہا۔

❁......❁......❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اپنے بچے کو ایک کڑی آزمائش سے بچانے کی کوشش کی تھی۔لیکن ٹھاکرانی کو اس سے تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا کہ اس سلسلے میں کوشش ہی نہیں کی گئی اور وہ ہمیشہ افسوس کرتی اور ہاتھ ملتی۔لیکن قدرت نے اسے اس کشٹ سے بچا لیا۔

اس بات کو چند ہی روز ہوئے ہوں گے کہ پہلی بار معمول میں فرق آیا۔حمیدہ اور وصال دین حویلی نہیں آئے۔اس روز جمال دین اکیلا ہی آیا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ نے اسے حیرت سے دیکھا۔"چاچا جی، اماں نہیں آئیں۔ویر جی نہیں آئے؟"

"نہیں چھوٹے ٹھاکر۔وہ نہیں آ سکیں گے۔وصال دین کو بخار ہے...... بہت تیز بخار۔"

ننھے ٹھاکر نے پہلے بخار کا نام بھی نہیں سنا تھا۔وہ اپنی اماں اور ویر جی کے نہ آنے کو بھی بھول گیا۔فطری تجسس ہر بات پر حاوی آ گیا۔"یہ بخار کیا ہوتا ہے چاچا جی؟"

جمال دین گڑبڑا گیا۔وہ اس طرح کے سوالات کا عادی نہیں تھا۔اب بخار کے بارے میں کیا بتائے۔چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔"ایک بیماری ہوتی ہے۔"

"اور بیماری کیا ہوتی ہے؟"

جمال دین اور گڑبڑا گیا۔اس دوران ٹھاکرانی بھی آ گئی تھی اور یہ سب کچھ سن رہی تھی۔وہ جمال دین کی مدد کو بڑھی۔"شریر میں جو خرابی ہوتی ہے، اسے بیماری کہتے ہیں۔" اس نے ننھے بیٹے کو سمجھایا۔

"تو بیماری سے کیا ہوتا ہے؟" ننھے ٹھاکر کے پاس سوالوں کی کمی نہیں تھی۔

"بیماری سے شریر کی شکتی کم ہو جاتی ہے۔"

"اور بخار کیا ہوتا ہے؟"

"اس میں شریر کی گرمی بہت بڑھ جاتی ہے۔شریر دکھتا ہے اور منش چل پھر نہیں سکتا۔"

اس طرف سے تسلی ہوئی تو ننھے ٹھاکر کو اپنی محرومی کا خیال آیا۔"تو ویر جی کب آئیں گے؟"

"پتا نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ بہت تیز بخار ہے اسے۔ دعا کریں کہ شام تک اتر جائے۔"

"خود بخود اتر جائے گا؟"

"نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ابھی میں وید جی کے پاس جا کر دوا لوں گا اس کے لیے۔" جمال دین نے کہا۔ پھر زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آیئے چھوٹے ٹھاکر۔ گھوڑا حاضر ہے۔"

ننھے ٹھاکر نے سواری تو کی۔ لیکن انداز سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ خوش نہیں اور ناشتے سے تو اس نے انکار ہی کر دیا۔ ٹھاکرانی کو تو پرانے دن یاد آ گئے، جب اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔

بہرحال بڑے ٹھاکر کے سمجھانے پر اس نے بڑی بے دلی سے ناشتہ کر لیا لیکن وہ دن اس نے جس طرح گزارا، اسے دیکھ کر ٹھاکر اور ٹھاکرانی دونوں کو ترس آنے لگا۔ وہ تو اس بچے کی طرح تھا، جو بارونق میلے میں اپنے لوگوں سے بچھڑ گیا ہو۔ پورا دن اس نے کسی کھلونے میں، کھیل کود میں دلچسپی نہیں لی۔ بس وہ بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتا تو مشینی انداز میں اِدھر اُدھر چلنے پھرنے لگتا۔ وہ اتنا بیزار اور اکتایا ہوا تھا کہ ٹھاکرانی کا دل کٹنے لگا۔

"چلو...... بھگوان نے تمہاری منو کامنا پوری کر دی۔" ٹھاکر نے رنجیتا سے کہا۔ "ننھا بیٹا حمیدہ اور وصال دین سے دور ہو گیا۔"

"مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ حال ہو جائے گا میرے راج کمار کا۔" ٹھاکرانی نے تاسف سے کہا۔

"مگر میں جانتا تھا۔ اس لیے منع کیا تھا۔"

ننھے ٹھاکر نے کھانا بھی برائے نام کھایا۔ ٹھاکرانی کے اصرار پر اس نے کہا۔ "ماتا جی، کھایا نہیں جاتا۔ گلے میں کچھ پھنس رہا ہے۔"

اس کے لہجے میں ایسی بے چارگی اور دکھ تھا کہ ٹھاکرانی کے اپنے حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔

اور سرِ شام ہی چھوٹا ٹھاکر منہ لپیٹ کر پڑ گیا۔ ورنہ اس وقت ہر روز وہ اپنے پتا جی سے کھیلتا، ان سے باتیں کرتا تھا۔ ٹھاکر نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی جلدی کیوں لیٹ گیا ہے تو اس نے کہا۔ "میں سو جاؤں گا پتا جی۔ صبح اٹھوں گا تو اماں اور ویر جی آ جائیں گے۔"

یعنی وہ اپنے بچھڑے ہوؤں کا انتظار کر رہا تھا۔

ٹھاکرانی کو تو ہول اٹھنے لگا۔ "ناتھ...... بھگوان نہ کرے، اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

ٹھاکر خود بھی پریشان تھا۔ "اگر وہ لوگ کل بھی نہیں آ سکے تو؟"

"بھگوان نہ کرے۔" ٹھاکرانی نے بڑے خلوص سے کہا۔ یہ سوال خود اسے بھی پریشان کر رہا تھا۔ "اور اگر ایسا ہوا تو؟"

"کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔"

"کسی بھی طرح ان کو آنا ہی ہو گا۔"

ٹھاکر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "کیسی بات کرتی ہو رنجیتا۔ وہ بھی منش ہیں۔"

وہ دونوں بار بار بیٹے کے پاس جاتے۔ وہ لیٹا ہوا تو تھا۔ لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ انھوں نے کئی بار اسے پکارا۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ ظاہر یہی کر رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ ٹھاکرانی بار بار اس کا ہاتھ تھام کر دیکھتی کہ کہیں اسے بخار تو نہیں ہے۔

دونوں کی وہ رات سوتے جاگتے گزری۔ کیونکہ ان کا بیٹا بھی اسی حال میں تھا۔ ایک جھپکی آتی اور پانچ منٹ بعد وہ چونک کر اٹھ جاتا۔ "ماتا جی...... صبح ہو گئی؟"

"نہیں پتر۔ ابھی تو آدھی رات ہے۔ صبح تو بہت دور ہے۔"

"یہ صبح اتنی دیر میں کیوں ہوتی ہے۔" ننھا بچہ جھنجھلا کر کہتا۔

ٹھاکرانی اسے کیا بتاتی کہ صبح تو اپنے وقت پر ہوتی ہے۔ لیکن انتظار ہو تو وقت جیسے ٹھہر جاتا ہے۔

ٹھاکر بھی رات بھر اس کمرے کے چکر لگاتا رہا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے۔

صبح کے قریب کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ نیند آ ہی جاتی ہے۔ اور گہری نیند آتی ہے۔ اس وقت ٹھاکرانی بھی سو گئی۔ ذرا ہی دیر ہوئی ہو گی کہ اوتار سنگھ نے اسے جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔ "اٹھیں ماتا جی، اٹھ جائیں۔ صبح ہو گئی ہے۔"

ٹھاکرانی گھبرا کر اٹھی۔ کھڑکی کے پاس گئی۔ پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو گہرا اندھیرا تھا۔ "نہیں پتر جی، ابھی تو رات ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں ماتا جی۔ سنیں تو۔ چڑیاں بول رہی ہیں۔"

ٹھاکرانی نے کان لگا کر سنا۔ کہیں ایک آدھ چہکار سنائی دے رہی تھی۔ مگر ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ "سو جاؤ پتر۔ ابھی تھوڑی دیر ہے صبح ہونے میں۔" اس نے بیٹے کو سمجھایا۔

لیکن ننھے ٹھاکر کے لیے انتظار کی رات کی صبح ہو چکی تھی۔ یہ الگ بات کہ انتظار اب بھی کرنا تھا۔ وہ اس کے بعد نہ سویا، نہ ٹھاکرانی کو سونے دیا۔

وہ ایسی صبح تھی، جس میں سب کے لیے انتظار ہی انتظار تھا۔ ٹھاکر اور ٹھاکرانی بھی آنے والوں کے منتظر تھے۔ لیکن ان کے آنے کا وقت ابھی دور تھا۔

اور جب وہ وقت آیا تو مایوسی لے کر آیا۔ اس صبح بھی جمال دین اکیلا ہی آیا۔ ''وصال دین کا بخار کل سے اب تک نہیں اترا ہے۔'' اس نے بتایا۔

ننھے ٹھاکر کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس روز اس نے جمال دین پر سواری کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اور ناشتے کو وہ ہاتھ لگانے کا روادار بھی نہیں تھا۔

ٹھاکر اور ٹھاکرانی پریشان تھے کہ اب کیا کریں۔

اچانک ننھے ٹھاکر نے کہا۔ ''پتاجی...... مجھے ویرجی کے پاس جانا ہے۔ مجھے لے کر چلیں۔''

ٹھاکر کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اسے حیرت ہوئی اور خود پر غصہ بھی آیا۔ اتنے سامنے کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس مسئلے کا واحد حل یہ تھا کہ ننھے ٹھاکر کو وصال دین کے پاس لے جایا جائے۔

لیکن ٹھاکر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹھاکرانی بول اٹھی۔ ''یہ نہیں ہو سکتا پتر۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا ماتاجی؟''

''بس...... نہیں ہو سکتا۔''

''تم چپ رہو ٹھاکرانی۔'' ٹھاکر نے بے حد سخت لہجے میں کہا۔ پھر بیٹے کی طرف مڑا۔ ''یہ ٹھیک ہے پتر۔ ہم خود تمھارے ویرجی کے گھر چلیں گے۔''

ننھا ٹھاکر خوش ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے میں پہلی بار اس کے چہرے پر خوشی نظر آئی تھی۔ اسے دیکھ کر ٹھاکرانی کا دل بھی موم ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے ناتھ۔''

''تم ناشتہ تیار کرو رنجو۔ ہم ناشتہ ساتھ لے کر جائیں گے اور تم جمال دین۔'' ٹھاکر جمال دین کی طرف مڑا۔ ''تم وید جی کو لے کر اپنے گھر پہنچو۔''

''وید جی سے تو مجھے دوا لینی ہے۔'' جمال دین نے حیرت سے کہا۔ ''وہ کب کہیں جاتے ہیں۔''

''ان سے کہنا، یہ میرا حکم ہے۔'' ٹھاکر نے سخت لہجے میں کہا۔

جمال دین چلا گیا۔ ٹھاکر گاڑی تیار کرانے لگا۔ جمال دین کا گھر گاؤں کے آخری سرے پر تھا۔ بچے کو اتنی دور پیدل تو نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔

ٹھاکر نے گاڑی تیار تو کرا لی۔ مگر اس کے بعد وہ دوسرے انداز میں سوچنے لگا۔ اسے یاد تھا کہ اپنی غرض کے لیے جب وہ پہلی بار جمال دین کے گھر گیا تھا تو اس نے یہ خیال رکھا تھا کہ غرض مندوں کی طرح جائے۔ سو وہ آدھی رات کو پیدل ہی اس کے گھر گیا تھا اور آج بھی بات غرض کی تھی۔ تو پھر یہ اہتمام اور کروفر کیسا۔ دوسری بات یہ کہ اوتار سنگھ کا حمیدہ سے دودھ کا تعلق جڑنے کے بعد اس نے اس کے گھرانے کو ہر اعتبار سے برابری کا درجہ دیا تھا۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ یہ

برابری تو نہیں۔ وصال دین اپنی ماں کے ساتھ ہر روز پیدل چل کر حویلی آتا تھا۔ جبکہ اس کا بیٹا تو پہلی بار حمیدہ کے گھر جا رہا تھا۔ اسے بھی پیدل ہی جانا ہے۔

اور اس برابری کے خیال کے تحت ٹھاکر نے ایک فیصلہ اور کیا۔ یہ کیا کہ وصال دین اپنی ماں کے ساتھ ہر روز حویلی آئے۔ یہ بھی برابری تو نہیں۔ برابری تو یہ ہے کہ ایک دن وصال دین حویلی آئے اور دوسرے دن اوتار سنگھ اس کے گھر جائے اور وہاں وقت گزارے۔ یہ فیصلہ کر کے وہ پُرسکون ہو گیا۔

ٹھاکرانی ناشتے کا سامان لے کر آئی تو ٹھاکر نے دونوں فیصلے اسے سنا دیے۔ ٹھاکرانی جزبز تو ہوئی۔ لیکن اختلاف کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ تاہم اس نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ''میرا بچہ اتنا چھوٹا ہے۔ پیدل چلے گا تو تھک جائے گا۔''

''نہیں تھکوں گا ماتاجی۔ ویرجی سے ملنے تو میں خوشی خوشی جاؤں گا۔'' ننھے ٹھاکر نے کسی کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

وہ چلنے لگا تو ٹھاکرانی بھی ساتھ ہو لی۔ ''آج تو میں بھی چلوں گی۔''

ٹھاکر نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹھاکرانی دیکھنا چاہتی ہے کہ اس کا بچہ کہاں جایا کرے گا۔

❁ ❁ ❁

اس سے پہلے ننھے ٹھاکر کی دنیا صرف اس کی آبائی حویلی تھی۔ وہ کبھی باہر نکلا ہی نہیں تھا۔ سو اب وہ حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ یہ باہر کی دنیا بہت بڑی تھی۔ تاحدِ نظر لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیت اور ان میں کام کرتے ہوئے کسان۔ یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگا۔ وہ ہر چیز کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور ہر سوال کے ساتھ وضاحتیں بھی تھیں ٹھاکر جواب دیتے دیتے تھک گیا۔ ''باقی باتیں پھر پوچھ لینا پتر۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی لمحے اسے ایک درخت کے پاس وہی مجذوب کھڑا نظر آیا، جسے اس نے اوتار سنگھ کی پیدائش کے دن دیکھا تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''رنجو...... آج تمھیں بھی اس بابا کے درشن ہونے والے ہیں، جسے تم نے خواب میں دیکھا تھا۔''

ٹھاکرانی نے نظریں اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ مجذوب ان سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ ٹھاکر نے اس کے تھامے ہوئے ہاتھ سے اس کے جسم کی تھرتھراہٹ محسوس کر لی۔ ''کیا بات ہے رنجو؟''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے ناتھ۔'' ٹھاکرانی کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

''دینے والوں سے ڈر کیسا؟'' ٹھاکر نے اسے تسلی دی۔

''دینے والے لے بھی تو سکتے ہیں۔''

وہ مجذوب کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ ٹھاکر اور ٹھاکرانی نے ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا۔ ٹھاکرانی کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

مجذوب ٹھاکرانی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا، جو نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ ''نظریں تو اٹھا ٹھاکرانی'' مجذوب نے دھیمی آواز میں کہا۔

ٹھاکرانی نے ایک لمحے کو نظر اٹھائی اور فوراً ہی جھکالی۔ ان آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہیں تھی اس میں۔

''دینے والے بہت سے نہیں ہوتے نا سمجھ۔ دینے والا ایک ہی ہوتا ہے۔'' مجذوب نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''اور دینے والا اتنا بڑا ہے کہ کسی بات پر خفا ہو کر دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔''

ٹھاکرانی تو یہ سن کر دہل گئی۔ اتنے فاصلے سے اس کی سرگوشی میں کہی ہوئی بات مجذوب نے کیسے سن لی۔

''بھول ہوگئی مہاراج۔ میری پتنی نادان ہے۔ شما کر دیں اسے۔'' ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔

''بھول تو ہوتی ہے۔ معافی بھی مل جاتی ہے۔ لیکن نشانیاں دیکھ کر سمجھنا تو چاہیے۔ یہ بات تو بھی نہیں سمجھا کہ دینے والا صرف ایک ہے۔'' مجذوب کے لہجے میں ہلکی سی سرزنش تھی۔ ''تم کہاں کہاں مانگتے پھرے۔ مگر تمھیں کچھ نہیں ملا۔ پھر دینے والے نے تمھیں کچھ دینے سے پہلے برگد کے اس پیڑ کو جلا دیا، جس سے تم نے آخری بار اولاد مانگی تھی۔ اس میں نشانی تھی کہ برگد کا پیڑ تو خود اپنی مرضی سے رہ بھی نہیں سکتا۔ دینے والا کوئی اور ہے جو تمھیں نظر نہیں آتا۔ مگر تم بدنصیب سمجھتے ہی نہیں۔''

اس بار ٹھاکر پر بھی تھرتھری چڑھ گئی۔ اس پیڑ کا جلنا پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

''بھول ہوگئی مہاراج۔'' وہ گڑگڑایا۔

''کب تک بھولے رہو گے۔ کب تک بھول ہوتی رہے گی۔ خیر، بھول ہوگی تو معافی بھی ملے گی۔ وہ تو بہت معاف کرنے والا ہے مگر بھولے رہو گے تو وہ بھی تمھیں بھول جائے گا۔''

ان لفظوں میں جانے کیا تھا کہ ٹھاکر اور ٹھاکرانی اندر سے تھرا کر رہ گئے۔

''اور سنو۔ میں نے سب کچھ تو سمجھا دیا تھا۔'' مجذوب کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔ ''ٹھاکرانی، تو سمجھتی کیوں نہیں۔ چھوٹے کی خوشی کے آڑے نہ آیا کر۔ تو اس کا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتی۔ بس خود کو دکھی کرلے گی اس کوشش میں۔ محبت کی ہے تو محبت کرنا بھی سیکھ۔ دل بڑا رکھ۔ اس نے تجھے قیمتی چیز دی۔ تو اسے سب کے ساتھ بانٹے گی تو وہ تیرا ہوگا۔ ورنہ تیرا نہیں رہے گا۔ اور سن...... اسے اپنا راستہ معلوم ہے۔ اسے چلنے دے اس کے راستے پر۔ تب تیری بیڑھ بھی دور ہو

جائے گی۔''

اس بار مجذوب کی بات پوری طرح ٹھاکرانی کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''اب غلطی نہیں ہوگی مہاراج۔''

اتنی دیر تک ننھا ٹھاکر مجذوب کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا تھا۔ اچانک مجذوب گھٹنوں کے بل بیٹھا اور اس نے ننھے ٹھاکر کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''آپ کیسے ہیں بیٹے۔'' اس نے کہا اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

''میں ٹھیک ہوں بابا۔ بس میرے ویر جی بیمار ہیں۔'' ننھے ٹھاکر نے کہا۔

''ٹھیک ہو جائے گا وہ۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ بس آپ خوش رہیں خوش رہنے والی باتوں میں۔ اللہ آپ کے ساتھ ہے۔'' یہ کہہ کر مجذوب نے اس کے دونوں ہاتھوں کو محبت سے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔''

مجذوب دہلی کی سمت چل دیا۔ وہ تینوں کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ جمال دین کے گھر کی طرف چلے۔

راستے میں ننھے ٹھاکر نے باپ سے پوچھا۔ ''یہ کون تھے پتا جی؟'' اس کے لہجے میں احترام تھا۔

''یہ بہت بڑے گیانی ہیں پتر...... بڑی شکتی والے۔''

ننھے ٹھاکر نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ گیانی کیا ہوتا ہے اور شکتی کسے کہتے ہیں۔ جیسے وہ یہ بات پہلے سے جانتا ہو۔

چند منٹ بعد وہ جمال دین کے گھر پہنچ گئے۔

❁ ❁ ❁

ویدجی وصال دین کو دوا دے کر جا چکے تھے۔ ننھا ٹھاکر جاتے ہی وصال سے لپٹ گیا۔

''اٹھو نا ویر جی۔ میرے ساتھ کون کھیلے گا۔''

وصال دین کراہ کر رہ گیا۔

''پتا جی، ویر جی کا شریر تو آگ ہو رہا ہے۔'' چھوٹے ٹھاکر نے باپ سے فریاد کی۔

''دوا پیے گا تو ٹھیک ہو جائے گا پتر۔'' ٹھاکر نے اسے دلاسہ دیا۔

''اب ناشتہ تو کرلو چھوٹے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

''ویر جی کے ساتھ کروں گا۔ اماں کے ہاتھ سے کروں گا۔''

دونوں شرطیں پوری کر دی گئیں۔ وصال دین سے کچھ کھایا تو نہیں گیا۔ اس نے دودھ پی لیا۔ ناشتے کے بعد چھوٹا ٹھاکر وصال دین سے لپٹ کر لیٹ گیا۔

ٹھاکرانی پریشان ہوئی۔ مگر ٹھاکر نے اسے بڑے یقین سے کہا۔ ''ڈرو مت ٹھاکرانی۔

تمھارے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔"

ٹھاکرانی کو مجذوب یاد آیا۔ وہ مطمئن ہوگئی۔

ایک گھنٹے بعد ٹھاکر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب ہم جائیں گے جمال دین۔"

"آپ آئے سرکار۔ بڑی مہربانی آپ کی۔" جمال دین نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا پتا جی۔" اوتار سنگھ بولا۔

ٹھاکر مسکرایا۔ "تم سے کون کہہ رہا ہے جانے کو۔ تمھیں میں شام کو آ کر لے جاؤں گا۔"

یہ سن کر حمیدہ ہکا بکا رہ گئی۔ ٹھاکرانی نے اس کی کیفیت بھانپ کر جلدی سے نرم لہجے میں کہا۔ "جب تک وصال دین ٹھیک نہیں ہو جاتا، چھوٹے ٹھاکر خود تمھارے گھر آیا کریں گے۔"

"اور ٹھیک ہو جانے کے بعد ایک دن وصال دین حویلی آئے گا تو دوسرے دن میرا پتر تمھارے گھر آئے گا۔" ٹھاکر بولا۔ "تمھیں بوجھ تو نہیں لگے گا حمیدہ۔"

"بوجھ کیسا ٹھاکر جی سرکار۔ ہماری تو کٹیا کے بھاگ جاگ گئے ہیں جی۔ سر آنکھوں پر۔"

ٹھاکر اور ٹھاکرانی اپنے بیٹے کو وصال دین سے لپٹا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ راستے میں ٹھاکر نے پتنی سے کہا۔ "تمہاری سمجھ میں آیا کہ تم آج یہاں کیوں آئیں۔"

ٹھاکرانی نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمھیں آج مجذوب سے ملنا تھا۔"

ٹھاکرانی سوچ میں پڑ گئی۔ "پرناتھ، اس کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"نہ سہی۔ بس یاد رکھنا اور عمل کرنا۔ سمجھ میں خود آ جائیں گی۔"

"یہ کیسا بھید ہے ناتھ؟"

"بھید کے چکر میں نہ پڑ ناری۔ بھگوان کی باتیں بھگوان جانے۔"

"سچ کہتے ہو ناتھ۔"

❁ ❁ ❁

پہلے تین دن تو چھوٹا ٹھاکر مسلسل حمیدہ کے گھر گیا۔ وصال دین کا بخار تو اتر گیا تھا۔ لیکن کمزوری بہت تھی۔ پھر بھی وہ صحن میں چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ کھیلتا رہا۔ تیسرے دن وہ گھر سے باہر نکل کر مٹی میں خوب کھیلے۔ چھوٹے ٹھاکر کو بہت مزہ آیا بلکہ یہ جان کر اسے افسوس ہوا کہ اگلے روز وصال دین حویلی آئے گا۔ اسے گھر سے باہر کھلی فضا میں کھیلنے کا چسکا لگ گیا تھا۔

پھر وہ دوسرا معمول شروع ہو گیا۔ ایک دن وصال دین حویلی آتا اور اگلے دن چھوٹا ٹھاکر [illegible] مرے تا۔

ایک ہفتے بعد ٹھاکر پرتاپ سنگھ بیٹے کی تعلیم کی فکر میں دہلی چلا گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بیٹے کی تعلیم شروع ہو چکی ہے۔

ننھا ٹھاکر بے حد متجسس فطرت کا مالک تھا۔ اس کا مشاہدہ بہت اچھا تھا۔ ... اور چیزوں کو دیکھ کر وہ ان کے بارے میں غور و فکر بھی کرتا تھا۔ اب وہ باہر نکلا تو پتا چلا کہ دنیا بہت بڑی ہے۔ ... اتنی بڑی کہ اس کی نظر اسے نہیں دیکھ سکتی۔

اب وہ سوال پہلے سے زیادہ کرتا تھا۔ لیکن اسے جواب بھی ملتے تھے۔ حمیدہ ٹھاکرانی اور جمال دین دونوں سے مختلف تھی۔ اس میں تعلیم کی تو کمی تھی لیکن گرد و پیش سے مکمل آگہی اسے حاصل تھی۔ اور اس کے پاس دانش بھی تھی۔ وہ مشین کی طرح لگی بندھی زندگی گزارتی تو تھی لیکن اس کے پاس سوچتا ہوا دماغ بھی تھا اور ننھے ٹھاکر کے لیے یہ بہت بڑی نعمت تھی۔

اس روز حمیدہ کو کھانا تیار کرنے میں دیر ہو گئی۔ چھوٹا ٹھاکر بھوک سے بے تاب ہو کر چلایا۔ "اماں ..... مجھے ابھی روٹی چاہیے۔ جلدی سے دو۔"

حمیدہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "بس ذرا دیر رک جاؤ بیٹے۔ ابھی دیتی ہوں۔"

"مجھے ابھی چاہیے۔"

"اچھا..... یہاں آ جاؤ۔ دیکھو تو کہ روٹی کیسے بنتی ہے۔"

ننھا ٹھاکر اس کے پاس جا بیٹھا۔ حمیدہ اسے قصے سناتی، بہلاتی رہی۔ اس کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ پھر اس نے پہلی گرم گرم روٹی اتاری، اس پر مکھن رکھا اور تھالی میں ساگ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "تو چھوٹے ٹھاکر، اب کھاتے جاؤ۔ میں گرم گرم روٹی اتارتی رہوں گی۔"

ننھا ٹھاکر بہت بھوکا تھا۔ مگر اس عالم میں بھی وصال دین کو نہیں بھولا۔ "آ ؤ ویر جی۔ کھانا کھائیں۔"

"ابھی نہیں..... دو روٹیاں اور اتر جائیں تو پھر وصال دین بھی بیٹھ جائے گا۔" حمیدہ نے کہا۔

لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں مانا۔ اس نے وصال دین کے بغیر لقمہ نہیں توڑا۔ اتنی بحث میں حمیدہ کو مہلت مل گئی۔ روٹی کا تسلسل بھی نہیں ٹوٹا۔ دونوں بچے کھانا کھا کر نمٹے تو چھوٹے ٹھاکر نے حمیدہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "تم کتنی اچھی ہو اماں۔" اس نے کہا اور وصال دین کو دیکھا جو ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ "یہ تم کھانے کے بعد کیا کرتے ہو ویر جی؟" اس نے وصال دین سے پوچھا۔

وصال دین گھبرا گیا۔ اسے اپنے گھر میں ہمیشہ کھانے کے بعد ایسا کرنے کی عادت تھی۔ [illegible] اسے سکھایا تھا۔ [illegible] نے باتھ کہا تھا کہ [illegible] دل میں ہی

اللہ کا شکر ادا کر دینا۔'' ''کچھ نہیں چھوٹے ٹھا کر۔'' اس نے کہا۔

''نہیں ویر جی ۔ مجھے بتاؤ نا۔''

وصال دین نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔ حمیدہ نے جلدی سے کہا۔ ''اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا بیٹے۔''

''کون اللہ؟''

اب حمیدہ بھی گڑ بڑا گئی۔ ''وہ جسے تم بھگوان کہتے ہو۔''

''اچھا۔ اور شکر کیا ہوتا ہے؟''

''ابھی تم خوش ہو کر مجھ سے لپٹ گئے تھے نا...... اور کہا تھا...... تم کتنی اچھی ہو اماں۔ تو یہ شکر تھا۔''

''میں سمجھ گیا اماں۔ کوئی کسی کو کچھ دے، کسی کو کسی سے کچھ فائدہ ہو تو وہ اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ ہے نا اماں۔''

حمیدہ اسے شکریہ اور شکر کا فرق بتانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ ''ہاں چھوٹے ٹھا کر...... میرے بیٹے۔''

''تو ویر جی نے اللہ کا شکر کیوں ادا کیا۔ روٹی تو انھیں تم نے دی تھی اماں۔''

اب حمیدہ کو کون روک سکتا تھا۔ وہ چپ رہتی تو اس کا بیٹا خراب ہوتا...... ایمان سے دور ہوتا۔ ''اس کے لیے تمھیں یہ سمجھنا ہوگا بیٹے کہ روٹی کتنی مشکل سے بنتی ہے۔''

''مشکل سے بنتی ہے۔'' چھوٹے ٹھا کر نے حیرت سے دہرایا۔ ''آٹا گوندھا، چولہا جلایا، توا چڑھایا اور روٹی تیار۔''

''اور مکئی اور گیہوں کہاں سے آئے ہیں؟''

چھوٹے ٹھا کر کا تجسس بھڑک اٹھا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ''تم بتاؤ اماں۔''

''کھیتوں سے۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''کسان پہلے زمین میں ہل چلاتا ہے۔ پھر بیج بوتا ہے۔ چار پانچ مہینے اس کی دیکھ بھال، اس کی رکھوالی کرتا ہے۔ اللہ دھوپ سے گرمی دیتا ہے۔ وقت پر بارش برساتا ہے۔ تب فصل تیار ہوتی ہے۔ پھر بہت سے لوگ مل کر کٹائی کرتے ہیں۔ تب کہیں گندم یا مکئی ملتی ہے۔ اب سوچو، تمہاری ایک روٹی کے لیے کتنے لوگ مہینوں محنت کرتے ہیں۔ اور اللہ بارش روک دے تو فصل خراب ہو جاتی ہے۔ کبھی بہت دن سورج نہ نکلے تو بھی فصل خراب ہو جاتی ہے۔ اب سوچو، کتنا کچھ ہوتا ہے ایک روٹی کے لیے۔''

اس روز چھوٹے ٹھا کر کے لیے سوچ کے نئے دروازے کھل گئے۔ دنیا اس کے لیے کچھ اور بڑی، کچھ اور نا قابل فہم ہو گئی۔ جسے سمجھنے کی کوشش کرنی تھی۔

❁ ❁ ❁

ٹھا کر پرتاپ سنگھ دہلی سے کافی رات گئے واپس آیا۔ چھوٹا ٹھا کر اس وقت سو چکا تھا۔ ٹھا کرانی کھانا لے کر ٹھا کر کے کمرے میں گئی۔ ٹھا کر نے کھانا کھایا۔ پھر پتنی سے بولا۔ ''رنجو...... میں پورا بندوبست کر آیا ہوں۔ چھوٹے کی پڑھائی کا۔''

ٹھا کرانی کا تو دل دھک سے رہ گیا۔ اسے لگا کہ ٹھا کر نے بچے کو دہلی میں داخل کرانے کی بات کر لی ہے۔

ٹھا کر اس کے چہرے کے تاثر سے سمجھ گیا۔ ''نہیں ٹھا کرانی۔ چھوٹا گھر پر ہی پڑھے گا۔ میں نے اسکول والوں سے بات کر لی ہے۔ ہم چھوٹے کو گھر پر ہی تیاری کرائیں گے۔ آٹھویں جماعت سے اسے اسکول میں جانا ہوگا۔ پہلے وہ امتحان لیں گے۔ پھر داخلہ دیں گے۔ پھر اسے وہیں رہنا ہوگا۔ صرف چھٹیوں میں گھر آیا کرے گا۔''

ٹھا کرانی کو اس وقت سے خوف آنے لگا۔ ''اس وقت کتنا بڑا ہوگا ہمارا چھوٹا؟''

''بارہ تیرہ سال کا ہوگا۔''

ٹھا کرانی نے سکون کی سانس لی۔ ''تب تو ٹھیک ہے۔'' مگر فوراً ہی وہ پریشان ہو گئی۔ ''تو یہاں گھر پر اسے کون پڑھائے گا؟''

''اسی اسکول کے ایک ریٹائرڈ ماسٹر ہیں کانتی پرشاد۔ میں نے ان سے بات کی ہے۔ ہفتہ دس دن میں وہ یہاں آ ئیں گے۔ حویلی میں ہی رہیں گے۔ وہ اسکول کے نصاب سے واقف ہیں۔ صحیح تیاری کرائیں گے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے۔'' ٹھا کرانی نے کہا۔ اس کے دل سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔

ٹھا کر نے اگلے روز اس سلسلے میں جمال دین سے بات کی۔ جمال دین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ٹھا کر اسے کیوں بتا رہا ہے۔ ''میرا اوتار سنگھ وصال دین کے بغیر نہیں پڑھے گا۔'' ٹھا کر نے وضاحت کی۔ ''وہ وصال دین کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔''

''تو ٹھیک ہے ٹھا کر جی۔''

''تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

''میں احسان فراموش نہیں ہوں سرکار۔'' جمال دین نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آپ کا ایک اور احسان ہوگا مجھ پر...... اور وصال دین پر۔ ورنہ میں اسے کہاں پڑھاتا بھلا۔''

ٹھا کر کے لیے دل کی بات زبان پر لانا مشکل ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔ ''وہ ماسٹر کانتی پرشاد ہندو جاتی کا ہے جمال دین۔ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

جمال دین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیسی بات کرتے ہیں ٹھا کر جی۔ علم تو کوئی بھی کسی کو دے سکتا ہے۔ اس کا تو احسان ہوتا ہے جی۔''

ٹھا کر کو حیرت ہوئی۔ یہ وہی جمال دین تھا، جو مذہب کا پکا تھا۔ اس کے لیے کچھ بھی کھونے کو تیار تھا۔ کیا اسے ڈر نہیں لگتا کہ ہندو ماسٹر اس کے بچے کا دھرم خراب کر دے گا۔ جبکہ ٹھا کرائی تو صرف صحبت سے ڈر رہی تھی اور بچے کو اسی مسلمان پریوار سے دور کرنا چاہتی تھی۔

اس نے ٹھا کرائی کو یہ بات بتائی تو وہ بہت شرمندہ ہوئی۔

❋ ...... ❋ ...... ❋

دہلی سے ماسٹر کانتی پرشاد آ گئے۔ دونوں بچوں کی پڑھائی شروع ہو گئی۔

کانتی پرشاد پڑھے لکھے، لائق اور روشن خیال آدمی تھے۔ دھرم کو انھوں نے بہت پہلے فرسودہ پا کر طاقِ نسیاں پر رکھ دیا تھا۔ عمر ان کی تدریس میں گزری تھی۔ اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ پریشانی کوئی نہیں تھی۔ گھر بچوں نے سنبھالا ہوا تھا۔ ٹھا کر پرتاپ سنگھ کی پیشکش انھیں بہت بڑی نعمت محسوس ہوئی۔ پتنی کے دیہانت کے بعد ان کا کہیں من نہیں لگتا تھا۔ بے کاری کا احساس ستاتا تھا۔ ٹھا کر کی مہربانی سے ان کا بے وقعتی کا احساس بھی دور ہو گیا، گرد و پیش بھی تبدیل ہو گیا اور مصروفیت بھی مل گئی۔ یہ طے تھا کہ انھیں پیسہ بھی بہت ملے گا۔ لیکن پیسے کی انھیں پروا نہیں تھی۔

انھیں دو شاگرد ملے۔ ابتداء میں ہی انھیں اندازہ ہو گیا کہ ٹھا کر کا بیٹا نہ صرف ذہین ہے۔ بلکہ اسے علم کی جستجو بھی ہے جبکہ دوسرا لڑکا بس نبھا کر رہے بیٹے کی محبت میں پڑھ رہا تھا۔ اسے جو پڑھایا جاتا، طوطے کی طرح رٹ لیتا جبکہ ٹھا کر کا بیٹا بڑھ چڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کانتی پرشاد کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا میلانِ طبع سائنس کی طرف ہے۔

پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے، کانتی پرشاد کی اوتار سنگھ میں دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ جتنا اسے پڑھانے کی کوشش کرتے تھے، اس سے زیادہ وہ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یعنی استاد اور شاگرد کے درمیان ایک دوڑ لگی تھی...... اور شاگرد ہمیشہ استاد پر فوقیت لے جاتا تھا۔ تجسس سے علم کی لگن بڑھتی ہے۔ اوتار سنگھ متجسس بھی تھا اور غور و فکر بھی کرتا تھا۔ چنانچہ وصال دین اس سے بہت پیچھے رہ گیا۔

دوسری طرف ٹھا کرائی رنجیتا نے بھی اپنے طور پر ایک ذمے داری سنبھال لی تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے دھرم کی، دیوی دیوتاؤں کی باتیں کرتی تھی۔ ادھر تو اوراس نے حویلی میں ہی ایک چھوٹا سا مندر بنایا تھا۔ خود اسے دھرم کے بارے میں زیادہ جانکاری نہیں تھی۔ لیکن جتنا وہ جانتی تھی، اتنا بیٹے کو بتانا ضروری سمجھتی تھی۔ وہ اوتار سنگھ سے روز پوجا کراتی تھی۔

تیسری طرف حمیدہ تھی۔ اوتار سنگھ کے ذہن میں جو سوال ابھرتا، وہ اس کا جواب دینے کی کوشش [illegible] تی۔ اس کے لہجے میں عجیب سی سچائی اور دل نشینی تھی۔ بات آسانی سے [illegible] میں آ جاتی تھی۔ مگر اس [illegible] ہوتی تھیں۔

آپس میں ایک [illegible] سے ملے [illegible] یہ تینوں ضلع [illegible] ایک مثلث بناتے تھے [illegible]

مثلث کے درمیان میں بیٹھا ہوا اوتار سنگھ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ سچائی کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ گرد و پیش کی ہر چیز پر غور کرتا۔ سوچتا کہ وہ کیا ہے، کیوں ہے اور کیسے ہے۔ یہ سوال وہ تینوں سے کرتا اور تینوں کے جواب مختلف ہوتے۔ وہ حیران ہوتا کہ ایک ہی چیز کے بارے میں تین افراد کے تین نظریے ہیں۔ اس سے اس نے یہ سمجھ لیا کہ کثرت میں ابہام ہے، الجھاؤ ہے۔ اور یہ کہ نظریے ضروری نہیں کہ درست ہوں بلکہ ان کے غلط ہونے کا امکان زیادہ ہے۔

اوتار سنگھ اس پر غور کرتا کہ صحیح کیا ہے۔ اپنے طور پر اس نے سمجھ لیا کہ سورج نکلتا ہے تو صبح ہوتی ہے اور جب تک سورج رہتا ہے، دن رہتا ہے۔ سورج غروب ہو تو رات ہو جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ سورج حرکت کرتا ہے۔ مشرق سے نکلتا ہے تو ہلکی ہلکی دھوپ پھیلتی ہے اور سورج اوپر آتا رہتا ہے تو دھوپ میں تیزی بڑھتی جاتی ہے اور ساتھ ہی گرمی بھی۔ پھر عین سر پر پہنچنے کے بعد سورج مغرب کی طرف جھکتا ہے تو دھوپ ہلکی ہونے لگتی ہے۔ روشنی کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہوتا ہے اور رات ہو جاتی ہے۔

سوال یہ تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس نے تینوں معلموں سے یہ بات پوچھی۔ ہمیشہ کی طرح جواب مختلف ملے۔ ماتا جی نے بتایا کہ سورج دیوتا کا کام ہی روشنی دینا ہے۔ دن بھر دھوپ بانٹنے کے بعد تھک جائیں تو آرام کرتے ہیں۔ ماسٹر جی نے بتایا کہ سورج نہیں چلتا۔ بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ جس حصے میں ہم موجود ہیں، وہ جب گھومتا ہوا سورج کے سامنے آتا ہے تو صبح ہوتی ہے۔ جب تک سامنے رہتا ہے، دن رہتا ہے اور جب گھومتا ہوا سورج سے اوجھل ہوتا ہے تو رات ہو جاتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دراصل سورج غروب نہیں ہوتا۔ جس وقت ہمارے ہاں سورج غروب ہوتا دکھائی دیتا ہے تو وہ دوسری طرف طلوع ہوتا نظر آتا ہے اور وہاں صبح ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ زمین پر زندگی سورج کے دم سے ہے۔ اسی کی وجہ سے حرارت ہے۔ حرارت نہ ہو تو زمین پر کوئی فصل نہ اُگے اور سردی ہی سردی ہو۔ اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ یہ بات اماں نے بھی کہی تھی کہ دھوپ نہ نکلے تو فصلیں خراب ہو جائیں۔

اماں نے کہا کہ سورج اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے۔ اس سے زندگی ہے اور وہ اپنے وقت پر طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے اور اماں نے ایک بات ایسی بتائی، جو اس کی سمجھ میں سب سے زیادہ آئی۔ اماں نے کہا کہ اللہ نے دن اور رات بنائے ہیں تا کہ انسان دن میں کام اور رات میں آرام کریں۔

''وہ کیسے اماں؟''

''چھوٹے ٹھا کر، یہ بتاؤ کہ تم دن بھر کیوں نہیں سوتے؟'' اماں نے پوچھا۔

'' [illegible] روشنی ہوتو [illegible] نہیں

سکتا۔''

''تو سوچو، سورج ہر وقت نکلا رہتا تو تم کیسے سوتے اور نہیں سوتے تو تھکن بڑھتی رہتی۔ سوئے بغیر رہ سکتے ہو تم؟''

''نہیں اماں، کبھی میں زیادہ تھک جاؤں تو بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا ہوں۔''

''اور سوچو کہ سورج نکلتا ہی نہیں اور ہر وقت اندھیرا رہتا تو لوگ کام کیسے کرتے۔ فصلیں کیسے ہوتیں۔ کھانا کیسے پکتا۔ زندگی تو ختم ہو جاتی نا۔''

اوتار سنگھ نے بڑے فخر سے سوچا کہ اماں کتنی عقل والی ہیں۔ یہ بات تو ماسٹر جی نے بھی نہیں بتائی تھی۔

اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ سورج دیوتا بہت شکتی مان ہے۔ زمین پر زندگی اسی کے دم سے ہے۔ جب وہ غصے میں ہوتا ہے تو گرمی بڑھ جاتی ہے۔ انسان اور جانور پسینے میں نہا جاتے ہیں، ہانپنے لگتے ہیں۔ لیکن پھر ایک دن سورج نہیں نکلا۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ بات نہیں کہ صبح نہیں ہوئی۔ صبح تو ہوئی ہے۔ سورج بھی نکلا ہے۔ لیکن اس کی دھوپ، اس کی روشنی کا راستہ بادلوں نے روک رکھا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بادل تو معمولی چیز تھے اور وہ سورج جیسے شکتی مان کا راستہ روک سکتے تھے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

پھر اس نے موسموں کا مشاہدہ کیا۔ ماسٹر جی نے اس کی بڑی رہنمائی کی۔ ورنہ ماتا جی اور اماں تو ہر بات کے جواب میں۔ بھگوان کی اِچھا...... اور اللہ کی مرضی کہہ دیتی تھی۔ سردی آتی ہے۔ بس آتی ہے۔ گرمی آئے گی۔ اسے آنا ہے۔ ماسٹر جی نے اسے بتایا کہ موسموں کے پیچھے بھی سورج کا دخل ہے۔ زمین سورج سے دور ہٹتی ہے تو سردی آتی ہے اور قریب ہوتی ہے تو گرمی آتی ہے۔ پھر اس نے بارش کو سمجھا۔ یہ بھی سمجھا کہ بارش کتنی اہم ہے۔ صرف دھوپ سے فصلوں کا تعلق نہیں تھا۔ بارش نہ ہو تو بھی فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

اگلے دو برس میں اس نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ جس میں شکتی ہو اور جو سمجھ میں نہ آئے، وہ ماتا جی کے نزدیک دیوی تھی یا دیوتا۔ اور اماں ہر چیز کو اللہ سے جوڑ دیتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں، یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ کچھ سمجھ میں آ جاتے ہیں، کچھ نہیں آتے۔ سب طاقت اللہ کی ہے۔

پہلے بچوں کو کھیل کود سے فرصت نہیں تھی۔ اب ان کے لیے دن چھوٹا پڑتا تھا۔ تین وقت تو ماسٹر جی پڑھاتے تھے۔ اس لیے معمولات کچھ بدل گئے تھے۔ اوتار سنگھ کے ایک دن چھوڑ کر حمیدہ کے ہاں جانے کا سلسلہ جاری تھا لیکن اب وہ کم وقت کے لیے جاتا تھا۔

چھوٹا ٹھاکر آٹھ سال کا ہوا تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اسے سچ مچ کا گھوڑا دیا۔ گھوڑا وصال دین کو بھی ملا۔ کیونکہ ٹھاکر جانتا تھا کہ اس کا بیٹا اکیلا یہ تحفہ قبول نہیں کرے گا۔ پھر وہ ان دونوں کو گھڑ سواری سکھانے لگا۔ اور وہ بیٹے سے باتیں بھی کرتا تھا۔ وہ اسے راجپوتی آن کے بارے میں بتاتا۔

ان کے اوصاف سے متعارف کراتا۔ اسے پرکھوں کی بہادری کے قصے سناتا۔

باپ ہونے کے ناتے جمال دین بھی پیچھے نہیں تھا۔ وہ لٹھیا چلانے کا ہنر جانتا تھا۔ اس نے ان دونوں کو لٹھیا چلانا سکھانا شروع کر دیا۔ یوں وقت اور سمٹنے لگا۔ دونوں لڑکے ان نئی مصروفیات میں بہت خوش تھے۔ ان کے نزدیک وہ نئے کھیل تھے...... نئے بھی اور دلچسپ بھی۔

مگر پھر ایک دن یہ ہوا کہ چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ پر معلومات کا ایک دروازہ بند ہو گیا۔

اب تک وہ یہ سمجھتا تھا کہ اللہ اور بھگوان ایک ہی ہیں۔ فرق صرف زبان کا ہے...... اور لفظوں کی طرح۔ جیسے ماتا جی شما کہتی ہیں اور اماں معافی۔ جیسے ماتا جی بنتی کہتی ہیں اور اماں التجا۔ اور اماں نے اسے تاثر بھی یہی دیا تھا۔

اس دن اس نے اماں سے کہا۔ ''اماں...... تم بھی اللہ کی پوجا کرتی ہو؟''

اماں نے جھرجھری سی لی۔ ایک لمحے ہچکچائیں اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے بھی دکھاؤ اماں۔ میں بھی اس کی پوجا کروں گا۔''

اماں تو ہکا بکا رہ گئیں۔ ان سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

''مجھے اللہ کی مورتی دکھاؤ نا اماں۔'' اس نے ضد کی۔

''وہ تو نہیں ہوتی چھوٹے ٹھاکر۔''

''کیوں اماں۔ بھگوان کی تو ہوتی ہے۔''

''اللہ کی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اسے کسی نے دیکھا نہیں ہے۔''

یہ چھوٹے ٹھاکر کو ہلا دینے والی بات تھی۔ ''تو اللہ اور بھگوان ایک نہیں ہیں؟''

اماں نے نفی میں سر ہلایا اور بولیں۔ ''دیکھ چھوٹے ٹھاکر، تم اب مجھ سے یہ نہ پوچھنا۔ ٹھاکر جی اور ٹھاکرانی کو پتا چل گیا کہ میں تم سے ایسی باتیں کرتی ہوں تو وہ ہم سب کو مروا دیں گے اور یہ نہ بھی ہوا تو تمھیں کبھی ہم سے ملنے نہیں دیں گے۔''

چھوٹا ٹھاکر ڈر گیا۔ اس کے لیے تو ان سے نہ ملنے کا تصور بھی ناقابل قبول تھا۔ کجا یہ کہ مر جانے کی بات۔ اس نے غور سے اماں کے چہرے کو دیکھا، جو پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ لگ رہی تھی۔ ''سچ اماں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بیٹے۔ تم ہمیں زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو یہ بات کبھی نہ پوچھنا اور میری کہی ہوئی کوئی بات اپنے ماتا پتا کے سامنے نہ دہرانا۔ اللہ کا نام بھی نہ لینا ان کے سامنے۔ ورنہ وہ سمجھیں گے کہ ہم تمھیں خراب کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں مروا دیں گے بیٹے۔''

''ٹھیک ہے اماں۔ میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔'' چھوٹے ٹھاکر نے بڑے خلوص سے وعدہ کیا۔ ''مگر آج جو میں پوچھوں، وہ بتا دو۔''

حمیدہ نے بادل نخواستہ ہامی بھر لی۔

تب حمیدہ نے اسے بتایا کہ اس کا اللہ ایک ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ کسی کو نظر نہیں آتا۔ مگر اس کی قدرت نظر آتی ہے۔ وہ زبردست ہے۔ سب کچھ اس نے بنایا، اسی نے پیدا کیا ہے۔

''تو ماتا جی اور پتا جی اسے کیوں نہیں مانتے؟''

''ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ سب کا اپنا اپنا عقیدہ ہوتا ہے۔''

اس لمحے نو سالہ ٹھاکر اوتار سنگھ کے نتائج اخذ کرنے والے ذہن نے ایک بڑی بات سمجھ لی۔ اس نے جان لیا کہ ماننے نہیں ماننے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جو سچ ہے، وہ سچ ہے۔ نہ ماننے سے وہ تبدیل نہیں ہوگا اور جو نہیں ہے، اسے مان لینے سے وہ ہو نہیں جائے گا۔ ماننے میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ اسے خود سمجھنا ہوگا۔

وہ اس کی تلاش حق کا نکتہ آغاز تھا!

❁...❁...❁

کتابِ دوم

طلوعِ صبح

اس صبح پوجا کے بعد اوتار سنگھ نے ماں سے پوچھا۔ ''ماتا جی، آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے؟''

''روز دیکھتی ہوں پتر۔ تم بھی دیکھتے ہو...... یہ بھگوان ہیں نا۔'' ٹھاکرانی نے مورتی کی طرف اشارہ کیا۔

''تو یہ سچ مچ کے بھگوان ہیں؟'' اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

ٹھاکرانی کو غلطی کا احساس ہوگیا۔ ''میرا مطلب ہے، یہ بھگوان کی مورت ہے۔ ہم روز اس کے درشن، اس کی پوجا کرتے ہیں۔''

''تو یہ سچ مچ کے بھگوان تو نہیں ہیں نا۔''

ٹھاکرانی چوکنا ہوگئی۔ ''بھگوان کی صورت بالکل ایسی ہے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں ماتا جی۔ آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے؟''

''نہیں۔ دیکھا تو نہیں۔ پر مجھے معلوم ہے، یہ بھگوان کی مورت ہے۔''

''تو ماتا جی۔ ہمیں بھگوان کی پوجا کرنی چاہیے۔ اس مورت کی نہیں۔''

ٹھاکرانی گھبرا گئی۔ ''دیکھو پتر...... ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہمارے باپ دادا صدیوں سے اس مورتی کی پوجا کرتے آئے ہیں۔ وہ غلط تو نہیں ہوسکتے۔''

چھوٹے ٹھاکر کی ذہانت پوری طرح کام کر رہی تھی۔ ''ماتا جی، آپ کے باپ دادا کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ان کا تو دیہانت ہوگیا۔''

''دیہانت کیا ہوتا ہے ماتا جی؟''

''منش ہے نا۔ وقت پورا کرتا ہے تو مرجاتا ہے۔''

''تو آپ کا وقت پورا ہوگا تو آپ کا دیہانت ہوجائے گا۔ اور اپنا وقت پورا کر کے میں بھی مرجاؤں......''

ٹھاکرانی نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے پتر۔''
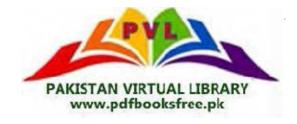
ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

"منہ سے نہ نکالنے سے کچھ بدل جاتا ہے ماتا جی۔" اوتار سنگھ نے بے حد معصومیت سے پوچھا۔ "مجھے بتائیں نا۔ ایسا ہی ہوگا نا؟"

"ہاں۔" ٹھاکرانی نے بات مختصر کرنے کی کوشش کی۔

"تو پھر جو دوسرے لوگ ہوں گے، وہ بھی اپنے بچوں سے یہی کہیں گے کہ ہمارے باپ دادا اس مورتی کو پوجتے تھے۔ مگر ماتا جی، آپ کے باپ دادا بھی غلطی تو کر سکتے تھے نا۔ آپ کو کیسے پتا کہ وہ درست تھے۔ آنے والوں کو بھی یہ پتا نہیں ہوگا کہ آپ درست تھیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو پتر؟"

"یہی کہ ہمیں بھگوان کی پوجا کرنی چاہیے، اس کی مورتی کی نہیں۔"

ٹھاکرانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "سامنے مورتی ہے۔ مگر ہم پوجا تو بھگوان کی کرتے ہیں۔"

"تو ہم مورتی کے بغیر بھی پوجا کر سکتے ہیں ماتا جی۔ آپ کہتی ہیں، بھگوان سب جانتے ہیں۔"

"سو تو ہے پتر۔ مگر ہمارے باپ دادا......"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ غلطی کرتے رہے ہوں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ غلطی کرتے رہے ہوں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا اوتار سنگھ۔" ٹھاکرانی نے سخت لہجے میں کہا۔

"اچھا ماتا جی۔ میرے...... آپ کے جو پرکھ تھے، وہ منش تھے نا؟"

"اوش تھے۔"

"اور منش غلطی کرتا ہے۔ اس سے بھول بھی ہوتی ہے...... بلکہ جیون بھر ہوتی رہتی ہے۔"

ٹھاکرانی کو احساس ہوا کہ وہ بری طرح پھنس گئی ہے۔ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ انکار کرتی تو ڈر تھا کہ آگے کہیں اس سے بری پھنس جائے گی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "یہ باتیں چھوڑو نا چھوٹے۔"

"نہیں ماتا جی۔ بتائیں نا۔"

ٹھاکرانی بے بس ہو گئی۔ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "ہاں پتر۔ منش غلطی کرتے ہیں۔"

"تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے پرکھوں سے بھول ہوئی ہو۔" اوتار سنگھ نے کہا اور یہ سوال نہیں تھا۔ وہ ماں سے اس کی تصدیق بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ تو سیدھا سا بیان تھا۔ "تو اس کو ٹھیک کرنا ہماری ذمے داری ہے۔ اچھا تو ماتا جی، یہ تو بتاؤ کہ بھگوان کہاں رہتے ہیں؟"

"اوپر آکاش پر...... پرلوک میں۔"

"میں انھیں دیکھ سکتا ہوں...... ان سے مل سکتا ہوں ماتا جی؟"

"نا پتر۔ بھگوان کو کسی نے دیکھا ہے بھلا!"

اوتار سنگھ نے تیزی سے اس کی بات پکڑ لی۔ "کسی نے نہیں دیکھا؟"

"نا پتر۔"

"تو پھر یہ مورتی کیسے بنا لی۔" اوتار سنگھ نے نپا تلا اعتراض کیا۔ "اس کا مطلب ہے ماتا جی کہ یہ خیالی ہے۔ ضروری نہیں کہ بھگوان ایسے ہوں۔"

"دیکھ پتر۔ ہمیں تو اس مورتی کی ہی پوجا کرنی ہے۔ ہمارے پرکھوں سے یہ ریت چلی آ رہی ہے۔" ٹھاکرانی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"بھلے وہ غلطی پر رہی ہوں؟"

"بھلے وہ غلطی پر رہی ہوں۔" ٹھاکرانی کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"ماتا جی، اس نظر آنے والی خیالی مورتی کے مقابلے میں نظر نہ آنے والے سچے بھگوان کے سامنے سر جھکانا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"ہوا کرے۔ پر تمھیں پوجا روز کرنی ہے۔"

اوتار سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔ سوچنے کو بہت سامان مل چکا تھا۔

❀......❀......❀

فطری بات تھی کہ اوتار سنگھ نے اس کے بعد ماتا جی اور اماں کے نظریات کا موازنہ کیا۔ اسے ایک بات مشترک نظر آئی۔ بھگوان بھی نظر نہیں آتا تھا اور اللہ بھی۔ اس کے آگے فرق ہی فرق تھا۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ بھگوان آکاش کے اوپر، پرلوک میں رہتا ہے۔ جبکہ اماں کہتی تھیں کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ حتیٰ کہ انسان کے اندر بھی۔ پھر اماں کہتی تھیں کہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے۔ اس کی قدرت ایسی ہے کہ وہ جو چاہتا ہے، ایک پل میں ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اماں بہت سے دیوی دیوتاؤں کو مانتی تھیں۔ بھگوان نے بہت سے دیوی دیوتاؤں کو کام سپرد کر رکھے تھے۔ انھیں اختیار دے رکھا تھا۔

اور ماسٹر جی بتاتے تھے کہ سب کچھ جو نظر آتا ہے، جسے آپ چھو سکتے ہیں، مادہ ہے اور مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ ہاں...... وہ شکل بدل لیتا ہے۔ پانی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ سمندر، دریا، جھیل، ندی اور چشمے۔ پانی پر دھوپ پڑتی ہے تو عمل تبخیر ہوتا ہے۔ بادل بنتے ہیں۔ پھر جب بادل کسی پہاڑ سے، درختوں سے ٹکرائیں تو بارش ہوتی ہے۔ یہ بات اوتار سنگھ کی سمجھ میں آتی تھی۔ اس نے چولہے پر رکھی پانی سے بھری دیگچی میں بھاپ بنتے دیکھی تھی اور دیگچی کو ڈھکنے سے بند کر کے چولہا بجھانے کے کچھ دیر بعد ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تھا تو ڈھکنے کے اندرونی حصے پر پانی کے بے شمار قطرے جمے ہوئے دیکھے تھے۔ وہ بھاپ سے پانی بنا تھا۔ اور غذا جو ہم کھاتے ہیں، اس کا ایک حصہ جسم میں شامل ہوتا ہے۔ باقی فضلہ ہوتا ہے۔ کھاد بن جاتا ہے۔

کھاد زمین میں ڈالی جاتی ہے تو فصل بہتر ہوتی ہے۔

اوتار سنگھ نے ندی تو دیکھی تھی۔ دریا اور سمندر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ان کے بارے میں ماسٹر جی سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''دریا بڑا بھی ہوتا ہے اور چھوٹا بھی۔ پر سمندر تو بہت ہی بڑا ہوتا ہے۔ اتنا بڑا کہ تم جہاں تک دیکھ سکو، پانی ہی پانی نظر آئے۔''

اوتار سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''اتنا پانی!''

''اور سمندر کا پانی اتنا کھاری، اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ تم ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتے۔''

''کھاری کیا ماسٹر جی؟''

''کھاری کا مطلب نمک ملا ہوا۔''

''نمک ملا ہوا؟''

اس کی حیرت ایسی تھی کہ ماسٹر جی کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اور وہ اسے پانچ سال سے پڑھا رہے تھے۔ اس کا مزاج جانتے تھے۔ وہ تو بہت بڑھے ہوئے تجسس والا بچہ تھا۔ ایسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر زیادہ سیکھتے ہیں۔ ورنہ تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ٹھاکر سے بات کی کہ بچوں کو سیر کرانا، دنیا دکھانا بھی ضروری ہے۔

''تو انھیں کہاں لے جانا ہے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ یہ پہاڑ بھی دیکھ لیں اور سمندر بھی۔''

ٹھاکر کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کو بھی ساتھ لے لیا۔ ماسٹر جی کو تو ساتھ جانا ہی تھا۔

اس ایک ماہ میں اوتار سنگھ نے جو کچھ دیکھا، وہ اس کے لیے چشم کشا تھا۔ سمندر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ماسٹر جی کے بتانے میں وہ بات نہیں تھی، جو اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں تھی۔ کنارے پر کھڑے ہو کر جو اس نے دیکھا تو جہاں تک نظر جاتی تھی، پانی ہی پانی تھا۔ اور سمندر کی آواز! اسے سن کر خوف آتا تھا۔ پتا چلتا تھا کہ وہ بہت طاقت ور ہے۔ مگر اس میں ٹھہراؤ تھا۔ اور اوتار سنگھ نے ایک بار ندی کی باڑھ دیکھی تھی۔ معمولی سی ندی چڑھی تو گاؤں کے گاؤں ڈبو گئی۔ اب سمندر کو دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ یہ چڑھ گیا تو کیا ہوگا۔ یہ تو اتنا پانی ہے کہ دنیا ڈبو دے گا۔ اور اس نے ایک گھونٹ حلق سے اتارنے کی کوشش کی تو دل بگڑ گیا۔ پھندا لگ گیا۔ وہ زہر جیسا پانی تھا...... کڑوا، کھاری۔

پھر اس نے پہاڑ دیکھے تو اسے خوف آیا۔ پہاڑ گر جائے، لڑھک جائے تو کتنی تباہی ہوگی۔ مگر اس نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ اس نے چشمے دیکھے، آبشار دیکھے، پہاڑی ندیاں، جھیلیں اور دریا دیکھے۔ شور مچاتے تند خو دریا اور کیسے کیسے درخت، پھل پھول۔ اس

ایک ماہ میں اس نے ماسٹر جی سے ایک سوال بھی نہیں کیا...... ان کے اکسانے پر بھی نہیں۔ وہ تو سحر زدہ تھا۔ صرف دیکھ رہا تھا اور جذب کر رہا تھا۔

اس سفر میں بھی اسے ایک کمی محسوس ہوئی۔ بہت کچھ دیکھنے کے بعد اسے ہوش آیا کہ وہ بہت سی قیمتی چیزیں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ ویر جی، اماں اور چاچا جی...... اور گاؤں۔ اسے گھر یاد آنے لگا۔ سب لوگ یاد آنے لگے۔ تب اسے واپسی کی لگ گئی۔

وہ واپس پہنچے تو اس کے سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مشاہدے کی کوکھ سے سوال ہی سوال جنم لے رہے تھے۔ ''یہ دنیا تو بہت بڑی ہے ماسٹر جی۔'' اس نے کہا۔

''اتنی بڑی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' ماسٹر جی نے کہا۔ ''جو کچھ تم نے دیکھا، وہ تو ہمارے دیس کا ایک چھوٹا سا بہت چھوٹا سا حصہ ہے۔ صرف ہمارا دیس ہی اس سے سینکڑوں گنا بڑا ہے اور دنیا میں ایسے سینکڑوں دیس ہیں۔ آدمی پوری زندگی گھومتا پھرتا ہے تو بھی پوری دنیا نہیں دیکھ سکتا۔''

''ماسٹر جی، یہ زمین کیسے بنی؟''

''سائنس بتاتی ہے کہ زمین سورج کا حصہ تھی۔ پھر یہ ٹوٹ کر علیحدہ ہوئی۔ لاکھوں برس یہ کھولتا ہوا کرہ زندگی سے محروم رہا۔ بارشیں ہوتی رہیں۔ لاکھوں برس میں یہ ٹھنڈا ہوا۔ پھر اس میں زندگی کا آغاز ہوا۔ نباتات اور جاندار پیدا ہوئے۔''

''کیسے پیدا ہوئے؟'' اوتار سنگھ نے جھٹ پوچھا۔

''کھولتی ہوئی زمین پر ٹھنڈا پانی برستا رہا۔ یہ ایک بہت وسیع اور ہمہ پہلو کیمیاوی عمل تھا۔ اس کے نتیجے میں زندگی شروع ہوئی۔''

''آدمی بھی ایسے ہی پیدا ہوا؟''

کانتی پرشاد پریشان ہو گئے۔ انھوں نے کہا۔ ''سائنس بتاتی ہے کہ بندر ترقی کر کے انسان بنا۔ غور سے دیکھو تو بندر انسان سے مشابہ بھی ہے۔''

اوتار سنگھ کو ہنومان کا خیال آ گیا۔ ماتا جی کہتی تھیں، ہنومان دیوتا ہے۔ اسی لیے بندروں کو نہ مارنا چاہیے نہ ستانا چاہیے۔ لیکن اسے یہ خیال کچھ اچھا نہیں لگا کہ بندر اور انسان ایک جیسے ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ ''تو پھر باقی بندر ایسے کیوں رہ گئے۔ آدمی کیوں نہیں بنے؟''

''عمل میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ جو عمل سے گزر گئے، وہ آدمی بن گئے۔''

''مگر ماسٹر جی، اصل چیز تو دماغ ہے۔ بندر کا دماغ تو آدمی جیسا نہیں۔ آدمی بولتا ہے، سوچتا ہے، چیزیں بناتا ہے، کپڑے پہنتا ہے۔''

''کیمیاوی تبدیلی تو ایسی ہی ہوتی ہے کچھ پتا نہیں کہ کہاں کہاں کیا کچھ بدل جائے۔''

اوتار سنگھ کی تسلی نہیں ہوئی۔ لیکن اس نے اس بات کو یہیں چھوڑ دیا اور دوسرے

زاویے سے حملہ کیا۔ ''تو کیمیاوی عمل اب بھی ہوتا ہے؟''

''اب تو ویسا عمل نہیں ہوتا۔'' کانتی پرشاد نے کہا۔ ''زمین تو ٹھنڈی ہو چکی ہے نا۔''

''تو پھر اب درخت، پودے، انسان اور جانور کیسے پیدا ہوتے ہیں؟''

کانتی پرشاد کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ''وہ تو افزائش کا عمل چل رہا ہے۔''

''کیوں ماسٹر جی؟ آپ نے بتایا کہ تپتی ہوئی زمین پر ٹھنڈی بارش کے کیمیاوی عمل سے سب کچھ پیدا ہوا۔ تو اب اس عمل کے بغیر سب کچھ کیسے پیدا ہو رہا ہے؟ ہمارے پرکھے دادا پردادا مر گئے۔ ہم پیدا ہو گئے۔ یہ سب کیسے؟''

''یہ تولیدی نظام ہے۔ خودکار نظام۔ ایک سسٹم ہے، جس کے تحت تمام جانداروں اور نباتات کی افزائش ہوتی ہے۔''

''لیکن ماسٹر جی، پہلا درخت، پہلا جانور، پہلا انسان...... وہ تو اس سسٹم سے پیدا نہیں ہوئے ہوں گے نا؟'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

کانتی پرشاد بوکھلا گئے۔ ''دیکھو چھوٹے ٹھاکر، ابھی تم چھوٹے ہو۔ خود کو اتنا نہ الجھاؤ۔ بعد میں ان پر بات کریں گے۔'' انھوں نے ذہین شاگرد کو ٹالا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب تو خود انھیں بہت کچھ پڑھنا ہوگا۔

❀......❀......❀

چھوٹے ٹھاکر نے ماں سے پوچھا۔ ''ماتا جی...... یہ سنسار کس نے بنایا ہے؟''

''بھگوان نے۔''

''کیسے؟''

''یہ تو بھگوان کو ہی معلوم ہوگا۔''

''اور یہ بھگوان کی مورتی کے تین سر کیوں ہیں؟''

''ایک بھگوان برہما ہے، دوسرا بھگوان وشنو اور تیسرا بھگوان شیو۔''

''تینوں کا جسم ایک کیوں ہے؟''

''تینوں مل کر بھگوان ہیں نا، اس لیے۔''

''بھگوان تین ہیں۔ میں تو ایک سمجھتا تھا۔''

''ایک ہی ہے۔ پرنتو روپ تین ہیں۔ برہما، وشنو اور شیو۔ تینوں کے کام الگ الگ ہیں۔ برہما نے سنسار بنایا۔ وشنو نرمی اور محبت کا بھگوان ہے اور شیو جی غضب، غصہ اور ہلاکت ہیں۔''

تب اوتار سنگھ کو پتا چلا کہ تمام دیوی دیوتا ان تینوں میں سے کسی نہ کسی کے ماتحت ہیں اور دیوی دیوتاؤں کی تعداد بہت بڑی تھی، جو سنسار کی مختلف ذمے داریاں سنبھالتے تھے۔ اور ماں کہتی تھی کہ کسی کی مورتی کے سامنے بھی پوجا کرو، پوجا بھگوان کی ہی ہوتی ہے۔ اوتار سنگھ کی سمجھ میں

نہیں آتا تھا کہ پوجا کرنے کے لیے کسی مورتی کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اس نے ٹھاکرانی سے یہ بات کہی تو وہ بھڑک گئی۔ ''دیکھو پتر، یہ صرف مورتی نہیں۔ یہ خود بھگوان ہے۔''

''پر ماتا جی، آپ تو کہتی ہیں، وہ آکاش پر رہتے ہیں۔''

''رہتے ہیں۔ پر جہاں چاہے آ سکتے ہیں۔ ان کی شکتی مہان ہے۔ تم الٹا سیدھا بولو گے تو وہ تمھیں شراپ بھی دے سکتے ہیں۔''

اوتار سنگھ کو تھوڑا سا ڈر لگا۔ تین سر والی مورتی سے اسے ویسے بھی ڈر لگتا تھا۔ ''اور رام چندر جی اور کرشن جی کون تھے؟''

''رام چندر جی بھگوان وشنو کے اوتار تھے۔ ساتویں اوتار اور کرشن جی آٹھویں اوتار تھے۔''

''مطلب؟''

''ان کے اندر وشنو بھگوان کی آتما تھی۔ وہ منش کے روپ میں وشنو بھگوان تھے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔ ''ویدوں میں لکھا ہے کہ دس اوتار آئیں گے۔ نو آ چکے ہیں اور ایک باقی ہے۔''

''ماتا جی، یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ کسی منش میں بھگوان کی آتما موجود ہے۔''

''ان کی شکتی سے پتا چلتا ہے...... اور گیانیوں کو پتا چل جاتا ہے۔''

اوتار سنگھ اور الجھ گیا۔ یہ گورکھ دھندا کیا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

چند روز بعد اس نے ماسٹر جی کو گھیر لیا۔ ''ماسٹر جی، یہ دیوی دیوتا کیا سچ مچ ہوتے ہیں؟'' اس نے ریاضی پڑھتے پڑھتے اچانک پوچھ لیا۔

ماسٹر جی کا ذہن ریاضی میں تھا۔ انھوں نے بے دھیانی میں کہا۔ ''بھئی لوگ کہتے ہیں تو ہوتے ہی ہوں گے۔''

اس جملے سے اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ ماسٹر جی دیوی دیوتاؤں پر اتنا یقین نہیں رکھتے۔ ''آپ کا اپنا خیال کیا ہے ماسٹر جی؟''

''بھئی میں تو سائنس کا آدمی ہوں اور سائنس ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔''

''تو پھر آپ کے خیال میں یہ دیوی دیوتا کہاں سے آئے؟ ان کی ضرورت کیا تھی؟''

''آنا تو ان کا ثابت ہی نہیں ہوتا یہاں۔ میں اس سلسلے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ضرورت کیوں تھی۔''

''تو بتائیے نا۔''

''دیکھو، خوف انسان کی بنیادی جبلتوں میں سے ہے۔ ہے نا؟''

''شاید ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' دس سالہ اوتار سنگھ نے ذہانت سے کام لیا۔

ورنہ وہ خوف کو سمجھتا تھا لیکن اس جواب سے وہ ماسٹر جی کو بھڑکانا چاہتا تھا۔ وہ بھڑکیں گے تو بھید کھولیں گے۔

اور کانتی پرشاد سچ مچ بھڑک گئے۔ ''یقین سے کیسے نہیں کہہ سکتے۔ ابھی اس کمرے میں کوئی اجنبی آواز تمھیں پکارے اور دیکھنے پر کوئی نظر نہ آئے، تو تم لازمی ڈرو گے۔''

''جی ہاں۔ مگر اس کا دیوی دیوتاؤں سے کیا تعلق؟'' اوتار سنگھ نے انھیں چیلنج کیا۔

''تعلق میں بتاتا ہوں۔'' کانتی پرشاد بڑے جوش سے بولے۔ ''اب تو منش نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ ذرا بہت پرانے، ابتدائی دور کے منش کا سوچو۔ اس وقت کی بات سوچو، جب اس نے پتوں سے شریر ڈھانپنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ جب وہ ننگا رہتا تھا۔ جب اس نے سورج کو نکلتے دیکھا ہوگا تو ہلکی ہلکی دھوپ اسے نعمت لگی ہوگی۔ پھر سورج چڑھا ہوگا، دھوپ تیز ہوئی ہوگی اور اس نے اس کے جسم میں کانٹے چبھوئے ہوں گے تو اس نے سوچا ہوگا کہ اس میں تو قہر بھی ہے اور طاقت بھی۔ اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ ورنہ یہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور شروع ہی سے جھکنا اطاعت کی علامت رہا ہے۔ سو اس نے سورج کو سجدہ کیا ہوگا۔ پھر تیز دھوپ میں چلتے چلتے وہ کسی درخت کے ٹھنڈے سائے میں رکا ہوگا تو اس نے درخت کی طاقت کو تسلیم کیا ہوگا۔ ارے...... یہ تو سورج دیوتا کے قہر سے بچاتا ہے۔ پھر بارش ہوئی ہوگی اور اس کے ننگے جسم پر تیز بارش کے ٹھنڈے نیزے برسے ہوں گے۔ کہیں امان نہیں ملی ہوگی تو اس نے بارش کو اور بعد میں بادل کو دیوتا مانا ہوگا۔ ایک بار پھر درخت نے اسے تیز بارش سے بچایا ہوگا۔ تب اس کے ذہن میں آیا ہوگا کہ درخت کی طرح پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر وہ بھی بارش دھوپ اور ہوا سے بچ سکتا ہے۔ اور سوچو کہ ہوا سے وہ کتنا ڈرا ہوگا کیونکہ وہ تو نظر بھی نہیں آتی ہے اور جب پہلی بار بجلی کڑکی ہوگی اور اس نے چمک دیکھی ہوگی تو اس کے خوف کا کیا عالم ہوگا؟ وہ بس سجدے میں گر گیا ہوگا۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ اس طرح دیوی دیوتا وجود میں آئے ہوں گے۔''

اوتار سنگھ سانس روکے ماسٹر جی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ایک کیفیت میں تھے۔ ان کی گفتگو میں زور تھا، بہاؤ تھا، اوتار سنگھ نے زور سے سانس بھی نہیں لی کہ کہیں وہ کیفیت ختم نہ ہو جائے۔

''دراصل منش کے اندر، بہت گہرائی میں اوّل دن سے ایک احساسِ کمتری بیٹھا ہوا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے کہ وہ اپنے سے بہت برتر کسی نامعلوم طاقت سے ڈرتا ہے۔ معلوم قوت سامنے آتی ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح اسے تسخیر کر لیتا ہے اور تب بھی وہ خوف مٹ جائے، چاہے اوپری سطح پر مٹے تو وہ فرعون بن جاتا ہے۔''

''تو ماسٹر جی، اس خوف کا فائدہ تو ہے نا۔ اس سے انسان اچھا بنا رہتا ہے۔''

''[illegible] طور پر تو فائدہ [illegible]

[illegible] پرشاد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

کہا۔ ''میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ خوف بہت اہم ہے۔ انسان...... ہر انسان زندگی میں بارہا بے بسی محسوس کرتا ہے۔ جب اپنے مسائل اس سے حل نہیں ہوتے۔ جب اپنی ضرورتیں وہ پوری نہیں کر پاتا۔ ایسے میں اسے ایک برتر، ایک مشکل کشا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بیمار ہے اور شفا چاہیے، بے اولاد ہے اور اولاد کی ضرورت ہے اور دنیا میں ایسا کوئی نہیں، جس سے وہ یہ چیزیں مانگ سکے اور اسے مل بھی جائیں۔ تو اس کے لیے وہ ایک برتر نامعلوم تخلیق کر لیتا ہے۔ کہیں وہ بھگوان ہے تو کہیں خدا۔''

''کہتے ہیں کہ بھگوان آکاش پر رہتا ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''وہ کسی ایسی ہی جگہ رہ سکتا ہے، جو منش کی نظروں سے اوجھل ہو، اور آکاش سے اچھی ایسی جگہ اور کون سی ہوگی۔'' ماسٹر جی نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

''پر لوگوں نے بھگوان کو دیکھا ہوگا۔ تبھی تو مورتی بنائی ہے ان کی۔''

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ایسے منش ہر دور میں رہے ہیں، جو بہت اچھے تھے۔ اخلاق میں اعلیٰ لوگوں کے کام آنے والے۔ ایسے کہ لوگ ان سے محبت کرنے لگیں۔ اب کوئی مجسمہ تراشنے والا کسی سے محبت کرے گا تو اس کی مورتی تو بنائے گا ہی۔ اور محبت کرے تو آدمی آدمی کو اوتار مان لیتا ہے۔ بلکہ بھگوان بھی بنا دیتا ہے اسے۔''

یہ بات معقول تھی۔ اوتار سنگھ نے بارہا ماتا جی کو پتا جی سے کہتے سنا تھا کہ آپ تو میرے بھگوان ہیں۔ اگر ماتا جی کو بت بنانا آتا تو وہ یقیناً پتا جی کا بت بناتیں۔ پھر ہزاروں برس بعد لوگ پتا جی کو بھگوان کہتے۔

''اور مسلمانوں اور انگریزوں کے بھارت میں آنے کے بعد ہندو دھرم کے بہت سے نظریات تبدیل ہوئے ہیں۔ تری مورتی کا تصور عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث سے لیا گیا ہے۔ اور مسلمانوں سے متاثر ہو کر بھگوان کے تصور کو مرکزیت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔''

''تو یہ دیوی دیوتا۔ یہ سب خوف کی پیداوار ہیں...... وہم ہے منش کا؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔

ایک پل میں کانتی پرشاد کی کیفیت ختم ہو گئی۔ انھیں اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ بہت خطرناک گفتگو کر رہے ہیں...... بلکہ کر چکے ہیں۔ اگر ٹھاکر جی کو پتا چل گیا کہ وہ ان کے بیٹے کو دھرم کے خلاف کر رہے ہیں تو وہ انھیں نکال باہر کریں گے اور کانتی پرشاد کا یہاں دل بھی لگ گیا تھا اور برسوں بعد ان کے جیون کو ایک مقصد مل گیا تھا۔ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ میں نے کب کہا چھوٹے ٹھاکر۔''

''جو باتیں آپ نے کہیں، ان کا یہی مطلب نکلتا ہے۔''

اتنی دیر میں کانتی پرشاد نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ''نہیں۔ وہ تو میں سائنس کے حوالے

سے بات کر رہا تھا۔ ورنہ میں کوئی ناستک تو ہوں نہیں۔"

"یہ ناستک کون ہوتا ہے؟"

"جو نہ بھگوان کو مانے نہ خدا کو، وہ ناستک ہوتا ہے۔" کانتی پرشاد نے یوں بدمزہ ہو کر کہا جیسے ناستک کوئی گالی ہو۔ پھر پوچھا۔ "چھوٹے ٹھاکر، تمھیں میں کیسا لگتا ہوں۔"

"اچھے لگتے ہیں۔"

"کیا تم یہ چاہو گے کہ میری جگہ کوئی اور ماسٹر تمھیں پڑھانے کے لیے آئے؟"

"نہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہوگا؟"

"اگر ٹھاکر جی یا ٹھاکرائن کو پتا چل گیا کہ میں تمھیں ایسی باتیں بتا رہا ہوں تو وہ شاید مجھے مروادیں۔ نہ بھی مروایا تو نکال ضرور دیں گے۔"

اوتار سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے اماں نے بھی یہی بات کہی تھی۔ اور وہ اماں سے کچھ پوچھنے سے محروم ہو گیا تھا۔ اب کیا ماسٹر جی بھی......؟ نہیں۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔

"میں پتا جی اور ماتا جی کو کبھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ لیکن ایک شرط ہے ماسٹر جی۔"

کانتی پرشاد تو گویا سولی پر لٹک گئے۔ "وہ کیا ہے اوتار سنگھ جی؟" انھوں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"میں جب بھی کچھ پوچھوں گا، آپ مجھے بتائیں گے۔ وہ جو آپ کے خیال میں سچ ہے۔"

کانتی پرشاد مطمئن ہو گئے۔ وعدہ کرنے میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے سوچا۔ لیکن دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ محتاط رہیں گے۔ "ضرور چھوٹے ٹھاکر" انھوں نے اوتار سنگھ سے کہا۔ "یہ تو میرا فرض ہے۔"

❁......❁......❁

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ کے دماغ میں دو صندوق تھے۔ ایک میں معلومات جمع ہوتی رہتی تھیں...... دوسروں کے نظریات۔ وہ درست ہوں یا غلط۔ معقول ہوں یا احمقانہ۔ وہ اس صندوق میں جمع ہو جاتے تھے اور دوسرے صندوق میں اس کے مشاہدات۔ اور اب یہ ہوا کہ اسے تنہائی کی ضرورت محسوس ہونے لگی تاکہ وہ ان معلومات، نظریات اور مشاہدات کا تجزیہ کر کے ان سے نتائج اخذ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تنہائی کے موقعے تلاش کرنے لگا۔ کھیل سے اس کا دل بالکل ہٹ گیا۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ سب سے اچھی اور طویل تنہائی رات کو بستر پر میسر آتی ہے۔ سو دیر سے سونا اس کا معمول بن گیا۔ وہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا اور سوچتا رہتا۔ ماتا جی اور پتا جی سمجھتے کہ وہ سو رہا ہے۔

تنہائی کی ضرورت اس لیے اور بڑھ گئی تھی کہ ماسٹر جی نے اسے ایک بہت وسیع مشغلہ

دے دیا تھا۔ وہ تصور میں دیکھتا کہ وہ بہت پرانے...... ابتدائی زمانے کا انسان ہے۔ وہ یہ کیفیت خود پر طاری کرتا۔ اس کی مشکلات، اس کی پریشانیاں اور اس کی بے بسی محسوس کرنے کی کوشش کرتا۔ یوں وہ انسان کے ارتقا کو محسوس کر رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا اور یہ میدان بہت بڑا تھا۔

اس وقت تک وہ مطالعہ بھی بہت کر چکا تھا۔ ماسٹر جی خود بہت لائق انسان تھے۔ ان کا شاگرد ہونے کی حیثیت سے وہ علم میں اپنی عمر کے مقابلے میں بہت آگے تھا۔ اس پر مستزاد اس کا فطری تجسس...... اس کے سوال۔ اسی حساب سے اس کا تصور بھی بہت زرخیز تھا۔

سو بیسویں صدی عیسوی کا اوتار سنگھ زمانہ ماقبل تاریخ کی وسیع و عریض دنیا میں آزادی سے گھومتا پھرا۔

بالکل ابتدا میں انسان کا معاش شکار تھا۔ اور زندگی صرف پیٹ بھرنا اور اپنی بقا کا خیال رکھنا۔ چنانچہ وہ کہیں نکلتا نہیں تھا۔ پانی میں ہاتھ سے مچھلی پکڑتا۔ پرندے اور زیادہ دشوار تھے۔ بکری اور ہرن وغیرہ کے لیے بہت مشقت کرنا پڑتی تھی۔ بڑے جانوروں سے تو وہ گھبراتا تھا۔

ایک بار دو دن ہو گئے اور کوئی شکار نہیں ملا۔ بھوک نے اسے نڈھال کر دیا۔ چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ اب تو شکار کا کوئی امکان بھی نہیں رہا تھا۔ تب پہلی بار اس نے ڈرتے ڈرتے جنگلی بیریاں کھائیں۔ کچھ کڑوی کسیلی، کچھ میٹھی۔ ذائقہ اسے اچھا لگا۔ توانائی بھی ملی۔ یوں وہ پھلوں سے متعارف ہوا۔ اب کبھی شکار نہ ملتا تو وہ جنگلی پھل کھا لیتا۔ اس نے درختوں سے پھل توڑنا سیکھ لیا۔

پھر ایک دن بڑے نکیلے دانتوں والا گیدڑ اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ بھاگا، گیدڑ اس کے پیچھے تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا اور ہانپنے لگا۔ گیدڑ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ بے بس تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک پتھر نظر آیا۔ اس نے پتھر اٹھایا اور کھینچ کر مارا۔ پتھر گیدڑ کے منہ پر لگا اور گیدڑ کے منہ سے خون نکلا۔ گیدڑ بھاگ گیا۔

اس اتفاق سے اس نے سمجھا کہ وہ پتھر سے کام لے سکتا ہے۔ اگلی بار گیدڑ چپکے سے اس کے قریب آیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ پتھر اس کے پاس تھا اور کھینچ کر مارنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ ہاتھ میں پتھر تھام کر گیدڑ کو مارتا رہا۔ یہاں تک کہ گیدڑ ختم ہو گیا۔ اس دن اس نے پتھر کا فرق بھی سمجھ لیا۔ نکیلا پتھر زیادہ کام آتا ہے۔ اس نے پتھر کو پتلا اور نکیلا کر کے ہتھیار بنائے۔ تحفظ کا تحفظ...... اور شکار کرنا آسان ہو گیا۔

فاقے کا خطرہ دور ہوا تو دماغ زیادہ کام کرنے لگا۔ پیٹ کی طرف سے بے فکری ہوئی تو مشاہدہ شروع ہوا۔ اس نے مکئی دیکھی اور دیکھا کہ اسے پرندے شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ خود بھی شوق سے کھاتا تھا۔ پھر وہ بیمار ہو گیا۔ مجبور ہو گیا کہ وہیں پڑا رہے۔ آگے جانے کی طاقت نہیں تھی۔ راستہ دشوار تھا اور سامنے پہاڑ تھا۔ اس کا جسم گرم ہو رہا تھا۔ اس نے مکئی کے دانے جہاں تک،

پھیلا سکتا تھا، پھیلا دیے کہ پرندے آئیں گے اور وہ پتھر سے ان کا شکار کر کے پیٹ بھرے گا اور طاقت بحال ہوگی تو آگے نکل جائے گا۔

تیس چالیس سورج نکلے اور ڈوبے تو اس نے دیکھا کہ جہاں اس نے مکئی کے دانے پھیلائے تھے، وہاں پودے نکل رہے ہیں۔ پھر اس نے ان پودوں کو بڑھتے دیکھا۔ ہر پودے میں مکئی کے بہت سارے پھل تھے۔ بہت سارے سورج نکلے اور ڈوبے تو مکئی تیار ہوگئی۔ اس نے سوچا تو ان دانوں سے پودے نکلتے ہیں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

وہ صحت یاب ہوگیا تھا۔ مگر وہ آگے نہیں گیا۔ اس نے پھر دانوں کو پھیلا کر تجربہ کیا۔ پھر فصل ہوئی۔ مگر اس نے سمجھ لیا کہ اس کے لیے یہاں رہنا ضروری ہے۔ سو اس نے گھومنے پھرنے کو خیرباد کہا۔ اور وہیں ایک غار میں رہنے لگا۔ پھر اس نے پرندوں کو گھونسلا بناتے دیکھا اور اپنے لیے گھر بنایا، جہاں وہ دھوپ اور بارش سے اور ہوا سے محفوظ تھا۔ وہ زراعت اور تمدن کا آغاز تھا۔

اہم ترین عناصر چار تھے مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ ان کے بغیر زندگی کا تصور نہیں تھا۔ ہوا اور مٹی ہر جگہ موجود تھی۔ پانی کا ایک سسٹم تھا اور آگ نہ ہوتی تو انسان جانوروں کی طرح کچا کھاتا رہتا۔ پہلی بار وہ کھانا پکا کر ہی جانوروں سے ممتاز ہوا تھا۔

ان سب باتوں پر غور کرتے ہوئے اوتار سنگھ کے ذہن میں دو باتوں نے جڑ پکڑی، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راسخ ہوتی گئیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں کوئی کام خود بہ خود نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اتفاق کوئی چیز نہیں ہوتا اور اس کا سبب اس کا عمیق مشاہدہ تھا۔

وہ ہر چیز کو علم کی کسوٹی پر پرکھتا ضرور تھا لیکن اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ کہیں کہیں سائنس بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ جیسے دنیا کی ابتداء کے بارے میں وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتا تھا کہ ایک کیمیاوی عمل کے نتیجے میں زمین بنی اور اس پر زندگی کا آغاز ہوا۔ اور وہ کہتا تھا کہ وہ عظیم کیمیاوی عمل خودکار تھا۔ یہ بات اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ یہ طے ہے کہ کیمیاوی عمل عناصر کے درمیان ہوتا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ عناصر خود بہ خود پیدا نہیں ہوتے۔ ہر چیز کی، ہر عمل کی کوئی نہ کوئی علت ہے۔ جو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ اس پر اتفاق کا لیبل چپکا دیتا ہے۔ سو جہاں سائنس بے بس دکھائی دیتی تھی، وہ وہیں سے غور و فکر کرتا تھا۔

انسانی ارتقاء کی تاریخ سے اوتار سنگھ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انسان کا علم بہت محدود اور ناقابل اعتبار ہے۔ ابتداء میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ پھر اسے اپنی عقلی صلاحیت کا ادراک ہوا۔ تب اس نے سمجھنا شروع کیا اور تب سے اب تک کتنے ہی نظریات ایسے ہیں، جن پر وہ مدتوں راسخ رہا۔ مگر بعد میں انھیں غلط ماننے پر مجبور ہوگیا۔ تو یہ طے ہے کہ جو بھی انسان کو معلوم ہے، جو کچھ بھی [illegible] نے سمجھا ہے، اس کے درست ہونے کی کوئی ضمانت نہیں۔ کوئی بھی نظریہ کسی بھی وقت غلط [illegible]ت ہوسکتا ہے۔

سائنس کی بنیاد انسان کی عقل اور اس کی جاننے کی خواہش ہے۔ اور اوتار سنگھ نے سمجھ لیا تھا کہ عقل خام ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں، جنھیں عقل سمجھنے سے قاصر ہے تو اس وجہ سے ان کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا جو کچھ انسان کو جب تک معلوم نہیں، تب تک وہ ناموجود ہے۔ لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ وہ موجود تو ہوتی ہے۔ کسی کے وجود کا انکار کرنے سے وجود ختم تو نہیں ہو جاتا اور جب انسان اسے دریافت کرتا ہے، تب سے اسے ماننا شروع کرتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت عرصے سے موجود ہوتی ہے۔ ابھی ماسٹر جی نے بتایا تھا کہ ایک اور ستارہ دریافت ہوا ہے، جس کا نام پلوٹو ہے۔ دریافت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب انسان کو نظر آیا ہے۔ اس کی سمجھ میں اب آیا ہے۔

خود ماسٹر جی نے بتایا تھا کہ نظام شمسی بہت بڑا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس میں اور ستارے بھی ہوں، جو ابھی انسان کو نظر نہ آئے ہوں اور یہ بھی کہ کائنات میں اس سے کہیں بڑے ہزاروں...... بلکہ شاید لاکھوں نظام موجود ہوں۔ تو کائنات بہت بڑی ہے...... اتنی بڑی کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ تو ابھی تک اپنے نظام شمسی کو بھی پورے طور پر نہیں سمجھ پایا ہے۔ اور یہ جو کچھ انسان نے سمجھا ہے، ہزاروں برسوں میں سمجھا ہے اور جو سمجھا ہے، وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ ہزاروں، لاکھوں سوال ایسے ہیں، جن کے وہ ابھی تک جواب نہیں دے پایا ہے۔

پھر عقل کے ساتھ حواس بھی ہیں۔ انسان دیکھتا ہے تو مانتا ہے۔ سب سے زیادہ وہ آنکھوں پر اعتبار کرتا ہے۔ مگر اور حسیں بھی ہیں۔ وہ سُن سکتا ہے۔ سونگھ سکتا ہے، چھو سکتا ہے، چکھ سکتا ہے۔ یہ تمام حسیں عقل کی مددگار ہیں۔ تبھی تو اس نے بہت سی ایسی چیزوں کا وجود تسلیم کیا، جنھیں وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان میں ہوا بھی تھی اور خوشبو بھی۔

اوتار سنگھ دنیا کے نظام پر غور کرتا تھا۔ سورج ہر روز اپنے مقررہ وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا تھا۔ چاند تھا۔ اس کی گردش کا دائرہ ایک خاص مدت میں مکمل ہوتا تھا۔ نیا چاند نکلتا، روز تھوڑا تھوڑا بڑھتا، مکمل ہوتا، پھر تھوڑا تھوڑا گھٹتا، دو دن غائب ہو جاتا اور پھر نیا چاند نکلتا۔ موسم تھے جو اپنے اپنے وقت پر آتے جاتے تھے۔ کچھ مہینے بارشوں کے تھے۔ گرمی سردی تھی۔ بہار خزاں تھی۔ تمام ستارے اپنی مخصوص رفتار سے آگے پیچھے گردش کرتے تھے۔ ایسے کہ اس میں کبھی ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ تبھی تو جنتریوں سے پتا چلتا تھا کہ کب کون سا ستارہ کہاں ہے۔ زہرہ، مشتری، مریخ، عطارد اور زحل۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کب سے کب تک طلوع رہیں گے۔ یعنی زمین سے دیکھے جا سکیں گے۔ سب کچھ ایسے حساب کتاب سے تھا کہ نجومیوں کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ کس سال کس مہینے میں کتنے بج کر کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈ پر سورج یا چاند گرہن ہوگا۔

سائنس بہت سی چیزوں کو نہیں مانتی تھی۔ ان میں آتما بھی تھی اور خدا بھی۔ اور بھی بہت کچھ تھا، جسے وہ توہمات قرار دے کر مسترد کر دیتی تھی۔ دراصل سائنس بہت مجبور تھی۔ اس کی کچھ حدود تھیں۔ وہ مختلف چیزوں پر، ان کی ماہیت، ان کے اجزائے ترکیبی کے حساب سے تجربے کر

کے نتائج اخذ کرتی تھی۔ اور ایسا صرف ان چیزوں پر ہو سکتا تھا جو اس کی دسترس میں ہوں۔ جو انسانی حسوں کی حدود میں ہوں۔ ایسی چیزیں بھی تھیں جو انسان دیکھ سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا۔ مگر وہ اس کی پہنچ سے دور تھیں۔ ان چیزوں کو وہ ریاضی کی مدد سے سمجھتا تھا۔ فلکیات کا پورا علم ایسا ہی تھا۔ اور اس کی براہِ راست تصدیق نہیں کی جا سکتی تھی۔ انسان نے بہت ترقی کر لی تھی۔ ثابت ہو چکا تھا کہ تمام جانداروں میں وہ سب سے برتر ہے۔ اس نے بہت کچھ تسخیر کر لیا تھا۔ بہت کچھ جان لیا تھا۔ بہت کچھ ایجاد کر لیا تھا۔ اس نے اپنے نظام شمسی کے سسٹم کو بھی بڑی حد تک سمجھ لیا تھا۔ لیکن اپنی قوتوں اور اختیارات کے باوجود بہت سے مقامات پر بے بس تھا۔ آسمانی بجلی، زلزلے، طوفان، ان کے سامنے اس کی نہیں چلتی تھی۔ اور وہ سسٹم میں تبدیلی کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ وہ سورج کو نہ پانچ منٹ پہلے نکال سکتا تھا نہ پانچ منٹ بعد۔ موسم بھی اس کے اختیار میں نہیں تھے۔

اور ایک اہم چیز وقت تھا۔ اس پر کسی چیز کا اثر و اختیار نہیں تھا اور اس کے اثرات سے کوئی چیز محفوظ نہیں تھی۔ اس کا تعلق سورج سے تھا اور وہ آگے ہی آگے بڑھتا تھا۔ کبھی رکتا نہیں تھا۔ اوتار سنگھ نے بیج سے پودے کو نکلتے اور پھر پودے کو بڑھتے دیکھا تھا۔ اس نے خود کو بھی بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ لمبا بھی ہوا تھا اور بڑھا بھی تھا۔ اس نے چیزوں کو پرانی اور بوسیدہ ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے ماتا جی کی آنکھوں کے نیچے چڑیوں کے پنجوں کے سے نشان آتے دیکھے تھے اور پتا جی کے چہرے پر جھریاں پڑتے بھی دیکھا تھا۔ وقت کے اثرات بے جان چیزوں پر اور طرح کے تھے۔ وہ بڑھتی نہیں تھیں۔ پرانی...... وقت کے ساتھ ساتھ بوسیدہ ہوتی چلی جاتی تھیں۔ لگتا تھا کہ گزرتا وقت ان میں توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ انھیں کمزور کرتا ہے۔ جان دار چیزوں کے ساتھ معاملہ اور تھا۔ وہاں تعمیر بھی تھی۔ وقت پہلے جان دار چیزوں کو بڑھاتا تھا اور جان دار چیزوں کے بڑھنے کی ایک حد تھی۔ اس حد کو پہنچ کر بڑھوتی کا ہر عمل رک جاتا تھا اور ایک مدت کے ٹھہراؤ کے بعد زوال کا عمل شروع ہو جاتا تھا۔

وقت ایک ایسی طاقت تھی، جو نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن ہر چیز پر اس کے اثرات نظر آتے تھے۔ وہ ایک ایسا دھارا تھا، جو کبھی رک نہیں سکتا تھا۔ اوتار سنگھ نے غور کیا تو سمجھا کہ ہر جاندار چیز کے لیے ایک مہلت مقرر ہے اور وقت اس کا پیمانہ ہے۔ ہر چیز کو فنا ہے۔ جو جیتا ہے، وہ آخر کار مر جاتا ہے۔ اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ سب کی مہلت الگ الگ ہے۔ یہ نہیں کہ آدمی بوڑھا ہو کر مرے۔ گنگا رام کا بچہ دو سال کا مر گیا تھا۔ اور گنگا رام کا باپو 80 سال کا تھا، مگر زندہ تھا۔ یہی حال نباتات کا تھا۔ کوئی پودا بڑا ہوتے ہوتے اچانک سوکھ جاتا تھا اور کوئی درخت برسوں سے ہرا بھرا تھا۔

وہ بارہ سال کا ہونے والا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اسے گھر سے دور جانا ہے۔ اسکول میں داخل ہونا ہے۔ اس خیال سے وہ گھبراتا نہیں تھا۔ بلکہ خوش ہوتا تھا۔ اس کے تجسس کو گاؤں کے

چھوٹے سے منظر نے مہمیز کر دیا تھا۔ وہ سوچتا کہ بڑے منظر میں جا کر وہ زیادہ دیکھے گا اور زیادہ سمجھے گا۔

پتا جی نے جب اسے اس بارے میں بتایا تو گویا دلاسہ دینے کے لیے کہا۔ ''وصال دین بھی تمھارے ساتھ جائے گا...... اور ماسٹر جی بھی۔''

وہ خوش ہو گیا۔ ویر جی نے کبھی اس کے تجسس میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ خود کو ادھورا محسوس کرتا تھا۔

لیکن پتا جی اداس ہو گئے۔ ''پتا نہیں، تمھارے بغیر ہم کیسے جئیں گے۔''

''کیوں پتا جی۔ اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے بھی لوگ دور بھیجتے ہوں گے۔''

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے گہری سانس لی۔ ''مگر تم تو میرے ایک بیٹے ہو...... اور وہ بھی منتوں مرادوں والے......''

''یہ کیا ہوتا ہے پتا جی...... منتوں مرادوں والا؟'' اوتار سنگھ نے اپنا پسندیدہ جملہ دہرایا۔

اس کے جواب میں ٹھاکر نے اسے سب کچھ بتایا۔ بلکہ اسے لے جا کر برگد کا وہ درخت بھی دکھایا، جو جل چکا تھا۔ مگر اب بھی کھڑا تھا۔ ''یہاں ہم نے آخری بار تمھیں مانگا تھا۔ منت چڑھائی تھی۔''

''تو اس کے بعد ہی میں پیدا ہوا تھا؟''

''ہاں۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ اس درخت نے آپ کو مراد دی۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بیٹے کو اس معاملے کی تفصیل نہیں بتانا چاہتا تھا۔ لیکن چند لمحے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکلا۔ ''یہ درخت تو ہمارے منت ماننے کے کچھ دن بعد ہی سوکھ گیا تھا۔''

''میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے۔''

''ہاں پتر۔ اس سے بہت پہلے۔''

ماتا جی اکثر اسے بتاتی تھیں کہ انھوں نے کیسے طویل برس اولاد کی آرزو میں گزارے تھے۔ کیا گزرتی تھی ان پر۔ انھیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہر چیز میسر تھی۔ لیکن انھیں کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ وہ بس ہر جگہ اولاد کی پرارتھنا کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ انھوں نے بائیس برس اولاد سے محرومی کا کشٹ اٹھایا ہے اور جب انھیں وہ مل گیا تو جیسے سب کچھ مل گیا۔

تو اوتار سنگھ نے سوچا کہ وہ ہستی جس نے مجھے پیدا کیا، یقیناً زبردست ہے اور وہ یہ درخت تو ہرگز نہیں ہو سکتا، جو خود ہی زندگی سے محروم ہو گیا ہے۔ میرے ماں باپ بائیس سال ہر کسی سے اولاد مانگتے رہے۔ لیکن اولاد نہیں ملی پھر اس نے مجھے پیدا کیا تو میرے ماں باپ پر بڑا احسان

کیا۔ مجھ پر بھی احسان کیا کہ مجھے ایسے محبت کرنے والے ماں باپ دیے، اور انھیں اتنا کچھ دیا کہ وہ میری ہر خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟

وہ اس سوال پر سوچتا رہا۔ اسے یاد آیا کہ ایک دن اس نے ماتا جی سے پوچھا تھا۔

''آپ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ ہر چیز دیتی ہیں مجھے۔ اور پتا جی بھی کیا کچھ کرتے ہیں میرے لیے۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اباجی۔ میں کیا کروں آپ کے لیے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ بس تم اچھے رہو۔ خوش رہو۔ میرے لیے یہی سب کچھ ہے۔'' ماتا جی نے کہا تھا۔

''اچھے رہنے کا کیا مطلب ہے؟''

''اچھے پرش بنو۔ اچھے کام کرو۔ تاکہ تمھارے پتا جی کا نام روشن ہو۔ لوگ خوشی سے کہیں کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا پوت مہاپرش ہے۔''

''اور کیا کروں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اور کچھ بتایئے۔ کوئی مشکل سا کام۔''

ماتا جی چند لمحے سوچتی رہیں۔ اس دوران پتا جی بھی آ گئے تھے۔ ''بس تم ہمیشہ ہم سے محبت کرو۔'' انھوں نے کہا۔

اور اوتار سنگھ ماں سے لپٹا اور انھیں پیار کیا۔ پھر پتا جی سے لپٹ گیا اور انھیں چومنے لگا۔ ''وہ تو میں کرتا ہوں اور یہ بھی بہت آسان ہے میرے لیے۔''

''محبت کرنا کبھی آسان نہیں ہوتا۔'' پتا جی نے کہا۔ ''مگر یہ بات تم ابھی نہیں سمجھو گے۔''

تو اب اوتار سنگھ نے سوچا کہ اسے اپنے پیدا کرنے والے سے محبت کرنی چاہیے...... دنیا میں سب سے...... ماتا جی، پتا جی، اماں اور ویرجی سے بڑھ کر۔ کیونکہ اس نے اسے پیدا نہ کیا ہوتا تو نہ وہ ان سب کو ملتا اور نہ یہ سب اسے ملتے۔ اس نے سمجھ لیا کہ شکر ادا کرنا اور محبت کرنا سب سے زیادہ اس کے لیے ہونا چاہیے، جس نے اسے پیدا کیا ہے۔

مگر محبت کیسے کرے؟ وہ تو اسے جانتا بھی نہیں۔ تو پھر پہلے اسے جاننے کی کوشش کرے۔ اسے تلاش کرے۔ پھر اس سے دنیا کی ہر ہستی اور ہر چیز سے بڑھ کر محبت کرے۔

''اے تو کہ جو بھی ہے، میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں، اس سب پر جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو دیا۔'' اوتار سنگھ نے سرگوشی میں کہا۔ ''اب میں تجھے تلاش کروں گا۔ تجھے ڈھونڈوں گا اور پھر تجھ سے محبت کروں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ میں بس ارادہ کر سکتا ہوں، کوشش کر سکتا ہوں۔ مگر تو مجھے اسی وقت ملے گا، جب تو چاہے گا۔ جب تیری مرضی ہوگی۔ میں تجھ سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ میری مدد کر، اور مجھے مل جا۔''

یہ دعا کر کے اسے ایک پل کو سکون آیا۔ مگر وہ فوراً ہی مضطرب ہو گیا۔ اسے تو ڈھونڈنا ہے...... ان تھک کوشش کرنی ہے۔ سکون تو اس کے بعد کی چیز ہے۔ بعد میں ہی اچھا لگے گا۔

اب وہ سراپا عزم تھا!

⊛......⊛......⊛

''درخت کیسے سوکھ جاتے ہیں ماسٹر جی؟'' اوتار سنگھ نے ماسٹر جی سے پوچھا۔

''ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ ارد گرد کی زمین خشک ہو جائے۔ ایسی کہ درخت کی جڑیں درخت کے لیے غذا حاصل نہ کر سکیں۔ مگر بہت پرانے اور بہت بڑے درختوں کے ساتھ ایسا کم ہی ہوتا ہے کیونکہ ان کی جڑیں بہت دور تک...... بعض اوقات میلوں تک پھیلی ہوتی ہیں۔'' کانتی پرشاد نے کہا۔

''اور دوسری وجہ؟''

''تم جانتے ہو کہ جڑیں زمین سے غذا حاصل کر کے تنے کی طرف بڑھاتی ہیں۔ اس سے درخت ہرا رہتا ہے۔ نئی کونپلیں، نئے پتے نکلتے رہتے ہیں۔ غذا نہ ملے تو یہ عمل رک جاتا ہے اور دھیرے دھیرے سوکھ جاتا ہے۔ اب جڑوں میں کوئی بیماری پھیل جائے اور زمین سے غذا چوسنے اور آگے بڑھانے کا ان کا عمل معطل ہو جائے تو درخت ختم ہو جاتا ہے۔''

''تو سوکھنے کے بعد بھی درخت کھڑا رہتا ہے؟''

''کچھ عرصہ۔ اس وقت تک، جب تک جڑوں میں اس کا بوجھ اٹھانے کی طاقت ہو۔ اور پھر درخت اندر سے کھوکھلا ہونے لگتا ہے۔ پھر یا تو وہ کھڑے کھڑے ختم ہو جاتا ہے یا گر جاتا ہے۔ جڑیں زمین چھوڑ دیتی ہیں...... ٹوٹ جاتی ہیں۔''

''سوکھنے کے کتنے عرصے بعد درخت گر جاتا ہے؟''

''مہینہ...... دو مہینے...... چھ مہینے...... اور زیادہ سے زیادہ سال بھر بعد۔'' کانتی پرشاد نے کہا۔ ''مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یونہی۔ کوئی خاصی بات نہیں۔''

سہ پہر کو ان کا کھیلنے کا وقت تھا۔ وصال دین اور اوتار سنگھ حویلی سے نکل جاتے تھے اور کانتی پرشاد اپنے کمرے میں آرام کرتے تھے۔ اس سہ پہر اوتار سنگھ نے کانتی پرشاد سے کہا۔

''آپ آج ہمارے ساتھ چلیں ماسٹر جی۔''

کانتی پرشاد کو معمول میں اس تبدیلی کا تصور خوش گوار لگا۔ انھوں نے ہامی بھر لی۔ وہ دونوں لڑکوں کے ساتھ حویلی سے نکل آئے۔ اوتار سنگھ آگے آگے چل رہا تھا۔

وہ بستی سے باہر نکل آئے۔ کچھ دور کانتی پرشاد کو وہ سوکھا ہوا برگد کا بہت بڑا درخت نظر آیا۔ انھیں اپنے شاگرد پر فخر ہونے لگا۔ وہ صحیح طالب علم تھا۔ سائنسی ذہن والا، تجسس سے بھرا ہوا اور تحقیق کے جذبے سے مالا مال۔

اوتار سنگھ نے انھیں لے جا کر وہاں کھڑا کر دیا۔ ''اس درخت کو دیکھیے ماسٹر جی۔''

کانتی پرشاد نے درخت کو دیکھا۔ پھر گردو پیش کا جائزہ لیا۔ قریب ہی پانی کا ایک تالاب تھا۔ اور ہر طرف خود رو گھاس اور جنگلی پھولوں کے پودے موجود تھے۔ ''دیکھ رہا ہوں۔ یہ جڑوں کی بیماری والا معاملہ ہے کیونکہ اردگرد تو بہت ہریالی ہے۔''

''یہ درخت مر چکا ہے نا۔''

''بالکل۔'' کانتی پرشاد نے درخت کی زمین سے باہر نکلی ہوئی مردہ جڑوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا مر چکا ہے کہ اب کبھی ہرا نہیں ہوگا۔''

''مگر ماسٹر جی، یہ درخت تقریباً تیرہ برس سے اس حال میں ہے۔''

کانتی پرشاد کے چہرے پر بے یقینی کا تاثر ابھرا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔'' انھوں نے بے حد وثوق سے کہا۔

''آپ پتاجی سے پوچھ لیں۔''

ٹھاکر کے حوالے پر کانتی پرشاد کو سانپ سونگھ گیا۔ ''تو پھر یہ اتنے برسوں سے کھڑا کیسے ہے؟''

''یہی تو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''میرے خیال میں تو اسے اب ایک انگلی کے دھکے سے بھی گر جانا چاہیے۔'' کانتی پرشاد نے کہا اور درخت کے تنے پر بیچ ایک انگلی سے ہی دباؤ ڈالا۔ پھر انھوں نے پہلے ایک ہاتھ سے اور پھر دوسرے ہاتھ سے درخت کو دھکیلا۔ وہ زور لگاتے رہے۔ دونوں لڑکے بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ مگر درخت اپنی جگہ کھڑا رہا۔

بالآخر کانتی پرشاد نے کوشش ترک کر دی۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ''اس کی جڑیں یقیناً زندہ ہوں گی۔''

''تو پھر درخت کو غذا بھی ملنی چاہیے۔'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''ہو سکتا ہے، درخت کا جڑوں سے رابطہ نہ رہا ہو۔''

''تو پھر درخت کو گر جانا چاہیے اور زندہ جڑوں سے دوبارہ درخت اگنا چاہیے۔ سائنس تو یہی بتاتی ہے نا۔''

''ممکن ہے، جڑ کے ایک مضبوط مگر چھوٹے حصے سے درخت کا رابطہ ہو۔''

''تو اسے تھوڑی بہت غذا تو مل رہی ہوگی۔ کہیں تو نمو کے آثار نظر آئیں۔''

کانتی پرشاد لاجواب ہوگئے۔ ''اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی، جو ہمیں معلوم نہیں۔''

''سائنس کو بھی معلوم نہیں؟''

''سائنس کو معلوم ہوگا۔ ہمارا علم کم ہے۔'' کانتی پرشاد نے بات بنائی۔ لیکن ان کا لہجہ کمزور تھا۔ ''آؤ، اب چلیں۔'' انھوں نے کہا اور واپس چل دیے۔

دونوں لڑکے ان کے پیچھے تھے۔ ماسٹر جی کا جواب اوتار سنگھ کو مطمئن نہیں کر سکا تھا۔ مگر اسے خوشی تھی کہ ماسٹر جی نے اس معاملے کو توہم قرار نہیں دیا۔

❀……❀……❀

پھر ماتا جی بیمار ہو گئیں...... ایسی بیمار کہ دیکھتے ہی دیکھتے بستر سے لگ گئیں۔ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں رہیں۔ پہلے تو وید جی آتے رہے۔ پھر شہر سے ڈاکٹر آنے لگے۔ ٹھاکر جی بھی بہت پریشان رہنے لگے تھے۔

بہت دن سے ماتا جی پوجا والے کمرے میں نہیں گئی تھیں۔ جب پہلی بار ایسا ہوا تو انھوں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''دیکھ پتر، آج میں اٹھ نہیں سکتی۔ لیکن تم روز کی طرح جاؤ گے اور پوجا کرو گے۔''

اوتار سنگھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور جب تک میں نہ جا سکوں، تم ہر روز پوجا کرتے رہو گے۔''

''جی ماتا جی۔''

اوتار سنگھ اکیلا ہی پوجا کے کمرے میں جانے لگا۔ ایک دن اس نے بھگوان کے سامنے رکھے پرشاد پر ایک مکھی کو منڈلاتے دیکھا۔ وہ کبھی کسی پھل پر بیٹھتی تو کبھی مٹھائی پر۔ اوتار سنگھ کو گھن آنے لگی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر مکھی کو اڑایا۔ مگر اگلے ہی پل وہ پھر وہاں آ بیٹھی۔ اوتار سنگھ نے پھر اسے اڑایا۔ مگر پھر وہی ہوا۔ ذرا دیر میں ہی وہ عاجز ہو گیا۔ بری طرح سے جھنجھلانے لگا۔ ایک اتنی سی مکھی پر اس کا بس نہیں چل رہا اور ماسٹر جی کہتے ہیں کہ منش میں بڑی شکتی ہے۔ دنیا کی ہر مخلوق سے زیادہ۔

وہ عاجز آ گیا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے کہا۔ ''بھگوان، اس بدتمیز مکھی کو شراپ دیجیے۔ یہ آپ کے پرشاد کو گندا کر رہی ہے۔''

لیکن بھگوان کب جواب دیتا ہے۔

اوتار سنگھ نے اب مکھی کو مارنے کی کوشش کی۔ اس کی جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

''کیسے بھگوان ہو۔ تم تو کچھ بولتے ہی نہیں۔ اس مکھی کو شراپ دو نا۔ ماتا جی کہتی ہیں، تم بدتمیزی کرنے والوں کو شراپ دیتے ہو۔ یہ مکھی تمہارا پرشاد گندا کر رہی ہے۔ ماتا جی کہتی ہیں، کوئی بدتمیزی کرے تو تم اسے بہت برا شراپ دیتے ہو۔''

اس نے ہاتھ روک لیا۔ اب وہ منتظر تھا کہ بھگوان مکھی کو شراپ دے گا۔ لیکن بدبخت مکھی اسی طرح پرشاد پر دندناتی رہی بلکہ وہ بار بار بھگوان کی مورتی پر بھی جگہ جگہ بیٹھ رہی تھی۔

''تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔'' اوتار سنگھ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''بولتے بھی نہیں۔ اپنے پرشاد

کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ تو دنیا کا نظام کیسے چلاتے ہو؟"

اب کے اوتار سنگھ نے وہیں رکھی گیتا اٹھائی اور مکھی کے درپے ہو گیا۔ مگر مکھی بہت پھرتیلی، بہت شریر تھی۔ ایک بار جو وہ بھگوان کی مورتی پر بیٹھی تو اس نے گیتا سے اسے مارا۔ مکھی تو اڑ گئی۔ گیتا بھگوان کے منہ پر لگی۔ مورتی الٹ کر گر گئی۔

اوتار سنگھ پر تو لرزہ چڑھ گیا۔ اس کے ذہن میں بس ایک خوف تھا۔ اب بھگوان اسے شراپ دے گا۔ کئی منٹ گزر گئے اور کچھ نہیں ہوا، تو اس کا خوف کم ہونے لگا۔ اس نے سوچا کہ اس نے تو جان بوجھ کر بدتمیزی نہیں کی جبکہ مکھی تو دانستہ بدتمیزی کر رہی تھی اور بھگوان نے اسے شراپ نہیں دیا تو مجھے کیوں دے گا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ شاید کسی کو شراپ دے ہی نہیں سکتا۔

چند روز بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ اس بار بدتمیزی کرنے والا ایک چوہا تھا۔ اوتار سنگھ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بس پوجا بھول کر چپ چاپ تماشہ دیکھتا رہا۔ چوہے نے پرشاد میں سے من پسند چیزیں اڑائیں اور اس کے بعد اس نے گستاخی کی حد کر دی۔ وہ براہ راست بھگوان سے بدتمیزی کرنے لگا۔ وہ اپنے نکیلے دانتوں سے شیو جی کی ناک کتر رہا تھا...... غیض وغضب والے، قہر کے دیوتا، تباہی کے دیوتا شیو جی کی ناک!

شیو جی کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ خوف سے شل ہو گیا۔ اب اس چوہے کی خیر نہیں۔ لیکن چوہے کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ شیو کی ناک کترنے کے کھیل سے اس کا دل بھر گیا تو وہ مورتی سے اترا اور نہایت آسودگی کے ساتھ چلتے ہوئے ایک طرف چلا گیا۔

اس روز بھگوان سے تو نہیں، لیکن اس کی مورتی سے اوتار سنگھ کا دل برا ہو گیا۔ اس نے سوچا، اس کی پوجا کرنا، اس سے کچھ مانگنا، جو خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتا، پرلے درجے کی حماقت ہے۔ انسان کی توہین ہے۔ لیکن ماں باپ سے ملا ہوا نسلی ورثہ اور ان کی دی ہوئی تعلیم اتنی کمزور نہیں ہوتی کہ آسانی سے مٹ جائے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اگلے روز وہ پوجا کے لیے چلا آیا۔ اور ناگواری کے باوجود اس نے پوجا بھی کی۔

اسی شام ٹھاکر جی بہت پریشان تھے۔ اس نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ "کیا ہوا پتا جی؟ کیا بات ہے؟"

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ "کچھ نہیں پتر۔ بس ایسے ہی۔"

"کچھ تو ہے پتا جی۔ مجھے بتائیں نا۔"

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے چند لمحے سوچا اور فیصلہ کیا کہ بیٹے کو بتانا ضروری ہے۔ "پتر...... تمہاری ماں کی حالت اچھی نہیں۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔"

اوتار سنگھ گھبرا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ماتا جی کی مہلت ختم ہونے والی ہے۔ ویسے جب سے وہ بیمار ہوئی تھیں، ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے یہ احساس ستاتا رہا تھا کہ کہیں ایسا تو

نہیں کہ کبھی نہ رکنے والا وقت ان کے لیے ختم ہو رہا ہو۔ اسی لیے اس نے ان کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ پڑھائی میں تو اس کی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ لیکن کھیلنے کے وقت میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ جلدی واپس آ جاتا اور بستر پر ماتا جی سے لپٹ جاتا اور انہیں پیار کرتا۔ وہ بھی جواب میں اسے پیار کرتیں۔ مگر پچھلے ایک ہفتے میں اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اب ان میں اسے پیار کرنے کی طاقت نہیں رہی ہے۔ وہ بس نگاہوں میں بے بسی اور حسرت لیے، پیاسی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہتی تھیں۔ اسے ڈر لگتا تھا...... مگر شعور کی سطح پر نہیں۔ وہ لاشعور میں تھا۔

"تو اب کیا ہوگا پتا جی؟" اس نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ہو سکتا پتر۔ جو بھگوان کی اچھا۔" ٹھاکر اوتار سنگھ نے اداسی سے کہا۔ پھر ذرا ٹھہر کر بولے۔ "تم تو روز پوجا کرتے ہو۔ بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ تمہاری ماتا جی اچھی ہو جائیں۔"

اگلے روز اوتار سنگھ پوجا کے لیے گیا تو بھگوان کے لیے عقیدت سے بھرا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے پرارتھنا کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ "ہے بھگوان۔ میری ماتا جی کو اچھا کر دو۔ انہیں جیون دے دو۔ میں جیون بھر تمہاری پوجا کروں گا...... آرتی اتاروں گا۔ بس تم میری ماتا جی کو پہلے جیسا کر دو۔ ماتا جی کہتی تھیں کہ تمہاری شکتی مہان ہے۔ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ مجھے بھینٹ دے دو بھگوان۔ میری ماتا جی کا جیون مجھے بھینٹ دے دو۔ میں تمہارا یہ اپکار کبھی نہیں بھولوں گا۔"

وہ پوجا کے کمرے سے نکلا تو بہت پر یقین تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ بھگوان نے اس کی سن بھی لی ہے اور مان بھی لی ہے۔ اس وقت تک ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والا محاورہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بحران میں آدمی کسی موہوم سہارے سے بھی آس لگا لیتا ہے۔ وہ اپنے تمام شکوک وشبہات بھول گیا تھا۔ اس نے بھگوان سے کمرے سے من کے ساتھ لو لگائی تھی۔

اس روز ماسٹر جی نے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ "آج چھٹی ہے چھوٹے ٹھاکر۔ آپ اپنی ماتا جی کے پاس جائیں۔"

اوتار سنگھ کا دل ہولنے لگا۔ وہ اس کمرے میں چلا گیا، جو شروع ہی سے اس کا اور ماتا جی

روازے تک پہنچا ہی تھا کہ ٹھاکر جی باہر آئے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔

"میں تمہیں ہی بلانے کے لیے آ رہا تھا۔"

"پتا جی، خیر تو ہے؟" اوتار سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں پتر۔ تمہاری ماتا جی کی حالت بہت خراب ہے۔ نہ کچھ بول رہی ہیں، نہ کسی کو پہچان رہی ہیں۔ چلو تم ان سے مل لو۔"

اوتار سنگھ ماں کے پاس چلا گیا۔ ایک پنڈت بیٹھا بلند آواز میں اشلوک پڑھ رہا تھا۔ ٹھاکرانی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن بے نور لگ رہی تھیں۔ لگتا تھا، اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ اوتار سنگھ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ برف کی طرح سرد تھا۔

''ماتا جی...... ماتا جی ...... مجھے دیکھیں۔ یہ میں ہوں اوتار سنگھ۔'' اوتار سنگھ نے اسے پکارا۔

ٹھاکرانی نے جھرجھری سی لی۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے بمشکل بیٹے کو کھینچ کر لپٹالیا۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

''ماتا جی، مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔'' اوتار سنگھ گڑگڑایا۔ ''میں نے بھگوان سے بات کر لی ہے۔ وہ تمہارا جیون نہیں لیں گے۔ ماتا جی......'' بولتے بولتے اسے احساس ہوا کہ ماں کے جسم کی لرزش ختم ہوگئی ہے۔ وہ ساکت ہوگیا ہے۔ اس کا دل بری طرح گھبرانے لگا۔

اسی لمحے کسی نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ ''اٹھو چھوٹے ٹھاکر، تمہاری ماتا جی جا چکی ہیں۔'' یہ ٹھاکر جی کی آواز تھی۔

اوتار سنگھ ہٹا اور اس نے ماں کے چہرے کو دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ پھر ٹھاکر نے اسے لپٹالیا...... اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

❀......❀......❀

حویلی میں کہرام مچا تھا۔ سبھی رو رہے تھے۔ پھر مصروفیات بھی تھیں۔ ٹھاکرانی کی آخری رسومات کی تیاری ہو رہی تھی۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ سائے کی طرح بیٹے کے ساتھ لگا تھا۔ مگر پھر اسے اطمینان ہوگیا۔ اوتار سنگھ پہلے تو بہت رویا تھا۔ مگر اب پرسکون ہوگیا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تھی۔ خالی پن تھا۔ ٹھاکر نے پرکھنے کی غرض سے اس سے کچھ باتیں پوچھیں۔ اس نے درست جواب دیے...... لیکن اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ ٹھاکر مطمئن ہو کر اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ رشتے داروں کو اطلاع کرائی تھی اور بہت سے بندوبست کرنے تھے۔

مگر باہر جاتے ہوئے اس نے وصال دین سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔

وصال دین اس کے قریب چلا گیا۔ ''چھوٹے ٹھاکر، کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں ویر جی۔''

''تو کچھ سوچ رہے ہو؟''

اوتار سنگھ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ''میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں کہ کیا۔ اور میں سوچ بھی نہیں پا رہا ہوں۔''

''دماغ پر زیادہ زور نہ دو بھائی۔'' وصال دین نے بے ساختہ کہا۔

اوتار سنگھ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وصال دین کی آنکھوں میں محبت تھی، دکھ تھا، آنسو تھے۔ اور اتنی خراب کیفیت میں بھی اوتار سنگھ کو ایک لمحے میں اس غیر معمولی بات کا احساس ہوگیا۔ ویر جی نے پہلی بار...... ہاں، پہلی بار اسے بھائی کہہ کر پکارا تھا۔ وہ اس سے لپٹ گیا۔ وہ اس سے لپٹ گیا۔ ''بس ویر جی، ایک وعدہ کرو۔'' اس نے کہا۔ ''اب مجھے ہمیشہ ایسے ہی پکارو گے۔''

وصال دین کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''کیسے پکاروں گا!''

''ایسے ہی...... بھائی کہہ کر۔''

وصال دین نے اسے محبت سے دیکھا۔ ''میں تمہیں کچھ بھی کہوں، سمجھتا تو یہی ہوں۔''

''بس اب مجھے کچھ اور نہ کہنا۔''

جب آدمی کسی بہت بڑے غم سے شل ہوتا ہے تو اس کیفیت سے نکلنا اس کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تو لوگ ہفتوں اس کیفیت میں الجھے رہتے ہیں۔ اوتار سنگھ کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن وصال دین کا بھائی کہنا اسے ہوش میں لانے کا بہانہ بن گیا۔ اس کی غم کی کیفیت ختم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیا سوچنا، کیا کرنا چاہ رہا تھا اور ایک لمحے میں غصہ اس کے اندر یوں امنڈا کہ وہ تھرتھر کانپنے لگا۔

وصال دین اس کی یہ تبدیلی دیکھ کر گھبرا گیا۔ ''کیا ہوا بھائی؟''

''کچھ نہیں ویر جی۔ ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اوتار سنگھ کمرے سے نکل گیا۔

وصال دین کو یہ خیال تھا کہ بڑے ٹھاکر جی اس کا خیال رکھنے کو کہہ کر گئے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ لیکن اسے پوجا کے کمرے میں جاتے دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ وہ اندر تو نہیں جا سکتا تھا۔

اوتار سنگھ اندر گیا اور بھگوان کی مورتی کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔ ''او بے جان مورت، غلطی میری تھی۔ میں نے تجھ سے ماں کے جیون کی بھیک مانگی۔ میں جانتا تھا کہ تو تو اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتی۔ چوہا تو بڑی چیز ہے۔ تو مکھی سے بھی خود کو نہیں بچا سکتی۔ پھر تو میری ماں کو کیا جیون دے گی۔ میں نے تجھ سے مانگا تو اس لیے کہ میری ماں تجھ پر یقین رکھتی تھی...... اور ہم منش لوگ اپنے ماں باپ، دادا پردادا کے یقین پر یقین رکھتے ہیں، چاہے وہ غلط ہوں۔ مگر اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ آج کے بعد میں تجھ سے واسطہ نہیں رکھوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پلٹ کر آخری بار مورتی کو دیکھا۔ ''اگر تجھ سے بن پڑے تو مجھے شراپ ضرور دینا۔ میں انتظار کروں گا۔''

اور وہ باہر نکل آیا۔ اس کے بعد وہ کبھی اس کمرے میں نہیں گیا!

❀......❀......❀

ایک آدمی کی موت سے زندگی بدل سکتی ہے...... دنیا بھی بدل سکتی ہے۔ اوتار سنگھ کے لیے یہ ایک نیا اور بہت بڑا تجربہ تھا۔ اس کی مشاہدے کی قوت غیر معمولی تھی۔ لیکن یہ مشاہدہ بے حد غیر معمولی تھا کیونکہ اس کی دو جہتیں تھیں۔ وہ دیکھتا تو کچھ بھی پہلے جیسا نہیں لگتا تھا۔ حویلی کی چہل پہل ختم ہو گئی تھی۔ وہ رونق نہیں رہی تھی، جو پہلے ہوتی تھی۔ سب ملازم وہی تھے۔ گھر میں کام کرنے والی نوکرانیاں وہی تھیں۔ مگر اب خاموشی رہتی تھی۔ کوئی ہنستا بولتا نہیں تھا اور ماتا جی کے دیہانت کے بعد حویلی کا ایک کمرا بالکل اجڑ گیا تھا۔ وہ کمرا جو حویلی کا سب سے آراستہ و پیراستہ کمرا تھا، اب وہاں کوئی جاتا ہی نہیں تھا اور وہ ماتا جی کا کمرا نہیں تھا جو کہ اس کا بھی تھا۔ اجڑا تو پتا جی کا کمرا تھا۔ وہ اپنا کمرا چھوڑ کر اس کے پاس آ گئے تھے اور ماتا جی کی جگہ سوتے تھے...... اس کے پاس۔

وہ باہر دیکھتا تو وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سورج اسی طرح اپنے وقت پر طلوع و غروب ہوتا۔ پرندے اسی طرح چہچہاتے۔ ندی اس طرح بہتی۔ ہوا ویسے ہی چلتی۔ لیکن اسے لگتا کہ ہر شے اداس ہے۔ اس نے یہ بات وصال دین سے کہی تو وہ ہنس کر بولا۔ ”نہیں بھائی، سب کچھ ویسا ہی ہے۔ تمھیں ایسا لگتا ہے۔“

تو اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ دنیا کا نظام کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ کسی کے ہونے نہ ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بس اس سے تعلق رکھنے والوں پر اثر پڑتا ہے اور اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ بنیادی طور پر آدمی بہت خود پسند ہے۔ وہ سب کچھ اپنے حوالے سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ خوش ہے تو جھلسا دینے والی تیز دھوپ روح پرور ہے۔ تپتی ہوئی ریت سونا ہے۔ پتوں سے محروم خزاں رسیدہ درخت خوبصورت ہیں اور وہ ناخوش ہے تو چاندنی جھلساتی ہے۔ بہتے پانی کی آواز ڈراؤنی لگتی ہے۔ اور مہکتے ہوئے پھولوں کا نظارہ آنکھوں میں چبھتا ہے۔ خوشبو سے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

ہے میرے دل سے تعلق تمام عالم کا
فضا اداس بہت چاندنی نراس بہت

پھر اس نے دیکھا کہ دھیرے دھیرے حویلی کی رونق بحال ہو رہی ہے۔ نوکروں اور داسیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آنے لگی ہے۔ وہ ہنستے بولتے ہیں۔ لیکن وہ سامنے آ جائے تو ایک دم چپ ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے خود کو مجرم سمجھ رہے ہیں۔ اسے عجیب سا لگا۔ مگر کچھ عرصے بعد خود اس میں بھی تبدیلی آ گئی۔ وہ ہنسنے بولنے مسکرانے لگا۔ تو یہ یوں ہے۔ اس نے سوچا۔ تعلق رکھنے والے بھی مرنے والے کو بھول جاتے ہیں۔ ابتداء میں یہ سوچنا اسے برا لگا۔ اس نے سوچا، آدمی کتنا بے وفا ہوتا ہے اور میں کتنا بے وفا ہوں کہ محبت کرنے والی خیال رکھنے والی ماں کو بھول رہا ہوں۔ اس احساس جرم کے تحت اس نے خود پر سوگواری طاری کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس نے پوجا تو چھوڑ دی تھی۔ لیکن آکاش پر بیٹھے بھگوان کو وہ پہلے سے زیادہ ماننے لگا تھا۔ ماتا جی کے دیہانت کے بعد اس نے اس پر بہت سوچا تھا اور بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ تو مہانوں کا مہان تھا، جو دنیا کا نظام چلا رہا تھا۔ تو وہ بے جان مورتی نہیں ہو سکتا، جو اپنے پرشاد پر بیٹھنے والی مکھی کو بھی نہ اڑا سکے۔ کسی گستاخ چوہے کو سزا بھی نہ دے سکے۔ بلکہ وہ مورتی بھی اس کی نہیں ہو سکتی۔ وہ اس طرح اپنی بے عزتی کیوں کرائے گا۔ جبکہ سب سے زیادہ عزت اسی کا حق ہے۔ اور یہ طے ہے کہ عبادت کی بنیاد خوف ہے۔ اور سب سے بڑا خوف ہمیشہ نامعلوم کا ہوتا ہے۔ جان لیا، سمجھ لیا تو رفتہ رفتہ خوف ختم۔ سامنے آ گئے تو خوف ختم۔ تو وہ مہانوں کی مہان ہستی جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے، یہ کیوں چاہے گی کہ کسی کے سامنے آئے اور اس کا خوف ختم ہو۔ وہ یہ کیوں چاہے گا کہ انسان اسے دیکھے، اس کی مورت بنائے اور حقیر جانور بھی اس کی توہین کریں۔ تو یہ مورتی انسان کی اختراع ہے اور وہ لوگ بے وقوف اور نہایت درجے کے جاہل ہی ہو سکتے ہیں، جو مکھی اور چوہے کے ہاتھوں اس مورت کا اپمان ہوتے دیکھیں اور پھر بھی اس کی پوجا کرتے رہیں۔ ان سے بہتر تو وہ جانور ہیں، جو مورت کا اپمان کرتے ہیں۔ چوہے کو دیکھو۔ کبھی جاگتے انسان پر چڑھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ مورت پر چڑھتا ہے تو اس سمجھ کے ساتھ کہ یہ بے جان ہے اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تو جس سے جانور بھی نہ ڈریں، اس سے عقل مند انسان کیسے ڈر سکتا ہے۔ وہ تو کبھی ایسا نہیں کرے گا۔

تب سے اوتار سنگھ کا معمول ہو گیا کہ دن میں دو ایک بار وہ کھلے آسمان کے نیچے کھڑا ہوتا، احترام سے سر جھکاتا اور عقیدت اور احترام سے کہتا۔ ”اے سب کچھ بنانے والے، میں تیرے سامنے، تیری بڑائی کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔“ یہ اس کی پوجا تھی۔

ماسٹر جی تاریخ پڑھا رہے تھے...... ہندوستان کی تاریخ!

”یہ کیا بات ہے ماسٹر جی کہ پورے بھارت پر جب بھی کسی ایک راجا کی حکومت رہی تو پورے دیش میں خوش حالی تھی۔“ اوتار سنگھ نے ان سے پوچھا۔ ”اور جب بھی بہت سارے رجواڑے بنے، ریاستیں بنیں تو بدامنی اور بدحالی رہی۔“

”یہ تو اصول ہے۔ وحدت میں ارتکاز ہے، کثرت میں انتشار۔“ ماسٹر جی نے جواب دیا۔ ”کم و بیش ایک جیسی طاقت کے بہت سے حکمراں ہوں گے۔ تو وہ اپنی طاقت بڑھانے اور دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کریں گے یوں جنگیں ہوں گی۔ بدامنی ہوگی۔ پیسہ جنگوں پر خرچ ہوگا تو رعایا پر ٹیکس کا بوجھ پڑھے گا اور غربت ہوگی۔“

”مگر جنگیں کیوں؟ سب اپنی اپنی جگہ حکومت کرتے رہیں۔“

”یہ انسان کی فطرت ہے۔ طاقت اور اقتدار ملتا ہے تو اس کی ہوس بڑھتی ہے۔ اس ہوس کی کوئی حد نہیں۔ تبھی تو کہتا ہوں کہ کثرت میں انتشار ہے۔ اب کسی کی پورے دیس پر حکومت

ہوتو بھی وہ اپنی راج دھانی میں بیٹھ کر حکومت کرتا ہے۔ ریاستوں میں وہ اپنے نائب مقرر کرتا ہے، جو اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ حکم اس کا ہوتا ہے، نافذ گورنر کرتے ہیں سکہ اس کے نام کا چلتا ہے۔ وصولی اور تقسیم کا کام گورنر کرتے ہیں۔ وحدت میں مرکزیت ہے۔ اس لیے خوش حالی ہے۔ معمولی سی شورش ہوئی جو فرو کر دی گئی۔ کوئی جنگ نہیں۔ کوئی چیلنج نہیں۔ رعایا سکون سے اپنا کام کرتی ہے۔ پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔"

اوتار سنگھ پر سوچوں کے نئے دروازے کھل گئے۔ کثرت میں انتشار ہے، وحدت میں ارتکاز۔ یہ تو واقعی سامنے کی بات ہے۔ اگر بھارت میں یہ معاملہ ہے تو کائنات تو بہت بڑی ہے...... منش کے تصور سے بھی بڑی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس پر بے شمار دیوی دیوتاؤں کی حکمرانی ہو۔ ایسا ہوتا تو لڑائی جھگڑے ہوتے۔ انتشار ہوتا۔ بلکہ یہ نظام چلانے والے تین بھی نہیں ہو سکتے۔ ایک ہی ہوسکتا ہے۔ چندر گپت موریہ، اشوک، ہرش، اکبر اعظم، اورنگ زیب بڑے حکمران تھے، پورے بھارت کے مالک بہت طاقت ور۔ لیکن بغاوتیں تو ان میں سے ہر ایک کے خلاف ہوئیں۔ یعنی کیسی ہی مرکزیت ہو، اور کوئی کتنا ہی طاقت ور ہو، اس کے خلاف سر اٹھانے والے موجود ہوتے ہیں اور سر اٹھاتے بھی ہیں۔

اس کے برعکس کائنات کے نظام میں کبھی خلل نہیں پڑتا۔ سورج اپنے وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔ کوئی موسم وقت سے پہلے آتا ہے نہ بعد میں۔ اپنے وقت پر آتا ہے۔ سب کچھ ایک سسٹم کے تحت ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ جس نے یہ نظام قائم کیا اور چلا رہا ہے، نہ صرف واحد ہے۔ بلکہ مطلق العنان بھی ہے۔ اس کا اختیار و اقتدار ایسا ہے کہ کوئی اسے چیلنج نہیں کر سکتا۔ کوئی اس کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ اور اس کے پاس ایسی قوتیں ہیں کہ وہ دور بیٹھ کر بھی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہ سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کے بعد اس پر ہیبت طاری ہوگئی۔ لرزہ چڑھ گیا۔ اس روز اس نے کھلے آسمان کے نیچے کمر کے بل جھک کر بہت عاجزی سے پکارا۔ "تو جو کوئی بھی ہے اے سب کچھ بنانے والے، میں تیرا اعتراف کرتا ہوں اور تیرے سامنے خود کو جھکاتا ہوں۔"

اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ رکوع کیا ہوتا ہے!

❁......❁......❁

کئی دن گزر گئے۔ اوتار سنگھ کو احساس بھی نہیں ہوا کہ اب وہ خود بھی ہنس بول رہا ہے۔ بلکہ ان کئی دنوں میں اس نے ماتا جی کو ایک بار بھی یاد نہیں کیا ہے اور جب اسے احساس ہوا تو پھر احساسِ جرم بھی ہوا۔ ارے...... وہ اتنی چاہنے والی ماں کو بھول گیا! احساسِ جرم ہو تو پھر آدمی تاویلیں بھی تلاش کرتا ہے۔ وہ تو واقعی بہت مصروف ہوگیا تھا۔ اسکول میں داخلے کے دن قریب آ گئے تھے۔ ماسٹر جی نے پڑھائی کا وقت بڑھا دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بڑے ٹھاکر نے خود

ماسٹر جی سے فرمائش کی تھی کہ وہ اسے زیادہ مصروف کر دیں۔ تاکہ وہ ماں کا غم بھول سکے۔

مگر اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ اسے پہلے بھی احساس ہوا تھا کہ وہ ماں کو بھول رہا ہے۔ اور اس نے خود پر سوگواری طاری کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ تو کیا وہ کوشش بھی ناکام ہوگئی...... اور وہ بھی ایسے کہ اسے پتا بھی نہیں چلا۔ اور اس کا مطلب ہے کہ اس کے اندر کوئی خودکار نظام حرکت میں آ گیا ہے جو اس کی کوشش پر حاوی ہے۔

اب کے ماتا جی کا خیال آیا تو اسے محرومی کا احساس اور دکھ تو ہوا۔ مگر اس بار وہ گہرائی میں نہیں تھا۔ بلکہ سطحی تھا۔ ایسا لگا کہ اندر کوئی زخم تھا...... گہرا زخم، جو چپکے چپکے بھر گیا تھا۔

یہ تو اوتار سنگھ نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ دنیا میں کوئی کام خود بہ خود نہیں ہوتا۔ سائنس جس چیز، جس بات اور جس عمل کی توجیہہ نہیں کر پاتی، اسے یا تو ایک عظیم واقعہ قرار دے دیتی ہے یا اتفاق کہتی ہے یا پھر کہتی ہے کہ یہ ایک سسٹم ہے۔ اور اوتار سنگھ کا دل اور عقل اس بات پر متفق تھے کہ جہاں سسٹم نظر آتا ہے، وہیں سسٹم بنانے والی ایک عظیم اور سب سے طاقت ور ہستی کا وجود پکا ہو جاتا ہے۔

اب اوتار سنگھ نے اپنے وجود کے حوالے سے سمجھا کہ ہر جان دار شے کے وجود میں اس عظیم ہستی کی نشانیاں موجود ہیں۔ اور اسی حوالے سے اسے اس کی کچھ صفات بھی سمجھ میں آئیں۔ وہ یقیناً بہت مہربان ہے۔ بہت شفیق ہے۔ اپنی مخلوق کی فکر کرتا ہے۔ اس نے سب کو زندگی کے لیے وقت کی ایک خاص مقدار دی ہے۔ اس عرصے تک ہر ایک کو جینا ہے۔ اب کسی کو کوئی بہت بڑا دکھ یا غم لگ جائے تو وہ اپنا جیون تو جیے گا لیکن مردوں سے بدتر۔ اب یہ اس کی مہربانی ہے کہ وہ [illegible] کے گہرے زخم بغیر کسی دوا، کسی ظاہری مرہم کے بھر دیتا ہے۔ اب یہی دیکھو کہ ماں کے [illegible] والے روز اسے لگتا تھا کہ اس کی سانس غم کی شدت [illegible] رک جائے گی۔ دل بند ہو جائے گا۔ جیسے وہ ماں [illegible] نہیں سکے گا۔ اگلے دن غم کچھ ہلکا ہوا۔ پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ اور [illegible] ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ [illegible] وفائی کے مجرمانہ احساس کے تحت اس غم کو زبردستی خود پر طاری [illegible] اس کے [illegible] وہ زخم بھر چکا ہے۔ بس یاد کے ساتھ ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے اور بس۔

[illegible] مہربان ہے۔ اپنی مخلوق کا خیال رکھتا ہے۔ ان کے غم دور کرتا ہے۔ اس کا مطلب [illegible] اپنی مخلوق کی [illegible] ہر شخص کی الگ الگ خبر رکھتا ہے۔ ان سے واقف ہے۔ کیوں نہ [illegible] اس نے [illegible] بنایا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کامل علم کے ساتھ بنایا ہے۔ وہ ان کی ہر کمزوری، ان کی ہر خوبی سے آگاہ ہے۔

اس لمحے اوتار سنگھ کا احساسِ جرم مٹ گیا۔ اس نے اس اَن دیکھی مہان ہستی کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس کا غم دور کیا تاکہ وہ اپنا جیون جاری رکھ سکے۔ تو ضرور اس جیون کا کوئی مقصد بھی ہے۔ یقیناً ہے۔ لیکن یہ وہ مقام تھا، جہاں اوتار سنگھ ہار جاتا تھا۔

بہر حال اس نے اپنا جیون پھر سے جینا شروع کر دیا!

❁......❁......❁

چھ ماہ بعد اسکول میں داخلے کا مرحلہ آ گیا!

ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے لیے وہ مرحلہ بہت کڑا تھا۔ ابھی تو وہ بیوی کی دائمی جدائی کے صدمے سے بھی پوری طرح نہیں سنبھلا تھا۔ اس چہیتے بیٹے کے سوا اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ نہ ہوتا تو شاید جیون میں اس کی دلچسپی ہی نہ رہتی۔ اسے خود سے دور کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح ڈانواں ڈول ہو گیا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ اوتار سنگھ کو اسکول میں داخل کرنے کا خیال ہی دل سے نکال دے۔ لیکن وہ خود تعلیم یافتہ تھا۔ بیٹے کو تعلیم سے محروم رکھ کر وہ اس پر ظلم کیسے کر سکتا تھا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک اور حل آیا۔ کیوں نہ وہ بھی بیٹے کے ساتھ دہلی چلا جائے۔ اب اس کا یہاں دل نہیں لگے گا۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اتنی بڑی جاگیر کے معاملات دیکھنا کوئی معمولی کام نہیں۔ یہ نہیں کہ اسے جاگیر سے کوئی دلچسپی رہ گئی ہو۔ مگر یہ سب کچھ اس کے چھوٹے ٹھاکر کا تھا۔ جب تک وہ تعلیم مکمل کر کے واپس آئے اور یہ سب کچھ سنبھالنے کے قابل ہو، تب تک اسے ہی یہ ذمے داری نبھانا تھی۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا اور وہ جمال دین کے گھر چلا گیا۔ رنجیتا کی موت کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے گھر گیا تھا۔ وقت ایسا تھا کہ اوتار سنگھ اور وصال دین ماسٹر جی سے پڑھ رہے تھے۔

حمیدہ نے جلدی جلدی چارپائی پر گدا بچھایا، چادر پھیلائی اور تکیہ لگایا۔ ”بیٹھیے ویر جی۔“

لیکن ٹھاکر اصرار کے باوجود چارپائی پر نیم دراز بھی نہیں ہوا۔ پاؤں لٹکا کر ہی بیٹھ گیا۔

جمال دین اور حمیدہ چارپائی کے پاس موڑھے رکھ کر ان پر بیٹھ گئے۔ ”آپ نے کیوں تکلیف کی ٹھاکر جی۔“ جمال دین نے عاجزی سے کہا۔ ”مجھے بلوا لیا ہوتا۔“

”کام مجھے ہے تو میں ہی آؤں گا۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”کیسی عجیب بات ہے کہ مجھے تم سے کام پڑتا ہی رہتا ہے۔“

”کیا حکم ہے ٹھاکر جی۔ میں آپ کے کسی کام آ سکوں، اس سے بڑی خوشی میرے لیے کیا ہو گی۔“ جمال دین بولا۔

”حکم نہیں، درخواست ہے۔“ ٹھاکر کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ”رنجیتا کے دیہانت کے بعد میرے پاس اوتار سنگھ کے سوا کچھ نہیں رہا ہے اور اب اوتار سنگھ کے اسکول میں داخلے کا وقت آ گیا ہے۔“

جمال دین اور حمیدہ پریشان ہو گئے۔ تو یہ بات ہے۔ ان کی بھی وصال دین سے جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ وہ پہلے بھی اس سلسلے میں آپس میں بات کرتے رہے تھے۔ لیکن ان میں اتنی

ہمت نہ تھی کہ وصال دین کو دہلی بھیجنے سے انکار کرتے۔ حمیدہ تو اب بھی کچھ نہ بولی۔ لیکن جمال دین نے بے حد خوش دلی سے کہا۔ ”میں نے تو پہلے بھی آپ سے کہا تھا ٹھاکر جی کہ یہ بھی آپ کا ہم پر احسان ہے۔ ورنہ ہم وصال دین کو کہاں پڑھوا سکتے تھے۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ دہلی ضرور جائے گا سرکار۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔“

”وہ تو جائے گا جمال دین۔ مگر میں تمھارے پاس ایک اور کام سے آیا ہوں۔“

اب تو جمال دین اور حمیدہ کی تشویش کی کوئی حد نہیں تھی۔ ”کیا حکم ہے سرکار۔ فرمائیں تو۔“ جمال دین نے مرے مرے لہجے میں پوچھا۔

”اب میں اوتار سنگھ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں بھی اس کے ساتھ دہلی جانا چاہتا ہوں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے ٹھاکر جی۔ جاگیر کا کیا ہو گا۔“ جمال دین نے اچنبھے سے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔ اسی لیے تو میں تمھارے پاس آیا ہوں۔“

جمال دین کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ٹھاکر کو تکتا رہا۔

”اب یہ سب کچھ تم سنبھالو گے جمال دین۔“

یہ جمال دین کے لیے دھماکہ تھا۔ وہ اضطراری طور پر موڑھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”مم...... میں...... میں سنبھالوں گا!“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ آدھی زمین جائیداد تمہاری ہے اور میں برسوں سے تمھارے حصے کا کام بھی کرتا رہا ہوں۔ اب سمے آ گیا ہے کہ تم اپنا بوجھ اٹھاؤ۔ بلکہ میرے حصے کی ذمے داری بھی نبھاؤ۔“

جمال دین کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں۔ ”ٹھاکر جی، آپ کے حکم پر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کام کی تو مجھ میں اہلیت ہی نہیں ہے۔ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ ٹھاکر جی۔ یہ کام تو میرے بس کا نہیں۔“ وہ بری طرح گڑگڑا رہا تھا۔

”آدمی کوشش کرے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”ٹھاکر جی، اللہ نے ہر آدمی کو ہر کام کے لیے پیدا نہیں کیا۔“ جمال دین رونے لگا۔ ”میں کسان ہوں۔ زمین میں بس ہل چلا سکتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، سب کچھ ہم نے صرف آپ کی خاطر لیا۔ آپ کا حکم نہیں ٹال سکتے تھے۔ آپ ہر سال ہمیں حصہ لا کر دیتے رہے۔ ہم سنبھال کر رکھتے رہے۔ ہم آپ کے کہنے پر بھی زمین دار نہیں بن سکے۔ صرف اس لیے کہ یہ ہمارے بس کا کام نہیں۔ پر حکم آپ کا تھا، اس لیے ٹال نہیں سکے۔ صرف آپ کی خوشی کی خاطر میں نے یہ سب قبول کیا۔ انکار کرتا تو گستاخی ہوتی۔ مگر کیا معلوم تھا کہ ایک دن آئے گا، جب مجھے آپ کو انکار کرنا پڑے گا۔ آج تو لگتا ہے، زندگی اکارت ہو گئی۔ کاش...... کاش ٹھاکر جی...... کاش میں آپ کے کام آ سکتا۔ پر مجھے تو کسی پر حکم چلانا آتا ہی نہیں۔ اور آپ کا کام تو بادشاہ کا کام ہے ٹھاکر جی۔“

جمال دین اب ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ ٹھاکر تڑپ کر اٹھا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ ''چلو جمال دین، تم چنتا نہ کرو۔'' اس نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''جب تک میں موجود ہوں، سنبھال لوں گا۔ لیکن میرے بعد کیا ہوگا۔''

''ایسی باتیں نہ کریں ویر جی۔'' حمیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اللہ آپ کو بہت عمر دے گا۔''

''پھر بھی، جانا تو ہر منش کو ہے۔ کون جانے، کب کس کا بلاوا آ جائے۔''

''تب چھوٹے ٹھاکر ہوں گے نا۔''

''ٹھیک ہے بہنا۔ جو بھاگیہ میں ہے، سو تو ہوگا۔'' ٹھاکر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

❁......❁......❁

اب ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو ایک ہی پریشانی تھی۔ اس کا بیٹا داخلے کا ٹیسٹ پاس کرے گا یا نہیں۔ اس کا داخلہ ہو بھی سکے گا۔ اس نے اس سلسلے میں کانتی پرشاد جی سے بات کی۔ ''ماسٹر جی۔ اوتار سنگھ ٹیسٹ پاس کر لے گا؟'' اس کے لہجے میں شک تھا۔

''کیسی بات کرتے ہیں ٹھاکر جی۔'' ماسٹر جی گویا برا مان کر بولے۔ ''چھوٹے ٹھاکر کو ابھی میٹرک کا امتحان دلوائیں تو وہ ٹاپ کریں گے۔ آپ اس ٹیسٹ کی بات کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے بیٹے کی لیاقت دیکھی ہی نہیں۔''

ٹھاکر کو فخر کا احساس ہوا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ ماسٹر جی مبالغے سے کام لے رہے ہوں۔ ''آپ کو پکا یقین ہے ماسٹر جی؟''

''اگر اس کے خلاف ہوا تو میں پڑھانا چھوڑ دوں گا۔''

اب ٹھاکر مطمئن ہو گیا۔ اسے بیٹے سے اپنی بے خبری پر افسوس ہونے لگا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ اس کا بیٹا سوال بہت کرتا ہے۔

''لیکن ایک مسئلہ ہے ٹھاکر جی۔'' کانتی پرشاد نے اچانک کہا۔

ٹھاکر کا دل بری طرح دھڑکا۔ اب وہ مطمئن ہوا ہے تو ماسٹر جی نے جانے کون سا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ ''مجھے صرف اس بات کی فکر ہے کہ میرے بیٹے کو اسکول میں داخلہ مل جائے گا۔''

''اس طرف سے تو بے فکر رہیں۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ وصال دین وہ ٹیسٹ پاس کر سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ٹھاکر جی، چھوٹے ٹھاکر کے برعکس وصال دین کو پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو بس چھوٹے ٹھاکر کا سایہ ہے۔ ان کی محبت میں ان کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے اور مارے باندھے پڑھ بھی لیتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اس ٹیسٹ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔''

''یہ تو الجھن کی بات ہے۔'' ٹھاکر نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔ ''اوتار سنگھ بھی اس کے

بغیر نہیں رہ سکتا۔ اچھا ماسٹر جی، کچھ اُپائے ہے اس کا؟''

کانتی پرشاد کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ''میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔''

''بہت بڑا فرق ہے دونوں کی قابلیت میں؟'' ٹھاکر نے پوچھا۔

''میں نے عرض کیا نا کہ چھوٹے ٹھاکر ابھی میٹرک کا امتحان دیں تو ٹاپ کر لیں جبکہ وصال دین کی قابلیت بمشکل پانچویں تک کی ہے۔''

ٹھاکر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''تب تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے ماسٹر جی۔''

''جی...... میں سمجھا نہیں۔''

''آپ مجھے ایک بات بتائیں۔ وصال دین کو چھٹی جماعت کے ٹیسٹ میں بٹھایا جائے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے؟''

کانتی پرشاد نے پھر کچھ دیر سوچا۔ ''جی...... میرے خیال میں یہ ممکن ہے۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔ ہم اوتار سنگھ کو آٹھویں میں اور وصال دین کو چھٹی میں داخلہ دلائیں گے۔'' ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ ''ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ آپ اتنے دن میں وصال دین کو کم از کم اس حد تک پکا کر دیں۔''

''میں کوشش کروں گا ٹھاکر جی۔'' کانتی پرشاد نے کہا۔ مگر ان کے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔

اسی شام کانتی پرشاد نے کہا۔ ''وصال دین، ایک ہفتہ ہے۔ اس میں تیاری کر لو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم پڑھنے میں پوری دلچسپی نہیں لیتے ہو۔ تمھیں پتا ہے، اگر تمھیں داخلہ نہیں ملا تو تمہارا ایک بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

وصال دین نے کچھ کہا نہیں۔ بس مستفسرانہ نظروں سے انھیں دیکھتا رہا۔

''تم گاؤں واپس آ جاؤ گے اور پھر برسوں چھوٹے ٹھاکر سے نہیں مل سکو گے۔''

یہ سن کر صرف وصال دین ہی نہیں دہلا، اوتار سنگھ کا چہرہ بھی فق ہو گیا۔ اس نے وصال دین سے کہا۔ ''ویر جی، کچھ کرو۔ میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

وصال دین خود بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ خوف بہت بڑا محرک ہوتا ہے۔ اس دن سے وصال دین کی پڑھائی کو پر لگ گئے۔

❁......❁......❁

اس رات کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ حویلی میں ٹھاکر اور اوتار سنگھ کروٹیں بدل رہے تھے تو گاؤں کے اس سرے پر جمال دین، حمیدہ اور وصال دین بھی نیند سے محروم تھے۔ سونے کا ڈھونگ نبھانا ناممکن ہو گیا تو جمال دین اٹھ بیٹھا۔ ''حمیدہ...... تم جاگ رہی ہو نا؟'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں جی۔ اب تو بس اللہ کی مہربانی ہوگی، تبھی نیند آئے گی۔" حمیدہ بھی اٹھ بیٹھی۔

"ہاں۔ آج تو میں سو ہی نہیں سکتا۔"

"مجھے تو لگتا ہے، اب مجھے کبھی گہری نیند نہیں آئے گی۔" حمیدہ نے آہ بھر کے کہا۔ پھر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "کیا ضروری تھا کہ ہمارا بیٹا بھی پڑھنے کے لیے اتنی دور جاتا؟"

"یہ تو نصیب کی بات ہے۔ جانا ہے تو جانا ہے۔ اللہ صبر دیتا ہے۔" جمال دین نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "میری نیند تو کسی اور ہی خیال سے اُڑی ہے۔"

حمیدہ چونکی۔ "کیا بات ہے؟"

"ہمارا گھر اس گاؤں میں اکیلا مسلمان گھر ہے۔" جمال دین کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ "مجھے ہمیشہ ڈر لگتا تھا کہ میرا بیٹا اچھا مسلمان نہیں بنا تو میں قیامت کے دن اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اسی لیے میں نے خود اسے قرآن پڑھایا۔ کم عمری میں نماز سکھائی۔ ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ نماز میں کوتاہی نہیں کرتا۔ مگر اب وہ دور جا رہا ہے تو ڈر لگتا ہے۔ قیامت کے دن شرمندگی کا سامان نہ ہو جائے۔"

"کیوں پریشان ہوتے ہو جی۔ اب وہ بچہ تو نہیں ہے۔" حمیدہ نے اسے دلاسہ دیا۔ "ہم ابھی اسے تاکید کریں گے تو وہ انشاءاللہ نہ کبھی نماز چھوڑے گا، نہ قرآن پڑھنا۔"

"یہ بات اتنی سادہ نہیں ہے حمیدہ۔ چھوٹا ٹھاکر وصال دین کے بہت قریب ہے۔ وہ اسے نماز، قرآن پڑھتے دیکھے گا تو پوچھے گا۔ وہ سوالات بہت کرتا ہے نا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ وہ متاثر ہو۔ یوں مجھے ٹھاکر جی کے سامنے شرمندگی ہوگی۔ جان بھی جا سکتی ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وصال دین صحن میں سو رہا تھا۔ وہ دونوں وہاں چلے آئے۔ حمیدہ نے نرمی سے اسے ہلایا۔ "اٹھ بیٹے۔ کچھ بات کرنی ہے تجھ سے۔"

وصال دین بھی سو نہیں رہا تھا۔ لیکن اس کی بے قراری ماں باپ جتنی نہیں تھی۔ اس کے لیے معاملہ انیس بیس کا تھا۔ ایک طرف ماں باپ تھے تو دوسری طرف اوتار سنگھ تھا، جس سے وہ سوائے سونے کے وقت کے کبھی دور نہیں ہوتا تھا۔ جو اس کا واحد ہم جولی، واحد دوست تھا۔ اور وہ ذہنی طور پر تیار بھی تھا کیونکہ اس پہلو پر غور کرتا رہا تھا۔ اگر اوتار سنگھ سے دور رہنا مشکل نہ ہوتا تو اس مسئلے کا حل اس کے لیے بہت آسان تھا۔ وہ پڑھائی میں دلچسپی ہی نہ لیتا۔ یوں اسے اسکول میں داخلہ بھی نہ ملتا اور وہ ماں باپ سے دور بھی نہ ہوتا۔ لیکن اس نے اس ایک ہفتے میں پڑھائی میں بہت زیادہ محنت کی تھی۔ صرف اوتار سنگھ کی محبت میں۔ اور یہی نہیں، اسے ابا کی سمجھائی ہوئی بات اچھی طرح یاد تھی۔ احسان کا رشتہ...... اسے تو چھوٹے ٹھاکر سے غلام جیسی محبت کرنی ہے۔ کبھی انکار نہیں کرنا کسی بات سے۔ تو وہ اسے اکیلا کیسے چھوڑ دے۔

مگر اس کے باوجود ماں باپ سے دور ہونا آسان نہیں تھا۔ اس کا دل بہت بوجھل تھا۔ وہ اداس تھا۔ اس جدائی کا خیال اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔ ماں نے ہلایا تو وہ اٹھ بیٹھا۔ "کیا بات ہے اماں۔"

"کچھ ضروری باتیں سمجھانی ہیں تجھے۔"

"بولو اماں۔"

"دیکھ۔ اب تو جائے گا۔ ہم سے، گاؤں سے دور، چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ رہے گا۔ اب تیرے ابا پریشان ہو رہے ہیں کہ کہیں تو قرآن سے، نماز سے دور نہ ہو جائے۔" حمیدہ نے کہا۔

وصال دین نے جمال دین کو دیکھا۔ "نہیں ابا۔ انشاءاللہ ایسا نہیں ہوگا۔" اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میں اس کا یہاں سے زیادہ خیال وہاں رکھوں گا۔"

تب جمال دین نے زبان کھولی۔ "تو نماز کہاں پڑھے گا۔ قرآن کہاں پڑھے گا؟"

وصال دین نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔ "کیا مطلب ابا۔ جہاں رہوں گا، وہیں پڑھوں گا۔"

"چھوٹے ٹھاکر کے سامنے؟"

"تو اور کیا۔ اس میں کوئی حرج ہے ابا؟"

"ہاں، حرج ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو چھوٹے ٹھاکر کے سامنے یہ سب کچھ کرے۔" جمال دین نے سخت لہجے میں کہا۔ "چھوٹا ٹھاکر سوال بہت کرتا ہے۔ تجھے نماز پڑھتے، تلاوت کرتے دیکھے گا تو تجھ سے بھی سوال کرے گا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تو اس سے اپنے دین کی کوئی بات کرے۔ اس لیے کہ یہ بات ٹھاکر جی کو اچھی نہیں لگے گی۔ ہمیں خیال رکھنا ہے کہ انھیں ہم سے کوئی شکایت نہ ہو۔ ان کے احسان ہیں ہم پر۔"

"تو کوئی بات نہیں ابا۔ میں اکیلے میں پڑھ لیا کروں گا۔" وصال دین نے سادگی سے کہا۔ "ٹھاکر جی نے ہمارے رہنے کے لیے بڑے مکان کا بندوبست کیا ہے۔ مجھے وہاں الگ کمرا ملے گا۔ چھوٹے ٹھاکر کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اور میں نماز بھی پڑھ لیا کروں گا اور قرآن بھی۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔" جمال دین نے پہلی بار سکون کی سانس لی۔ "لیکن وعدہ کر کہ تو نماز کبھی قضا نہیں کرے گا اور ہر روز قرآن بھی پڑھے گا۔"

"تم پریشان نہ ہو ابا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

جمال دین نے محبت سے اسے لپٹا لیا۔ "بس بیٹا، مجھے اللہ کے سامنے شرمندہ نہ کرانا۔" اس نے بیٹے کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

●.....●.....●

وہ دہلی گئے تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ اور جمال دین بھی ان کے ساتھ تھے۔ کانتی پرشاد کی توقع کے عین مطابق اوتار سنگھ نے داخلے کا ٹیسٹ بڑی شان سے پاس کیا۔ مگر اصل کارنامہ یہ تھا کہ وصال دین کو بھی چھٹی جماعت میں داخلہ مل گیا۔

ٹھاکر نے ان لوگوں کے لیے جامع مسجد کے علاقے میں مکان کا بندوبست کیا تھا۔ وہ اوپری منزل کا چھ کمروں کا مکان تھا۔ اوپر ایک کوٹھا تھا، جس کے ساتھ بڑی ساری چھت تھی۔ وہاں پھولوں کے پودے رکھے تھے۔ چنبیلی کی بیل دیوار پر چڑھی تھی۔ مکان صاف ستھرا اور بہت اچھا تھا۔

جمال دین کو اطمینان ہو گیا کہ اس کے بیٹے کو تنہائی میسر ہے۔ وہ ٹھاکر کے ساتھ گاؤں واپس گیا تو بہت مطمئن تھا۔

اس مکان میں کانتی پرشاد، اوتار سنگھ اور وصال دین کے علاوہ دو افراد اور تھے، جنھیں ٹھاکر پرتاپ سنگھ گاؤں سے لایا تھا۔ کھانا پکانے کے لیے رنجنا تھی اور باہر کے کام کرنے اور سودا سلف لانے کے لیے رگھو تھا۔

چند ہی دنوں میں زندگی کے نئے معمولات بن گئے۔

اوتار سنگھ اور وصال دین کے لیے تو دہلی ایک جہانِ حیرت تھا۔ وصال دین نے تو شہر ہی پہلی بار دیکھا تھا۔ جبکہ اوتار سنگھ تو ایک مہینے گھوما پھرا تھا۔ چند روز ممبئی میں بھی رہا تھا۔ لیکن بہرحال وہ گاؤں میں زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ اب دہلی شہر میں رہا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

دہلی بڑا بارونق شہر تھا...... خاص طور پر شام کے وقت۔ یہاں اوتار سنگھ کو گھومنے پھرنے کا شوق ہو گیا۔ اس نے ماسٹر جی سے بات کر کے ایسا معمول بنایا کہ شام کے وقت وہ آزاد ہوتا۔ اسکول سے واپسی پر وہ کھانا کھاتے، ایک گھنٹا آرام کرتے اور پھر ماسٹر جی سے پڑھنے بیٹھ جاتے۔ شام کو وہ سیر کے لیے نکلتے۔ واپس آ کر رات کا کھانا کھاتے اور سو جاتے۔ صبح وہ بہت سویرے اٹھتے اور ماسٹر جی سے پڑھتے۔ اس کے بعد اسکول جاتے۔

ایک سال میں وہ دہلی کے چپے چپے سے واقف ہو گئے۔ اوتار سنگھ نے آٹھویں پاس کر لی اور وصال دین نے چھٹی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ گاؤں واپس گئے۔ اوتار سنگھ اب 14 سال کا ہو چکا تھا۔

شہر میں ایک سال گزارنے کے بعد گاؤں انھیں پہلے سے بھی اچھا لگا۔ وہاں شور و غل نہیں، سکون تھا۔ وہاں آ کر اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ دہلی نے اسے کتنا تبدیل کر دیا ہے۔ اس ایک سال میں اس کا تجسس صرف مادی اور ظاہری چیزوں تک محدود ہو گیا تھا۔ اس نے سوچنا اور غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے ذہن میں بہت سے سوال تھے، جن کے جواب اسے کھوجنے تھے۔ لیکن دہلی میں یہ عمل رک گیا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ تنہائی...... اور تنہائی میں بیٹھ کر سوچنا

اسے کتنا اچھا لگتا تھا۔ دہلی میں اس تنہائی کو اس نے خود چھوڑ دیا تھا۔

گاؤں میں اس نے پھر سے سوچنا شروع کر دیا۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ دہلی میں اس نے گھومنے پھرنے، سیر کرنے میں جو وقت صرف کیا، وہ ضائع نہیں ہوا۔ اس سے تو اس کے مشاہدات میں زبردست اضافہ ہوا تھا اور وہ ہمیشہ مشاہدات ہی کی بنیاد پر سوچتا آیا تھا۔ البتہ ایک کمی ضرور تھی۔ ماسٹر جی سے اس کا تعلق صرف پڑھائی تک محدود ہو گیا تھا۔ ورنہ پہلے وہ ان سے ہر طرح کی باتیں کرتا تھا۔

گاؤں میں اس کی چھٹیاں صرف اپنے نظریات کو تازہ کرنے میں گزر گئیں۔ بہرحال ایک سال کا ٹوٹا ہوا رابطہ پھر سے جڑ گیا۔

❀......❀......❀

دہلی میں ان کا دوسرا سال بالکل مختلف تھا!

شام کے وقت وہ گھومنے کے لیے ضرور نکلتے۔ کبھی چاندنی چوک کی طرف اور کبھی جمنا کے کنارے۔ مگر اوتار سنگھ اکھڑا اکھڑا رہتا تھا۔ اور ذرا ہی دیر کے بعد گھر واپس پہنچنے کی بات کرتا تھا۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔

وصال دین نے باپ کی بات کا پوری طرح خیال رکھا تھا۔ وہ تنہائی میں ہی نماز پڑھتا اور تنہائی میں ہی قرآن۔ اس کے نتیجے میں نماز میں بے قاعدگی بھی ہوتی تھی۔

اسکول کا چوکی دار مسلمان تھا۔ ایک دن اس نے اسے ٹوک دیا۔ ”تم تو مسلمان ہو۔ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟“

وصال دین کے لیے تو وہ گالی تھی۔ اسے بہت برا لگا۔ تاہم اس نے تحمل سے کہا۔ ”نماز تو میں پڑھتا ہوں۔“

احمد علی نے کہا۔ ”میں نے تو تمھیں کبھی دیکھا نہیں نماز پڑھتے۔“

”تو نماز کیا دکھا کر پڑھتے ہیں؟“ وصال دین نے چڑ کر کہا۔

”دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر سب کو پتا چل جاتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”بھئی تمہارا گھر بھی جامع مسجد کے قریب ہے۔ مسجد میں نماز پڑھو گے تو دوسروں سے ملو گے۔ انھیں پتا بھی چل جائے گا۔“ احمد علی بولا۔ ”لیکن میں نے تو تمھیں کبھی مسجد میں نہیں دیکھا۔“

اب وصال دین حیران تھا۔ ”میں مسجد کبھی گیا ہی نہیں۔“

”تو نماز کہاں پڑھتے ہو؟“ احمد علی نے حیرت سے پوچھا۔

”گھر میں پڑھتا ہوں۔“

"یہ تو بہت بری بات ہے۔ اتنے قریب مسجد ہے اور تم وہاں نہیں جاتے۔ پتا ہے، جماعت سے نماز پڑھنے کا اجر 27 گنا زیادہ ہے۔"

وصال دین کو یہ سب معلوم ہی نہیں تھا۔ باپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ اس نے احمد علی کو یہ سب بتایا۔ احمد علی نے تاسف سے سر ہلایا۔ "وہ تو مجبوری تھی۔ تمہارا باپ بڑا آدمی ہے کہ اس نے اس حال میں بھی تم کو یہ سب کچھ سکھایا۔ مگر یہاں اور بات ہے۔ مسلمان بہت ہیں۔ مسجدیں بھی ہیں۔ اذان ہوتی ہے جو کہ بلاوا ہے۔ چلو، میں تمھیں سکھاؤں گا۔ آج ظہر کے وقت مجھے مسجد کے باہر ملنا۔"

اس روز وصال دین ظہر پڑھنے احمد علی کے ساتھ گیا۔ اس کا دل خوش ہو گیا۔ یہ تو بہت آسان تھا۔ مسجد گئے اور نماز پڑھ لی۔ مسجد میں قرآن بھی تھا۔ وہیں بیٹھ کر پڑھ لیا۔ گھر میں تو اوتار سنگھ کی وجہ سے نماز کبھی قضا بھی ہو جاتی تھی۔

اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ بس اسے یہ فکر رہتی تھی کہ وہ چپکے سے نماز پڑھنے کے لیے نکلتا تھا۔ اگر اس دوران اوتار سنگھ اس کی غیر حاضری کو محسوس کر لے اور اس سے پوچھے کہ وہ کہاں تھا، تو اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ لیکن اس کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ اوتار سنگھ تو خود میں گم رہنے لگا تھا۔

اوتار سنگھ نے سلسلہ وہیں سے جوڑا، جہاں چھوڑا تھا۔ یہ تو وہ سمجھ چکا تھا کہ کثرت میں انتشار ہے اور وحدت میں ارتکاز۔ اس نے بہت سارے دیوتاؤں کے وجود سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ یقین تھا کہ کائنات کا نظام ترتیب دے کر، اسے قائم کرنے والا کوئی ایک ہے...... صرف ایک۔ اس کی کچھ صفات بھی وہ جان چکا تھا۔ ورنہ یہ سب کچھ اتنا منظم نہ ہوتا۔

وہ ایک شہر کی، ایک ملک کی مثال پر غور کرتا۔ تاریخ کے اوراق گواہی دیتے تھے کہ بادشاہ قانون بناتا تھا۔ اس پر عمل درآمد کے لیے کارندے ہوتے تھے۔ قانون پر کبھی پوری طرح عمل درآمد نہیں ہوتا تھا۔ کارندے کبھی رشوت کی خاطر، کبھی کسی بڑے آدمی کی سفارش پر اور کبھی اپنے کسی عزیز رشتے دار کی خاطر لوگوں کو قانون سے مستثنیٰ کرتے رہتے تھے۔ اب ظاہر ہے، بادشاہ کیسا ہی عادل و منصف ہو، اُن کے پل پل کی اور اپنی مملکت کے چپے چپے کی خبر تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور یہ خرابی طاقت کے ارتکاز اور وحدتِ اقتدار کے باوجود تھی۔

یہاں سے سوچ کے اور دروازے کھلے۔ کائنات بہت بڑی تھی۔ آدمی کو تو اس کے بہت چھوٹے سے حصے کا علم تھا۔ تو جو کائنات کا نظام چلا رہا تھا، اس کے تو کارندے اتنے ہوں گے کہ ان کا شمار ہی نہیں ہوگا۔ تو پھر کہیں کوئی بدنظمی کیوں نہیں ہوتی؟ کیوں؟

اس جواب کا سراغ اسے اپنے دکھ سے ملا۔ اسے یاد تھا۔ جب ماں کی موت کا غم وہ بھولا تھا، تب اس نے سمجھا تھا کہ اوپر والا اپنی مخلوق کی، ہر منش کی الگ الگ خبر رکھتا ہے۔ وہ ان سے واقف ہے۔ ان کی ہر کمزوری، ہر خوبی سے آگاہ ہے۔

تو اس کا مطلب تھا کہ وہ پوری کائنات پر، ہر چیز پر نظر رکھتا ہے۔ اپنے کارندوں پر بھی، جن کے سپرد کائنات کا نظام ہے اور اس کے کارندے یہ بات جانتے بھی ہیں۔ تبھی تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔

تو یہ طے ہو گیا کہ وہ ایسا دیکھنے والا ہے کہ ہر پل ہر جگہ کا علم رکھتا ہے۔ بیک وقت سب پر نظر رکھتا ہے۔ اس کے دیکھنے، اس کے سننے اور اس کے جاننے کی کوئی حد نہیں۔ اس سے کچھ چھپا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اوتار سنگھ کو عجیب خیال آیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اوپر والے کی کوئی ذاتی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ نہ کھانے پینے کی، نہ آرام کی، نہ سونے کی، اور اسے تھکن بھی نہیں ہوتی ہوگی۔ اور اس کا دیکھنا آنکھ کا، منش کا دیکھنا نہیں۔ منش کی نظر تو محدود ہے۔ ایک حد سے آگے نہیں جاتی۔ ایسے ہی اس کا سننا کان کا سننا نہیں۔ فاصلہ زیادہ ہو تو منش تک آواز نہیں پہنچتی۔ اس کا دیکھنا، اس کا سننا اور اس کا جاننا لامحدود ہے۔ آدمی صرف ایک طرف دیکھتا ہے جبکہ وہ ہر طرف دیکھتا ہے۔ وہ زمین کے اندر تک دیکھتا ہے۔ تبھی تو پوری کائنات سے باخبر رہتا ہے۔

چند روز بعد اوتار سنگھ نے ایک اور زاویے سے سوچنا شروع کیا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ سائنس اس اوپر والے کی سوچ ہو۔ وہی اصل سائنس دان ہو۔ اس صورت میں اسے بہت کارندوں کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ زمین پر چلنے والے سب جان دار، چاند ستارے، سورج...... یہ پورا نظام...... یہ سب اس کی ایجاد ہے۔ یہ سب کچھ جیسے چابی سے چل رہا ہے۔ سورج، چاند، ستارے سب اپنے وقت پر نکلتے ہیں۔ اپنے طے شدہ راستے پر چلتے ہیں۔ اپنے وقت پر غروب ہوتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں پڑتا۔ تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ منش نے کتنی چیزیں ایسی بنائی ہیں۔ چابی سے چلنے والے کھلونے، جب تک چابی ختم نہ ہو وہ چلتے رہتے ہیں۔ اور گھڑی...... جس وقت کا الارم لگا ہو، اس وقت گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اگر منش یہ سب کچھ بنا سکتا ہے تو وہ کیا کچھ بنائے گا، جس نے خود منش کو بنایا ہے۔

مہینوں وہ اس پر سوچتا رہا۔ اردگرد...... مظاہر فطرت کو دیکھتا تو وہ اس تھیوری کا اور قائل ہو جاتا۔ اسے اس بات پر یقین ہو گیا کہ انسان کی سائنس کا آغاز ہی مظاہر فطرت کے بارے میں سوچنے سے ہوا ہے۔ اور اشارے اسے اپنے وجود کے اندر سے ملے ہوں گے۔

اس آخری خیال کی اس کے پاس کوئی وضاحت نہیں تھی۔ مگر یہ خیال خود ایک وضاحت تھا۔ یہ خیال اسے کیوں آیا۔ سب کو تو یہ خیال نہیں آیا۔ ورنہ دنیا میں ماسٹر جی جیسے سائنس کے لوگ نہیں ہوتے۔ یہ خیال بھی اس کے وجود کے اندر سے ملنے والا اشارہ ہے۔ اسے سوچنے کی دعوت دے رہا ہے۔

وہ مظاہرِ فطرت پر سوچتا رہا۔ زندگی کی سب سے پہلی ضرورت...... بلکہ شرط ہوا تھی۔ اور وہ سب کے لیے [illegible] تھی۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں تھی۔ اس پر کوئی قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔

کوئی کسی کی ہوا نہیں روک سکتا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ زندگی اوپر والے کا حکم تھا۔ اس نے اسے منقطع کرنے کا اختیار کسی کو نہیں دیا تھا۔

سائنس بتاتی ہے کہ انسان سانس کے ذریعے ہوا میں سے آکسیجن اندر لیتا ہے اور باہر کاربن ڈائی آکسائیڈ نکالتا ہے۔ ہوا ایک ایسا عنصر جو زمین کی فضا پر محیط ہے۔ ہوا مستقل طور پر گردش میں رہتی ہے۔ اس کے دباؤ میں کمی بیشی سے موسم پر اثر پڑتا ہے۔ اس کی ایک خاص مقدار ہے، جو گردش میں ہے۔

اب ایسے میں اربوں انسانوں کے سانس لینے کے نتیجے میں قدرتی طور پر ہوا کی ترکیب بری طرح بگڑتی۔ اربوں انسان ہر لمحے ہوا میں سے آکسیجن چوس کر کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ اگر یہ معاملہ یونہی چلتا رہے تو آکسیجن ختم ہو جائے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ بہت بڑھ جائے۔ نتیجہ؟ انسانوں سمیت تمام جان دار ختم ہو جائیں۔

اس مقام پر پہنچ کر اوتار سنگھ اش اش کر اٹھا۔ اسے کہتے ہیں نظام..... ایک مکمل اور مربوط نظام۔ اس نظام کو قائم کرنے والا سب کچھ جانتا ہے۔ وہ وقت کے، صدیوں کے آر پار دیکھتا ہے۔ اسی لیے ہر مسئلے کا حل اس کے پاس ہوتا ہے۔ اس نے درخت، پودے، پھل پھول، ہر طرح کی نباتات سے دنیا کو آراستہ بھی کیا اور آکسیجن کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ کتنی سادہ اور آسان ترکیب تھی۔ مگر صرف ایک زبردست اور ہر علم پر حاوی ہستی کے لیے! نباتات کا سسٹم اس نے یہ رکھا کہ وہ جان داروں کے برعکس ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتی ہیں اور آکسیجن خارج کرتی ہیں۔ لیجیے..... مسئلہ حل ہو گیا۔ ہوا میں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کے تناسب میں معمولی سی..... بہت معمولی سی کمی بیشی تو ہو سکتی ہے۔ مگر ان کی مقدار میں بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔

اوتار سنگھ نے دیکھا کہ یہ سارا چکر کا معاملہ ہے۔ ایک چیز سے دوسری چیز بنتی ہے اور دوسری چیز سے پھر پہلی چیز۔ رات کے پیچھے دن لگا ہے اور دن کے پیچھے رات۔ اسے اماں کی بات یاد آئی۔ انھوں نے کہا تھا..... رات نہ ہوتی تو ہم آرام کیسے کرتے اور دن نہ ہوتا تو ہم کام کیسے کرتے۔ اماں پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ لیکن عقل مند تھیں۔ کیسی سادہ، مگر سچی بات کہی تھی انھوں نے۔

ہاں..... اب وہ اس بات سے اور باتیں سمجھ سکتا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ دن اور رات نہ ہوتے تو وقت کی پیمائش نہیں ہو سکتی تھی۔ دن رات نہ ہوتے تو کیلنڈر نہ ہوتا۔ یکسانیت ہوتی، پڑاؤ ہوتا، جو کہ زندگی کی نہیں، موت کی علامت ہے۔ زندگی کی رونق، اس کا لطف تو تغیر اور تبدل سے ہے۔

پھر موسم تھے۔ گرمی..... گرمی کے بعد سردی اور پھر گرمی۔ اور وہ بھی ایک دوسرے کے بعد ایک دم نہیں آتے تھے۔ ورنہ آدمی کے لیے ایک کے بعد دوسرے کو قبول کرنا آسان نہ ہوتا۔ گرمی کے بعد موسم میں ہلکی سی، بتدریج تبدیلی تاکہ آدمی کے لیے قبول کرنا آسان ہو جائے۔ وہ خزاں ہوتی تھی اور سردی کے بعد ہلکی سی بتدریج تبدیلی بہار تھی۔ یہ ایک سال میں وقت کے چار

ذائقے تھے۔ پھر اس میں بھی تنوع تھا۔ گرمی کی بارش اور سردی کی بارش۔ اوپر والا کتنا مہربان تھا۔ اس نے انسان کو اکتاہٹ کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے کتنا اہتمام کیا تھا۔ اوتار سنگھ نے باری باری تصور کیا کہ صرف ایک موسم میں جی رہا ہے۔ صرف تصور میں ہی اس پر مر جانے کی حد تک گھبراہٹ اور اکتاہٹ طاری ہو گئی۔

چکر کی..... سائیکل کی ایک اور بہت بڑی مثال پانی تھا۔ پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ سمندر تھا۔ اتنا بڑا ذخیرہ کہ سمندر میں پانی کی مقدار کا اندازہ کرنا بھی ناممکن تھا۔ اس کی گہرائی بھی نامعلوم تھی۔ لیکن اس کا پانی بہت کھاری، بلکہ کڑوا تھا۔ کسی کام بھی نہیں آ سکتا تھا۔ نہ پینے کے، نہ گھریلو کام کاج کے اور نہ آب پاشی کے..... اس نے خود چکھ کر دیکھا تھا۔

کام کا پانی دریا، جھیل، ندی اور چشموں کی شکل میں تھا۔ یہ سب چیزیں آبادی کے، بستیوں کے درمیان بہتی تھیں۔ ان کے پانی سے انسانوں کی مختلف ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ پانی ایک ایسی بنیادی ضرورت تھا، جس کے بغیر زندگی ناممکن تھی۔ مگر پانی کا استعمال بہت زیادہ تھا جبکہ ذرائع بہت محدود تھے۔ یہاں اوپر والے سائنس دان کا بنایا ہوا ایک اور عظیم نظام سامنے آتا تھا۔

سمندر پر دھوپ پڑتی تو عمل تبخیر ہوتا۔ پانی بخارات میں تبدیل ہوتا۔ ہلکے ہونے کی وجہ سے بخارات اوپر اٹھتے اور بادلوں کی شکل اختیار کرتے۔ پھر پانی کو اٹھائے ہوئے یہ بادل ہوا کے دوش پر سفر کرتے اور ان کے پاس میٹھا اور صاف پانی ہوتا کیونکہ نمک اور دیگر کثافتیں عمل تبخیر کے نتیجے میں ساحل پر ہی رہ گئی ہوتی تھیں۔ یوں بارش کے ذریعے یہ صاف ستھرا میٹھا پانی انسانوں تک پہنچتا۔ یہ گویا ایک عظیم فلٹر پلانٹ تھا۔ اور اتنا عظیم منصوبہ کوئی زبردست اور ذی علم ہستی ہی بنا سکتی تھی۔

پھر اوتار سنگھ نے ارتقائے انسان پر غور کرنا شروع کیا۔ یہ تو اس نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ اتفاق کوئی چیز نہیں۔ جو آدمی کی سمجھ میں نہ آئے، جس کی کوئی ظاہری وجہ نظر نہ آئے، وہ اسے اتفاق قرار دیتا ہے..... صرف اپنی کم علمی چھپانے کے لیے۔ انسان کی ترقی ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بہت محدود علم رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ بے علم تھا۔ پھر بتدریج اسے علم حاصل ہوتا گیا۔ مگر اب اتنی ترقی کے باوجود وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ سب کچھ جان چکا ہے اور وہ یہ دعویٰ کبھی نہیں کر سکے گا۔

سوال یہ تھا کہ انسان نے علم کیسے حاصل کیا۔ انسانی ارتقاء کی تاریخ گواہی دیتی تھی کہ انسان کے کسب علم کی بنیاد مشاہدے اور اتفاق پر ہے۔ ہمیشہ انھی کی وجہ سے اسے کوئی خیال سوجھا۔ پھر اس نے اسے تجربات کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی تصدیق کی اور اسے دوسروں کی طرف بڑھایا۔ اب ان میں سے اتفاق کو اوتار سنگھ مانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے نزدیک اتفاق کائنات کا نظام قائم کرنے اور چلانے والے کی منصوبہ بندی تھی، جو نہ دکھائی دیتی تھی اور نہ ہی سمجھ میں آتی تھی۔

اتفاق کو نہ ماننے کی معقول وجہ تھی اس کے پاس۔ بچپن سے اس کے ساتھ ایسا ہوتا تھا...... اور اکثر ہوتا تھا۔ اس کے دل میں بیٹھے بیٹھے خیال آتا کہ راجو آئی ہے۔ راجو سے اسے بڑی اُنسیت تھی۔ اگلے ہی لمحے بند دروازہ کھلتا اور راجو نمودار ہوتی۔ ایسا بہت سے لوگوں کے معاملے میں ہوا۔ بارہا اس نے اعلان کر دیا۔ پھر کسی نے پوچھا...... تمھیں کیسے معلوم ہوا۔ ''پتا نہیں۔ بس مجھے خیال آیا تھا۔'' وہ جواب دیتا۔

پھر اس نے خود لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ اسے کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔ سب اس پر متفق تھے کہ یہ اتفاق ہے، جو اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تقریباً سبھی کے ساتھ ہوتا تھا۔ کسی کے ساتھ کم اور کسی کے ساتھ زیادہ۔

اب اوتار سنگھ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ اتفاق ایک بار ہو جائے، دو بار ہو جائے۔ بار بار ہو تو اسے اتفاق نہیں کہتے۔ اور پھر اس کا اندازہ ایک بار بھی غلط نہیں ہوا تھا۔ اس نے ماسٹر جی سے اس پر بحث کی تھی۔ مگر وہ بس اتفاق ہے، کہہ کر بات ختم کر دیتے تھے۔

پھر ایک دن وہ اماں اور وید جی کے پاس ان کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ ''اماں، چاچا جی آ رہے ہیں۔ وید جی، دروازہ کھولو۔''

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''نہیں بیٹا، ابھی ان کے آنے کا وقت نہیں ہوا ہے۔''

''نہیں اماں، چاچا جی آ رہے ہیں۔''

حمیدہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ''تمھارے کان بج رہے ہیں بیٹا۔''

مگر اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ وصال دین نے دروازہ کھولا۔ جمال دین اندر آ گیا۔

حمیدہ اٹھ کر اس کی طرف لپکی۔ ''کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' صبح ہلکا سا بخار تھا۔ اب تیز ہو گیا۔ میں وید جی سے دوا لیتا ہوا آیا ہوں۔ انھوں نے کہا ہے کہ آرام کروں۔''

جمال دین اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

حمیدہ اوتار سنگھ کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''تمھیں کیسے پتا چل گیا تھا بیٹے؟'' اس نے اس سے پوچھا۔

''پتا نہیں اماں۔ بس مجھے معلوم ہو جاتا ہے خود بخود۔''

''قدموں کی چاپ سنائی دی تھی؟''

''نہیں اماں۔ بس میرے دل میں خیال آیا تھا اچانک۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''پہلے بھی ایسا ہوا ہے کبھی؟'' حمیدہ تفتیش کرتی رہی۔

''ہوتا رہتا ہے اماں۔'' اوتار سنگھ نے بے پروائی سے کہا۔ ''کوئی نہیں بتاتا کہ ایسا کیوں

ہوتا ہے۔ سب کہتے ہیں، یہ اتفاق ہے۔''

حمیدہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے کیا کیا کچھ یاد آ گیا۔ ننھا سا اوتار سنگھ، جو بھوکا تھا۔ مگر ماں کی چھاتیوں سے ابلتا ہوا دودھ قبول نہیں کر رہا تھا۔ اور اس نے حمیدہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ جیسے قسم کھائی ہوئی ہو کہ دودھ پیے گا تو بس اس کا پیے گا۔ اور اس نے اپنی ضد پوری کر کے چھوڑی۔ ہاں، اس کے بعد ماں کا دودھ بھی قبول کر لیا۔

تو وہ شروع ہی سے غیر معمولی بچہ تھا۔ ورنہ کون سوچ سکتا ہے کہ راجپوت کا بچہ مسلمان عورت کا دودھ پیے۔ اور اتنا سا نا سمجھ بچہ...... اور ضد ایسی سمجھ داری کی۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔

''تم ہی بتاؤ اماں، میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں بیٹے۔'' حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''جو لوگ صاف ستھرے ہوں، صاف ستھرے رہیں، اللہ ان سے خوش ہوتا ہے اور ان کے بہت قریب ہوتا ہے اور جس سے وہ خوش ہوتا ہے اسے اپنے علم میں سے جتنا چاہے دے دیتا ہے۔ تم خوش نصیب ہو بیٹے۔ اللہ نے تمھیں اپنے علم میں سے کچھ دے دیا ہے۔''

اس بیان سے اوتار سنگھ کے ذہن میں کئی سوال اٹھے۔ وہ ذہنی طور پر بہت مرتب بچہ تھا۔ اس نے ان سوالوں کو ترتیب میں رکھ کر بات شروع کی۔ ''ہاں اماں، صاف ستھرا تو میں رہتا ہوں۔ یہ اتنی بڑی بات ہے کیا؟''

''تم صاف ستھرا رہنا کسے سمجھتے ہو؟'' حمیدہ نے اس سے الٹا سوال کیا۔

''میں تین دن بعد نہاتا ہوں۔ کپڑے میلے ہونے سے پہلے بدل کر صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہوں۔''

''یہ تو ایک حصہ ہے صاف ستھرے پن کا۔'' حمیدہ بولی۔ ''اپنے جسم کو پاک صاف رکھنا، روز نہانا اور صاف کپڑے پہننا۔ لیکن آدمی کو اندر سے بھی صاف ستھرا رہنا چاہیے۔''

''اندر سے؟'' اوتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

''ہاں بیٹے۔ خیال اندر ہی تو پیدا ہوتا ہے......''

یہ بات اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ سچ تھا۔ خیال تو دل میں آتا تھا......

''دل میں...... اور اس کے لیے خون کا صاف ستھرا ہونا بھی ضروری ہے۔'' حمیدہ نے اپنی بات پوری کی۔

''تو دل کو اور خون کو کیسے صاف کیا جا سکتا ہے۔ دھویا تو نہیں جا سکتا انھیں۔'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''خون غذا سے بنتا ہے۔ خون کی صفائی اس میں ہے کہ آدمی حلال کھائے۔ حرام نہ کھائے۔''

"یہ حلال حرام کیا ہوتا ہے اماں؟"

"اپنی محنت کی کمائی حلال ہے۔ کسی کی چیز بغیر اجازت لینا، چوری، بے ایمانی، کوئی بھی ناجائز کام۔ یہ سب حرام ہے۔" حمیدہ نے کہا۔ "پھر اندر روح بھی ہوتی ہے......" "آتما؟" اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔

"ہاں۔ آتما کو پاک صاف رکھنے کے لیے اچھے کام، نیکیاں ہوتی ہیں۔ آدمی سچ بولے، لوگوں کے کام آئے...... اور برے کاموں سے بچے۔ جھوٹ نہ بولے۔ کسی انسان کو تکلیف نہ پہنچائے۔ یوں آدمی صاف ستھرا ہوتا ہے۔ تو پھر اللہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ اس کے قریب ہوتا ہے۔ اس پر مہربان ہوتا ہے اور اسے کچھ بھی دے دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے علم میں سے بھی کچھ دے دیتا ہے۔"

"علم میں سے کچھ؟" اوتار سنگھ نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔

"ہاں، کچھ۔ بہت تھوڑا۔"

"تو اللہ کے پاس بہت علم ہے؟"

"بہت نہیں، سارا علم۔" حمیدہ کے لہجے میں خفگی تھی۔ "علم سارے کا سارا اللہ کا ہے اور جو وہ بہت تھوڑا علم دیتا ہے تو وہ بھی بندے کے لیے بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

"تو اللہ مجھ سے خوش ہے؟ میرے بہت قریب ہے؟"

"ہاں بیٹے۔ بس تم ہمیشہ اچھے رہنا۔"

وہ ساری باتیں اوتار سنگھ کے دل میں اتر گئی تھیں۔ اس دن کے بعد وہ صفائی پر اور توجہ دینے لگا۔ وہ دن میں دو بار نہاتا۔ سچ بولتا تا کہ اللہ اس سے خوش رہے۔ مگر پھر کچھ عرصے کے بعد اماں نے اس سے اللہ کی باتیں کرنا چھوڑ دیا۔ بہرکیف اس کے ساتھ جب بھی ایسی کوئی بات ہوتی، وہ خوش ہوتا کہ اللہ اب بھی اس سے خوش ہے...... اس کے قریب ہے۔ یہ نکتہ وہ کبھی نہیں بھولا۔

تو وہ اتفاق کو کیسے مان سکتا تھا۔ انسانی ارتقا کی تاریخ بتاتی تھی کہ اوپر والے نے دنیا بنائی، جاندار پیدا کیے، نباتات اگائی اور ایک مکمل سسٹم بنایا۔ اس نے انسان کو پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا۔ اس نے اسے سکھایا بھی۔ وہ قدرت والا، بہت زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس لیے اسے آدمی کے سامنے آنے، اس سے اپنی آواز میں بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مظاہرِ فطرت کے ذریعے اسے بہت کچھ سکھایا۔ اور اس کا تعلیم دینے کا سب سے بڑا ذریعہ خیال ہے، جو وہ جب چاہے، کسی کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ کم علم لوگ جو صرف اپنی حسوں پر یقین کرتے ہیں، اسے اتفاق کہتے ہیں۔

آدمی کو کششِ ثقل کا علم کیسے ہوا؟ نیوٹن کو کتاب پڑھنی تھی۔ وہ اتفاق سے ایک درخت

کے نیچے جا بیٹھا۔ اتفاق سے ایک سیب شاخ سے ٹوٹ کر اس کے سر پر گرا، تب نیوٹن نے غور کیا اور زمین کی کشش کو دریافت کیا۔ یہ بیان سائنس کا ہے۔ لیکن دوسرے زاویے سے دیکھیں تو اوپر والے کو یہ منظور تھا کہ آدمی کو زمین کی کشش کے بارے میں بتائے۔ وہ نیوٹن کو کتاب پڑھنے کے لیے درخت کے نیچے لے گیا۔ ورنہ نیوٹن اپنے کمرے میں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا تھا۔ پھر اس نے سیب گرایا۔ پھر نیوٹن کے دل میں خیال پیدا کیا۔ تب یہ دریافت ہوئی۔ اب اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی انسانوں کے سامنے درخت سے پھل گرتے رہے ہیں۔ کتنوں نے غور کیا کہ ایسا زمین کی کشش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ تو اب بھی کوئی نہیں سوچتا۔

اور ایسے ہی اتفاق سے ارشمیدس نے کثافت کا اصول دریافت کیا۔ ورنہ آج بھی کتنے لوگ روز دریا میں، سمندر میں نہاتے ہیں۔ کسی کو یہ خیال نہیں آتا لیکن ارشمیدس کا دریافت کردہ کلیہ تمام انسانوں کے لیے کتابوں میں محفوظ ہو گیا۔

علم سے محروم انسان مشقت کی زندگی گزارتا تھا۔ اس نے پرندوں سے گھر بنانا سیکھا۔ درختوں سے اسے لباس کا خیال آیا۔ جھنجلاہٹ میں کسی جانور کو پتھر مارا اور اس کا نتیجہ دیکھ کر اس نے پتھر سے ہتھیار اور اوزار بنائے۔ پرندوں کو اڑتے دیکھ کر اسے اڑنے کا شوق ہوا۔ لکڑی کو پانی میں نہ ڈوبتے دیکھا تو کشتی کا خیال سوجھا۔ چیونٹی کو بوجھ اٹھا کر چلتے دیکھا تو جانوروں سے بار برداری کا کام لیا۔ غرض ہر دریافت، ہر ایجاد کے پیچھے صرف اور صرف مشاہدے اور خیال کی طاقت تھی۔ اور خیال کبھی اجتماعی نہیں تھا۔ ہمیشہ کسی فرد کو خیال سوجھا اور اس نے کچھ دریافت یا ایجاد کیا اور پھر اپنی تعریف کے لیے، خود کو نمایاں کرنے کے لیے اس کے بارے میں دوسروں کو بتایا۔ اگر خیال کوئی عام چیز ہوتا تو بیک وقت بہت سارے لوگوں پر اترتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی قوت ہے، جو کسی منتخب شخص کو کوئی ایسا خیال سوجھاتی ہے۔ یہ علم کا ذریعہ ہے۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں اماں کی بات پوری طرح آ گئی کہ علم سارے کا سارا اللہ کا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے، اسے بہت...... بہت تھوڑا سا علم دیتا ہے۔ آدمی کو وہ بہت زیادہ لگتا ہے لیکن وہ علم کے سمندر کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر بے خبر انسان کو بہت زیادہ لگتا ہے۔

خیال کی طاقت کے بارے میں سوچتے ہوئے اوتار سنگھ کے سامنے ایک اور رخ آیا۔ انسان کی ترقی، خیال کے دم سے تھی۔ تو دوسری طرف اس کے مصائب اور دنیا میں شر اور فساد کا ذمے دار بھی خیال ہی تھا...... خیالِ بد۔ اس کے تحت آدمی برے کام کرتا تھا۔ دوسروں سے ان کا حق چھیننے اور اپنی ہوس کی خاطر سازشیں سوچتا اور کرتا۔ دوسروں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش میں ہی جنگیں ہوتی تھیں۔ چوری، ڈاکے، قتل، یہ سب برے خیال کی وجہ سے تھا۔

اس بارے میں سوچ کر وہ الجھنے لگا۔ کیا اوپر والے کے علاوہ کوئی اور طاقت بھی ہے۔ اس سے متصادم، اس کی مخالف، جو انسان کے دل میں برا خیال ڈالتی ہے؟ یہ تسلیم کرتا تو اس کے

اب تک کے اخذ کیے ہوئے نتیجے پر اثر پڑتا۔ کائنات کے منتظم اعلیٰ کی اپنی تلاش میں وہ یہاں تک پہنچا تھا کہ وہ ایک مطلق العنان ہستی ہے، جسے چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔ اب وہ اس میں ترامیم کرتا تو سب کچھ بکھر جاتا اور اس کا ذہن اس طرح کا تھا کہ وہ ہر چیز پر سوچتا تھا۔ نظریں کبھی نہیں چراتا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی اب تک کی تلاش رائیگاں ہونے والی ہے۔

وہ سوچتا رہا!

اچانک اسے ایک خیال آیا۔ اماں نے کہا تھا کہ آدمی صاف ستھرا رہے، اچھے کام کرے، برے کاموں سے بچے تو اللہ اس سے خوش ہوتا ہے، اس کے قریب ہوتا ہے اور اسے انعام دیتا ہے۔ تو اگر معاملہ برعکس ہو تو کیا ہوگا؟ یعنی آدمی گندا رہے، برے کام کرے اور اچھے کاموں سے بچے تو اللہ اس سے ناراض ہوگا، اس سے دور ہو جائے گا اور اسے سزا دے گا۔ تو یہ برا خیال سزا بھی ہو سکتا ہے۔

یہ دلیل معقول اور موثر تھی۔ اس سے اوپر والے کی اور صفتیں بھی سامنے آتی تھیں۔ وہ انتقام لینے والا بھی ہے۔ برے کو اور برا کر دیتا ہے وہ غصے والا بھی ہے۔ سزا بھی دیتا ہے۔ علم دیتا ہے۔ مگر گمراہ بھی کر دیتا ہے۔

وہ مطمئن تو ہوا، مگر پوری طرح نہیں۔ برائی کی قوت والا تصور وہ مسترد نہیں کر سکا تھا۔

پھر اس کی تلاشِ حق کی گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کا بنیادی سبب اردو شاعری بنی تھی...... اور اس کے بعد عشق!

❁......❁......❁

صحیح معنوں میں اردو شاعری سے اس کا واسطہ اب نویں جماعت میں پڑا تھا۔ میرؔ کو پڑھا تو پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ شاعری میں کتنی زیادہ قوت ہے اور وہ کیسا تحرک پیدا کرتی ہے۔ اور میرؔ کی شاعری تو عجیب تھی۔ سکوت بھی طاری کرتی اور اس کے ساتھ تحرک بھی دیتی۔ آدمی شعر پڑھتا اور بیٹھے کا بیٹھا رہ جاتا۔ وقت سمیت گرد و پیش کی ہر چیز جیسے ساکت ہو جاتی۔ پھر اندر ایک تحرک جاگتا۔ دل چاہتا کہ اداس ہو جائیں اور وہ اداس ہو جاتا...... بغیر کسی وجہ کے جیسے میرؔ کی شاعری اس کے اندر موجود اداس کر دینے والی کسی مشین میں چابی بھر دیتی۔

شاعری میں اس کے لیے کشش کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ شاعری کا بنیادی موضوع اور نفیس مضمون محبت تھی...... عشق تھا اور وہ محبت اور عشق کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کی خاطر تو اس نے تلاشِ حق کا آغاز کیا تھا۔ کئی برس پہلے اس نے سوچا تھا کہ اوپر والے نے یہ دنیا بنائی، اسے وجود دیا، اس پر بڑی بڑی مہربانیاں کیں۔ تو اسے ماں باپ سے بڑھ کر اس سے محبت کرنی چاہیے۔ لیکن بغیر دیکھے، سمجھے اور جانے کوئی کسی سے اتنی محبت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے اوپر والے کو کھوجنا شروع کر دیا اور شاعری کے ذریعے اسے محبت کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔

پھر میرؔ کے بعد وہ غالبؔ تک پہنچا اور حیران رہ گیا۔ غالبؔ کا تجسس اس کی فکر...... وہ تو جیسے اس کا ہی عکس تھا۔ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے؟

اور غالبؔ کا ایک شعر تو اس پر چھا گیا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا ، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے ، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

شاعری کے مطالعے کا شوق بڑھ گیا۔ وہ کتابیں خرید کر لانے لگا۔ نصاب کی شاعری بہت پیچھے رہ گئی۔

پھر شاعری کے حوالے سے اس نے محبت کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی۔ کیسا طاقت ور ہے یہ جذبہ جو آدمی کو تخلیق کے راستے پر لے جاتا ہے۔ کیسی کیسی کیفیتیں آتی ہوں گی، تب کہیں شاعر ایسے شعر کہتا ہوگا۔

یہ دروازہ کھلا تو اس کے آگے اور دروازے تھے۔ وہ نثر کی طرف چلا گیا۔ اس نے عشق کی داستانیں پڑھیں۔ شیریں فرہاد، قیس اور لیلیٰ، سسی پنوں، ہیر رانجھا، سَستی مراد، سوہنی مہینوال اور انگریزی میں رومیو جولیٹ اور یہ سب پڑھ کر اسے محبت سے محبت ہو گئی...... عشق سے عشق ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ سائنس میں اس کی دلچسپی صرف نصاب تک محدود ہو گئی۔ وہ فنون میں اور بالخصوص ادب میں دلچسپی لینے لگا۔ اوپر والے کی تلاش بھول کر وہ زمین پر کسی کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ کوئی ایسا ہو، جس سے اسے محبت ہو جائے۔ وہ بڑی حسرت سے سوچتا، کیا مجھے کبھی کسی سے محبت نہیں ہوگی۔ کیا مجھے کوئی ایسا نہیں ملے گا، جس کے لیے میں آہیں بھروں، شعر کہوں۔

وہ طبعاً شرمیلا تھا۔ لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے اس کی نظریں جھک جاتیں۔ لیکن اب تلاش کا مرحلہ تھا۔ چنانچہ اس کی نظریں اٹھنے لگیں۔ یہ الگ بات کہ بے خبر لڑکی نظریں اٹھاتی تو وہ نظریں نہ ملا پاتا۔ جھکا لیتا۔ لیکن بہرحال اب وہ دیکھتا تھا۔ تلاش جو تھی۔ وہ یہ سوچ کر بازار میں، جمنا کے کنارے، دیگر تفریحی مقامات پر لڑکیوں کو دیکھتا کہ شاید کسی کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوں گی۔ تب اسے پتا چل جائے گا کہ اسے اس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن ایسا کبھی ہوا نہیں۔

شاعری کے ذریعے اس نے بہت کچھ سمجھا اور سیکھا تھا۔ شاعری میں بوس و کنار بھی تھا اور جسمی اختلاط بھی۔ ایسے شعر پڑھ کر وہ ہیجان میں مبتلا ہوتا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگتی۔ اندر وحشت سی امنڈتی۔ وہ اس سے لطف اندوز ہوتا۔ لیکن پھر ایک جھٹکا لگتا۔ اسے احساس ہوتا کہ اس

وحشت میں خوب صورتی نہیں، اس میں لطافت نہیں کثافت ہے، جبکہ محبت کو تو بہت خوبصورت اور لطیف ہونا چاہیے۔ اس نے محبت کی تھی...... اپنے ماتا پتا سے، اماں سے، چاچا سے اور ویر جی سے۔ لیکن اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ محبت ناکافی ہے۔ اس میں کمی ہے۔ وہ مکمل محبت کرنا چاہتا تھا...... اپنے خالق سے۔ اس کا خیال تھا کہ محبت آدمی کو سکون دیتی ہے، خوشی دیتی ہے۔ مگر یہ وحشت...... یہ اندر جو کسی کو توڑ پھوڑ دینے کی خواہش اُبھرتی ہے...... یہ خوشی کیسے دے سکتی ہے۔

وہ اردو کے پیریڈ میں اردو کے استاد کو اپنے سوالات سے تنگ کرنے لگا۔ اس سے اسے فائدہ بھی ہوا۔ اسے پتا چلا کہ عشق بھی دو طرح کا ہے۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی۔ عشق حقیقی وہ ہے جو بندہ اپنے معبود سے کرتا ہے اور عشق مجازی بندہ بندے سے۔

''لیکن سر، یہ محبت میں وحشت کیوں ہے؟ اسے تو لطیف ہونا چاہیے۔''

''محبت تو لطیف ہی ہوتی ہے۔'' سر نے کہا۔ ''محبت کی تعریف پر غور کرو۔''

''اور محبت کی تعریف کیا ہے سر؟''

''محبت کرنے والے کو اپنے محبوب سے کوئی غرض، کوئی طلب نہیں ہوتی۔ وہ اپنے محبوب سے بدلے میں کچھ بھی نہیں مانگتا۔ محبت بھی نہیں، التفات کی ایک نظر بھی نہیں۔ وہ تو بس محبت کیے جاتا ہے کیونکہ محبت ایک خودکار جذبہ ہے، جو دل میں خود بخود ابھرتا ہے۔ تو محبت کرنے والا تو محبت کرنے پر مجبور ہے۔ وہ کوئی شرط عائد نہیں کر سکتا۔ یہ محبت نہیں کہ محبوب جواب میں محبت نہ دے تو اسے چھوڑ کر کسی اور سے محبت کر لو۔ یہ تو پھر کاروبار ہوا۔''

اب اوتار سنگھ جو اتفاق کو نہیں مانتا تھا، خودکار جذبے کو کیسے مان لیتا۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ اوپر والا خیال کی طرح کسی کو کسی کی محبت بھی سونپ دیتا ہے۔ لیکن تجربہ کرنا بھی ضروری تھا۔ اس نے کئی لڑکیوں سے بالارادہ محبت کرنی چاہی لیکن ناکام رہا۔ بات سمجھ میں آ رہی تھی۔

ایک اور موقعے پر سر نے اسے کہا کہ وہ چھٹی کے بعد ان سے ملے۔ وہ چھٹی کے بعد ان سے ملا۔ ''جی سر؟''

''بات یہ ہے اوتار سنگھ کہ تم ایسی باتیں جاننا چاہتے ہو، جو ابھی کلاس میں پڑھانا مناسب نہیں۔'' سر بولے۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمھیں بتانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ تم گمراہی میں پڑ سکتے ہو۔ اس لیے تم کلاس میں سوال کرنے کے بجائے مجھ سے اکیلے میں مل لیا کرو اور جو پوچھنا ہو پوچھ لیا کرو۔''

''شکریہ سر۔''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ محبت میں تمھیں خاص دلچسپی ہے، اور تم شاعری کے حوالے سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہو۔''

''جی سر، یہ درست ہے۔''

''اس لیے غلط فہمی کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ محبت کو سمجھ لو۔ محبت بہت پاک اور بلند جذبہ ہے۔ اور یہ محدود بھی نہیں۔ ماں بیٹے سے محبت کرتی ہے۔ بندہ معبود سے محبت کرتا ہے۔ محبت کسی کو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کسی مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے محبت ہو سکتی ہے۔ لیکن محبت کی بنیاد جسم کبھی نہیں ہوتا۔ اس کی بنیاد اچھے اوصاف بھی نہیں ہوتے۔ محبوب کا ظاہر بھی نہیں ہوتا کیونکہ محبت لافانی جذبہ ہے۔ آدمی بوڑھا ہو جائے تو جسم ڈھل جاتا ہے۔ اس جسم سے محبت ہو تو محبت ختم ہو جائے گی۔ محبوب کی کوئی بری عادت سامنے آئے تو محبت ختم ہو جائے گی......''

''جی سر۔''

''نہیں۔ محبت ہے تو کبھی ختم نہیں ہو گی۔''

اوتار سنگھ نے انھیں کئی اشعار کے حوالے دیے۔

سر مسکرائے۔ ''یہی تو میں تمھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ محبت نہیں، ہوس ہے۔''

''لیکن سر......''

سر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کوئی دن کو رات کہے تو وہ رات تو نہیں ہو جائے گا۔ بدی کو نیکی کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اسی طرح محبت کو اس کی تعریف پر، اس کی پاکی، اس کی بے غرضی اور بے طلبی پر تولو گے تو پتا چل جائے گا کہ وہ محبت ہے یا ہوس۔ چیزیں اپنے نام سے نہیں، خواص سے پہچانی جاتی ہیں۔ اور دعوے پڑتال کے بغیر بے معنی ہوتے ہیں۔''

بعد میں اوتار سنگھ ان باتوں پر غور کرتا رہا۔ سر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

پھر مومن کے ایک شعر نے اس پر محبت کی کیفیات کی خوبصورتی کسی حد تک واضح کر دی۔ شعر تھا......

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

پہلی بار یہ شعر پڑھنے کے بعد کئی دن تک اوتار سنگھ اس شعر کے طلسم کا اسیر رہا۔ اسے اس شعر میں ایک جہانِ معنی آباد نظر آتا تھا۔ یہ تھا محبت کا احترام اور اس کی پاکیزگی۔ خلوت...... ایسی تنہائی، جس میں کوئی بھی نہ ہو۔ تب محبوب آ جائے، جسمی طور پر نہیں، خیالوں میں۔ تنہائی میں محفل ہو جائے۔ اور آلودگی کا شائبہ بھی نہ ہو۔ وہ ایسی ہی محبت کا تو متمنی تھا۔

مجھے محبت...... سچی محبت کب ملے گی؟ اس نے خود کلامی کی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ محبت اسے ملنے ہی والی ہے!

❋......❋......❋

امتحان ہونے والے تھے۔ اس شام وہ سکون سے پڑھائی کی غرض سے کوٹھے پر چلا گیا۔ اوپر جاتے ہی اسے افسوس ہونے لگا۔ اب تک یہاں نہ آ کر اس نے بڑی ناقدری کی تھی۔ وہ تو بڑا خوبصورت ماحول تھا۔ فضا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی۔ کوٹھے پر بید کی بنی ہوئی کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کتاب کھولی اور پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ سچ یہ ہے کہ وہاں پڑھنے میں اسے بہت لطف آ رہا تھا۔

پھر ایک نسوانی آواز نے اس کی محویت کے حصار کو توڑ دیا!

اس نے کتاب سے نظریں ہٹائیں۔ چند لمحوں میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ کتاب اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس آواز میں عجیب سا جادو تھا۔ وہ کانوں کی راہ سے اس کے جسم میں اتر کر جیسے خون کے ساتھ اس کی رگوں میں گردش کر رہی تھی۔ اتنی خوبصورت آواز! اس کے ذہن میں بس یہی خیال تھا۔

پہلے تو ذرا دیر وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔ اس آواز کو سننے کے سوا وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر پھر اس نے غور کیا۔ وہ آواز کسی سے گفتگو نہیں کر رہی تھی۔ ورنہ گفتگو میں تو وقفہ بھی ہوتا ہے۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ لڑکی بلند آواز میں کچھ پڑھ رہی ہے۔ لڑکی اس لیے کہ اپنی آواز کی کھنک سے وہ بہت کم عمر لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا، آواز اتنی خوبصورت ہے تو وہ خود کتنی خوبصورت ہوگی۔

پھر اسے الجھن ہونے لگی۔ یہ لڑکی کیا پڑھ رہی ہے؟ اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا ہے؟ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ کچھ لفظ اس کی گرفت میں آئے مگر فوراً ہی محو بھی ہو گئے۔ وہ اس کے لیے اجنبی لفظ تھے۔ وہ کوئی اجنبی زبان تھی۔

اوتار سنگھ اردو، فارسی اور انگریزی پڑھتا تھا۔ چوتھی کوئی زبان اس کے علم میں نہیں تھی۔ وہ تجسس سے بے حال ہو گیا۔ اب یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ کون سی زبان ہے۔ ویر جی سے مدد لی جائے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ پڑھائی میں ویر جی اس سے پیچھے ہیں۔ تو ماسٹر جی...... لیکن نہیں۔ ان سے حجاب کا رشتہ تھا۔ وہ یقیناً بتا سکیں گے کہ یہ کون سی زبان ہے۔ لیکن ان سے پوچھا نہیں جا سکتا تھا۔

ابھی وہ اس الجھن میں تھا کہ آواز خاموش ہو گئی۔ ایسا لگا، جیسے پوری کائنات خاموش ہو گئی ہے۔ لیکن نہیں، ایسا نہیں تھا، پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جھٹ پٹے کا سماں تھا۔ پرندے بسیرے کے لیے واپس جا رہے تھے۔

ذرا دیر میں وہ آواز ابھری، جو ہر روز اس کے جسم کی تمام طاقت کو ٹانگوں میں لے آتی تھی...... اذان کی آواز! یہ آواز سن کر اس کے قدم خود بخود اٹھتے تھے...... حرکت میں آتے تھے۔ اندر کوئی تلقین ابھر کر اٹھتی تھی...... کوئی کہتا تھا...... تجھے بلایا جا رہا ہے۔ تو جاتا کیوں نہیں۔ وہ خود

بخود چند قدم چلتا تھا اور پھر مضطربانہ انداز میں چھوٹے سے دائرے میں ٹہلتا رہتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کون اسے بلا رہا ہے اور اسے کس طرف جانا ہے۔

مگر اس شام وہ تلقین بہت دھیمی، بہت کمزور تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے مرتکز حواس پر وہ آواز چھائی ہوئی تھی، جو اس نے ذرا دیر پہلے سنی تھی۔ اجنبی الفاظ دوش پر اٹھائے ہوئے وہ آواز اب بھی اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ اس کی موجودگی میں باہر کی آوازیں دھیمی پڑ گئی تھیں۔

وہ ہاتھ میں کتاب لیے دیر تک وہاں بیٹھا رہا...... منتظر کہ وہ آواز پھر سنائی دے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ ایسا گم تھا کہ اسے اندھیرے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ورنہ وہ اٹھ کر لائٹ تو جلا لیتا اور تو اور اسے ویر جی کے آنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔

''بھائی...... تم یہاں بیٹھے ہو۔ اور میں تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔'' وصال دین کے لہجے میں شکایت تھی۔

''کیوں ڈھونڈ رہے ہو ویر جی۔'' اوتار سنگھ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

وصال دین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کھانے کے لیے بھائی۔''

''اچھا۔ کھانے کا وقت ہو گیا؟''

''کہاں کھوئے ہوئے ہو بھائی۔ اور یہاں بیٹھنا تھا تو لائٹ ہی جلا لی ہوتی۔''

اب اوتار سنگھ اسے کیسے بتاتا کہ اسے کچھ ہوش ہی نہیں۔ اس نے بات بنائی۔ ''دل ہی نہیں چاہا۔ اندھیرا اچھا لگ رہا ہے۔''

''اچھا۔ اب نیچے چلو۔''

اوتار سنگھ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

❁......❁......❁

اگلے روز شام کے وقت اس کے قدم خود بہ خود اٹھے اور وہ کوٹھے کی طرف چل دیا۔ کتابیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ بید کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے کتاب کھولی اور پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا دھیان تو کہیں اور تھا۔ اس کی تمام حسوں کی طاقت سماعت میں مجتمع ہو گئی تھی۔ اس کی نظریں کتاب کے کھلے صفحے پر تھیں۔ مگر اسے ایک حرف بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

لیکن وہاں ہر طرف خاموشی تھی...... ایک غیر معمولی خاموشی! وہ مضطرب ہوا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کیا ہوا؟ کیا اب وہ آواز سنائی نہیں دے گی؟ وہ پریشانی سے سوچتا رہا۔ کیا وہ اتفاق تھا......؟ بس ایک دن کی بات تھی؟

ہاں...... بالکل ممکن ہے۔ اس کے اندر سے کسی نے جواب دیا۔ اب کیا ضروری ہے کہ روز اسی وقت وہ آواز سنائی دے۔

اس خیال سے وہ اتنی تیزی سے، اور اتنا زیادہ مایوس ہوا کہ اسے حیرت ہونے لگی۔ کیا صرف ایک بار سننے کے بعد وہ آواز اس کے لیے اتنی اہم ہوگئی کہ وہ اتنا مایوس ہوگیا۔ ایسا ہوتا تو نہیں۔

وہ یہ سب کچھ سوچتا رہا ٹہلتا رہا۔ اس کے اندر عجیب سی کشمکش تھی۔ دل کہتا تھا۔ ابھی وہ آواز سنائی دے گی۔ اور دماغ کہتا تھا... یہ ضروری نہیں۔ لمحے بہت سست رفتار سے گزر رہے تھے۔ اس کی بے چینی بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

پھر وہ بے چینی وحشت میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ پورا جسم اینٹھنے لگا۔ اس کے اندر ایک خواہش مچلی۔ جی چاہا کہ وہ پوری قوت سے چلائے ... اے..... نیچے والی، تم چپ کیوں ہو؟ بولتی کیوں نہیں؟ اور اس خواہش کا گلا گھونٹنا بہت مشکل تھا۔ وجود کی پوری طاقت صرف کرنے کے باوجود اس کے ہونٹ بری طرح لرز رہے تھے۔ بے تاب زبان دہن میں اینٹھی جارہی تھی۔

اوتار سنگھ نے گھبرا کر اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔ اس نے پڑھائی کے بارے میں سوچا، ماسٹر جی اور ویر جی کے بارے میں سوچا، پتا جی اور اماں کے بارے میں سوچا۔ لیکن اس سے سوچا نہیں گیا۔ دماغ گراموفون کی سوئی کی طرح اسی آواز پر اٹکا ہوا تھا۔ اس نے ماتا جی کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی۔ اس سے پوری طرح سوچا تو نہیں گیا۔ البتہ وحشت قدرے کم ہو گئی۔ مگر اب بھی صورتِ حال تسلی بخش نہیں تھی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ اس آواز والی کے بارے میں سوچے۔

یہ اس کے پاس آخری ترکیب تھی۔ خوش قسمتی سے وہ کارگر ثابت ہوئی۔ اس خیال سے ہی اس کا مضطرب وجود پُرسکون ہوگیا۔ چند لمحوں میں وہ سب کچھ بھول کر اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔

نیچے والوں کے بارے میں اسے بتایا تو گیا تھا۔ لیکن اس نے کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ دھیان سے نہیں سنا تھا۔ رنجنا نیچے جاتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ان کی باتیں کیا کرتی تھی۔

اب تعلق جڑا تھا تو اوتار سنگھ رنجنا کی باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر دشواری ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ رنجنا کی باتیں دھیان سے سنتا ہی نہیں تھا۔ سو اب اسے اس چیونٹی کی سی مشقت کرنی پڑ رہی تھی، جو اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھا کر بل تک جاتی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے رنجنا سے حاصل ہوئی معلومات کو یاد کرتا اور پھر ترتیب دیتا۔ یہ گھر ایک بہت بڑے سرکاری افسر کا تھا۔ خاندانی لوگ تھے۔ ان کے ہاں بیٹا کوئی نہیں تھا۔ بیٹیاں تین تھیں۔ ایک چودہ سال کی، دوسری بارہ اور تیسری دس سال کی۔ ان کے یہاں آنے سے ایک سال پہلے سرکاری افسر کا انتقال ہوگیا۔ اب گھر میں ان ماں بیٹیوں اور دو نوکروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ چھمن بوا اور بہادر علی دونوں پشتینی

ملازم تھے اس گھر کے۔ مرنے والے کے واجبات میں بڑی رقم ملی تھی۔ باقاعدگی سے پنشن آتی تھی اور اب اوپر کے مکان کا کرایہ بھی تھا۔ چنانچہ تنگی کوئی نہیں تھی۔ وہ خوش حال لوگ تھے۔ ماں کو بس یہی فکر تھی کہ تینوں بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہوجائیں تو بوجھ ہلکا ہو۔

اوتار سنگھ کو خوشی ہوئی۔ دھیان سے نہ سننے کے باوجود اتنا کچھ اسے یاد تھا۔ ہاں وہ متاسف ضرور تھا کہ پتا نہیں کتنی اہم باتیں حافظے میں نہیں رہی ہوں گی۔ بہرحال اسے اتنا پتا چل گیا کہ وہ آواز ان تین لڑکیوں میں سے کسی کی ہے۔ کس کی؟ یہ فی الوقت اسے معلوم نہیں تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس کا دھیان پوری طرح بٹ چکا تھا اور وہ پُرسکون ہوگیا تھا۔ ایسا پُرسکون کہ نہ اسے اپنا اضطراب یاد تھا اور نہ ہی اس کا سبب۔ وہ ذہن پر زور دے رہا تھا... نیچے والوں کے بارے میں سنی ہوئی اور باتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا......

پھر اسے ایک اور اہم بات یاد آئی۔ نیچے رہنے والے سب لوگ مسلمان تھے.... ویر جی، اماں اور چاچا جی کی طرح!

اسی لمحے وہ آواز ابھری..... اور اس کے ساتھ ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔ وہ مترنم، دل نشیں آواز لحہ بہ لحہ بلند ہورہی تھی۔ وہی اجنبی زبان، وہی مخصوص لحن۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ آواز بلند نہیں ہورہی تھی۔ دراصل وہ اس کے پورے وجود میں دوڑ رہی تھی..... گونج رہی تھی۔ اس کے وجود میں اس آواز کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ جیسے کسی طلسم کا اسیر، ہاتھ میں کھلی کتاب لیے، سامنے کے صفحے پر نظریں جمائے ساکت وصامت بیٹھا تھا۔ لیکن وہ پڑھ نہیں رہا تھا۔ وہ صرف سن رہا تھا۔ ایسے کہ وہ اپنی مرضی سے ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔

پھر آواز کی وہ ڈور اچانک ہی ٹوٹ گئی۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ اسے لگا کہ اس کا وجود بالکل خالی ہوگیا ہے۔ زندگی جیسے اس آواز سے لپٹ کر، اس آواز کے ساتھ رخصت ہوگئی ہے۔

وہ بیٹھا رہا۔ اسے امید تھی کہ وہ آواز پھر سنائی دے گی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد اذان کی آواز سنائی دی۔ اندھیرا ہوگیا تھا۔ وہ اس آواز کا انتظار کیے جا رہا تھا۔

پھر اچانک اسے اندھیرے کا احساس ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی یاد آیا کہ گزشتہ روز ویر جی اوپر آئے تھے اور انھوں نے کہا تھا..... لائٹ ہی نہیں جلائی۔ تو لائٹ جلانا اب ضروری ہے۔ اس نے سوچا۔ یہ ضروری تھا۔ اب اس کے پاس ایک مقدس راز تھا، جسے افشا نہیں ہونے دینا تھا۔ سب کو یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ سکون سے پڑھنے کی غرض سے کوٹھے پر آتا ہے۔ انتظار کی اس کیفیت نے اس کے وجود کو شل کردیا تھا۔ اس پر عجیب سی کسلمندی طاری تھی۔ اٹھنا اور کچھ کرنا تو بہت دور کی بات ہے، ایسے میں تو انگلی ہلانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ لیکن بات اپنے مقدس و محترم راز کی پردہ

داری کی تھی۔ وہ یونہی بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ اٹھے، کتابیں لے اور نیچے چلا جائے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کون جانے، وہ آواز پھر جادو جگائے...... اسی انتظار میں تو تھا۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ اٹھ کر لائٹ جلائے اور کتاب کھول کر پڑھنے کی اداکاری کرتا رہے۔

اس نے اٹھ کر لائٹ جلا دی۔ اب کتاب کے صفحے پر نظریں جمائے وہ اس آواز کا منتظر تھا۔

لیکن وہ آواز نہیں آئی!

❁......❁......❁

نجانے کتنے دن گزر گئے۔ اتنا ہوش کسے تھا کہ دنوں کی گنتی کرتا۔ ایک سحر تھا، جس میں اوتار سنگھ گرفتار تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی اس کا انتظار شروع ہوتا۔ وہ شام کے اس مخصوص وقت کے انتظار میں وقت گزارتا، جب وہ آواز ابھرتی تھی۔ حالانکہ وہ انتظار بے معنی تھا۔ وہ ذرا سا غور کر لیتا تو یہ بات خود اس کی سمجھ میں بھی آ جاتی۔ لیکن وہ تو خود فراموشی کی کیفیت میں تھا۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ اب وہ آواز تو ہر وقت، ہر پل اس کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ تو جیسے اس کی سماعت سے، اس کے وجود سے جڑ گئی ہے۔ وہ کلاس روم میں ہو یا گھر میں، کلاس میں لیکچر ہو یا گھر میں ماسٹر جی پڑھا رہے ہوں، وہ آواز اس کے کانوں میں بسی رہتی تھی، اس کے وجود میں گونجتی رہتی تھی۔

اور اتنے دنوں میں اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ آواز صرف اس مخصوص وقت میں آتی ہے۔ اس کے باوجود اس کا بس چلتا تو وہ چوبیس گھنٹے کوٹھے پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا۔ اس انتظار میں ایسی انوکھی لذت تھی، جس سے وہ پہلی بار آشنا ہوا تھا۔

ابتداء میں وہ آواز سنتے ہوئے اسے جھنجلاہٹ ہوتی تھی...... اس بات پر کہ وہ زبان...... ادا کیے جانے والے الفاظ اس کے لیے اجنبی ہیں۔ کاش وہ ایک ایک لفظ سمجھتا۔ تب تو کچھ اور ہی بات ہوتی لیکن چند دنوں کے بعد یہ احساس خود بخود مٹ گیا۔ وہ آواز اس پر یوں حاوی ہوئی کہ اسے کچھ سوچنے کا خیال ہی نہ آتا۔ ہاں، اسے یہ احساس ہوتا کہ جو بات بھی کہی جا رہی ہے، وہ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود اس کے اعصاب کو پُرسکون کر دیتی ہے۔ اس کے دل و دماغ کو طمانیت سے بھر دیتی ہے۔ اس کا پورا وجود جیسے ایک بہت خوبصورت کیفیت میں جھومنے لگتا ہے۔ اور یہ کیفیت صرف اس کی داخلی نہیں۔ باہر بھی ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔ بیلیں، پودے، پھول ...سب جھوم رہے ہوتے ہیں۔ ہر شے میں حتیٰ کہ بے جان دیواروں میں بھی ایک سپردگی آمیز ارتعاش محسوس ہوتا ہے۔

امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ اب نتیجہ آنے تک چھٹیاں تھیں۔ یہ دن اس کے

لیے آزمائش بن گئے۔ اس کا جی چاہتا کہ صبح ہی سے کوٹھے پر چلا جائے۔ رات تک کے لیے! لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی بات ہو گی، جس پر سب غور کریں گے اور بالآخر اس کا راز افشا ہو جائے گا اور یہ وہ گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے معمول سے ہٹ کر کچھ نہیں کیا۔ لیکن وقت گزارنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا۔ وہ شام تک کا وقت گزارنے کے لیے باؤلوں کی طرح مضطرب اِدھر اُدھر پھرتا رہتا اور شام ہوتے ہی کتابیں اٹھا کر کوٹھے کا رخ کرتا......

وصال دین چھوٹے ٹھاکر کے اس نئے معمول سے بے خبر نہیں تھا لیکن اس نے اس معاملے میں تجسس نہیں کیا۔ کچھ تو یہ کہ اس کی فطرت میں تجسس تھا ہی کم۔ دوسرے یہ کہ یہ معمول اس کے لیے بہت بہتر تھا۔ اسے اماں اور ابا کی نصیحت یاد تھی۔ جب اوتار سنگھ نیچے ہوتا تھا تو اسے عصر اور مغرب کی نماز کے لیے نظر بچا کر جانا ہوتا تھا۔ اور قرآن شریف کی تلاوت ایک الگ مسئلہ تھی۔ اب اوتار سنگھ کے اس نئے معمول نے اس کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

تجسس نہ کرنا اپنی جگہ، مگر وصال دین کا مشاہدہ بہرحال برا نہیں تھا۔ یہ تو اس سے نہیں چھپ سکا کہ اوتار سنگھ اب بہت مضطرب رہتا ہے۔ اس میں کچھ مشاہدے کا کمال بھی نہیں تھا۔ اوتار سنگھ کا اضطراب ایسا تھا کہ اس کے انگ انگ سے چھلکتا نظر آتا تھا۔ تاہم غیر متجسس وصال دین نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا۔ یہ کیفیت گاؤں جانے کی خواہش کی وجہ سے بھی ہو سکتی تھی اور امتحان دینے کے بعد نتیجے کے انتظار میں بھی ایسا ہوتا ہے۔

کچھ بھی ہو، وصال دین کے لیے تو وہ معمول، نعمت تھا۔ اوتار سنگھ اوپر ہوتا تو وہ بڑے سکون سے اپنے معمولات میں مگن رہتا۔ وہ اوپر جاتا تو صرف کھانے کے وقت کھانے پر اوتار سنگھ کو بلانے کے لیے۔ چنانچہ اوتار سنگھ سکون سے اپنے راستے پر چلتا رہا۔

مگر اس شام بڑے ٹھاکر کا ٹیلی گرام آ گیا۔ انھوں نے اطلاع دی تھی کہ اگلے روز وہ آ رہے ہیں۔

وصال دین نے ٹیلی گرام پڑھا۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ خوشی کی یہ خبر سنانے کے لیے وہ آندھی طوفان کی طرح کوٹھے کی طرف دوڑا۔

اوتار سنگھ اپنی محبوب آواز میں اس طرح گم تھا کہ کوئی طوفان بھی اسے نہیں چونکا سکتا تھا۔ اسے وصال دین کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔

وصال دین اوپر پہنچا تو اوتار سنگھ کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ مگر اس کی نظریں کتاب پر نہیں تھیں۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر ایک لمحے میں وصال دین کو احساس ہو گیا کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ مگر وہ سامنے کی کوئی چیز بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ ڈر گیا کہ کیا ہو گیا بھائی کو۔ لیکن چند لمحوں میں اس کا ڈر دور ہو گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ بھائی کہیں کھویا ہوا ہے...... دنیا و مافیہا سے [illegible] بے خبر۔

وصال دین نے ادھر اُدھر دیکھا۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ وہاں بہت پرسکون ماحول تھا۔ پھر اچانک اسے اس آواز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ نسوانی آواز نیچے سے آ رہی تھی۔ مگر اس میں اسے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہوئی۔

وہ اوتار سنگھ کی آنکھوں کے سامنے سے گزرا اور برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیکن شاید اوتار سنگھ نے اسے نہیں دیکھا۔ یا دیکھا بھی تو بہرحال اس کی محویت نہیں ٹوٹی۔

اس نے اوتار سنگھ کو پکارنے کا ارادہ کیا۔ اسے خود بہ خود یہ احساس ہوا کہ اسے زور سے نہیں پکارنا چاہیے۔ جیسے یہ کوئی بے ادبی ہوگی۔ چنانچہ اس نے تین چار بار اسے دھیرے سے پکارا۔ ''بھائی...... بھائی...... ٹھاکر جی کا ٹیلی گرام آیا ہے۔''

لیکن اوتار سنگھ کی محویت نہیں ٹوٹی۔

پریشان ہو کر اس نے اوتار سنگھ کو نرمی سے ہلایا۔ ''بھائی کیا ہو گیا ہے تم کو؟ کہاں کھوئے ہوئے ہو؟''

پہلی بار اوتار سنگھ کی محویت ٹوٹی۔ اس نے وصال دین کو دیکھا۔ مگر اس کی نگاہوں میں بیگانگی تھی۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔

وصال دین کو جھٹکا لگا۔ اوتار سنگھ نے پہلے کبھی اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ وہ سہم گیا۔ ''وہ...... وہ...... چھوٹے ٹھاکر...''

اوتار سنگھ نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ مت بولو۔ بس سنتے رہو۔''

اب وصال دین میں بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ نجانے اوتار سنگھ اسے کیا سننے کو کہہ رہا تھا۔ وہاں نیچے سے آنے والی اس نسوانی آواز کے سوا سننے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے سنتے سنتے وہ خود بھی اس آواز میں کھو گیا۔

نجانے کتنی دیر ہو گئی۔ پھر اوتار سنگھ نے ہی اسے چونکایا۔ ''سن رہے ہو نا ویر جی۔'' اس بار اس کے لہجے میں نرمی اور اپنائیت تھی۔

''جی چھوٹے ٹھاکر، سن رہا ہوں۔''

''کیا جادو ہے اس آواز میں۔''

''جی ہاں۔''

''پتا نہیں زبان کون سی ہے۔ ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ کاش...''

''یہ عربی زبان ہے۔'' وصال دین نے بے ساختہ کہا۔

اوتار سنگھ تو اچھل پڑا۔ ''عربی! سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں بھائی۔ یہ عربی ہے۔''

''تمھیں پکا معلوم ہے ویر جی۔'' اوتار سنگھ کی کیفیت ہیجانی تھی۔

''ہاں بھائی۔'' وصال دین نے کہا۔ اور فوراً ہی اسے ڈر لگنے لگا۔ وہ تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اوتار سنگھ اس سے پوچھے کہ اسے کیسے معلوم کہ یہ عربی ہے...... تو وہ کیا جواب دے گا۔

لیکن اوتار سنگھ ایسے عالم میں تھا کہ اور کچھ پوچھ ہی نہیں سکتا تھا۔

اُدھر اوتار سنگھ کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ مگن تھا۔ یہ تو بہت بڑی بات معلوم ہو گئی۔

چند لمحے اوتار سنگھ اس خوشی کی لذت میں گم رہا۔ مگر پھر سوچنے کا عمل شروع ہوا اور سوالات ابھرنے لگے۔ عربی تو عرب میں بولی جاتی ہے۔ تو کیا یہ نیچے رہنے والے لوگ عرب کے ہیں؟ نہیں...... ایسا تو نہیں؟ تو پھر؟ اس کا جی چاہا کہ یہ بات وصال دین سے پوچھے۔ لیکن فوراً ہی اس نے خود کو روک لیا۔ یہی کیا کم ہے کہ وصال دین کو اس کی محویت اور اس آواز کے درمیان رشتے کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ زیادہ پوچھ گچھ کرے گا تو یہ راز کھل جائے گا۔ نہیں...... یہ نہیں ہونا چاہیے اور جو تھوڑی بہت بات کھلی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے بدلے یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ کون سی زبان ہے۔ اب وہ یہ زبان سیکھ سکتا ہے۔ یہ تو بہت بڑی بات معلوم ہوئی ہے۔ مگر اب اور کچھ نہیں پوچھنا۔

دراصل اوتار سنگھ کی سوچ کا محور صرف وہ آواز تھی... اور صاحب آواز۔ ورنہ یہ سامنے کی بات وہ ضرور سوچتا کہ پڑھائی میں اس کے پیچھے چلنے والے وصال دین کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ زبان عربی ہے اور یہ سوچتا تو اس کا تجسس ضرور بھڑکتا۔ وہ وصال دین سے پوچھتا...... اور وصال دین کے لیے وہ بہت بڑی آزمائش ہوتی۔ لیکن اوتار سنگھ کے ارتکاز نے یہ نوبت ہی نہیں آنے دی۔

دوسری طرف وصال دین کو یہ شک تو ہوا کہ شاید اوتار سنگھ اوپر یہ آواز سننے کے لیے ہی آتا ہے۔ لیکن اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا کیونکہ اوتار سنگھ نے رات کے کھانے تک کوٹھے پر بیٹھا رہتا تھا۔ جبکہ یہ آواز تو تھوڑی دیر کی ہی ہے۔

اوتار سنگھ اس آواز کی اہمیت کے تاثر کو زائل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہاں پڑھائی کے لیے بہت اچھا ماحول ہے۔ بہت سکون ہے۔ آج اس آواز نے ڈسٹرب کر دیا۔ ورنہ یہاں پڑھائی میں ایک لمحے کو بھی خلل نہیں پڑتا۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرا کہ وصال دین نے بھی پڑھائی کے لیے یہاں آنا شروع کر دیا تو کیا ہوگا۔

''ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ لیکن میں یہاں نہیں پڑھ سکتا۔ میں تو یہاں کے ماحول میں کھو جاؤں گا۔'' وصال دین نے کہا۔

اوتار سنگھ نے خطرہ ٹل جانے پر سکون کی سانس لی۔ پھر بولا۔ ''ارے ہاں ویر جی، تم یہاں کیوں آئے تھے؟ کچھ کہہ رہے تھے؟''

''ہاں بھائی۔ کل ٹھاکر جی یہاں آ رہے ہیں۔''

❋ ❋ ❋

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دوپہر کو وہاں پہنچ گیا۔ چنی کو کھونے کے بعد اس کے پاس اس بیٹے کے سوا بچا ہی کیا تھا۔ اس کے تو دل میں بار ہا آتی تھی کہ اوتار سنگھ کو اسکول سے اٹھا لے۔ اچھی سے اچھی پڑھائی کا وہ گھر پر بھی بندوبست کر سکتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ یہ تو انتہا درجے کی خود غرضی ہوگی۔ صرف علم سے کیا ہوتا ہے۔ اسکول کالج سے آدمی اور بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ٹھاکروں کی گڑھی میں بند رہے گا تو اس کا بیٹا علم حاصل کرنے کے باوجود کنویں کا مینڈک ہی رہے گا۔

اب مہینوں سے وہ بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترس رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اب گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ اس کے باوجود اس سے رہا نہیں گیا۔ تین دن بیٹے کے ساتھ گزارنے کی نیت سے وہ دہلی چلا آیا۔

اور اب اس کا رویہ ایسا تھا کہ وہ بیٹے کو ایک پل کے لیے بھی نظروں سے دور نہ ہونے دیتا۔

شام کو اوتار سنگھ کتابیں لے کر اوپر جانے لگا تو ٹھاکر نے اسے ٹوکا۔ ''کہاں جا رہے ہو پتر؟''

اوتار سنگھ چور سا ہو گیا۔ ''اوپر کوٹھے پر پتا جی۔ وہاں پڑھائی اچھی ہوتی ہے۔''

''پر اب تو امتحان ہو چکے ہیں نا۔ پھر پڑھائی کیسی؟''

''اب بڑی کلاسیں ہیں پتا جی۔ اور میں کلاس کے مقابلے میں ایڈوانس رہنا چاہتا ہوں۔''

ٹھاکر کا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا۔ ''ابھی پڑھائی کو چھوڑو۔ تین دن تو میرے ساتھ گزارو۔''

''ٹھیک ہے پتا جی۔'' اوتار سنگھ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

ٹھاکر کو فرض شناس اور فرمے دار بیٹے پر پیار آ گیا۔ ''اچھا چلو۔ میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ تم پڑھائی کرنا۔ میں تمھیں دیکھتا رہوں گا۔''

مایوس اوتار سنگھ کے لیے یہ بہت غنیمت تھا۔ دونوں اوپر چلے گئے۔

ابھی آواز کے طلوع ہونے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ اوتار سنگھ ترسے ہوئے باپ سے باتیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی اسے احساس جرم ہو رہا تھا۔ وہ کتنا خود غرض تھا۔ باپ اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے اتنی دور سے آیا تھا اور وہ اس آواز کی وجہ سے اسے ٹال رہا تھا۔

اس نے کتابیں بے پروائی سے رکھ دیں اور باپ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''گاؤں کا کیا

حال ہے پتا جی؟''

''ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''لیکن تم پڑھتے کیوں نہیں؟''

''پڑھ لوں گا پتا جی۔ پہلے آپ سے باتیں تو کر لوں۔ میں بہت مس کر رہا تھا آپ کو۔''

ٹھاکر کا دل خوش ہو گیا۔ لیکن اسے بیٹے کی پڑھائی کا احساس بھی تھا۔ وہ بولا۔ تم پڑھتے رہو۔ میں بس تمھیں دیکھ کر ہی خوش ہو لوں گا۔''

''لیکن میں تو آپ کو نہیں دیکھ سکوں گا۔'' احساسِ جرم کے شکار بیٹے نے کہا۔ ''اور پڑھائی کی کوئی بات نہیں پتا جی۔ امتحان تو ہو چکے ہیں۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔''

اچانک اوتار سنگھ کو بہت کچھ یاد آ گیا۔ اس کا احساسِ جرم اور بڑھ گیا۔ ارے۔۔۔ اس آواز کے چکر میں وہ سب کو۔۔۔ کیسے کیسے محبت کرنے والوں کو بھول گیا۔ اتنے دن اسے کسی کی یاد نہیں آئی، کسی کا خیال نہیں آیا۔ واقعی، یہ تو خود غرضی کی انتہا ہے۔ اسے اماں بھی یاد نہیں آئیں۔

''پتا جی۔۔۔ اماں کیسی ہیں۔۔۔ چاچا کا کیا حال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہیں پتر۔ تمھیں بہت یاد کرتے ہیں۔'' ٹھاکر نے بتایا۔ ''اور تم سناؤ، یہاں کا کیا حال ہے؟''

''سب ٹھیک ہے پتا جی۔ بس مجھے ایک ٹیچر کی ضرورت ہے۔''

ٹھاکر چونکا۔ ''خیریت؟ کانتی پرشاد جی تو ہیں نا۔''

''مجھے عربی پڑھنی ہے پتا جی۔'' یہ کہتے ہوئے اوتار سنگھ اپنے آپ میں چور سا ہو گیا۔ ''اور کم وقت میں عبور حاصل کرنا ہے۔ اس لیے کسی کامل استاد کی ضرورت ہے۔''

ٹھاکر کچھ چوکنا سا ہو گیا۔ ''مگر عربی کیوں پتر؟''

''بس۔۔۔ جی چاہتا ہے میرا۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا۔ پھر بولا۔ ''یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ میں جانے سے پہلے اس کا بندوبست کر دوں گا۔ مگر اب گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔ پھر تم گاؤں چلے آؤ گے۔ کیوں نہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کے لیے بات کی جائے۔''

اوتار سنگھ گڑبڑا گیا۔ اب تو وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور پتا جی تین ماہ کی بات کر رہے تھے۔ ''پتا جی، اس بار میں چھٹیاں یہیں گزاروں گا۔''

''کیوں پتر۔۔۔ ایسا کیوں؟'' ٹھاکر نے بوکھلا کر کہا۔

''پتا جی، مجھے عربی شروع سے پڑھنی ہے۔ یوں سمجھیں کہ عربی میں، میں دس سال پیچھے ہوں۔ بہت محنت کروں اور چھٹیوں میں بھی پڑھوں تو کچھ بات بنے گی۔''

ٹھاکر نے شکایتی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ لیکن پھر اس کی علم کی تڑپ پر پیار آ گیا۔
''تم چھٹیوں میں بھی پڑھنا چاہتے ہو نا؟''
''جی پتا جی۔''
''ٹھیک ہے، یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔'' ٹھاکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

❁ ❁ ❁

اوتار سنگھ کی چھٹیوں کے وہ دو مہینے ٹھاکر کے لیے اب بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ وہی ایک عرصہ تھا، جس میں اسے بیٹے کی قربت ملتی تھی۔ وہ راجپوت تھا۔ محبت میں بھی آن کا خیال رکھتا تھا۔ وہ خود کو بیٹے پر تھوپتا نہیں تھا۔ ہر وقت اس سے چپکے رہنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ تو [illegible] کے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھتا تھا۔ لیکن وہ اس کے ہر پل کی خبر رکھتا تھا۔ وہ اسے چپکے چپکے [illegible]۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی خوشی تھی کہ اس عرصے میں اس کا بیٹا ہر وقت اس کی نگاہوں [illegible] مے ہے۔ ان دو مہینوں میں وہ رات کو کم ...... بہت ہی کم سوتا تھا۔ بعض اوقات تو وہ رات بھر [illegible] سوتے ہوئے بیٹے کو دیکھتا رہتا تھا۔

تو اب وہ اس عرصے کو کھو دینا کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ مگر بیٹے کی بات ٹالنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ بیٹھ کر اسی مسئلے پر سوچتا رہا۔ بالآخر اسے اس کا حل مل گیا۔

اگلے روز وہ اسکول گیا اور اس نے پرنسپل کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔

''یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'' پرنسپل نے سب کچھ سننے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔
''مولوی برکت علی عربی میں استادِ کامل ہیں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے بیٹے کو عربی کی کیا سوجھی۔''
''من موجی ہے سروہ تو۔ اور علم کی بڑی لگن ہے اسے۔''
''چلیں، ٹھیک ہے۔ میں کل مولوی صاحب کو آپ کی طرف بھیج دوں گا۔''
''ایک مسئلہ اور ہے۔'' ٹھاکر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
''فرمائیں ٹھاکر صاحب۔''
''اوتار سنگھ گرمی کی چھٹیوں میں بھی پڑھنا چاہتا ہے۔''
''آپ کا مطلب ہے، گاؤں میں .....''
''جی ہاں۔'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔ ''فیس کا کوئی مسئلہ نہیں۔ جو حکم کریں گے.....''
''میں بات کر لوں گا مولوی صاحب سے۔ میرا خیال ہے، یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔'' پرنسپل نے کہا۔

اور واقعی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ مولوی برکت علی دو ماہ کی چھٹیاں ٹھاکروں کی گڑھی میں

گزارنے کے لیے بخوشی تیار ہو گئے۔

❁ ❁ ❁

مولوی برکت علی نہ صرف باشرع مسلمان تھے۔ بلکہ بہت بڑے عاشق رسولؐ بھی تھے۔ عربی اور فارسی ان کے لیے مادری زبان کی طرح تھیں۔ لیکن عربی سے تو انھیں عشق تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ وہ ان کے محبوبؐ کی زبان جو تھی اور پھر علوم دین کے تمام خزانے اسی زبان میں تھے۔ اللہ نے کیسی عزت، کیسا شرف عطا فرمایا ہے اس زبان کو کہ اپنا کلام پاک بھی اسی زبان میں عطا فرمایا ہے۔

مگر مولوی صاحب کے لیے وہ دور بڑا دکھ دینے والا تھا۔ قدریں بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھیں۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ تعلیم کا انداز بدل گیا تھا۔ جب سر سیّد احمد خان نے پہلی بار آواز اٹھائی تھی کہ مسلمانوں کے لیے انگریزی زبان سیکھنا بہت ضروری ہو گیا ہے تو مسلمانوں کا ردعمل بہت منفی تھا۔ سر سیّد کو کیسے کیسے خطابات دیے گئے۔ انگریزوں کا پٹھو، ٹوڈی کہا گیا انھیں۔ انھیں جوتوں کا ہار پہنایا گیا۔ لیکن وہ اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ انھوں نے صرف زبان سے نہیں، عمل سے بھی ثابت کیا کہ ان کا موقف درست ہے اور مسلمانوں کی بقا اسی میں ہے۔

شروع میں مولوی برکت علی بھی سر سیّد کے مخالف تھے۔ مگر پھر بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ جیسے انگریز ہندوستان میں آئے تھے، ویسے ہی دنیا کے بہت سے ملکوں پر قابض ہوئے تھے۔ اس کے نتیجے میں انگریزی کو پوری دنیا میں فروغ حاصل ہوا تھا۔ اب اس زبان میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا اور بے بنیاد پروپیگنڈا ہو رہا تھا...... اور وہ بہت موثر تھا کیونکہ یک طرفہ تھا۔ اس کی تردید کرنے والا، اس کا مدلل جواب دینے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ مسلمان تو انگریزی سے ناواقف تھے۔ انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ حضورؐ کے اور اسلام کے خلاف کیسی کیسی ہرزہ سرائیاں ہو رہی ہیں اور تردید نہ ہونے کے نتیجے میں، جہاں انگریزی پڑھی نہ سمجھی جاتی تھی، وہاں اسلام کے متعلق لغو تصورات فروغ پا رہے تھے۔ اسلام کو ظالمانہ دین سمجھا جا رہا تھا۔

سر سیّد نے ایک طرف تو علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی اور دوسری طرف انھوں نے اور ان کے رفقاء نے اس مذموم اور جھوٹے پروپیگنڈے کا جواب دینا شروع کیا...... اور وہ بھی منہ توڑ مدلل جواب۔

یہی فرماتے رہے، تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا، توپ سے کیا پھیلا ہے

تب مسلمانوں کو احساس ہوا کہ بے خبری میں ان کے اور ان کے دین کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ جہالت کی دھند چھٹنے لگی۔

پھر قرآن پاک کا انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں ترجمے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جاہل مولویوں نے اس پر بڑا واویلا مچایا، فتوے لگائے۔ لیکن مولوی برکت علی کو ہوش آ گیا۔ وہ تو ہر چیز کو قرآن پاک کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور قرآن میں اللہ نے جگہ جگہ فرمایا تھا کہ یہ قرآن سراسر ہدایت ہے تمام انسانوں کے لیے...... روشنی ہے پوری انسانیت کے لیے۔ تو پھر یہ مسلمانوں کا فرض نہیں کہ قرآن کو تمام انسانوں تک پہنچانے کا اہتمام کریں؟ اس زبان میں اللہ کے اس پیغام کو منتقل کر کے پہنچائیں، جو زبان لوگوں کی ہو۔ تو یہ دوسری زبانوں میں قرآن کا ترجمہ گناہ نہیں، فرض ہے اور فرض کو پورا نہ کرنا گناہ۔

دوسری بات مولوی برکت علی نے قرآن سے یہ سمجھی کہ کسی زبان سے نفرت کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اللہ نے سورۃ الرحمٰن میں فرمایا ہے۔ ہم نے انھیں بولنا سکھایا۔ گویا دنیا میں جتنی بھی زبانیں بولی جاتی ہیں، سب اللہ نے ہی انسان کو سکھائی ہیں۔

سرسید کی تحریک کامیاب رہی۔ دشمنانِ اسلام کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کی لغو اور بے بنیاد باتوں کو بآسانی رد کیا جا سکتا ہے اور اتنی آسانی سے رد کیے جانے کے نتیجے میں ان کی پوزیشن خراب ہو رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ محتاط ہوئے اور ان کی ہرزہ سرائیاں محدود ہوئیں۔ ترجمے کے نتیجے میں قرآن پاک اور اسلامی لٹریچر دنیا بھر میں پہنچا اور ہزاروں انسانوں نے اللہ کی ہدایت سے استفادہ کیا۔ وہ صحیح معنوں میں احیائے اسلام کی تحریک تھی۔

خود مولوی برکت علی نے بڑے ذوق و شوق سے انگریزی سیکھی۔ تب ان کی آنکھیں کھلیں کہ دشمنانِ اسلام غیر جانب دار لوگوں کے سامنے اسلام کا کتنا خراب امیج بنا رہے تھے۔

لیکن مسلمانوں میں ایک خرابی ہے...... بھیڑ چال کی۔ وہ آنکھیں بند کر کے ایک راستے پر چلتے ہیں تو چلتے ہی جاتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی کو قبول کیا تو اس کے ساتھ انگریزی کلچر کی تقلید اندھا دھند کرنے لگے۔ شعار میں انگریزوں کی نقالی ہونے لگی۔ عربی کو غیر ملکی زبان سمجھ لیا گیا۔ جو تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی، اسے غیر ضروری سمجھ لیا گیا۔ وہ انگریزی پڑھنے کا بنیادی مقصد اور غرض و غایت بھول گئے۔ اس کے نتیجے میں وہ خود دین سے دور ہونے لگے۔

مولوی برکت علی جلنے کڑھنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ ان کے اپنے لیے روزگار کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ چار ٹیوشن پکڑ لیتے تو کشادگی کے ساتھ گزر بسر ہو سکتی تھی۔ یہ اسکول بہت بڑا تھا۔ اس لیے یہاں پھر بھی عربی کے اسٹوڈنٹ موجود تھے۔ ورنہ عام اسکولوں میں تو عربی کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہی ہو چکا تھا۔

ایسے میں پرنسپل صاحب کی وساطت سے انھیں اس ٹیوشن کی آفر ہوئی تو وہ افسردہ بھی ہوئے، خوش بھی اور متجسس بھی۔ انھیں بتایا گیا کہ عربی پڑھنے کا یہ شوقین طالب علم راجپوت ہے۔ یہ ان کے لیے عبرت کی بات تھی، افسردگی کی بات تھی کہ کسی مسلمان بچے [illegible] تو یہ [illegible] نہیں ہوا۔

ایک ہندو عربی پڑھنا چاہتا ہے، اس پر انھیں خوشی بھی ہوئی۔ مگر ان کا تجسس بہت بڑا تھا۔ ایک ہندو کو عربی پڑھنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ بہرحال انھوں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

چھٹیاں شروع ہونے سے ایک دن پہلے وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ اور اوتار سنگھ سے ملے۔ ٹھاکر نے ان سے فیس کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بولے۔ ''فیس کی کوئی بات نہیں۔ جو آپ خوشی سے دیں گے، میرے لیے بہت کافی ہوگا۔''

ٹھاکر ان کے اس جواب سے بہت متاثر ہوا۔ ''تو آپ گرمی کی چھٹیاں ہمارے ساتھ گزاریں گے؟''

''جی ہاں۔ لیکن پہلے میں برخوردار سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور۔''

مولوی صاحب نے اوتار سنگھ کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ انھیں بہت اچھا لگا۔ اس کی کشادہ پیشانی غیر معمولی طور پر روشن تھی۔ آنکھیں بے حد چمک دار اور متجسس اور اس کے چہرے پر عجیب سی پاکیزگی تھی۔ وہ انھیں متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے ان کی پوچھ گچھ کا منتظر ہو اور لگتا تھا کہ وہ ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ اسے منع نہ کر دیں۔

''بیٹا...... آپ کو اچانک یہ خیال کیوں آیا کہ آپ کو عربی پڑھنی چاہیے۔'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

وہ سٹپٹا گیا۔ ''جی...... وہ...... بس میرا دل چاہتا ہے عربی پڑھنے کو۔''

''بغیر کسی وجہ کے؟''

''جی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کو زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھنی چاہئیں۔'' اس بار اوتار سنگھ نے اعتماد سے کہا۔

مولوی صاحب کے لیے یہ جواب تسلی بخش تھا۔ لیکن ابھی ان کے پاس ایک اعتراض اور موجود تھا۔ ''تو یہ کام اسکول کھلنے کے بعد بھی ہو سکتا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں ہی کیوں؟ اب تم دس ماہ بعد گھر جاؤ گے۔ وہاں لوگوں سے ملنے جلنے، کھیلنے کودنے کو دل نہیں چاہے گا؟''

''جی میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں جلد سے جلد عربی پر دسترس حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''برخوردار، میں آپ کو بتا دوں کہ عربی جلد بازی میں سیکھی جانے والی زبان نہیں۔''

مولوی صاحب کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''دنیا میں سب سے سخت اور منضبط قواعد اس زبان کی ہے۔ اسے سرسری طور پر نہیں پڑھا جا سکتا اور یہ دو ماہ کا کام نہیں۔ برسوں لگیں گے اس میں۔'' اور یہ بڑی محترم زبان ہے۔''

''میں شاید اپنی بات واضح نہیں کر سکا۔'' اوتار سنگھ نے بے حد عاجزی سے کہا۔ ''میں

بس بہت بے تاب ہوں۔ میرے اندر بڑی لگن ہے اس کے لیے۔"

مولوی صاحب کے چہرے پر نرمی چھا گئی۔ یہ بے تابی تو انھوں نے پہلے ہی دیکھ لی تھی۔ انھیں احساس ہو رہا تھا کہ انھیں ایک مثالی شاگرد مل رہا ہے۔ "ٹھیک ہے اوتار سنگھ، ہم بھی آپ کو پوری لگن سے پڑھائیں گے۔"

"تو کل آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں؟" ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔

"جی ہاں انشاء اللہ۔ میں کل صبح اپنا ضروری سامان لے کر یہاں آ جاؤں گا۔" مولوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

ٹھاکر نے جیب سے کچھ رقم نکالی اور گن کر ان کی طرف بڑھائی۔

مولوی صاحب نے نوٹوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ "یہ کیا؟" انھوں نے پوچھا۔

"چار سو روپے آپ کی دو ماہ کی فیس اور یہ دو سو روپے ضروری کتابوں، لغات وغیرہ کی خریداری کے لیے۔"

مولوی صاحب مسکرائے۔ "جو رقم میں نے ابھی کمائی نہیں، وہ کیسے لے لوں۔" انھوں نے کہا۔ "فیس تو میں مہینہ پورا ہونے کے بعد لوں گا۔ ہاں کتابوں کے پیسے دے دیجیے۔ وہ میں آج خرید لوں گا۔"

ٹھاکر مسکرا دیا۔ "مجھے خوشی ہے کہ میرے بیٹے کو آپ سا استاد ملا۔"

❀......❀......❀

پڑھائی شروع ہوئی تو مولوی برکت علی کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ انھیں کیسا شاگرد ملا ہے۔ ان کی زندگی درس و تدریس میں گزری تھی۔ انھیں بہت اچھے، علم کی لگن رکھنے والے، محنتی شاگرد بھی ملے تھے، جن پر وہ آج بھی فخر کرتے تھے۔ مگر وہ سب اس شاگرد کے سامنے ہیچ تھے۔ وہ حصول علم کے لیے پڑھتے تھے۔ لیکن یہ لڑکا تو جیسے پڑھتا نہیں تھا۔ یہ تو عربی سے عشق کرتا تھا۔ وہ پڑھاتے اور وہ والہانہ انداز میں سنتا۔ ذہن اس کا ایسا تھا، یا پھر یہ عشق کا کمال تھا کہ انھیں کبھی کوئی بات دہرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ جو سنتا، اسے ذہن نشین کر لیتا۔

سو زبان رسولؐ سے عشق کرنے والے مولوی برکت علی کو اپنے اس شاگرد سے محبت ہو گئی۔ مگر وہ متجسس تھے۔ عربی زبان سے اس ہندو لڑکے کی محبت ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ یہ اسے کیسے ہو گئی، کہاں سے مل گئی؟ ان کے پاس اس سوال کا اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ یہ بس اللہ کی عطا ہے۔ وہ جسے چاہے نواز دے۔ کبھی کبھی انھیں خیال آتا کہ یہ لڑکا مسلمان ہوتا تو یقیناً اسے بڑا مرتبہ ملتا۔

وہ شہر کے رہنے والے تھے۔ گڑھی کو دیکھ کر انھیں حیرت ہوئی۔ وہاں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی حیثیت بادشاہ جیسی تھی اور اوتار سنگھ گویا کوئی شہزادہ تھا۔ لیکن ان دونوں کے ہی مزاج میں

حاکمیت نہیں تھی۔ ٹھاکر کا دبدبہ تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ لیکن وہ بھی کسی پر حکم نہیں چلاتا تھا۔ اور اوتار سنگھ کو تو پڑھنے کے سوا کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔

مولوی صاحب کو عربی پڑھانے کا شوق تھا۔ لیکن اوتار سنگھ کا عربی پڑھنے کا شوق ان سے کہیں زیادہ تھا۔ ایک ہفتے میں یہ نوبت آ گئی کہ وہ پڑھانے سے تھکنے لگے۔ لیکن لڑکا کسی جن کی طرح آ دھمکتا۔ وہ تو جیسے تھکتا ہی نہیں تھا۔

ایک ہفتے میں مولوی صاحب نے اسے اتنا پڑھایا تھا کہ ذہین ترین شاگرد کو وہ پڑھنے میں ایک ماہ لگتا۔ انھیں اس کی رفتار غیر فطری لگی۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ایسا شوق تیزی سے ختم بھی ہو جاتا ہے اور یہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ پھر یہ بھی ان کی ذمے داری تھی کہ دیکھیں کہ پڑھایا ہوا اسے ہضم بھی ہوا ہے یا نہیں اور وہ اس سرکش تیز رفتار دریا کے سامنے بند بھی باندھنا چاہتے تھے۔

چنانچہ دسویں دن انھوں نے اسے پڑھانے کے بجائے اس کا ٹیسٹ لینے کا فیصلہ کیا۔ "میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ پڑھا ہے، وہ تمھارے اندر اترا بھی ہے یا نہیں۔" انھوں نے اس سے کہا۔ "میں امتحانی پرچا بناتا ہوں۔ اسے حل کر کے دکھاؤ۔"

اوتار سنگھ اعتراض کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو سراپا سپردگی تھا۔

مولوی صاحب نے بڑا طویل پرچا بنایا۔ جو کچھ پڑھایا تھا، وہ سب کچھ اس میں موجود تھا۔ اتنے طویل تو امتحانی پرچے بھی نہیں ہوتے۔

وہ پرچا اسے تھما کر وہ مطمئن ہو گئے اور اطمینان سے پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب اس دن کے لیے فرصت ہی فرصت ہے۔ دس دن میں پہلی بار انھوں نے سکون سے پاؤں پھیلائے تھے۔ ان پر غنودگی طاری ہو گئی۔

نجانے کتنی دیر ہوئی۔ غنودگی میں انھیں احساس ہوا کہ کوئی ان کے پاؤں دبا رہا ہے۔ ہاتھوں کا لمس جانا پہچانا تھا۔ ان کا یہ شاگرد دہرا اعتبار سے عجیب تھا۔ پہلی رات سے اس نے معمول بنا لیا تھا کہ وہ سونے کے لیے لیٹتے تو وہ ان کے پاؤں دباتا۔ انھیں نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کب ان کے کمرے سے گیا کیونکہ اس وقت تک وہ سو چکے ہوتے۔

تو اس وقت غنودگی کے عالم میں انھیں یہی خیال ہوا کہ یہ رات کا وقت ہے۔ وہ سونے کے لیے لیٹے ہیں اور اوتار سنگھ ان کے پاؤں دبا رہا ہے۔ مگر کچھ دیر کے بعد انھیں یاد آیا کہ انھوں نے تو اسے پرچا بنا کر دیا تھا...... ایسا پرچا، جسے حل کرنے میں دو دن لگتے۔

شاید کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھ بیٹھے۔ "کیا بات ہے اوتار سنگھ۔ کچھ مشکل ہو رہی ہے۔" انھوں نے نندا سی آواز میں پوچھا۔

"نہیں مولوی صاحب۔"

"تو پھر کام کیوں نہیں کرتے؟"

''جی...... کام تو میں نے کرلیا ہے۔''

مولوی صاحب کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔غنودگی ہوا ہوگئی۔''دکھاؤ مجھے۔'' انھوں نے کہا۔

اوتار سنگھ نے کاپی ان کی طرف بڑھادی۔

مولوی صاحب نے کام چیک کرنا شروع کیا اور حیران رہ گئے۔کہیں کوئی غلطی نہیں تھی اور اس نے پورا پرچا حل کرلیا تھا۔

مولوی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔اس لڑکے میں کوئی بات ہے...... بھڑک کر تیز جلنے والے چراغ جیسی، جو جلدی بجھ بھی جاتا ہے۔وہ تشویش میں پڑ گئے۔ان کا باندھا ہوا بند بھی اسے روکنے میں ناکام رہا تھا۔تو اب اور کیا کریں؟ پھر انھوں نے سوچا کہ یہی طریقہ کافی ہے۔بس اس کی رفتار کم کرنی ہوگی۔

اس کی حوصلہ شکنی کرنا زیادتی ہوتی بلکہ اس کی تو حوصلہ افزائی ضروری تھی۔چنانچہ انھوں نے کہا۔''شاباش اوتار سنگھ۔تم ہونہار اور قابل فخر شاگرد ثابت ہو رہے ہو۔لیکن ایک کمی ہے تمھارے اندر؟''

اوتار سنگھ نے کچھ نہیں کہا۔بس انھیں مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

''رائٹنگ کی طرف توجہ دو۔تحریر کی خوبصورتی بھی بہت اہم ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کو خود احساس ہوا کہ وہ زیادتی کر رہے ہیں۔مگر یہ ضروری تھا۔''کام کرتے ہوئے کبھی جلدی نہ کرو۔ہاتھ روک کر لکھو۔خوب سوچ کر جواب دو۔کام میں خوبصورتی ہونی چاہیے۔''

''جی مولوی صاحب۔آئندہ خیال رکھوں گا۔''

مولوی صاحب کو ادراک ہوگیا کہ اب وہ مزید پڑھانے کی فرمائش کرنے والا ہے۔اس سے پہلے ہی انھوں نے کہا۔''تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔اب تم جاؤ۔آج کی چھٹی۔اب کل پڑھیں گے۔''

اوتار سنگھ ہچکچایا اور بادل نخواستہ اٹھ گیا۔

لیکن مولوی صاحب عصر پڑھ کر بیٹھے ہی تھے کہ وہ پھر آ گیا۔یہ بھی ایک عجیب بات تھی۔عصر اور مغرب کے درمیان اس کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔اور وہ اس وقت میں لازمی طور پر ان کے پاس آتا تھا۔اس وقت میں وہ کھویا کھویا رہتا تھا۔لگتا تھا، ہمہ تن سماعت ہے۔کہیں دور کی کوئی آواز سن رہا ہے۔

''کیسے آئے اوتار سنگھ؟'' مولوی صاحب نے بڑی بے رخی سے کہا۔

''یونہی مولوی صاحب...... ''

''میں نے کہا تھا نا کہ آج کی چھٹی۔''

''میں پڑھنے نہیں آیا۔کچھ سنائیں مجھے عربی میں۔''

شام کے اس وقت میں وہ ہمیشہ یہی فرمائش کرتا تھا۔مولوی صاحب کو پہلے دن اس کا اس وقت آنا بہت گراں گزرا تھا کیونکہ وہ ان کی تلاوتِ قرآن پاک کا وقت تھا۔وہ بہت جھنجلائے۔پھر انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ بلند آواز میں قرآن پڑھا جائے۔اپنا معمول بھی پورا ہو جائے گا اور شاگرد کی فرمائش بھی۔اس خیال پر پہلے تو وہ ڈرے۔وہ ایک راجپوت کے گھر میں تھے۔مگر پھر انھوں نے سوچا کہ یہ کیسے پتا چلے گا کہ وہ قرآن پڑھ رہے ہیں۔چنانچہ وہ قرآن سنانے بیٹھ گئے۔پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔

اس وقت بھی انھوں نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کردی۔

مولوی برکت علی حافظ قرآن بھی تھے۔بڑی خوبصورت قرات کرتے تھے۔قرات کرتے کرتے ان پر کیفیت طاری ہو جاتی۔تاہم اس کیفیت سے پہلے وہ اوتار سنگھ کو بہت غور سے دیکھتے۔اس کے چہرے پر انہماک ہوتا۔آنکھیں کسی غیر مرئی شے پر جمی ہوتیں اور ان میں چمک ہوتی۔مگر اسے دیکھ کر احساس ہوتا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔کہیں اور بیٹھا، کچھ اور سن رہا ہے۔

اس روز بھی اسے دیکھتے دیکھتے ان پر کیفیت طاری ہوگئی۔

❁......❁......❁

گرمی کی چھٹیوں کے لیے دہلی سے روانہ ہوتے وقت اوتار سنگھ کا عجیب حال تھا۔آخری رات وہ بہت دیر تک کوٹھے پر بیٹھا۔وہ پورے چاند کی رات تھی۔ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی اور روشن روشن تھی۔وہ بہت اداس تھا۔دو ماہ کی جدائی کا خیال روح فرسا تھا۔اس شام اس نے وہ آواز سنی اور سوچا کہ اب وہ دو ماہ تک یہ آواز نہیں سن سکے گا۔اس خیال کے ساتھ ہی اداسی اس کے وجود میں تیر گئی۔دو ماہ...... ساٹھ دن! یہ تو بہت بڑا عرصہ ہے۔کون جانے، اس عرصے میں کیا ہو جائے۔

پھر اسے خود بھی اس بات پر حیرت ہوئی کہ جس کے لیے وہ تڑپ رہا ہے، جس کی جدائی سے وہ ڈر رہا ہے، وہ اس سے کبھی نہیں ملا ہے۔نہ کبھی اسے دیکھا ہے۔اس رات اس نے پہلی بار یہ سوچا کہ اگر وہ بدصورت ہوئی تو کیا ہوگا۔

اس پر وہ دیر تک سوچتا رہا۔بنیادی طور پر وہ حسن پرست تھا۔خوبصورتی کسی بھی شکل، کسی بھی روپ میں ہو، اسے بہت زیادہ متاثر کرتی تھی۔کوئی حسین منظر دیکھتا تو اس کی آنکھیں خود بخود بھیگ جاتیں۔اندر عجیب سی کیفیت ہو جاتی۔پھر وہ اندر سے بھی بھیگ جاتا۔اس کے اندر ستائش، بے پایاں ستائش ابھرتی...... اس منظر کے خالق کے لیے، جس نے وہ خوبصورتی پیدا کی۔پھر وہ شکر ادا کرتا۔زندگی دینے والے کا۔اگر اسے زندگی نہ ملی ہوتی تو وہ یہ خوبصورت کیفیت کا اسے کیسے تجربہ ہوتا۔سب قیمتی زندگی کے ہی دم سے تو ہیں۔زندگی نہیں تو کسی نعمت سے اس کا کیا

واسطہ۔

پہلے اس نے اس پر سوچا ..... اور ایک لمحے میں اپنے اس خیال کو پوری شدت سے مسترد کر دیا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ جس کی آواز اتنی خوبصورت ہے، وہ بدصورت نہیں ہوسکتی۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی اس محبت کی بنیاد اس امکان پر رکھ رہا ہے کہ وہ اپنی آواز کی ہی طرح خوبصورت ہوگی۔ جبکہ یہ امکان ہے، یقینی امر نہیں۔ اسے لگا کہ وہ کسی بہت بڑے محل کی بنیاد پانی پر رکھ رہا ہے۔

پہلے تو یہ سوچنا ضروری تھا کہ وہ محبت ہے بھی یا نہیں۔ پہلے تو یہ خیال اسے بے حد توہین آمیز لگا۔ مگر پھر اس کی اہمیت اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے شاعری کی مدد سے اور اپنے خیالات اور تصورات کی بنیاد پر جو محبت کا خاکہ بنایا تھا، یہ اس کا جذبہ اس پر پورا اترتا تھا۔ اس میں بے تابی تھی، تڑپ تھی، پاکیزگی تھی اور صورتِ حال کیسی ہی ہو..... اور چاہے تکلیف ہو، اس میں بھی خوبصورتی تھی۔ اب اس وقت کے جدائی کے دکھ ہی کو لے لو۔ یہ بھی خوبصورت ہے۔ اس سے دور جانے کے خیال سے جو اذیت ہوتی ہے، اس میں بھی خوبصورتی ہے۔ نہیں بھئی، یہ تو سراسر محبت ہے۔ اس نے طمانیت سے سوچا۔ میرا جی تو چاہتا ہے کہ اس آواز والی کو دیکھوں۔ مگر دیکھنے کی ایسی تڑپ نہیں کہ پاگل کر دے۔

سوال وہی تھا کہ اگر وہ بدصورت ہوئی تو کیا اس کے محسوسات، اس کے جذبات یہی رہیں گے اور یہ بڑا مشکل سوال تھا۔ ایک دلیل اس کے حق میں تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے بھی تڑپا نہیں تھا۔ اس نے کبھی چھپ کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گویا اس کی صورت شکل کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔

بہرحال بہت سوچنے پر بھی اسے اس کا حتمی جواب نہیں مل سکا۔ اس نے سوچا کہ یہ فکر بے کار ہے۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔ جب وہ اسے دیکھے گا۔ اگر وہ بدصورت ہوئی اور اس کا جذبہ اسے دیکھنے کے بعد کمتر ہوگیا تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ محبت نہیں ہے اور ایسا ہوا تو اسے بہت دکھ ہوگا۔ وہ صدمہ ہوگا اس کے لیے۔

اس دوران اس کی حقیقت پسندی نے اسے یہ احساس بھی دلایا تھا کہ وہ ایک کم عمر لڑکا ہے، جو محبت کے بارے میں محض نظریات قائم کیے بیٹھا ہے۔ یہی نہیں، وہ محبت کا متمنی بھی ہے۔ گویا وہ ایک ایسا نوجوان ہے، جسے محبت سے محبت ہے۔ جو پہلا موقع ملنے پر ہی کسی سے بھی محبت کر سکتا ہے۔ یہ خیال بھی کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔

بہرکیف دہلی میں اس آخری رات وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سویا۔ اسے ڈر تھا کہ صبح روانگی کے وقت وہ رو پڑے گا۔ اور یوں شاید اس کا بھید کھل جائے۔ لیکن روانگی کا وقت آیا تو اس کی کیفیت بالکل مختلف تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوش ہے اور اس خوشی کا سبب مولوی

برکت علی تھے۔ یہ خیال تھا کہ وہ دور جا رہا ہے۔ لیکن وہاں وہ اجنبی زبان سیکھ سکے گا، جو اس کی محبت کی زبان ہے۔ پھر ایک دن آئے گا کہ وہ اس کی بات سمجھ سکے گا۔ یہ کم خوشی کی بات نہیں۔ یہ تو مولوی صاحب نے اسے بتا دیا تھا کہ عربی بڑی مشکل زبان ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میری محبت، میری لگن، میری تڑپ اس مشکل کو آسان کر دے گی۔

دہلی سے نکلتے ہی وہ گھر پہنچنے کے لیے تڑپنے لگا۔ پڑھائی جو شروع کرنی تھی۔

پڑھائی شروع ہوئی تو اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب جیسے عربی پڑھنے اور سیکھنے کے سوا دنیا میں اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہی اس کے لیے وصال یار تھا اور وہی عبادت۔ پہلی بار جب اس نے مولوی صاحب کو عربی بولتے سنا تو اسے ان سے محبت ہوگئی۔ اس نے سوچا، یہ اس کے لیے کتنا بڑا کام کر رہے ہیں۔ اسے محبوب کی بات سمجھنے کے قابل بنا رہے ہیں۔ اس خدمت کا تو کوئی صلہ ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر گڑھی میں پہلی شام آئی ..... وہ وقت جب وہ کوٹھے پر جاتا تھا..... وہ آواز سنتا تھا۔ وہ وقت آیا تو وہ بے تاب ہوگیا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلا..... کوٹھے پر لے جانے والے زینے کی طرف بڑھنے کے لیے۔ لیکن وہ تو وہاں تھا ہی نہیں۔ وہ گڑھی میں تھا، دہلی میں نہیں۔ اس کی بے تابی وحشت میں بدل گئی۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ دیوار سے سر ٹکرائے۔ بس ایسا ہو جائے کہ وہ آنکھیں بند کرے اور کھولے تو وہ دہلی میں ہو..... اس کوٹھے پر۔ اور وہ آواز سورج کی طرح طلوع ہو..... پھر دھوپ کی طرح پھیلتی..... چڑھتی جائے۔ یہاں تک کہ ہر چیز پر چھا جائے۔ دنیا میں کچھ بھی نہ رہے اس کے سوا۔

اس وحشت میں بھی اسے احساس تھا کہ یہ ان ہونی ہے۔ وحشت سے فاصلے نہیں مٹتے۔ وحشت تو حد درجہ بے بسی کا ردعمل ہے..... بے بسی کی آخری حد، جس کو پہنچ کر آدمی نقصان تو اٹھا سکتا ہے، دوسروں کو نقصان پہنچا بھی سکتا ہے۔ لیکن جو وہ چاہتا ہے، وہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ مگر اس احساس میں بھی کوئی تسلی نہیں تھی۔ اس نے جان لیا کہ یہ وحشت دور کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا اور وہ اس کمرے کی طرف چل دیا، جو مولوی صاحب کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ بس ایک اندھی، گونگی، بہری خواہش تھی جو طوفان کی طرح اس کے اندر امنڈ رہی تھی..... اسے دہلی جانا ہے، وہ آواز سننی ہے۔

مولوی صاحب اپنے کمرے میں کھڑے کسی کپڑے کو تہ کر رہے تھے (اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جاء نماز ہے) انھوں نے چونک کر اسے دیکھا..... اور دیکھتے رہ گئے شاید اس کے چہرے پر انھیں اس کے اندر امنڈنے والے طوفان کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا بات ہے اوتار سنگھ؟'' انھوں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

اوتار سنگھ کے اندر بے تابی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لفظ اسے مل ہی نہیں سکتے تھے۔ ''وہ مولوی صاحب... عربی... ''اس نے بمشکل کہا۔

مولوی صاحب کے چہرے پر سرد مہری اور بے رخی کی سختی ابھر آئی۔ تاہم انھوں نے لہجے کو سخت نہیں ہونے دیا۔ ''میں نے تمھیں صبح ہی بتا دیا تھا بیٹے کہ پڑھائی ٹائم ٹیبل کے مطابق ہوگی اور یہ کہ پڑھانے والا میں ہوں۔ ہر فیصلہ میرا ہوگا۔''

لہجہ نرم تھا۔ لیکن لفظ بہت سخت تھے اور ان میں قطعیت تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اوتار سنگھ میں آگے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ لیکن اس وقت تو وہ ایک ٹرانس میں تھا۔ یہی بہت بڑی بات تھی کہ اس وحشت میں بھی وہ حفظ مراتب کو نہیں بھولا۔ حد ادب اسے یاد رہی۔ ''جی مولوی صاحب، مجھے یاد ہے۔'' اس نے بھڑکتی آواز میں کہا۔ ''لیکن...''

''لیکن کیا؟''

''میں پڑھنے نہیں آیا ہوں۔ آپ مجھے عربی میں کچھ سنا دیجیے... شاعری... کوئی کہانی... کچھ بھی۔''

مولوی صاحب کے لیے وہ فرمائش خلاف توقع تھی۔ ''لیکن ابھی تم اس قابل کہاں ہو کہ عربی میں کچھ سمجھ سکو۔ ابھی تو تم نے پورے حروف بھی نہیں پڑھے ہیں۔''

''بس آپ مجھے سنا دیجیے کچھ۔ آپ کی مہربانی ہوگی مجھ پر۔''

چند لمحے کے لیے مولوی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انھوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں سناتا ہوں۔ مگر ادب سے سننا۔ کوئی آواز نہ ہو۔''

''جی مولوی صاحب۔''

اور مولوی صاحب نے پڑھنا شروع کر دیا۔

جیسے ہی وہ اجنبی الفاظ اوتار سنگھ کے کان میں پڑے، اس کے اندر کا منظر دھیرے دھیرے بدلنے لگا۔ اندر بھڑکتی ہوئی وحشت کی آگ آہستہ آہستہ سرد ہونے لگی۔ بے تابی سکون میں بدلنے لگی۔ تڑپ ختم ہوتی گئی اور اس کی جگہ سپردگی نے لے لی۔ اندر کا ہی نہیں، باہر کا منظر بھی بدلنے لگا۔ وہ کمرا غائب ہو گیا۔ اب اس کی جگہ بے کراں صحرا تھا... متحرک صحرا، جو آگے بڑھتا ہوا کہیں اور جا رہا تھا۔ پھر صحرا تھم گیا۔ اب وہ خود متحرک تھا۔ چند لمحے بعد اسے دہلی کی جامع مسجد کے مینار نظر آئے... اور اگلے ہی لمحے وہ اس کوٹھے پر تھا، جو اس آواز سے معمور تھا اور اب وہ پوری طرح پرسکون تھا... اور وہ آواز سن رہا تھا، جو لگتا تھا کہ پوری کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔

اسے دبا دبا سا سہی، مگر یہ احساس تھا کہ وہ اپنی حویلی میں، مولوی صاحب کے کمرے میں ہے۔ اور جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، حقیقت نہیں، تصور ہے۔ مگر وہ اتنا حقیقی لگ رہا تھا کہ اس نے زور زور سے آنکھیں مل کر دیکھا۔ اصولاً کوٹھے کے اس منظر کو ہٹ جانا تھا اور مولوی صاحب کے

کمرے کو نظر آنا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تو کیا میں سچ مچ اس کوٹھے پر ہوں۔ اس نے خود سے پوچھا۔ مولوی صاحب اور ان کا کمرا نظر نہیں آ رہا ہے اور تو اور مولوی صاحب کی آواز بھی نہیں ہے۔ یہ تو وہی آواز ہے۔ لیکن اس کے ذہن کا ایک چھوٹا سا حصہ اس کی تردید کر رہا تھا۔

چند لمحے اور گزرے تو اس نے خود کو اس رو کے سپرد کر دیا۔ اب کہیں کوئی خیال، کوئی احساس نہیں تھا۔ بس وہ کوٹھے پر بیٹھا وہ آواز سن رہا تھا۔

اس کیفیت میں جیسے زمانے گزر گئے۔ پھر اچانک ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ وہ آواز معدوم ہو گئی تھی۔ کائنات جیسے تھم گئی اور وہ بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔

پھر جیسے پرسکوت جھیل میں کوئی چھوٹا سا کنکر گر کر اسے متلاطم کر دیتا ہے، اس کی سماعت کو ایک آواز نے جھنجوڑ دیا۔ ''اوتار سنگھ۔''

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ مولوی صاحب تھے۔ مگر وہ خود ابھی تک اس سحر انگیزی میں گرفتار تھا۔ مولوی صاحب کا کمرا نظر آیا تو اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ خاموشی سے، کھوئی کھوئی آنکھوں سے انھیں تکتا رہا۔

''اب تم جاؤ۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔''

''اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس وہ اٹھ کر کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل آیا۔

اس شام وہ مولوی صاحب کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے مولوی صاحب سے ایسی محبت محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے آواز والی کے سوا کسی سے نہیں کی تھی۔ وہ بار بار سوچتا کہ آج مولوی صاحب نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ وہ تو اس کوٹھے پر پہنچنے کی لگن میں پاگل ہو جاتا۔

پھر وہ اپنی اس کیفیت کے بارے میں سوچنے لگا۔ مولوی صاحب جب پڑھ رہے تھے تو وہ کتنا پرسکون، کتنا شانت ہو گیا تھا۔ اور مولوی صاحب بالکل اس نیچے والی لڑکی کے انداز میں پڑھ رہے تھے۔ پھر کیا ہوا کہ آواز کا فرق مٹ گیا۔ وحشت ختم ہو گئی اور وہ پرسکون ہو گیا۔

تو کیا یوں ہے کہ اہمیت آواز کی نہیں۔ آواز تو محض ایک وسیلہ، ایک بہانہ ہے۔ تو کیا یوں ہے کہ اصل اہمیت الفاظ کی ہے، جنھیں وہ سمجھتا نہیں، نفس مضمون کی ہے، جس کا مفہوم وہ نہیں سمجھتا، پھر بھی وہ اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تو وہ کیسے لفظ ہوں گے۔ وہ کیسا مضمون ہوگا، جو سمجھ میں نہ آنے پر بھی آدمی کی دنیا بدل دے!

بات بہت بڑی، مگر بہت آسان تھی۔ کم از کم اس کے لیے کیونکہ وہ بچپن ہی سے سوچنے اور تجزیہ کرنے کا عادی تھا۔ لیکن آنکھوں پر محبت کا رنگ چڑھ جائے تو سامنے کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔ شاید ابھی وہ اس بڑی بات کے لیے بہت چھوٹا تھا۔

بلکہ اصل بات شاید یہ تھی کہ ابھی سمجھنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ سمجھنے کا بھی تو ایک وقت مقرر ہے۔

بہر حال اوتار سنگھ کی سمجھ میں یہ ضرور آ گیا کہ مولوی صاحب اسے وہ کچھ دے رہے ہیں اور دینے والے ہیں، جو بہت بڑا ہے، جو کوئی کسی کو نہیں دیتا اور اس کے صلے میں وہ جو کم سے کم انھیں دے سکتا ہے، محبت ہے اور محبت تو اسے ان سے خود بخود ہو گئی تھی۔

وہ آواز کو بھول کر مولوی صاحب کی محبت میں سرشار ہو گیا۔ رات کو وہ مولوی صاحب کے کمرے میں گیا۔ وہ سونے کے لیے لیٹے ہی تھے۔ مگر شاید اجنبی جگہ ہونے کی وجہ سے انھیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ پہلی بار وہ اپنی بیوی اور بچوں سے دور ہوئے تھے... اس کی وجہ سے۔ انھیں عجیب لگ رہا ہو گیا۔ اس کی محبت اور فزوں ہو گئی۔

وہ ان کے پاؤں دبانے لگا۔

مولوی صاحب کسمسائے۔ ''کیا کرتے ہو اوتار سنگھ۔ اس کی ضرورت نہیں۔''

''آپ کو ضرورت نہیں۔ مگر مجھے ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ مجھے جو کچھ دے رہے ہیں، اس کے بدلے میں میں زندگی سمیت سب کچھ آپ کو دے دوں تو کم ہے۔ یہ تو بہت معمولی خدمت ہے۔''

مولوی صاحب حیران رہ گئے۔ کیا یہ غیر مسلم لڑکا اس کی اہمیت کو سمجھتا ہے؟ کیسے؟ یہ تو کچھ جانتا ہی نہیں۔ بہر حال اوتار سنگھ کے سچے جذبے نے ان کے دل کو چھو لیا تھا۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''تم بہت اچھے ہو اوتار سنگھ۔'' انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اللہ تمھیں ہدایت سے نوازے اور اپنی راہ دکھائے۔''

اوتار سنگھ ان کی ٹانگیں دباتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو چکے ہیں تو وہ کمرے سے نکل آیا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ ٹھٹھک گیا۔ اسے پتا جی کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو اپنے کمرے میں اکیلے ہوں گے اور جاگ رہے ہوں گے۔ ابھی وہ مولوی صاحب کی خدمت کر کے آیا ہے۔ لیکن اسے کبھی پتا جی کا خیال نہیں آیا۔ کتابیں بتاتی ہیں کہ ماں باپ اور استاد کا ایک ہی درجہ ہوتا ہے اور وہ دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہوتے ہیں۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر ملامت ابھری۔ وہ فرض ادا کرنے میں، دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کتنا پیچھے ہے۔ وہ بس خود میں ہمیشہ گم رہا۔ اس نے کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچا۔ ارے پتا جی نے تو برسوں پہلے اپنی پتنی، میری ماتا کو کھو دیا تھا اور ان کے پاس تو میرے سوا کوئی بھی نہیں اور میں دہلی چلا گیا۔ میرے اور ماتا جی کے بغیر ان پر کیا گزری ہو گی۔ مولوی صاحب کو آج بیوی بچوں سے جدا ہوئے پہلا دن ہے تو انھیں نیند نہیں آ رہی ہے۔ تو کیا میرے پتا جی برسوں سے نہیں سوئے ہوں گے اور میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ بلکہ میں تو گرمی کی

یہ چھٹیاں دہلی میں گزارنا چاہتا تھا۔ صرف اس لیے کہ ہر روز وہ آواز سنتا رہوں۔ تو کیا محبت آدمی کو خود غرض اور بے پروا بنا دیتی ہے۔ نہیں محبت تو بہت عظیم جذبہ ہے۔

اوتار سنگھ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ محبت سچی ہو تو آدمی کو ہر شخص کے حقوق اور اپنے فرائض یاد دلاتی ہے۔ دل کو گداز اور عمل کو پھولوں کی سی نرمی بخشتی ہے۔ وہ لمحہ اوتار سنگھ کے لیے بہت بڑے انقلاب کا تھا۔

اس نے آنسو پونچھے اور ٹھاکر کے کمرے کی طرف چل دیا۔

ٹھاکر کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھا ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے بیٹے کو کمرے میں دیکھا تو اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ اس نے ڈائری بند کی، قلم ایک طرف رکھا اور مسکرایا۔

''کیسے ہو پتر؟''

''ٹھیک ہوں پتا جی۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''آپ سوئے نہیں۔''

''نیند تو مجھے کم ہی آتی ہے پتر۔'' ٹھاکر نے سادگی سے کہا۔

اوتار سنگھ کا دل کٹنے لگا۔ اس چھوٹے سے جملے میں بہت کچھ تھا۔ ماں کی موت کے بعد کے، اس کے تعلیم کے سلسلے میں دہلی چلے جانے کے بعد کے، باپ کے شب و روز کی پوری داستان تھا وہ جملہ۔ اسے دکھ ہوا کہ اس نے کبھی باپ کے تنہائی کے دکھ اور کرب کو محسوس کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کبھی اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔

ٹھاکر اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے پتر؟''

''کچھ نہیں پتا جی۔ آپ پاؤں پھیلا کر لیٹ جائیں۔ مجھے آپ کے پاؤں دبانے ہیں۔'' وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''نہیں پتر، اس کی ضرورت نہیں۔ تم جا کر سو جاؤ۔''

''پتا جی، آپ مجھے معاف کر دیں۔'' اوتار سنگھ نے شرمندگی سے کہا۔ ''مجھے آپ کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے نہیں رکھا۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی......''

ٹھاکر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نا پتر...... ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہاری پڑھائی میں میری بہت بڑی خوشی ہے۔''

''آپ لیٹیں تو۔ آپ کے پاؤں دبانے میں میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہو گی۔''

ٹھاکر چند لمحے ہچکچایا۔ پھر لیٹ گیا۔ اوتار سنگھ اس کے پاؤں دبانے لگا۔ اس سے پہلے اس نے روشنی گل کر دی تھی۔

بہت دیر ہو گئی۔ اوتار سنگھ پاؤں دباتا رہا۔ ٹھاکر کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند اسے آ ہی نہیں رہی تھی۔ یہ احساس الگ ستا رہا تھا کہ وہ بیٹے کو تکلیف دے رہا ہے۔ ذرا دیر بعد اس نے کسمساتے

ہوئے کہا۔ ''اب بس کرو پتر۔ تم تھک گئے ہو گے۔''

''اس کام میں تھکن نہیں ہو سکتی پتا جی۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں سچی خوشی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ ایسا سکون، ایسی خوشی، ایسی طمانیت اسے کبھی نہیں ملی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔ ''آپ سو جائیں۔ پھر میں چلا جاؤں گا۔''

''مجھے نیند کہاں آتی ہے پتر۔'' ٹھاکر نے بے بسی سے کہا۔ ''تم جا کر سو جاؤ۔''

''نہیں پتا جی۔ جب تک آپ سو نہیں جاتے، میں آپ کی ٹانگیں دباؤں گا۔''

کچھ دیر اور گزر گئی۔ پھر ٹھاکر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا پتر۔ میری ایک بہت بڑی خوشی ہے۔ وہ پوری کر دو۔''

''بولیں پتا جی۔''

''تم یہاں آ کر میرے ساتھ سو جاؤ۔''

اوتار سنگھ کو بہت حیرت ہوئی۔ لیکن اس نے جان لیا کہ ٹھاکر صرف اسے پاؤں دبانے سے روکنے کو، اسے ٹالنے کو یہ بات نہیں کر رہا ہے۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ جیسے وہ واقعی اس کے لیے بہت بڑی خوشی ہو۔ اس نے ہاتھ روک دیے اور بستر پر باپ کے ساتھ جا لیٹا۔

چند لمحے دونوں ذرا سے فاصلے پر لیٹے رہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فاصلہ تھا۔ اتنے قریب لیٹنے کے باوجود وہ اپنی اپنی جگہ تنہا تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف رخ کیے لیٹے تھے۔ ٹھاکر بیٹے کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

پھر ٹھاکر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو چھوا اور بولا۔ ''او یار اوتار سنگھ، ساتھ ایسے تو نہیں سوتے۔ مجھ سے لپٹ جا نا یار۔''

اوتار سنگھ کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ٹھاکر کی ٹوٹتی بکھرتی آواز اور لہجے کی وہ تڑپ اس کے لیے بالکل نئی چیز تھی..... اس کی فرمائش کی طرح۔ باپ کی محبت کا اسے ہمیشہ احساس رہا تھا لیکن اس کا اظہار اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ باپ سے لپٹ گیا..... چھوٹے سے بچے کی طرح!

''پتا جی کہتے تھے، ٹھاکر ہونا بڑا بھاری کام ہے۔'' اس نے باپ کی بھرائی ہوئی آواز سنی۔ ''ٹھاکر کو سخت ہونا چاہیے..... نرمی سے دور۔ ایک ٹھاکر کے لیے سب سے بڑی چیز آن ہے۔'' اس کی زبان ہے۔ محبت ٹھاکروں کے لیے نہیں بنی کیونکہ یہ کمزور کرنے والی شے ہے۔ محبت کرو تو اسے چھپا کر رکھو۔ اس کا اظہار مت کرو کبھی۔ پتر اوتار سنگھ پتا جی کی آگیہ کا پالن کرنا میرا دھرم تھا۔ میں نے ہمیشہ اچھا ٹھاکر بننے کی کوشش کی.....''

اوتار سنگھ حیرت سے باپ کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ٹھاکر تو میں بھی ہوں۔ مگر مجھے محبت کتنی عزیز ہے۔ کیسے میں محبت پر جان [illegible] اور کس طرح کی محبت ہوتی ہے

مجھے۔ اگر پتا جی کو اس کا پتا چل جائے تو؟ وہ غصہ ہوں گے؟

ٹھاکر اپنی کہے جا رہا تھا۔'' ..... لیکن میں اچھا ٹھاکر تھا ہی نہیں۔ کوشش کے باوجود بن بھی نہیں سکا۔ شاید اگر تم مجھے شادی کے ایک دو سال بعد مل جاتے تو میں اچھا ٹھاکر بن جاتا۔ مگر تم تو برسوں کی منتوں مرادوں اور ماتھا رگڑنے کے بعد ملے۔ ایسے میں کہیں آن رہ پاتی ہے! پھر بھی میں اچھا ٹھاکر بننے کی کوشش کرتا رہا۔ پر ہوا یوں کہ نہ میں اِدھر رہا نہ اُدھر۔ ٹھاکروں کو دوستی بہت راس آتی ہے۔ بدقسمتی سے میرا کوئی میتر بھی نہیں تھا۔ جمال دین سے دوستی کو بہت من کرتا تھا۔ پر میں جانتا تھا کہ وہ اپنے حال میں مست ہے۔ سدا میراثی رہے گا۔ متر کبھی نہیں بنے گا۔ سو جیون اکیلے ہی بیت گیا۔ میں تمہاری ماتا جی سے بہت پریم کرتا تھا۔ پر کبھی اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا، یہاں تک کہ وہ چلی گئی۔

اور اوتار سنگھ، تم سے میں نے محبت نہیں کی۔ تم تو میری جان تھے۔ تم میں میری جان تھی۔ پر میں نے تمھیں کبھی بتایا نہیں۔ آج بھی نہیں بتا رہا ہوں کبھی بھی نہیں بتاؤں گا۔ ٹھاکر کبھی یہ بات بتایا نہیں کرتے۔

مگر میں تم سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمھیں ٹھاکر بننے کی ضرورت نہیں۔ تم آزاد ہو۔ جو چاہو، کر سکتے ہو..... اور کرو۔''

ٹھاکر عجیب سے ڈوبتے لہجے میں بول رہا تھا اور اوتار سنگھ اس سے لپٹا ہوا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ حیران بھی تھا۔ لیکن پتا جی کی آخری بات سن کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ انھوں نے اس کی ایک بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔

وہ یہ سوچتا رہا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ ٹھاکر کی آواز تھم گئی ہے۔ جب اسے احساس ہوا اور اس نے باپ کے سینے سے سر ہٹا کر دیکھا تو پتا چلا کہ ٹھاکر سو چکا ہے۔ اس نے سوچا، اب وہ جب بھی یہاں ہوگا، پتا جی کے ساتھ ہی سویا کرے گا۔

کیدار ناتھ کی ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے دور پرے کی رشتے داری تھی۔ وہ ٹھاکر کے دیہانت کے بعد گڑھی میں وارد ہوا تھا۔ اسے زمین بھی دی گئی تھی رشتے داری کے ناتے اس کا شمار زمین داروں میں ہوتا تھا۔ مگر وہ زمین داری بہر حال ٹھاکر پرتاپ کی دی ہوئی تھی۔ ٹھاکر خون کے اعتبار سے اسے اپنا ہم رتبہ نہیں سمجھتا تھا۔ بس لحاظ کر لیتا تھا۔ کیدار ناتھ کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس کا خواب تو بڑا تھا۔ ٹھاکر کے اولاد نہیں تھی۔ کیدار ناتھ کو یقین تھا کہ ایک دن وہی ٹھاکر کا وارث ہوگا۔ ٹھاکر کے قریب رشتے دار سب زمین جائیداد والے تھے۔ ان کو ٹھاکر کی زمینوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ٹھاکر کی موت کے بعد وہ اسی کے حصے میں آتی۔

لیکن اوتار سنگھ کی پیدائش نے اس کے سب سپنے بکھیر دیے۔ اوتار سنگھ سے اس کا الگ ہی تعلق بن گیا۔ نفرت کا تعلق۔ اوتار سنگھ کو پتا نہیں تھا کہ کیدار ناتھ نے اس کی پیدائش کے لیے

سے لے کر آج تک اس سے صرف نفرت کی ہے۔ خالص نفرت! وجہ یہ تھی کہ اوتار سنگھ اس کے راستے کی دیوار بن گیا تھا۔ کیدار ناتھ ہر وقت سوچتا رہتا تھا کہ اس دیوار کو کیسے گرائے۔ لیکن کوئی اپائے نہیں سوجھتا تھا۔ براہ راست وار کرنے سے وہ ڈرتا تھا۔ بات کھل جائے، یہ اسے کسی طور گوارا نہیں تھا لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس روز کیدار حویلی چلا آیا۔ ٹھاکر پرتاپ تو موجود نہیں تھا، اوتار سنگھ سے ملاقات ہو گئی۔

''کہو چاچا جی، کیسے ہو؟'' اوتار سنگھ نے اس سے پوچھا۔

''بھگوان کی کرپا ہے۔ اچھا ہوں۔''

''ہماری یاد کیسے آ گئی؟''

کیدار ناتھ نے دل میں کہا۔ تم کو میں بھولتا ہی کب ہوں چھوٹے ٹھاکر کہ یاد آنے کا سوال ہو۔ پیدائش سے لے کر آج تک تم میرے دل و دماغ پر بوجھ بنے ہوئے ہو۔

لیکن اوپر سے وہ مسکرا دیا۔ ''تم تو ہمیشہ یاد رہتے ہو پتر۔'' وہ بولا۔ ''آج میں جے پور جا رہا ہوں... میلے میں۔ سوچا تمہیں بھی پوچھ لوں۔''

''نہیں چاچا جی۔ میں تو نہیں جا سکتا۔'' اوتار سنگھ نے صاف انکار کر دیا۔

کیدار ناتھ کو بے حد مایوسی ہوئی۔ یہ ایک کوشش تو وہ برسوں سے کرتا رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ چاہا کہ اوتار سنگھ سے قریب ہو جائے۔ وہ اس سے محبت اور شفقت جتاتا۔ تاکہ کبھی اسے اپنے ساتھ کہیں لے جائے۔ ایسے ہی کسی حادثے کا اہتمام کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن اوتار سنگھ کبھی اس سے بہت قریب نہیں ہوا۔ اس کی وجہ وہ مسلا بچہ وصال دین تھا۔ بلکہ اس کا پورا پریوار۔ اوتار سنگھ ان کی قربت میں ایسا مگن تھا کہ اسے کسی اور کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اس وقت بھی کیدار ناتھ اوتار سنگھ کے انکار پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ تاہم اس نے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہیں جا سکتے پتر؟ اب تو چھٹیاں ہیں تمہاری۔''

گھر پر پڑھائی کر رہا ہوں چاچا۔ دیکھتے نہیں، مولوی صاحب کو ساتھ لایا ہوں۔''

''دیکھتا تو ہوں۔ پر سمجھ نہیں آتی۔'' کیدار ناتھ بولا۔ ''اس مسلے سے تم کیا پڑھتے ہو؟''

''عربی پڑھتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔ پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ''ان کے متعلق ایسی خراب بات مت کرو چاچا۔ وہ میرے استاد ہیں۔''

''تمہیں تو پتر مسلوں سے شروع ہی سے محبت ہے۔'' کیدار ناتھ نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''یہ استاد ہے۔ وہ وصال دین تمہارا بھائی ہے۔ اور حمیدہ کو تم ماتا سمجھتے ہو۔ اور میں نے تو کوئی خراب بات نہیں کی۔ پر مسلے کو تو مسلا ہی کہیں گے اور پتر اوتار سنگھ، اس سے کوئی اچھی چیز تو تم پڑھ اور سیکھ نہیں سکتے۔'' کیدار ناتھ بہت ڈھٹائی سے بات کر رہا تھا۔

اوتار سنگھ کو غصہ آ گیا۔ ''یہ بات تو تم پتا جی سے کرنا چاچا۔ وہ تمہیں بہتر طور پر سمجھا سکیں

گے۔''

پرتاپ سنگھ کے نام پر کیدار ناتھ کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں پتر۔ تم خفا نہ ہو۔ میں چلتا ہوں۔'' اس نے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔

کیدار ناتھ بہت عیار اور شاطر آدمی تھا۔ اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ اوتار سنگھ کا مسلوں کی طرف جو جھکاؤ ہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر یہ بس موہوم سا احساس تھا... جزئیات کے بغیر۔ کیسے؟ کیا کرے؟ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ذہن پر زور دیتا رہا، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

اب انگلیاں ٹیڑھی کرنی ہی پڑیں گی۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بڑبڑایا۔

❁......❁......❁

گھٹا تو کئی دن سے چھائی ہوئی تھی۔ اور گرمی کے موسم میں گھٹا ہو اور نہ برسے تو حبس ہو جاتا ہے۔ حور بانو کو برسات جتنی اچھی لگتی تھی، حبس اتنا ہی برا لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی دن سے وہ بولائی بولائی پھر رہی تھی۔

اس صبح بوندا باندی شروع ہوئی تو سب سے خوش حور بانو ہی تھی۔ اس کے اندر جیسے بجلیاں چمکنے لگیں۔ ''امی جان... پھوار پڑ رہی ہے۔'' اس نے ماں کو ہلا ڈالا۔

''ہاں... نظر آ رہا ہے مجھے۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔ ''جمعرات کی جھڑی ہے۔ ایک ہفتے سے پہلے نہیں ٹلے گی۔''

''اسے جھڑی تو نہ کہیں۔'' حور بانو نے اعتراض کیا۔ ''بوندا باندی ہے... وہ بھی ہلکی سی۔''

''جھڑی تو کہلائے گی۔ چاہے روں روں برسے۔''

لیکن حور بانو کو تو موسلا دھار بارش پسند تھی۔ بہر حال حبس کے مقابلے میں تو یہ بوندا باندی بھی بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ ماں کے پاس سے اٹھی تو بہنوں کی طرف لپکی۔ نور بانو حسب معمول اپنے مطالعے میں کھوئی ہوئی تھی۔ اور گلنار بیٹھی اپنی گڑیا کے کپڑے سی رہی تھی۔

''ارے تم لوگ یہاں بیٹھی ہو۔ پتا ہے، بوندا باندی ہو رہی ہے۔'' حور بانو نے انہیں ہلایا۔

دونوں بہنوں کا ردعمل مختلف تھا۔ ان کی طبیعتوں کے عین مطابق۔ نور بانو نے کتاب سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بڑی بے نیازی سے بولی۔ ''تو کیا ہوا یہ موسم ہی برسات کا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر کتاب پر جھک گئی۔

مگر گلنار نے گڑیا کے کپڑے ایک طرف پھینک دیے۔ ''سچ باجی۔ واہ اب مزہ آئے گا۔'' اس نے کہا۔ ''دل گھبرانے لگا تھا اس حبس سے۔'' اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلیں باجی، جھو

لگائیں گے۔"

حور بانو اور گلنار دالان کی طرف چلی گئیں۔ نور بانو بیٹھی پڑھتی رہی۔ حور بانو سب سے بڑی تھی اور گلنار سب سے چھوٹی۔ ان دونوں کے مزاج ایک سے تھے۔ شوخ و شنگ اور زندگی سے لبریز۔ حور بانو بے حد حسین تھی۔ گلنار ابھی کم عمر تھی لیکن ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ حور بانو سے کم ثابت نہیں ہوگی۔ بیچ کی نور بانو ہر اعتبار سے دونوں بہنوں سے مختلف تھی بلکہ ضد کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ واجبی بھی نہیں تھی۔ اس کا رنگ سانولا بھی نہیں، پکا تھا۔ چہرے کے نقوش بھی موٹے تھے۔ آنکھیں بہت چھوٹی تھیں۔ مگر ان میں بلا کی چمک تھی۔ جسمانی اعتبار سے بھی وہ بہت کم تھی۔ بدن پر گوشت تھا ہی نہیں۔ لگتا تھا، ہڈیوں پر کھال منڈھ دی گئی ہے۔ دونوں بہنوں سے اس کا تضاد یہیں تک محدود نہیں تھا۔ طبیعت بھی اس کی بالکل الگ تھی۔ وہ بہت سنجیدہ، بردبار، کم گو اور کم آمیز تھی۔ ہنسنا تو جیسے اسے آتا ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیتی۔ بس اسے ایک ہی شوق تھا...... مطالعہ کرنا۔ لگتا تھا، اس کی دوستی صرف کتابوں سے ہے۔

حور بانو اور گلنار نے مل کر جھولا باندھا۔ پھر اس کی مضبوطی کو جانچا۔ دہری رسی کے اوپر انھوں نے ایک بڑے گدے کو باندھ دیا۔ اب وہ بہت آرام دہ جھولا تھا۔

"پہلی بار میری۔" گلنار نے چہک کر کہا۔

"واہ...... بڑی تو میں ہوں۔ پہلے تم مجھے جھولا جھلاؤ گی۔" حور بانو بولی۔

گلنار مان گئی۔ حور بانو جھولے پر بیٹھ گئی۔

دالان کی چھت کافی اونچی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جھولا وہاں باندھا جاتا تھا۔ دالان کے سامنے خاصا کشادہ صحن تھا۔ صحن کے اختتام پر غسل خانہ، بیت الخلا اور اسٹور تھے۔ اور ان کے اوپر کوٹھا تھا...... وہ کوٹھا جو پچھلے کچھ عرصے سے حور بانو کو بہت محبوب ہو گیا تھا۔

گلنار نے پینگ دی۔ جھولا قوسی شکل میں اوپر اٹھا اور دالان سے ذرا باہر صحن تک گیا۔ اگلی پینگ اسے صحن کے وسط تک لے گئی۔ صحن میں پھوار حور بانو کے جسم اور رخساروں سے ٹکرائی تو حور بانو کے اندر کا سماں ایک دم تبدیل ہو گیا۔ وہ اداس ہو گئی۔

یہ اداس ہونا بھی اس نے حال ہی میں سیکھا تھا۔ ورنہ وہ تو بڑی معصوم، بے فکر اور شوخ لڑکی تھی۔ اداسی کا سبب وہ لڑکا تھا، جو ان کے مکان کے اوپری حصے میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتا تھا۔ ویسے تو ان کرائے داروں کو ان کے ہاں دو سال ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے ان میں سے کسی کو دیکھا نہیں تھا...... سوائے ان کی ملازمہ رنجنا کے کہ وہ اکثر نیچے آ جاتی تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ وہ لوگ ہندو ہیں اور بہت بڑے زمین دار ہیں۔

مگر چھ ماہ پہلے ایک اتفاق کے تحت اس نے لڑکے کو دیکھ لیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس

نے آ کا میاں کو کوئی چیز لانے کے لیے بھیجا تھا۔ دیر ہو گئی تھی اور وہ واپس نہیں آئے تھے۔ نہ جانے کیا چیز تھی کہ وہ اس کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ اسی بے تابی میں وہ چلمن تک پہنچ گئی۔

چلمن کی درزوں سے اس کی نظریں آ کا میاں کو تلاش کر رہی تھیں کہ اسے وہ دونوں لڑکے آتے نظر آئے۔ ایک بڑا تھا۔ وہ عام سا لڑکا تھا۔ مگر دوسرے لڑکے کو وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ پتا نہیں، کچھ عجیب سی بات تھی اس میں۔ کھڑا قد، بے حد متناسب جسم اور چہرہ ایسا خوبصورت کہ نظر ہی نہ ہٹے۔ ترشے ہوئے نقوش، متناسب کھڑی ناک، بڑی بڑی روشن آنکھیں، بہت کشادہ، دمکتی ہوئی پیشانی اور سرخ و سپید رنگت، چہرے پر روئیدگی تھی، جو جوانی کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔

پتا نہیں، وہ کیسا جادوئی لمحہ تھا۔ دونوں لڑکے زینے کی طرف چلے گئے۔ لیکن حور بانو وہیں کھڑی رہ گئی۔ چھوٹے لڑکے کا سراپا اب بھی اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اور اسے پلکیں جھپکانا بھی برا لگ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک پل کے لیے بھی سامنے سے ہٹے۔

کم عمر اور معصوم حور بانو نہیں جانتی تھی کہ یہ سب کیا ہے۔ جو بھی تعلیم اس نے حاصل کی تھی، گھر پر ہی کی تھی اور گھر میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ کون سی کتاب گھر میں رکھی جانی چاہیے اور کون سی نہیں۔ محبت کے بارے میں وہ کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔

وہ وہیں کھڑی خلا میں اس حسین سراپا کو دیکھتی رہی۔ آ کا میاں نے آ کر اسے چونکایا تو وہ ہٹی۔

اسی لمحے سے ایک مستقل بے چینی، ایک عجیب سا اضطراب اس کے اندر رہنے لگا۔ یہ بے چینی بس اس بات کی تھی کہ وہ اس لڑکے کو بار بار دیکھنا چاہتی تھی۔ بلکہ درحقیقت وہ تو ہر وقت اسے دیکھنا چاہتی تھی اور یہ ممکن نہیں تھا۔

حور بانو بچپن ہی سے بہت ضدی تھی۔ جو مانگتی، وہ جب تک نہ ملتا، بے چین رہتی۔ جو کرنا چاہتی کر کے رہتی۔ اب اس معاملے میں بھی یہی کیفیت تھی۔ مگر ایک فرق بھی تھا۔ وہ جس چیز کی ضد کرتی، جب تک وہ نہ ملتی، اسے جھنجلاہٹ ہوتی رہتی۔ لیکن اس معاملے میں یہ بات نہیں تھی۔ وہ جھنجلا نہیں رہی تھی۔ اور اس اضطراب میں بھی عجیب سی لذت تھی۔ صرف اسے دیکھنے کی خواہش کرنا بھی بہت پر لطف تھا۔ عجیب سا سرور تھا اس میں۔

چلمن کے قریب وہ کم...... بہت ہی کم جاتی تھی۔ مگر اب اس کا چلمن سے کوئی بہت گہرا تعلق قائم ہو گیا تھا۔ مضطرب تو وہ ہر وقت رہتی تھی۔ مگر جب بھی اضطراب کی کوئی اونچی لہر اٹھتی، اس کے قدم خود بہ خود چلمن کی طرف اٹھ جاتے۔ پھر وہ ناکام واپس آ جاتی۔

چند دن میں اس معاملے میں بھی ٹھہراؤ آ گیا۔ آدمی تجسس کرے تو اسے معلومات بھی

حاصل ہوتی ہیں۔ اسے پتا چل گیا کہ وہ صرف دو اوقات میں اس لڑکے کو یقینی طور پر دیکھ سکتی ہے۔ ایک صبح کے وقت جب وہ اسکول جاتا ہے اور پھر دوپہر کے وقت جب وہ اسکول سے آتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دوسرا لڑکا مسلمان ہے۔ وہ ایسے کہ وہ نماز کے وقت نکلتا تھا اور نماز پڑھ کر واپس آتا تھا۔ بظاہر تو گھر سے نکلتے وقت وہ کوئی ایسا اہتمام نہیں کرتا تھا کہ جس سے لگے، وہ نماز پڑھنے جا رہا ہے۔ سر پر ٹوپی بھی نہیں ہوتی تھی۔ شروع میں تو حور بانو یہی سمجھی کہ وہ کسی کام سے کچھ خریدنے کے لیے نکلا ہے۔ اذان کے بعد گھر سے نکلنا ایک اتفاق ہو سکتا ہے۔ لیکن دن میں پانچ بار اور ہفتے کے ساتوں دن یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک دن وہ نماز پڑھ کر واپس آیا تو اس کے پائنچے اوپر تھے۔ شاید ہر بار آتے ہوئے وہ انھیں نیچے کر لیتا تھا۔ مگر اس بار وہ ایسا کرنا بھول گیا تھا۔

حور بانو بہت ذہین لڑکی تھی اور جس طرح کا اسے تجسس تھا، ایسے میں ذہین لوگ معمولی سی بات سے بہت سارے نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ حور بانو کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ دوسرا لڑکا مسلمان ہے اور نماز کے لیے جاتا ہے...... مگر چوروں کی طرح، جیسے یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا ہو کہ وہ نماز پڑھنے جا رہا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ جن ہندوؤں کے ساتھ وہ رہ رہا ہے، ان کی طرف سے اسے یہ آزادی نہیں۔ اسی لیے وہ چھپ کر نماز پڑھتا ہے۔

اس احساس کے ساتھ اسے اس پر ترس آیا اور ان ہندوؤں پر غصہ، جنھوں نے اسے پابند کر رکھا تھا۔ لیکن ان ہندوؤں میں وہ لڑکا شامل نہیں تھا، جس کی دید کو وہ ترستی تھی۔ اس کے نزدیک اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

دونوں گھروں کے درمیان وہ تعلق تھا، جو پڑوسیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ کبھی اوپر سے رنجنا کھانے پینے کی کوئی چیز لاتی اور کبھی ان کے ہاں کوئی خاص چیز پکتی تو چھمن بوا اوپر لے جاتیں۔ چیزوں کے اس تبادلے میں معلومات کا تبادلہ بھی قدرتی طور پر ہوتا رہتا تھا۔ پہلے حور بانو اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ مگر اب وہ غور سے سننے لگی تھی۔ امی جان البتہ بڑے سوال جواب کرتی تھیں۔

رنجنا تھی بھی بڑی باتونی۔ کتنی باتیں تو وہ بغیر پوچھے ہی بتا دیتی تھی۔ حور بانو کو معلوم ہو گیا کہ چھوٹا لڑکا چھوٹا ٹھاکر کہلاتا ہے۔ رنجنا نے اس کا نام کبھی نہیں بتایا۔ کہتی تھی، بس وہ چھوٹے ٹھاکر ہیں۔ البتہ مسلمان لڑکے کا نام اس نے بتا دیا...... وصال دین!

''مگر یہ مسلمان لڑکا تمھارے ساتھ کیوں رہتا ہے؟'' امی جان نے ایک دن پوچھا۔

''وہ بھی اسکول میں پڑھتا ہے۔'' رنجنا نے بے حد سادگی سے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تمھارے ٹھاکروں کے ساتھ اس کا کیا جوڑ؟''

رنجنا نے امی جان کو یوں دیکھا، جیسے ان کی سادگی اور کم علمی پر کڑھ رہی ہو۔ ''جوڑ تو کوئی نہیں بی بی۔ لیکن وہ چھوٹے ٹھاکر کا بچپن کا دوست ہے...... چھوٹے ٹھاکر اس کے بغیر رہ نہیں

سکتے۔ وہ نہیں آتا تو چھوٹے ٹھاکر یہاں کبھی نہیں آتے۔''

''مگر تعلق کیا ہے ان سے؟'' امی جان بھی پیچھے ہی پڑ گئیں۔

''تعلق تو مجھے بھی نہیں پتا۔'' رنجنا نے بے بسی سے کہا۔ ''اس کا باپ جمال دین کمی ہے ہمارے بڑے ٹھاکر کا۔ مگر بڑے ٹھاکر اس پر بڑی دیا کرتے ہیں۔

ویسے اوپر والے روشن خیال ہندو تھے۔ گوشت کا پرہیز نہیں کرتے تھے۔ بس گائے کا گوشت کھانے سے بچتے تھے۔ بقول رنجنا کے ماسٹر جی تو گوشت کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے اور چھوٹے ٹھاکر کا بھی یہی حال تھا۔ رہ گئے رنجنا اور رگھو تو وہ ملازم تھے۔ اور ملازم آقاؤں کا عقیدہ اپناتے ہیں۔

حور بانو کو اچانک احساس ہوا کہ بارش تیز ہو گئی ہے۔ جس ثانیے میں جھولا صحن سے گزرا اور واپس آیا تھا، بارش کی بوچھاڑ نے اس کو بھگو ڈالا تھا وہ چونک کر خیالوں سے نکل آئی۔ ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ گلنار کچھ کہہ رہی ہے۔

''باجی...... بس اب اتریں بھی، اب میری باری ہے۔''

حور بانو نے پاؤں فرش سے لگائے۔ رکتے رکتے جھولا رک گیا اور وہ نیچے اتر آئی۔

گلنار نے حیرت سے اسے دیکھا۔ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں تھا۔ حور بانو بڑی ہونے کا پورا فائدہ اٹھاتی تھی اور جب تک اپنا جی نہیں بھرتا تھا، اسے جھولنے کا موقع نہیں دیتی تھی۔

اس نے مشتبہ نظروں سے بہن کو دیکھا اور جلدی سے جھولے پر بیٹھ گئی۔ ''پینگ دیں باجی۔'' اس نے کہا۔

حور بانو نے جھولے کو دھکیلا۔ مگر دو تین پینگیں دینے کے بعد رک گئی۔ جھولے کا ردھم ٹوٹنے لگا۔ ''کیا کرتی ہیں باجی۔ پینگ دیں نا۔'' گلنار نے احتجاج کیا۔

''بھئی میرا دل نہیں چاہ رہا اس وقت۔''

''یہ تو بے ایمانی ہے باجی۔ آپ کی باری آئے گی تو میں بھی پینگ نہیں دوں گی۔''

''نہیں دینا۔ میرا دل بھی نہیں چاہ رہا ہے جھولنے کو۔''

تو یہ بات ہے۔ گلنار نے سوچا۔ اس لیے جھولا اتنی آسانی سے خالی ہو گیا۔ باجی کا بھی پتا نہیں چلتا۔ اب تو پل پل رنگ بدلتی ہیں۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ پھر اس نے خوشامدانہ لہجے میں پکارا۔ ''اچھی باجی، بس دو تین لمبی لمبی پینگیں دے دیں۔ پھر میں آپ سے نہیں کہوں گی۔''

حور بانو نے جھنجلا کر جھولے پر ہاتھ رکھا اور اسے دھکیلتی ہوئی صحن تک لے گئی۔ پھر وہ ایک طرف ہٹی اور دالان سے واپس صحن کی طرف آتے ہوئے جھولے کو اور زور سے دھکیلا۔ دو بار میں ہی گلنار کے پاؤں اسٹور کی دیوار سے جا لگے۔ اب وہ خود بھی پینگیں لے سکتی تھی۔

حور بانو اندر ماں کے پاس چلی گئی۔ ''امی جان...... بہت زور کی بارش ہو رہی ہے......''

سرفراز بیگم نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں جانتی ہوں، تم کیا کہو گی۔'' انھوں نے کہا۔ ''میں بہادر علی کو پہلے ہی آلو لانے کے لیے بھیج چکی ہوں بیسن گھول کر رکھ دیا ہے۔ چھمن بوا ابھی گرم گرم پھلکیاں اتاریں گی۔ تم ذرا چٹنی پیس لو۔''

وہ چٹنی پیسنے بیٹھ گئی۔ مگر اس کا دھیان چھوٹے ٹھاکر کی طرف تھا۔ وہ گزرے ہوئے وقت میں کھو گئی۔

دن میں دو بار وہ چھوٹے ٹھاکر کو آتے جاتے دیکھتی تھی اور اس کے بعد وہ اُس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ نیند بھی اس کی پہلے جیسی نہیں رہی، سوتی تو وہ خوابوں میں آ جاتا۔ نیند اچٹ جاتی۔ مگر نیند کا وہ اچٹنا بھی خوش گوار تھا کیونکہ وہ بہت سرشار اور خوش خوش اٹھتی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد دوبارہ نیند آ جاتی اور خوابوں کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ اب اس کا جی چاہتا کہ ہر وقت وہ سوتی ہی رہے۔

پھر تین ماہ پہلے اس کی پیاسی نگاہوں کی مزید ضیافت کا سامان ہو گیا۔

اس کے حواس تو مکان کے اوپری حصے کی آوازوں پر ہی مرکوز رہتے تھے۔ اس روز اسے کوٹھے کی طرف جانے والے زینوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دی تو وہ کوٹھے کی طرف لپکی۔ عام طور پر رنجنا کے سوا کوئی کوٹھے پر نہیں جاتا تھا۔ لیکن یہ رنجنا کے قدموں کی آہٹ نہیں تھی۔ حور بانو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اتنے زور سے کہ اسے لگا، اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز امی جان تک بھی پہنچ جائے گی۔

کوٹھے کے چاروں طرف دیوار نہیں تھی۔ بلکہ منڈیروں پر جالیاں چن کر دیواریں بنا دی گئی تھیں۔ جالیوں کے درمیان سوراخ تھے، جن سے دونوں طرف کا منظر پوری طرح تو نہیں، کچھ کچھ نظر آتا تھا۔

چند لمحے بعد اس نے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ اوپر کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھ گیا اور کتابیں میز پر رکھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جالیوں کے سوراخوں سے بالکل صاف تو نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن انداز سے لگتا تھا کہ وہ وہاں پہلی بار آیا ہے اور جو کچھ اس نے دیکھا ہے اسے دیکھ کر وہ خوش ہوا ہے۔

وہ دالان میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس وقت کی غیر متوقع دید اسے بہت بڑی نعمت محسوس ہوئی تھی۔ اس نے تصور میں کوٹھے کو دیکھا۔ کرائے پر اٹھنے سے پہلے تو وہ اکثر کوٹھے پر جاتی رہتی تھی۔ حور بانو کو پھولوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے وہاں چنبیلی لگائی تھی جو خوب پھلی پھولی تھی۔ اس کے علاوہ موسمی پھولوں کے بھی کئی پودے تھے۔ اسے یاد تھا کہ اسے کوٹھا بہت اچھا لگا تھا۔ شام کے وقت خاص طور پر وہ وہاں جایا کرتی تھی۔

اوپر کوٹھے پر چھوٹے ٹھاکر نے کتاب کھول لی تھی اور اس پر جھک گیا تھا۔

حور بانو بڑی محویت سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''حور بانو'' وہاں کیا کر رہی ہو۔ چلو عصر کی نماز پڑھو اور پھر قرآن پاک کی تلاوت کے لیے بیٹھو۔ عصر مغرب کے درمیان اعمال کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔''

''آئی امی جان...... وضو کرنے کے لیے ہی آئی ہوں یہاں۔'' حور بانو نے جواب دیا اور غسل خانے کی طرف چل دی۔ لیکن اس کا دل وہیں کوٹھے پر اٹکا رہا۔ وضو کر کے اس نے نماز پڑھی۔ پھر قرآن پاک کی تلاوت کی...... یہ روز کا معمول تھا اور اس کے معاملے میں امی جان بہت سخت تھیں۔ پھر عادت بھی تھی۔ سو وہ عصر سے مغرب تک کا یہ وقت بڑے شوق سے گزارتی تھی۔ قرآن شریف پڑھنے میں اسے بہت لطف آتا تھا بلکہ تلاوت کرتے ہوئے وہ کھو جاتی تھی۔ مگر اس شام وہ ارتکاز سے محروم تھی۔ وہ قرآن شریف پڑھ رہی تھی مگر اس کا دل کہیں اور تھا۔ وہ کوٹھے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بلکہ تصور میں کوٹھے کو دیکھ رہی تھی، جہاں چھوٹا ٹھاکر بیٹھا پڑھائی کر رہا تھا۔ کئی بار اسے شرم آئی کہ یہ کتنی بری بات ہے۔ اس نے دل کو کوٹھے سے ہٹایا اور توجہ قرآن پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ مگر اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب بے ایمان دل چپکے سے پھر کوٹھے پر جا اٹکا ہے۔ وہ اندر سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ مگر بے بس تھی۔ یہ تو بہت بڑی بے ادبی ہے۔

یہ خیال دل میں آیا تو وہ اٹھ گئی۔

''کیا بات ہے۔ تلاوت میں دل نہیں لگتا۔'' امی جان نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

''امی جان...... وضو کرنے جا رہی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ دالان سے گزرتے ہوئے اس کی نظر کوٹھے کی طرف اٹھی۔ مغرب ہونے والی تھی۔ جھٹ پٹے کا سماں تھا۔ آسمان اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹنے والے پرندوں کے چہچہوں سے گونج رہا تھا۔ اتنا اجالا نہیں تھا کہ وہ اسے صاف دیکھ سکتی۔ مگر چھوٹا ٹھاکر اسے ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ پڑھ نہیں رہا ہے بلکہ بڑے ارتکاز کے ساتھ خلا میں گھور رہا ہے۔

وہ وضو کر کے آئی تو مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی۔ اس بار نماز میں بھی اس کا دل نہ لگا۔ جلدی جلدی نماز پڑھ کر وہ دالان میں تخت پر جا بیٹھی اب اندھیرا ہو چکا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر کا ہیولا اور گہرا ہو گیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ پڑھائی کے لیے اوپر آنے والے چھوٹے ٹھاکر نے روشنی کیوں نہیں کی۔ اور روشنی نہیں کی تو اندھیرے میں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ بیٹھی رہی۔ اوپر چھوٹا ٹھاکر بھی بیٹھا رہا۔

کچھ دیر بعد اچانک اوپر روشنی ہو گئی۔ روشنی اسی دوسرے لڑکے وصال دین نے کی تھی۔ ذرا دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔ پھر نیچے چلے گئے۔

اگلے روز شام کا وہ وقت ہوا تو حور بانو کا دل مچلنے لگا۔ کاش وہ آج بھی آ جائے۔ شاید

وہ وقت دعا کی قبولیت کا تھا۔ وہ آ گیا اور اس کے آنے کے ذرا دیر بعد ہی عصر کی اذان ہو گئی۔

پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا۔ حور بانو بہت خوش تھی۔ رات کو وہ خواب میں اسے دیکھتی۔ پھر صبح وہ اسکول جاتا۔ صبح سے دوپہر اس کی واپسی کا انتظار رہتا۔ دوپہر کو وہ اسے دیکھتی اور پھر شام کا انتظار کرتی۔ شام کو وہ کوٹھے پر آتا...... کتابیں لے کر۔ لیکن کچھ پڑھے بغیر رات کو واپس جاتا۔ اور کوٹھے پر رہ کر پڑھائی وہ کبھی نہیں کرتا تھا۔

وہ عرصہ حور بانو کے لیے سرشاری کا تھا۔ وہ بے خود، کھوئی کھوئی، مگر بہت خوش رہتی۔ بات بات پر ہنستی۔ آپ ہی آپ مسکراتی۔ مگر کسی کی بات دھیان سے نہ سن پاتی۔

مگر ساتھ ہی ایک خلش اسے بار بار ستاتی۔ اس کے ضمیر پر بوجھ بڑھتا جاتا۔ قرآن پاک پر لاکھ کوشش کے باوجود وہ پوری توجہ مرکوز نہیں کر پاتی۔ اسے تو بس انتظار رہتا تھا کہ کب مغرب ہو اور وہ نماز پڑھ کر دالان کا رخ کرے۔ اسے دیکھنے کے چکر میں وہ عصر کی نماز کے لیے کھڑے ہونے میں بھی تساہل کرنے لگی تھی۔

پھر ایک روز حور بانو نے تلاوت کرتے ہوئے قرآن پاک کی ایک آیت مبارکہ پڑھی، جس میں برتر مشرک مردوں پر کم تر مومن مردوں کی قوت اور برتری کو بیان کیا گیا تھا۔ وہ آیت سن کر وہ چور ہو گئی۔ مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ مشرک ہو سکتا ہے۔ بار بار اس کے ذہن میں ایک دلیل ابھرتی...... کسی مشرک کی پیشانی اتنی روشن کیسے ہو سکتی ہے!

اچانک سرشاری کی وہ کیفیت ایسے ختم ہو گئی، جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں کسی نے کنکر پھینک دیا ہو۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں اور وہ لوگ چلے گئے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ حور بانو اداسی سے آشنا ہوئی۔ یوں تو وہ اداس پہلے بھی ہوتی رہی تھی۔ کون ایسا ہے جو کبھی اداس نہ ہوتا ہو۔ اور اس نے بہت کم عمری میں شفیق باپ کی موت کا دکھ بھی جھیلا تھا۔ مگر یہ اداسی بہت مختلف تھی۔ بیٹھے بٹھائے کسی بھی لمحے اچانک اوپری سطح سے شروع ہوتی اور تیزی سے اس کے وجود کی نامعلوم گہرائی تک سرائیت کر جاتی۔

اور اس اداسی میں کوئی تکلیف، کوئی اذیت نہیں تھی۔ اس کے برعکس اس میں لذت تھی۔ یہ اداسی اسے سوچنے پر اکساتی...... ایسی ایسی باتیں جو پہلے اس کے گمان میں بھی نہیں تھیں۔ یہ اداسی تصور کو مہمیز کرتی...... اسے وہاں لیجاتی، جہاں چھوٹا ٹھاکر تھا۔ حالانکہ اس نے وہ جگہ دیکھی نہیں تھی بلکہ کبھی اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

کبھی وہ حیران ہو کر سوچتی کہ ایک اجنبی لڑکا، جس سے کبھی اس نے بات بھی نہیں کی، تھوڑے سے دنوں میں اتنا اہم کیسے ہو گیا کہ سامنے ہوتے ہوئے بھی اسے امی جان اور اپنی بہنوں کا خیال نہیں آتا جبکہ وہ اس کی یادوں، اس کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہے۔ وہ اتنا اہم کیسے

ہو گیا کہ اس کے چلے جانے کے بعد زندگی بے کیف اور اپنا وجود نامکمل لگتا ہے۔

''اے ہے حور بانو...... یہ چٹنی پیس رہی ہو یا سفوف بنا رہی ہو؟''

امی جان کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے پہلے امی کو اور پھر سل کو دیکھا۔ پھر بڑی شرمندگی سے اس نے چٹنی پر پانی کے چھینٹے دیے اور وہ چار بار بٹا چلانے کے بعد چٹنی کو سمیٹ کر پیالے میں گرا دیا۔ وہ دالان میں چلی آئی۔ گلنار اب بھی جھولا جھول رہی تھی۔

''آئیں باجی...... جھولیں گی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں...... دل نہیں چاہ رہا ہے۔''

گلنار نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ جواب اس کے لیے بے حد خلاف توقع تھا۔ مگر آج کل باجی ایسی ہی ہو رہی تھیں۔

حور بانو تخت پر بیٹھ کر کوٹھے کو تکنے لگی، جہاں کوئی نہیں تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی اس کا اپنا معمول وہی رہا تھا۔ عصر سے پہلے وہ یہاں آ کر ضرور بیٹھتی اور کوٹھے کو تکتی۔ پھر عصر کے بعد وہ قرآن پاک پڑھتی تو مغرب سے پہلے وضو کے بہانے اٹھ جاتی۔ وضو کے لیے جاتے وقت وہ پھر کوٹھے کی طرف دیکھتی اور مغرب کے بعد رات کے کھانے تک وہ پھر دالان میں تخت پر بیٹھی رہتی۔ اس دوران کبھی کبھی تو اسے چھوٹا ٹھاکر نظر آتا...... ایسا جیتا جاگتا کہ وہ خوش ہو جاتی...... ارے، یہ لوگ واپس آ گئے۔ مگر پلکیں جھپکتیں تو اندھیرا اور ویران کوٹھا سامنے ہوتا اور کبھی کبھی تو اسے سچ مچ ایسا لگتا کہ وہ لوگ کہیں نہیں گئے۔ یہیں موجود ہیں۔

اب زندگی کی مرکزی کیفیت انتظار کی تھی بلکہ یوں کہیے کہ زندگی نام ہی انتظار کا تھا۔

ویسے تو جب سے یہ دیکھنے کا کھیل شروع ہوا تھا، وہ حالت انتظار میں تھی۔ پہلے اس انتظار میں لمحے گنے جاتے تھے۔ مگر اب وہ دن گن رہی تھی...... دو مہینے کے ساٹھ دن۔ اور گرمیوں کے دن تو ویسے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ایک ایک پل مشکل سے گزرتا ہے۔

''گلنار...... کہاں ہو؟ آ کر دستر خوان بچھاؤ۔'' امی جان نے پکارا۔ ''چلو حور بانو، نور بانو آ جاؤ بھئی۔ گرم گرم پراٹھے اترتے جائیں، کھاتی جاؤ۔''

دستر خوان بچھ گیا۔ چھمن بوا گرم پراٹھے اتار کر لا رہی تھیں۔ حور بانو نے پہلا لقمہ توڑا۔ مگر کچھ سوچ کر رک گئی۔ ''بوا...... پہلے چند پراٹھے اوپر دے آؤ نا۔'' اس نے پکارا۔

''اے بولا گئی ہو کیا۔'' امی جان نے اسے گھورا۔ ''پتا بھی ہے کہ وہ لوگ گئے ہوئے ہیں۔''

اب وہ کیا کہتی۔ کھسیائی اور دستر خوان پر جھک گئی۔

❀......❀......❀

کیدار ناتھ جے پور کے میلے میں ہر سال جاتا تھا۔ مگر اس بار اس کے دماغ میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ اس بار اس نے اوتار سنگھ کو بہت بدلا بدلا پایا تھا۔ اس نے ایک دم سے قدم نکالا

تھا۔ وہ بہت بڑا اور بہت طاقت ور لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کیدار ناتھ کو نفرت تو ہمیشہ محسوس ہوتی تھی مگر اس بار وہ احساسِ کمتری میں بھی مبتلا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پرتاپ سنگھ سے بڑھ کر دبدبے والا نکلے گا۔

کیدار ناتھ نے سمجھ لیا کہ اب بھی اس نے کچھ نہ کیا تو اس کا سپنا سپنا ہی رہ جائے گا۔ وہ کبھی ٹھاکروں کی گڑھی کا بڑا ٹھاکر نہیں بن سکے گا۔ اب تو کوئی قدم اٹھانا ہی تھا۔

جے پور سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے بیشتر رشتے دار جے پور میں ہی رہتے تھے۔ خود اس کی اپنی عمر کا بڑا حصہ بھی جے پور میں ہی بسر ہوا تھا ٹھاکروں کی گڑھی تو وہ صرف ٹھاکر بننے کے لالچ میں گیا تھا۔ جے پور ایک اعتبار سے اس کے لیے گھر کی طرح تھا۔ رشتے داروں کے علاوہ اس کے وہاں بہت تعلقات تھے۔ ہر طرح کے۔ اور اب اس نے ان تعلقات کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ میلے میں بھی شریک ہوا اور اپنے کام کے لوگوں سے بھی ملا۔ اس نے ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔

''او یار جی، یہ کون سی بڑی بات ہے۔'' اس کے بچپن کے دوست جسونت نے سنتے ہی کہا۔

''نہیں جسونت، بات تو بڑی ہے۔'' کیدار ناتھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اس سلسلے میں مجھ پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اور شبہ کر لیا گیا تو سارا کھیل ختم سمجھو۔''

''تم پر کیوں شبہ کیا جائے گا؟''

''اس لیے کہ اس کی موت سے فائدہ صرف مجھ کو پہنچ سکتا ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ تب بھی کوئی بڑی بات نہیں۔'' جسونت نے کہا۔ ''اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔''

''مجھے پوری بات بغیر اطمینان نہیں ہوگا۔''

''یار جی...... ڈاکو تو ہر جگہ ہوتے ہیں نا۔''

''ہوتے ہیں۔ پر ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی حویلی میں گھسنے کی ہمت کسی میں نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہاں انھیں موت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔''

''پر گاؤں میں تو ڈاکو کسی پر بھی حملے کر سکتے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' کیدار ناتھ نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ چھوٹے ٹھاکر کو کچھ ہوا تو سب سے پہلے مجھ پر شبہ کیا جائے گا؟''

''وہ کیوں کید...؟''

''اس لیے کہ اس کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ مجھے ہی پہنچے گا اور یہ بات نہ ہوتی

تو میں اس سلسلے میں کچھ کرتا ہی کیوں۔''

جسونت سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سر ہلا کر بولا۔ ''تم چنتا مت کرو۔ میں ایسا بندوبست کروں گا کہ تم پر آنچ نہیں آئے گی۔''

''جو کچھ بھی کرو، میرے واپس جانے کے کچھ دن بعد کرنا۔'' کیدار ناتھ نے کہا۔ ''اور آدمی بھروسے کے ہونے چاہئیں۔ بات بگڑے تو بھی کسی قیمت نہ کھلے۔ ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔''

''میں نے کہا نا، تم چنتا نہ کرو۔ یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔''

دو دن بعد کیدار ناتھ گاؤں واپس چلا آیا۔

❁ ❁ ❁

مہیش پور جمال دین کے باپ مہر دین کا وہ آبائی گاؤں تھا، جہاں سے ہجرت کر کے وہ ٹھاکروں کی گڑھی میں آیا تھا۔ ٹھاکروں کی گڑھی کی نسبت مہیش پور بڑا گاؤں تھا۔ اس کی آبادی بھی زیادہ تھی۔ وہاں چند گھر مسلمانوں کے بھی تھے۔

مہیش پور کے زمین دار ایشور لال کی ٹھاکروں سے بہت لگتی تھی۔ ایک تو مزاج کا فرق بھی تھا۔ دونوں زمین دار ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ٹھاکر پرتاپ اپنے کمیوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا۔ بلکہ اس کی رعیت اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کے برعکس ایشور لال روایتی زمین دار تھا۔ اس میں وہ سارے گن تھے، جن کا کسی زمین دار میں تصور بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ بہت شوقین مزاج آدمی تھا۔ ساتھ ہی ظالم بھی تھا۔ اس کے مزارعین میں اس سے کھل کر نفرت کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ اس سے بہت ڈرتے تھے۔

ٹھاکروں کی گڑھی مہیش پور سے چھوٹا گاؤں تھا۔ وہی نہیں، ارد گرد کے تمام گاؤں مہیش پور سے چھوٹے تھے۔ سال کے سال پھولوں کے موسم میں بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ اس میں مردانہ کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ ایشور لال کی بڑی تمنا تھی کہ کسی بار اس کے گاؤں کے جوان جیت جائیں۔ لیکن جیت ہر بار ٹھاکروں کی گڑھی کے حصے میں آتی تھی۔ لٹھ بازی ہو، گھڑ سواری ہو، نیزے بازی ہو، دوڑ ہو یا کشتی، ٹھاکر کی گڑھی کے جوان ہر فن میں طاق تھے۔ یہ ایک اور وجہ تھی ایشور لال کے ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے چڑنے کی۔

اور ایک بار ندی کے پانی پر دونوں گاؤں میں تنازعہ ہوا تھا۔ مسئلے کو بات چیت سے حل کرنے کے بجائے ایشور لال نے نفری کے زور پر طاقت کے استعمال پر بھروسہ کیا تھا اور بری طرح منہ کی کھائی تھی۔ ٹھاکر کے گاؤں کے لوگ فطری طور پر بہادر تھے...... ڈٹ جانے والے۔

اس دن کے بعد ایشور لال کی نفرت اور بڑھ گئی تھی۔ مگر وہ کر کچھ بھی نہیں سکا تھا۔

اس رات آدھی رات کے قریب آٹھ جوان ایشور لال کی حویلی پہنچے۔ جسونت نے خط

کے ذریعے پہلے ہی ایشور لال سے معاملات طے کر لیے تھے ان کے ٹھہرانے کا بندوبست حویلی کے تہ خانے میں کر لیا گیا تھا۔ ایشور لال کے خاص معتمد جانکی داس کے سوا وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

جانکی داس انھیں تہ خانے میں لے گیا، جہاں ضرورت کی ہر چیز پہلے سے ہی موجود تھی۔ ایشور لال نے جانکی داس کو پہلے ہی سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ ان آنے والوں کے بارے میں اپنے گاؤں میں بھی کسی کو پتا نہ چلے۔

ایشور لال نے جانکی داس کو بتا دیا تھا کہ وہ آٹھوں صرف رات کو یہاں آرام کریں گے اور ان کے بھوجن کا انتظام کرنا ہوگا۔ وہ رات کو گاؤں والوں کے سونے کے بعد آیا کریں گے اور پو پھٹے نکل جایا کریں گے۔ دن بھر وہ کیا کریں گے، کہاں رہیں گے، کس لیے آئے ہیں...... یہ سب اسے معلوم نہیں تھا۔ اور اسے معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایشور لال کے پاس رہ کر اس نے اپنے کام سے کام رکھنا سیکھ لیا تھا۔

آنے والے خود بھی رازداری سے کام لے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے چہرے بڑے سیاہ رومالوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ تہ خانے میں پہنچنے کے بعد بھی انھوں نے چہرے نہیں کھولے۔ انھوں نے تنقیدی نظروں سے اس خفیہ اقامت گاہ کا جائزہ لیا اور جیسے مطمئن ہو گئے۔

''بھوجن کرنا ہے مہاراج؟'' جانکی داس نے پوچھا۔

انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ کسی نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ جانکی داس ان کے لیے بھوجن لے کر آیا۔ وہ آٹھوں بھوجن کے لیے بیٹھے۔ تب ان میں سے ایک جانکی داس سے مخاطب ہوا۔ ''اب تم چلے جاؤ۔''

اس کی آواز کرخت تھی اور لہجے میں تحکم تھا۔ جانکی داس کو اچھا تو نہیں لگا۔ لیکن اسے زیادہ پروا بھی نہیں ہوئی۔ اسے تو بس اپنی ذمے داری پوری کرنی تھی۔ ''میں یہاں قریب ہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجا دینا۔''

''اب ہمیں ضرورت صبح نکلتے سمے ہی پڑے گی۔'' اسی شخص نے کہا۔ ''دھنے واد۔''

جانکی داس کمرے سے نکل آیا۔ وہ برابر والے چھوٹے کمروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

❁......❁......❁

اس شام گھٹا خوب گھر کر آئی۔ اوتار سنگھ کا دل جیسے کھل اٹھا۔ ساون کا وہ کب سے انتظار کر رہا تھا۔

صحرا میں بہار موسم بہار میں نہیں آتی۔ [illegible] بہار کا آغاز ساون کی پہلی جھڑی سے ہوتا ہے۔ ساون کی محبت اوتار سنگھ کے لیے بچپن کی بات تھی۔ [illegible] کی بات ہے جب وہ [illegible] کرتا تھا...... محسوس کرتا تھا۔

وہ باہر نکلا اور [illegible] ساتھ ہوتا [illegible]

جہاں گاؤں ختم ہوتا تھا، وہاں سے صحرا شروع ہوتا تھا۔ ریت ہی ریت...... لہریں لیتی ہوئی ریت۔ دھوپ ہوتی اور ہلکی سی بھی ہوا چلتی تو ریت کی جگہ پانی نظر آتا...... اور وہ پانی باقاعدہ لہریں لیتا، آگے بڑھتا نظر آتا۔ ریت تو صحرا کا خاص عنصر تھی۔ اس کے علاوہ وہاں ریت کے سینے پر خاردار جھاڑیوں اور کچھ سوکھے درختوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

ریت کا عجیب مزاج تھا۔ وہ محض ایک لمحے کے لیے دباؤ قبول کرتی تھی۔ پھر پہلے جیسی ہو جاتی تھی۔ اس نے ریت پر چل کر دیکھا۔ پیر تھوڑے سے اندر دھنستے تھے۔ پیروں کے نشان بنتے۔ ذرا آگے جا کر وہ پلٹ کر دیکھتا تو پیچھے والے نشان معدوم ہو چکے ہوتے۔ جیسے اس نے وہاں پاؤں رکھا ہی نہ ہو۔ اور وہاں بھٹکنے کا امکان بہت زیادہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں سب کچھ ایک جیسا تھا۔ کہیں کوئی خاص نشانی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی وجہ سے سمتوں کا اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار وہ دونوں سورج غروب ہونے تک واپس نہیں ہوئے۔ اس کے بعد وہ راستہ بھٹک گئے۔ اور بڑی مشکل سے انھیں بستی کے نشان نظر آئے۔ ان کا اعتماد بحال ہوا۔ مگر وہ چند لمحوں کی بات تھی۔ بستی میں داخل ہونے سے پہلے ہی انھیں احساس ہو گیا کہ وہ ان کا گاؤں نہیں ہے۔ بعد میں انھیں پتا چلا کہ وہ شیو پور میں ہیں۔

زمین دار کی گاڑی میں انھیں ٹھاکروں کی گڑھی بھجوایا گیا، جہاں ان کی ڈھونڈ مچی تھی۔ لالٹینیں اٹھائے ہوئے گاؤں کے لوگ انھیں صحرا میں ڈھونڈ رہے تھے۔ پتا جی بہت پریشان تھے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اسے دیکھتے ہی انھوں نے اسے لپٹا لیا۔ ''کہاں چلے گئے تھے تم اوتار سنگھ؟''

''گھومنے گیا تھا پتا جی۔ پھر راستہ بھول گیا۔''

''صحرا میں راستہ بھولنا بہت آسان ہوتا ہے پتر۔ اور ایک بار راستہ بھول جائے تو صحرا منش کو نگل جاتا ہے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''پرنتو مجھے کچھ یاد آ گیا۔ پھر مجھے وشواس ہو گیا کہ تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں شانت ہو گیا۔ پر من میں ہلکی سی چنتا لگی رہی۔''

''آپ کو کیا یاد آیا تھا پتا جی؟''

''کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔'' ٹھاکر نے تیزی سے کہا۔ پھر بات بدل دی۔ ''اور تم بھٹک کر بھیشن پور نکل جاتے تو اچھا نہ ہوتا۔ اب ایسے نہ نکلنا کبھی۔''

''واہ پتا جی...... بھٹکنے کے ڈر سے گھومنا چھوڑ دوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ جو من میں آئے کرو پتر۔ پر بھیشن پور کے معاملے میں احتیاط کرنا۔''

صحرا کے مشرق کی طرف شیو پور تھا اور جنوب کی طرف بھیشن پور۔ اوتار سنگھ نے گھومنا پھرنا تو نہیں چھوڑا۔ مگر جنوب کی سمت کا وہ [illegible] خیال [illegible] اس کی [illegible] کہ پتا جی کی

نافرمانی وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تب ایک دن اس نے وہ جادوئی منظر دیکھا، جس کے بعد اسے ساون سے محبت ہو گئی۔

وہ منظر اسے آج بھی یاد تھا۔ مگر اس منظر میں ایک جادو اور تھا۔ وہ یہ کہ اسے جب بھی دیکھو، لگتا تھا کہ پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے آج ساون کی گھٹا گھر کر آئی تو اوتار سنگھ وصال دین کی طرف چل دیا۔

حمیدہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ ''آؤ چھوٹے ٹھاکر، تم تو کبھی آتے ہی نہیں۔''

''پڑھائی میں لگا رہتا ہوں ناماں۔'' اوتار نے کہا۔ پھر شکایتی لہجے میں بولا۔ ''تم ایسے پکارتی ہو اماں تو اچھا نہیں لگتا۔''

''کیسے پکارتی ہوں میں؟'' حمیدہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمھارے لیے ٹھاکر ہوں اماں۔'' اوتار کے لہجے کی شکایت اور بڑھ گئی۔

حمیدہ سمجھ گئی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم تو بیٹے ہو میرے۔ اچھا لسی لاؤں تمھارے لیے؟''

''نہیں اماں۔ اس وقت تو میں بس ویر جی کو لینے آیا ہوں۔''

''تو جلدی کیا ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟''

''بس اماں، سورج غروب ہونے سے پہلے کچھ دیکھنا ہے۔''

اتنے میں وصال دین کمرے سے نکل آیا تھا۔ ''بھائی...... تم کب آئے؟''

اوتار سنگھ نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگا۔ ''بس چلو نا ویر جی۔ دیر نہیں کرنی ہے۔''

وہ دونوں صحرا کی طرف چل دیے۔

گاؤں کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر انھوں نے صحرا کی طرف دیکھا۔ ڈوبتے سورج کی دم توڑتی روشنی میں ریت لوہے کے ذرات جیسی لگ رہی تھی...... سیاہی مائل۔ لیکن چمک دار اور حدِ نظر تک صحرا ہی صحرا تھا۔ کہیں کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ بس ایک مقام تھا، جہاں آسمان ریت کو چومتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نظروں کی آخری حد تھی۔ لیکن اوتار سنگھ جانتا تھا کہ کل نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکے گی۔

اچانک ایک خیال نے اوتار سنگھ کو بری طرح چونکا دیا۔ اس کے وجود میں خود ملامتی کی ایک تند اونچی لہر اٹھی اور اسے اندر سے بھگو گئی۔ ارے...... کیا میں آواز والی کو بھول گیا؟ اس کی آواز کو بھول گیا؟''

بس اس کے بعد ایک ہی خیال تھا، جو اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اسے فوری طور پر مولوی صاحب کے پاس پہنچنا ہے...... سورج ڈوبنے سے پہلے!

''آؤ ویر جی چلیں۔'' اس نے وصال دین کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''ایسی جلدی کیا ہے بھائی۔'' وصال دین نے بے پروائی سے کہا۔

''جلدی ہے ویر جی۔ مجھے سورج ڈوبنے سے پہلے حویلی پہنچنا ہے...... مولوی صاحب کے پاس۔''

سورج ڈوبنے کے حوالے پر وصال دین کو مغرب کا خیال آیا اور وہ شرمندہ ہو گیا۔ اسے تو خیال ہی نہیں رہا تھا لیکن فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ ابھی مغرب میں کچھ وقت تھا۔

لیکن اوتار سنگھ کو بہت جلدی تھی۔ پہلے تو وہ تیز قدموں سے چلا۔ پھر باقاعدہ دوڑنے لگا۔ وصال دین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اوتار سنگھ تو حویلی کی طرف جا رہا ہے جبکہ اسے ابھی مغرب کی نماز ادا کرنا تھی۔ وہ حویلی جاتا تو نماز قضا ہو جاتی۔

''بھائی...... میں گھر جاؤں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ کیونکہ اوتار سنگھ اسے چلنے کو کہتا تو وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔

مگر خلافِ توقع اوتار سنگھ نے اس سے کہا۔ ''ٹھیک ہے ویر جی۔ تم گھر جاؤ۔''

وصال دین نے سکون کی سانس لی اور اپنا رخ گھر کی طرف کر لیا۔ وہ کم سوچنے والا سادہ طبیعت کا لڑکا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کچھ مخصوص اوقات میں اوتار سنگھ اسے ساتھ رکھنے سے گریز کرتا ہے۔

اوتار سنگھ پوری قوت سے حویلی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ وہ اس وقت نیچے والی اور اس کی آواز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس کا ایسا راز تھی، جس میں وہ کسی کو بھی شریک نہیں کر سکتا تھا...... ویر جی کو بھی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہر معاملے میں وصال دین کو شریک کرنے کی خواہش کے باوجود اس نے اسے مولوی صاحب کی پڑھائی میں شریک نہیں کیا تھا اور اس وقت جبکہ اسے مولوی صاحب سے عربی سننا تھی تو وہ وصال دین کو ساتھ لے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

حویلی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے سورج کو دیکھا۔ سورج اب بھی ایک بڑے زرد گولے جیسا دکھائی دے رہا تھا...... یعنی وہ ابھی غروب ہونے کے عمل میں داخل نہیں ہوا تھا۔

اس نے سکون کی سانس لی اور مولوی صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔

مگر مولوی صاحب کا کمرا خالی تھا۔ وہ پریشان ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب غسل خانے کی طرف سے آتے نظر آئے۔ ان کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں بھیگے ہوئے تھے۔ ''ارے اوتار سنگھ، خیریت تو ہے، ہانپ کیوں رہے ہو؟'' انھوں نے اس سے پوچھا۔

اوتار سنگھ کی سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی۔ ''وہ...... مولوی صاحب...... مجھے...... عربی میں...... کچھ سنا دیجیے۔''

مولوی صاحب کو روز کا معمول یاد آ گیا۔ ''آج وقت کچھ کم ہے......'' انھوں نے کہا۔

اوتار سنگھ نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ یہ احساس اس سے زیادہ کسی کو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے تو احساس جرم ہو رہا تھا ساون کی محبت میں گھٹا کو امنڈتے دیکھ کر وہ اپنی اصل محبت کو بھول گیا تھا۔

''مگر ٹھیک ہے۔'' مولوی صاحب نے مزید کہا۔ ''ادب سے بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں کچھ سناتا ہوں۔''

اوتار سنگھ بیٹھا اور ہمہ تن ساعت ہو گیا۔

مولوی صاحب نے قرأت شروع کی...... اور پھر وہی ہوا۔ احساس جرم معدوم ہو گیا۔ اس پر سپردگی اور خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اب وہ پھر دہلی میں اسی کوٹھے پر تھا!

❁......❁......❁

رات ہو گئی تھی۔ اوتار سنگھ مولوی صاحب کے پاؤں دبا رہا تھا۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہونے کے ذرا دیر بعد ہی بارش شروع ہوئی تھی۔ تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ رکنا تو دور کی بات، بارش کے زور میں معمولی سی کمی تک نہیں ہوئی تھی اور اوتار سنگھ نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو آسمان بالکل سیاہ تھا۔ یعنی گھٹا اسی طرح چھائی ہوئی تھی۔

مولوی صاحب کسمسائے۔ اوتار سنگھ جانتا تھا کہ وہ کیا کہیں گے۔ وہ پاؤں دباتا رہا۔

''بس بیٹے، اب مجھے نیند آ رہی ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''تھوڑی دیر اور مولوی صاحب'' اوتار سنگھ کے لہجے میں لجاجت تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹے۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ جب مجھے نیند آتی ہے تو جسم پر ہلکا سا دباؤ بھی نیند کو دور کر دیتا ہے۔''

اوتار سنگھ نے فوراً ہی ہاتھ روک لیے۔ کہیں مولوی صاحب کی نیند اڑ نہ جائے۔ وہ بہت آہستگی سے بستر سے اترا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف چلا روشنی گل کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکل آیا۔ اس کا رخ پتا جی کے کمرے کی طرف تھا۔ جواب اس کی خواب گاہ بھی تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ معمول کے مطابق بیٹھے اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دوبارہ لکھنے لگے۔ چند لمحے بعد انھوں نے ڈائری ایک طرف کی اور قلم بھی رکھ دیا۔ ''آؤ پتر، سناؤ کیسا دن گزرا؟''

''ہمیشہ کی طرح اچھا پتا جی۔'' اوتار سنگھ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اور تمھاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''

''بہت اچھی۔ مولوی صاحب بہت اچھے استاد ہیں۔''

''سو تو ہیں ہی۔ پر میرا پتر دنیا کا سب سے اچھا شاگرد ہے۔''

اوتار سنگھ شرمندہ ہو گیا۔ اپنی تعریف سننا اسے کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ الفاظ پتا جی کے نہیں ہیں۔ ضرور انھوں نے مولوی صاحب سے بات کی ہو گی اور یہ مولوی صاحب نے کہا ہو گا۔ ''آپ نے مولوی صاحب سے بات کی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''اوش کی تھی۔'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمھاری پڑھائی کے لیے میں بہت چنتا کرتا ہوں۔ تمھاری طرف سے نہیں، بلکہ اس بات کی کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔''

اوتار سنگھ کو ان پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ وہ ان کا بیٹا تھا۔ مگر وہ اس کی عزت بڑوں کی طرح سے کرتے تھے۔ کیوں؟ یہ بات وہ کبھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ ''پتا آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ بہت اچھے استاد دیے ہیں۔''

''اس میں میرا کچھ نہیں پتر۔ یہ سب تو بھاگیا کی باتیں ہیں اور تم بھاگیاوان ہو۔'' ٹھاکر نے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں سے تجسس جھلکنے لگا۔ ''مولوی صاحب سے تم کیا پڑھتے ہو پتر؟''

اوتار سنگھ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''عربی پڑھتا ہوں۔''

''سو تو میں بھی جانتا ہوں۔ پر تو عربی میں کیا پڑھتے ہو؟''

''عربی زبان...... اس کے قواعد۔ بس ابھی تو یہی پڑھ رہا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے جواب دیا۔ ''جو میں نے ابھی تک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے قواعد بہت منظم اور ذخیرہ الفاظ بہت بڑا ہے۔ ایک چیز کے لیے اس زبان میں کئی کئی لفظ ہیں۔'' اوتار سنگھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس زبان کا ادب، اس کی شاعری پڑھنا چاہتا ہے، لیکن مولوی صاحب اسے صرف قواعد میں الجھائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ شکایت ہوتی...... اور استاد کی شکایت گستاخی ہوتی ہے۔ پھر سچی بات یہ کہ مولوی صاحب ہی سمجھ سکتے تھے کہ کس چیز کی کیا اہمیت ہے۔ وہ تو نہیں جانتا تھا۔

''یہ بتاؤ پتر کہ تمھیں عربی پڑھنے کا خیال کیسے آیا؟''

یہ اوتار [illegible] کی [illegible] اوتار [illegible] پتا جی کے ساتھ کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ ''بس پتا جی۔ ایک دن [illegible] یہ نام [illegible] تو من [illegible] چاہا کہ میں یہ زبان پڑھ لوں، ہندی، اردو، فارسی اور انگلش [illegible] پڑھ [illegible] ہیں [illegible]۔''

''[illegible]۔'' ٹھاکر نے ہنکارا بھرا۔ پھر پرخیال لہجے میں بولا۔ ''[illegible] کوئی بات [illegible] نہیں آتی۔ [illegible] نامعلوم [illegible] کو کسی اور طرف لے جانا چاہتی ہیں [illegible] من میں خود [illegible] خیال آتا ہے۔'' ''میں سمجھا نہیں پتا جی۔'' اوتار سنگھ [illegible] طرح چونکا۔

''[illegible] نہیں پتر۔ پوری طرح تو میں بھی نہیں سمجھا ہوں۔ بس [illegible] سے [illegible] تھی یہ [illegible] کہ تم [illegible] بیٹے [illegible] ابھی نہیں جانتا تھا۔ [illegible] وہ [illegible] جانے [illegible] اوتار سنگھ کو

وہ بات معنی خیز لگی تھی اور وہ اسی پر غور کر رہا تھا۔

''آج ساون کی جھڑی لگی ہے۔'' ٹھاکر نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔

''جی پتاجی۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔''

''ساگر بھی برس جائے تو صحرا کی پیاس نہیں بجھتی۔''

''اچھا اب آپ لیٹ جائیں...... میں آپ کے پیر دبا دوں۔''

''روز روز کیوں تکلیف کرتے ہو پتر۔''

''تکلیف نہیں پتاجی، یہ تو میرا دھرم ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر شرمندہ ہو گیا۔ اس نے تو کبھی اپنے پتا کے پاؤں نہیں دبائے تھے۔ دبانے کی کوشش کرتا تو بھی وہ دبانے نہ دیتے۔ کہتے، یہ اتنے نوکر چاکر کس لیے ہیں۔ ''تم نے شاستروں میں پڑھی ہے یہ بات؟'' اس نے پوچھا۔

''شاستروں کا تو مجھے نہیں پتا۔ بس میرا من کہتا ہے۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

ٹھاکر لیٹ گیا اور اوتار سنگھ اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ٹھاکر کو اس سے بڑا سکون ملتا تھا۔ لیکن جب اوتار سنگھ اس کے ساتھ لیٹتا، اس سے لپٹتا تو وہ اس کے لیے دنیا کی سب سے بڑی راحت ہوتی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نیند کو ترسے ہوئے ٹھاکر کو اب پر سکون نیند آنے لگی تھی۔

''بس اب لیٹ جاؤ پتر۔'' تھوڑی دیر بعد ٹھاکر نے کہا۔ ''اب نیند آ رہی ہے۔''

اوتار سنگھ ٹھاکر سے لپٹ کر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد ہی اسے اندازہ ہوا کہ پتاجی سو چکے ہیں۔ وہ مسکرایا۔ کتنی اچھی بات ہے کہ وہ سونے لگے ہیں۔ اس نے اس عرصے میں ٹھاکر میں بہت بڑا فرق دیکھا تھا۔ اس کی صحت بہتر ہو گئی تھی۔ کاش...... یہ خیال مجھے پہلے ہی آ گیا ہوتا۔ پچھتاوے کا کانٹا اس کے دل میں چبھنے لگا۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وجہ اسے معلوم تھی۔ بارش! اس کا بس چلتا تو اسی وقت وہ صحرا کی طرف چل دیتا۔ اب وہ صبح کا منتظر تھا۔

اس نے پتاجی کے اچھی طرح سونے کا اطمینان کیا۔ پھر اٹھ کر روشنی گل کی اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کھڑکی کے شیشے سے چہرہ لگایا۔ شیشہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ٹھنڈا بھی اور دھندلا بھی۔ اس کے باوجود نظر آ رہا تھا کہ بارش بہت تیز ہو رہی ہے۔ ویسے تو یہ بتانے کے لیے بارش کا شور ہی بہت تھا۔

کچھ دیر وہ کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ پتاجی اس سے لپٹ کر سونے کے عادی ہیں۔ کہیں اس کے نہ ہونے سے ان کی نیند نہ اچٹ جائے۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسہری کی طرف چل دیا۔

مولوی برکت علی بڑی الجھن میں تھے۔ کبھی تو وہ یہ تک سوچنے لگتے تھے کہ یہ ٹیوشن قبول کر کے انھوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ خود کو ایسی آزمائش میں ڈال دیا ہے، جس سے صحیح و سلامت نکلنا ممکن نہیں ہے۔ الجھن کی وجہ ان کا شاگرد تھا۔

وہ پورا معاملہ ہی پیچیدہ تھا۔ ابتداء میں انھیں اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ ان کے شاگرد کی اہلیت، لیاقت اور اس کی سیکھنے کی لگن کی شدت...... بلا شبہ یہ سب لائق تعریف عوامل تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ غیر مسلم تھا اور اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا سیکھ رہا ہے اس سے تو خود اس کے لیے بھی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔ مگر وہ اس سے بے خبر تھا۔ جبکہ مولوی صاحب باخبر تھے۔ اس لیے پریشانی بھی ان کے لیے تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عربی ایسی زبان نہیں کہ آدمی یونہی سیکھ لے اور وہ اسے آ بھی جائے۔ کوئی بھی زبان، جب تک اسے اندر نہ اتارا جائے، اس پر دسترس نہیں ہوتی۔ لیکن عربی زبان اس معاملے میں سب سے آگے ہے۔ برسوں کی ریاضت کے بعد ہی کوئی اس پر دسترس حاصل کر سکتا ہے۔

مگر اوتار سنگھ کا ذہن بہت تیز تھا اور سیکھنے کی خواہش بے حد توانا۔ فہم کے اعتبار سے وہ غیر معمولی لڑکا تھا۔ اگر وہ مسلمان ہوتا تو مولوی برکت علی خود کو بہت خوش نصیب سمجھتے کہ انھیں ایسا شاگرد ملا ہے۔ پھر اس کا خاندانی پس منظر الگ ایک مسئلہ تھا۔ وہ ایک متمول راج پوت گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ مولوی صاحب جانتے تھے کہ ذرا سی بھی چوک ہو گئی تو ان کے جینے کے لالے پڑ جائیں گے۔ وہ تو مصیبت میں پھنس گئے تھے۔

ابھی تو انھوں نے اسے حروف اور قواعد کے پھیر میں الجھایا ہوا تھا مگر وہ جانتے تھے کہ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ اوتار سنگھ کی رفتار کم کرنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا، جو اس نے خود انھیں دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے اس زبان پر قدرت حاصل کرنی ہے۔ انھوں نے اس کی یہ بات پکڑ لی تھی۔ جب بھی وہ تیزی کی کوشش کرتا، وہ اسے ٹوک دیتے۔ ''بیٹے، عربی تو اس طرح تم سیکھ لو گے لیکن اس پر قدرت نہیں حاصل کر سکو گے۔ آہستہ چلو آہستہ۔''

اور شاید اوتار سنگھ کے لیے یہ بات بڑی اہم تھی۔ کیونکہ وہ فوراً ہی تیز رفتاری ختم کر دیتا۔

مولوی برکت علی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ قواعد سے نمٹنے کے بعد اوتار سنگھ لازمی طور پر عربی لٹریچر پڑھنے کی خواہش کرتا۔ دور جاہلیت کا عربی ادب وہ اسے پڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ جدید عہد کا عربی لٹریچر ہندوستان میں دستیاب نہیں تھا۔ کچھ یوں بھی تھا کہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عربی میں دلچسپی صرف مسلمانوں کو تھی اور اس کا سبب، اس کا محرک صرف اور صرف دین تھا۔ لہٰذا صرف اپنی کتب مل سکتی تھیں۔ قرآن پاک، حدیث اور سنت پر کتابوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن

اوتار سنگھ کو وہ یہ سب کچھ پڑھا نہیں سکتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کسی کو پتا چل جاتا تو ان کی زندگی تک خطرے میں پڑ جاتی یہی کہا جاتا کہ وہ اس کا دھرم بھرشٹ کر رہے ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ بہر حال مشرک تھا۔ جبکہ ان کتابوں کو تو وہ خود بھی وضو کیے بغیر نہیں چھوتے تھے۔ وہ انھیں ہاتھ لگائے، اس کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

تو سوال یہ تھا کہ یہ مرحلہ آنے پر وہ اسے پڑھنے کو کیا دیں اور ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اس وقت خود کو سوتا ظاہر کر کے انھوں نے اسے رخصت کیا اور خود اس مسئلے پر سوچتے رہے۔ وہ بہت اچھا شاگرد تھا۔ صرف پڑھنے کے معاملے میں نہیں۔ شاگردی کے آداب بھی اسے خوب آتے تھے۔ وہ نہ صرف احترام کرنے والا تھا، بلکہ بے حد خدمت گزار بھی تھا۔ وہ احسان مانتا تھا کہ وہ اسے پڑھا رہے ہیں ایسی خدمت تو مولوی صاحب کی کسی نے کبھی نہیں کی تھی۔

مولوی صاحب نے ایک بات سمجھ لی تھی۔ در حقیقت انھوں نے بہت غلط عرصے میں یہ ٹیوشن قبول کی تھی۔ گرمی کی سالانہ چھٹیاں، یہی وجہ تھی کہ وہ جن کی طرح ان کے سر پر سوار رہتا تھا۔ اسکول کے دن ہوتے تو اوتار سنگھ کے پاس اتنی فرصت ہی نہ ہوتی۔ عربی کو وہ بہت کم وقت دیتا۔

اس خیال کے ساتھ ہی ایک ترکیب ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ کل اس پر عمل کریں گے۔ یوں اوتار سنگھ کی رفتار اور کم ہو جائے گی۔ وہ ایسے مطمئن ہوئے کہ انھیں نیند آ گئی!

صبح ہوتے ہوتے بارش تھم گئی تھی!

اوتار سنگھ ایسا بے تاب ہو رہا تھا کہ ناشتہ کیے بغیر ہی حویلی سے نکل آیا اور وصال دین کے گھر کی طرف چل دیا۔ گاؤں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کسی نے اسے دھو کر بالکل نیا کر دیا ہے...... نیا اور اجلا اجلا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر اب بھی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ یہ طے تھا کہ ابھی بارش اور ہوگی۔

وصال دین بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''مجھے معلوم تھا بھائی، آج تم ضرور آؤ گے۔''

''تم نے ناشتہ کیا ہے چھوٹے ٹھاکر؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

''نہیں اماں۔''

''تو وصال دین کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں گرم گرم روٹی ڈال رہی ہوں۔ مکھن موجود ہے۔''

اوتار سنگھ کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن حمیدہ کے کہنے پر بیٹھ گیا۔ وہ تو اس وقت بس یہ چاہتا تھا کہ اڑ کر صحرا میں پہنچ جائے۔ مگر اماں کی اتاری ہوئی گرم گرم روٹی، اماں کا بلویا ہوا مکھن اور لسی...... اس کی بھوک بھڑک اٹھی۔ وہ کھانے بیٹھا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ عجیب سواد تھا اماں کے ہاتھ کے کھانے میں۔

وصال دین پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی کھا گیا ہے۔ اس نے لسی کا گلاس خالی کر کے رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو...... ویر جی اب چلنا ہے۔'' اس نے وصال دین کو پکارا۔

''آتا ہوں بھائی۔'' وصال دین نے کمرے سے جواب دیا۔

''ابھی ذرا دیر رکو۔'' حمیدہ نے کہا۔

''کیوں اماں؟'' اوتار سنگھ نے بے صبرے پن سے کہا۔

''بس کہہ جو دیا کہ رکو۔ ابھی تم لوگ نہیں جا سکتے۔ میں اجازت دوں گی تو جاؤ گے نا۔''

اوتار سنگھ بیٹھ گیا۔ مگر وہ اندر ہی اندر مچل رہا تھا۔ ایک ایک پل اسے گراں گزر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حمیدہ ایک پوٹلیا لیے ہوئے آئی۔ ''لو یہ رکھ لو۔'' اس نے پوٹلیا وصال دین کی طرف بڑھائی۔

''یہ کیا ہے اماں؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔

روٹی مکھن اور ساگ ہے۔'' حمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے روکا تھا تمھیں۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے اماں؟''

''بچے ہو میرے۔ جانتی نہیں ہوں کیا تمھیں۔'' حمیدہ نے بڑے مان سے کہا۔ ''اب نکلو گے تو گھر کا ہوش تھوڑی رہے گا تمھیں۔ شام سے پہلے تو لوٹو گے نہیں۔ ساون میں بھوک بہت لگتی ہے۔''

اوتار سنگھ نے دل میں حمیدہ کو اس کی عقل مندی پر سراہا۔ واقعی وہ ان کا مزاج خوب سمجھتی تھی۔

وہ دونوں چلنے لگے۔ دروازے تک پہنچے تو حمیدہ نے پکارا۔ ''سنو لاٹھیاں لیتے جاؤ۔ آج کل سانپ بہت نکل آتے ہیں بلوں سے۔''

وصال دین خاموشی سے جا کر کوٹھری سے دو لاٹھیاں نکال لایا۔ ایک لاٹھی اس نے اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دی اور دوسری خود رکھ لی۔

''اور ہاں، خیال رکھنا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے واپس آ جانا ورنہ ٹھاکر بھیا مجھ پر بہت خفا ہوں گے۔''

اوتار سنگھ مسکرایا۔ یہ اماں کا خاص ہتھیار تھا۔ اس سے کوئی ایسی بات منوانی ہوتی، جس کے بارے میں انھیں خدشہ ہوتا کہ وہ بھول جائے گا تو وہ یہ جملہ بڑے اہتمام سے کہتیں۔ حالانکہ اوتار سنگھ نے پتا جی کو کبھی اماں پر خفا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے پتا جی کو غصہ کرتے ہی نہیں دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے اماں۔ ہم شام سے پہلے آ جائیں گے۔'' اس نے کہا۔ وہ دونوں گھر سے

نکل آئے۔

❀......❀......❀

وہ گاؤں کی سرحد پر سحر زدہ سے کھڑے سامنے کا منظر دیکھے جا رہے تھے!

صحرا کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہاں تو اب ایک جنگل کھڑا تھا۔ رنگا رنگ پھولوں کے پودے، راتوں رات دھرتی سے نکل آئے تھے۔ ٹنڈ منڈ درخت ہرے بھرے ہو گئے تھے۔ ان پر نئی کونپلیں پھوٹی تھیں اور وہ نکھرے ہوئے پتوں سے سج گئے تھے۔ کیکٹس کے تمام پودوں پر پھول نکل آئے تھے...... نازک اور خوش رنگ پھول! اور تو اور خاردار جھاڑیاں بھی ریشم جیسی نرم لگ رہی تھیں، جیسے کسی نے ان پر مخمل کا غلاف چڑھا دیا ہو۔

یہ وہ منظر تھا کہ جب بھی دیکھو، نیا لگتا تھا۔ یہ منظر اس شعر کی تصویر تھا......

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

اوتار سنگھ نے جب پہلی بار یہ شعر پڑھا تو حیران رہ گیا۔ جب اس نے پہلی بار صحرا کو لباس تبدیل کرتے دیکھا تھا تو اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا۔ وہ شاعر نہیں تھا کہ اسے شعور میں ڈھال لیتا۔ یہ شعر پڑھ کر اس نے سوچا تھا کہ یہ شعر وہی کہہ سکتا ہے، جس نے صحرا کو پل میں روپ بدلتے دیکھا ہو اور اسے سمجھ بھی وہی سکتا تھا، جس کی صحرا سے شناسائی ہو۔

وہ جادو لگتا تھا اور صحرا جادو نگری تھا۔ کسی نے جادو کی چھڑی گھمائی اور جادو کے زور سے سب کچھ بدل گیا۔ بدلنے کا اس سے تیز، اس سے بھرپور مفہوم کسی اور نظارے میں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بارش سے پہلے کے ٹنڈ منڈ درخت تعداد میں بہت کم لگتے تھے۔ لیکن بارش کے بعد ان کی تعداد بہت زیادہ لگتی تھی۔ یا شاید زیادہ ہو ہی جاتی تھی۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی کیونکہ بارش کے نتیجے میں ایک دن میں یہ تو ممکن نہیں تھا کہ کچھ اگے بھی...... اور فوراً ہی درخت بھی بن جائے۔

وہ دونوں دیر تک سحر زدہ سے کھڑے وہ منظر دیکھتے رہے۔

اوتار سنگھ پیچھے...... بہت پیچھے پہنچ گیا تھا...... زندگی کے اس ابتدائی دور میں، جب اس نے غور و فکر...... تجسس کرنا سیکھا تھا۔

جب وہ ہر وقت سوالوں سے بھرا رہتا تھا اور ہر وقت جواب کھوجتا تھا۔ آج پھر اس کی وہی کیفیت ہو گئی۔ ایک اہم سوال کا جواب جو ملنا تھا۔

ایک بات اس نے سمجھ لی تھی۔ زندگی چار عناصر کی مرہون منت تھی۔ مٹی، پانی، آگ اور ہوا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کم ہو جاتا تو زندگی ختم ہو جاتی۔ وہ ہمیشہ سوچتا تھا کہ چاروں میں اہم ترین عنصر کون سا ہے۔

اس نے یہ بات اپنے تینوں معلموں سے پوچھی تھی۔ ''دیکھ پتر، ہر دیوتا کو اپنا کام کرنا ہے۔ سو وہ کرتے ہیں۔''

ماتا جی نے کہا تھا۔ ''بات صرف اتنی ہے کہ جیون کو چلتے رہنا ہے۔''

''تو جیون کو کبھی رکنا بھی ہوگا۔'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔

''نا پتر۔ جیون تو دھارا ہے۔ جنموں کا چکر ہے۔''

''جنموں کا چکر؟''

''ہاں پتر۔ جیون کا کوئی انت نہیں۔ سمے کی دھارا میں منش بار بار آتا ہے بھیس بدل کر۔''

''کیا مطلب ماتا جی؟''

''یہ سب کرموں کا کھیل ہے۔ کرم اچھے ہوں تو بہتر روپ ملتا ہے اگلے جیون میں۔ کرم برے ہوں تو برا روپ ملتا ہے۔ منش جانور بن کر بھی پیدا ہوتا ہے۔''

ماتا جی کے ساتھ یہ معاملہ تھا۔ سیدھی بات کو بھی الجھا دیتی تھیں۔ وہ عناصر پر تجسس کر رہا تھا اور انھوں نے اسے آواگون کا فلسفہ تھما دیا تھا۔ وہ کئی دن اس پر غور کرتا رہا۔ گائے کو دیکھتا تو سوچتا کہ کیا پچھلے جنم میں یہ عورت رہی ہوگی اور اس نے بہت اچھے کرم کیے ہوں گے تبھی تو یہ گئو ماتا بنی۔ ماتا جی کہتی تھیں کہ گائے سب سے اچھا روپ ہے اور وہ کتے کو دیکھتا تو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کا سوچتا۔ یہ سزا اس کی سمجھ میں بھی نہیں آئی اور اچھی بھی نہیں لگی کہ کسی نے اچھے کرم نہیں کیے تو بھگوان نے اسے کتا بنا دیا۔ اور گئو ماتا کی پوتر تا بھی اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ گائے جانور تھی، اور وہ بھی بے وقوف۔ جہاں چاہتی، گوبر کر دیتی۔ اسے ماتا کا درجہ کیسے دیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد اس نے ماسٹر جی سے رجوع کیا۔

''سب اپنی جگہ اہم ہیں۔'' ماسٹر جی نے کہا۔ ''کوئی ایک بھی کم ہو جائے تو زندگی ختم ہو جائے۔ سائنس بتاتی ہے کہ زمین جب سورج سے ٹوٹ کر علیحدہ ہوئی تو تپ رہی تھی۔ اس کی تپش سے بخارات بنے۔ بارش ہوئی...... اور لاکھوں سال برستی رہی۔ تب زمین ٹھنڈی ہوئی۔ پھر بارش کے نتیجے میں نباتات کی افزائش ہوئی۔ وہ زمین پر زندگی کا آغاز تھا۔ سورج نے توانائی دی۔ نباتات کی افزائش ہوئی۔ ہوا نے بیج اِدھر اُدھر بکھیرے۔ پھر بارش ہوئی تو بیجوں سے پودوں نے سر اٹھایا۔ اب کوئی بھی عنصر کم ہو جائے تو زندگی ختم۔''

''زندگی اس طرح شروع ہوئی تو ماسٹر جی، انسان کسی درخت پر اگا تھا؟''

ماسٹر جی بری طرح گڑبڑا گئے۔ ''منش کی نسل بڑھنے کا سسٹم الگ ہے۔''

''میں یہ پوچھ رہا ہوں ماسٹر جی کہ دنیا کا پہلا منش کیسے پیدا ہوا؟ وہ کسی درخت پر ہی اگا ہوگا نا۔''

ماسٹر جی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''نہیں اوتار سنگھ، سائنس بتاتی ہے کہ منش بندر تھا۔ ہزار سال کے ارتقائی عمل کے بعد وہ بندر سے منش کے روپ میں آیا۔

''تو پھر لاکھوں کروڑوں بندر، بندر کیسے رہ گئے۔ ان پر ارتقا کا عمل کیوں ناکام ہو گیا۔''

اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔ ''اور اب تو میں آپ سے یہ پوچھوں گا کہ پہلا بندر، پہلا ہاتھی، پہلا کتا، ہر پہلا جاندار کیسے وجود میں آیا۔ مان لیا کہ بندر ترقی کر کے انسان بن گیا۔ مگر یہ تو بتائیں کہ بندر کہاں سے آیا؟''

ماسٹر جی تو تاچ کر رہ گئے۔ ''ہم بات عناصر کی کر رہے تھے۔'' انھوں نے جلدی سے کہا۔ پھر اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے عناصر کے بارے میں بے حد طویل تقریر کر ڈالی۔ آخر میں انھوں نے فیصلہ سنایا کہ چاروں عناصر یکساں طور پر اہم ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

اوتار سنگھ بے حد معاملہ فہم تھا اور اس میں خوبی تھی کہ وہ کسی بات کے پیچھے نہیں پڑتا تھا۔ اس کا مقصد کسی کو عاجز کرنا، بے بسی میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔ وہ تو صرف جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ جب وہ سمجھ لیتا کہ اب یہاں سے معلومات حاصل نہیں ہو سکیں گی تو وہ بات ختم کر دیتا۔ اس وقت بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس نے سمجھ لیا کہ اب ماسٹر جی کچھ بتا نہیں سکیں گے۔ چنانچہ اس نے بات آگے نہیں بڑھائی۔

مگر اس کے دماغ میں آواگون کی پھانس بھی چبھی ہوئی تھی۔ اس نے ماسٹر جی کو اس سلسلے میں اکسانے کی کوشش کی۔

''یہ سب بکواس ہے۔'' ماسٹر جی نے تند لہجے میں کہا۔ وہ بہت محتاط تھے یہ جواب ہرگز نہیں دیتے۔ مگر پچھلی گفتگو نے انھیں جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا اس جھنجلاہٹ میں انھوں نے یہ جواب دیا۔ ''منش مر گیا تو سب کچھ ختم۔''

اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ اب ماسٹر جی سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ آخر میں وہ حمیدہ کے پاس گیا۔

''چھوٹے ٹھاکر، میرے بیٹے...... میں پڑھی لکھی نہیں ہوں۔'' حمیدہ کے لہجے میں معذرت تھی۔

''اس سے کیا ہوتا ہے اماں۔'' اوتار سنگھ بولا۔ ''میں پڑھتا ہوں، مگر تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔ بتاؤ نا اماں۔''

حمیدہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''مجھ جاہل کی سمجھ میں یہ تو آتا ہے کہ ترتیب بہرحال ہوتی ہے۔ مٹی کے پیٹ میں بیج پڑا ہوتا ہے۔ لیکن پانی کے بغیر بیج سے کلا نہیں پھوٹتا۔ زندگی پانی سے شروع ہوتی ہے۔ پھر مٹی کام آتی ہے۔ اس کے بعد سورج بڑھوتی کرتا ہے۔ بیج کی۔ اسے درخت بناتا ہے۔ ہوا بیج بکھیرتی ہے۔''

وہ جواب بھی تسلی بخش نہیں تھا۔ اوتار سنگھ دوسرے مرحلے کی طرف بڑھ گیا۔ ''یہ بتاؤ اماں، پہلا آدمی کیسے پیدا ہوا؟''

حمیدہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''اللہ نے پیدا کیا تھا۔''

اوتار سنگھ مایوس ہو گیا۔ اب اماں کہیں گی، خود بخود پیدا ہو گیا تھا۔ تاہم پوچھے بغیر وہ نہ مانا۔ ''کیسے؟''

''مٹی سے۔ اللہ نے مٹی سے اس کا پتلا بنایا۔''

''جیسے مورت ہوتی ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''مگر اس میں تو زندگی نہیں ہوتی۔''

''اس لیے کہ اسے اللہ نے نہیں بنایا، آدمی نے بنایا ہے۔ اللہ نے پہلے پتلا بنایا۔ پھر اس میں روح پھونک دی۔''

''اچھا اس کا کوئی نام بھی تو ہو گا۔''

''ہاں۔ وہ حضرت آدم تھے...... پہلے انسان۔''

''مگر اب جو اتنے سارے منش ہیں۔''

''حضرت آدم اکیلے تھے۔ ان کا ہم جنس، ان جیسا کوئی نہیں تھا، ان کی تنہائی دور کرنے کے لیے اللہ نے ان کی پسلی سے عورت کو پیدا فرمایا۔ وہ حضرت حوا تھیں۔ ان دونوں کی اولاد تمام انسان ہیں۔''

اوتار سنگھ کی دلچسپی کہیں کی کہیں پہنچ گئی۔ ''یعنی ان کے بعد تمام انسان ویسے پیدا ہوئے جیسے ہوتے ہیں۔ یہ بات تو دل کو لگتی ہے اماں۔''

مگر وہی لمحہ تھا کہ حمیدہ بھڑک گئی۔ ارے...... وہ ٹھاکر اوتار سنگھ کو دین پڑھا رہی ہے۔ یہ تو آگ سے کھیلنا ہوا۔ ''بس بیٹے، تم مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھا کرو۔''

''اچھا، اب نہیں پوچھوں گا۔'' اوتار سنگھ نے نہایت سعادت مندی سے کہا۔ ''بس ایک بات اور بتا دو۔ یہ تمہارا کون سا جنم ہے؟''

حمیدہ دونوں ہاتھوں سے رخسار پیٹنے لگی۔ ''توبہ توبہ۔ ہر آدمی کو زندگی بس دو بار ملتی ہے۔ ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ اللہ نے جتنی عمر اسے دی ہوتی ہے، اتنا جیتا ہے۔ پھر وقت آنے پر مر جاتا ہے اور مٹی میں مل جاتا ہے۔''

اوتار سنگھ خوش ہو گیا۔ دو جنم کی بات تو اماں بھی کر رہی ہیں۔ اس نے سوچا۔ پھر بولا۔

''وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں اماں۔ یہ تمہارا پہلا جنم ہے یا دوسرا؟''

''زندگی بس ایک ہی ہوتی ہے۔ دوسری زندگی تو قیامت کے دن سب کو ایک ساتھ ملے گی۔ اور قیامت ابھی نہیں آئی ہے۔ دوسری زندگی جب ملے گی تو اسے موت کبھی نہیں آئے گی۔ تب ہر آدمی ہمیشہ زندہ رہے گا۔''

اب اوتار سنگھ الجھ گیا۔ یہ معاملہ زیادہ پیچیدہ معلوم ہو رہا تھا۔ ''یہ قیامت کیا ہوتی ہے اماں؟''

''میں نہیں بتا سکتی چھوٹے ٹھاکر۔ اور جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ کبھی کسی سے نہ کہنا۔ ورنہ ٹھاکر بھیا ہم سب کو زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔'' حمیدہ کے لہجے میں خوف تھا۔

''میں کسی سے نہیں کہوں گا اماں۔ تم بتاؤ تو۔''

مگر حمیدہ نے چپ سادھ لی۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ اب وہ اس کی زبان نہیں کھلوا سکتا تھا۔

''کہاں کھوئے ہوئے ہو بھائی۔'' وصال دین کی آواز اوتار سنگھ کو حال کی دنیا میں کھینچ لائی۔ ''چلو نا...... بیر بہوٹیاں پکڑیں۔''

مگر وصال دین اس وقت ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک جسیم خیال کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔ اس نے بے دھیانی سے کہا۔ ''جلدی کیا ہے۔ ابھی چلتے ہیں۔''

وصال دین نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ پھر سر جھٹک دیا۔

اوتار سنگھ سامنے دیکھتا رہا۔ مگر درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ موہوم سے اس خیال کے خدوخال واضح ہوتے جا رہے تھے۔

اس نے صحرا کا تصور کرنے کی کوشش کی...... صحرا جو کل تھا۔ لیکن کھلی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہوئے یہ کام آسان نہیں تھا۔ ہرے بھرے جنگل کو دیکھتے ہوئے اس مردہ صحرا کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

اس بار مردہ صحرا کا منظر اس کے سامنے تھا۔ واقعی! وہ تو جیسے مردہ زمین تھی۔ اور اب...... بارش کے بعد اب وہ زندہ ہو گئی تھی۔ واضح طور پر وہ سانسیں لیتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے سینے پر سبزہ لہلہا رہا تھا۔ درخت تیز تیز سانسیں لے رہے تھے۔ پتے ہل رہے تھے۔ پھول جھوم رہے تھے۔ رنگ مسکرا رہے تھے۔ خوشبوئیں مل جل کر...... ایک دوسری کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالیاں بجاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس لمحے اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ پانی بہت اہم ہے۔ زندگی پانی کے دم سے ہے۔ پانی سے ہی شروع ہوئی ہوگی۔ جب کچھ بھی نہیں رہا ہوگا، تب بھی سب پہلے پانی ہی رہا ہوگا۔

اس آواز اور اس آواز والی کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ غور و فکر کر رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس محبت نے اسے اپنی جستجو اور تلاش سے دور کر دیا تھا۔ اسے بہت اچھا لگا۔ لیکن چند ہی لمحے بعد وہ بلا ارادہ پھر اس آواز کے بارے میں سوچنے لگا۔ باقی سب اس کے ذہن سے نکل گیا۔

''آؤ دیر جی، چلیں۔'' اس نے وصال دین سے کہا۔

دونوں صحرا کی حدود میں داخل ہو گئے۔ وصال دین نے جلدی سے شیشی میں تھوڑی سی

ریت بھر لی۔ اوتار سنگھ نے بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ریت کو چھوا اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ ریت بھیگی ہوئی تو نہیں تھی۔ لیکن ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ جبکہ عام دنوں میں اس پر ننگے پاؤں چلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے پتا جی کی کہی ہوئی، رات کی بات یاد آئی...... ساگر بھی برس جائے تو صحرا کی پیاس نہیں بجھتی۔

وہ بیر بہوٹیاں تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ چھوٹی بیر بہوٹیوں کو وہ نظر انداز کر رہے تھے۔ مگر انہیں دیکھنے کی خوشی بھی بہت بڑی تھی۔ سرخ...... خوبصورت سرخ رنگ کی یہ ننھی سی مخلوق جیسے نرم ملائم ریشم سے بنی تھی۔ ایسی کہ اسے دیکھ کر حیرت ہو کہ بھگوان نے کیا کیا بنایا ہے اور کیسا بنایا ہے۔ اپنی پتلی لمبی ٹانگوں پر چلتی وہ بہت عجیب لگتی تھی۔ عجیب اور خوبصورت۔ مگر جب وہ اپنے پنجے بند کر لیتی تو اسے دیکھ کر سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کوئی مخلوق ہے۔ ایسے میں اسے دیکھ کر اوتار سنگھ کو پتا جی کی انگوٹھی یاد آتی تھی، جس میں بہت خوبصورت سرخ پتھر جڑا تھا۔ اوتار سنگھ کو وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ اکثر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن ٹھاکر کو اس بات کا احساس ہو گیا۔ اس نے انگوٹھی اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔ ''لو پتر...... اچھی طرح دیکھ لو اسے۔''

اوتار سنگھ نے پتھر کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ بہت خوش رنگ اور بے داغ تھا۔

''یہ یاقوت ہے پتر۔ بہت اچھی کوالٹی کا پتھر بہت مہنگا اور بہت خوبصورت ہوتا ہے تم پہنو گے۔''

''نہیں پتا جی۔ دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ انگوٹھی پہننے کا مجھے شوق نہیں۔''

مگر پنجے سمیٹے ہوئے، ساکت بیر بہوٹی یاقوت سے ہزار گنا خوبصورت لگتی ہے اور دوسرے زاویے سے دیکھو تو یاقوت جتنا سخت ہوتا ہے، بیر بہوٹی اتنی ہی نازک ہوتی ہے۔ اسے بڑی نزاکت اور احتیاط سے پکڑا جاتا ہے۔ ایک بار انگلی اور انگوٹھے کا دباؤ ذرا سا بڑھ گیا تھا تو اس کے ہاتھ میں موجود بیر بہوٹی بیچ سے پچک گئی تھی، جیسے بہت پکا ہوا انگور ذرا سے دباؤ سے پھٹ جاتا ہے۔ اس کی انگلیوں پر سیال سا چپک گیا تھا۔ اس کا دل برا ہو گیا۔

انھوں نے آٹھ دس بڑی بڑی بیر بہوٹیاں پکڑ کر شیشی میں ڈال لیں۔ پھر وہ مزید رنگ جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ رنگ پھولوں کی شکل میں تھے جنہیں وہ شیشی میں اگا رہے تھے۔

وہ دن ہی رنگوں سے کھیلنے کا تھا۔ ان کے ہاتھ ایک مشغلہ اور آ گیا۔ وہ تتلیوں کے پیچھے بھاگتے پھرے۔ بڑی مشکل سے بھاگ دوڑ کر کے وہ کسی تتلی کو پکڑتے۔ مگر فوراً ہی چھوڑ دیتے۔ پھر وہ انگلی اور انگوٹھے کے پوروں پر موجود ریشمی لمس کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے محسوس کرتے۔ وہ عجیب جادوئی لمس تھا۔ دل میں پھول کھلتے محسوس ہوتے تھے۔

دوپہر ہوئی تو انھیں بھوک کا احساس ہوا۔ انھوں نے ندی کے کنارے بیٹھ کر کھانا

کھایا۔ پھر وہیں بیٹھ کر انھوں نے اپنا محبوب مشغلہ شروع کیا۔ انھوں نے شیشی میں سے اپنے لیے ایک ایک بیر بہوٹی منتخب کی۔ انھوں نے ریت پر ایک لکیر کھینچی اور دونوں بیر بہوٹیوں کو اس لکیر پر رکھ دیا۔ پھر انھوں نے کچھ فاصلے پر ایک اور لکیر کھینچ دی۔ وہ گویا وننگ پوسٹ تھی۔ جس کی بیر بہوٹی پہلے وہ لکیر پار کر جاتی وہ جیت جاتا۔

بیر بہوٹی کی عجیب فطرت ہے۔ ہاتھ میں لینا تو بڑی بات ہے، وہ کسی کی موجودگی بھی محسوس کر لے تو اپنے پنجے سمیٹ کر ایک خول کی صورت میں بند ہو جاتی ہے اس وقت بھی دونوں کی بیر بہوٹیوں کی یہی پوزیشن تھی۔ وہ ساکت تھیں۔

ان کے اندر جنبش تک نہیں تھی۔ اس کا منتر ان دونوں کے پاس تھا۔ دونوں اپنی اپنی بیر بہوٹی پر جھک کر وہ منتر گنگنانے لگے۔ ''بیر بہوٹی اپنے انجے پنجے کھول۔ تیرا ماموں لڈو پیڑے لایا۔ بیر بہوٹی اپنے انجے پنجے کھول......''

چند ہی لمحوں میں بیر بہوٹیوں نے اپنے پنجے کھول دیے۔ لیکن وصال دین کی بیر بہوٹی نے فوراً ہی اپنا رخ تبدیل کیا اور دوسری لکیر کی طرف بڑھنے کے بجائے اسی لکیر پر چلنے لگی۔

''ارے یہ کیا۔'' وصال دین چلایا۔ ''ادھر کہاں جا رہی ہو۔ ادھر چلو۔'' اس نے جلدی سے اپنی بیر بہوٹی کو پکڑ کر اس کی سمت درست کی۔ مگر بیر بہوٹی پھر اپنے پنجے بند کر کے بیٹھ گئی۔

دوسری طرف اوتار سنگھ کی بیر بہوٹی ذرا ٹیڑھی سمت سہی، بہر حال دوسری لکیر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ''شاباش......تھوڑا تیز چلو......کچھ اور تیز......شاباش میری بیر بہوٹی......'' اوتار سنگھ اسے بڑھاوا دے رہا تھا، جیسے وہ سب کچھ سن اور سمجھ رہی ہو۔

ادھر وصال دین اپنی بیر بہوٹی کی سمت درست کرنے کے بعد التجائیہ لہجے میں منتر گنگنا رہا تھا۔ ''بیر بہوٹی اپنے انجے پنجے کھول......''

بالآخر وصال دین کی بیر بہوٹی نے اپنے پنجے کھولے اور چلنا شروع کیا۔ چلنا کیسا، وہ تو اب دوڑ رہی تھی، جیسے سچ مچ کسی دوڑ میں حصہ لے رہی ہو جبکہ اوتار سنگھ کی بیر بہوٹی خراماں خراماں چل رہی تھی اور اس نے ٹیڑھا چل کر اپنی مسافت اور بڑھا لی تھی۔

دونوں بیر بہوٹیوں کے درمیان فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ ادھر دوسری لکیر بھی زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔ دونوں لڑکے چیخ چیخ کر اپنی اپنی بیر بہوٹی کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ وہ اپنے اس کھیل میں اتنے منہمک تھے کہ انھوں نے بھاری قدموں کی قریب آتی ہوئی آہٹیں بھی نہیں سنیں۔

ہاں انھیں اس پر حیرت ضرور ہوئی کہ دونوں بیر بہوٹیوں نے اچانک ہی اپنے پنجے سمیٹ لیے۔

''یہ کیا؟'' وصال دین نے کہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ اب پھر منتر پڑھنا ہوگا اور

نجانے بیر بہوٹیاں پنجے کھولنے میں کتنی دیر لگائیں۔

❁......❁......❁

ان آٹھوں کو یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اب وہ مایوس ہونے لگے تھے۔ ویسے تو وہ آئے ہی ناخوش تھے۔ جسونت کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ آتے ہی نہیں۔ پندرہ سال کے ایک عام سے لڑکے کو ٹھکانے لگانے کے لیے آٹھ آدمی!۔ ان کے خیال میں یہ بات ذلت آمیز تھی۔

''یارا...... یہ کام تو میں اکیلا ہی کر آؤں گا۔'' کرتارے نے جسونت سے کہا۔ ''کیوں ہم سب کو ذلیل کرتے ہو۔''

''دیکھو...... میں بہت سوچ سمجھ کر کام کر رہا ہوں۔'' جسونت نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اس میں احتیاط ضروری ہے صرف ٹھکانے لگانا کافی نہیں ہے۔ کام ایسے ہو کہ کوئی نشان بھی نہ چھوڑا جائے۔ کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔ ورنہ ایک نشان ہی ٹھاکر پرتاپ کو اصل آدمی تک پہنچا دے گا۔''

''اور اصل آدمی کون ہے؟''

''یہ تمھیں پتا نہ ہو، اسی میں بھلائی ہے۔''

اس پر کرتارا آپے سے باہر ہو گیا۔ ''او یار جسونت، صاف بول نا کہ ہم کو زنانی سمجھتا ہے۔ او کوئی ہم سے کچھ اگلوا سکتا ہے بھلا۔''

''کام میری مرضی کے مطابق کرنا ہے۔'' جسونت نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں نے کسی کو وچن دیا ہے کہ اونچ نیچ نہیں ہوگی۔ تو مجھے اس وچن کا پالن کرنا ہے۔''

''تو یارا، مکھی کو مارنے کے لیے توپ چلاؤ گے۔'' اس بار گوپال نے زبان کھولی۔

''تو تم لوگ رہنے دو۔ میں کسی اور سے بات کر لوں گا۔''

یہ سن کر کرتارا تیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔ یہ تو بہت بڑی بے عزتی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا یار کسی اور سے کام لے۔ ''پر یارا، سمجھا تو۔ یہ سب کیوں؟''

''بات یہ ہے کہ وہاں چھپنا آسان نہیں۔ وہ کوئی شہر تو ہے نہیں۔''

''یہی تو میں کہتا ہوں۔'' کرتارے نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک آدمی کا کام ہے۔ ایک آدمی کا چھپنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آٹھ آدمیوں کی کیا ضرورت ہے اور آٹھ آدمی کہاں چھپ سکتے ہیں۔''

''بدھی سے کام لے کرتارے۔ مجھ کو بتایا گیا ہے کہ لڑکا من موجی ہے۔ کسی بھی وقت کسی بھی طرف نکل کھڑا ہوتا ہے اور نہیں نکلتا تو کئی کئی دن حویلی سے باہر بھی نہیں آتا۔ ایک بار تو وہ راستہ بھول کر دوسرے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں، تم لوگ ڈاکو بن کر جاؤ۔ موقع ملے تو بے شک کسی کو لوٹ بھی لو اور تم لوگ الگ الگ رہو۔ یوں تم پورے علاقے پر نظر رکھ سکو گے۔ میں نے

کہا تا کہ وہ کسی بھی وقت کہیں بھی نکل سکتا ہے۔ ایک آدمی ہو تو وہ برسوں بھی کسی کو نہیں ملے گا۔''
بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی تھی۔ پھر بھی دل نہیں مانتا تھا۔ یہ تو واقعی مکھی کو توپ کے گولے سے مارنے والی بات تھی۔ لیکن دوستی کا لحاظ تھا۔ کرتارے کو ماننا پڑا۔

یہاں آ کر وہ ایشور لال کی حویلی میں ٹھہرے۔ صبح سویرے جانکی داس انھیں کھانا دے کر رخصت کرتا اور وہ نکل کھڑے ہوتے۔ وہ اونٹوں پر سوار ہوتے اور صحرا میں پہنچ کر الگ ہو جاتے۔ دو وقت ان کی یکجائی کے ہوتے تھے۔ دوپہر میں کھانا کھانے کے لیے وہ ندی کے کنارے اکٹھا ہوتے اور رات کو واپس جاتے سمے بھی وہ وہیں ملتے۔ وہاں سے وہ ساتھ ہی مہیش پور جاتے۔

اس ایک ہفتے میں انھوں نے چند افراد کو لوٹا تھا۔ مگر قسمت کی بات کہ وہ سب دور پرے کے گاؤں دیہاتوں کے لوگ تھے۔ جو یا تو شہر کی طرف جا رہے تھے یا شہر سے گاؤں واپس آ رہے تھے۔ یوں قریب کے دیہاتوں میں ڈاکوؤں کی آمد کا چرچا نہ ہو سکا، جو وہ چاہ رہے تھے۔
بہر حال اس ایک ہفتے میں ان کا دل اچاٹ ہو گیا۔ من موجی لڑکا جس کی وجہ سے وہ یہاں آئے تھے، اس کی تو ایک جھلک بھی انھیں دکھائی نہیں دی تھی بس دو دن پہلے تو وہ تہہ خانے میں بیٹھ کر اس پر گفتگو کر رہے تھے کہ کیا اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے انھیں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی حویلی میں ہی گھسنا پڑے گا۔
''یہ تو بھول جاؤ۔'' کرتارے نے کہا تھا۔ ''دل تو میرا بھی یہی کرتا ہے۔ لیکن مجبوری ہے۔''

پھر کل شام موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ ان کے لیے تو وہ مسئلہ بن گئی۔ کہاں پناہ لیتے۔ مجبوراً ایک ایک کر کے وہ معمول سے پہلے مہیش پور چلے گئے تاہم کسی نے انھیں نہیں دیکھا۔ بارش کے نتیجے میں لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔
بارش ان کے لیے بڑی شبھ ثابت ہوئی تھی۔ صحرا ہرا بھرا ہونے کے بعد ایسا مقام نہیں رہا تھا کہ جہاں چھپنا کچھ مشکل ہو۔ بعض جگہوں پر تو وہ گھنا جنگل بن گیا تھا۔ ادھر موسم سے ان کی طبیعت بھی جولانی پر تھی۔

دوپہر کے وقت وہ یکجا ہوئے اور ندی کی طرف چل دیے۔ کرتارا آگے تھا۔ جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتے ہی انھیں وہ دونوں نظر آئے۔ اوتار سنگھ کو اس نے پہلی نظر ہی میں پہچان لیا۔ وہ اپنی تصویر کے عین مطابق تھا۔
کرتارے نے جھٹکے سے اپنے اونٹ کو روکا اور ہاتھ اٹھا کر ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر پلٹ کر سرگوشی میں بولا۔ ''شکار بھٹ سے نکل آیا ہے۔''
ان سب کے چہرے کھل اٹھے۔

''اونٹ یہیں باندھ دو۔ میں اور راجو آگے جائیں گے۔ باقی یہیں رکیں گے۔''
''تم سردار ہو کرتارے۔ موقع ہمیں ملنا چاہیے۔'' اس کے ایک ساتھی نے کہا۔
کرتارے نے چند لمحے سوچا۔ بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ یہ کام راجو اور گوپال کریں گے۔''
راجو اور گوپال نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں نے اپنے ہتھیاروں کو چھوا اور آگے بڑھ گئے۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ نے آہٹیں سنی تو تھیں۔ مگر اس کا دھیان بیر بہوٹی کی طرف تھا۔ اس لیے اس کے دماغ نے ان پر توجہ نہیں دی۔
دونوں بیر بہوٹیوں کے پنجے بند کرنے کے بعد اس کی چھٹی حس نے اچانک ہی اسے نامعلوم خطرے کا احساس دلایا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ڈھاٹے باندھے ہوئے دو افراد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بڑا بلم تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں خنجر تھا، جسے وہ بار بار دونوں ہاتھوں میں تول رہا تھا اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ وہ دشمن ہیں۔
وہ دونوں ابھی کوئی بیس قدم کے فاصلے پر تھے۔ اوتار سنگھ نے سرگوشی میں وصال دین کو پکارا۔ ''ویرجی...... جلدی کرو۔ لٹھیا سنبھالو۔''
وصال دین نے چونک کر ایک نظر اسے اور پھر ان دونوں کو دیکھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہو۔
ان کی لاٹھیاں کچھ دور پیچھے کی طرف پڑی تھیں۔ اوتار سنگھ تیزی سے جھپٹا اور لاٹھی اٹھا لی۔ اسی لمحے وصال دین بھی جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ بھی لاٹھی کی طرف لپکا۔ دونوں دوست لاٹھیاں اٹھانے کے بعد ایک دوسرے سے خاصا دور چلے گئے۔
ڈھاٹا باندھے ہوئے دونوں افراد نپے تلے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے لیکن ان دونوں نے جس انداز میں لاٹھیاں سنبھالی تھیں اس سے وہ کچھ جھجک گئے۔ انھوں نے پلٹ کر اس سمت دیکھا، جدھر سے وہ آئے تھے۔
ادھر کرتارے کی نگاہوں سے تشویش جھلکنے لگی تھی۔ لڑکوں نے جس انداز میں لاٹھیاں سنبھالی تھیں، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں لٹھیا چلانی آتی ہے۔ اور یہ خطرناک بات تھی۔ اگر وہ اوسط درجے کے لٹھیا باز بھی تھے تو راجو اور گوپال ان کے لیے ناکافی تھے۔
''دو آدمی اور چلے جائیں۔'' کرتارے نے اپنے ساتھیوں سے سرگوشی میں کہا۔
دو آدمی اور آگے بڑھ گئے۔
دونوں لڑکے لاٹھی سنبھالے کھڑے تھے۔ انھوں نے دو اور آدمیوں کو جھنڈ سے نکل کر

آتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں بھی نیزے تھے۔ دونوں لڑکوں کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ پُراعتماد بھی تھے۔ انھیں جمال دین جیسے ماہرِ فن نے یہ فن سکھایا تھا۔ لیکن کچھ ڈر بھی تھا کیونکہ آپس میں مشق کرنا اور بات ہے اور مسلح دشمنوں کا سامنا کرنا اور بات ہے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ ان کا واسطہ سچ مچ کے کسی دشمن سے پڑا تھا۔

نئے آنے والے دونوں آدمی اپنے پہلے ساتھیوں سے آ ملے۔ اب ان میں سے دو وصال دین کی طرف بڑھ رہے تھے اور دو اوتار سنگھ کی طرف۔

درمیانی فاصلہ کم ہوتے ہی دونوں لڑکے تیزی سے حرکت میں آئے۔ لاٹھیاں اتنی تیزی سے گردش کر رہی تھیں کہ نظر ہی نہیں آ رہی تھیں۔

پھر جو کچھ ہوا، وہ لمحوں میں ہوا۔ پہلے خنجر والا لپیٹ میں آیا۔ اس کا خنجر ہاتھ سے نکلا اور اڑتا ہوا دور جا گرا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر چیخ رہا تھا اور اس کا ہاتھ پہنچے کے پاس سے لٹک رہا تھا۔ دوسرا شکار کرپان والا تھا۔ اوتار سنگھ کی لاٹھی اس کی کنپٹی پر لگی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

دونوں نیزے والے بھی گھبرا گئے تھے۔ وہ نیزے سے لاٹھی کا کام لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن لٹھیا بازی کے فن سے نابلد تھے۔ انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ دیر نہیں ٹک سکیں گے۔ دشواری یہ بھی تھی کہ انھیں پلٹ کر بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔

وصال دین کچھ نروس تھا۔ اس کا ارتکاز مکمل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیزہ اس کے بازو کو چھو کر گزرا۔ اس کی قمیص پھٹ گئی اور بازو پر ایک لکیر سی کھنچ گئی، جو دیکھتے ہی دیکھتے خون سے بھر گئی۔

''تم ہٹ جاؤ ویرجی۔'' اوتار سنگھ نے اسے پکارا۔ ''انھیں میں سنبھال لوں گا۔''

لیکن زندگی بھر وفاداری کا سبق پڑھنے والا اس آزمائش سے منہ نہیں پھیر سکتا تھا۔

اُدھر جھنڈ میں صورتِ حال اور خراب تھی۔ دو ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر باقی لوگ میدان میں اترنا چاہتے تھے۔ جوش تو کرتارے کا خون بھی مار رہا تھا لیکن اسے اپنے وچن کی فکر بھی تھی۔ وہ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ''تم میں سے کوئی آگے نہیں بڑھے گا۔'' وہ سرگوشی میں پھنکارا۔

''تو اپنے ساتھیوں کو پٹتا دیکھتے رہیں۔'' رگھبیر نے غرا کر کہا۔

''اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ لٹھیا چلانی آتی ہے تم میں سے کسی کو۔'' کرتارے نے چیلنج کیا۔

وہ تینوں خاموش رہے۔

''ہم بیس بھی ہوتے تو ان کے لیے کم تھے۔'' کرتارے نے کہا۔ ''اور سوچنے کی کوشش کرو۔ ہمیں اپنے کسی ساتھی کو یہاں چھوڑ کر نہیں جانا ہے..... زندہ نہ مردہ۔ اور میں اکیلا سات آدمیوں کو لے کر نہیں جا سکتا۔''

اتنی دیر میں لڑکوں سے لڑنے والے ان کے دوسرے دو ساتھی بھی ڈھیر ہو چکے تھے۔

''چلو ویرجی گاؤں کی طرف۔'' اوتار سنگھ نے وصال دین سے کہا۔ ''ہمیں وہاں سے لوگوں کو لے کر آنا ہے۔''

''میں یہیں رک جاتا ہوں۔'' وصال دین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ان کی فکر نہ کرو ویرجی۔ یہ اٹھنے والے نہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔ ہمیں جانے اور واپس آنے میں بس دس منٹ لگیں گے۔''

بات ماننے والا وصال دین اوتار سنگھ کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

لڑکوں کے اوجھل ہوتے ہی کرتارا اور اس کے ساتھی اپنے گرے ہوئے ساتھیوں کی طرف لپکے۔ جس کی کنپٹی پر لٹھیا لگی تھی، وہ بے سدھ تھا۔ باقی تین ہوش میں تھے۔ مگر اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔ ''جلدی کرو۔'' کرتارے نے کہا۔

انھوں نے چاروں ساتھیوں کو اونٹوں پر لادا۔ ''اب کرنا کیا ہے؟'' رگھبیر نے پوچھا۔

''نکلنا ہے یہاں سے۔''

''مہیش پور چلیں گے؟''

''بے وقوف نہ بنو۔ اب اس علاقے میں ہمیں ایک پل بھی نہیں رکنا ہے۔'' کرتارے نے جھنجلا کر کہا۔

❁......❁......❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے وید کو وصال دین کی مرہم پٹی کرنے کو کہا اور اپنے ساتھ کچھ آدمیوں کو لے کر اوتار سنگھ کے ساتھ چل پڑا۔ کیدار ناتھ بھی ان کے ساتھ تھا۔

اس کے علاوہ وہ وہاں کوئی ایسی نشانی نہیں تھی، جو اس واقعے کی گواہی دے۔

کیدار ناتھ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور تمسخرانہ لہجے میں اوتار سنگھ سے بولا۔ ''پتر..... کہیں ایسا تو نہیں کہ تم دونوں نے خواب دیکھا ہو۔ یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

اوتار سنگھ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹھاکر پرتاپ نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''وصال دین کے بازو کا زخم تو اصلی ہے۔ یا وہ بھی خواب میں لگا ہے۔''

''کسی درخت کی شاخ سے خراش لگی ہو گی ٹھاکر ویر۔'' کیدار ناتھ نے بڑے ادب سے کہا۔ ''ورنہ سوچو تو۔ اتنی سی دیر میں چار زخمی آدمی کہاں جا سکتے ہیں۔ جبکہ پتر اوتار سنگھ کا کہنا ہے کہ وہ اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔''

ٹھاکر پرتاپ کے ساتھ ایک کھوجی بھی تھا۔ ٹھاکر نے اس سے کہا۔ ''تو اِدھر اُدھر دیکھ۔ مجھے لگتا ہے، ان کے اور ساتھی بھی ہوں گے۔''

اس دوران اوتار سنگھ متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا تھا۔ ندی کے کنارے ایک

چمکتی ہوئی چیز نظر آئی تو وہ اس طرف لپکا۔ وہ ایک حملہ آور کا خنجر تھا۔ ”یہ دیکھیں پتا جی۔“ اس نے پکارا۔

ٹھاکر پرتاپ اس کی طرف بڑھا۔ کھوجی چند لمحے اِدھر اُدھر جائزہ لینے کے بعد جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر نے وہاں پہنچ کر وہ خنجر اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ”یہ لو کیدار ناتھ، خواب کا خنجر خواب سے باہر بھی آ گیا ہے۔“

”میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا ٹھاکر ویر۔“ کیدار ناتھ نے کھسیا کر کہا۔ ”یہ نشانی تو نہیں دیکھی تھی نا میں نے۔“

ذرا ہی دیر میں کھوجی واپس آ گیا۔ ”وہ آٹھ اونٹوں پر سوار آٹھ منش تھے اَن داتا۔“ اس نے کہا۔

”چار نے حملہ کیا اور چار تماشا دیکھتے رہے۔“ ٹھاکر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ”انھیں وشواس ہوگا کہ دو لڑکوں کے لیے چار آدمی کافی ہیں۔ مگر جب انھوں نے چار ساتھیوں کو گرتے دیکھا تو حملہ کیوں نہیں کیا۔“ اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

”ڈاکوؤں کے دل بہت چھوٹے ہوتے ہیں ٹھاکر ویر۔“ کیدار ناتھ نے جلدی سے کہا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ڈاکو تھے؟“ ٹھاکر نے تیکھے لہجے میں کہا۔

کیدار ناتھ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اوتار سنگھ بول اٹھا۔ ”ان کے چہروں پر ڈھاٹے تھے پتا جی۔“

”دیکھا ٹھاکر ویر، میں نے کہا تھا نا۔“

”میں نہیں مانتا کیدار ناتھ کہ وہ ڈاکو تھے۔“

”لیکن کیوں ٹھاکر ویر؟“

”پچھلے دنوں اِدھر اُدھر کے گاؤں دیہاتوں میں ایسا کچھ نہیں سنا گیا۔ ورنہ آٹھ ڈاکو آ جائیں تو شور مچ جاتا ہے علاقے میں۔ پھر وہ ڈاکو ہوتے تو میرے چھوٹے اور وصال دین پر حملہ کیوں کرتے۔ ڈاکو تو مال دیکھ کر حملہ کرتے ہیں۔“ ٹھاکر نے دلیل دی۔

”تو ٹھاکر ویر، تمھارے خیال میں وہ کون تھے؟“

”وہ جو کوئی بھی تھے، میرے پتر کی جان لینا چاہتے تھے۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”صرف جان! مال سے انھیں کوئی غرض نہیں تھی۔“

”اگر وہ ڈاکو نہیں تھے تو انھوں نے ڈھاٹے کیوں باندھ رکھے تھے۔“ کیدار ناتھ نے اعتراض کیا۔

”خود کو چھپانے کے لیے۔ اور اسی لیے انھوں نے چار آدمی گرنے کے بعد مزید کوشش

نہیں کی۔ بلکہ ان چاروں کو اٹھا کر لے جانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ جو بھی تھے، شناخت سے بچنا چاہتے تھے۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے ٹھاکر ویر۔“ کیدار ناتھ نے لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے کہا۔

”مگر میری سمجھ میں بہت کچھ آ رہا ہے۔“ ٹھاکر بولا۔ ”خیر، اب اس پر حویلی میں بات ہوگی۔“

کیدار ناتھ کے من میں کھد بد ہو رہی تھی۔ وہ ٹھاکر کے ساتھ حویلی چلا آیا۔

وہ لوگ کچھ دیر ڈیوڑھی میں بیٹھے۔ ٹھاکر اپنے بیٹے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”پتر اوتار سنگھ۔“ بالآخر اس نے کہا۔ اس کا لہجہ بھی محبت سے چھلک رہا تھا۔ ”مجھے تم پر فخر ہے پتر۔ تم نے ثابت کر دیا کہ تم ٹھاکر ہو...... اصلی ٹھاکر۔“

اوتار سنگھ نے کچھ نہیں کہا۔ بس باپ کو دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ اب اس پر پابندیاں لگیں گی۔ وہ جانتا تھا کہ پتا جی اس سے کتنی محبت کرتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ اب وہ اسے اسکول نہ بھیجیں۔

”دیکھو پتر، جیون اوپر والے نے جتنا دیا ہے، منش اتنا ہی جیتا ہے۔ نہ ایک پل کم نہ ایک پل زیادہ۔“ ٹھاکر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”راجپوت موت سے نہیں ڈرتے۔ ہاں جنگ وہ جان لینے کے لیے لڑتے ہیں، جان دینے کے لیے نہیں۔ پر جانتے ہیں کہ اس کھیل میں جان جا بھی سکتی ہے۔ سو وہ بہادروں کی طرح جیتے اور بہادروں کی طرح مرتے ہیں۔“

اوتار سنگھ اب بھی چپ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے۔

”میں تم سے یہی کہوں گا پتر کہ جو ہوا، اسے بھول جاؤ۔ پر ہر بات کے لیے ہر وقت تیار رہو۔ جیسے چاہو جیو، جو چاہو کرو، جہاں چاہو جاؤ۔ بس یہ یاد رکھو کہ تم راجپوت ہو اور راجپوت دشمن پر دَیا کبھی نہیں کرتے۔“

”جی پتا جی۔“

ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟ کچھ بے کل ہو پتر؟“

”جی پتا جی، وہ پڑھنے کے لیے جانا ہے۔“

ٹھاکر بے ساختہ مسکرایا۔ پھر ہنسنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ خوامخواہ بیٹے کو پڑھا رہا ہے جبکہ بیٹا اس سے بھی بڑھ کر پکا ہے۔ ابھی اس پر جان لیوا حملہ ہوا تھا اور وہ...... وہ پڑھائی کی فکر میں بے حال ہو رہا تھا۔ ”تو تم جاؤ...... پڑھو۔ شاباش پتر۔“ اس نے کہا۔

اوتار سنگھ چلا گیا۔

کیدار ناتھ کی بے چینی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اوتار سنگھ کے جاتے ہی اس نے ٹھاکر سے کہا۔ ''ٹھاکر ویر، تمھارے خیال میں چھوٹے ٹھاکر کے جیون کو کوئی خطرہ ہے؟''

''جیون کے ساتھ مرن کا دھڑکا تو لگا ہی رہتا ہے کیدار ناتھ۔ جیون کا انت تو مرن ہی ہے نا۔ پل میں ہو یا برسوں میں۔'' ٹھاکر نے فلسفیانہ انداز میں کہا ''پر مجھے خوشی ہے کہ میرا پتر جانتا ہے...... جانتا ہے کہ ٹھاکر موت سے نہیں ڈرتے۔''

''پر ٹھاکر ویر، دھڑکا ہے تو اس کا اُپائے تو سوچنا ہوگا۔'' کیدار ناتھ نے کہا۔ ''اور دشمنی ہے تو اس کا کارن بھی ہوگا۔''

''ہوگا...... اوش ہوگا۔'' ٹھاکر نے بے پروائی سے کہا۔

کیدار ناتھ کو اس کی بے پروائی بہت عجیب اور غیر فطری لگی۔ ''میں دیکھتا ہوں ٹھاکر ویر کہ تم کچھ بے پروائی کر رہے ہو۔ چھوٹا ٹھاکر تمھارا ایک ہی پتر ہے...... تمھاری نسل چلانے والا۔ اگر اسے خطرہ ہے تو تمھیں اس کی حفاظت کی فکر کرنی ہوگی۔ پر تم تو اسے اور آزادی دے رہے ہو۔ جیسے چاہو جیو، جو چاہو کرو جہاں چاہو جاؤ۔ یہ کیا بات ہوئی؟''

ٹھاکر مسکرایا۔ ''مجھے اس کی کوئی چنتا نہیں۔''

''پر کیوں؟''

''یوں کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہوگا میرے پتر کو۔ وہ لمبا جیون جیے گا۔''

ٹھاکر کے لہجے کے یقین نے کیدار ناتھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ''اس کا اتنا وشواس کیوں ہے تمھیں؟''

''تم نہیں جانتے کیدار ناتھ کہ وہ مجھے کیسے ملا ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''مجھے بتا دیا گیا تھا کہ کوئی اس کا بال بانکا نہیں کر سکے گا۔''

''پھر بھی ٹھاکر ویر......''

''چھوڑو اس بات کو کیدار ناتھ۔ یہاں ایک تم ہی تو ہو، جس سے من کی بات کر سکتا ہوں۔ جب تک اوتار سنگھ پیدا نہیں ہوا تھا، میں سوچتا تھا کہ ساری زمین اپنے کارندوں میں بانٹ دوں گا۔ لیکن جب وہ پیدا ہوا تو مجھے جیون اچھا لگنے لگا۔'' ٹھاکر کہتے کہتے رکا۔ چند لمحے وہ کیدار ناتھ کو غور سے دیکھتا رہا۔ ''میں اپنی وصیت تیار کر چکا ہوں۔ اگر میرے پتر کو کچھ ہو گیا تو میرا سب کچھ سرکار کے پاس چلا جائے گا۔ اوتار سنگھ کو کچھ نہ ملا تو کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا اور بھگوان نے اسے جیون دیا تو میں نے اپنی وصیت میں سب کا خیال رکھا ہے۔ کوئی محروم نہیں رہے گا۔''

کیدار ناتھ کو لگا کہ ٹھاکر جان بوجھ کر اسے یہ سنا رہا ہے...... جتا رہا ہے...... سمجھا رہا ہے کہ اوتار سنگھ کے جینے میں ہی اس کا فائدہ ہے۔ اوتار سنگھ کو راستے سے ہٹا کر اسے کچھ نہیں ملے گا۔

''ایسی باتیں نہ سوچو ٹھاکر ویر۔'' کیدار ناتھ نے بجھے دل سے کہا۔ من میں وہ سوچ رہا

تھا کہ اب اسے جے پور جا کر جسونت سے بات کرنی پڑے گی۔

❀......❀......❀

مولوی برکت علی اس کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ''اوتار سنگھ، استاد ہونے کے ناتے ایک بات کا مجھے شروع ہی میں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمھیں پڑھانے کی فکر میں اسے میں بھول ہی گیا۔''

''میں سمجھا نہیں مولوی صاحب۔''

''بھئی اسکول میں تمھیں ہوم ورک بھی تو ملا ہوگا نا۔''

''جی ہاں۔ ملا ہے۔''

''اور میں نے اس کی فکر بھی نہیں کی۔ بس اپنا مضمون پڑھانے میں لگا رہا۔ بڑی غیر ذمے داری ہوئی مجھ سے۔ مگر خیر۔ ابھی کچھ دن کی چھٹیاں باقی ہیں۔ اس کی تلافی اب کرنی ہوگی۔''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب؟'' اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اب پہلے تم اپنا ہوم ورک مکمل کرو گے۔''

''وہ تو میں پہلے ہی مکمل کر چکا ہوں۔''

مولوی صاحب کو ایسا شاک لگا کہ وہ گنگ ہو کر رہ گئے۔ ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بڑی کوشش کے بعد انھوں نے خود کو سنبھالا۔ ''کک...... کیا...... کیا مطلب! تم ہوم ورک پہلے ہی کر چکے ہو؟''

''جی...... جی ہاں۔''

''ہر مضمون کا...... تمام مضامین کا۔''

''جی مولوی صاحب، تمام مضامین کا۔ لا کر دکھاؤں آپ کو۔''

''ہاں...... دکھاؤ تو۔''

''ابھی لاتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

مولوی صاحب نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ ہوم ورک دیکھنے میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انھیں یقین تھا کہ اوتار سنگھ نے کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ بس اس بہانے انھیں کچھ مہلت مل گئی۔ اب تو وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کہیں یہ لڑکا جن تو نہیں۔

کچھ دیر بعد اوتار سنگھ ہوم ورک کی کاپیاں لے آیا اور ہوم ورک چیک کرانے لگا۔

مولوی صاحب بے دلی سے دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔ ''ٹھیک ہے۔ شکر ہے کہ میں شرمندگی سے بچ گیا۔''

''چلیں...... پڑھائی شروع کریں۔'' اوتار سنگھ نے خوش ہو کر کہا۔

اب مولوی صاحب اور کیا کرسکتے تھے۔ وہ اسے پڑھانے لگے۔

اس رات مولوی صاحب پھر الجھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے وہی مسئلہ تھا۔ اب اوتار سنگھ جب عربی میں کچھ پڑھنا چاہے گا تو وہ کیا کریں گے؟ اس سوال کا تو کوئی جواب انھیں نہیں سوجھ رہا تھا۔ البتہ یہ انھوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے پڑھائے ہوئے کو بار بار ری وائز کراتے رہیں گے۔ اوتار سنگھ ایسا شاگرد تو ہے نہیں کہ کوئی اعتراض کرے۔ اس سے یہ ہوگا کہ اس کی بنیاد اور مضبوط ہوجائے گی۔

لیکن اصل مسئلے کا حل ابھی تلاش کرنا تھا۔ ری وائز کرانا اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے بالآخر ایک بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا..... یہ کہ وہ اردو کی کہانیاں اور داستانیں خود عربی میں منتقل کریں۔

یہ سوچنے کے بعد وہ مطمئن ہوگئے۔ مگر ساتھ ہی انھیں احساس ہوا کہ ان کا یہ شاگرد ان کے لیے کتنا فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی صلاحیتوں سے متعارف ہو رہے تھے۔ ورنہ شاید انھیں کبھی اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کا خیال نہ آتا۔

اس رات وہ سوئے تو بے حد مطمئن تھے!

❁....❁....❁

چھٹیاں اب ختم ہو رہی تھیں۔ اسکول کھلنے سے تین چار دن پہلے وہ دہلی کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ تاکہ وہاں رہنے کھانے کا بندوبست کرلیا جائے۔ چنانچہ وہ گڑھی میں ان کی آخری رات تھی۔

اوتار سنگھ معمول کے مطابق پتاجی کے پاؤں دبا رہا تھا۔ لیکن ٹھاکر پرتاپ سنگھ بہت بے چین تھا۔ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔

''کیا بات پتاجی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔

''اب طبیعت کا کیا پوچھتے ہو پتر۔ اب سال بھر ایسے ہی رہنا ہے۔''

''ایسی باتیں نہ کریں پتاجی۔''

''چھوڑو پتر۔ تم بس مجھ سے لپٹ کر لیٹ جاؤ۔''

اوتار سنگھ ٹھاکر سے لپٹ گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اب پتاجی کو اس نئے معمول کی..... اس سے لپٹ کر سونے کی عادت ہوگئی ہے۔ یہ سال تو انھیں بہت ہی بھاری لگے گا۔ اسے یاد آیا کہ جب پہلی بار وہ ان سے لپٹ کر سویا تھا تو انھوں نے کہا تھا کہ مدت سے وہ نیند کو ترسے ہوئے ہیں۔ تو کیا اب وہ پھر رات رات بھر جاگا کریں گے۔

اس خیال سے وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیا علاج ہے اس کا؟

''کیا یہ نہیں ہوسکتا پتر کہ تم دو دن اور رک جاؤ۔'' ٹھاکر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''ٹھیک ہے پتاجی۔ جو آپ کی اچھا۔'' اوتار سنگھ نے بلا جھجک کہا۔ ''اس بار تو میرا بالکل دل نہیں چاہتا ہے جانے کو۔''

ٹھاکر کو اس پر شدت سے پیار آیا۔ اس نے اسے بھینچ لیا۔ ''تم بہت اچھے ہو پتر۔ میں تو بچوں کی سی بات کر بیٹھا اس سے۔ ارے جانا ہے تو جانا ہے۔ دو دن سے کیا فرق پڑے گا۔ سال تو اکیلے ہی بتانا ہے نا۔''

اوتار سنگھ کا دل کٹنے لگا۔ ''پتاجی..... ایسا ہے کہ میں اسکول نہیں جاتا۔'' اوتار سنگھ نے بے حد خلوص سے کہا۔ کہنے کو تو وہ باپ کی محبت میں یہ بات کہہ گیا۔ لیکن فوراً ہی اس کی نگاہوں میں وہ کوٹھا پھر گیا..... سماعت میں وہ آواز گونجنے لگی......

لیکن وہ آزمائش بس ایک لمحے کی تھی۔ ٹھاکر نے کہا۔ ''ایسی بات نہ کرو پتر۔ تمھاری تعلیم میرا شوق ہے۔ اسکول تو تمھیں جانا ہے۔''

اوتار سنگھ اب شرمندہ تھا۔ اسکول جائے بغیر تو وہ خود بھی نہیں رہتا۔ یہ خیال اسے شرمندہ کر رہا تھا کہ اس آواز والی کی محبت باپ کی محبت کے منہ لگ رہی ہے۔

''تو پتاجی، آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ وہیں رہیں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں پتر..... یہ کہاں ممکن ہے۔ جیون کی بندشوں سے کہاں چھوٹتا ہے منش۔ چھوڑو اس بات کو۔''

مگر بات چھوڑ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آنکھیں بند کر لینے سے مسائل ختم نہیں ہو جاتے۔ یہ وہ رات تھی کہ وہ دونوں ہی نہیں سو سکتے تھے۔ یہ ان کے جاگنے کی رات تھی۔ دونوں کو معلوم تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ لیکن وہ سونے کی اداکاری کرتے رہے۔

وقت گزر ہی جاتا ہے۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ صبح روانگی تھی۔ وہ دو راج پوتوں کے لیے سخت آزمائش کا وقت تھا۔ بہرحال وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔

❁....❁....❁

دہلی میں سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ بس ایک تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ سرفراز بیگم کو ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ انھوں نے بچیوں کو قرآن کی تعلیم تو دلا دی تھی لیکن ان کی دینی تعلیم ابھی نامکمل ہے۔ حدیث شریف اور سیرت مبارکہ کے علم کے بغیر تو وہ مکمل نہیں ہوسکتی۔

محلے میں ایک خاتون تھیں..... مہرالنسا۔ سنا تھا کہ وہ ان علوم میں طاق ہیں۔ سرفراز بیگم نے ان سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے گھر میں ہی بچیوں کو تعلیم دیتی تھیں۔ لیکن سرفراز بیگم نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بچیاں گھر سے باہر قدم رکھیں۔

''آپ گھر پر آنے کی زحمت نہیں کرسکتیں؟'' سرفراز بیگم نے مہرالنسا سے کہا۔

مہرالنسا کچھ ہچکچائیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہاں اس زحمت کی انھیں معقول فیس بھی ملے گی۔ ''آپ انھیں میرے گھر ہی بھیج دیں نا۔ اجتماعی تعلیم زیادہ موثر اور دل نشیں ہوتی ہے۔'' انھوں نے کہا۔

''آپ میری بچیوں کے لیے وقت نکالیں نا۔'' سرفراز بیگم نے اصرار کیا۔

مہرالنسا سوچ میں پڑ گئیں۔ ''ان بہت ساری بچیوں کو میں نہیں چھوڑ سکتی جو میرے گھر پڑھنے کے لیے آتی ہیں۔'' انھوں نے کہا۔

''یہ تو میں چاہتی بھی نہیں۔ آپ الگ سے کوئی وقت دے دیں۔''

کچھ سوچ بچار کے بعد مہرالنسا نے کہا۔ ''تو ٹھیک ہے۔ میں عصر اور مغرب کے درمیان انھیں پڑھا دیا کروں گی۔''

تینوں لڑکیاں اس نئی مصروفیت سے بہت خوش تھیں۔ ان کی روز و شب کی یکسانیت، یہ معمول انھیں بہت خوش گوار لگا تھا۔

دوسری طرف حور بانو اوپر والوں کی آمد کا ایک ایک دن گن رہی تھی۔ اسکول کھلنے میں ایک ہفتہ رہ گیا تو اس نے ان کا انتظار شروع کر دیا لیکن اس انتظار میں نہ کوفت تھی نہ اداسی کیونکہ یہ یقینی انتظار تھا۔ اسکول کھلنے سے پہلے انھیں بہرحال آنا تھا۔ سو اب حور بانو کے لیے ہر لمحہ ان کے انتظار کا تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکراتی رہتی۔ بار بار چلمن کی طرف جاتی۔ چند لمحے وہاں کھڑی رہتی اور پھر لوٹ آتی۔ وہ بہت کم گو لیکن بے حد خوش مزاج ہو گئی تھی۔

چار دن اس انتظار میں گزر گئے اور وہ نہیں آئے۔ لیکن حور بانو خوش تھی۔ آج نہیں تو کل...... وہ آ ہی جائیں گے۔

اور پانچویں دن وہ آ گئے!

ان کی آمد سے چند لمحے پہلے حور بانو کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا اور اس کے قدم خود بہ خود چلمن کی جانب اٹھے۔ وہ وہاں جا کر کھڑی ہوئی ہی تھی کہ ایک بگھی اور تانگا سامنے آ کر رکا۔

تب حور بانو نے دو ماہ کے بعد پہلی بار چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا۔ ان دو مہینوں میں وہ پہلے سے اونچا ہو گیا تھا۔ یا شاید یہ اس کا گمان تھا!

❀......❀......❀

اوتار سنگھ کے دہلی جانے کے بعد وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی پہلی رات تھی!

دن تو جیسے تیسے اِدھر اُدھر کی مصروفیت میں گزر گیا۔ مگر اب رات...... پہاڑ جیسی رات منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ یہ رات جس سے وہ بہت پہلے سے خوف زدہ تھا۔ سوچتا رہتا تھا کہ یہ رات آئے گی تو وہ کیا کرے گا...... کیا گزرے گی اس پر۔ اور اب یہ رات آ گئی تھی۔

سارے معاملات نمٹانے کے بعد وہ مجبوراً اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اپنا سیف کھول کر اس نے وہ کتابیں نکالیں، جو وہ چھپا کر رکھتا تھا۔ اس مطالعے میں اس کا خوب دل لگتا تھا۔ لیکن اس روز معاملہ مختلف تھا۔ وہ کتاب کھول کر پڑھ رہا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں پڑھ رہا تھا۔ اسے ایک لفظ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ پھر وہ گہری سانس لے کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ یہ تو پہلی رات ہے۔ اس نے سوچا۔ اور ایک سال میں 365 راتیں ہوتی ہیں۔ کیا بنے گا میرا؟

اس کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بہت ناخوش تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہیں تھا وہ۔ حد یہ ہے کہ اس نے اوتار سنگھ کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر اس سے اس کے بارے میں بھی نہیں سوچا گیا۔

اس نے اپنی ڈائری نکالی اور بڑی بے دلی سے قلم اٹھایا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ لکھنے میں محو ہو گیا۔

اس ڈائری لکھنے کے شغل کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی۔ راجپوت ویسے بھی تلوار کے دھنی ہوتے ہیں، قلم کے نہیں۔ پھر زمین داری کا بکھیڑا الگ۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ڈائری لکھے گا۔

زمانہ تعلیم میں اس کا روم میٹ امان ڈائری لکھا کرتا تھا۔ ٹھاکر اسے ڈائری لکھتے دیکھ کر ہمیشہ الجھتا تھا۔ ''یہ تم کیا لکھتے رہتے ہو ڈائری میں؟'' اس نے امان سے پوچھا تھا۔

''بس یونہی۔'' امان نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''اچھا مجھے دکھاؤ۔''

''کیا کرو گے دیکھ کر؟''

''دیکھوں گا کہ تم اس میں کیا لکھتے ہو۔''

''یہ ڈائری ہے پرتاپ سنگھ۔ اور ڈائری بڑی ذاتی چیز ہوتی ہے۔ سوری...... یہ میں تمھیں نہیں دکھا سکتا۔''

''کیوں بھئی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ میں بس یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس میں کیا لکھتے ہو۔''

''یہی تو میں تمھیں سمجھا رہا ہوں۔'' امان نے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں معذرت تھی۔

''ڈائری میں آدمی وہ باتیں لکھتا ہے جو وہ کسی سے نہیں کر سکتا...... کسی سے بھی نہیں۔ تو جو باتیں وہ کسی سے کر نہیں سکتا، وہ کسی کو پڑھوا بھی نہیں سکتا۔ اسی لیے ڈائری بڑی ذاتی چیز ہوتی ہے۔''

ٹھاکر کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔ ''میں تو نہیں سمجھ پایا تمھاری بات۔''

''بھئی سیدھی سی بات ہے۔ ڈائری خود کلامی ہے...... ایک طرح سے خود سے گفتگو۔''

"تو کان گھما کر کیوں پکڑتے ہو؟ خود سے باتیں کر لیا کرو۔"

امان ہنسنے لگا۔ "یہ بتاؤ، تم مجھے خود سے باتیں کرتے دیکھو گے تو کیا سمجھو گے۔"

ٹھاکر نے چند لمحے غور کیا۔ پھر بولا۔ "پاگل ہی سمجھ سکتا ہوں۔"

"بس اس لیے میں خود سے باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ باتیں ڈائری میں لکھ لیتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں ایک بات اور نہیں آئی۔" ٹھاکر نے کہا۔ "ایسی کون سی باتیں ہو سکتی ہیں، جو منش کسی سے نہیں کر سکتا۔"

اس بار امان کو حیرت ہوئی۔ "کمال کرتے ہو۔ ارے آدمی سوچنے والا جانور ہے۔ دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ اس میں کیسے کیسے خیال آتے ہیں۔ اگر وہ کسی سے کہے تو وہ اسے برا، بہت برا سمجھنے لگے۔ آدمی تمام باتیں کسی سے نہیں کر سکتا۔"

"اپنے سب سے اچھے دوست سے بھی نہیں؟"

امان نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں تمہارا بہت اچھا دوست ہوں۔ اور تم جانتے ہو کہ راز رکھنا بھی جانتا ہوں۔ تم مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ گے تو مجھ سے آگے کبھی نہیں جائے گی۔"

"میں جانتا ہوں یہ بات۔" امان نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مگر بھائی، بہت سی باتیں میں تم سے بھی نہیں کر سکتا۔"

"بھروسا نہیں ہے مجھ پر۔" ٹھاکر کے لہجے میں خفگی تھی۔

"یہ بات نہیں۔ بھروسا ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو آدمی خود سے بھی کرے تو شرمندہ ہو جاتا ہے۔ میں وہ باتیں خود سے نہیں کر سکتا۔ تم سے کروں گا تو پھر کبھی تم سے نظریں نہیں ملا سکوں گا۔ تمہارا سامنا کرنے سے گھبرانے لگوں گا۔ شاید تمھیں چھوڑ ہی بیٹھوں۔"

"تب تو مجھے بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔" ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ "میں تمھیں کھونا نہیں چاہتا۔"

"چلو بات تمہاری سمجھ میں تو آئی۔" امان بولا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ایسا تمھارے ساتھ بھی ہوتا ہوگا۔ تو تم کیا کرتے ہو؟"

"مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہم ٹھاکر لوگ تو ہر بات صاف کرنے کے قائل ہیں۔ میرے دل میں جو بھی آتی ہے، میں کسی سے بھی کہہ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا۔"

امان نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "اتنا مت اکڑو۔ ابھی تم اس سے محفوظ ہو۔ لیکن یہ وقت ہر انسان پر آتا ہے۔"

"مجھ پر نہیں آئے گا۔" ٹھاکر نے بڑے یقین سے کہا۔

اس کے بعد بھی برسوں گزر رے۔ ٹھاکر کا یقین سلامت رہا۔ اس کی زندگی میں بھی کوئی پوشیدہ..... خفیہ موڑ نہیں آیا۔ دوسرے وہ صاحب اقتدار تھا۔ کسی سے کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔

پھر جب ٹھاکرانی کا دیہانت ہوا اور اوتار سنگھ تعلیم کے سلسلے میں دہلی چلا گیا تو وہ اکیلا رہ گیا۔ وہ ایسی تنہائی تھی، جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ زندگی جیسے رینگ رینگ کر چلنے لگی اور وہ رینگنا بھی برائے نام تھا۔ وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔ صبح سے شام کا انتظار رہتا۔ شام رات کے خوف میں گزرتی اور رات صبح کی آرزو میں کٹتی۔ چند ہی دنوں میں وہ اندر سے بیمار ہو گیا۔

گاؤں میں جمال دین کے علاوہ کوئی ایسا نہیں تھا، جس سے وہ قربت محسوس کرتا ہو۔ شام کے بعد جمال دین کا اس کے پاس آنا اور وقت گزارنا معمول بن گیا۔

اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے کا ایک ہی خواب جو اس نے اور رنجیتا نے ایک ہی رات دیکھا تھا، درخت کا سوکھنا، مجذوب کی آمد اور اس کی باتیں اوتار سنگھ کا اس کے کمرے میں پہنچنا، پھر اوتار سنگھ جس خاص حال میں پیدا ہوا تھا، جس کی وجہ سے دائی راجو اور شانتا کی شامت آ گئی تھی، پھر اوتار سنگھ کا دودھ سے انکار اور حمیدہ کا دودھ پینا...... یہ سب ایسے معاملات تھے، جنھیں وہ برسوں سے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا...... وہ ان پر کسی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ بہت کچھ واضح طور پر جاننا...... سمجھنا چاہتا تھا۔

ایک اعتبار سے جمال دین اس کا ہم راز تھا۔ ان میں سے کم از کم ایک معاملے سے واقف تھا۔ پھر اپنی فطرت، اپنی عادات اور اپنے کردار سے اس نے ٹھاکر کا دل جیت لیا تھا۔ ٹھاکر تو اسے اپنا دوست ہی سمجھتا تھا۔ لیکن وہ خود اسے زمین دار کا اور خود کو رعیت کا درجہ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے درمیان کبھی بے تکلفی کی فضا پیدا نہیں ہو سکی۔

ٹھاکر نے کئی بار جمال دین سے اس موضوع پر بات کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ہمت نہ ہوئی۔ اسے امان کی بات یاد آئی اور تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ کچھ باتیں آدمی کسی سے نہیں کر سکتا..... خود سے بھی نہیں۔

یوں پہلی بار اس نے ڈائری لکھنی شروع کی۔

گاؤں میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ٹھاکر کے حساب سے جمال دین جلدی گھر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ بھی تھی کہ ٹھاکر کو نیند آتی ہی نہیں تھی۔ یہ کمی اسے مطالعے کی طرف لے گئی۔ اور مطالعے نے ڈائری کی اہمیت اور بڑھا دی۔ اب تو تقریباً سبھی کچھ ایسا تھا، جس پر وہ کسی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ڈائری لکھنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

ڈائری لکھنے کی افادیت تو وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ ڈائری لکھنے کے بعد وہ بوجھل نہیں رہتا تھا۔ ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ مگر آج اس پر ڈائری لکھنے کا ایک اور فائدہ کھلا۔ جس وقت وہ کمرے میں آ کر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے اس نے مطالعے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ پڑھنے

کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دل لگ ہی نہیں رہا تھا۔ لیکن اب ڈائری لکھنے کے بعد وہ ہلکا ہوا تو اس نے کتاب اٹھائی اور سرسری طور پر اسے دیکھا۔ فوراً ہی اس کا دل کتاب میں لگ گیا۔ وہ مطالعے میں محو ہو گیا۔

جو کتابیں وہ پڑھتا تھا، اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے بہت بھاری تھیں۔ شوق ہونے کے باوجود وہ ایک حد سے زیادہ مطالعہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس حد سے بڑھ کر مطالعہ کرتا تو سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ لگتا خالی لفظوں سے سر ٹکرا رہا ہے۔ ایسے میں وہ سمجھ جاتا کہ اب مطالعہ چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب اسے مطالعے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

اس وقت بھی یہی ہوا اور اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

اس نے گہری سانس لے کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی رات آدھی سے زیادہ باقی تھی اور اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ وہی پرانا والا مسئلہ اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اوتار سنگھ کے جانے کے بعد اسے نیند کم ہی آتی تھی۔

وہ کمرے میں بے چینی سے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے تھکن کا احساس ہونے لگا۔ دماغی طور پر تو وہ پہلے ہی تھک چکا تھا۔ ڈائری لکھنے اور مطالعے کے بعد دماغی تھکن تو ہونا ہی تھا۔ اور اب جسم بھی تھک گیا تھا۔

تھکن کا تقاضا تھا کہ وہ لیٹ جائے۔ سو وہ لیٹ گیا۔ اس کے بعد وہی کروٹیں بدلنے کا پرانا معمول۔ کچھ دیر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اس وقت اوتار سنگھ اسے شدت سے یاد آ رہا تھا۔ کیسے وہ اس سے لپٹ کر لیٹتا تھا۔ اس نے ہاتھ پھیلائے اور جیسے اس کے ہاتھ نے اوتار سنگھ کو چھو لیا۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اوتار سنگھ کا تکیہ تھا۔ مگر اس میں حرارت تھی...... اوتار سنگھ کے جسم کا لمس تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ تکیے پر نہیں، اوتار سنگھ کے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھا ہے۔

اس کا دل طمانیت سے بھر گیا۔ اس نے تکیے کو اپنی طرف کھینچا اور یوں سینے سے لگا لیا، جیسے وہ اوتار سنگھ ہے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ سکون اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ اوتار سنگھ جاتے جاتے مجھے یہ تحفہ دے گیا ہے۔ اس نے سوچا۔ شاید اب اس کی جدائی کا سے اتنا سخت نہیں گزرے گا۔

اس کا خیال درست تھا۔ کچھ دیر وہ اس تکیے کو لپٹائے لیٹا رہا۔ پھر کب اسے نیند آئی، یہ اسے پتا ہی نہ چلا۔ اور وہ بہت گہری نیند تھی!

❀.....❀.....❀

مولوی صاحب گھر ان سب [illegible] ساتھ آ [illegible] تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھے بھی۔ پھر انھوں نے کہا۔ ''اوتار سنگھ [illegible] میں چلتا ہو[illegible]

''کہاں مولوی صاحب؟ کہاں جائیں گے آپ؟'' اوتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

مولوی صاحب کو اس کی حیرت پر حیرت ہوئی۔ ''ارے بھئی، اپنے گھر۔ اور کہاں جاؤں گا۔'' انھوں نے کہا۔

''گھر؟'' اوتار سنگھ نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں بھئی گھر، جہاں میں رہتا ہوں۔ میرے بچے رہتے ہیں۔''

اوتار سنگھ کو شاک لگا۔ اتنے دن مولوی صاحب اس کے ساتھ رہے تھے کہ وہ یہ سب بھول ہی گیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ مولوی صاحب دہلی میں رہتے ہیں۔ ان کا گھر ہے۔ بیوی بچے ہیں اور وہ اسی اسکول میں پڑھاتے بھی ہیں، جہاں وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اب وہ اپنے گھر تو جائیں گے۔ اور وہیں رہیں گے۔ وہ اداس ہو گیا۔ تو اب وہ ان کی خدمت سے...... ان کے پاؤں دبانے سے محروم ہو جائے گا!

''کچھ دیر اور رکیں نا مولوی صاحب۔'' اس نے کہا۔

مولوی صاحب نے جواب نہیں دیا۔ بس بیٹھ گئے۔ لیکن اضطراب ان کے صرف چہرے پر نہیں تھا۔ ان کا جسم تک مرتعش تھا۔ اوتار سنگھ نے انھیں غور سے دیکھا۔ اس بار بات ایک لمحے میں اس کی سمجھ میں آ گئی۔ گھر کو اور بیوی بچوں کو ترستے ہوئے مولوی صاحب کے لیے اس وقت ایک پل یہاں رکنا بھی دوبھر تھا۔ ان کا بس چلتا تو اڑ کر گھر پہنچ جاتے۔ اس کو احساس ہوا کہ اس وقت اس نے ان پر بڑا ظلم کیا تھا۔

''مجھے معاف کر دیجیے مولوی صاحب۔ آپ جائیے...... گھر جائیے آپ۔'' اس نے کہا۔

''چلا جاؤں گا۔ اب تین دن بعد اسکول کھل رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھنا ہو گا کہ میں تمھیں کب وقت دے سکوں گا۔''

''جی...... جی ہاں۔''

''تو اب یہ سمجھ لو کہ ایک ہفتے کی چھٹی۔ اس کے بعد پڑھائی کا وقت طے کریں گے۔''

ایک ہفتے کے لیے عربی پڑھنے کی چھٹی! یہ اوتار سنگھ کے لیے تکلیف دہ بات تھی۔ لیکن اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ مولوی صاحب کو اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچوں کے لیے کچھ وقت تو ملنا چاہیے۔ پھر اسے کوٹھے کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو بے تاب ہو رہا تھا کہ شام ہو اور وہ کوٹھے پر جائے۔

''جی مولوی صاحب، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں اتنے دن اپنا سبق دہراتا رہوں گا۔''

مولوی صاحب چلے گئے۔

اگلے چند گھنٹوں میں زندگی کے معمولات پھر سے جاری ہو گئے۔ رگھو بازار جا کر سودا لایا۔ اتنی دیر میں رنجنا نے گھر کی صفائی کر ڈالی۔ رگھو سودا لے کر آیا تو وہ رسوئی میں جا گھسی۔ تین گھنٹے بعد وہ دہلی میں پہلا کھانا کھا رہے تھے۔

اوتار سنگھ کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بہت بے چین، بہت مضطرب تھا۔ اس وقت اسے نہ اسکول کا خیال تھا نہ اسکول کی پڑھائی کا۔ نہ ہی اسے عربی کی پڑھائی کی فکر تھی۔ اس کے دماغ پر تو صرف کوٹھا سوار تھا۔ وہ یونہی وقت گزاری کے لیے کانتی پرشاد جی سے اور کبھی وصال دین سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی بے تابی ایسی تھی کہ وقت سے کچھ پہلے ہی وہ کوٹھے پر چلا گیا۔

رنجنا اوپر آ کر صفائی کر گئی تھی۔ کرسیاں اس نے جھاڑ پونچھ کر ترتیب سے رکھ دی تھیں۔ اس لیے کوٹھا ویسا ہی لگ رہا تھا، جیسا وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس بار اس نے کتابیں ساتھ لانے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔

وہ بیٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھتا...... جائزہ لیتا رہا۔ لیکن گرد و پیش سے درحقیقت اسے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ محض وقت گزاری تھی۔ چند منٹ میں ہی وہ اکتا گیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

دیر ہو گئی۔ مگر وہ آواز سنائی نہیں دی، جس کا انتظار وہ دو ماہ سے کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ وقت سے کافی پہلے اوپر آ گیا ہے۔ مگر پھر اسے گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ اس کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ ان دو مہینوں کی دوری میں ایسا کیا ہو گیا کہ آج وہ آواز سنائی نہیں دے رہی۔ کہیں وہ......! اس کہیں وہ کے آگے متعدد امکانات تھے، جن پر وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے ٹہلنے کی رفتار دوڑنے کے برابر ہو گئی ہے۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ نیچے سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے!

❀......❀......❀

دو ماہ سے ترسی ہوئی حور بانو کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کی ایک جھلک دیکھ چکی تھی اور اس جھلک نے اسے اور بے تاب کر دیا تھا۔ وہ بار بار دالان کے چکر لگا رہی تھی۔

پھر اس نے اون کا گولا، اپنی سلائیاں اور ادھ بنا سویٹر اٹھایا اور دالان میں پڑے تخت پر آ بیٹھی۔ لیکن اس کی سلائیاں حرکت میں نہیں تھیں۔ اس کیفیت میں وہ بننے کی کوشش کرتی تو یقیناً غلط پھندے ہی ڈالتی۔

وہ وہاں بیٹھی رہی۔ اس کی نظریں نامکمل سویٹر پر تھیں۔ لیکن سماعت اوپر والے مکان کی آوازوں پر مرکوز تھی۔ عقل اسے کہتی تھی کہ وہ شام کو اسی مخصوص وقت میں کوٹھے پر جائے گا۔ مگر دل مُصر تھا کہ وہ یہاں بیٹھ کر انتظار کرے۔ کون جانے، آج وہ جلدی ہی آ جائے۔

زینے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ بغیر دیکھے وہ بتا سکتی تھی کہ وہ رنجنا ہے۔ لیکن پھر بھی اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ رنجنا ہی تھی، جو ہاتھ میں جھاڑو لیے کوٹھے پر جا رہی تھی۔

اس کا وہاں بیٹھنا فائدہ مند ثابت ہوا۔ اس بار قدموں کی آہٹ وہ تھی، جس کے ساتھ اس کا دل بے ترتیب ہو کر دھڑکتا تھا۔ اور وہ اس کی توقع سے خاصا پہلے اوپر جا رہا تھا۔ ورنہ اس کے اوپر جانے کا وقت مخصوص تھا۔

اس کی نظریں اوپر اٹھیں اور جم کر رہ گئیں۔ چند لمحے بعد چھوٹا ٹھاکر اس کے حیطہ نگاہ میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں نہیں تھیں۔ وہ اوپر پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، جیسے گرد و پیش سے دو ماہ کا ٹوٹا ہوا تعلق پھر سے جوڑ رہا ہو۔

پھر وہ اٹھا اور ٹہلنے لگا!

حور بانو کی نگاہیں اس کی ایک ایک حرکت پر جمی تھیں۔ وہ والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ وہ اب بھی ٹہل رہا تھا۔ مگر اب حور بانو کو ایک غیر محسوس تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی وارفتگی کی وجہ سے وہ شعوری طور پر تو اسے محسوس نہیں کر سکی تھی۔ لیکن اس کے لاشعور نے اسے سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ اب وہ غور کر رہی تھی۔

پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ چھوٹے ٹھاکر کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ یہی نہیں، اس کے جسم کا ایک ایک عضو اس کے اندرونی اضطراب کا اظہار کر رہا تھا۔

حور بانو سوچ میں پڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، محض چند لمحوں میں یہ تبدیلی کیسی؟ وہ آ کر بیٹھا تو پُرسکون تھا۔ پھر اس نے ٹہلنا شروع کیا، تب بھی وہ پُرسکون تھا۔ مگر اچانک ہی وہ مضطرب ہو گیا۔ کیوں؟

وہ اس پر سوچتی۔ مگر اسے موقع ہی نہیں ملا۔ ''حور بانو، عصر پڑھ لو۔ استانی جی آتی ہی ہوں گی۔'' امی نے اسے پکارا۔

''جی امی، وضو کر کے آتی ہوں۔''

اس نے اٹھ کر سلائیاں، اون کا گولا اور ادھ بنا سویٹر رکھا اور کاہلی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ وضو کرتے ہوئے بھی وہ کوٹھے کی طرف دیکھتی رہی۔ چھوٹے ٹھاکر کی رفتار اور اس کا اضطراب اور بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی عجیب ہی کیفیت میں تھا۔ اور حور بانو اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ یہ اچانک ہو کیا گیا ہے۔

وہ نماز پڑھ ہی تھی کہ استانی جی آ گئیں۔ تینوں بہنیں ان سے پڑھنے بیٹھ گئیں۔ استانی جی بہت اچھا پڑھاتی تھیں۔ ان کا انداز بڑا دل نشیں تھا۔ وہ ایسی فضا بناتی تھیں کہ اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس دن حور بانو کا دل کوٹھے پر اٹکا ہوا تھا اور وہ چھوٹے ٹھاکر کے اچانک مضطرب ہونے پر غور کر رہی تھی۔

پڑھائی ختم ہوئی تو مغرب کا وقت ہوگیا تھا۔ انھوں نے مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز پڑھتے ہی حور بانو دالان کی طرف لپکی۔ اس نے سلائیوں کو اٹھانے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے نظریں اٹھا کر کوٹھے کی طرف دیکھا۔

وہاں اندھیرا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ کچھ دیکھ نہ پاتی۔ چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود تھا۔

❁……❁……❁

آس ایک بہت پتلے اور کمزور دھاگے کی طرح تھی۔ اور وہ کہتی تھی کہ کسی بھی لمحے وہ آواز ایک بار پھر فضا میں ابھرے گی۔ لیکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ کمزور دھاگا بھی اوتار سنگھ کے ہاتھ سے پھسلا جا رہا تھا۔

اور پھر مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ اوتار سنگھ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسی آواز ہے اور اس کا کیا مطلب ہے۔ مگر وہ اتنا جانتا تھا کہ جس آواز سے اسے عشق ہوا تھا، وہ نسوانی آواز اس آواز سے پہلے خاموش ہو چکی ہوتی تھی۔

آس کا وہ کمزور دھاگا بھی ٹوٹ گیا!

اوتار سنگھ کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی بہت اہم چیز اس سے چھن گئی ہے۔ مایوسی ایسی تھی، جیسے دنیا میں کچھ بچا ہی نہ ہو۔ باہر جھٹ پٹے کا سماں تھا۔ لیکن اس کے اندر تو جیسے گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ ٹہلنا موقوف کر کے وہ بیٹھ گیا اور یوں بیٹھا، جیسے مر گیا ہو۔ خود اسے بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی۔ مگر ہاتھ تو کیا، اس سے ایک انگلی بھی نہیں ہلائی گئی۔

یہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟ یہ کیا ہوگیا ہے مجھے؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟ وہ نہایت خوف زدہ تھا۔ کیا یہی موت ہے؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ موت ساکت ہو جانے کا ہی تو نام ہے!

لیکن وہ سوچتے ہوئے ذہن کا آدمی تھا۔ بدترین صورتِ حال میں بھی اس کا ذہن تجزیہ کرنے کی راہیں نکال لیتا تھا۔ ماں کی موت جیسے صدمے پر بھی اس کا ذہن سوچتا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کا ذہن سوچ رہا تھا۔

چنانچہ اس کے اندر ایک تردید ابھری۔ نہیں، یہ موت نہیں۔ موت تو سب کچھ ختم کر دیتی ہے۔ ماسٹر جی کہتے تھے کہ موت مکتی ہے۔ زندگی کے تمام دکھوں، تمام پریشانیوں کو مٹا ڈالتی ہے۔ منش تمام بکھیڑوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ نجات پا لیتا ہے۔ جبکہ وہ تو اس وقت بہت زیادہ دکھی، بہت زیادہ مایوس ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔

پھر جس طرح بالکل اچانک اس کے اندر گھپ اندھیرا ہوا تھا، ویسے ہی بالکل اچانک اس گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن چمکی۔ وہ ننھا سا ایک روشن نقطہ تھا۔ اس کے دل

میں ایک امید جاگی۔ شاید ایسا ہے کہ نیچے والی لڑکی نے وقت تبدیل کر دیا ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد...... یا زیادہ دیر بعد بہر حال وہ آواز ابھرے گی اور یہ اندھیرا روشنی سے تبدیل ہو جائے گا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے دل اور دماغ دونوں اس پر متفق تھے کہ یہ بہت موہوم امید ہے...... بے حد دور از کار۔ اس کے باوجود اس کے اندر اس امید کے لیے قبولیت پیدا ہوگئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فضا بدلی اور دل نے بھی اس امید کے دھاگے کو تھام لیا۔

پڑوس کے گھروں میں، کوٹھوں پر روشنی ہوئی تو اس کا کوٹھا بھی کچھ روشن ہوگیا۔ ساتھ ہی اندر کے اندھیرے میں بھی کچھ کمی ہوئی۔ کچھ یوں بھی تھا کہ اس نے اپنا دھیان اصل مسئلے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

مگر وہ مایوس اب بھی تھا۔ دو ماہ وہ اس آواز سے محروم رہا تھا اور ان دو مہینوں کے ہر دن، اور ہر دن کے ہر لمحے اس نے یہی سوچا تھا کہ چھٹیاں ختم ہوں گی، وہ دہلی جائے گا اور وہ آواز سنے گا۔ لیکن آنے کے بعد پہلے ہی دن اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ اور زیادہ مایوسی کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سوچ رہا تھا...... شاید یہ تبدیلی مستقل ہے...... شاید اب وہ کبھی یہ آواز نہیں سن سکے گا اور اس کا یہ سوچنا فطری بھی تھا۔

اس موہوم امید کے تحت وہ اب بھی انتظار کر رہا تھا لیکن وہ نیم دلانہ انتظار تھا۔ اندر کی مایوسی کا عکس اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔

پھر اس کی سوچ کا رخ بدلا۔ اسے ایک خیال آیا۔ یہ اس کے اندر گھپ اندھیرے میں امید کی وہ ایک کرن کہاں سے آئی؟ اسے ماں کی موت یاد آئی۔ کیسے اسے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ وہ جی ضرور رہا ہے، سانس بھی لے رہا ہے۔ لیکن زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہے۔ پھر چند ہی دنوں میں وہ اتنا بڑا غم خود بہ خود بھول گیا تھا۔ اس نے پھر سے ہنسنا بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ وہ مہانوں کا مہان جو دنیا کا نظام چلا رہا ہے، بہت مہربان ہے۔ وہ آتما کے گہرے زخم بغیر کسی دوا کے بھر دیتا ہے اور آج اس نے دیکھا تھا کہ وہ مہربان گہری مایوسی کے اندھیروں کو امید کی روشنی دیتا ہے۔ جیسے وہ کسی کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتا۔

اس کے ساتھ ہی اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ بہت دنوں سے اس نے اس انداز میں...... اس اوپر والے بھگوان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ وہ تو اس کی جستجو کر رہا تھا۔ وہ اسے جاننا، اسے سمجھنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اس سے محبت کر سکے، کیونکہ سب سے زیادہ محبت تو صرف اسی کا حق ہے۔

آخر وہ اپنی اس جستجو سے دور کیسے ہوا...... کیوں ہوا؟ اس پر اس نے سوچا تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ تبدیلی تو اسی دن سے آئی تھی، جب اس نے پہلی بار نیچے والی لڑکی کی آواز سنی تھی۔ یہ تو طے ہے کہ اسے نہ صرف اس آواز سے...... بلکہ آواز والی سے بھی محبت ہوگئی تھی۔ تو اس محبت نے اسے

بدل ڈالا تھا۔ اس کے مزاج، اس کے معمولات تک کو بدل دیا تھا۔ واقعی محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اگر وہ اوپر والے بھگوان سے محبت کرنے کے قابل ہو جائے تو وہ محبت یقیناً دنیا کی سب سے بڑی محبت ہوگی۔ اس کے دل نے فوراً اس کی تائید کی۔ بے شک، وہ اس محبت سے بہت بڑی ہوگی، جو اسے اس آواز والی لڑکی سے ہے۔ اور اس لڑکی کی محبت میں وہ اتنا کچھ بھول گیا کہ اسے اپنی جستجو بھی یاد نہ رہی تو اس محبت میں اس کا کیا ہوگا۔ کیا وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ حتیٰ کہ زندگی بھی اسے یاد نہیں......

''بھائی، کب سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ تمھیں ہوش ہی نہیں۔ کب سے تمھیں آواز دے رہا ہوں۔ تم ٹھیک تو ہو۔''

اس نے چونک کر وصال دین کو دیکھا، جو عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ''کیا...... کیا بات ہے ویر جی؟ کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی۔'' وصال دین کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہوگیا۔''

''اتنی آوازیں دیں۔ تم نے سنی ہی نہیں۔ میں تمہارے سامنے کھڑا تھا اور تم مجھے دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔''

اب اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ یہ بات وصال دین نے شروع میں بھی کہی تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اور بے شک، وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن نظر اٹھا کر دیکھنے سے پہلے اسے احساس بھی نہیں تھا۔

شاید وہ اپنے آپ میں بہت زیادہ کھویا ہوا تھا!

''اچھا اب چلو۔ کھانا کھالو۔'' وصال دین نے کہا۔

''ٹھیک ہے چلتا ہوں۔'' اوتار سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔

سچ یہ ہے کہ اسے بھوک بالکل نہیں تھی اور وہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ کھانا نہیں کھاتا تو سب لوگ اور خاص طور پر ویر جی کو تشویش ہوتی اور تشویش ہوتی تو وہ اس کی وجوہات پر غور کرتے اور یہ اوتار سنگھ نہیں چاہتا تھا۔

وہ دونوں نیچے چلے آئے۔

❀......❀......❀

دہلی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا!

اوتار سنگھ کے لیے وہ بدترین محرومی کے سات سخت ترین دن تھے۔ ان سات دنوں میں نہ صرف یہ کہ وہ اس آواز کو سننے کی ہر امید کھو بیٹھا تھا اور پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔ بلکہ ہر لمحے

اس کا دل بدترین اندیشوں سے لرزتا رہتا تھا۔ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔

وہ اس راز کو راز رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے پوچھ گچھ کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ معاملہ بہت سنگین اور اس کے لیے بہت اہم ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں، جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ پھر وہ تو تھا بھی بہت ذہین۔ اس نے ایک ترکیب سوچ ہی لی۔

اس شام وہ چاندنی چوک گیا اور وہاں سے رس ملائیاں لایا۔ پھر اس نے رنجنا سے کہا۔

''نیچے بھی دے آؤ۔''

''جی چھوٹے ٹھاکر۔''

''سنو۔ ہر ایک کے لیے دو تو ہونی چاہئیں نا۔ تو تم ایسا کرو کہ دس رس ملائیاں قاب میں ڈال کر نیچے دے آؤ۔''

رنجنا نے چند لمحے سوچا، حساب لگایا، پھر بولی۔ ''دو کے حساب سے تو نیچے بارہ دینی ہوں گی چھوٹے ٹھاکر۔''

''وہ کیسے؟'' اوتار سنگھ نے معصومیت سے پوچھا۔

''وہ چھ ہیں سرکار۔ تین لڑکیاں، ایک ماں اور دو نوکر۔''

''اوہ...... میں سمجھا تھا کہ آج کل کوئی ایک ان میں سے گھر میں نہیں ہے۔ شاید کہیں گیا ہوا ہو۔''

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ سب لوگ موجود ہیں۔''

''چلو تو بارہ دے آؤ۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں اطمینان تھا۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔

رنجنا نیچے چلی گئی۔ اوتار سنگھ سوچتا رہا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ بغیر کسی تردد کے کسی بھی طرح کی پوچھ گچھ کر سکتا ہے۔ آخر وہ لوگ اس کے ملازم ہیں اور اس کے سامنے چون و چرا نہیں کر سکتے۔ وہ تو اس سے ڈرتے ہیں۔ تو وہ ان سے کیوں ڈرے۔ بس اسے ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا۔

مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ پھر خوف زدہ ہوگیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس پر...... اس کی محبت کے بارے میں موہوم سا بھی شک ہو۔ ایسا ہوا تو ملازم جو اس سے ڈرتے ہیں، کہیں گے تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن دل میں تو سوچیں گے اور اسے یہ بھی گوارا نہیں تھا۔

اسے خیال آیا کہ پچھلے ایک ہفتے میں پریشان ہوکر وہ خاصی بے احتیاطی کر چکا ہے۔ اس کی وجہ اس کا یہ خیال تھا کہ ممکن ہے، نیچے والی نے وقت بدل لیا ہو۔ چنانچہ وہ کھانا کھانے کے بعد دوبارہ کوٹھے پر چلا جاتا تھا۔ وہ وہاں بیٹھا رہتا۔ یہاں تک کہ نیچے اندھیرا ہو جاتا اور رات کے سناٹے کے سوا کوئی آواز نہ رہتی۔ اسے یقین ہو جاتا کہ وہ سب سو چکے ہیں۔ تب وہ مایوس واپس آ

جاتا۔ وہ اس آواز کے لیے ترس رہا تھا۔ مگر اس سے زیادہ اب وہ آواز والی کے لیے پریشان تھا۔ اسے رہ رہ کر ہول اٹھتے تھے کہ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔

اسی لیے آج اس نے یہ ہمت کر لی تھی اور اس کے نتیجے میں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکی بہرحال اپنے گھر میں ہی ہے اور خیریت سے ہے۔

مگر اب وہ گومگو کی کیفیت میں تھا۔ کیا مزید پوچھ گچھ مناسب رہے گی۔ کچھ بھی ہو، بس اس کا راز افشا نہیں ہونا چاہیے۔

رنجنا واپس آئی تو اس سے رہا نہیں گیا۔ اس نے بڑے سرسری انداز میں کہا۔ ''رنجنا...... یہ نیچے والے شام کے وقت کیا کرتے ہیں؟ کیا مصروفیت ہوتی ہے ان لوگوں کی؟''

اس کی توقع کی خلاف رنجنا بالکل نہیں چونکی۔ ''بچیاں پہلے بھی پڑھتی تھیں شام کو۔ اور اب بھی پڑھتی ہیں۔ فرق یہ ہے چھوٹے مالک کہ پہلے خود پڑھتی تھیں، اب ایک ماسٹرنی آتی ہے پڑھانے۔ اور ان کی ماتا اور لچھمن بوا رسوئی میں ہوتی ہیں۔''

اوتار سنگھ ایک دم مطمئن ہو گیا۔ بلکہ وہ خوش ہو گیا۔ حالانکہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب وہ آواز وہ شاید ہی کبھی سن سکے۔ لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ وہ لڑکی خیریت سے ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ بات اداس کن تھی کہ جب تک وہ ماسٹرنی سے پڑھیں گی، وہ اس آواز کو سننے سے محروم رہے گا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا کب تک ہوگا۔ مگر اس خوشی اور اطمینان کے سامنے کہ وہ لڑکی خیریت سے ہے، اس اداسی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اس روز اوتار سنگھ پر محبت کی ایک اور عظمت عیاں ہوئی۔ محبت ہو تو آدمی کی سب سے بڑی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ اس کا محبوب خوش و خرم ہو اور خیر و عافیت سے رہے۔ اپنی خوشی کہیں پیچھے چلی جاتی ہے اور اوتار سنگھ جانتا تھا کہ بے غرضی بہت بڑا انسانی وصف ہے۔

اگلے روز مولوی برکت علی نے اسکول میں اس سے رابطہ کیا۔ ''برخوردار اوتار سنگھ، اب پڑھائی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنا چاہیے۔'' انھوں نے کہا۔ ''جو آپ کا حکم مولوی صاحب۔''

''میں نے بہت سوچا۔ اسکول کی چھٹی کے فوراً بعد پڑھانا مناسب نہیں۔ ہم دونوں ہی تھکے ہوئے ہوں گے۔ اس لیے میرے خیال میں شام کا وقت مناسب رہے گا۔ یہ بتاؤ، اس وقت تمہاری کوئی مصروفیت تو نہیں۔''

اوتار سنگھ نے چھٹیوں سے پہلے کی شام کے بارے میں سوچا۔ وہ تو اس کے لیے مقدس ترین مصروفیت کا وقت ہوتا تھا۔ لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ وہ دن ہوتے تو وہ مولوی صاحب کو انکار کر دیتا۔

مولوی صاحب اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ ''کیا بات ہے اوتار سنگھ۔ بتاؤ نا، شام کا وقت مناسب رہے گا نہیں تو کچھ اور سوچتے ہیں۔''

''جی نہیں مولوی صاحب۔ یہ وقت بہت مناسب ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ دل میں اس نے کہا...... اس سے مناسب وقت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

''تو ٹھیک ہے۔ آج شام کو میں آؤں گا۔'' مولوی صاحب یہ کہہ کر چلے گئے۔

اوتار سنگھ گھر پر اس بارے میں سوچتا رہا۔ جتنا غور کرتا، یہ آنے والی مصروفیت اسے بہت بڑی نعمت معلوم ہوتی۔ آخر مولوی صاحب سے وہ عربی ہی تو سیکھ رہا تھا...... اور محض اس آواز کی وجہ سے سیکھ رہا تھا۔ اب وہ اس خاص وقت میں اس آواز کو سننے سے محروم ہو گیا تھا۔ تو اس وقت کا اس سے اچھا مصرف اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اس میں مولوی صاحب سے پڑھے۔ اور آخر میں وہ ان سے کچھ سنا بھی کرے گا۔ واہ...... محروم ہوتے ہی محرومی کا مداوا بھی ہو گیا تھا۔

اُدھر مولوی صاحب کچھ سوچ کر جھجک رہے تھے۔ وہ اوتار سنگھ کو اس کی حویلی میں پڑھاتے رہے تھے، جہاں ان کا اپنا ایک کمرا تھا اور پڑھائی کے درمیان انھیں مکمل تنہائی میسر تھی۔ مگر یہاں معاملہ مختلف تھا۔ بہرحال پڑھانا تو تھا۔

شام کو مولوی صاحب آئے۔ وہ وہی خاص وقت تھا، جب چھٹیوں سے پہلے اوتار سنگھ کوٹھے پر جاتا تھا اور وہ آواز سنتا تھا۔ اب جبکہ آواز کا سلسلہ رک چکا تھا تو اب بھی یہ حال تھا کہ یہ وقت ہوتا تو اس کے قدم اوپر جانے کے لیے تھرکنے لگتے۔

''مولوی صاحب، میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کوٹھے پر مجھے پڑھائیں۔'' اس نے کہا۔

''جو تم مناسب سمجھو اوتار سنگھ۔''

''جی نہیں۔ فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔ چلیں...... میں آپ کو کوٹھا دکھا دوں۔''

اوتار سنگھ مولوی صاحب کو اوپر لے گیا۔ کوٹھا دیکھ کر مولوی صاحب کا دل خوش ہو گیا۔ انھوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''اس سے مناسب جگہ تو ہو ہی نہیں سکتی۔''

اوتار سنگھ بھی خوش ہو گیا۔ ایک خوشی سے...... بہت بڑی خوشی سے وہ محروم ہوا تھا۔ مگر اس کا جو بہترین مداوا ممکن تھا، وہ ہو گیا تھا۔ ''اور آخر میں آپ مجھے کچھ سنا دیا کریں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں التجا تھی۔

مولوی صاحب نے اسے تو نہیں بتایا۔ مگر انھوں نے سوچا تھا کہ عصر پڑھ کر یہاں آیا کریں گے اور یہاں سے جاتے ہوئے جامع مسجد میں مغرب پڑھ لیا کریں گے۔ یہ فرمائش انھیں اور اچھی لگی۔ انھوں نے سوچا کہ یوں وہ مغرب کی اذان تک تلاوت بھی کر لیا کریں گے۔

''کیوں نہیں اوتار سنگھ۔'' انھوں نے شفقت سے کہا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔ کل سے اسی وقت آؤں گا۔''

''کل سے ہی کیوں مولوی صاحب؟ آج سے کیوں نہیں۔''

مولوی صاحب نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ اس کی بے تابی پر انھیں پیار آ گیا۔

''ٹھیک ہے اوتار سنگھ۔ آج ہی سے، سہی۔''

یوں ایک معمول دوسرے معمول میں ڈھل گیا!

❁ .... ❁ .... ❁

حور بانو بہت اداس تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی کوئی بے حد قیمتی چیز اس سے چھن گئی ہے۔ اوپر والے جب واپس آئے تھے تو وہ بہت خوش تھی لیکن اب وہ مایوس بھی تھی اور اسے محرومی کا احساس بھی ستا رہا تھا۔

بظاہر تو معمول میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ مغرب پڑھتے ہی دالان میں جاتی۔ چھوٹا ٹھاکر اسے کوٹھے پر بیٹھا نظر آتا۔ لیکن وہ بہت بجھا بجھا لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا کہ جیسے اس کی کوئی بہت قیمتی چیز چھن گئی ہے۔ وہ بس اداس بیٹھا کچھ سوچتا رہتا۔ اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی خوش کن بات نہیں سوچ رہا ہے۔

اسے دیکھ کر حور بانو کو پہلے جیسی خوشی ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی دید دوبارہ مل گئی ہے۔ لیکن اس کی اداسی دیکھ کر اس کا دل کٹنے لگتا تھا۔ وہ خود بھی اداس ہو جاتی تھی۔ وہ دعا کرتی کہ چھوٹے ٹھاکر کی اُداسی دور ہو جائے۔

ایک تبدیلی اور آئی تھی۔ چھوٹا ٹھاکر اب دیر تک کوٹھے پر بیٹھا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمان لڑکا اسے بلانے کے لیے آتا تھا اور پھر وہ نیچے چلے جاتے تھے۔ تیسرے چوتھے دن ایک ضرورت کے تحت حور بانو اٹھی اور بیت الخلا کی طرف گئی۔ اس وقت رات کافی ہو چکی تھی۔ اتفاقیہ طور پر ہی اس کی نظر اٹھی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر بیٹھا ہے۔

وہ بیت الخلا سے آ کر کچھ دیر دالان میں بیٹھی اور چھوٹے ٹھاکر کو دیکھتی رہی۔ وہ اس وقت زیادہ ہی مضطرب تھا۔ بیٹھے ہوئے بھی اس کے چہرے کا تاثر پل پل بدلتا رہتا۔ اور ہر دو منٹ بعد وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔

حور بانو کا بس چلتا تو وہ وہاں بیٹھی رہتی۔ لیکن وہ بے وقت تھا اور وہ ڈرتی تھی کہیں امی کی آنکھ کھل جائے اور وہ اسے یہاں بیٹھا دیکھ لیں تو وہ انھیں کیا جواب دے گی۔ وہ کیا سوچیں گی اس کے بارے میں۔ اس خوف نے دل چاہنے کے باوجود اسے ٹھہرنے نہیں دیا۔

یہ سلسلہ دو تین رات تک یونہی چلا، مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اس کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔

ایک شام مغرب پڑھ کر وہ دالان میں گئی تو دیکھا کہ کوٹھا اجڑا ہوا ہے۔ چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود نہیں تھا۔ اسے حیرت تو ہوئی۔ مگر کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا۔ وہ وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں آیا۔ کچھ دیر گزری تو وہ بے چین ہو گئی۔ اب ہر گزرتا لمحہ اسے مایوسی میں مبتلا کر رہا تھا۔ اگرچہ ہر لمحہ رک رک کر گزر رہا تھا۔ پھر بھی اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔

امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''حور بانو عشاء کب پڑھو گی؟''

''اٹھتی ہوں امی۔''

اس نے اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی۔ پھر خلافِ معمول وہ دالان میں واپس آئی۔ لیکن چھوٹا ٹھاکر اب بھی کوٹھے پر نہیں تھا۔ بہرحال وہ بیٹھ گئی۔

''حور بانو۔ چلو اب سو جاؤ۔ پھر صبح اٹھنے میں پریشان کرتی ہو۔''

وہ بغیر ایک لفظ کے اٹھ گئی۔ لیکن بستر پر لیٹ کر وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ امی، بہنیں اور سب لوگ سو گئے ہیں تو وہ اٹھ کر دالان میں چلی آئی۔

مگر چھوٹا ٹھاکر اب بھی کوٹھے پر موجود نہیں تھا!

اس بار وہ زیادہ دیر نہیں رکی۔ ایک تو وہ اس بات سے ڈرتی تھی کہ امی اٹھیں، اسے یہاں دیکھیں اور انھیں اس پر کسی بھی طرح کا شک ہو۔ دوسرے نجانے کیسے اس نے یہ جان لیا تھا کہ اب وہ چھوٹے ٹھاکر کو کوٹھے پر کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کی کیفیت میں جو فرق اس نے دیکھا تھا، اس کا کوئی بڑا سبب تھا۔ وہ سبب کوئی بھی رہا ہو، اس نے چھوٹے ٹھاکر کو اس کے کسی خاص معاملے میں مایوس کر دیا تھا...... بہت مایوس!

اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن دل کہاں مانتا ہے۔ حور بانو اس کے بعد بھی تقریباً ایک ہفتہ اس کی جستجو کرتی رہی۔ اس نے آدھی رات کو وہاں آ کے دیکھا۔ لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں تھا۔

بالآخر وہ مایوس ہو گئی!

اب چھوٹے ٹھاکر کی دید کے وہی دو اوقات رہ گئے تھے۔ اسکول جاتے وقت اور اسکول سے آتے وقت اسے دیکھنا۔ حور بانو یہ موقعے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ناخوش تھی۔ دن بھر ناخوش رہتی۔ وہ چڑچڑی ہو گئی۔ بات بات پر جھنجلاتی۔ نیند بھی اس کی کم ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ خوابوں سے بھی محروم ہو گئی تھی اور جب آدمی پر جھنجلاہٹ طاری رہنے لگے تو جاگتی آنکھوں تو وہ خواب دیکھ ہی نہیں سکتا۔

لیکن آدمی کے اندر امید کبھی ختم نہیں ہوتی۔ خراب صورتِ حال میں وہ اندر..... بہت نیچے، دبک کر، چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ پھر اچانک کسی دن وہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ حور بانو کو بھی وہ امید اچانک کبھی دالان میں لے آتی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر موجود ہوگا۔ کبھی

وہ رات کو بستر سے اٹھ کر دالان میں چلی آتی۔ مگر مایوس جاتی اور ہر بار موہوم سی وہ امید زیادہ دن کے لیے سر جھکا کر، منہ چھپا کر بیٹھ جاتی۔ مگر وہ ختم بہر حال کبھی نہیں ہوتی تھی۔ ہاں ہر بار اس کے سر اٹھانے کا دورانیہ بڑھ جاتا تھا۔

اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ استانی جی انھیں پڑھانے کے لیے نہیں آئیں۔ یوں کافی عرصے کے بعد حور بانو کو اس خاص وقت میں آزادی ملی۔ عصر پڑھنے کے بعد وہ بلاوجہ ہی دالان میں چلی آئی۔ وہاں بیٹھ کر وہ چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

مگر وہاں تو اسے بن مانگے بہت بڑی خوشی مل گئی۔ چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود تھا۔

خوشی ایسی تھی کہ کچھ دیر تو وہ کچھ سننے، سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ چھوٹا ٹھاکر اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ہے اور یہ غیر معمولی بات تھی۔ ورنہ وہ تو اکیلا ہی وہاں آتا تھا۔

اس نے اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن دوسرا شخص جو بھی تھا، اس کی پیٹھ اس طرف تھی۔ البتہ چھوٹا ٹھاکر اسی رخ پر بیٹھا تھا۔

اب حور بانو سماعت پر زور دے رہی تھی۔ اوپر سے آواز آتی تو تھی۔ لیکن بالکل صاف نہیں ہوتی تھی۔ بہر حال وہ سننے کی کوشش کرتی رہی۔ پہلے مرحلے میں اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ دوسرا شخص کوئی استاد ہے اور وہ چھوٹے ٹھاکر کو پڑھا رہا ہے۔

پھر اچانک اس کے کانوں میں کچھ لفظ پڑے اور اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ وہ تو عربی زبان کے الفاظ تھے۔ وہ سماعت پر اور زور دیتی رہی۔ ذرا دیر بعد اسے یقین ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر عربی میں پڑھ رہا ہے۔

اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ چھوٹا ٹھاکر...... ہندو...... مشرک...... یہی اس کی شرمندگی تھی۔ مگر اب وہ مشرک، وہ ہندو عربی زبان پڑھ رہا ہے۔ کیوں؟ ایک ہندو کا عربی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ پتا نہیں کیوں، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بہت اچھی علامت ہے۔ کیسے......؟ اس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

وہ بیٹھی اوپر کی آوازیں سنتی رہی۔ خوشی اس کے وجود میں موج در موج اٹھ رہی تھی۔ محبت تو اسے خود بہ خود، بغیر کسی ارادے کے ہو گئی تھی۔ یہ سوچ کر اسے شرمندگی ہوتی تھی کہ اس کا محبوب مشرک ہے۔ اب وہ عربی پڑھ رہا تھا تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ جیسے اس کے راستے کی کوئی رکاوٹ دور ہو رہی ہو۔

لیکن وہ کسی اور کو نہ بتاتی تو وہ خوشی ادھوری رہ جاتی۔ وہ اٹھ کر اندر گئی۔ نور بانو کچھ پڑھ رہی تھی۔ ''نور...... نور...... اٹھو تو۔ کچھ دکھانا ہے تمھیں۔'' اس کے لہجے میں بھی سنسنی تھی۔

نور بانو نے چونک کر، سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''کیا ہے باجی؟''

''میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟''

''دالان میں۔ اور کہاں لے جا سکتی ہوں میں تمھیں۔''

''میں پڑھ رہی ہوں باجی۔ یہیں بتا دو نا، کیا بات ہے۔''

''بہت عجیب بات ہے۔ بتانے میں مزہ نہیں آئے گا۔ آؤ نا۔'' حور بانو اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

''تم بہت اول جلول ہو باجی۔ پڑھنے بھی نہیں دیتیں چین سے۔''

نور بانو کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن بہن کے اصرار پر وہ اٹھ گئی۔

وہ دونوں دالان میں چلی آئیں۔ ''آؤ یہاں بیٹھو۔'' حور بانو نے تخت پر بیٹھتے ہوئے نور بانو سے کہا۔

نور بانو بیٹھ تو گئی۔ لیکن وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ ''یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے باجی۔'' بالآخر وہ مایوس لہجے میں بولی۔

''جو میں دکھانا چاہتی ہوں، وہ یہاں نہیں اوپر ہے...... کوٹھے پر۔''

''کوٹھے پر!'' نور بانو نے حیرت سے دہرایا۔ پھر اس نے کوٹھے کی طرف دیکھا۔

''وہاں دو آدمی بیٹھے ہیں۔ مگر اس میں کیا خاص بات ہے؟''

''دیکھنا اتنا ضروری نہیں۔ تم ذرا کان لگا کر سنو۔''

نور بانو نے چند لمحے سماعت پر زور دیا۔ پھر بولی۔ ''پڑھائی ہو رہی ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔ مگر یہ سنو کہ کیا پڑھایا جا رہا ہے۔''

اس بار چند لمحے گزرے تو نور بانو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''ارے ہاں...... یہ تو عربی پڑھا رہے ہیں۔''

''ہاں۔'' حور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عربی کیوں پڑھ رہے ہیں۔''

''اس میں کیا خاص بات ہے باجی۔ لوگ عربی بھی پڑھتے ہیں اور فارسی بھی۔''

''لیکن ایک ہندو عربی کیوں پڑھنے لگا؟'' حور بانو نے اعتراض کیا۔

''ہندو! یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی۔'' نور بانو نے کہا۔ ''ایک مسلمان لڑکا بھی تو رہتا ہے وہاں۔''

''وہ تو ہے۔ لیکن اس وقت جو پڑھ رہا ہے، وہ مسلمان لڑکا نہیں، چھوٹا ٹھاکر ہے۔''

نور بانو نے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ انھیں نہیں پہچانتی تھی۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو

باجی؟''

حور بانو چوری ہوگئی۔ لیکن اب وہ پہلو نہیں بچا سکتی تھی۔ ''میں پہچانتی ہوں ان دونوں کو۔'' اس نے مجوب لہجے میں کہا۔ پھر جلدی سے صفائی پیش کی۔ ''کبھی کبھی اسکول جاتے آتے نظر آجاتے ہیں دونوں۔ یہ چھوٹا ٹھاکر ہے۔''

نور بانو چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''واقعی یہ تو غیر معمولی بات ہے۔'' پھر وہ چند لمحے خاموش رہی۔ ''لیکن باجی، میں نے سنا ہے، ہندو بھی عربی فارسی پڑھتے ہیں۔ دیکھو نا، علم تو کسی کی میراث نہیں۔''

حور بانو سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اصل میں وہ اسے غیر معمولی بات ثابت کرنا چاہتی تھی...... کسی اور کے لیے نہیں، اپنے لیے۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ کوئی اور اس کی تائید کرے۔

لیکن اسی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ اوپر موجود پڑھانے والے نے تلاوت شروع کر دی۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی اور وہ بے حد خوبصورت قرأت کر رہا تھا اور وہ سورہ یٰسین کی تلاوت کر رہا تھا۔

لمحوں میں سماں بندھ گیا۔ اب جیسے اس آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ دونوں بہنیں مبہوت ہو کر سن رہی تھیں۔

تلاوت کرنے والے نے صدق اللہ العظیم کہہ کر تلاوت ختم کی اور خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں خالی خالی نظروں سے سامنے کی طرف کسی غیر مرئی چیز کو تک رہی تھیں۔ پھر انھوں نے بیک وقت ایک دوسری کو دیکھا۔ حور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''اب کیا کہتی ہو نور بانو۔ بات صرف عربی پڑھنے کی نہیں۔ یہ تو قرآن کی تلاوت تھی۔''

''یہ تو واقعی غیر معمولی بات ہے۔'' نور بانو نے کہا۔

حور بانو مسکرانے لگی۔ وہ کسی کو یہ بات بتا نہیں سکتی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ بہت خوش تھی اور وہ خوشی اس کے لیے بہت غیر متوقع تھی۔ اس نے تو چھوٹے ٹھاکر کو عربی پڑھتے سنا تھا اور نور بانو کو گواہ بنانے کے لیے لے آئی تھی۔ لیکن یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بات قرآن پاک کی تلاوت تک پہنچے گی۔ یہ تو بہت بڑا معاملہ تھا۔ اب تو وہ آگے کے امکانات پر غور کر رہی تھی۔ کیا چھوٹا ٹھاکر مسلمان ہو گیا ہے؟ یہ سوچتے ہوئے اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ کوٹھے پر پڑھنے والا اور پڑھانے والا دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب انھوں نے پہلی بار پڑھانے والے کو دیکھا۔ ان کی آدھی کالی، آدھی سفید لمبی داڑھی تھی۔ چہرہ نورانی تھا اور سر پر ٹوپی تھی۔

وہ دونوں بھی نیچے چلی آئیں۔ وضو کر کے نماز پڑھنی تھی۔

نماز کے بعد حور بانو پھر دالان میں گئی۔ لیکن کوٹھا سنسان پڑا تھا۔

مگر اس بار حور بانو کو کوئی مایوسی نہیں ہوئی بلکہ وہ تو خوش تھی۔ اس خوشی کے لیے تو وہ چھوٹے ٹھاکر کی دید بھی قربان کر سکتی تھی۔

اس دن کے بعد اس کے خواب خوبصورت ہوتے چلے گئے!

❁......❁......❁

ابتدا میں اوتار سنگھ کو اس آواز کی محرومی بہت بڑی لگی تھی۔ لیکن مداوا ہو گیا تو محرومی کا وہ زخم دھیرے دھیرے مندمل ہونے لگا۔ انھی اوقات میں مولوی صاحب کا عربی پڑھانا اس کے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا تھا۔ پھر آخر میں وہ مولوی صاحب سے کچھ سنانے کی فرمائش کرتا تھا اور مولوی صاحب سناتے تو ان کی آواز کہیں دور چلی جاتی اور وہی نسوانی آواز اس کی سماعت میں شہد انڈیلتی رہتی۔

پھر پڑھائی کا بوجھ بھی بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس سال اسے میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ اس امتحان کی اہمیت بہت زیادہ تھی...... صرف طلباء کے نزدیک ہی نہیں، اساتذہ کے لیے بھی وہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ اسکول کے میٹرک کے نتائج اس کی ساکھ سے کم نہیں ہونے چاہیے تھے۔ وہ ایک چیلنج تھا اساتذہ کے لیے۔ چنانچہ انھوں نے پڑھائی کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

یہ اوتار سنگھ کے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اپنی جماعت کا ہونہار ترین طالب علم تھا۔ لیکن کانتی پرشاد جی اسکول کے اساتذہ سے بڑھ کر اس امتحان کو چیلنج بنائے ہوئے تھے۔ ایک بات ماننے والی تھی۔ پچھلے برسوں کی طرح وہ اس بار بھی اوتار سنگھ کو پڑھائی کے معاملے میں اسکول پر سبقت دلائے ہوئے تھے۔ لیکن اوتار سنگھ کے لیے وقت مسئلہ بن گیا تھا۔ اس کے پاس فرصت کے لمحے کم...... بہت ہی کم ہوتے تھے۔

ہر آدمی کے لیے ہر محرومی کا ایک مثبت نتیجہ بھی نکلتا ہے۔ بلکہ محرومی جتنی بڑی ہو، مثبت نتیجہ بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ اس آواز نے اوتار سنگھ کو اس کے طبعی تجسس سے اور اس کی زندگی کی ایک بہت بڑی جستجو سے محروم کر دیا تھا۔ اب وہ اس آواز سے محروم ہوا تو اس کی فطرت کے وہ دبے ہوئے عناصر پھر ابھر آئے۔ وہ پھر پہلے کی طرح تجسس، غور و فکر کرنے لگا...... وہ پھر سے سوچنے لگا۔

اسکول میں تفریحی پروگرام بھی ہوتے تھے۔ ایک اتوار کو اوتار سنگھ کی جماعت آم کے ایک باغ میں گئی۔ باغ شہر کے ایک بڑے رئیس کا تھا، جس کا بیٹا اسکول میں پڑھتا تھا۔ یہ دعوت اس کی طرف سے تھی۔

باغ دیکھ کر اوتار سنگھ کی آنکھیں کھل گئیں۔ زمین تو اس نے بہت دیکھی تھی۔ بڑے بڑے کھیت بھی دیکھے تھے اور صحرا بھی، جس کا کوئی انت نظر نہیں آتا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی، آسمان جھک کر ریت کو چومتا دکھائی دیتا۔ لیکن پھلوں کا اتنا بڑا باغ اس نے نہیں دیکھا تھا۔

اس کے ہم جماعت تو آم کھانے میں مگن تھے۔ مگر وہ اِدھر اُدھر گھومتا پھر رہا تھا۔ کچھ لڑکے درختوں پر چڑھے ہوئے تھے اور آم توڑ توڑ کر نیچے کھڑے اپنے ساتھیوں کو دے رہے تھے۔ ایک ٹولی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد آم کھانے میں مصروف تھی۔

باغ کے رکھوالے نے اسے الگ تھلگ دیکھا تو ہنس کر بولا۔ ''میاں، آم کھاؤ۔ پیڑ کیوں گنتے ہو۔''

اوتار سنگھ کر بھی یہی رہا تھا۔ اس نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک باغ کا جائزہ لیا تھا اور پیڑوں کو غور سے دیکھتا رہا تھا۔ ہر پیڑ دوسرے سے مختلف تھا۔ کچھ اونچے تھے، کچھ بہت چھوٹے تھے اور کچھ درمیانے۔ پھر یہی ایک فرق نہیں تھا۔ کچھ پیڑ زیادہ گھنے تھے، کچھ چھدرے تھے۔ کچھ پیڑ آموں سے لدے ہوئے تھے اور کچھ پر بہت کم آم تھے۔ یہی نہیں، ایک پیڑ کی مختلف شاخوں کا معاملہ تک مختلف تھا۔ کوئی ڈال آموں سے محروم تھی اور کوئی آموں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔ پھر گزرتے ہوئے اس نے آموں کے ڈھیر کو دیکھا، جو اس کے چند ساتھیوں نے جمع کیا تھا۔ ان میں ہر طرح کے آم تھے، چھوٹے، بڑے، پیلے، ہرے، ملی جلی رنگت والے۔

''گن نہیں رہا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں۔'' اس نے رکھوالے کو جواب دیا۔

''کھانے کی چیز کھانے کے لیے ہوتی ہے میاں۔ دیکھنے کے لیے نہیں۔'' رکھوالے نے کہا۔ ''ویسے یہ تو بتاؤ کہ تم دیکھ کیا رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں کہ پیڑ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔''

''وہ تو ہوتے ہی ہیں۔ کھا کر دیکھو میاں تو پتا چلے گا کہ ہر آم کا ذائقہ بھی جدا ہے اور خوشبو بھی۔''

''یقیناً ہو گی۔'' اوتار سنگھ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایسا کیوں ہے؟''

''اللہ کی شان ہے میاں۔ اللہ کی قدرت ہے۔ ہر آدمی دوسرے آدمی سے مختلف کیوں ہے۔ شکل و صورت الگ۔ کسی ایک آدمی کی آواز تک دوسرے کی آواز سے نہیں ملتی۔ پھر عادتیں، مزاج اور فطرت تو ہیں ہی الگ۔''

اوتار سنگھ نے سوچا، واقعی یہ تو سامنے کی بات ہے۔

''اور اللہ نے سب کو ایک سا بنایا ہوتا تو پہچان کیسے ہوتی۔ نام رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔''

اس بار اوتار سنگھ نے باغ کے رکھوالے کو احترام کی نظر سے دیکھا۔ وہ بڑی عقل کی باتیں کر رہا تھا۔ ''لیکن جانور تو سب ایک جیسے ہیں۔'' اس نے وہ مخصوص انداز اختیار کیا، جو وہ ماسٹر جی سے باتیں اگلوانے کے لیے کرتا تھا۔

''نہیں میاں۔ ایسا نہیں ہے۔ جانور بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ کسی بھی بندر کو دیکھ لو۔ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔''

''ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہمیں لگتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم ان میں دلچسپی نہیں لیتے۔ انھیں غور سے نہیں دیکھتے۔ ہاں جو جانور ہمارے ہوتے ہیں، انھیں تو ہم پہچانتے ہیں نا۔ اپنی بھینس کو ہر آدمی پہچانتا ہے۔ کوئی چوری کر لے، تب بھی شناخت کر لیتا ہے۔ ہزاروں گھوڑوں میں بھی آدمی اپنے گھوڑے کو پہچان لیتا ہے۔ ہے کہ نہیں؟''

اب اوتار سنگھ کو اس گفتگو میں لطف آ رہا تھا۔ وہ بات بڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن......''

''جنگل کی بات لو۔'' رکھوالے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جانور ایک دوسرے کو الگ الگ پہچانتے ہیں...... بہت اچھی طرح۔ ان میں دوستیاں بھی ہوتی ہیں اور دشمنی بھی۔ ایک دوسرے کو شناخت نہ کر پائیں تو بھلا ایسا ہو سکتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر یہ بے جان درخت......''

''درخت بے جان نہیں ہوتے۔ یہ جان دار ہیں۔ سانس لیتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں ہماری طرح۔ کسی درخت کو نظر انداز کریں تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔ کسی کو غذا نہ ملے تو سوکھ جاتا ہے۔ غذا اچھی نہ ملے تو اس کے پھل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ میں اس باغ کے ایک ایک درخت کو جانتا ہوں...... پہچانتا ہوں۔''

اس بار اوتار سنگھ کو سچ مچ حیرت ہوئی۔ ''واقعی! کیسے؟''

''یہاں کا ایک ایک بوٹا میرے ہاتھوں لگا ہے۔ میرے ہاتھوں پروان چڑھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کس کے پھل کا ذائقہ کیسا ہے۔''

''تو مجھے بتائیں ان کے بارے میں۔ کچھ درخت چھوٹے کیوں رہ گئے۔ کسی میں پھل کم اور کسی میں زیادہ کیوں ہیں؟''

''یہاں دو طرح کے پیڑ ہیں میاں۔ ایک تخمی اور دوسرے قلمی۔ تخمی تو وہ ہیں، جو گٹھلی بوئی گئی اور اس سے کلا پھوٹا اور درخت بن گیا۔ اور قلمی وہ ہیں، جو ہم نے زمین میں قلم لگائی......''

''قلم کیا؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔ وہ تو بس لکھنے والے قلم سے واقف تھا۔

''کسی درخت کی پتلی ٹہنی کو تراشا جاتا ہے، جیسے تم لکھنے والے قلم کو تراشتے ہو۔ اسی لیے اسے قلم کہتے ہیں۔ وہ قلم لگائی جاتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ پھر وہ درخت بن جاتا ہے۔''

''مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟ جبکہ گٹھلی سے بھی وہی کچھ حاصل ہوتا ہے؟'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''قلمی آم تخمی آم سے کہیں زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ تخمی آم میں رس ہوتا ہے۔ اسے چوسا

جاتا ہے جبکہ قلمی آم میں آم تیار ہوتے ہوتے رس گودے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسے کھایا جاتا ہے۔ پھر اس میں تجربوں کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔ دو آموں کو ملا کر ایک بنایا جاتا ہے۔ پیوند کاری کی جاتی ہے۔ میں ابھی تمھیں دکھاؤں گا۔''

اوتار سنگھ بہت حیران تھا۔ ''دو آموں کو ملانے کا..... پیوند کاری کا یہاں تک کیا مطلب ہے؟''

''دو مختلف قسم کے درختوں کی قلمیں بنائی جاتی ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے ملا کر زمین میں لگایا جاتا ہے۔ یوں ایک نئی قسم وجود میں آتی ہے، جس کے پھل میں ان دونوں قسموں کی خاصیتیں اور ذائقے گھلے ملے ہوتے ہیں۔''

اوتار سنگھ کے ذہن میں شادی کا خیال آ گیا۔ انسانوں میں شادی اسی طرح تو ہوتی ہے۔

''آؤ میرے ساتھ۔ میں تمھیں آم بھی کھلاؤں گا اور کچھ دکھاؤں گا بھی۔''

اوتار سنگھ باغ کے رکھوالے کے ساتھ چل دیا۔

''یہ دیکھو۔ یہ سب تخمی آم کے درخت ہیں۔'' رکھوالے نے چلتے ہوئے کہا۔ ''آگے میں نے الگ الگ قلمیں لگائی ہیں۔ ابھی سب دکھاؤں گا۔''

وہ بڑھتے رہے۔ باغ کے آگے والے حصے میں جو درخت تھے، وہ دیکھنے میں ہی مختلف لگ رہے تھے۔ وہ زیادہ اونچے نہیں تھے۔ کچھ تو اتنے چھوٹے تھے کہ ہاتھ بڑھا کر ہی آم توڑے جا سکتے تھے۔ لیکن اونچے درختوں کے مقابلے میں لدے ہوئے تھے۔

اوتار سنگھ نے اس کی وجہ پوچھی۔

''دیکھو۔ درخت کو غذا تو اتنی ہی ملتی ہے۔ اب اگر درخت اونچا ہوگا تو وہ خوراک اس کے لیے نسبتاً کم ثابت ہوگی۔ جبکہ چھوٹے درخت کو اتنی ہی خوراک فراوانی کے ساتھ ملے گی۔ اس لیے اس پر پھل زیادہ ہوں گے۔''

اوتار سنگھ کچھ شرمندہ ہوا۔ اگر وہ سوچتا، غور کرتا تو یہ بات خود بھی سمجھ سکتا تھا۔

''دیکھو، یہ سرخاب ہے۔ اور وہ انور رٹول ہے۔'' رکھوالا درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتائے جا رہا تھا۔ ''اور وہ آگے میں نے ان دونوں کا ملاپ کیا ہے۔ ابھی ان میں پھل نہیں آئے ہیں۔''

رکھوالے نے آم توڑے، اپنے کندھے پر پڑا کپڑا زمین پر پھیلایا اور بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جیب سے چھوٹا سا چاقو نکالا اور ایک قاش کاٹ کر اوتار سنگھ کی طرف بڑھائی۔

اوتار سنگھ نے کھایا اور اس کا دل خوش ہو گیا۔ وہ بہت میٹھا آم تھا۔ مگر اسی درخت کے دوسرے آم میں ہلکی سی کھٹاس تھی۔ ذرا دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ تمام آموں کا بنیادی ذائقہ ایک سا ہے۔ لیکن ہر آم [illegible] ے آم ۔ کچھ مختلف ہے۔

''یہ تو ہوتا ہے۔ کسی ڈال پر دھوپ کم پڑتی ہے تو اس سے فرق پڑتا ہے۔ نیچے کی ڈالیوں کے آم عام طور پر زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔ کیونکہ غذا ان تک پہلے پہنچتی ہے اور بھرپور بھی ملتی ہے۔ مگر ذائقے کا فرق تو ایک ڈال کے آم میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے ایک باپ کے بیٹے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ صورت میں بھی اور مزاج اور فطرت میں بھی۔''

اس روز اوتار سنگھ نے اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ اور بہتر آم کھائے اور سوچنے کو جو کچھ ملا، وہ اضافی انعام تھا۔

اس رات اپنے بستر پر لیٹ کر وہ اسی حوالے سے سوچتا رہا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کو دیکھو تو ایک حوالے سے دوسری اور تیسری...... بلکہ اَن گنت باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ بس آدمی غور تو کرے۔ دیکھے تو، سوچے تو۔ یہ فرق صرف آم کا نہیں۔ یہ تو ہر پھل میں ہوگا۔ جیسے ہر پھل اپنی جگہ ایک فرد ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ تو آ رہا تھا...... کوئی اس کے اندر بیٹھا کہہ رہا تھا...... یہ سب نشانیاں ہیں، اس ہستی کی جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ یہ مربوط نظام قائم کیا ہے۔ مگر اس سے آگے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

پھر ایک دن اس نے کیلنڈر پر غور کیا۔ وہ تو بہت اہم چیز تھا۔ اسی سے آدمی وقت کا حساب رکھتا تھا۔ زندگی میں ترتیب اور تنظیم کیلنڈر کے دم سے تھی۔ اس پر اس نے کانتی پرشاد سے گفتگو بھی کی۔ ''جب کیلنڈر نہیں ہوگا تو کیسے کام چلتا ہوگا ماسٹر جی؟''

''کام تو چلتا تھا اوتار سنگھ۔ اس لیے کہ اس وقت زندگی بہت سست رفتار تھی۔ گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ پرانے زمانے کا آدمی نہیں جانتا تھا۔ اس کی اسے اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسے تو بس بنیادی ضروریات کی فکر کرنا اور زندہ رہنا تھا۔ تو سورج اور چاند تو موجود تھے نا۔ دن اور رات کا تو اسے معلوم تھا۔ پھر اس کے پاس اور پیمانے بھی تھے...... موسم کے پیمانے۔ سردی، گرمی، بہار اور خزاں۔ تب لوگ کہتے ہوں گے...... دو بہار پہلے میرا یہ بیٹا پیدا ہوا تھا۔ پھر آدمی نے مشاہدے سے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ کب بیج بونا فائدہ مند ہوتا ہے۔ کب فصل کٹنی چاہیے۔''

''کیلنڈر مختلف کیوں ہیں ماسٹر جی؟''

''ایک شمسی کیلنڈر ہے اور دوسرا قمری۔''

''فرق کیا ہے دونوں میں؟''

''زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ 365 دن اور چند گھنٹوں میں زمین کا ایک چکر مکمل ہوتا ہے۔ اسی لیے شمسی سال 365 دن کا ہوتا ہے۔''

''تو چند گھنٹوں کے فرق کا کیا بنتا ہے؟''

ماسٹر جی مسکرائے۔ ''وہ اضافی گھنٹے تین سال میں ایک دن بن جاتے ہیں۔ اسی لیے تو ہر چوتھا سال لیپ ہوتا ہے...... 366 دن کا۔''

''اور قمری کیلنڈر؟''

''چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ وہ 28 دن اور چند گھنٹوں میں اپنا ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ تو قمری مہینہ 29 یا 30 دن کا ہوتا ہے۔ اور سال وہی بارہ مہینوں کا۔''

''مگر یہ معلوم کیسے ہوا ماسٹر جی؟''

''گرنتھ سے...... جسے علم ریاضی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا علم ہے...... دیوتاؤں کا علم۔ اسی سے آدمی نے زمین کا، سورج کا اور چاند کا قطر معلوم کیا۔ درمیانی فاصلہ بھی معلوم کیا۔ زمانہ قبل از مسیح میں یونانیوں نے چاند اور سورج گرہن کا حساب لگایا تھا۔ انھوں نے دو ہزار عیسوی تک کے تمام گرہنوں کا وقت لکھ دیا تھا۔ اور اس میں سیکنڈ کے دسویں حصے تک کا فرق نہیں ہے۔''

بعد میں اوتار سنگھ اس پر غور کرتا رہا۔ واقعی دنیا کا نظام اتنا مربوط تھا کہ لگتا تھا، حساب کتاب سے قائم کیا گیا ہے۔ لگتا تھا کہ ہر چیز علم ریاضی کے تحت ایک خاص رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔ چاند، سورج، ستارے ایک سسٹم کے تحت چل رہے ہیں اور وہ سسٹم ایسا ہے کہ اس میں کبھی ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ علم رکھنے والے انسانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کب چاند کہاں ہے اور کوئی اور ستارہ کہاں ہے۔ اس کا ثبوت جنتریاں ہیں، جن میں چاند سورج اور تمام ستاروں کی آگے کے وقت تک کی ہر لمحے کی پوزیشن موجود ہے۔ یہ علم فلکیات ہے، جو علم نجوم میں بھی کام آتا ہے۔

وہ خیال اور راسخ ہو گیا کہ جس نے یہ پورا نظام قائم کیا ہے، وہ ہستی بہت مہان ہے۔ اس کی شکتی کی کوئی حد نہیں۔ اور منش جو کچھ بھی جانتا ہے، وہ اسی مہان ہستی نے اسے سکھایا ہے۔ مگر جو کچھ منش نہیں جانتا، وہ بہت زیادہ ہے۔

❀......❀......❀

اس شام ٹھاکر پرتاپ سنگھ بیٹھا اپنے کارندوں سے باتیں کر رہا تھا کہ پنڈت روپ سہائے آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک بہت بوڑھا آدمی تھا، جس کی بھویں تک سفید تھیں۔

ٹھاکر نے سر اٹھا کر ذرا خفگی سے اسے دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''روپ سہائے، تم تو اس دن آنے کا وعدہ کر کے ایسے غائب ہوئے کہ میں تمہاری صورت بھی بھول گیا۔''

''شما کر دو ٹھاکر جی۔ پر میں نے وعدہ پورا کر دیا ہے۔''

''سو تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پر بیچ میں سولہ سال ہیں...... پورے سولہ سال۔''

''میں نے کہا تھا نا ٹھاکر جی کہ میں اپنے گرو جی کو لے کر آؤں گا۔ تو میں انھیں تلاش کر رہا تھا۔ یہ ہیں میرے گرو جی۔'' روپ سہائے نے اپنے ساتھ آئے ہوئے بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بڑے گیانی ہیں۔ مگر سیلانی بھی ہیں۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہیں۔''

ٹھاکر نے بوڑھے کو غور سے دیکھا۔ ''آپ کا شبھ نام؟''

بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ ''میں رام دیال ہوں ٹھاکر جی۔''

''آپ نے بڑی کرپا کی کہ ہمیں درشن دیے۔''

''نا ٹھاکر جی۔ یہ تو میرا بھاگ ہے کہ آپ کے درشن ہوئے۔ میں تو تڑپ رہا تھا یہاں آنے کے لیے۔''

ٹھاکر کی نگاہوں میں ایک لمحے کو حیرت جھلکی۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے روپ سہائے کو دیکھا۔

''میں نے گرو دیو کو چھوٹے ٹھاکر کی جنم کنڈلی دکھائی۔ تب سے یہ بے چین ہیں انھیں دیکھنے کو۔'' روپ سہائے نے کہا۔ ''اب تو وہ جوان ہو گئے ہوں گے۔''

''مجھے راج کمار کے درشن تو کرا دیجیے ٹھاکر جی۔'' رام دیال کی آواز لرز رہی تھی۔

''اوتار سنگھ تو دہلی میں رہتا ہے۔ وہیں اسکول میں پڑھتا ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''بس گرمی کی چھٹیوں میں گھر آتا ہے۔''

پنڈت رام دیال نراش نظر آنے لگا۔ ''میں سوچتا تھا کہ ان کی دید ہو گی تو بھاگ جاگ جائیں گے۔ پرنتو مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ میرے ایسے بھاگ کہاں۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی، چلتے ہیں۔''

وہ اٹھنے لگا تو ٹھاکر نے اس کا ہاتھ تھام کر بٹھا لیا۔ ''اب میں آپ کو ایسے تو نہیں جانے دوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ تو بتائیں، آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔''

''بنارس سے۔''

''اتنی دور سے۔'' ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''اتنا کشٹ اٹھا کر آپ یہاں آئے میرے پتر کو دیکھنے کو۔ اور میں نہ روکتا تو ایسے ہی واپس چلے جاتے!''

''ٹھاکر جی، میں اسی کی خاطر تو آیا ہوں اتنی دور سے۔'' پنڈت رام دیال بولا۔ ''جب چاند ہی نہیں نکلا تو رکنا کیسا؟''

''نہیں پنڈت جی۔ آپ دو چار دن یہاں رکیں۔ مجھے خدمت کا موقع دیں۔ آپ ایسے نہیں جا سکتے۔''

ٹھاکر کے بے حد اصرار پر پنڈت رام دیال نے ایک رات رکنے کی ہامی بھر لی۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ محض مروت میں آمادہ ہوا ہے۔ ورنہ وہ رکنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ پنڈت روپ سہائے رکنا چاہ رہا تھا۔ اور وہی اسے لے کر آیا تھا۔

ٹھاکر نے مہمان خانے میں ان کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا۔ رات بھوجن بھی اس نے ان کے ساتھ کیا۔

بھوجن کے بعد اس نے کہا۔ ''آپ مجھے اوتار سنگھ کے بارے میں نہیں بتائیں گے؟''

"کیا بتاؤں؟ کیا بتا سکتا ہوں؟" پنڈت رام دیال کے لہجے میں بے بسی بھی تھی اور عاجزی بھی۔ "میں تو خود سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر مہاراج، اس کی کنڈلی دیکھ کر کچھ تو سمجھ میں آیا ہوگا۔" ٹھاکر نے کہا۔

"بہت مشکل ہے۔ ایسی ہی کنڈلیاں تو گیان دیتی ہیں۔ مگر جیون میں ایک ایسی کنڈلی بھی مل جائے تو بڑی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایسی کنڈلی کبھی نہیں دیکھی۔" پنڈت رام دیال عجیب سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ "میرے بے شمار چیلے ہیں۔ میں روپ سہائے کو اپنا اچھا چیلا مانتا ہوں۔ پرنتو یہ کنڈلی دیکھی تو مجھے اس پر شک ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے کنڈلی بنانے میں۔ یا پھر جنم کا وقت اور تاریخ غلط ہے۔"

"دیکھیں مہاراج، اس کے جنم کی تاریخ اور وقت تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔" ٹھاکر نے تیز لہجے میں کہا۔

"میری آپ سے ایک بنتی ہے ٹھاکر جی۔"

"آپ حکم کریں مہاراج۔"

"میں آپ کی اور چھوٹے ٹھاکر کی...... دونوں کی کنڈلی بنانا چاہتا ہوں۔" رام دیال نے کہا۔ "بلکہ آپ کی پتنی کی بھی......"

"ضرور بنائیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔" ٹھاکر نے کہا۔ پھر اپنی رنجیتا کی اور اوتار سنگھ کی تاریخ پیدائش اور وقت بتایا۔

پنڈت رام دیال کنڈلیاں بنانے میں مصروف ہوگیا۔ روپ سہائے پر تشویش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

رام دیال نے پہلے اوتار سنگھ کی کنڈلی بنائی۔ پھر اس نے اپنے تھیلے سے ایک اور کنڈلی نکالی اور تازہ کنڈلی سے اس کا موازنہ کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر اس نے سر اٹھایا اور روپ سہائے کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔ "تمہاری کنڈلی میں رتی بھر فرق نہیں ہے۔" اس نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

روپ سہائے پہلی بار مسکرایا۔ "جو بھی سیکھا ہے، آپ ہی سے سیکھا ہے مہاراج۔" وہ بولا۔

رام دیال دوسری اور تیسری کنڈلی میں مصروف ہوگیا۔ وہ کنڈلیاں بنانے کے بعد اس نے اوتار سنگھ کی کنڈلی سامنے رکھی اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگا۔ لگتا تھا، اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔

ٹھاکر اسے متوقع نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ لگتا تھا، کچھ بھید کھلنے والے ہیں۔ بڑے بھید!

پھر اچانک پنڈت رام دیال نے کئی بار سر جھٹکا اور بولنا شروع کیا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ اور وہ کسی کو سنا نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ "عجیب...... بہت عجیب۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اس جنم کنڈلی میں راج یوگ ہے...... اور بہت شکتی والا راج یوگ ہے۔ تو چھوٹے ٹھاکر۔ راج تو کریں گے۔ راجا تو بنیں گے۔ لیکن اس کنڈلی میں سنت یوگ بھی ہے...... اور وہ بھی بڑا شکتی والا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں کہ یہ کوئی انہونی ہو۔ میں نے سینکڑوں جنم کنڈلیاں دیکھی ہیں، جن میں یہ دونوں یوگ موجود تھے۔ پرنتو ہوتا یوں ہے کہ دونوں یوگ ایک دوسرے کو ناکارہ کر دیتے ہیں۔ منش نہ راجا رہتا ہے نہ بھکاری۔ بس عام سا منش بن کر رہ جاتا ہے۔ یا یوں ہوتا ہے کہ وہ من کا راجا ہوتا ہے اور بھاگیہ کا فقیر۔ یوں سمجھ لو کہ دونوں یوگ شکتی میں برابر ہوں تو ایک دوسرے کو صفر کر دیتے ہیں۔ اگر راج یوگ کی شکتی 4 ہو اور سنت یوگ کی 3 تو راج یوگ کا اثر ایک درجے کا رہ جاتا ہے۔"

"اوتار سنگھ کی کنڈلی میں راج یوگ کی شکتی کتنی ہے؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

رام دیال نے اسے یوں چونک کر دیکھا، جیسے اب تک اس کی موجودگی سے بے خبر رہا ہو۔ "بہت ہے ٹھاکر جی، بہت ہے۔ مگر سنت یوگ کی شکتی بھی اتنی ہی ہے۔" اس نے کہا۔

"یعنی دونوں نے ایک دوسرے کو کاٹ دیا؟" ٹھاکر بولا۔

"نہیں ٹھاکر جی۔ ہونا تو یہی چاہیے تھا۔ لیکن کنڈلی میں کچھ اور یوگ بھی ہیں۔ سہارا دینے والے یوگ۔ جنھوں نے انھیں کٹنے نہیں دیا۔ سو میں کہتا ہوں کہ دونوں یوگ پورا اثر ڈال رہے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ میرے لیے یہ عجیب بات ہے۔ میں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا اور پھر یہی نہیں، اس کنڈلی میں ایسی بہت سی باتیں ہیں۔"

"مطلب کیا ہے۔ مجھے تو یہ بتائیں۔" ٹھاکر کے لہجے میں تشویش بھی تھی اور بے چینی بھی۔

"چھوٹے ٹھاکر راجا ہوں گے۔ لیکن جیون غلامی کا گزاریں گے۔ اور روپ سہائے سچ کہتا ہے۔ اس کنڈلی میں روشنی اتنی زیادہ ہے کہ کچھ بھائی نہیں دیتا۔ کچھ نظر آنے لگتا ہے تو روشنی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سب کچھ چھپ جاتا ہے۔"

"تو آپ اس سے زیادہ نہیں بتائیں گے جو روپ سہائے نے بتایا تھا۔" ٹھاکر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"روپ سہائے میرا سب سے گیانی چیلا ہے ٹھاکر جی۔" رام دیال نے فخریہ لہجے میں کہا اور روپ سہائے کا سینہ چوڑا ہوگیا۔ "پرنتو میں آپ کو جو کچھ بتا سکتا ہوں، بتلاؤں گا۔ چھوٹے ٹھاکر کی زندگی کئی بار خطرے میں پڑے گی۔ مگر خطرے ہار جائیں گے اور چھوٹے ٹھاکر لمبا جیون پائیں گے اور چھوٹے ٹھاکر پریم کریں گے...... دو بار۔ اور وہ سچا پریم ہوگا۔ دونوں میں وہ سچل ہوں گے۔

چھوٹے ٹھاکر کے بھاگیہ میں بدیشی سفر نہیں ہے۔ مگر ان کا دیہانت اپنے دیس میں نہیں ہوگا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟" ٹھاکر جھنجلا گیا۔ "جب بھاگیہ میں بدیشی سفر ہے ہی نہیں تو دیہانت بدیش میں کیسے ہوگا؟"

پنڈت رام دیال نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ جو دیکھ رہا ہوں، سمجھ رہا ہوں، وہی بتا رہا ہوں۔ سمجھ میں تو میری بھی نہیں آتا۔ پرنتو کنڈلی یہی بتاتی ہے۔ اور ٹھاکر جی، چھوٹے ٹھاکر بڑے گیانی ہوں گے۔ ودیارتھی ہوں گے۔ پرنتو ان کا پریم زیادہ بڑا ہوگا۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ چند لمحے وہ جنم کنڈلی کو یوں دیکھتا رہا، جیسے اس میں اتر رہا ہو۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور بولا۔ "ٹھاکر جی، ہوتا یوں ہے کہ منش جیون میں بہت کچھ کماتا ہے۔ دولت، عزت، شہرت۔ پر جب وہ مرتا ہے تو کیول راکھ رہ جاتا ہے۔ سب کچھ ختم۔ چھوٹے ٹھاکر کو جیون میں سب کچھ ملے گا، دولت بھی، عزت بھی اور شہرت بھی۔ پر وہ ہر چیز سے بھاگیں گے...... صرف پریم کی تلاش میں۔ وہ ہر چیز کو ٹھکرا دیں گے۔ اور جب ان کا سمے آئے گا تو موت ہی انھیں سب کچھ دے گی۔ وہ مرنے کے بعد بڑا مقام پائیں گے۔ ان کی بڑائی ان کے جینے سے بڑھ کر ان کے مرنے میں ہوگی۔"

ٹھاکر کو اکلوتے بیٹے کے مرنے کی باتیں بہت گراں گزر رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر درشتی ابھر آئی۔ مگر اسے یاد تھا۔ پنڈت رام دیال نے شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کو لمبا جیون ملے گا۔

"اب میں ذرا آپ کی اور سورگ باش ٹھاکرائن کی کنڈلی دیکھ لوں۔" پنڈت نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"ہماری کنڈلیاں کیوں دیکھتے ہیں مہاراج۔ ٹھاکرائن تو جا چکی۔ اور میرا بھی کیا ہے......" ٹھاکر نے اعتراض کیا۔

"بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ جب کوئی کنڈلی سمجھ میں نہ آئے تو اس کے لیے ماتا پتا کی یا پتر کی کنڈلی دیکھی جاتی ہے۔" پنڈت نے وضاحت کی۔ "میں چھوٹے ٹھاکر کی کنڈلی کو ان دونوں کنڈلیوں سے سمجھوں گا تو زیادہ سمجھ سکوں گا۔"

ٹھاکر خاموش ہو گیا۔ پنڈت دونوں کنڈلیوں کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر گہرے وچار کا تاثر تھا۔ مگر پھر اچانک اس نے جھرجھری لی اور بری طرح چونکا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ اس نے سر اٹھایا۔ ایک لمحے کو نظریں اٹھائیں۔ مگر فوراً ہی جھکا لیں۔ "شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ پرنتو میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔"

ٹھاکر اسے بغور دیکھتا رہا تھا۔ اس نے پنڈت کے چہرے کے تاثر کی تبدیلی دیکھی تھی۔ اس نے جان لیا کہ کوئی بہت بڑی بات سامنے آئی ہے اور وہ بات ایسی ہے کہ پنڈت بتانا نہیں

چاہتا جبکہ وہ جاننا چاہتا تھا۔ "مہاراج، آپ کو بتانا ہوگا۔ میں بے خبر نہیں رہنا چاہتا۔"

پنڈت نے ہاتھ جوڑ لیے۔ "ایسی کوئی بات نہیں ٹھاکر جی جو بتانے کے قابل ہو۔"

"بتانے کے قابل نہیں، تب بھی بتائیں۔ میں اپنے پتر کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

"یہ بات چھوٹے ٹھاکر کے متعلق نہیں۔ میرا وشواس کریں ٹھاکر جی۔"

اس پر ٹھاکر کا تجسس اور بھڑک اٹھا۔ یعنی بات اس کے یا رنجو کے متعلق تھی۔ "تب تو ضرور بتائیں مہاراج۔"

"میں شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔" پنڈت نے پھر ہاتھ جوڑ دیے۔

"آپ اتنا بچ کیوں رہے ہیں مہاراج؟"

پنڈت واضح طور پر ہچکچا رہا تھا۔ جیسے یہ سوچ کر الجھ رہا ہو کہ کچھ بولے یا نہیں۔ لیکن تجسس تو اسے بھی تھا۔ اور وہ تجسس اسے اکسا رہا تھا کہ جو دل میں ہے، کہہ دے۔ بالآخر تجسس جیت گیا۔ "بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ آپ کی اور ٹھاکرائن کی کنڈلی دیکھ کر میری ودیا نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے، جو سننا آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ اور میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔"

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا۔ پھر بولا۔ "میں وچن دیتا ہوں کہ آپ سے ناراض نہیں ہوں گا۔ اور پھر یہ تو علم کی بات ہے۔ علم آپ کو کچھ بتاتا ہے تو وہ آپ کی ذاتی بات تو نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔ پر......" پنڈت اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ اور روپ سہائے پریشان نظر آ رہا تھا۔

"آپ چنتا نہ کریں مہاراج۔ آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں برا نہیں مانوں گا۔"

پنڈت ہچکچایا۔ مگر پھر اس کے چہرے پر استقلال نظر آنے لگا۔ "میں آپ سے ایک بات پوچھوں ٹھاکر جی؟"

"ضرور پوچھیں مہاراج؟"

"چھوٹے ٹھاکر آپ کے اپنے پتر تو نہیں ہیں؟"

ٹھاکر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لگا پنڈت نے اسے گالی دی ہے۔ شدتِ غیظ و غضب سے وہ اندر ہی اندر لرزنے لگا۔ لیکن ایسے میں بھی اسے یاد رہا کہ وہ ناراض نہ ہونے کا وچن دے چکا ہے۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"وہ لے پالک تو نہیں؟ آپ نے کسی کا بچہ لے کر پالا ہو۔ اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہو۔"

ٹھاکر کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس کا پتر...... ٹھاکر اوتار سنگھ...... بھگوان کا آشیرباد...... بھگوان کا سب سے بڑا تحفہ۔ وہ یہ کیسے گوارا کرتا کہ دنیا میں کوئی ایک شخص بھی اس تحفے کو کچھ اور سمجھے...... اس کے بارے میں کچھ اور گمان کرے۔ مگر اسے اپنے وچن کا بھی احساس تھا۔ چنانچہ اسے اپنے لہجے پر

بھی قابو رکھنا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی آواز اور لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم راجپوت اپنے خون پر بہت ناز کرتے ہیں مہاراج۔ ہم اپنے خون میں ملاوٹ گوارا نہیں کر سکتے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اداس ہو گیا۔ اسے یاد تھا کہ پتر تو اوتار سنگھ اس کا اور رنجو کا تھا۔ پر دودھ اس نے حمیدہ کا پیا تھا۔ خون میں ملاوٹ تو ہوئی تھی۔

''جانتا ہوں ٹھاکر جی۔ پر کوئی اصل راجپوت بچہ بھی مل سکتا ہے......''

''یہ خیال آپ کو کیسے آیا مہاراج؟''

''آپ کے اور سورگ باشی ٹھاکرائن کے بھاگیہ میں اولاد ہے ہی نہیں۔ جنم کنڈلیاں یہی بتاتی ہیں ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔ ''آپ سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے مہاراج؟''

''میں نے بڑی احتیاط سے کام کیا ہے ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر کا غصہ غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ عاجزی نے لے لی۔ ''اوتار سنگھ میرا ہی پتر ہے مہاراج۔ اس کی پیدائش سے پہلے میں نے اور ٹھاکرائن نے ایک ہی رات ایک جیسا سپنا دیکھا تھا۔ اس سپنے میں ہمیں خوش خبری ملی تھی۔ اور وہ نو ماہ میری پتنی کی کوکھ میں رہا اور اس کی کوکھ سے جنم لیا۔ میرے پاس اس کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ پورا گاؤں گواہ ہے اس کا۔''

''میرے لیے آپ کا کہنا ہی کافی ہے ٹھاکر جی۔'' پنڈت رام دیال نے کہا۔ ''پرنتو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ جو بھاگیہ لکھتا ہے، وہ اسے کبھی بدل بھی دیتا ہے اور ہمیں پتا نہیں چلتا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ پرارتھنا میں بڑی شکتی ہے۔ اس سے بھاگیہ بھی بدل جاتا ہے۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔ میں اور دیکھتا ہوں۔''

ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پنڈت مزید کھوج کرے۔ مگر وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔

پنڈت سر جھکائے کنڈلیوں میں الجھا رہا۔ پھر اچانک اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ''آپ کی پتنی کا دیہانت تین ورش پہلے...... ہوا تھا۔'' اس نے تاریخ تک بتاتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ تو اس کے دل پر لکھی تھی۔ اس نے اداسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پنڈت نے کنڈلیوں کو مزید چند لمحوں تک بغور دیکھا۔ پھر بولا۔ ''یہ سچ ہے کہ کنڈلی کے حساب سے آپ دونوں کے بھاگیہ میں اولاد نہیں۔ لیکن آپ کی کنڈلیوں میں چھوٹے ٹھاکر کی آمد کی گواہی ملتی ہے۔''

ٹھاکر نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''چھوٹے ٹھاکر کے جنم کے ساتھ آپ کا اور آپ کی پتنی کا نیا دور شروع ہوا۔ آپ کے جیون کی دشا بدل گئی۔ آپ کا راستہ بدل گیا۔ آپ کی پتنی کے لیے تو یہ آسان نہیں تھا۔ لیکن آپ نے ہنسی خوشی اسے مان لیا۔ بلکہ آپ خود ہی نئے راستے پر چل پڑے۔''

ٹھاکر گھبرا گیا۔ پنڈت رام دیال خطرناک حد تک سچی بات بتا رہا تھا۔ ٹھاکر جانتا تھا کہ وہ تبدیل ہوا ہے۔ مگر پنڈت نہیں جانتا تھا کہ تبدیلی کا اصل عمل تو اب شروع ہو گا۔ اس نے بات ہی ایسی بتائی ہے۔ بچہ نہ اس کے بھاگیہ میں تھا نہ رنجو کے۔ پر دینے والے نے اسے اوتار سنگھ دیا۔ اس پر کتنی بڑی دیا کی۔ اس نے اپنا لکھا ہوا اس کا بھاگیہ بدل دیا۔ تو کیا وہ نہ بدلے۔ اسے تو بدلنا ہے...... ہنسی خوشی!

''آپ لوگ اب آرام کریں۔'' ٹھاکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''صبح آپ کے درشن ہوں گے۔''

ٹھاکر نے اگلے روز انہیں بہت کچھ دے کر رخصت کر دیا!

❁......❁......❁

مصروفیت بہت زیادہ ہو تو وقت کے پر لگ جاتے ہیں۔ اوتار سنگھ کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ سال کب اور کیسے بیت گیا۔ میٹرک کا آخری پرچا دے کر آیا تو اس نے بڑی بے یقینی سے سوچا...... ارے، امتحان ختم!

پھر ٹھاکر پرتاپ سنگھ خود دہلی آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کی زندگی کا یہ اہم مرحلہ ہے۔ اب اس کے بیٹے کو کالج جانا تھا۔ وہ آیا تو اسے کالج میں داخلہ دلانے کے لیے تھا۔ لیکن انعام بہت بڑا تھا۔ بیٹے سے لپٹ کر سونے کے لیے اسے کئی راتیں مل گئیں۔ کیسی شانتی تھی اس کے ساتھ۔

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ اوتار سنگھ نے امتیازی نمبروں کے ساتھ امتحان پاس کیا۔ اس دوران ٹھاکر پرتاپ سنگھ کالجوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے کوئین میری کالج کو اپنے بیٹے کے لیے چن لیا۔ داخلہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اوتار سنگھ کے نمبر ایسے تھے کہ اسے کہیں بھی داخلہ مل سکتا تھا۔

اوتار سنگھ کا کالج میں داخلہ ہوا۔ پھر وہ کالج جانے لگا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا دل تو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اسے واپس تو جانا ہی تھا۔ فصلوں کا حساب کتاب، گاؤں کی دیکھ بھال کا کام وہ کیدار ناتھ پر چھوڑ کر آیا تھا۔ اور کیدار ناتھ پر اسے بھروسہ نہیں تھا۔

چنانچہ وہ واپس چلا گیا!

اوتار سنگھ کو اس نئی تبدیلی کو قبول کرنے میں کچھ دن لگے۔ وہ تبدیلی تھی بھی بہت بڑی۔

اب وہ کالج کا اسکول سے موازنہ کرتا تو ایسا لگتا کہ وہ ایک چھوٹے سے تالاب سے نکل کر ایک

بڑے دریا میں آ گیا ہے۔ اسکول میں رہ کر کالج کا جو تصور اس نے قائم کیا تھا، حقیقت میں کالج اس سے یکسر مختلف تھا۔ اسکول میں ہر پیریڈ لینا ضروری تھا۔ جبکہ کالج میں وہ آزاد تھا۔ یہاں خالی پیریڈ بھی ہوتے تھے، جنھیں طالب علم اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ چاہے وہ لائبریری میں جا بیٹھے اور مطالعہ کرے۔ چاہے وہ کامن روم میں چلا جائے اور کھیل لے۔ چاہے وہ لان میں جائے اور دوسرے طلبا کے ساتھ گپ شپ کرے۔ بلکہ کالج میں وہ تو اپنی مرضی سے کوئی پیریڈ چھوڑ بھی سکتا تھا۔ یعنی وہ آزاد تھا۔

ایک اور اعتبار سے بھی کالج بڑا دریا تھا۔ وہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ یہی نہیں، طلباء اور طالبات کی اس کمیونٹی میں تمام رنگ موجود تھے۔ مذہب کے اعتبار سے بھی اور زبان اور علاقے کے اعتبار سے بھی۔ انگریز، ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، پنجابی، گجراتی، بنگالی، مدراسی...... اور نجانے کیا کیا۔

ایک اور بات بھی تھی۔ اوتار سنگھ کو اسکول میں دوست بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ سنجیدہ طالب علم تھا۔ کلاس میں جان پہچان تو ہوئی۔ مگر باقاعدہ دوستی نہیں ہوئی۔ صرف ہاف ٹائم میں موقع ملتا تھا لیکن وہ وقت وہ وصال دین کے ساتھ گزارتا تھا۔

اب معاملہ مختلف تھا۔ کالج میں سوشل لائف ضروری تھی۔ اور وصال دین وہاں تھا نہیں۔ پھر اوتار سنگھ کی فطرت میں تجسس دوسروں سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اب اسے مختلف لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور بہت کچھ جاننے کا موقع مل رہا تھا تو وہ اسے کیسے ضائع کرتا۔ اس کے لیے موقع اسے فوراً ہی مل گیا۔ کالج کی یونین کے الیکشن ہو رہے تھے۔ وہاں پہلی بار اسے پتا چلا کہ سیاست کیا ہوتی ہے...... نیچے سے اوپر تک۔ کالج میں ایک اور کام کا رویہ اسے ملا، جو اسکول میں نہیں تھا اور وہ تھا اختلاف رائے، ابتدا ہی میں اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اختلاف رائے سے معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔

کالج لائف میں آتے ہی پہلے تو اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ لڑکیوں کے لیے ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ ایف اے سالِ اوّل کی تمام لڑکیاں اس سے دوستی کی...... اس کی قربت کی متمنی تھیں۔ بلکہ سالِ دوم کی بھی کئی لڑکیوں نے اس سے دوستی کی کوشش کی۔ پھر اسے اندازہ ہوا کہ لڑکیوں کے اس کی طرف کھنچنے کی وجہ سے لڑکے بھی اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ یعنی لڑکے ان لڑکوں سے دوستی کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں، جن کی طرف لڑکیاں کھنچتی ہوں۔

بہت جلد اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ صحیح معنوں میں تعلیم اب شروع ہو رہی ہے۔ اس کے لیے جاننے اور سیکھنے کے مواقع بڑھ گئے ہیں۔ وہ سوالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور یہاں سب کے جواب موجود تھے۔

اوتار سنگھ بہت خوبصورت اور وجیہہ لڑکا تھا۔ وہ بے حد متناسب الاعضا تھا۔ ساکت رہتا،

تب بھی جسم توانائی کا پاور ہاؤس نظر آتا۔ پھر وہ خوش لباس بھی تھا...... اور اس کا لباس اس کے تموّل کا مظہر تھا۔ خود اعتمادی کی اس میں کمی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ساری زندگی اس نے کبھی ''نا'' نہیں سنی تھی۔ اس کی کوئی بات کبھی ٹالی نہیں گئی تھی...... رد نہیں کی گئی تھی۔ اس نے خود کو کبھی کسی سے کم تر نہیں جانا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کی فطرت میں عاجزی تھی، انکسار تھا...... لیکن بہت پُراعتماد انکسار!

ابتدا میں ہی اس نے دیکھا کہ سب لوگ اس کی دوستی کے خواہاں ہیں...... کیا لڑکے، کیا لڑکیاں۔ یعنی اس کے پاس دوست منتخب کرنے کے لیے بڑی ورائٹی تھی۔ اور وہ کوئی سطحی انداز میں دیکھنے اور سوچنے والا لڑکا نہیں تھا۔ چنانچہ لپکنا تو درکنار، اس نے گرم جوشی تک نہیں دکھائی۔ وہ اپنے دوستوں میں کچھ خوبیاں ضروری سمجھتا تھا اور اس کے لیے پرکھنا ضروری تھا۔

دہلی میں تین سال گزارنے کے باوجود بنیادی طور پر وہ گاؤں کا لڑکا تھا۔ مطالعہ اس کا وسیع تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ سے خوب واقف تھا۔ لیکن موجودہ سیاسی منظر سے وہ اتنا باخبر نہیں تھا۔ کالج میں اس کی سمجھ میں بہت کچھ آنے لگا۔

اسے معلوم تھا کہ ہندوستان پر انگریز حکومت کر رہے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ کورس کی کتابوں میں جنگ آزادی کا تذکرہ نہیں تھا۔ ان میں اسے غدر کہا جاتا تھا...... بغاوت! اور وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا، وہاں انگریزوں کی مذمت نہیں کی جاتی تھی۔ تاہم وہ اپنے طور پر اس بات پر غور کرتا تھا کہ انگریز اتنی دور سے یہاں آئے اور اب اتنے بڑے ملک پر، اتنی بڑی آبادی پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ کہ اس ملک کے لوگ نااہل ہیں؟ ان میں اپنا ملک سنبھالنے کی، اسے چلانے کی اہلیت نہیں؟ اور ان میں غیرت بھی نہیں؟ وہ یہ نہیں سوچتے کہ دوسرے باہر سے...... اتنی دور سے آئے، ان کے ملک پر قابض ہوئے اور ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں غدر کا تصور بھی مختلف تھا۔ بغاوت! کیسی بغاوت؟ بنیادی طور پر انگریزوں کو یہاں حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اگر کچھ لوگوں نے ان کا اقتدار ختم کرنے کی کوشش کی تو وہ بغاوت کیسے ہوئی۔ وہ تو اپنا حق چھیننے کی جائز کوشش تھی۔ اور جنھوں نے کوشش کی، وہ غیرت مند لوگ تھے۔ انھیں مجرم تو نہیں کہا جا سکتا۔

یہ سب کچھ وہ سوچتا رہا تھا۔ اب کالج میں یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے فضا موجود تھی۔ چند دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ملک میں آزادی کے لیے تحریک چل رہی ہے، یہی نہیں، انگریز بھی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ یونین کے الیکشن میں مقابلہ دو پارٹیوں کے درمیان تھا۔ اور دونوں پارٹیوں کا اختلاف نظریاتی تھا در حقیقت وہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کی ذیلی جماعتیں تھیں۔ ایک کانگریس تھی، جس میں سبھی مذاہب کے لوگ تھے۔ دوسری مسلم لیگ تھی، جو صرف مسلمانوں کی جماعت تھی۔ کانگریس ملک کی آزادی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ جبکہ مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے علیحدہ مسلمان مملکت چاہتی تھی۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں مسلمانوں کی منطق نہیں آئی۔ اگر مذہب کی بنیاد پر الگ الگ مملکتیں بنائی جاتیں تو ہندوستان میں سکھ بھی تھے، عیسائی بھی اور پارسی بھی۔ تاریخ بتاتی تھی کہ ملک پر سینکڑوں برس سے مسلمان حکومت کر رہے تھے۔ حالانکہ اکثریت ہندوؤں کی تھی۔۔ اس وقت ہندوستان ایک تھا تو اب وہ تقسیم کیوں ہو؟

دوستی اور تعلقات کے معاملے میں اوتار سنگھ کی کچھ ترجیحات تھیں۔ اسے ذہین، علم دوست اور متجسس لوگ اچھے لگتے تھے۔ اس اعتبار سے اس نے اپنے لیے دوستوں کا انتخاب کیا۔ اور اس کے دوستوں میں سبھی لوگ تھے...... انگریز، ہندو، مسلمان اور سکھ۔ ذہانت، علم کی لگن اور تجسس ان سب کے درمیان قدرِ مشترک تھا۔

ان سب کے درمیان بہت شدید نظریاتی اختلافات تھے اور ان کے درمیان تند و تیز بحثیں ہوتیں۔ کبھی تو ایسا لگتا کہ اب لڑائی ہو جائے گی۔ لیکن ذہین، علم دوست اور متجسس لوگوں میں یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ وہ روشن خیال ہوتے ہیں۔ اختلاف اپنی جگہ۔ لیکن وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔

کالج یونین کا الیکشن ہوا اور کانگریس کی ذیلی جماعت جیت گئی۔ اوتار سنگھ نے انھی کو ووٹ دیا تھا۔

الیکشن کے بعد اس روز وہ لان میں بیٹھے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے دو پیریڈ خالی تھے۔ رام گوپال نے محمود کو چھیڑ دیا۔ ''دیکھا تم نے۔ اس الیکشن نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔'' اس نے فاتحانہ لہجے میں محمود سے کہا۔ ''اس ملک میں اکثریت ہوش مندوں کی ہے، جو آزادی چاہتے ہیں۔ ملک کو تقسیم کرنا نہیں چاہتے۔''

''میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔'' محمود نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ کالج کی یونین کا الیکشن تھا اور بس۔''

''او یار، یہ تو وہی بات ہوئی نا کہ انگور کھٹے ہیں۔'' فتح سنگھ بولا۔ ''یہ بات تھی تو الیکشن کیوں لڑا تم نے؟''

''یہ دیکھنے کے لیے کہ ہمارے لوگ ہمارے اس موقف کی تائید کرتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے ہم رائے عامہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو تمھیں پتا چل گیا کہ لوگ تمھارے ساتھ نہیں ہیں۔'' رام گوپال نے کہا۔ ''اس شکست نے تمہاری آنکھیں کھول دیں؟''

''ہاں ہمیں پتا چل گیا کہ قوم جاگ رہی ہے۔'' محمود کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔ ''کالج میں 58 طلباء اور طالبات مسلمان ہیں اور ہمیں 56 ووٹ ملے۔''

رام گوپال کا منہ اتر گیا۔ ''یہ تو تنگ نظری ہے تمہاری۔ 56 ووٹوں نے تمھیں جتوا تو

نہیں دیا۔

''یہ تنگ نظری نہیں، حقیقت پسندی ہے۔ ہمیں اپنی طاقت کا اندازہ ہونا چاہیے۔''

تب اوتار سنگھ نے پہلی بار مداخلت کی۔ ''ویسے محمود، میری سمجھ میں تم لوگوں کی منطق نہیں آتی۔ اصل مسئلہ آزادی ہے۔ ملک کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہ فہم و فراست کی بات ہے۔ جب ایک جنگ سے کام چل سکتا ہے تو پے در پے دو جنگیں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟'' رچرڈ پارسن نے بھویں اچکائیں۔

''بھئی ابھی ہم آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں اور آزادی کے فوراً بعد ہمیں علیحدگی کے لیے لڑنا ہوگا۔ تو یہ کام ابھی کیوں نہ کر لیں۔''

''بنیادی سوال یہ ہے کہ علیحدگی کی ضرورت کیوں ہے۔'' رام گوپال بولا۔

''ضرورت اس لیے ہے کہ ہمیں اپنا دینی اور قومی تشخص برقرار رکھنا ہے۔'' محمود نے جواب دیا۔

''یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔'' رام گوپال نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا قومی تشخص کیا ہے؟ یہی نا کہ تم ہندوستانی ہو۔''

''نہیں۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہیں۔ ہمارا قومی تشخص دینی تشخص سے جڑا ہوا ہے۔'' محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم اگر صرف ہندوستانی رہ گئے تو گویا ہم نے اپنی شناخت کھو دی اور یہ ہم گوارا نہیں کر سکتے۔''

''تو بھائی، اتنی صدیوں سے جو تم اسی ہندوستان میں رہ رہے ہو، پہلے کبھی تمھیں یہ فکر نہیں ہوئی۔ نہ تم اپنی شناخت سے محروم ہوئے۔'' رام گوپال نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''قسم واہگورو کی رامو، تو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ اب یہ اتنی صدیوں یہ صرف حکومت ہی تو کرتے رہے ہیں۔ یہ فکر کیوں ہوتی انھیں۔'' فتح سنگھ بولا۔

''یہ ہوئی نا بات۔'' رام گوپال کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ ''جب تک حکومت کرتے رہے، یہ پریشانی نہیں رہی۔ اب ہماری باری آئی تو دم نکل رہا ہے ان کا۔''

''ہاں یہی بات ہے۔ اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی کہہ دیا۔''

اوتار سنگھ کی توقع کے برعکس محمود کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ ورنہ وہ تو سمجھا تھا کہ اس دلیل کے بعد محمود مدافعانہ انداز اختیار کرے گا۔ مگر وہ تو اس دلیل کی تائید کر رہا تھا۔

اب وہ سب محمود کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''اب ذرا اس کی وجہ بھی تو بتاؤ کہ تمہاری حکومت آنے سے پہلے ہی...... تجربہ ہونے سے پہلے ہی مسلمان عدم تحفظ کا شکار کیوں ہو گئے۔''

"اسے کہتے ہیں قبل از مرگ واویلا۔" فتح سنگھ نے چوٹ کی۔

"اور یہ ضروری ہے۔ ورنہ بعد میں کوئی ماتم کرنے والا بھی نہیں ملتا۔" محمود نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"بھیا ہم ٹھہرے جاہل اور نا سمجھ۔ وجہ بھی تم ہی بتا دو۔" رام گوپال نے جل کر کہا۔

"مسلمانوں نے صدیوں یہاں حکومت کی۔ مگر ہمارا قومی اور مذہبی تشخص تو خطرے میں نہیں پڑا۔"

"حکمرانوں کے معاملے میں ظرف، رواداری اور وسیع النظری کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ مسلمانوں میں تھا۔ اسی لیے مندر سلامت رہے۔ سب کو پوجا پاٹ کی آزادی تھی......"

"کیا بات کرتے ہو۔" رام گوپال تنک کر بولا۔ "رواداری، ظرف، وسیع النظری! سب کہنے کی باتیں ہیں۔ محمود غزنوی نے......"

"محمود غزنوی نے کبھی ہندوستان پر حکومت نہیں کی۔ وہ کبھی ہندوستان کا حکمراں نہیں رہا۔ اکبر کے عہد کی تاریخ بھی یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے۔ اور اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ بھی یاد ہے ہمیں۔" رام گوپال اب تلخ ہو رہا تھا۔

"اورنگ زیب ویسا مسلمان تھا، جیسا مسلمان کو ہونا چاہیے۔ اس سے تو شکایتیں مسلمانوں کو بھی ہیں۔ بڑے بڑے بزرگوں کے مزار ڈھا دیے اس نے۔ وہ مزار پرستی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ بت پرستی تو بہت آگے کی بات ہے۔ اور میری بات کی سچائی اس سے ثابت ہے کہ کئی صدیوں تک مسلمان حکومت کرتے رہے۔ لیکن آج بھی ہندوستان میں ہندو بھاری اکثریت میں ہیں۔"

"کروڑوں ہندوؤں کو مسلمان کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اس دیس میں کروڑوں مسلمان کہاں سے آئے؟"

"اسلام میں تو زبردستی ہے ہی نہیں۔" محمود پھر مسکرا دیا۔ "یہ سب حسنِ اخلاق کا، محبت کا، سلوک کا کمال ہے۔ محمد بن قاسم سندھ میں کتنا کم عرصہ رہا۔ لیکن لوگ اس کی پوجا کرنے لگے تھے۔ کیوں؟ ایک طاقت ور کا اتنے کم وقت میں دل جیت لینا سمجھ میں آتا ہے؟ جو مسلمان ہوا، اپنی خوشی سے ہوا۔ کردار اور اخلاق دیکھ کر ہوا۔ تم نے تو شودروں کو جانوروں سے بدتر بنا رکھا تھا۔ زندگی عذاب تھی ان کی۔ وہ مسلمان ہوئے تو انھیں عزت ملی۔ برابری کا درجہ ملا۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ برتری ہے تو صرف اعمال کی ہے۔ یہ اسلام کا کمال ہے۔ اسی لیے تو اسے پھیلنے سے نہیں روکا جاسکا۔ تو بھائی، میں ظرف، رواداری اور وسیع النظری کی بات یونہی نہیں کر رہا ہوں۔"

"تمھارے خیال میں ہندوؤں میں یہ خوبیاں نہیں ہیں؟ ان کی حکومت ہوئی تو تم اپنی پہچان کھو بیٹھو گے؟"

"ہاں۔ یہی بات ہے۔ اسی لیے پاکستان ضروری ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بات ہے۔ تم ثابت کرکے دکھاؤ۔" رام گوپال نے چیلنج کیا۔

"ثابت کرنا کیا مسئلہ ہے۔" محمود نے کہا۔ "یہ شدھی تحریک کون چلا رہا ہے؟ ہندو ہی چلا رہے ہیں نا......"

"وہ تو انتہا پسند ہندو ہیں۔" رام گوپال نے تلملا کر کہا۔

"ہیں تو ہندو نا۔ اور ابھی تو ان کے پاس اقتدار بھی نہیں ہے۔ اقتدار آئے گا تو کیا کچھ نہیں کریں گے وہ۔ مسلمان گائے ذبح کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے لیے گائے ماں کے برابر ہے۔ اب بتاؤ، جھگڑا ہوگا کہ نہیں۔ ارے خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ مسلمان اس خطے میں امن کی خاطر پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔"

"بات تو سچ ہے۔" رچرڈ پارسن نے دھیرے سے کہا۔

"تم تو سچ ہی کہو گے۔" رام گوپال رچرڈ پر الٹ پڑا۔ "تم انگریزوں کو یہ اقتدار مسلمانوں سے ہی تو ملا ہے۔ ورنہ یہ سونے کی چڑیا تمھارے ہاتھ کہاں آتی۔"

"ہاں، یہ سچ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مسلمان حکمرانوں کی کمزوری کے نتیجے میں انگریز تجارت کے بہانے یہاں آئے اور پورے ہندوستان پر قابض ہوگئے۔" محمود نے کہا۔ "لیکن یہ تو بتاؤ کہ ان کمزور حکمرانوں کو ہٹا کر ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم نہ کرنا کس کی کمزوری تھی۔ جس میں جتنی طاقت تھی، اسی حساب سے وہ کوئی علاقہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مرکزیت کی کمی تو پورے ہندوستان کی تھی۔ صرف مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرانا تو زیادتی ہے۔"

بات طول پکڑتی۔ لیکن ان کا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ یہ بات فتح سنگھ نے یاد دلائی۔ وہ اٹھ گئے۔ محمود نے رام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا دوست، مائنڈ نہ کرنا۔ پھر کبھی بات ہوگی۔"

رام نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "نہیں کبھی نہیں ہوگی۔ میں تم سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"ارے نہیں۔ دوستوں میں یہ جھگڑے اچھے نہیں ہوتے۔" اوتار سنگھ نے مداخلت کی۔ "دیکھونا، یہ تو ایک علمی گفتگو تھی۔ نالج بڑھانے کے لیے، ذہن کو وسعت......"

"مجھے یہ پسند نہیں۔" رام نے تنک کر کہا۔

"او کم آن۔ تم میں اسپورٹس مین اسپرٹ نہیں ہے رام۔ اٹ واز آل ان گڈ

اسپرٹ۔'' رچرڈ بولا۔ ''اور بات شروع تو تم نے ہی کی تھی۔''

''اور کیا۔ یاروں کے بیچ کوئی بات فرق نہیں ڈال سکتی۔'' فتح سنگھ سے بھی نہیں رہا گیا۔

لیکن رام گوپال بدستور اکڑا ہوا تھا۔ بالآخر محمود نے زبردستی اسے گلے لگا لیا۔

''اب مسکرا بھی دو۔'' رچرڈ نے کہا۔

رام گوپال مسکرایا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے کینہ توزی جھلک رہی تھی۔ اوتار سنگھ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

❁……❁……❁

اوتار سنگھ کے دماغ میں نئے نئے دریچے کھل رہے تھے!

دوستوں کے اس گروپ میں لڑکیاں بھی تھیں۔ ریٹا پارسن رچرڈ کی بہن تھی۔ پشپا تھی، جو ایک دولت مند ہندو گھرانے سے تھی۔ نادرہ تھی، جو ایک پڑھے لکھے اور آزاد خیال مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

تینوں لڑکیاں حسن و جمال میں ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ پشپا اور نادرہ دوستوں کے اس گروپ میں اس لیے شامل ہو پائیں کہ ان کی ریٹا سے دوستی ہو گئی تھی...... اور ریٹا رچرڈ کی بہن تھی۔ تینوں بے حد حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد ذہین بھی تھیں اور سوچنے والی بھی تھیں۔

دوستوں کے اس گروہ سے ملنے کے بعد اوتار سنگھ کی سوچ کا منظر بہت وسیع ہو گیا تھا۔ بہت کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا، اب اس کے علم میں آ رہا تھا۔ اس کے بعض نظریات کی تردید ہو رہی تھی اور بعض کی اصلاح۔ ان میں ایک نظریہ وہ تھا، جو اس نے مسلمانوں کے بارے میں قائم کر رکھا تھا۔

مسلمانوں کی اس کے لیے بڑی اہمیت تھی۔ ماتا جی اور پتا جی کو چھوڑ کر اس کے سب سے پسندیدہ انسان، سب کے سب مسلمان تھے۔ اماں، جو اس کے لیے ماتا جی سے کم نہیں تھیں۔ وصال دین جو اس کے لیے بھائی تھا اور چاچا جمال دین، جس کی وہ پتا جی جیسی عزت کرتا تھا۔ پھر بعد میں اسی میں مولوی صاحب بھی شامل ہو گئے، جو اسے عربی پڑھا رہے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ماسٹر کانتی پرشاد کو اس نے کبھی اس درجے میں شمار نہیں کیا۔

اماں، چاچا اور وصال دین کو وہ اس وقت سے دیکھ رہا تھا، جب اس نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اسی لیے وہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ان کے مزاج سے خوب واقف ہے۔ اور ان تینوں کے حوالے سے اس نے مسلمانوں کے بارے میں ایک نظریہ قائم کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسلمان بہت صلح جو، بہت نرم خو اور بہت منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ وہ کم سے کم اظہار کے قائل ہوتے ہیں۔ اپنی بات پر زور نہیں دیتے۔ اصرار نہیں کرتے۔ بحث سے گریز

کرتے ہیں۔ بے حد تابع دار اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔

اس نے مسلمانوں کو ایسا ہی دیکھا تھا۔ اماں سب سے زیادہ کھل کر بات کرتی تھیں۔ مگر بات کرتے کرتے اچانک چپ ہو جاتیں...... گھبرا کر بات نامکمل چھوڑ دیتیں۔ اور پھر کہتیں کہ ٹھاکر جی کو پتا چل گیا تو وہ ان سب کو ختم کرا دیں گے۔ اس کے بعد وہ لاکھ کریدنے کی کوشش کرتا، ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا۔ اور چاچا جمال دین اور ویر جی دونوں ایک سے تھے۔ پتا جی چاچا کی کتنی عزت کرتے۔ لیکن چاچا کے انداز کی عاجزی وہی رہتی۔ چاچا اور ویر جی میں ایک بات مشترک تھی۔ دونوں اپنے خیالات کا اظہار کم ہی کرتے تھے۔ ان کا عمومی رویہ یہ تھا کہ جو کہا جاتا، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ حالانکہ چاچا جی کا کوئی بات سمجھانے کا طریقہ بے حد سادہ اور حد درجہ دل نشیں تھا۔ اوتار سنگھ کو آج بھی یاد تھا کہ انھوں نے لکڑی کے گھوڑے کو نظر انداز کرنے کے بارے میں اسے کیسے موثر انداز میں سمجھایا تھا اور پھر وہ اس کا گھوڑا بنے تھے۔ اسے پیٹھ پر بٹھا کر دالان میں دوڑتے رہے تھے۔ اس روز انھوں نے اسے وفاداری کا سبق ایسے دل نشیں انداز میں سکھایا تھا کہ وہ آج تک نہیں بھولا تھا۔ انھوں نے کہا تھا...... ہاتھ تھام کر چھوڑتے نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔

اوتار سنگھ کو اس دن کی ایک ایک بات آج بھی یاد تھی۔ چاچا جی نے کہا تھا کہ ہر چیز کی ایک اوقات ہوتی ہے۔ کسی سے محبت کرتے وقت اس کی اوقات ضرور دیکھنی چاہیے۔ اس کے باوجود بھی محبت ہو جائے تو محبت ضرور کرو۔ لیکن جب محبت نہ رہے، تب بھی یہ بات اس پر ظاہر نہ ہونے دو۔ کیونکہ کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔

اس سے پتا چلتا تھا کہ چاچا جی عقل والے ہیں۔ لیکن وہ دبو بھی تھے۔ اپنی عقل کا اظہار کم ہی کرتے تھے۔ جمال دین اسی معاملے میں ان سے بھی آگے تھا۔ اس کے بارے میں تو اوتار سنگھ عقل [illegible] کر ہی نہیں سکتا تھا۔ کبھی ایسی کوئی علامت ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی۔

مگر اب کالج میں محمود کو دیکھنے کے بعد اوتار سنگھ کو مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے پر نظرثانی کرنی پڑ [illegible] ذہانت مند بھی تھا اور سلجھے ہوئے ذہن کا مالک بھی۔ جس طرح ٹھنڈے دل [illegible] نے اپنے موقف کا دفاع کیا تھا، وہ قابل رشک تھا۔

لیکن اس بحث نے اوتار سنگھ کو الجھا بھی دیا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات ابھرے تھے۔ یہ احساس بھی ہوا تھا کہ ملک کے سیاسی منظر نامے سے وہ ناواقف ہے۔ یہ تو پتا چل گیا تھا کہ مسلمان ہندوستان میں اپنے لیے الگ خطہ زمین کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بھی طے تھا کہ انگریز ہندوستان سے رخصت ہونے والے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی ہے...... اور وہ بھی مرکزیت کے ساتھ...... پورے ہندوستان پر!

اوتار سنگھ نے ابھی بات پر غور کیا تو وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

اتنی بھاری اکثریت پر اقلیت کا حکومت کرنا ایک غیر معمولی بات تھی۔ یوں تو انگریز بھی اقلیت میں ہونے کے باوجود مدت سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ بتاتی تھی کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں امن و امان تھا، خوش حالی تھی۔ لوگوں کو انصاف ملتا تھا اور طوائف الملوکی پھیلنے سے پہلے رعایا مسلمان حکمرانوں سے محبت کرتی تھی۔ اس حکومت میں طاقت تو تھی لیکن جبر نہیں تھا۔ جبکہ انگریز بہ جبر حکومت کر رہے تھے۔ انھیں ایک بہت بڑی اور ملک گیر بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تھا، جسے انھوں نے بڑی سختی اور بے رحمی سے کچل دیا تھا۔ اوتار سنگھ کے خیال میں اسے بغاوت کہنا زیادتی تھی۔ ہندوستانی لوگ...... کیا ہندو، کیا مسلمان...... بجا طور پر اسے تحریک آزادی کہتے تھے۔

اوتار سنگھ کے لیے مسلمانوں کی کشش اور بڑھ گئی۔ ان میں خوبیاں تو ہوں گی۔ تبھی تو انھوں نے اتنے طویل عرصے حکومت کی تھی۔ شیر شاہ سوری نے صرف پانچ سال میں اتنی اصلاحات کی تھیں...... اور اتنی بڑی اور اہم اصلاحات کہ اس کے مختصر دور کو بلاشبہ سنہرا دور کہا جا سکتا تھا۔

گزشتہ بحث کے بعد اوتار سنگھ کے اندر کا طالب علم بری طرح بھڑک چکا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد سب کچھ جان لینا اور سمجھ لینا چاہتا تھا۔ گزشتہ بحث میں دو فریق تھے...... محمود اور رام گوپال۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دونوں سے الگ الگ گفتگو کرے گا۔

پھر اسے رام گوپال سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ اسے کینٹین میں لے گیا۔ چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے مطلب کی بات چھیڑی۔ ''اس روز تمہاری اور محمود کی جو بحث ہوئی، وہ مجھے بڑی دلچسپ لگی۔''

''کچھ بھی ہو، مُسلا تو مُسلا ہی رہے گا۔'' رام نے بے حد نفرت سے کہا۔ ''اور یہ مُسلے سالے ہوتے ہی مطلبی ہیں۔''

رام کے لہجے کی نفرت نے اوتار سنگھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ بظاہر تو وہ معمولی سا اختلاف رائے تھا۔ لیکن یہ اتنی تند نفرت اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ ''ایسے تو نہ کہو رام۔ آخر وہ ہمارا دوست ہے۔'' وہ بولا۔

''ارے کاہے کا دوست۔'' رام نے بےزاری سے کہا۔ ''چھپا دشمن کہو اُسے۔''

''تم اوور ری ایکٹ کر رہے ہو رام۔ وہ محض ایک نظریاتی بحث تھی۔''

''نظریہ...... ہنہہ۔'' رام کے لہجے میں حقارت تھی۔ ''یہ ہندوستان جغرافیہ ہے، کوئی نظریہ نہیں۔ وہ نظریاتی بحث نہیں تھی، جغرافیائی بحث تھی۔ یہ ہماری دھرتی ہے، ہمارا دیش ہے۔ جو نظریہ اس کے ٹکڑے کرنے کی بات کرے، میں اسے نہیں مانتا۔ نظریے کو جغرافیہ تبدیل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ذرا سوچو، اس دھرتی پر ان مُسلوں کا کیا حق ہے۔ یہ باہر سے آئے اور ہندوستان

پر قابض ہو گئے۔ اکثریت کو غلام بنا لیا...... انگریزوں کی طرح۔''

''میرے خیال میں تو فرق ہے دونوں میں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''مسلمانوں نے حکومت کی، غلام نہیں بنایا۔ یہاں بہت کچھ کیا انھوں نے۔ اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ اس کی ترقی اور خوش حالی کے لیے کوشش کی۔ انگریزوں کا معاملہ اور ہے۔ وہ یہاں رہ کر بھی برطانیہ کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔ وہ یہاں کی دولت برطانیہ منتقل کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''مسلمان بھی یہاں بیٹھ کر اسلام کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔''

''تو یہ تو نظریاتی بات ہوئی، جغرافیائی نہیں۔'' اوتار سنگھ بولا۔ ''مسلمانوں نے ہندوستان کو انگریزوں کی طرح بدیش...... نو آبادی نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ اسے اپنا دیش سمجھتے ہیں۔''

''سمجھنے سے یہ ان کا دیش ہو گا نہیں۔'' رام گوپال نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''اب انگریز یہاں سے جانے والے ہیں۔ دیش آزاد ہو گا۔ اور یہاں وہ لوگ حکومت کریں گے، جن کا حق ہے۔ ان مُسلوں کی ہوا خراب ہو رہی ہے تو صرف اسی وجہ سے۔ یہ ہماری حکومت میں رعایا بن کر نہیں رہنا چاہتے۔''

اوتار سنگھ نے دل میں اس بات کی معقولیت کو تسلیم کیا۔ ''مگر وہ اپنے ڈر کی وجہ بھی تو بیان کرتے ہیں۔''

''ڈر ان کا سچا ہے۔'' رام گوپال مسکرایا۔ ''اب ہماری باری ہے اور ہم ان سے گن گن کر بدلے لیں گے۔ انھوں نے صدیوں ہم پر حکومت کی اور ہمیں دبا کر رکھا۔ اب ہماری باری ہے۔ یہ تو سمے کا چکر ہے۔ تو اب وہ ڈرتے کیوں ہیں۔ جو انھوں نے کیا، اب انھیں سہنا ہو گا۔''

''اور یہ شدھی تحریک کیا ہے؟''

''اس کی بنیاد اس پر ہے کہ ہندوستان میں صرف ہندوؤں کو رہنا ہے۔ یہ دھرتی ہندوؤں کی ہے۔ تو مسلمانوں کی بہتری کے لیے انھیں شدھی کیا جا رہا ہے۔ تاکہ وہ اس دھرتی پر رہ سکیں۔''

''شدھی کیا جا رہا ہے کا مطلب ہندو بنایا جا رہا ہے انھیں؟''

رام گوپال بڑی بے رحمی سے ہنسا۔ ''ہندو بنایا نہیں جاتا۔ ہم خالص لوگ ہیں۔ ماں کے پیٹ سے ہندو پیدا ہوتے ہیں۔ ان مسلمانوں میں یہ تصور نہیں۔ اسی لیے یہ شودروں کو بھی مسلمان بنا لیتے ہیں اور برابری کا درجہ دیتے ہیں۔''

اوتار سنگھ اس بات پر غور کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت اتنی مہلت نہیں تھی۔ اس نے سوچا،

اس پر بعد میں غور کرے گا۔ ''تو ہندو نہیں بنایا جاسکتا انھیں۔ پھر شدھی کرنے کا کیا مطلب ہوا۔''

''یہ ایک مرحلہ ہے۔ وہ مسلمان نہیں رہتے اور شودر جیسے ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگلے جنم میں وہ ہندو پیدا ہوں گے۔''

اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ خود رام گوپال کو بھی پوری معلومات نہیں ہیں۔ تاہم اس نے بات آگے بڑھائی۔ ''یہ تو ظلم ہے، زیادتی ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ ذرا سوچو تو۔ ہم تو اپنے ہندوؤں کو دوبارہ ان کے دھرم میں واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''مگر شدھی تو مسلمانوں کو کہا جا رہا ہے۔'' اوتار سنگھ الجھنے لگا۔

''وہ مسلمان جو پہلے ہندو تھے۔ ارے مسلمان آئے تو ان کی تعداد ہی کیا تھی۔ انھوں نے زور زبردستی سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ ورنہ آج مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کیسے ہوتی۔''

اوتار سنگھ کے لیے یہ بات بھی قابلِ غور تھی۔ لیکن ابھی وقت نہیں تھا۔ ''تو تمھارے خیال میں شدھی تحریک جائز ہے؟'' اس نے رام گوپال سے پوچھا۔

''بالکل۔''

''مگر اس دن تم کہہ رہے تھے کہ وہ انتہا پسند ہندوؤں کی تحریک ہے۔ ایک طرح سے تم نے اس سے بے تعلقی ظاہر کی تھی۔''

''ارے یار، اسے ڈپلومیسی کہتے ہیں۔'' رام گوپال آنکھ مارتے ہوئے مسکرایا۔ ''ورنہ ہر ہندو انتہا پسند ہے۔'' پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ''اس دھرتی پر بڑے پاپ کیے ہیں ان مُسلوں نے۔ اب یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ ہم گئو ماتا کی رکھشا کریں گے۔''

بات ختم ہو گئی کیونکہ ان کا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔

اس گفتگو سے اوتار سنگھ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رام گوپال تنگ نظر بھی ہے اور مکار بھی۔ لیکن بہرحال وہ فرد تھا۔ ضروری نہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت ایسی ہی ہو۔ آخر وہ خود بھی تو ہندو ہی تھا۔ لیکن نہیں...... اس نے سوچا۔ میرا معاملہ مختلف ہے۔ میں بتوں کو نہیں پوجتا۔ میں انھیں مانتا بھی نہیں۔ میں تو اس مہان ہستی کی کھوج میں ہوں، جس نے یہ دنیا بنائی، اس کا مربوط نظام قائم کیا۔

اس کے بعد کافی دنوں تک اسے محمود سے تنہائی میں گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ تاہم اس دوران اس نے متعدد ہندو طلبا سے بات کی۔ ان کا نکتۂ نظر بالکل وہی تھا، جو رام گوپال کا تھا۔ اس بات نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

❀......❀......❀

پارسن فیملی طویل عرصے سے ہندوستان میں تھی۔ رچرڈ اور ریٹا یہیں پیدا ہوئے تھے۔ دونوں میں صرف ایک سال کا فرق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر لوگ انھیں جڑواں بہن بھائی سمجھتے

تھے۔

جیمز پارسن دہلی کی انتظامیہ میں ایک کلیدی عہدے پر فائز تھے۔ دونوں بچوں کو تعلیم کے لیے انھوں نے نینی تال بھجوا دیا تھا۔ جہاں وہ پڑھتے تھے، وہ ایک بڑا کانونٹ اسکول تھا۔ وہاں اکثریت انگریزوں کی تھی۔ لیکن مسلمان اور ہندو بھی بہرحال موجود تھے۔

رچرڈ اور ریٹا دونوں کو ہندوستان بہت پُرکشش لگتا تھا۔ ہندوستان کی رنگا رنگ ثقافت ان کے لیے مسحور کن تھی۔ انھیں یہاں کی زبان میں بھی شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ یہ دلچسپی ہی کی بات تھی کہ انھوں نے اِدھر اُدھر سے سیکھ سمجھ کر اردو میں اچھی خاصی استعداد بنالی تھی۔

اسکول میں عام طور پر انگریز بچوں کا رویہ ایسا تھا کہ وہ بس ایک دوسرے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ویسے بھی ان کی اکثریت تھی۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہندوستانی بچے سب سے الگ تھلگ، ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر کچھ بچے ایسے بھی تھے جو فطرت کے اعتبار سے گھلنے ملنے والے تھے۔ وہ انگریز بچوں کی طرف بڑھتے تھے۔ مگر رچرڈ اور ریٹا کے سوا ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ رچرڈ اور ریٹا کے لیے اپنے ہم نسلوں سے بڑھ کر ان میں کشش تھی۔ اور ان سے وہ بہت کچھ سیکھتے تھے۔ ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔ پھر یہی نہیں، انھیں جب بھی موقع ملتا، وہ اسکول سے نکلتے اور مقامی لوگوں میں گھلتے ملتے۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ مقامی لوگ بہت سادہ اور ملنسار ہیں۔

دونوں بہن بھائیوں کو ہندوستان سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں سوچتے تھے۔ ان کا مشاہدہ بھی بہت اچھا تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ چند اکا دکا افراد کو چھوڑ کر ہندوستانیوں میں ایک اجتماعی احساسِ کمتری تھا۔ یہ فطری تھا۔ وہ باہر سے آنے والے اور خود سے ہر اعتبار سے مختلف انگریزوں کی رعایا تھے۔ کچھ انگریزوں کا حد سے بڑھا ہوا احساسِ برتری بھی ان کے احساسِ کمتری کو اور بڑھا دیتا تھا۔

بہرحال رچرڈ اور ریٹا نے اسکول میں بھی خود کو اپنے ہم نسلوں تک محدود نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے ہندوستانیوں سے بھی دوستی کی۔

اسکول کی تعلیم مکمل ہوئی تو جیمز پارسن نے انھیں دہلی واپس بلانے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ وہ نینی تال میں مزید پڑھ سکتے تھے۔ لیکن ایک تو وہ اور الزبتھ اپنے بچوں کو بہت زیادہ مس کرنے لگے تھے۔ اور دوسرے سیاسی صورتِ حال بہت تیزی سے بدل رہی تھی۔ انگریزوں کا ہندوستان سے رخصت ہونا اب نوشتۂ دیوار تھا۔ جیمز پارسن کے بس میں ہوتا تو وہ ابھی انگلینڈ واپس چلا جاتا۔ ایسے میں وہ کم از کم یہ تو کر سکتا تھا کہ اپنے بچوں کو اپنے پاس واپس بلا لے۔ تاکہ انگلینڈ واپسی کا فیصلہ ہو تو کوئی پیچیدگی نہ ہو۔

دہلی بڑا شہر تھا۔ وہاں انگریزوں کی اپنی سوشل لائف تھی۔ اب بچے جوانی کی سرحد میں

قدم رکھ چکے تھے۔ چنانچہ جیمز اور الزبتھ نے انھیں کلب لے جانا شروع کیا اور انھیں ان کے ہم نسلوں سے متعارف کرانے لگے۔ لیکن رچرڈ اور ریٹا کو کلب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ریٹا بالخصوص پیدائشی رومینٹک تھی۔ اس کی جمالیاتی حس بڑی توانا تھی۔ وہ نازک طبع، نازک خیال اور آرٹسٹک تھی۔ وہ اتنی رومان پرست تھی کہ بچپن ہی سے اس نے اپنا ایک آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ اس کے خوابوں کا ایک شہزادہ تھا، جس کی وہ راہ تکتی تھی۔

کلب میں لوگوں نے جس طرح اس کی پذیرائی کی، وہ اسے اچھا نہیں لگا۔ جبلی طور پر ہر عورت بوالہوس نگاہوں کو پہچان لیتی ہے۔ وہ تو پھر ایسی لڑکی تھی، جسے مشرقیت اچھی لگتی تھی اور وہ رومان پسند بھی تھی۔ چنانچہ وہ کلب سے بےزار ہوگئی۔

کالج کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ خوش تھی۔ کالج میں نئے دوست ہوں گے۔ نئی دلچسپیاں ہوں گی۔ اچھا وقت گزرے گا اور کون جانے......

لیکن ابتدا میں اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ کالج میں ہندوستانیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نینی تال کے مقابلے میں یہاں ہندوستانیوں کا احساسِ کمتری بڑھا ہوا تھا اور جو لوگ اس سے محفوظ تھے، وہ انگریزوں کو غاصب سمجھتے تھے۔ یہاں دوست بنانا زیادہ دشوار ہوگیا۔ ریٹا حیرت سے سوچتی، جذباتی اعتبار سے یہ کتنے متوازن لوگ ہیں۔ یا تو احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں گے۔ یا اپنے بدیسی حکمرانوں کے ہر ہم نسل سے نفرت کریں گے، جیسے وہ بھی اپنے ہم نسلوں کے ساتھ شریک استحصال ہو، جیسے وہ بھی ان کے جرمِ حکمرانی میں برابر کا شریک ہو۔

مگر پھر دھیرے دھیرے رچرڈ کے دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ اور اس حلقے میں ہر رنگ موجود تھا۔ قدرتی طور پر وہ ریٹا کا حلقہ بھی تھا۔ اس میں پشپا، نادرہ اور امرتا بھی تھیں اور محمود، رام گوپال، اوتار سنگھ اور فتح سنگھ بھی تھے۔ پہلی بار وہ خوش ہوئی۔

اور جب پہلی بار اس نے اوتار سنگھ کو دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔ مگر اس نے پہلی نظر کے اس تاثر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نزدیک آدمی کی ظاہری شخصیت سے زیادہ اہم اس کی باطنی شخصیت تھی اور باطنی شخصیت ذرا دیر میں ہی کھلتی ہے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کی شخصیت کے سحر میں الجھتی گئی۔ اوتار سنگھ ظاہری طور پر جتنا خوبصورت تھا، باطنی طور پر اس سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اس کی شخصیت غیر معمولی طور پر متوازن تھی۔ وہ بنیادی طور پر طالب علم تھا...... زندگی کا طالب علم۔ کالج کا چپڑاسی ہو یا لیکچرار، اپنا کوئی ہم جماعت ہو یا دوست، وہ سب کی بات ایسی توجہ سے سنتا کہ لگتا عبادت کر رہا ہے۔ جیسے ہر اہم، غیر اہم بات سے وہ کچھ سیکھ رہا ہے۔ اس کے مزاج میں عجیب سا انکسار اور عاجزی تھی۔ لیکن وہ ڈرپوک نہیں تھا۔ جس بات کو درست سمجھتا، اس کا برملا اظہار وہ کسی کے بھی

سامنے کر سکتا تھا۔ خود اعتمادی کی اس میں کمی نہیں تھی۔ مگر وہ بات نظریں جھکا کر کرتا تھا۔ اس کی نگاہیں نہ چور کی نگاہیں تھیں اور نہ ہی کسی بوالہوس کی۔ ان میں عجیب سی پاکیزگی، معصومیت اور جستجو تھی۔ وہ ایک طالب علم کی متجسس نگاہیں تھیں۔ ایسا طالب علم جو سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

مگر ایک بات تھی۔ دوستوں کے حلقے میں بھی وہ بہت ریزرو رہتا تھا۔ کبھی بہت زیادہ بےتکلف نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ اس سے اس کے بارے میں بات کی جائے تو وہ اس سے بچے۔ نہیں...... اپنے بارے میں وہ کھل کر بات کرتا تھا۔ البتہ دوسروں کے معاملے میں وہ پرائیویسی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ کسی کی نجی زندگی کے بارے میں تجسس نہیں کرتا تھا۔ اس کا تجسس خالصتاً علمی تھا۔

ریٹا کو پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ کب وہ اسے مختلف نظر سے دیکھنے لگی۔ جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو اسے کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی۔ وہ مغرب کی لڑکی تھی۔ اپنی زندگی کے فیصلے کرنا، اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنا اس کا حق تھا۔ بس اہمیت اس بات کی تھی کہ اوتار سنگھ کے نزدیک بھی اس کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں۔

اس معاملے میں اسے مایوسی ہوئی۔ اوتار سنگھ سب سے ایک طرح سے ملتا تھا۔ بلکہ کبھی تو ایسا لگتا کہ دوستوں میں اس کے نزدیک جنس کی تفریق تھی ہی نہیں۔ وہ بہت خوش اخلاق تھا۔ مہذب تھا۔ اس کے اندر رکھ رکھاؤ تھا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

وہ مایوسی وقتی تھی۔ ریٹا نے سمجھ لیا کہ اوتار سنگھ ایک ایسا لڑکا ہے، جس نے ابھی جوانی کی سرحد میں قدم رکھا ہے اور ابھی وہ جوانی کے تقاضوں سے ناآشنا ہے۔ وہ اسے اہمیت نہیں دیتا تو کوئی بات نہیں۔ اسے خود کوشش کرنی ہوگی کہ وہ اسے اہم سمجھنے لگے۔ وہ بہت خوبصورت اور شاداب لڑکی تھی۔ اسے خود پر بہت بھروسہ تھا۔ کلب میں وہ دیکھ چکی تھی کہ مرد کیسے دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے ہیں۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس سلسلے میں اسے کچھ کرنا ہے لیکن اس سے پہلے ہی اس پر ایک دھماکہ خیز انکشاف ہوگیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ وہ تو ایک انار سو بیمار والا معاملہ ہے۔ اس معاملے میں لڑکیوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اس نے دیکھ لیا کہ دوستوں کے اس حلقے میں تمام لڑکیاں صرف اور صرف اوتار سنگھ کی تمنائی ہیں۔ کیا پشپا، کیا امرتا اور کیا نادرہ۔ گویا مقابلہ بہت سخت تھا۔ مگر ریٹا کو یقین تھا کہ جیت اُسی کی ہوگی۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ کو اکیلے میں محمود سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس دوران ایک اور اہم واقعہ ہوگیا۔ ہفتے کے روز خالی پیریڈ میں وہ مل بیٹھے۔ چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر رچرڈ نے کہا۔ ''آج ریٹا کا برتھ ڈے ہے۔''

اس پر سب نے چونک کر ریٹا کو دیکھا۔ ریٹا مسکرائی۔ اسے سب کی توجہ کا مرکز بننا بہت اچھا لگتا تھا۔ سب نے اسے ہیپی برتھ ڈے کہا۔

"نہیں...... مجھے یہ مبارک باد نہیں چاہیے۔" ریٹا نے کہا۔ "ہر چیز کا، ہر بات کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ یہ کیا کہ یہاں پتا چلا اور یہیں وش کر دیا۔"

"تو پھر؟" محمود نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

ریٹا کو احساس تھا کہ محمود اسے خصوصی توجہ دیتا ہے۔ وہ پھر مسکرائی۔ "اب یہ تم سوچو۔" اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔

"چلو...... میں تمہیں تحفہ دوں گا۔ تب وش کر لوں گا۔" محمود بولا۔

"میں بتاتا ہوں۔" رچرڈ نے مداخلت کی۔ "آج ہمارے گھر پر ریٹا کی برتھ ڈے پارٹی ہے۔ تم سب کو آنا ہے۔"

"برتھ ڈے پارٹی!" رام گوپال نے فکر مندی سے کہا۔

پھر وہی احساسِ کمتری! ریٹا نے سوچا۔

"اس پارٹی میں ہم دوستوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔" رچرڈ نے وضاحت کی۔

"اوہ...... وری گڈ۔" پشپا نے چہک کر کہا۔

رام گوپال نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہاں بہت سارے لوگ ہوں گے...... بے شمار انگریز۔ "کیوں نہیں۔ ہم ضرور آئیں گے۔"

"پارٹی کا وقت کیا ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"رات آٹھ بجے۔ ڈنر دس بجے۔ پھر ڈانس اینڈ میوزک۔" ریٹا بولی۔

"یہ تو لمبا پروگرام ہے۔" نادرہ کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

"تو کیا؟ آج سیٹر ڈے ہے۔ کل کالج کی چھٹی ہوگی۔ رات اپنی ہی ہے۔" رچرڈ نے کہا

"نا بابا...... میں رات بھر نہیں رک سکتی۔" نادرہ بولی۔ "مجھے تو پارٹی میں شرکت کی اجازت بھی آسانی سے نہیں ملے گی۔ ہم لوگ ایسے آزاد خیال نہیں ہیں۔"

"اوکم آن۔ ڈونٹ بی سو بیک ورڈ۔" ریٹا نے کہا۔

"نادرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" محمود نے تائید کی۔ "میں بھی جلدی جانا چاہوں گا۔"

رچرڈ نے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ان کے موقف میں لچک نہیں ہوگی۔ "او کے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ جب تم کہو گے، میں تم دونوں کو گاڑی میں تمہارے گھر ڈراپ کرادوں گا۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔" نادرہ نے کہا۔

ریٹا نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔ "تم نے کچھ نہیں کہا۔ کیا بات ہے، آؤ گے نا؟"

"ضرور آؤں گا۔ میں تو آزاد آدمی ہوں۔" اوتار سنگھ نے کہا۔ "اور اچھا لگا تو پوری رات بھی رک سکتا ہوں۔"

"میں بھی۔" فتح سنگھ اور امرتا نے بیک آواز کہا۔

"میں بھی آؤں گی اور پوری رات رکوں گی۔"

"بس تو طے ہو گیا۔ آج رات آٹھ بجے۔"

❁......❁......❁

حور بانو ان دنوں بہت پریشان تھی!

پہلے تو استانی صاحبہ کی پڑھائی نے اس کا معمول تبدیل کیا۔ پھر اوپر چھوٹے ٹھاکر کا معمول بھی بدل گیا۔ اس نے مغرب کے بعد اوپر کوٹھے پر آنا اور دیر تک بیٹھنا چھوڑ دیا۔ کیوں؟ اس نے اس پر سوچا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اتفاق سے استانی جی نے چھٹی کی تو اسے پتا چلا کہ چھوٹا ٹھاکر عربی پڑھ رہا ہے۔ یہی نہیں، وہ اپنے مولوی صاحب سے قرآن پاک کی تلاوت بھی سنتا ہے۔

اس انکشاف نے حور بانو کے سامنے امکانات کی ایک روشن دنیا لا کر رکھ دی۔ خوش فہمی کے سرسبز باغ اسے نظر آنے لگے۔ اسے لگا کہ نجانے کیسے...... مگر چھوٹا ٹھاکر بھی اسی سے محبت کرنے لگا ہے اور اسی کی خاطر وہ عربی سیکھ رہا ہے۔ اور تلاوت سننے کے بعد اگلا مرحلہ تو قبولِ اسلام ہی کا ہے۔

معصوم لڑکی اس معاملے میں نہ کسی کو رازدار بنا سکتی تھی، نہ کسی سے مشورہ لے سکتی تھی۔ آپ ہی آپ سوچتی، اندازے لگاتی اور خوش ہوتی اور عربی پڑھنے والی بات سے تو وہ اتنی خوش ہوئی تھی کہ اس نے چھوٹے ٹھاکر کی دید سے محرومی پر بھی صبر کر لیا تھا۔ بڑے کام کے لیے بڑی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ یہ دید سے محرومی تو بہت چھوٹی بات تھی۔

لیکن ایک صبح اسے بڑا دھچکا لگا۔ اس نے دیکھا کہ وصال دین اکیلا اسکول جا رہا ہے۔ وہ پریشان ہو گئی۔ کہیں چھوٹے ٹھاکر کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟ وہ بے چین رہی۔ مگر چھٹی کے وقت وہ پھر دروازے پر پہنچ گئی۔ وصال دین اسکول سے اکیلا ہی واپس آیا تھا۔

اس معمول کو ایک ہفتہ ہو گیا۔ حور بانو کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر زیادہ ہی بیمار ہے۔ لیکن اوپر بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کافی دنوں سے رنجنا بھی نیچے نہیں آئی تھی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ حور بانو نے ایک ہفتے تک چھوٹے ٹھاکر کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ اس شام وہ پڑھائی کے دوران پانی پینے کے بہانے سے اٹھی اور برآمدے میں چلی آئی۔ اس

نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اوپر کوٹھے پر چھوٹا ٹھا کر اپنے مولوی صاحب سے عربی پڑھ رہا تھا۔

حور بانو کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہاں سے ہٹے۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو شبہ ہو۔ چنانچہ وہ پانی پی کر واپس چلی آئی۔ اسے یہ اطمینان تو ہو گیا کہ چھوٹا ٹھا کر بیمار نہیں ہے۔ لیکن یہ الجھن برقرار رہی کہ وہ اسکول کیوں نہیں جا رہا ہے۔

اس روز رنجنا نیچے آئی تو حور بانو ہر احتیاط بھول بیٹھی۔ ''اتنے دن بعد آئی ہو؟ کیا بات ہے؟'' اس نے رنجنا سے پوچھا۔

''بس موقع ہی نہیں ملا۔''

''سب خیرت ہے نا؟'' حور بانو نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں......سب ٹھیک ہے۔''

اس سے زیادہ پوچھنے کا موقع نہیں تھا۔ رنجنا بیٹھ کر اماں سے بات کرتی رہی اور حور بانو بے تاب سی اِدھر سے اُدھر پھرتی رہی۔ رنجنا جانے لگی تو حور بانو اس کے پیچھے برآمدے تک چلی آئی۔ ''رنجنا......تمھارے چھوٹے ٹھا کر نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے کیا؟'' اس نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ بات سرسری نہیں ہے۔

رنجنا بہت بری طرح چونکی۔ پھر بولی۔ ''لو......انھیں تو پڑھنے کے سوا کچھ کام ہی نہیں ہے۔ ہر وقت پڑھتے ہی رہتے ہیں۔''

''تو گھر پر ہی پڑھتے ہیں؟ اسکول چھوڑ دیا کیا؟''

''نہیں تو۔ روز جاتے ہیں۔'' رنجنا نے کہا۔ پھر بہت غور سے اسے دیکھا۔ ''پر تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟''

حور بانو چور سی ہو گئی۔ مگر اب پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی تھی۔ ''آکا میاں کہہ رہے تھے کہ اب وصال دین اسکول اکیلا جاتا ہے۔''

''ارے ہاں......وہ چھوٹے ٹھا کر تو پاس ہو گئے نا۔'' اچانک رنجنا کو خیال آیا۔ ''اب وہ اسکول نہیں......وہ کیا کہتے ہیں......ماسٹر جی بتا رہے تھے......ہاں کالج! اب چھوٹے ٹھا کر کالج جاتے ہیں۔''

''یہ کالج کیا ہوتا ہے؟'' حور بانو نے مزید ٹٹولا۔

''ماسٹر جی کہہ رہے تھے، بڑا اسکول ہوتا ہے......بہت بڑا۔'' رنجنا نے دونوں ہاتھ آخری حد تک پھیلاتے ہوئے بتایا۔ ''اور ماسٹر جی یہ بھی بتا رہے تھے کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔''

''ہائے اللہ۔'' حور بانو نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو آکا میاں کے سوا کبھی کسی کے سامنے نہیں آئے۔''

''وہاں تو انگریز لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ صبح چھوٹے ٹھا کر ذرا دیر سے جاتے ہیں اور واپسی کا کچھ پتا نہیں۔ کبھی جلدی میں آجاتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر دیر ہی ہوتی ہے۔ کبھی تو شام بھی ہو جاتی ہے۔ پھر واپس آ کر بھی پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ سوکھ کے کانٹا ہو گئے ہمارے چھوٹے ٹھا کر۔ ارے میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی زمین داری ہی سنبھالنی ہے نا انھیں۔ اچھا......اب میں چلتی ہوں۔''

رنجنا چلی گئی۔ حور بانو دیر تک بت بنی وہیں کھڑی رہی۔ ایک مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ یعنی اب وہ چھوٹے ٹھا کر کو جاتے آتے دیکھنے کی کوشش تو کر سکتی تھی۔ لیکن دوسری پریشانی لاحق ہو گئی۔ کالج میں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے!

یہ بات اس کے دل کا بوجھ بن گئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس بوجھ کو کسی کے سامنے ہلکا کیسے کرے۔ خود ہی سوچتے رہنے سے تو الجھن اور بڑھ جاتی ہے۔

اگلے روز اسے موقع مل گیا۔ استانی جی پردے کی اہمیت کے متعلق ایک حدیث شریف پڑھا رہی تھیں۔ ''مگر استانی جی، میں نے تو سنا ہے کہ کالج میں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔'' اس نے بات نکالی۔

''ہاں، یہ انگریزوں کی لائی ہوئی لعنت ہے۔'' استانی جی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اب ہندوؤں کے ہاں تو پردہ ہے نہیں۔ وہ بھی آنکھیں بند کر کے انگریزوں کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ یہ تو بے حیائی ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ کالج میں لڑکیاں سرخی پوڈر لگا کر جاتی ہیں۔ بے حیائی کے کپڑے پہنتی ہیں اور لڑکوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومتی ہیں۔'' استانی جی نے تو گویا آگ پر تیل کا چھڑکاؤ کر دیا۔

''مگر استانی جی، سنا ہے کالجوں میں مسلمان لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔'' حور بانو نے کہا۔

''کچھ موئے مسلمان ہیں جو انگریزوں کے ٹوڈی بنے پھرتے ہیں۔'' استانی جی بھنّا کر بولیں۔ ''ان کی اولادیں ہی ایسے کالجوں میں پڑھتی ہوں گی۔ وہ کم بخت اپنی پہچان ہی کھو بیٹھے۔ بس کلمہ پڑھنے کے مسلمان رہ گئے ہیں وہ۔''

''پھر بھی استانی جی، ہیں تو وہ مسلمان ہی۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' استانی جی نے سرد آہ بھر کے کہا۔ پھر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''محبت کا اثر تو ہوتا ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اسی لیے تو مسلمان پاکستان بنا رہے ہیں۔ تا کہ وہاں پوری آزادی سے اپنے طریقے سے زندگی گزار سکیں۔ کسی کی نقالی نہ کریں۔ اچھے مسلمان بن کر رہیں۔''

استانی جی سے بات کر کے حور بانو اور پریشان ہو گئی۔ یہ کالج اس کے لیے تو سوہانِ روح بن گیا۔

اگلی صبح وہ وصال دین کے جانے کے بعد دروازے پر منڈلاتی رہی۔ بالآخر اس نے چھوٹے ٹھاکر کو جاتے دیکھ لیا۔ وہ انگریزوں کی طرح سوٹ پہنے ہوئے تھا اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ احساس بھی ہوا کہ وہ اور بڑا ہو گیا ہے۔

چند روز میں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اسے کالج سے آتے دیکھنا بہت مشکل ہے۔ اس کی واپسی کا کوئی وقت ہی نہیں تھا۔

اب رات کے وقت حور بانو سونے کے لیے لیٹتی تو تصور میں اسے کالج نظر آتا۔ حالانکہ کالج اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کالج میں بس وہ ایک ہی منظر دیکھتی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں چھوٹے ٹھاکر کے سوا کوئی لڑکا نہیں ہے اور وہ اسے بھانت بھانت کی لڑکیوں میں گھرا نظر آتا۔ لڑکیاں جو عجیب و غریب لباس پہنے ہوتیں اور چھوٹے ٹھاکر کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتیں۔ وہ بے چارہ انہیں جھٹکتا رہتا۔

لیکن تصور سے ہٹ کر جب وہ سوچتی تو خوف زدہ ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ چھوٹا ٹھاکر کتنا ہی اچھا سہی، ہے تو انسان۔ کب تک ان لڑکیوں سے بچے گا۔ جبکہ وہ لڑکیاں تو ہیں ہی بے حیا۔ اور چھوٹا ٹھاکر لاکھوں میں ایک ہے۔ کوئی نہ کوئی لڑکی اسے لبھا ہی لے گی۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی ایک کو چھوڑ کر دوسری اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری کے چکر میں پڑ جائے۔ اور اسے بھول جائے تو کیا وہ اتنی آسانی سے اسے کھو بیٹھے گی۔

اس آخری بات پر اسے خود بھی ہنسی آ گئی۔ لو سوت نہ کپاس اور جلاہے سے لٹھم لٹھا۔ اسے بھولنے کا کیا سوال، جبکہ اسے تو معلوم ہی نہیں کہ کہیں کوئی حور بانو بھی ہے جو اس سے محبت کرتی ہے۔ اس نے تو اس کی ایک جھلک بھی کبھی نہیں دیکھی۔ وہ تو اسے جانتا بھی نہیں۔ اور کھونے کا کیا سوال، جبکہ وہ اس کا ہے ہی نہیں۔ اس مقابلے میں وہ تو کہیں ہے ہی نہیں۔

اس سوچ کے بعد بس وہ اس فکر میں لگ گئی کہ کس طرح چھوٹے ٹھاکر کے سامنے آ جائے...... وہ اسے دیکھ لے۔ تب شاید وہ ان بے حیا لڑکیوں سے محفوظ رہ سکے۔

براہ راست چھوٹے ٹھاکر کے سامنے جانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں وہ چلمن کے پیچھے سے یا جالیوں کے عقب سے اسے اپنی جھلک دکھا سکتی تھی۔ سو اس نے اس کا اہتمام کر لیا۔

اس روز اس نے اپنا سرخ کامدانی کا جوڑا پہنا۔ چھوٹا ٹھاکر دو بجے سے پہلے کبھی کالج سے نہیں آتا تھا۔ چنانچہ وہ دو بجے تیار ہو کر ڈیوڑھی میں آ گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کتنا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ تمام وقت کیا، زیادہ دیر بھی ڈیوڑھی میں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ وہ بمشکل پانچ منٹ کھڑی ہوتی اور پھر ہٹ جاتی۔ پھر پانچ منٹ بعد وہ دوبارہ ڈیوڑھی میں چلی جاتی اور اس دوران اسے یہ الجھن ستاتی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر آ کر اوپر جا بھی چکا ہے...... اس دوران جب وہ گھر میں تھی۔

خوش قسمتی سے چھوٹا ٹھاکر اس روز کالج سے جلدی آ گیا۔ ورنہ حور بانو پر نہ جانے کیا بیتتی اور خوش قسمتی سے اس وقت وہ ڈیوڑھی میں آئی تھی...... یہی سوچتی ہوئی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر اوپر جا چکا ہوگا۔

آتے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کی پہلی جھلک دیکھی تو حور بانو کا دل سینے میں یوں دھڑ دھڑایا، جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اور سانسیں اتنی تیز ہوئیں کہ ان کے شور سے اسے خود بھی گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا جسم یوں سنسنا رہا تھا، جیسے رگ رگ میں کوئی برقی رو دوڑ رہی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں کیا، پورا جسم کانپ رہا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کو آتے جاتے اس نے بارہا دیکھا تھا۔ مگر اس کا یہ حال پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ آج جو کرنے کا اس نے ارادہ کیا تھا، وہ پہلے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ آج وہ چاہتی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر اسے دیکھے۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔

مگر اب موقع ملا تو وہ پریشان کھڑی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے! ایسا کیا کرے وہ؟ کیسے کرے؟ اس کے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلمن کی طرف بڑھی۔ لیکن ٹانگوں کی لرزش اتنی بڑھ گئی کہ اسے لگتا تھا، وہ گر جائے گی۔

اور وہ صرف چند لمحوں کا کھیل تھا۔ اس موقع کی طوالت نہ ہونے کے برابر تھی اور اختصار ایسا تھا کہ مشکل سے چار بار پلکیں جھپکی جا سکتی تھیں۔

چھوٹا ٹھاکر دور سے آتا دکھائی دے رہا تھا اور وہ بیدِ مجنوں کی طرح لرزاں تھی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور اب ایک پل کی بات تھی۔ پل گزرتا اور وہ آگے نکل جاتا۔

حور بانو سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ وہ گنگ تھی۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ اس نے آواز نکالنے کی کوشش کی۔ مگر آواز ندارد تھی۔ اور وہ پل نکلنے ہی والا تھا۔ اس نے پھر بولنے کی کوشش کی...... اور اسے پھندا لگ گیا!

چھوٹے ٹھاکر نے آواز سن کر نظر اٹھائی۔ لیکن پوری طرح اٹھنے سے پہلے ہی اس کی نظر جھک گئی۔ اور پھر وہ آگے نکل گیا۔

حور بانو کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کی نظر اضطراری طور پر اٹھ رہی تھی۔ مگر درمیان میں ہی اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اور نظر جھکا لی تھی۔ معصوم لڑکی نہیں جانتی تھی کہ وہ نظر بھر کر دیکھ لیتا تو بھی اسے نہ دیکھ پاتا۔ باہر دھوپ تھی اور اندر اندھیرا۔ پھر درمیان میں چلمن۔ ایسے میں چھوٹے ٹھاکر کو متحرک سرخ رنگ کے سوا کیا نظر آ سکتا تھا۔

اس رات وہ بستر پر لیٹی یہی کچھ سوچتی رہی۔ وہ منظر اس کے تصور میں بار بار آتا......

چھوٹے ٹھاکر کا اضطراری طور پر نظر اٹھانا...... اور فوراً ہی ٹھٹھک کر نظر جھکا لینا۔ اچانک اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ ارے...... یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں۔ یہ تو چھوٹے ٹھاکر کی شناخت کا ثبوت ہے۔ وہ تو نگاہ سنبھالنے والا آدمی ہے۔ اس رویے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کالج میں وہ کس طرح رہتا ہوگا۔ حور بانو کے دل کو ایک اطمینان سا ہو گیا۔

لیکن محبت میں خطرے کا احساس بہت توانا ہوتا ہے۔ اس کا سکون محض وقتی تھا۔ بعد میں اسنے مختلف انداز میں سوچا تو بے سکون ہو گئی۔ وہ تو چلمن کے پیچھے تھی۔ چھوٹے ٹھاکر نے اٹھتی نظر پر قابو پا لیا۔ لیکن کالج میں تو بے حجاب لڑکیاں دھڑ سے اس کے سامنے آ جاتی ہوں گی۔ تب تو نظر جھکتے جھکتے بھی پڑ ہی جاتی ہوگی۔ اور پھر یہ معمول ہو تو کیا کوئی ہر وقت...... بار بار نظریں جھکاتا رہے گا۔ نہیں...... یہ تو ممکن نہیں۔

کچھ بھی ہو، حور بانو نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں۔ وہ کچھ بھی کر لے، کبھی چھوٹے ٹھاکر کے سامنے نہیں آ سکے گی۔ اور اسے ایک اور خیال آیا۔ اس نے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس پر سوچا۔ یہ حقیقت تھی۔ بہت بڑی سچائی تھی کہ اس محبت میں اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ یہ اس نے کی نہیں تھی، اسے خود بہ خود ہوئی تھی۔ اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ تو یہ محبت اللہ نے اس کے دل میں ڈالی تھی۔ تب اسے یہ سوچ کر شرمندگی ہوئی کہ چھوٹے ٹھاکر کے سامنے آنے کی، خود کو دکھانے کی کوشش اس کی اپنی تھی اور بالارادہ تھی۔ یہی نہیں ،اس کا ارادہ اور اس کی کوشش اللہ کے حکم سے متصادم تھی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے ار وہ خود کو چھوٹے ٹھاکر کو دکھا دے۔ تب بھی اس بات کی ضمانت نہیں کہ چھوٹا ٹھاکر کالج میں بے پردہ لڑکیوں کے شر سے محفوظ رہے گا۔ یہ ضمانت تو وہی دے سکتا ہے، جس نے اس کے دل میں چھوٹے ٹھاکر کی محبت ڈالی ہے۔ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔

اس سوچ کے بعد بس یہ ہوا کہ وہ کئی دن تک اللہ سے توبہ کرتی رہی۔ پھر اس کے دل کو سکون ہو گیا۔ جس نے اس کے دل میں وہ محبت ڈالی ہے، وہی جانے۔ وہی فیصلہ کرنے والا ہے۔ اب اسے کچھ نہیں کرنا۔ جو ہو سو ہو۔

❁......❁......❁

پارٹی میں شریک ہونے کے لیے وہ سبھی ٹھیک وقت پر پہنچے۔ سب سے پہلے آنے والا محمود تھا اور امرتا سب سے آخر میں آئی تھی۔ اوتار سنگھ سب سے زیادہ پُر اعتماد تھا۔ ورنہ اس کے علاوہ سبھی کو یہ خیال تھا کہ وہاں بہت سے انگریز مہمان ہوں گے۔ بلکہ وہ تو ریٹا اور رچرڈ کے والدین کا سامنا کرتے ہوئے بھی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہے تھے۔ جبکہ اوتار سنگھ کو اس سے غرض نہیں تھی کہ وہاں کون کون ہوگا۔

لیکن وہاں پہنچ کر ان سب کے دل خوش ہو گئے۔ اس پارٹی میں سوائے ان لوگوں کے

کوئی اور شریک نہیں ہو رہا تھا۔ رچرڈ کے ممی اور ڈیڈی بھی گھر میں موجود نہیں تھے۔ وہاں نوکروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ان سب کی جھجک دور ہو گئی۔ وہ پُرسکون اور خوش نظر آنے لگے۔

پھر بھی ایک پھانس دلوں میں چبھ رہی تھی۔ مسٹر اور مسز پارسن نجانے کب آ جائیں۔ اوتار سنگھ ان سب کی اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ وہ ان کے اندر چھپے احساسِ کمتری سے تو پہلے ہی واقف تھا۔ اور وہ اس پر غور کرتا رہتا تھا۔

پھر وہ پھانس بھی نکل گئی!

''تمھارے ممی ڈیڈی کہاں گئے ہیں؟'' امرتا نے ریٹا سے پوچھا۔

''کلب گئے ہیں۔'' ریٹا نے جواب دیا۔

''واپس کب آئیں گے؟'' نادرہ نے سوال اٹھایا۔

''آج سیٹرڈے نائٹ ہے۔'' ریٹا مسکرائی۔ ''آدھی رات کے بعد ہی واپسی ہوگی۔''

اجتماعی طور پر سکون کی سانس لی گئی۔

''تو کیک کاٹنے کے لیے تم ان کا انتظار کرو گی؟'' فتح سنگھ نے پوچھا۔

''ارے نہیں یو سلی۔'' ریٹا نے آنکھیں نکالیں۔ ''میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ یہ ایک پرائیویٹ پارٹی ہوگی۔ صرف ہمارے منتخب دوست اس میں شریک ہوں گے اور کیک تو ابھی ذرا دیر میں کاٹا جائے گا۔''

اس کے بعد ماحول ہلکا پھلکا ہو گیا۔ سب کے سب بے حد خوش مزاج ہو گئے۔ کالج کی، پڑھائی کی، کالج کے ساتھیوں کی باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد بٹلر کیک لے آیا۔ پارٹی کی فضا بن گئی۔ کیک کے گرد سولہ موم بتیاں روشن کر دی گئیں۔

ریٹا نے کیک کاٹا۔ سب نے اسے مبارک باد دی اور تحفے پیش کیے۔ کیک کاٹنے اور اس سے نمٹنے کے بعد تحفے کھولنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک دوسرے کے تحفوں پر فقرے چست کیے گئے۔

''ارے واہ...... رامو نے تاج محل کا ماڈل دیا ہے۔'' نادرہ بولی۔

رام گوپال کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''اوہ...... اِٹس بیوٹی فل۔'' ریٹا نے مسحور ہو کر کہا۔

''اینڈ اِٹ از سمبل آف لوَ۔'' امرتا نے وضاحت کی۔

رام گوپال بری طرح کھسیا رہا تھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا دوں۔'' وہ بولا۔ ''اور یہ مجھے بہت خوبصورت لگا۔''

''ایسے صفائی کیوں پیش کر رہے ہو، جیسے تم نے کوئی جرم کیا ہے۔'' محمود نے کہا۔

''مجھے تو یہ بہت اچھا لگا ہے۔'' ریٹا بولی۔

رام گوپال کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ تحفہ کھلنے کے بعد پہلی بار اس نے سکون کی سانس لی تھی۔

اس کے بعد پارٹی اگلے دور میں داخل ہو گئی۔ بٹلر نے برف میں لگی شمپیئن کی بوتلیں اور جام لا کر میز پر رکھ دیے اور باہر چلا گیا۔ تب رچرڈ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں شمپیئن کی بوتل لیے کھڑا ہوا اور اعلان کرنے والے انداز میں بولا۔ ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین، آج کی یہ خوبصورت شام، میری سویٹ بہن ریٹا کے نام۔ اور اس شام کا آغاز ہم شمپیئن کی بوتل سے کریں گے۔ کہتے ہیں کہ شمپیئن کی بند بوتل جوانی کے جوش کی نمائندگی کرتی ہے۔ جیسے جوان آدمی زندگی کے جوش کو دبائے بیٹھا ہوتا ہے، ویسے ہی کارک ہونے تک شمپیئن کی بوتل بھی اپنا ابال چھپائے رہتی ہے اور کارک ہٹتے ہی......'' اس نے بوتل کا کارک کھول دیا۔ شراب یوں اچھل کر، مچل کر نکلی، جیسے اس کا ضبط جواب دے گیا ہو۔

وہ سب تالیاں بجانے لگے۔ وہ منظر انھیں خوبصورت لگا تھا۔

رچرڈ جام بھرنے میں مصروف ہو گیا۔ پھر اس نے پہلا جام ریٹا کو پیش کیا۔ ''ناؤ کم آن...... ایوری باڈی۔'' اس نے دعوت دی۔

جام اٹھانے کے لیے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور اوتار سنگھ نہیں تھے۔ پشپا، امرتا، رام گوپال اور فتح سنگھ نے جام اٹھا لیے۔

رچرڈ کی نظروں میں الجھن تھی۔ ''کیا ہوا؟ تم لوگ شامل نہیں ہو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''تم جانتے ہو رچرڈ۔ ہم شراب نہیں پیتے۔'' محمود نے کہا۔

''اور تم اوتار سنگھ؟ تمھارا مذہب تو تمھیں منع نہیں کرتا۔'' رچرڈ نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔

''ہاں۔ مگر مجھے یاد ہے۔ پتا جی نے ایک بار مجھے سمجھایا تھا اور میں کبھی نہیں بھولا۔'' اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پتا جی کہتے ہیں، دنیا میں سب سے قیمتی چیز آدمی کی عزت ہوتی ہے اور انھوں نے کہا تھا، آدمی نشے میں ہوش و حواس گنوا بیٹھتا ہے۔ نہ اسے اپنی عزت کا خیال رہتا ہے، نہ بے عزتی کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح اسے دوسروں کی عزت کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ بس اسی لیے پتا جی نے کبھی شراب نہیں پی اور میں بھی کبھی نہیں پیوں گا۔''

اس دوران سب اسے غور سے دیکھتے رہے تھے۔ سب کے تاثرات مختلف تھے۔ پشپا، امرتا، رام گوپال اور فتح سنگھ کی نگاہوں میں استہزا تھا۔ نادرہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ محمود کی نگاہوں میں اس کے لیے عزت تھی۔ ریٹا سحر زدہ سی نظر آ رہی تھی اور اس کی نگاہوں میں دلچسپی تھی۔ رچرڈ کا انداز ایسا تھا، جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو۔

''رَدِش...... بکواس۔'' رام گوپال بڑبڑایا۔

''یہ تو امرت رس سے ٹھاکر جی۔'' فتح سنگھ نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

لڑکیوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بہرحال وہ سب اپنے اپنے جام ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔

رچرڈ نے ابھی تک جام نہیں اٹھایا تھا۔ ''بہرحال یہ تو مہمان نوازی کے اصول کے خلاف ہو گا کہ ہم پئیں اور تم دیکھتے رہو۔'' رچرڈ نے کہا۔

''تو ہم باہر چلے جاتے ہیں۔'' نادرہ بولی۔

''ارے نہیں...... تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' رچرڈ بے ساختہ مسکرایا۔ ''میرا مطلب ہے، تم لوگوں کو تمھارے ذوق کے مطابق کچھ ملنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ چند لمحوں کے بعد بٹلر اندر آیا۔ ''کیا حکم ہے صاحب؟''

''اورنج جوس لے کر آؤ...... بڑے جگ میں۔''

اورنج جوس آیا تو رچرڈ نے ان تینوں کے لیے گلاسوں میں جوس انڈیلا اور انھیں دیا۔

''تھینک یو رچرڈ۔'' نادرہ نے کہا۔

اب رچرڈ نے اپنے لیے جام اٹھایا اور اسے فضا میں بلند کیا۔ ''لیٹ اس ٹوسٹ ناؤ...... ریٹا کی صحت اور خوشیوں کے نام۔''

سب نے گھونٹ لیے اور پارٹی شروع ہو گئی۔ جوس والے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہے تھے۔ جبکہ شراب والے کھل کر پی رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب تیسرے جام پر پہنچ گئے۔ چہرے تمتمانے لگے۔ آوازیں لڑکھڑانے لگیں۔

''اب یہ دیکھو رچرڈ......'' رام گوپال نے کہا۔ ''یہ میرا بے وقوف دوست ملک کا بٹوارا اس لیے چاہتا ہے تا کہ یہ آزادی کے ساتھ شراب نہ پیے۔'' اس کا اشارہ محمود کی طرف تھا۔ ''اب بتاؤ، کیا ہم نے اس کے ساتھ زبردستی کی؟ بھئی نہیں پیتا تو نہ پیے۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔ اتنی سی بات کے لیے ملک کا بٹوارا...... یہ تو کوئی بات نہیں۔''

اس نے بات اس انداز میں کی تھی کہ سب ہنسنے لگے۔ لیکن محمود سنجیدہ تھا۔ ''تم غلط سمجھے ہو رام۔ ہم پاکستان اس لیے بنا رہے ہیں کہ وہاں اسلامی قانون ہو۔ نہ کوئی شراب پیے، نہ کسی دوسرے کو شراب کی ترغیب دے۔ ہم اس لیے پاکستان بنا رہے ہیں تا کہ تم ہندوستان میں آزادی سے شراب پیو اور ہم پاکستان میں شراب نہ پئیں۔''

''شراب پینے والے تو پھر بھی پئیں گے...... دیکھ لینا، پاکستان میں بھی پئیں گے۔'' فتح سنگھ نے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں چیلنج تھا۔

لیکن رام گوپال نے جیسے محمود کی بات سنی ہی نہیں۔ ''اب ہمارے ہندو بھائی اوتار سنگھ کو ہی دیکھ لو'' وہ بولا۔ ''اسے تو دھرم منع نہیں کرتا۔ مگر اس کے پتا جی منع کرتے ہیں۔ یہ نہیں پی رہا ہے۔ تو کیا ہم نے اسے مجبور کیا؟ نہیں کیا اور کیا ہم نے کسی کی بے عزتی کی یا اپنی عزت کا خیال

نہیں رکھا؟ نہیں...... ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہم نے۔ اس لیے کہ اب ہمارا ہندوستان سیکولر ہوگا اور یہاں جمہوریت ہوگی۔"

اوتار سنگھ مسکراتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم خاموش ہو اوتار سنگھ۔ کچھ بولتے کیوں نہیں۔" فتح سنگھ نے اسے اکسایا۔

"میں وقت آنے پر بولوں گا۔" اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔ "اور مجھے لگتا ہے کہ آج میرے پتاجی کی بات درست ثابت ہو جائے گی۔"

"اب یہ سوچو دوست کہ میرا دھرم مجھے شراب پینے سے نہیں روکتا۔" رام گوپال رچرڈ سے مخاطب تھا۔ "اور تمہارا دھرم بھی تمھیں نہیں روکتا۔ مگر محمود کا دھرم کچھ عجیب ہے...... ہے نا۔ زندگی کو انجوائے کرنے سے روکتا ہے۔"

محمود نے کچھ کہا نہیں۔ لیکن رچرڈ پارسن کو ایسی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ "نہیں رامو، تمہارا خیال غلط ہے۔" رچرڈ نے نظریں جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ "شراب کی ممانعت تو ہمارے مذہب میں بھی ہے۔"

رام گوپال چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ نظر آئی۔ "تو یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارا دھرم سب سے بہتر ہے۔" اس نے کہا۔

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ رچرڈ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے محمود کو دیکھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے پروائی اور درگزر تھا۔

اوتار سنگھ اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ آج اسے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اسے کئی مذاہب کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔ یہ موقع اس کے لیے خوش آئند تھا۔

رام گوپال نے بڑھ کر اپنے لیے ایک اور جام بنایا۔ "تو آپ سب نے میری بات کی سچائی کو تسلیم کر لیا۔" اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

رچرڈ نے محمود کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔ محمود نے کندھے جھٹک دیے۔ "میرا مذہب مجھے دوسروں کے مذہب پر تنقید کرنے سے بھی روکتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں میزبان ہونے کے خیال سے خاموش تھا۔" رچرڈ رام گوپال کی طرف متوجہ ہوا۔ "لیکن اب بولنے پر مجبور ہوں۔ ورنہ تمہارا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔"

"کیا مطلب؟ کس نقصان کی بات کر رہے ہو تم؟"

"تم اپنے دھرم کے بارے میں بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ گے۔" رچرڈ نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "تم جسے بڑے فخر سے اپنا دھرم کہتے ہو، وہ ہمیں عجیب و غریب اور

ناقابل فہم لگتا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ اسے حماقتوں کا مجموعہ کہنا چاہیے۔ اس بیسویں صدی میں جبکہ دنیا ترقی کر رہی ہے، تم لوگ اپنی دیو مالا میں الجھے ہوئے ہو۔ جہالت پر فخر کرتے ہو تم لوگ......"

"پلیز رچرڈ...... اوتار سنگھ کا اور دوسروں کا تو خیال کرو۔" ریٹا نے بھائی کو ٹوکا۔ وہ اوتار سنگھ کو معذرت طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"نو...... اٹس آل رائٹ۔ آئی ڈونٹ مائنڈ۔ بلکہ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔" اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔ "علمی تبادلہ خیال بہت فائدہ مند ہوتا ہے اس سے نالج بڑھتا ہے۔ رچرڈ پلیز...... اپنی بات جاری رکھو۔"

رام گوپال سناٹے کی کیفیت میں تھا۔ اس کا نشہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ نشے میں اس سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ اس نے آقاؤں کو چھیڑ دیا تھا۔

"تھینک یو اوتار سنگھ۔ بے شک یہ علمی تبادلہ خیال ہے۔" رچرڈ نے کہا۔ پھر وہ رام گوپال کی طرف مڑا۔ "رامو...... تم اپنے دیوی دیوتاؤں کی درست تعداد بتا سکتے ہو؟"

رام گوپال منہ کھولے کھڑا تھا۔ اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ وہ تو محمود کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ لیکن رچرڈ سے الجھ بیٹھا تھا۔

"نہیں معلوم...... تمھیں بھی نہیں معلوم۔ میرا خیال ہے، ان کی تعداد ہزاروں میں تو ہوگی۔ بلکہ شاید لاکھ سے اوپر ہو۔ تو تمھارے دھرم میں کوئی اپنے دھرم پر پورا اتر ہی نہیں سکتا۔ تمام دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنا تو دور کی بات ہے، کسی کو سب کے نام بھی معلوم نہیں ہوں گے۔ ہر جانور کو...... ہر چیز کو تو تم نے دیوتا بنا رکھا ہے۔ گائے، بندر، ہاتھی، سورج، چاند، درخت اور نجانے کیا کیا۔ اگر تم اپنے تمام دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگو تو زندگی میں پوجا کے سوا کچھ کر ہی نہ سکو۔ گندگی اور غلاظت کا یہ عالم ہے کہ گائے کے گوبر اور پیشاب کو تم مقدس کہتے ہو۔ میں نے تو سنا ہے کہ پی بھی لیتے ہو۔ شراب کی کیا بات کرتے ہو اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ بیواؤں کو ان کے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیتے ہو۔ علم کے فروغ کی اس صدی میں تم اس جہالت کو دھرم کہتے ہو۔ اس دور میں بھی تم لوگ زندہ انسانوں کو دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہو۔ تم غار کے زمانے کی طرح جی رہے ہو اور تمھیں درست اور غلط کا احساس ہی نہیں۔"

رچرڈ خاموش ہو گیا۔ دیر تک خاموشی رہی۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ اوتار سنگھ سوچ رہا تھا۔ جو کچھ رچرڈ نے کہا تھا، وہی سب کچھ وہ سوچتا رہا تھا۔ اب رچرڈ نے کہہ دیا تھا اور کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

اور یہاں اس کے سامنے دو مذاہب آئے تھے...... دو مختلف طرز عمل۔ رچرڈ کرسچن تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس کا مذہب شراب کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ شراب پیتا ہے۔

دوسری طرف محمود تھا...... مسلمان۔ اس کا مذہب بھی شراب کو منع کرتا ہے اور وہ اس کی پابندی بھی کرتا ہے۔ اور اس نے کہا کہ اس کا مذہب اسے دوسروں کے مذہب پر تنقید سے روکتا ہے۔ یہ ہوئی ناروا داری۔ اور اس کے نتیجے میں انسان تحمل سیکھتا ہے۔

اس سے اوتار سنگھ اپنے دھرم سے پوری طرح بیزار ہو گیا۔ لیکن اب اسے دوسرے مذاہب کو سمجھنا تھا۔

''یہ کیا باتیں لے بیٹھے تم لوگ۔'' اچانک ریٹا نے خاموشی کو توڑا۔ ''تمھیں یہ احساس بھی نہیں کہ یہ میری برتھ ڈے پارٹی ہے۔''

''سوری ریٹا۔'' رام گوپال نے جلدی سے کہا۔

''کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔'' رچرڈ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ سچ ہے کہ کسی پر اٹیک کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور مشتعل ہونے کے بعد تحمل برقرار رکھنا بہت مشکل۔ بہر حال جو ہوا اسے بھول جائیں۔ آفٹر آل، ہم سب دوست ہیں۔ چلیں...... اب پارٹی شروع کرتے ہیں۔'' رچرڈ کونے میں رکھے گراموفون کی طرف گیا اور ایک ریکارڈ منتخب کر کے لگا دیا۔

کمرے میں مدھر موسیقی کی آواز بھر گئی۔ رچرڈ ریٹا کی طرف بڑھا اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''کم آن ڈیر، لیٹ اس ڈانس۔''

وہ دونوں ناچنے لگے۔ باقی سب لوگ انھیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان میں لڑکیاں نہیں تھیں۔ وہ سب چوری چوری چپکے چپکے اوتار سنگھ کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اس کی قربت کے خواب تھے۔

ریکارڈ ختم ہوا تو رچرڈ اور ریٹا الگ ہو گئے۔ رچرڈ ریکارڈ تبدیل کرنے کے لیے گراموفون کی طرف بڑھ گیا۔ ریٹا اوتار سنگھ کی طرف چلی آئی۔ ''آؤ میرے ساتھ رقص کرو۔'' اس نے کہا۔

اوتار سنگھ گڑ بڑا گیا۔ ''لیکن مجھے تو رقص کرنا نہیں آتا۔''

''او کم آن۔ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ میں سکھا دوں گی۔''

اس دوران دوسرا ریکارڈ بجنے لگا تھا۔ ریٹا اوتار سنگھ کا ہاتھ تھام کر کھلی جگہ کی طرف چل دی۔ دوسری طرف رچرڈ پشپا سے رقص کی درخواست کر رہا تھا۔ ''میں اور ریٹا آج تم سب کو ناچنا سکھا دیں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب ایک کی جگہ دو جوڑے میدان میں تھے۔

ریٹا نے اوتار سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کمر پر رکھا۔ ''دوسرا ہاتھ بھی لاؤ اور مجھے اس طرح تھام لو۔'' اس نے کہا۔ اوتار سنگھ نے جھجکتے جھجکتے اس کی ہدایت کی تعمیل کی۔ ریٹا نے اپنے دونوں ہاتھ اس

کے کندھوں پر رکھ دیے۔ ''اب موو کرو...... ایسے۔'' اس نے اسٹیپ لے کر دکھائے۔

اوتار سنگھ کو چند لمحوں میں اندازہ ہو گیا کہ ڈانس کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ رقص کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بس مروتاً ریٹا کا ساتھ دے رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی خوشی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ لمحے بڑے بھرپور تھے۔ اس درجہ نسوانی قربت کا وہ تجربہ اس کے لیے نیا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ بے حد مختلف اور متضاد کیفیات سے گزر گیا۔ بنیادی طور پر بہر حال وہ 17 سال کا جوان لڑکا تھا۔ نسوانی لمس کا وہ پہلا تجربہ اپنی ابتدا میں اس کے لیے بے حد سنسنی خیز تھا۔ اس کا پورا وجود مرتعش ہو گیا تھا۔ ریٹا بے حد حسین لڑکی تھی...... قد میں اس سے تھوڑی سی کم۔ ان کے چہروں کے درمیان بہت تھوڑا فاصلہ تھا اور ریٹا اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

قربت کے ابتدائی لمحوں میں وہ مسحور ہو گیا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ لیکن پھر اچانک اس کی سماعت میں وہ نسوانی آواز گونجی، جس کی وجہ سے اس نے عربی پڑھنی شروع کی تھی۔ وہ آواز، جسے سن کر اسے آواز والی سے محبت ہو گئی تھی۔ اس پر اسے محبت کا خیال آیا۔ محبت جس کی اسے کب سے جستجو تھی۔ پھر اسے محبت کے بارے میں اپنے اسکول کے اردو کے استاد کی گفتگو یاد آئی......

وہ ابتدائی سحر ایک سے زیادہ مرحلوں میں ٹوٹا تھا۔ سب سے پہلے تو اس لڑکی کی آواز نے اسے احساس دلایا کہ وہ اس کی پاکیزہ محبت ہے۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ بہت عرصے سے اس نے وہ آواز بھی نہیں سنی اور آواز والی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ اس کے باوجود وہ محبت ابھی تک ویسی ہی تازہ اور توانا ہے بلکہ سماعت میں وہ آواز ابھری تو اس کا دل ویسے ہی دھڑکا، جیسے اس آواز کو پہلی بار سن کر دھڑکا تھا۔ اور قربت کا وہ سحر ٹوٹ گیا، جس نے چند لمحوں میں اسے اسیر کر لیا تھا۔ اور اچانک اسے ریٹا پارسن بری لگنے لگی۔ اس کے لباس سے اسے کراہت آنے لگی۔

پھر اسے خوشی ہوئی کہ اس کی پہلی محبت سچی ثابت ہوئی ہے۔ آزمائش کے ان لمحوں میں سرخرو ہوئی ہے۔ جسمانی قربت اپنی جگہ ایک بڑی سچائی سہی، لیکن وہ پاکیزہ آواز، جس کے الفاظ تک کو وہ نہیں سمجھ سکتا، مفہوم تک سے ناواقف ہے، آج بھی اتنی اثر انگیز ہے کہ اس سچائی کی بدصورتی کا احساس دلا سکتی ہے، اسے رد اور بے معنی کر سکتی ہے۔ اس کی محبت اردو کے استاد کی بیان کردہ تعریف پر پوری اتری تھی۔ وہ محبت ہی تھی، ہوس نہیں۔ بلکہ اس نے تو ہوس کے امکان کو بھی باطل کر دیا تھا۔

اس کے ہاتھ وہیں رہے، جہاں تھے۔ لیکن اس کی نگاہوں کا تاثر بدل گیا۔ ریٹا نے بھی وہ تبدیلی دیکھ لی۔ لیکن وہ جس کیفیت میں تھی، اس میں اس تبدیلی کی معنویت کو وہ نہیں سمجھ سکی۔ اسے تو آج پہلی بار اظہار محبت کا موقع ملا تھا۔ وہ اسے گنوا نہیں سکتی تھی۔ ''کیوں اوتار سنگھ، تمھیں یہ

اچانک کیا ہو گیا؟'' اس نے سرگوشی میں اوتار سنگھ سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ مجھے کیا ہوگا۔''

''نہیں۔ تم اچانک دور سے ہو گئے۔''

''وہ...... یہ...... دراصل تمہارا لباس اچھا نہیں لگا مجھے۔''

''اوہ...... مجھے تمہاری یہ بات اچھی لگی۔ آئندہ میں......'' ریٹا کچھ اور بھی کہتی۔ مگر اسی لمحے ریکارڈ ختم ہو گیا۔ اچانک خاموشی کی وجہ سے وہ کہتے کہتے رک گئی۔

اوتار سنگھ نے اپنے ہاتھ اس کی کمر سے ہٹا لیے۔ لیکن ریٹا نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''اتنی جلدی کیا ہے اوتار سنگھ۔ آج میرا برتھ ڈے ہے۔ ابھی تم میرے ساتھ رہو...... اور کچھ دیر۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

اسی لمحے رام گوپال ان کی طرف چلا آیا۔ ''مے آئی ہیو دی آنر......''

ریٹا نے اوتار سنگھ کے ہاتھ اور مضبوطی سے پکڑ لیے۔ ''یو ول ہیو ٹو ویٹ فور سم ٹائم۔'' اس نے رام گوپال سے کہا۔ ''پلیز...... ڈونٹ مائنڈ۔''

رام گوپال کا چہرہ کھسیاہٹ سے سیاہ ہو گیا۔ چند لمحے وہ وہیں ساکت کھڑا رہا۔ پھر پلٹ گیا۔

اسی وقت رچرڈ نے دوسرا ریکارڈ لگا دیا۔ وہ بہت رومان انگیز سلو ٹیون تھی۔ رچرڈ کے ساتھ اب امرتا تھی۔ لیکن اس کی نظروں کا مرکز اوتار سنگھ اور ریٹا تھے۔ دوسری طرف رام گوپال کے پاس بیٹھی ہوئی پشپا بھی انہی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''ریٹا ٹھاکر جی کو چھوڑ ہی نہیں رہی ہے۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ رام گوپال بولا۔ ''تم یہ بتاؤ، تم کس میں انٹرسٹڈ ہو؟''

''میں صرف خود میں انٹرسٹڈ ہوں۔'' پشپا نے نخوت سے کہا۔

''بہتری بھی اسی میں ہے۔ سراب کے پیچھے بھاگنے والوں کو پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔''

''تمھیں یہ بات ریٹا سے کہنی چاہیے۔ اوتار سنگھ کے تاثرات دیکھ رہے ہو۔ وہ بے چارہ بس مروت کر رہا ہے۔''

''اوتار سنگھ کو میں نے کبھی کسی لڑکی میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔'' رام گوپال نے سرد لہجے میں کہا۔

''دیکھتے رہو۔ جونک پتھر میں بھی لگتی ہے۔''

''وہ مجھے پتھر نہیں لگتا اور تم بھی جونک نہیں لگتیں۔'' رام گوپال نے سادگی سے کہا۔

''پلیز...... تم خاموش ہی رہو۔'' پشپا نے بھنا کر کہا۔ ''آج پہلے ہی تم بہت شرمندہ کرا

چکے ہو۔''

اُدھر ریٹا نے بھی اوتار سنگھ سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ''مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے اوتار سنگھ۔'' اس نے مخمور آواز میں کہا۔ ''مجھے کبھی کسی کے ساتھ رقص کرنا اتنا اچھا نہیں لگا۔ جانتے ہو، میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں۔''

''میں بھی تمھیں پسند کرتا ہوں۔ یو آر اے گڈ فرینڈ۔''

''مگر میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ وہ محبت جو ایک عورت ایک مرد سے کرتی ہے۔ وہ محبت میں نے پہلی بار تم سے کی اور اب کسی اور سے کبھی نہیں کر سکوں گی۔ میں تمھارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں اوتار سنگھ۔ میں خود کو بدل بھی سکتی ہوں۔''

بات اس قدر اچانک اور اتنی صاف گوئی اور دو ٹوک انداز میں کی گئی تھی کہ اوتار سنگھ ششدر رہ گیا۔ چند لمحے تو وہ کچھ سوچنے...... کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ ''سوری ریٹا وہ محبت تو مجھے بھی پہلے ہی ہو چکی ہے کسی سے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب میں کبھی کسی سے اس طرح محبت نہیں کر سکوں گا۔'' اس نے کہا۔

ریٹا کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ ''مائی لک۔'' اس نے آہ بھر کے کہا۔ پھر بولی۔

''کون ہے وہ خوش نصیب، بہت...... بہت خوبصورت ہو گی۔''

''پتا نہیں۔ میں نے کبھی اسے دیکھا نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' ریٹا کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں۔ ''دیکھا نہیں تو محبت کیسے ہو گئی؟''

''میں نے بس اس کی آواز سنی ہے۔''

ریٹا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''تب تو اس محبت کا کوئی اعتبار نہیں۔ کبھی تم اسے دیکھو اور وہ تمھیں اچھی نہیں لگے تو تمہاری محبت ختم ہو جائے گی۔''

''میں بھی یہی سوچتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

اسے دیکھے بغیر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو۔''

''میں حسن پرست ہوں۔ خوبصورتی ہر روپ میں مجھے اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے مجھے شبہ ہوتا تھا کہ اگر وہ خوبصورت نہ ہوئی تو میری محبت ختم ہو جائے گی۔ لیکن ریٹا، میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تم بہت خوبصورت ہو۔ اس کے باوجود مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی۔ تو میں نے سمجھ لیا کہ محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی۔ وہ تو بس ہو جاتی ہے...... اور ہو گئی۔ اب تو مجھے اس کی آواز سنے ہوئے بھی عرصہ ہو گیا۔ لیکن وہ آواز اب بھی میری سماعت میں گونجتی ہے اور اسے سن کر میری اب بھی وہی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو شاید آج میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے دیتا۔''

''تم بہت عجیب، بہت انوکھے آدمی ہو اوتار سنگھ۔''

''اور ریٹا...... اصل میں تو محبت میں کسی اور سے کرنا چاہتا تھا۔'' اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''بہت برسوں سے! میں اس دنیا کے نظام پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ کوئی کامل قوت ہے، جس نے یہ سب کچھ بنایا اور مکمل سسٹم کے ساتھ یہ نظام ترتیب دیا۔ وہ قوت والی ہستی واحد ہے...... مطلق العنان اور خود مختار۔ اس جیسا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ بہت مہربان ہے...... ماں سے زیادہ شفیق...... باپ سے زیادہ عنایت کرنے والی اور ضرور... پوری کرنے والی۔ میں نے بہت غور کیا اور سمجھا کہ میرے پاس جو کچھ بھی اچھا ہے...... میرے ماں باپ سمیت، وہ اس کا دیا ہوا ہے۔ میں والدین کی مہربانیوں کے جواب میں ان کا شکر گزار ہوتا ہوں اور اس کے اظہار کے لیے ان سے محبت کرتا ہوں تو ان سے زیادہ...... سب سے زیادہ شکر گزاری اور محبت تو اس کا حق ہے۔ مگر سمجھے بغیر تو محبت نہیں ہوتی۔ یا مجھے نہیں ہو سکی۔ چنانچہ میں اسے سمجھنے کی جستجو میں لگ گیا۔ اب درمیان میں مجھے یہ محبت ہو گئی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس محبت کو ختم کر دیتا کیونکہ میری اصل منزل تو وہ بڑی محبت ہے۔''

ریٹا سحر زدہ سی ہو کر سن رہی تھی۔ ''مجھے یقین نہیں آتا۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں ہمارے مذہب کے بارے میں سمجھنا چاہیے۔ میں تمہیں بتاؤں گی۔''

اسی وقت ریکارڈ ختم ہو گیا۔ رچرڈ نے کہا۔ ''اب ذرا وقفہ کر لیں۔''

وہ چاروں واپس آ گئے۔

کچھ دیر سستانے کے بعد دوبارہ سلسلہ شروع ہوا تو اس بار میدان میں تین جوڑے تھے۔ اوتار سنگھ اور امرتا، رچرڈ اور پشپا، رام گوپال اور ریٹا۔ نادرہ اور محمود نے رقص میں دلچسپی ہی نہیں لی۔ اس پر رام گوپال زہریلے انداز میں مسکرایا تھا۔ انداز ایسا تھا، جیسے ان پر مذہب کے حوالے سے طنز کرنا چاہتا ہو۔ لیکن پچھلے تجربے کے پیش نظر اسے تبصرے کی ہمت نہیں ہوئی۔

رقص کا سلسلہ کافی دیر چلتا رہا۔ اوتار سنگھ نے محض مروتاً ایک ایک راؤنڈ امرتا اور پشپا کے ساتھ رقص کیا اور پھر اپنی جگہ فتح سنگھ کو دے دی۔ اس دوران محمود رچرڈ سے اجازت لے کر اس کی لائبریری میں چلا گیا تھا۔ نادرہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اوتار سنگھ اس کے پاس چلا گیا۔ اسے وہ رات بہت طویل لگ رہی تھی۔ امرتا اور پشپا نے بھی رقص کے دوران اس سے اظہار محبت کیا تھا۔ نجانے کیوں اس نے ریٹا کی طرح ان سے تفصیل سے بات نہیں کی تھی۔ بس یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ پہلے ہی کسی سے محبت کرتا ہے۔

''کیا بات ہے، تم نے رقص نہیں کیا؟'' اوتار سنگھ نے نادرہ سے پوچھا۔

''مجھے دلچسپی نہیں ہے۔'' نادرہ نے جواب دیا۔

''تمہارا مذہب تمہیں اس سے روکتا ہے؟''

''ہاں روکتا ہے۔ لیکن ہم بہت سے ایسے کام کرتے ہیں، جن سے اللہ نے منع فرمایا

ہے۔ اس وقت میرے انکار کا اصل سبب یہ ہے کہ مجھے رقص میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''اللہ تمہیں کن کن باتوں سے روکتا ہے؟''

''اب تمہیں کیا بتاؤں۔ بہر حال سب سے بڑا گناہ شرک ہے...... اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔''

اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ، جو تم اللہ کے منع کرنے کے باوجود کرتی ہو۔'' اسے احساس ہوا کہ وہ بار بار اللہ کہہ رہا ہے۔ اور اللہ کہنا اسے اچھا بھی لگ رہا ہے۔

مگر اس سوال پر نادرہ کھسیا گئی۔ ''بہت ساری باتیں ہیں۔ ہم کوئی بہت اچھے مسلمان تو نہیں ہیں۔ ماحول ہم پر اثر انداز ہوتا ہے، ہمارے ایمان کی کمزوری کی وجہ سے۔ اب اسی وقت دیکھ لو۔ میں اس محفل میں شریک ہوں۔ حالانکہ اللہ نے مرد اور عورت کے اختلاط کو منع فرمایا ہے۔''

اس جواب سے اوتار سنگھ کو لمبی ڈور کا وہ سرا مل گیا، جسے تھام کر اس کے اندر کا متجسس انسان دور تک جا سکتا تھا۔ ''اس میں کیا برائی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''عورت اور مرد جتنا قریب ہوں گے، بے حیائی اور گناہ کا امکان یقین کی حد تک بڑھ جائے گا۔''

''مگر دونوں کے درمیان کشش تو قدرتی ہے، فطری ہے۔'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

''اس کے لیے شادی ہے۔ شادی گناہ اور بے حیائی کا راستہ بند کر دیتی ہے۔''

''اور محبت کے بارے میں تمہارا مذہب کیا کہتا ہے؟''

''محبت پاکیزگی کے ساتھ ہو تو برائی نہیں۔ مگر حل شادی ہی ہے۔''

اوتار سنگھ کا دماغ روشن ہو گیا۔ اسی وقت اسے ایک بات یاد آ گئی۔ اس کا مشاہدہ شروع ہی سے غیر معمولی تھا۔ محسوس تو اس نے پہلے ہی کیا تھا۔ لیکن آج اسے پختہ یقین ہو گیا تھا۔ ''ایک بات بتاؤں تمہیں۔'' اس نے کہا ''رچرڈ تم میں غیر معمولی دلچسپی رکھتا ہے۔''

نادرہ کچھ محجوب ہو گئی۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ ''میں جانتی ہوں۔ وہ مجھے بتا چکا ہے۔'' وہ بولی۔

''اب یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں تم سے کچھ پوچھ نہیں سکتا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''مگر میں تمہیں بتا سکتی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں۔'' نادرہ بولی۔ ''اور اگر ایسا کچھ ہوتا تو بھی میں اس کی حوصلہ افزائی نہ کرتی کیونکہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''کیوں؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔ ''مذہب کے فرق کی وجہ سے؟''

''ہاں۔ مشرکوں سے شادی کرنا ناجائز ہے۔ یہ لوگ اہل کتاب ہیں۔ لیکن شرک کرتے ہیں۔''

مشرک کے بارے میں نادرہ نے شروع میں بھی کہا تھا اور وضاحت بھی کی تھی۔ لیکن یہ اہل کتاب کی اصطلاح اوتار سنگھ کے لیے نئی تھی۔ ''اہل کتاب کا مطلب؟''

''وہ لوگ جن کے پاس اللہ کا کلام موجود ہے۔ ایسی تین ہی قومیں موجود ہیں۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان۔''

''تینوں کے پاس اللہ کا کلام ہے تو وہ الگ الگ کیوں ہیں؟''

''یہ بہت لمبی بحث ہے۔ چھوڑو اسے۔ بہرحال میں کسی مشرک سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''لیکن محبت تو ہو سکتی ہے تمہیں۔''

نادرہ یوں چونکی، جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ''ہاں...... ہو سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں میں اس محبت سے لڑوں گی۔ اسے دل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی اور دعا کروں گی کہ وہ مسلمان ہو جائے۔''

''کوئی مسلمان کیسے ہو سکتا ہے؟''

''دو کلمے ہیں ہمارے ہاں۔ ایک ناپاکی کا دور کرنے والا کلمہ ہے...... **لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ** اور دوسرا گواہی دینے والا...... **اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد عبدہ ورسولہ**۔ آدمی دل کی گہرائیوں سے ایمان لائے، زبان سے یہ کلمے پڑھے تو مسلمان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے اللہ کے احکامات پر عمل کرنا ہوتا ہے جو اللہ کی کتاب میں موجود ہیں۔''

اوتار سنگھ چونکا۔ ''یہ تو عربی زبان میں ہیں؟''

''ہاں۔ اللہ کا کلام بھی عربی زبان میں ہی نازل ہوا ہے۔''

اوتار سنگھ کا حافظہ بلا کا تھا۔ دونوں کلمے اسے یاد ہو گئے۔ اب وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی اس کی استعداد اتنی نہیں تھی اور پھر مشق بھی نہیں تھی۔ اس نے اٹک اٹک کر ترجمہ کیا۔ ''اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور دوسرا...... میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا......'' وہ اٹک گیا۔

نادرہ اسے بہت غور سے...... بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''...... کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔'' اس نے جملہ پورا کیا۔ وہ اب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ''تم غیر معمولی آدمی ہو اوتار سنگھ۔ کاش...... کاش تم......'' یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لیں۔

اوتار سنگھ اتنا ناسمجھ نہیں تھا کہ اس کا جملہ مکمل نہ کر پاتا۔ اس رات وہ چوتھا اظہار محبت تھا، جو اس سے کیا گیا۔ لیکن یہ آخری اظہار مشروط تھا۔

اسی وقت رقص کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ وہ سب یکجا ہو گئے۔ ''بس ذرا دیر ستا لیں۔

پھر کھانا کھائیں گے۔'' رچرڈ نے اعلان کیا۔

❀......❀......❀

وہ پارٹی اوتار سنگھ کو سوچنے کے لیے بہت کچھ دے گئی۔ یہی نہیں، اس نے اس آواز والی کی محبت کو پھر سے توانا کر دیا۔ یہ بات نہیں کہ وہ محبت کبھی ہلکی پڑی ہے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ مصروفیات نے اسے دبا دیا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ دوسرے اب وہ اس آواز سے محروم بھی ہو چکا تھا۔

نادرہ کی بات سنتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا اور اب وہ اس پر سوچ رہا تھا۔

محبت ایک آفاقی جذبہ تھا۔ اس کے بے شمار روپ تھے۔ ایک انسان کی دوسرے انسان سے محبت، دوستوں کی محبت، بھائی بہن کی محبت، ماں باپ کی محبت، اولاد کی محبت اور سب سے بڑھ کر مخلوق کی اپنے خالق سے محبت۔ یہ سب محبتیں ہیں، جو انسان کرتا ہے...... کرتا رہے گا۔ غور کرو تو ان میں سے کوئی بھی محبت بے غرض نہیں ہے۔ انسان کتنا ہی بے غرض ہو، مگر کسی دوسرے انسان سے محبت کرتے ہوئے مکمل طور پر بے غرض نہیں ہو سکتا۔ کوئی غرض نہ ہو تو تنہائی دور کرنے کی غرض تو ہے۔ اکیلا تو کوئی نہیں رہ سکتا۔ انسان معاشرتی جانور ہے۔ تو تعلق رکھنے کی غرض تو ایک بڑی سچائی ہے۔ دوستی کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی ہم خیال، جو اچھا بھی لگتا ہو۔ اس سے مل کر بات کر کے دل خوش ہوتا ہے۔ غرض تو ہوئی نا۔ اور اختلاف ہو جائے...... سنگین نوعیت کا اختلاف تو آدمی اس دوست کو چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی اور دوست تلاش کر لیتا ہے۔ بھائی بہن کی محبت کا اسے تجربہ نہیں تھا۔ یہ نعمت اسے ملی ہی نہیں تھی۔ لیکن وصال دین کے حوالے سے وہ اسے سمجھ سکتا تھا۔ بھائی دوست سے بڑی ضرورت ہوتا ہے۔ ایک بہت اپنا، جو ہر کڑے وقت میں ساتھ رہے...... ہمارا دکھ بانٹے...... ہمیں تسلی دے۔ اب اولاد کی محبت کو لیں۔ تو ماں باپ سے تو اولاد کی غرض ہوتی ہی ہے۔ بلکہ اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ آدمی کو اتنا کچھ ملتا ہے ماں باپ سے۔ وہ ان سے محبت نہ کرے تو کیا کرے اور خدا کی محبت! وہ تو ہے ہی محتاج کی محبت جو وہ اس سے کرتا ہے، جو اس کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کر خیال رکھنے والا، ضرورتیں پوری کرنے والا ہے۔ بس ماں باپ کی اولاد سے محبت سب سے مختلف ہے۔ مگر نہایت بے غرض ہونے کے باوجود غرض سے بالکل پاک وہ بھی نہیں ہے۔ باپ کو اولاد سے ایک معصوم سی غرض ہوتی ہے کہ وہ اس کی نسل کو آگے بڑھائے، مرنے کے بعد بھی اس کے نام کو زندہ رکھے۔ ہاں ماں کی محبت شاید بالکل بے غرض ہوتی ہے۔ اسی کا بس چلے تو اولاد کا ہر دکھ خود لے لے اور اسے اس دکھ سے محفوظ کر دے۔

ماں باپ کی محبت پر اس نے سوچا تو اسے سب کچھ بنانے والے کی...... خالق کی اپنی مخلوق کے لیے محبت کا خیال آیا۔ وہی سب سے خالص، سب سے بے غرض اور پاک محبت ہے۔ کیونکہ اسے تو کسی سے کچھ نہیں چاہیے۔ وہ جو سب کچھ بنانے والا ہے، ہر چیز کا مالک ہے۔ کوئی

اسے کچھ دے نہیں سکتا اور اسے ضرورت بھی نہیں۔ اس پر سوچتے ہوئے اوتار سنگھ کو ماں باپ کی محبت میں اس عظیم ہستی کی محبت کی جھلک نظر آئی۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ غرض کا مارا، مطلبی انسان خود تو ایسی محبت کر ہی نہیں سکتا۔ تو کیا یہ محبت اسے اس طرح سونپی گئی ہوگی، جیسے اس خالق نے سائنسدانوں اور موجدوں کو خیال سونپا، جس کے نتیجے میں ایجادات ہوئیں۔ ضرور یہی بات ہے کیونکہ یہ تو طے ہے کہ وہ جو بھی ہے، اس کی ذات محبت کا سرچشمہ ہے۔ دوسری نعمتوں کی طرح وہ انسانوں کو ایک دوسرے کے لیے محبتیں بھی عطا کرتا ہے۔ اس نے ماں باپ کو اولاد کے لیے اپنے جیسی محبت عطا کی کیونکہ اس کا بنایا ہوا سسٹم ہے کہ بچہ بے بس لاچار اور کمزور ہوتا ہے۔ اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ عاقل و بالغ ہونے تک برے بھلے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ نہیں سمجھ سکتا کہ کون سی چیز سودمند ہے اور کون سی ضرر رساں۔ کہاں خطرہ ہے، اسے نہیں معلوم ہوتا۔ تو اگر اس نے ماں باپ کو وہ محبت نہ دی ہوتی تو انسانی نسل تو ختم ہو چکی ہوتی۔

اور پھر خدا کی محبت کیسی ہے۔ وہ سب کچھ ایسے دیتا ہے کہ مخلوق کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اسے دے رہا ہے۔ وہ تو سوچتا ہے کہ فصل میں نے محنت کر کے اگائی۔ اماں نے کہا تھا نا کہ بارش نہ ہو تو محنت کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ گھٹا چھائی رہے، دھوپ نہ نکلے تو گندم پک نہیں سکتی۔ مگر اس بات پر غور کون کرتا ہے۔ اور اس مہان ہستی کو اس کی پروا بھی نہیں۔ شکر ادا نہ کرو، تب بھی وہ دیتا ہی رہتا ہے۔ وہ نہیں کہتا کہ میری بات نہیں مانو گے تو تمھیں کھانا نہیں ملے گا۔ وہ تو بس نوازتا ہی رہتا ہے۔

برسوں سے اوتار سنگھ یہ بات سوچتا رہا تھا کہ وہ اس مہان ہستی کو سمجھے گا...... اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانے گا۔ تاکہ دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر وہ اس مہان ہستی سے محبت کر سکے۔ مگر اب تک وہ کچھ بھی نہیں جان سکا تھا اور محبت کا وہ ارادہ تو رکھا رہ گیا۔ اسے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی...... صرف اس کی آواز سن کر!

بہت پہلے وہ اس محبت کا تجزیہ بھی کر چکا تھا۔ اس نے خوب ٹٹول لیا تھا کہ اسے لڑکی سے کوئی غرض نہیں۔ یہ بھی طے تھا کہ وہ بدصورت ہو، تب بھی اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچتا تھا کہ اس محبت کا انت کیا ہے...... یہ کہاں تک جائے گی؟

اب نادرہ کی گفتگو نے اس کے لیے اور دروازے کھول دیے تھے۔ مرد اور عورت کی اس محبت کا منطقی انجام شادی ہوتا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ، ایک دوسرے کے قریب رہیں اور مل کر اپنی نسل آگے بڑھائیں۔ اور اب وہ محبت اور ہوس کے فرق کو سمجھ سکتا تھا۔ اسکول میں اردو کے استاد نے شاعری کے حوالے سے محبت اور ہوس کا جو فرق سمجھایا تھا، وہ اتنی وضاحت سے اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اب وہ سمجھ گیا تھا۔ قربت شادی کے بغیر ہو تو پاپ ہے۔ محبت اور ہوس میں وہی فرق ہے جو پاپ اور پن میں ہے۔

اور اوتار سنگھ نے یہ بھی سمجھ لیا کہ محبت آدمی اوپر والے سے کرے یا اس کی کسی مخلوق

سے، وہ عبادت ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ پاک ہو اور محبت کرنے والا ہر پل یہ یاد رکھے کہ اسے اور اس کے محبوب کو اوپر والے نے بنایا...... احسان کیا۔ اور یہی نہیں، ان کے دلوں میں محبت بھی ڈالی، ورنہ وہ یک جا نہیں ہو سکتے تھے۔ تو یہ اوپر والے کا احسان ہے۔ اس خیال کے ساتھ محبت عبادت ہوگی۔ اور اس کے بغیر ہوس۔

پہلی بار وہ مطمئن ہوا کہ اس نے محبت اور ہوس میں فرق کرنا سیکھ لیا ہے...... اور اب اس سلسلے میں کبھی دھوکہ نہیں کھائے گا۔

اس نے پہلے کبھی اس آواز والی کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب سوچ رہا تھا۔ شادی کے بارے میں وہ کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اب اس کا جی چاہا کہ اس کی شادی اسی لڑکی سے ہو۔ مگر نادرہ کی طرح وہ لڑکی بھی مسلمان تھی۔ اور یقیناً وہ نادرہ سے اچھی مسلمان ہوگی اور مسلمان لڑکی کسی مشرک سے شادی نہیں کر سکتی۔ جبکہ ہندو مشرک ہوتے ہیں!

کیا میں مشرک ہوں؟ یہ سوال اس کے ذہن میں ابھرا۔

مشرک کون ہوتا ہے، یہ نادرہ نے اسے بتایا تھا۔ اس نے خود کو اس تعریف پر پرکھا۔ اس اعتبار سے وہ مشرک نہیں تھا کیونکہ اس نے از خود یہ نتیجہ نکالا تھا کہ کائنات کا یہ مربوط نظام قوت کے ارتکاز کے بل پر قائم ہے۔ اقتدار ایک سے زیادہ قوتوں کے پاس ہوتا تو اس میں خلل پڑتا۔ اس نے ہمیشہ اس مہان ہستی کو ایک مانا تھا۔ وہ بلاشرکت غیرے یہ نظام چلا رہا تھا۔ تو وہ مشرک تو نہیں۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے تو ماں کی موت والے دن مورتی کو چیلنج کیا تھا۔ اسے بھگوان ماننے سے انکار کیا تھا۔ بلکہ وہ تو بتوں کی پوجا کے سلسلے میں بہت پہلے سے ماتا جی سے بحث کیا کرتا تھا۔

اب وہ پوری طرح سمجھ گیا کہ بتوں کی پوجا کرنا شرک ہے۔ تو وہ مشرک تو نہیں۔

لیکن یہ سچ ہے کہ وہ ہندو تھا...... اور ہندو مشرک ہوتے ہیں۔ پہلی بار اس نے سوچا کہ وہ بتوں کو نہیں مانتا، ان کی پوجا نہیں کرتا اور وہ ایک مہان ہستی پر یقین رکھتا ہے۔ تب تو اسے ہندو دھرم کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مگر کیا دھرم یونہی چھوڑا جا سکتا ہے۔

اس لڑکی کو تو اب تک شاید اس کے وجود کا علم بھی نہیں ہوگا۔ اس کی محبت کا تو خیر گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر کسی طرح اسے معلوم ہو بھی جائے تو وہ اس سے محبت تو نہیں کر سکتی۔ وہ بھی نادرہ کی طرح یہی سوچے گی کہ میں کسی مشرک سے محبت کیسے کر سکتی ہوں۔ اور اگر اوپر والا اپنی عنایت سے اس کے دل میں اس کی محبت ڈال دے، تب بھی وہ یہ دعا کرے گی کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔

تو میں مسلمان ہو سکتا ہوں! اس نے سوچا۔ بس وہ کلمہ ہی تو پڑھنا ہوگا۔ اس نے دل میں، دونوں کلمے دہرائے۔ وہ اسے پوری طرح یاد تھے پھر اس نے ان کے معنی دہرائے۔ اسے معنی

بھی یاد تھے۔

تو کیا میں مسلمان ہو گیا؟ یہ دونوں کلمے پڑھ لیے میں نے۔ کیا آدمی اتنی آسانی سے ایک دھرم چھوڑ کر دوسرا دھرم اپنا سکتا ہے۔ کیا مسلمان ہونا اتنا آسان ہے؟

مگر فوراً ہی اس کے اندر ایک بے چینی ابھری۔ میرا مقصد مسلمان ہونا تو نہیں۔ میں تو اس مہان مہربان ہستی کو کھوج رہا ہوں۔ میرا مقصد تو اس سے محبت کرنا ہے۔ دھرم میرا مسئلہ نہیں۔ میں اس لڑکی کی خاطر مسلمان ہو جاؤں تو یہ تو بے ایمانی ہوگی۔

وہ سوچتا اور اُلجھتا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ مذاہب کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔ لفظ اللہ کے بارے میں اسے تجسس تھا۔ اسے زبان سے ادا کرنا اسے اچھا...... بہت اچھا لگتا تھا۔ بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ اللہ سوچتا بھی تو اس کے اندر بڑے خوبصورت جذبے جاگتے تھے۔ یہ اللہ کیا ہے...... کون ہے...... کیسا ہے؟

وہ اٹھا اور کوٹھے پر چلا گیا۔ اس کے اندر ایک عجیب سا اضطراب مچل رہا تھا۔ کوٹھے پر آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے کمر کے بل جھکتے ہوئے، آسمان کا تصور کر کے بڑی عاجزی سے پکارا۔ ''تو جو کوئی بھی ہے اے سب کچھ بنانے والے، میں تیرا اعتراف کرتا ہوں اور تیرے سامنے خود کو جھکاتا ہوں۔ میں تیری جستجو کر رہا ہوں۔ تو مجھے مل جا۔ مجھے اپنا راستہ دکھا دے۔ مجھے اپنا بنا لے کہ میں تجھ سے محبت کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ اس کی پوجا تھی...... اور ماتا جی کے دیہانت کے بعد سے اب تک اس کا معمول رہا تھا۔ اس روز یہ پوجا کر کے اس نے سر اٹھایا تو وہ مطمئن تھا۔ بے حد مطمئن! بھلے وہ ہندو ہو، لیکن وہ مشرک ہرگز نہیں ہے۔

⊛......⊛......⊛

پڑھائی کا شیڈول بہت سخت تھا۔ اس پر مستزاد عربی کی پڑھائی، جسے اوتار سنگھ کورس سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ پھر مولوی صاحب نے اسے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی پہلی کہانی لا کر دی جو عربی زبان میں تھی۔ اوتار سنگھ بہت خوش ہوا۔ مگر اسے پڑھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ ابھی وہ عربی کو پوری طرح سمجھنے کی اہلیت سے بہت دور ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی قواعد بڑی مضبوط تھی۔ لیکن اس کا ذخیرۂ الفاظ فی الحال بہت محدود تھا۔ لیکن اسے یہ یقین بھی ہو گیا کہ ذخیرۂ الفاظ ایسی کہانیاں پڑھنے سے بنے گا۔ اور جوں جوں ذخیرۂ الفاظ بڑھے گا، اس کی عربی کی استعداد بھی بڑھتی رہے گی۔

مذاہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی اس کی خواہش شدید ہو گئی تھی۔ لیکن کسی سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ خالی پیریڈز میں سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے تھے۔ زیادہ ہوتا تو پڑھائی پر بات ہو جاتی۔ بہرحال اوتار سنگھ موقع نکالنے کی تلاش میں تھا۔

پہلا موقع اسے رچرڈ سے بات کرنے کا ملا۔ اس روز خالی پیریڈ میں وہ سب لائبریری میں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ امتحان قریب آ رہے تھے اور سب بڑی سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف تھے۔

اچانک رچرڈ نے کہا۔ ''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ کسی کا کافی پینے کا موڈ ہے؟''

سب نے انکار کر دیا۔ ''میں چلتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''تو آؤ...... چلیں۔''

وہ دونوں لائبریری سے نکلے اور کینٹین کی طرف چل دیے۔

کینٹین میں رچرڈ نے کافی کا آرڈر دیا۔ اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔ پھر اس نے بلاواسطہ بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ''رچرڈ...... مجھے اپنے مذہب کے بارے میں بتاؤ۔''

رچرڈ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''یہ خیال کیسے آ گیا تمھیں؟''

''اس روز پارٹی میں تم نے ہندو دھرم کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ میں بہت پہلے سے سوچتا رہا ہوں۔''

''ہر معقول آدمی کو سوچنا چاہیے۔'' رچرڈ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں غور کرتا ہوں تو تم لوگوں کا دھرم مجھے مذہب کہیں سے نہیں لگتا۔ ہاں اسے ثقافت کہا جا سکتا ہے۔ بھلا بتاؤ تو، پتھر کے بتوں کی پوجا کرنا، انھیں بھینٹ دینا اس عہد کے شایانِ شان تو نہیں۔ تم لوگ اتنے وہمی اور ضعیف الاعتقاد ہو کہ درختوں تک سے اولاد مانگتے ہو۔''

اوتار سنگھ کو یاد آیا کہ اس کے ماتا اور پتا نے اس کے لیے برگد کے درخت پر منت مانی تھی اور وہ پیڑ ہی سوکھ گیا تھا۔ ''میں اس سلسلے میں بہت شروع سے سوچتا رہا ہوں۔ میں نے کبھی دل سے پوجا نہیں کی اور چار سال سے تو میں نے مورتیوں کو ماننا ہی چھوڑ دیا۔''

''تم مجھے شروع ہی سے غیر معمولی لگتے تھے۔'' رچرڈ کے لہجے میں ستائش تھی۔

''مگر رچرڈ، یہ کائنات کا نظام خود بخود تو نہیں چل رہا ہے۔ کوئی تو ہے جو اسے چلا رہا ہے۔''

''بے شک۔ اور وہ خدا ہے، جس نے چھ دن میں یہ نظام قائم کیا۔''

''تو تم اسے خدا کہتے ہو۔ کیوں؟''

''آسمانی کتاب میں یہی نام ہے اس کا...... گاڈ...... خدا۔ اس نے اپنے بیٹے مسیح مصلوب کو دنیا میں اپنی کتاب دے کر بھیجا کہ انسانوں کو محبت کی تعلیم دے اور دکھوں سے نجات کا راستہ دکھائے۔''

اوتار سنگھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''خدا کا بیٹا بھی ہے!...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اسے مقدس کنواری ماں نے جنم دیا تھا ..... پاک دامن مریم نے ۔ چرچ کے باہر بڑی صلیب پر تم نے ان کا مجسمہ دیکھا ہوگا اور ورجن میری کی شبیہہ بھی دیکھی ہوگی..... کم سن مسیح کو گود میں لیے ہوئے ۔ چہرے کے گرد نور کا ہار۔''

اوتار سنگھ نے دونوں چیزیں دیکھی تھیں۔ ''میں نے دیکھا ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہ بتاؤ کہ یہ کتنی پرانی بات ہے؟''

''ہمارا سن عیسوی مسیح کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ یہ 19 صدی پہلے کی بات ہے۔''

''تو تمھیں کیسے معلوم کہ مقدس ماں اور مسیح ایسے تھے؟'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس زمانے میں کوئی مصور ہوگا، جس نے انھیں دیکھ کر ان کی تصویر بنالی ہوگی۔''

اوتار سنگھ کی تسلی نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ خدا اس کے تصور کے خدا سے بہت مختلف تھا۔ اس پر یہ شبیہہ اور مورتی والی بات۔ ''تمھارا مذہب ہم سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''بت تو تم بھی بناتے ہو۔''

''مگر ہم بت پرست نہیں ہیں۔'' رچرڈ نے سخت برا مان کر کہا۔

''پہلے بت بنتا ہے۔ پھر بت پرستی ہی ہوتی ہے۔''

''میں ایسی باتیں نہیں سن سکتا۔'' رچرڈ بدمزہ ہو گیا۔

''کیوں؟ میں نے جب پہلی بار بھگوان کی مورت دیکھی تھی تو اپنی ماتا جی سے یہی سوال کیا تھا۔ اور ان کے جواب سے مجھے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں نے کبھی بھگوان کو دل سے نہیں مانا۔ تم کیوں برا مانتے ہو۔ میں تو ایک معقول بات کر رہا ہوں۔''

''خیر..... چھوڑو اس بات کو۔''

''اور یہ تمھیں کیسے پتا چلا کہ مسیح خدا کے بیٹے تھے؟''

''ہمارے پاس آسمانی کتاب بائبل ہے نا۔''

''اس میں یہ لکھا ہے؟''

رچرڈ گڑبڑا گیا۔ ''ظاہر ہے۔ اس میں لکھا ہوگا۔ تبھی تو ہم یہ بات مانتے ہیں۔''

''تم نے نہیں پڑھی بائبل؟''

''نہیں۔'' رچرڈ کچھ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے کافی کی پیالی خالی کر کے ہٹا دی۔ ''آؤ..... اب چلیں۔ پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔''

اوتار سنگھ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

اب اس کے پاس سوچنے کا کافی سامان تھا۔ کئی دن تک وہ سوچتا رہا۔ اس کا جو خدا کا

تصور تھا، وہ رچرڈ کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا خدا سب سے الگ، سب سے منفرد اور مختلف اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا تھا۔ یہ اولاد والا معاملہ تو اسے بہت برا لگا۔ کیا خدا نے شادی بھی کی ہوگی؟ اور اگر کی ہوگی تو کس سے.....؟ کسی عورت سے؟ اپنی مخلوق سے؟ یا اپنی ہی جیسی کسی ہستی سے؟

دونوں ہی امکان اس کے تصور سے متصادم تھے۔ اس کے نزدیک خدا جیسا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہوتا تو اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی۔ اور اگر مسیح خدا کے بیٹے تھے تو یہ تو طے ہے کہ وہ انسان تھے۔ ان کی ماں انسان ہی ہوگی۔ خدا تو انسان نہیں ہو سکتا۔

اسے ہندوؤں پر ترس آنے لگا۔ ہندو مشرک تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی..... بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس لیے انھیں مشرک کہا جاتا ہے اور شرک کا جو مطلب نادرہ نے اسے بتایا تھا، اس کے مطابق تو عیسائی بھی مشرک تھے۔ انھوں نے خدا کی فیملی بنا دی تھی۔ اور مورتیاں تو وہ بھی بناتے تھے۔ مگر نادرہ کا کہنا تھا کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ تو کسی کے پاس آسمانی کتاب ہو تو شرک کرنا اس کے لیے جرم نہیں رہتا۔ یہ تو بے انصافی ہے۔

اور یہ آسمانی کتاب والا معاملہ بھی وہ پوری طرح نہیں سمجھ پایا تھا۔ کیا وہ کتاب خدا کی لکھی ہوئی تھی؟ خدا کی تحریر تھی؟ اور ایسی کتنی کتابیں ہیں دنیا میں؟ ہندوؤں کو کوئی کتاب کیوں نہیں ملی؟ سوچنا ختم ہوا تو اس کے پاس سوال ہی سوال تھے۔ جواب اسے تلاش کرنا تھے۔

❁.....❁.....❁

وصال دین کے امتحان بھی ہو چکے تھے اور نتیجہ بھی نکل آیا تھا۔ وہ پاس ہو گیا تھا۔

''مبارک ہو ویرجی۔ تمھیں تو آزادی مل گئی۔'' اوتار سنگھ نے اس سے کہا۔

''آزادی کیسی؟ میں تو تمھارے ساتھ ہی آزاد ہوں گا۔'' وصال دین نے کہا۔

''نہیں ویرجی۔ اب یہ ممکن نہیں۔'' اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''دیکھو نا..... اب تمھاری دو مہینے کی چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں اور میرے امتحان میں ابھی بیس دن باقی ہیں۔ مجھے تو کوئی ڈیڑھ ماہ بعد آزادی ملے گی۔ اس کے بعد امتحان کا نتیجہ آنے تک چھٹیاں ہوں گی۔ لیکن میری آزادی کے چند دنوں کے بعد ہی تمھارا اسکول کھل جائے گا اور تمھیں واپس آنا پڑے گا۔''

وصال دین کی سمجھ میں یہ پیچیدہ حساب نہیں آیا۔ ''میں نہیں سمجھا بھائی۔ کیا اس بار ہم گاؤں صرف دس بارہ دن کے لیے جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''ارے نہیں۔ گھبراؤ نہیں ویرجی۔ تم ابھی گاؤں چلے جاؤ گے۔ میں ڈیڑھ ماہ بعد گاؤں آؤں گا۔ ہم دس بارہ دن ساتھ رہیں گے پھر تم دہلی واپس آ جاؤ گے اور میں وہیں رکوں گا رزلٹ آنے تک۔''

''تو ہم صرف دس بارہ دن ساتھ رہیں گے۔'' وصال دین نے تاسف سے کہا۔

''ڈیڑھ مہینے تم یہاں اکیلے رہو گے۔ نہیں بھائی، میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمھارے ساتھ ہی گاؤں چلوں گا۔''

اوتار سنگھ کو اس پر پیار آ گیا۔ ''نہیں ویر جی۔ یہ زیادتی ہوگی۔ وہاں اماں اور چاچا تمہارا انتظار کریں گے۔ ان کی خوشیوں کے یہ اتنے سارے دن میں تم سے نہیں چھین سکتا۔ تمھیں جانا ہوگا۔''

وصال دین نے اماں اور ابا کے بارے میں سوچا اور کشمکش میں پڑ گیا۔ وہ اوتار سنگھ کو اکیلا بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اماں اور ابا کی یاد بھی ستانے لگی تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''نہیں بھائی، میں تمھارے ساتھ ہی رہوں گا۔''

اس لمحے وصال دین کی خالص محبت کو اوتار سنگھ نے اپنے دل میں اترتا محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''تم بہت اچھے ہو ویر جی...... اور مجھے بہت پیارے ہو۔ لیکن یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔ تمھیں جانا ہی ہوگا۔''

اوتار سنگھ کا لہجہ فیصلہ کن تھا اور وصال دین نے کبھی اس کی بات نہیں ٹالی تھی۔

''بھائی...... صرف تمھاری خاطر میں نے پڑھائی میں دلچسپی لی۔ ورنہ میرا دل نہیں لگتا تھا پڑھنے میں۔'' اس نے اداس لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب میں پچھتا رہا ہوں۔ کاش میں نے پڑھائی میں دلچسپی لی ہوتی تو آج یوں تمھیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتا۔ یہ سزا ہے مجھے بے دلی کی۔''

''میں سمجھا نہیں ویر جی۔''

''میں دل لگا کر پڑھتا تو کالج میں تمھارے ساتھ ہوتا نا۔''

یہ بھی اس کی محبت تھی۔ اوتار سنگھ کا دل خوش ہو گیا۔ ''اب پچھتائے کیا ہووت ویر جی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن بھائی، میں اکیلا تو گاؤں جا بھی نہیں سکتا۔'' وصال دین نے کچھ سوچ کر کہا۔

''مجھے تو راستے بھی نہیں معلوم۔''

''تو تم اکیلے تھوڑا ہی جاؤ گے۔ رگھو ساتھ جائے گا اور تمھیں گاؤں چھوڑ کر واپس آ جائے گا۔''

''مگر پھر یہاں رگھو کا کام کون کرے گا؟'' وصال دین پریشان ہو گیا۔

''تم فکر بہت کرتے ہو ویر جی۔ ارے ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

وصال دین نے ذہن تو بنا لیا۔ لیکن جاتے وقت وہ اوتار سنگھ سے لپٹ کر اتنا رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ ''میں تمھارے بغیر کیسے رہوں گا بھائی۔ میرا وہاں دل نہیں لگے گا۔'' وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

اوتار سنگھ کو بھی رونا آ رہا تھا۔ لیکن اس نے آنسو پی لیے۔ جانتا تھا کہ وہ رو دیا تو وصال دین کو گاؤں نہیں بھیج سکے گا۔ وہ جائے گا ہی نہیں۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اس کا بھی برا حال تھا۔ آج تک وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہی نہیں تھے۔ ''تم اماں سے میری باتیں کیا کرنا ویر جی۔ اور ہاں، میرے پتا جی کا بہت خیال رکھنا۔ وہ بہت اکیلے ہیں۔ ان کے پاس روز جایا کرنا۔'' اوتار سنگھ نے اسے گاؤں جانے کا گویا ایک اور مقصد بھی دے دیا۔ ''پتا جی کو تمھاری صورت میں میری صورت نظر آیا کرے گی۔''

''یہ تو میں کروں گا ہی بھائی۔ یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔''

یوں وصال دین گاؤں چلا گیا۔ اگلے روز رگھو اسے چھوڑ کر واپس آیا تو ٹھاکر کے تحفوں سے لدا پھندا تھا، جو اس نے اوتار سنگھ کے لیے بھیجے تھے۔ مگر اوتار سنگھ کو سب سے قیمتی چیز وہ حلوہ لگا جو اماں نے اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنا کر بھیجا تھا۔

جب سے اوتار سنگھ کالج میں گیا تھا، اس کا وصال دین سے ملنا بہت کم ہو گیا تھا۔ کالج کا طویل دورانیہ، پھر زیادہ پڑھائی کی وجہ سے مصروفیت۔ اتوار کو چھوڑ کر بس وہ کھانے پر ہی ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن اب وہ چلا گیا تو اوتار سنگھ کو گھر سونا سونا لگنے لگا۔ امتحانوں کی وجہ سے پڑھائی کی بہت زیادہ مصروفیت نہ ہوتی تو شاید وہ بہت تڑپتا۔ جدائی کی پہلی رات وہ اپنے کمرے کی تنہائی میں جی بھر کے رویا۔ اس نے وہ آنسو بھی بہا دیے، جو وہ ویر جی کے سامنے نہیں بہا سکا تھا۔ پھر بہر حال پڑھائی نے جدائی کے اس احساس کو کم...... بہت ہی کم کر دیا۔

❀......❀......❀

وصال دین گاؤں پہنچا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات ابا سے ہوئی جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اس نے ابا کو سلام کیا۔ رگھو نے انھیں پرنام کیا۔

''کب آیا وصال دین؟'' جمال دین نے پوچھا۔

''ابھی آ رہا ہوں ابا۔''

جمال دین کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکیں۔ پھر ان میں مایوسی اور حیرت کا تاثر ابھرا۔

''چھوٹے ٹھاکر کہاں ہیں؟''

''وہ تو نہیں آئے ابا۔ ابھی تو ان کے امتحان بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مہینہ ڈیڑھ کے بعد آئیں گے وہ۔''

''تب تو تجھے بھی نہیں آنا چاہیے تھا وصال دین۔ تو چھوٹے ٹھاکر کو اکیلا چھوڑ آیا۔'' جمال دین نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں نہیں آ رہا تھا ابا۔ چھوٹے ٹھاکر نے زبردستی بھیجا ہے مجھے۔'' وصال دین نے ندامت سے کہا۔ ''چاہے رگھو سے پوچھ لو ابا۔''

جمال دین نے سوالیہ نظروں سے رگھو کو دیکھا۔"وصال دین ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا۔"رگھو نے کہا۔

لیکن جمال دین کے رویے میں نرمی نہیں آئی۔"اور تو رگھو کو بھی لے آیا۔انھیں بالکل اکیلا کر دیا تو نے۔"

"میں تو چاچا وصال دین کو چھوڑنے آیا ہوں۔کل واپس چلا جاؤں گا۔"رگھو نے کہا۔

"تجھے تو بالکل نہیں آنا چاہیے تھا رگھو۔"جمال دین بیٹے کی طرف مڑا۔"اب پہلے گھر نہ جانا۔ٹھاکر جی کے پاس جانا۔"

"میں وہیں جا رہا ہوں ابا۔"

جمال دین نے پہلی بار بیٹے کو نظر بھر کر دیکھا۔وہ بڑا...... جوان ہو گیا تھا۔قد بھی اونچا ہو گیا تھا اور جسم بھی بھر گیا تھا۔اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔وہ اس کے جسم کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔اس کا لرزتا ہوا ہاتھ سر سے اترا۔لیکن کندھے تک آتے آتے ٹھٹھک کر رہ گیا۔اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔"بس تو اب چلا جا۔یہاں دیر نہ کر۔"وہ سخت لہجے میں بولا۔

وصال دین سال بھر کے بچھڑے باپ سے لپٹ جانا چاہتا تھا۔لیکن اس نے خود کو روک لیا۔باپ کا حکم ماننے کی عادت جو تھی۔وہ رگھو کے ساتھ حویلی کی طرف چل دیا۔جمال دین نہ کہتا تو بھی وہ پہلے حویلی ہی جاتا۔اس کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی۔

جمال دین اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا...... شکر اور مسرت سے چھلکتی آنکھوں سے۔اس کا وصال دین اب مرد بن چکا ہے۔اے اللہ...... تیرا شکر ہے۔اس نے زیر لب کہا۔یہ سب تیرا ہی فضل ہے۔تیری عنایت ہے۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دیوان خانے میں تھا۔منیم جی اسے کچھ حساب کتاب بتا رہے تھے۔وصال دین کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔"آؤ پتر وصال دین، کب آئے؟ کیسے ہو۔"اس نے وصال دین کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہوں ٹھاکر جی۔"وصال دین نے جواب دیا۔اب وہ امید کر رہا تھا کہ ٹھاکر بھائی کے بارے میں حیرت سے پوچھے گا کہ وہ کیوں نہیں آیا۔

"اوتار سنگھ تو امتحان کی تیاری میں لگا ہوگا۔"ٹھاکر نے اسے حیران کر دیا۔

وصال دین کو احساس جرم ہونے لگا۔کاش وہ نہ آیا ہوتا۔"میں نہیں آ رہا تھا ٹھاکر جی۔پر بھائی نے مجھے مجبور کر دیا۔مجھے معاف ......"

"ارے کیسی بات کرتے ہو پتر۔"ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی۔"یہ تو زیادتی ہوتی تمھارے ساتھ۔دیکھو نا...... اوتار سنگھ دیر میں آئے گا تو دیر سے جائے گا بھی۔یہاں اتنے ہی دن رکے گا وہ۔جبکہ تمھیں جانا بھی اس سے پہلے ہی ہوگا۔اس نے اچھا کیا کہ تمھیں بھیج دیا۔یہ

بتاؤ...... وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"جی ٹھاکر جی۔ٹھیک ہے۔بس آج کل فرصت نہیں ہے انھیں۔"

"میں جانتا ہوں۔پر اس کا پھل بھی اچھا ملے گا اسے۔اچھا وصال دین، آؤ بیٹھو تو۔"

"جی...... میں...... میں یہیں ٹھیک ہوں ٹھاکر جی۔"

ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔بیٹے کیسے باپ پر جاتے ہیں۔جمال دین بھی بیٹھنے سے گھبراتا تھا۔اس نے سوچا۔پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔"ارے وصال دین، تم گھر بھی گئے ہو یا نہیں؟"اس نے چونک کر پوچھا۔

"سیدھا یہیں آیا ہوں ٹھاکر جی۔"

"حمیدہ بہن سے نہیں ملے۔جمال دین سے نہیں......"

"ابا سے تو کھیت میں ملاقات ہو گئی تھی۔"

"اور...... پر پہلے ماں سے ملنا تھا نا۔"ٹھاکر نے تڑپ کر کہا۔"بس تم فوراً گھر جاؤ اپنے۔"

"جاتا ہوں ٹھاکر جی۔پر ایک بات کرنی ہے آپ سے۔"

"بولو...... کیا بات ہے۔"

"مجھے اجازت دے دیں کہ میں ہر روز کچھ دیر کے لیے آپ کے پاس آ جایا کروں۔"

ٹھاکر کھل اٹھا۔"اجازت کی کیا بات ہے پتر۔یہ تمہارا گھر ہے۔جب چاہے، آ سکتے ہو۔"اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔پھر اچانک کسی خیال سے سنجیدہ ہو گیا۔"پر اپنے ماں باپ کا حق نہ مارنا۔وہ کب سے ترس رہے ہیں تمھیں۔"

"جی ٹھاکر جی...... میں خیال رکھوں گا۔"

"بس اب جاؤ تم۔"ٹھاکر نے شفقت سے کہا۔

وصال دین چلا گیا۔مگر ٹھاکر دیر تک دروازے پر نظریں جمائے رہا۔کیا میرا اوتار سنگھ بھی ایسا ہی بڑا ہو گیا ہوگا۔وہ سوچ رہا تھا۔پچھلی بار جب وصال دین کو دیکھا تھا تو وہ اتنا بڑا نہیں تھا۔اس کا دل مچلنے لگا اوتار سنگھ کو دیکھنے کے لیے۔پھر اس نے سوچا...... تھوڑے ہی دن کی تو بات ہے۔امتحان ختم ہوں گے اور وہ آ جائے گا۔

اس کا جی چاہا کہ دہلی چلا جائے اور اوتار سنگھ کو جی بھر کر دیکھے۔یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی۔لیکن امتحان کے دنوں میں مناسب نہیں تھا۔وہ بھی پیاسا رہ جاتا اور اوتار سنگھ کی پڑھائی میں بھی خلل پڑتا۔

اس نے چونک کر سر گھمایا تو رگھو پر نظر پڑی۔"میرے لیے کیا حکم ہے مالک؟ چھوٹے ٹھاکر کا حکم تھا کہ وصال دین کو پہنچا کر آؤں۔اب حکم ہو تو واپس چلا جاؤں۔"

"نہیں۔تم کل صبح واپس جانا۔اب جاؤ اور شانتا کو یہاں بھیج دو۔"ٹھاکر نے کہا۔

رگھو نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''جو حکم ان داتا۔''

باہر وصال دین گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اُڑ کر ماں کے پاس پہنچ جائے۔

❀……❀……❀

امتحان شروع ہونے میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ گھر پر تیاری کا موقع دینے کے لیے کالج سے چھٹیاں مل گئی تھیں۔ محمود اپنی ریاضی کی تیاری سے مطمئن نہیں تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس مضمون میں اوتار سنگھ بہت اچھا ہے۔

کالج کے آخری دن اس نے اس سلسلے میں اوتار سنگھ سے بات کی۔ ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے دوست۔''

''میں حاضر ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''مجھے ریاضی کی تیاری کرادو۔''

''بالکل کرادوں گا۔ مگر تمھیں میرے گھر آنا ہوگا۔''

''جب کہو، آجاؤں گا۔''

اوتار سنگھ نے چند لمحے سوچا۔ یوں اسے محمود سے بات کرنے کا موقع بھی مل جاتا۔ ''لیکن میں منہ مانگی فیس لوں گا۔'' وہ بولا۔

''فیس میں تو مجھے اعتراض نہیں۔ لیکن منہ مانگی فیس سے ڈر لگ رہا ہے۔ نجانے تم کیا مانگ بیٹھو۔'' محمود نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''خیر مجھے منظور ہے۔ بولو، کب آجاؤں۔''

''کل صبح کالج کے وقت پر آجاؤ۔ میں سمجھوں گا کہ کالج کی چھٹیاں پرسوں سے شروع ہو رہی ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ پھر پرسوں سے پڑھائی کا اپنا اپنا شیڈول بنالیں گے۔''

بات طے ہوگئی۔ دونوں آخری پیریڈ اٹینڈ کرنے کے لیے چل دیے۔

اگلے روز صبح نو بجے محمود اوتار سنگھ کے گھر پہنچ گیا۔

اوتار سنگھ کا پڑھائی کا کمرا گھر سے الگ تھلگ تھا۔ دونوں وہاں جا بیٹھے۔ اوتار سنگھ نے رنجنا سے کہہ دیا کہ ہر ایک گھنٹے کے بعد انھیں چائے کے لیے پوچھ لے۔

''اب بتاؤ، کہاں سے شروع کروں؟'' اوتار سنگھ نے محمود سے پوچھا۔

''تم استاد ہو۔ تم ہی فیصلہ کرو۔'' محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔ ''ایسا کرو کہ جو تمھیں مشکل لگتا ہو، اس پر نشان لگا دو۔ وہ میں تمھیں سمجھا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' محمود نے کتاب میں نشان لگا کر کتاب اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دی۔

''میتھس میں یہ آسانی ہے کہ ایک سوال میں تمھیں اچھی طرح سمجھا دوں...... ایسے کہ تم میتھڈ اچھی طرح سمجھ جاؤ تو اس کے بعد تم ہر سوال حل کر سکتے ہو۔ بس میتھڈ سمجھتے وقت تکلف نہ کرنا۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو بار بار پوچھو۔ یہاں تک کہ پوری طرح سمجھ جاؤ۔''

پڑھائی شروع ہوگئی۔ محمود دل میں سوچ رہا تھا کہ یہاں کتنا سکون ہے۔ اور وہ پڑھائی سے مطمئن بھی تھا۔ اوتار سنگھ کو ریاضی پر مکمل دسترس تھی اور اس کا سمجھانے کا طریقہ بھی بہت سادہ اور دل نشیں تھا۔

وہ منہمک تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ''آجاؤ، رنجنا۔'' اوتار سنگھ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

رنجنا ان کے لیے چائے لے آئی تھی۔

❀……❀……❀

اسی روز صبح ہی سے حور بانو باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھی۔ عام حالات میں اس موسم میں باورچی خانے میں زیادہ دیر رکنا اسے گوارا نہیں تھا۔ گرمی اسے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔

اس روز بھی گرمی کافی تھی۔ وہ پسینے میں نہا رہی تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ لیکن چولہے کے پاس سے ہٹنا اسے گوارا نہیں تھا۔ بوا نے کئی بار کہا... تم جاؤ بیٹا، ہم سنبھال لیں گے۔ لیکن وہ نہ مانی۔

''نہیں بوا...... آج سبھی کچھ میں خود پکاؤں گی۔'' اس نے کہا۔

''ہمیں تو لگتا ہے، گرمی سے بولا گئی ہو۔'' بوا نے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔

بوا ہی نہیں، اماں بھی حیران تھیں۔ حور بانو نے کھانا پکانے میں ایسی دلچسپی کبھی نہیں لی تھی۔ بلکہ اماں تو یہ سوچ سوچ کر اکثر ہولتی رہتی تھیں کہ سسرال میں جا کر اس لڑکی کا کیا بنے گا۔ پکانا تو یہ سیکھنا ہی نہیں چاہتی۔

''پریشان نہ ہوں بڑی بیگم۔ وقت آئے گا تو سب کرنے لگیں گی بٹیا۔'' بوا اماں کو دلاسا دیتیں۔

مگر آج اماں اس پر پریشان تھیں کہ تین چار قسم کے کھانے...... اور یہ لڑکی مصر ہے کہ سب کچھ خود ہی پکائے گی۔ وجہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

یہ سچ تھا کہ حور بانو کو کھانا پکانے میں دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن یہ تو چھوٹے ٹھاکر کے لیے

کھانا پکانے کا اعزاز تھا۔ اسے وہ کیسے کسی کے ساتھ بانٹ لیتی۔ یہ موقع تو قسمت نے اسے دیا تھا...... ایسا موقع جس کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

اور وہ مطمئن تھی کہ اماں کو نہیں معلوم ...... نہیں معلوم کہ اسے بھی معلوم ہے۔ اس نے تو بس اتفاقاً ہی اماں سے رنجنا کی گفتگو سن لی تھی۔

رنجنا پچھلی رات آئی تھی اور اماں کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ حور بانو اس وقت معمول کے مطابق برآمدے میں تھی۔

''بڑی بیگم...... میں اپنے چھوٹے ٹھاکر کی ایک بنتی لے کر آئی ہوں۔'' رنجنا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

چھوٹے ٹھاکر کا نام سن کر حور بانو کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ ہمہ تن سماعت ہو گئی۔ لفظ ''بنتی'' نے اس کے تجسس کو اور بھڑکا دیا تھا۔

''کیسی بنتی؟'' اماں نے کہا۔

''چھوٹے ٹھاکر کہتے ہیں کہ آپ ان پر اپکار کر دیں......''

''ارے...... تم لوگ اتنا تکلف کیوں کرتے ہو ہم سے۔ کہو نا، کیا بات ہے۔ دیکھو نا، کرائے دار ہونے کے علاوہ تم لوگ پردیسی ہونے کے ناتے ہمارے مہمان بھی ہو اور پڑوسی بھی ہو۔ تمہارا تو بہت حق ہے ہم پر۔''

رنجنا اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ کچھ اصرار کے بعد وہ بولی تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''بڑی بیگم، کھانا تو میں اچھا بناتی ہوں۔ آپ نے بھی کھایا ہے نا میرے ہاتھ کا۔ آپ ہی بتائیں......''

''بہت اچھا پکاتی ہو تم۔ پر بات کیا ہے؟''

''کل چھوٹے ٹھاکر کا کوئی دوست آ رہا ہے۔ لگتا ہے، چھوٹے ٹھاکر کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کل ان دونوں کے لیے کھانا بھجوا دیں۔''

''ارے تو اس میں اتنا جھجکنے کی کیا بات ہے۔''

''وہ دوست مسلمان ہے نا۔ تو آپ ایسا کھانا بھجوائیں جو آپ کے ہاں پکتا ہے۔ بے شک ماس ہو۔''

اماں کی سمجھ میں بات آ گئی۔ ''تمھارے چھوٹے ٹھاکر بہت اچھے ہیں۔'' انھوں نے کہا۔ ''تمھارے کھانے میں خرابی نہیں۔ مسلمان دوست کے لحاظ میں انھوں نے ہم سے فرمائش کی ہے کہ ممکن ہے، ان کا دوست تمھارے ہاتھ کا کھانا نہ کھائے۔''

''اوہو...... یہ بات ہے۔'' رنجنا نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''تو بڑی بیگم، آپ کر دیں گی نا یہ کام۔''

''سر آنکھوں پر۔ اور مجھے خوشی ہوگی۔ تم بے فکر ہو جاؤ اور چھوٹے ٹھاکر سے کہنا کہ پریشان نہ ہوں۔ انشاءاللہ انھیں شرمندگی نہیں ہوگی۔''

یہ سن کر حور بانو نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ سب کچھ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بنائے گی۔

اس رات وہ سو ہی نہیں سکی۔ صبح نماز اور تلاوتِ قرآن کے بعد وہ معمول کے مطابق کچھ دیر لیٹنے کے بجائے باورچی خانے میں چلی آئی، جہاں اماں آکا میاں کو سودے کی تفصیل بتا رہی تھیں، جو انھیں لانا تھا۔

''اماں...... آج کھانا میں پکاؤں گی۔'' اس نے اماں سے کہا۔

اماں خوش ہو گئیں۔ مگر ان کی نگاہوں میں حیرت تھی۔ ''یہ شوق تمھیں کب سے ہو گیا؟''

''بس اماں، آج جی چاہ رہا ہے۔''

آج نہیں۔ یہ شوق پھر کبھی پورا کر لینا۔ آج زیادہ چیزیں پکانی ہیں نا۔''

''کیا کیا پکے گا؟''

''پلاؤ، کوفتے، شامی کباب اور میٹھے میں کھیر۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں ایک ہی دن میں اتنا کچھ سیکھ لوں گی۔'' حور بانو نے خوش ہو کر کہا۔

''نہیں بھئی۔ یہ تجرباتی کھانا نہیں ہے۔ کہیں بھیجنا ہے۔''

''آپ بس مجھے ترکیب بتا دیجیے گا۔ سارا کام میں ہی کروں گی۔''

اماں نہیں مان رہی تھیں۔ مگر اس نے انھیں منا کر ہی دم لیا۔ اماں نے بھی شاید یہ سوچ کر مان لیا کہ شوق کا بھوت گرمی میں ذرا دیر میں اتر جائے گا۔ لیکن حور بانو باورچی خانے میں ایسی ڈٹی کہ نکلنے پر آمادہ ہی نہیں ہوئی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ کوفتے تیار ہو چکے تھے۔ کھیر برف میں لگا دی گئی تھی۔ پلاؤ دم پر تھا۔

''اچھا...... اب تم کچھ دیر ہوا میں جا بیٹھو بیٹا۔ صرف کباب رہ گئے ہیں۔ وہ میں تل لوں گی۔'' بوا نے پھر پیش کش کی۔

''واہ بوا...... سب کچھ کرنے کے بعد میں آخر میں کیوں ہٹوں۔ کباب بھی میں ہی تلوں گی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اے دیکھو تو...... انگارہ ہو رہی ہو۔''

''ہونے دو بوا۔ بس اب کام ہی کتنا ہے۔''

آدھے گھنٹے کے بعد سب کچھ تیار ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کھانا قابوں میں منتقل کیا۔ روٹیاں دسترخوان میں لپیٹیں اور سینی تیار کر دی۔ ''لو بوا...... اب یہ کھانا اوپر لے جاؤ۔'' اس نے سینی کو خوان سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔

❁......❁......❁

محمود نے ہاتھ پھیلا کر انگڑائی لی اور اوتار سنگھ کو بڑی ممنونیت سے دیکھا۔ ''میں تمہارا شکر گزار ہوں اوتار سنگھ۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' اوتار سنگھ مسکرایا۔ ''یہ بتاؤ کہ اب تم مطمئن ہو۔''

''بالکل۔ مطمئن بھی اور پُر اعتماد بھی۔ تم نے دیکھا نہیں کہ طریقہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ تمھارے دیے ہوئے سوال میں نے تمہاری مدد کے بغیر حل کر لیے۔''

''ہاں۔ میں بھی مطمئن ہوں۔''

''بس اب میں چلوں گا۔''

''ایسے کیسے جا سکتے ہو۔ ابھی تو تمھیں میری فیس دینی ہے۔''

''کب لو گے؟''

''میں تو آج ہی لینا چاہتا ہوں۔''

''اچھا بتاؤ تو تمہاری فیس کیا ہے۔''

''ابھی نہیں۔ کھانے کے بعد بتاؤں گا۔''

''کھانا! سنو اوتار سنگھ اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں نے ناشتہ بہت اچھا کیا تھا۔ ابھی بھوک بھی نہیں ہے۔ کھانا گھر جا کر کھاؤں گا۔''

''تب تو میری فیس بھی نہیں دے سکو گے۔ مجھے تم سے جو کچھ لینا ہے، اس میں بھی وقت لگے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ تم بتاؤ تو۔ مگر کھانا میں نہیں کھاؤں گا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم راجپوتوں کی روایت ہے کہ مہمان کو کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دیتے۔''

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر رنجنا نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ ''بھوجن لے آؤں چھوٹے ٹھاکر؟''

''ہاں...... لے آؤ۔''

رنجنا دروازہ بند کر کے جانے کے بجائے اندر چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی سلفچی اور تولیا تھا۔

''لو...... ہاتھ دھو لو محمود۔''

محمود ہچکچا رہا تھا۔ تاہم اس نے ہاتھ دھوئے اور تولیے سے خشک کیے۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں اوتار سنگھ، مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''چلو دو چار لقمے لے لینا۔'' اوتار سنگھ نے تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ پھر رنجنا کی طرف مڑا۔ ''جاؤ...... کھانا لے آؤ۔''

رنجنا چلی گئی۔ محمود اب بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کشمکش تھی۔

''برا مت ماننا اوتار سنگھ۔ میں کھانا نہیں کھا سکتا۔''

اوتار سنگھ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ ''دھرم کی وجہ سے؟'' اس نے پوچھا۔

محمود نے جواب نہیں دیا۔ بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ اوتار سنگھ کی نظریں اسے اپنے وجود میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''تمھیں پتا ہے، میرے ساتھ ایک مسلمان رہتا ہے۔ بچپن سے ہم ساتھ رہے ہیں۔ کبھی جدا نہیں ہوئے۔ میں اسے ویرجی کہتا ہوں، اپنا بھائی مانتا ہوں اس کے امتحان ختم ہو چکے ہیں اور وہ گاؤں چلا گیا ہے۔ ورنہ میں اس سے تمھیں ملواتا۔''

''اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ کسی کا دل نہ مانے تو وہ کیا کرے۔'' محمود نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

اتنے میں رنجنا سینی لے آئی اور کھانا میز پر سلیقے سے رکھنے لگی۔ پھر وہ جا کر پانی لے آئی۔

''چلو محمود...... آ جاؤ۔'' رنجنا کے جانے کے بعد اوتار سنگھ نے کہا۔

''میں معذرت خواہ ہوں اوتار سنگھ۔''

''ہم راجپوت مہمان نوازی جانتے ہیں محمود۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''یہ کھانا میرے گھر میں نہیں پکا ہے۔ یہ کسی ہندو نے نہیں، مسلمان نے پکایا ہے۔ اب بس تمھیں میرے ساتھ بیٹھنے پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ بات ہے تو میں بعد میں کھا لوں گا۔ تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔''

محمود شرمندہ ہو گیا۔ ''اتنی زحمت کی تم نے......''

''میں نے کی نہیں، زحمت دی۔ یہ جن کے مکان میں ہم رہ رہے ہیں، مسلمان ہیں۔ میں نے رات کو کہلوا دیا تھا۔ یہ سب کچھ انھوں نے ہی پکا کر بھیجا ہے اور کھانے بھی تم لوگوں کے ہی ہیں۔''

محمود کھانے کی میز پر جا بیٹھا تھا۔ ''آؤ نا اوتار سنگھ۔''

''تم کھاؤ۔ میں بعد میں کھا لوں گا۔''

''جو تم سمجھ رہے ہو، وہ بات نہیں ہے۔'' محمود نے کہا۔ ''آؤ۔ تمھارے بغیر میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

اوتار سنگھ بھی کھانے پر بیٹھ گیا۔

کھانا بہت لذیذ اور خوش ذائقہ تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ لاجواب تھی۔ ایسی کہ چھوڑنے کو دل ہی نہ چاہے۔ دونوں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔

''پیٹ بھر گیا۔ نیت نہیں بھری۔'' محمود نے کہا۔

''ادھر بھی یہی حال ہے۔'' اوتار سنگھ بولا۔ ''ویسے تم لوگوں کے کھانے بہت مزے دار ہوتے ہیں۔''

''اب تو نیند آنے لگی۔ کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں رہا میں۔''

''تو چلو۔ پاؤں پھیلا کر لیٹ جاؤ ذرا دیر۔''

دونوں مسہری پر نیم دراز ہو گئے۔ ''ہاں...... اب اپنی فیس کی بات کرو۔'' محمود نے کہا۔

''میں تمھارے مذہب کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

محمود کے لیے اس کی بات یکسر خلافِ توقع تھی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''کیوں جاننا چاہتے ہو؟''

''صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کے لیے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''تمھیں کوئی اعتراض ہے؟ تمہارا مذہب منع کرتا ہے تمھیں اس سے۔''

''نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ اللہ کا حکم ہے کہ اس کے دین کو پھیلانے کے لیے کام کیا جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے۔ تاکہ وہ سیدھی راہ اختیار کریں۔''

''تو مجھے بتاؤ۔''

محمود چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''یوں بتانا تو بہت مشکل ہے۔ اور میں کوئی عالم بھی نہیں ہوں۔ ایسا کرو، تم مجھ سے پوچھتے رہو، جو مجھے معلوم ہوگا اور جتنا معلوم ہوگا، میں بتا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ پہلے تم مجھے اللہ کے بارے میں بتاؤ۔ تم اپنے خدا کو اللہ کیوں کہتے ہو؟''

''یہ اللہ کا اسم ذات ہے اور خود اللہ نے ہمیں یہ بات بتائی ہے۔''

اوتار سنگھ پوچھتا رہا اور محمود بتاتا رہا۔ اس نے اللہ کی صفات اور اس کی کتابوں کے بارے میں بتایا۔ فرشتوں کے...... انبیاء کرام اور پیغمبروں کے بارے میں بتایا۔ اسلام کی تعلیم اور احکامات کے بارے میں بتایا۔ اوتار سنگھ جس دلچسپی سے سن رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا، وہ اس کے لیے حیران کن بھی تھا اور خوش کن بھی۔ محمود کو اندازہ ہوا کہ کچھ کچھ یہ سب اوتار سنگھ کے ذہن میں پہلے سے ہے۔

''اللہ کی کتاب تو عیسائیوں کے پاس بھی ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''اس وقت تین قومیں ایسی ہیں، جن کے پاس اللہ کا کلام موجود ہے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی۔'' محمود نے جواب دیا۔

''تو ان کو تو ایک ہونا چاہیے تھا۔'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا ظاہری سبب قوموں کا تعصب اور ان کی اجتماعی فطرت کی کمزوریاں ہیں۔ اللہ کی کتاب بھی اس کے متعلق بتاتی ہے اور تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے۔''

''لیکن اللہ نے تین کتابیں کیوں اتاریں۔ ایک کتاب ہوتی تو یہ تقسیم اور تفریق ہوتی ہی نہیں۔''

محمود گھبرایا...... لرز کر رہ گیا۔ اوتار سنگھ کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے اسے یہ احساس ہو گیا کہ یہ سوال بدنیتی سے نہیں، بلکہ خلوص سے کیا گیا ہے۔ لیکن اپنے عجزِ علم کی وجہ سے وہ اس کا جواب دینے سے معذور تھا۔

اچانک اس بے بسی کے عالم میں اسے اپنے اندر روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ''اوتار سنگھ، تم تو زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ یہ بتاؤ، فصل کس چیز سے تیار ہوتی ہے۔''

''بیج سے۔'' اوتار سنگھ نے بلا جھجک کہا۔

''سخت پتھریلی زمین میں بیج ڈالا جائے تو فصل اترے گی؟''

''نہیں۔''

''تو اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟''

''پہلے اس زمین پر محنت کرنی ہوگی۔ پتھر نکالنے ہوں گے۔ زمین نرم ہوگی تو اس میں ہل چلائیں گے۔ اسے پانی دیں گے۔ تاکہ زمین بیج قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔''

''اور زمین تیار ہوتے ہی بوائی کر دیں گے؟''

اوتار سنگھ نے چند لمحے سوچا۔ پھر بولا۔ ''نہیں...... موسم کا انتظام کرنا ہوگا۔''

''یعنی مناسب وقت کا۔'' محمود نے وضاحت کی۔ پھر بولا۔ ''اب میں تمھیں سمجھا سکتا ہوں۔ اللہ نے حضرت آدمؑ اور بی بی حواؑ کو زمین پر اتارا اور ان کی نسل میں برکت عطا فرمائی۔ لیکن جلد ہی انسان گمراہی میں پڑنے لگا۔ اور اس کی گمراہی بہت تیزی سے بڑھتی گئی۔ تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ معاشرے کس درجہ خراب ہو گئے تھے۔ اربابِ اقتدار سفاک تھے۔ انسانوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انسان کو انسان سے اور بھوکے درندوں سے لڑانا امرا کی تفریح تھی۔ اخلاقی انحطاط آخری حدوں کو پہنچ چکا تھا۔ مختصر یہ کہ معاشرے سنگلاخ زمین سے زیادہ بری حالت میں تھے۔ ایسے میں ہدایت کا بیج کیسے پنپتا۔ پھر اللہ کی صفات میں رحمت اور حد درجہ نرمی ہے۔ اللہ انسان کو آسانیاں عطا فرماتا ہے اور بتدریج بہتری اور اصلاح کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ آسمانی کتابیں صرف چار ہیں۔ لیکن تقریباً ہر پیغمبر پر صحیفے اترتے۔ وہ مختصر

اور غیر جامع تھے اور محفوظ نہ رہ سکے۔ رہ گئیں آسمانی کتابیں تو تورات بار بار تلف بھی ہوئی اور یہودی علماء نے اس میں تحریف بھی کی۔ اسی طرح انجیل بھی اپنی اصل شکل میں موجود نہیں۔ البتہ قرآنِ پاک میں آج تک زیر زبر کا فرق نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اللہ نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تھا۔'' محمود نے گہری سانس لی۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد گویا ہوا۔'' کہنے کا مطلب یہ کہ معاشروں کے حد سے بڑھتے ہوئے بگاڑ کی وجہ سے شاید اللہ نے اپنی شریعت بتدریج اور قسطوں میں اتاری۔ یہاں تک کہ ہمارے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے تو اللہ نے دین اور شریعت کو مکمل کر دیا۔ شریعت کے بتدریج مکمل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ نزولِ اسلام کے ابتدائی عرصے میں شراب پی جاتی رہی۔ لیکن بعد میں قرآن پاک میں اسے حرام قرار دینے کا حکم آیا اور اس پر عمل درآمد ہوا۔''

''یہ بات اللہ نے بتائی؟''

محمود تھرا اٹھا۔'' یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ یہ میرا عقلی قیاس ہے اور اگر غلط ہے تو میں اس پر اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔ وہ نیت کا حال جانتا ہے۔ میں نے صرف تمھیں سمجھانے کی غرض سے سوچا تو یہ بات میرے ذہن میں آئی۔ دیکھو نا..... اگر آدمی کو بہت ساری بری عادتیں ہوں تو انھیں ایک دم نہیں چھڑوایا جاتا کہ وہ گھبرا کر اصلاح قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ ایک ایک کر کے بری عادتیں چھڑا دیں تو اسی کے لیے آسانی ہوگی۔ اور ایک برائی چھوڑنے اور ایک اچھائی اپنانے کے نتیجے میں آدمی میں برائی کے لیے کراہت اور اچھائی کے لیے قبولیت پیدا ہوتی ہے۔ ہر مزید برائی چھوڑنے کے بعد وہ قبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی کی مکمل اصلاح ہو جاتی ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔''

اوتار سنگھ نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔'' بات تو میری سمجھ میں بھی آگئی۔''

محمود نے اوتار سنگھ کو وحی کے بارے میں بتایا۔ اوتار سنگھ کے لیے وحی کو سمجھنا اور اس تصور کو قبول کرنا فطری طور پر آسان تھا۔ سائنسی ایجادات اور دریافتوں پر غور کرتے ہوئے برسوں پہلے اس نے سوچا تھا کہ اوپر والے نے ذہن میں خیال پیدا کر کے رہنمائی کی ہوگی۔ وحی کی وضاحت سے اس کے قیاس کی تائید ہوتی تھی۔

''اچھا... ہم ہندو تو مشرک ہیں۔ بتوں کو پوجتے ہیں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔'' لیکن عیسائی تو اہلِ کتاب ہیں۔ تم لوگ بھی یہ کہتے ہو۔ انھیں تو ایک خدا کو ماننا چاہیے۔ مگر وہ بھی بت بناتے ہیں۔ تصویروں کو پوجتے ہیں۔''

''اسی لیے تو اللہ نے تصویروں اور بتوں کو بنانے سے منع فرمایا ہے۔'' محمود نے کہا۔

''یہ مجسمے اور تصویریں فرضی ہوں گے۔ میں نے یہ بات رچرڈ پارسن سے بھی پوچھی تھی۔ وہ برا مان گیا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ یہ تصویریں اور مجسمے بعد میں بنائے گئے ہوں گے۔ ابتدائی

زمانے میں تو یہ فنون ڈیولپ ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے یہ اصلی تو نہیں ہو سکتے۔''

''نہیں اوتار سنگھ، تاریخ بتاتی ہے کہ مصوری اور بت تراشی قدیم ترین فنون میں سے ہیں۔ انسان نے بولنا بعد میں سیکھا۔ تصویر اور بت بنانا پہلے شروع کیا تھا۔ اہمیت اس بات کی نہیں کہ وہ مجسمے اور تصویریں فرضی ہیں، اصلی نہیں۔ اللہ نے ان کی ممانعت اس لیے فرمائی ہے کہ شرک کا امکان پیدا ہوتا ہے اور شرک وہ گناہ ہے، جسے اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔''

''کبھی بھی نہیں، کسی بھی صورت میں نہیں؟'' اوتار سنگھ کی آواز میں لرزش تھی۔

محمود نے چونک کر اسے دیکھا اور فوراً ہی بات سمجھ گیا۔'' مطلب یہ ہے کہ جو ایمان لے آیا، اس کو اللہ نے اس شرک پر معاف کر دیا جو وہ پہلے کرتا رہا۔ لیکن ایمان لانے کے بعد شرک کیا تو اس پر اسے معاف نہیں کیا جائے گا۔ اور جو مشرک جیا اور مشرک ہی مر گیا، وہ تو ہے ہی مجرم۔''

''اور یہ جو عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں......''

''یہ تو بدترین شرک ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اللہ نے بتایا ہے کہ وہ واحد ہے، احد ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ وہ کسی سے ہے اور نہ کوئی اس سے ہے۔ ہم اس کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا اس نے ہمیں بتایا ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ہاں اسے ہر جگہ، خود اپنے اندر محسوس کر سکتے ہیں۔''

اوتار سنگھ کو حیرت ہوئی۔ کم و بیش اس کا تصور بھی یہی تھا۔

''اب وقت کافی ہو گیا ہے اوتار سنگھ۔'' محمود نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔'' اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ اس موضوع پر پھر کبھی امتحانوں کے بعد بات کریں گے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر تم مذاہب کے بارے میں خاص طور پر اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو کسی عالم سے بات کرو۔ میری معلومات تو بہت محدود ہیں۔''

''تمھارا بہت شکریہ دوست۔ جو کچھ تم نے مجھے آج دیا، وہ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔'' اوتار سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔'' آؤ چلیں۔''

اوتار سنگھ محمود کو رخصت کر کے آیا تو اس کی سوچوں کو ایک نیا رخ مل چکا تھا۔

❁......❁......❁

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وصال دین نگاہیں نیچی کیے بیٹھا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے میں ٹھاکر اس معمول کا عادی ہو چکا تھا۔ وصال دین پہلے دن دو بار اس کے پاس آیا تھا۔ ایک بار شام کے وقت اور دوسری بار رات کا کھانا کھانے کے بعد۔

پہلی بار وہ آیا تو زمین پر بیٹھ گیا۔'' اوپر بیٹھو پتر وصال دین۔'' ٹھاکر نے بڑی شفقت سے کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی، میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' وصال دین نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں''

''معاف کیجئے ٹھاکر جی، ابا نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔''

ٹھاکر مسکرا دیا۔ بیٹا باپ سے آگے جا رہا تھا۔ اسے وہ رات یاد آ گئی، جب جمال دین پہلی بار اس کی خواب گاہ میں تھا۔ وصال دین اس وقت بہت چھوٹا تھا اور باپ کے ساتھ آیا تھا۔ یہ وہ رات تھی، جب ٹھاکر ان تینوں کو سوتے سے اٹھا کر اپنے ساتھ حویلی لایا تھا جب حمیدہ نے پہلی بار اوتار سنگھ کو دودھ پلایا تھا۔ جمال دین اوپر بستر پر لیٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بلکہ اس کا بس چلتا تو سوتے ہوئے وصال دین کو بھی بستر سے اٹھا کر نیچے فرش پر لٹا دیتا۔

''اور میں حکم دے رہا ہوں کہ تم اوپر بیٹھو۔'' ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وصال دین کشمکش میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ بالآخر اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''آج معاف کر دیجئے۔ کل میں ابا سے پوچھ کر آؤں گا۔''

ٹھاکر کو اس کی عقل مندی پر ہنسی آ گئی۔ تاہم اس نے خود کو بڑی مشکل سے روکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ابھی جا کر جمال دین سے شکایت کرتا ہوں کہ وصال دین میرا حکم ماننے سے انکار کر رہا ہے۔''

''ایسا نہ کریں ٹھاکر جی۔'' وصال دین بھی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا جی، میں بیٹھ جاتا ہوں۔'' وہ کرسی پر بیٹھا کیا، بس ٹک گیا۔ انداز ایسا تھا کہ کسی بھی لمحے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ نگاہیں اس کی اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

ٹھاکر بھی بیٹھ گیا اور غور سے اسے دیکھتا رہا۔ ''دیکھ وصال دین، جیسے اوتار سنگھ میرا پتر ہے، ویسے ہی تو بھی ہے۔ میں تجھے اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں۔''

''یہ تو آپ کی بڑائی ہے ٹھاکر جی۔''

''اچھا یہ بتا، تعلیم نے تجھے یہ نہیں سکھایا کہ سب انسان برابر ہوتے ہیں۔''

''تعلیم تو اچھی چیز ہے ٹھاکر جی۔ ادب لحاظ ختم نہیں کرتی۔ اور ٹھاکر جی، عزت سب کی ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کسی کو اللہ نے زیادہ عزت دی ہے اور کسی کو کم۔ اور پھر ماں باپ کا حکم ماننا تو ضروری ہے۔ تعلیم بھی یہی سکھاتی ہے۔''

ٹھاکر کو اپنے بیٹے کا خیال آ گیا۔ کیا وہ بھی ایسا ہی ہے۔ باپ کا حکم ماننے والا۔ میرے اندر جو تبدیلی آئی ہے، کیا اوتار سنگھ اسے قبول کرے گا؟ کیا وہ خود بھی اپنے اندر وہ تبدیلی لائے گا؟ ان سوالوں کا جواب تو وقت ہی دے سکتا تھا۔ اور ٹھاکر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بیٹے کو اپنی تبدیلی کے بارے میں بتانے کو بے تاب تھا۔ مگر وہ بیٹے کے اختلاف کے امکان سے ڈر بھی رہا تھا۔ اگر اس نے اختلاف کیا تو کیا ہوگا؟ وہ تو بہت بڑی آزمائش ہوگی اس کے لیے۔

ٹھاکر نے اس سے پہلے نہ تو وصال دین کو کبھی بہت غور سے دیکھا تھا، نہ ہی اس کے ساتھ

کبھی اتنا وقت گزارنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسے بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔

پہلے دن ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ بیٹا باپ سے بہت آگے ہے۔ جمال دین بہت کم گو تھا۔ لیکن وصال دین سے موازنہ کرتے ہوئے اسے بڑی آسانی سے باتونی قرار دیا جا سکتا تھا۔ وہ تو بولتا ہی نہیں تھا۔ سوال کیا جاتا تو مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ ایک فرق تھا۔ جمال دین کی نظریں اس کے سامنے ہمیشہ جھکی رہتی تھیں۔ جبکہ وصال دین کی موجودگی میں اسے دیکھے جانے کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ نظریں اسے اپنے وجود میں چبھتی ہوئی محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ بلکہ اسے سہلائے جانے کا۔ گدگدی کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ ناگوار ہرگز نہیں تھیں۔

کئی بار ٹھاکر نے اچانک نظریں اٹھا کر وصال دین کو دیکھا۔ مگر وصال دین کو بدستور فرش کی طرف دیکھتے پایا۔ اسے خود بھی شبہ ہونے لگا کہ دیکھے جانے کا احساس محض اس کا وہم تھا۔ لیکن نظریں ہٹانے کے بعد وہ احساس پہلے سے زیادہ توانا ہو جاتا تھا۔

دیر تک نظروں کی چوری کا معاملہ چلتا رہا۔ مگر بالآخر ایک موقعے پر نظروں کی وہ چوری پکڑی گئی۔ وصال دین کو نظریں جھکانے میں ایک ثانیے کی تاخیر ہو گئی تھی۔ ٹھاکر کو اپنی طرف متوجہ پایا تو اس نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔

مگر ٹھاکر اسے دیکھ چکا تھا۔ اور ٹھاکر کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔ اس ایک ثانیے میں اس نے وصال دین کی آنکھوں سے چھلکتی، برستی محبت دیکھ لی تھی۔ ایسی نظروں سے تو کوئی بیٹا اپنے باپ کو ہی دیکھ سکتا ہے۔

ٹھاکر کے اپنے احساسات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ اس ذرا سی دیر میں اس نے سمجھ لیا تھا کہ وصال دین کا پاس بیٹھنا اسے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس پر اسے اوتار سنگھ جیسی ہی محبت آ رہی تھی اور اس کی موجودگی میں اوتار سنگھ کی یاد جدائی والی... تکلیف وہ یاد نہیں تھی۔

''پتر وصال دین، کچھ کھاؤ گے؟'' اس نے غیر معمولی شفقت سے پوچھا۔

''نہیں ٹھاکر جی، شکریہ۔'' وصال دین نے مختصر سا جواب دیا۔

''تم تکلف کرتے ہو پتر؟''

''نہیں ٹھاکر جی۔ میں گھر سے کھانا کھا کر آیا تھا۔''

اس پر ٹھاکر کو حمیدہ اور جمال دین کا خیال آ گیا۔ ایک سال بعد وہ گھر آیا تھا اور پہلے ہی دن ماں باپ کے ساتھ گزارنے کے بجائے اس کی دل جوئی کے لیے حویلی چلا آیا تھا۔ ٹھاکر جانتا تھا کہ وصال دین کے آنے میں اس کے ماں باپ کی مرضی بھی شامل ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ ان کی طبیعت میں کتنا ایثار ہے۔

ٹھاکر نے خود کو ان کی جگہ رکھ کر سوچا۔ اوتار سنگھ چھٹیوں میں گھر آتا تھا تو اس کا جی چاہتا

تھا کہ وہ ہر پل اس کی نظروں کے سامنے رہے اور اوتار سنگھ چھٹیوں میں گھر سے کم ہی نکلتا تھا۔ ہاں اس کی پڑھائی کی مصروفیات جاری رہتی تھیں۔ خود ٹھاکر بھی اپنے کاموں میں لگا رہتا تھا کہ زندگی یہی ہے۔ وہ اس میں خوش رہتا تھا کہ اس کا بیٹا گھر میں موجود ہے اور وہ جب چاہے، جا کر اسے دیکھ سکتا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ حمیدہ نے اوتار سنگھ کو دودھ پلایا ہے اور وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔ لیکن اس نے کبھی اوتار سنگھ سے نہیں کہا کہ ہر روز جا کر حمیدہ سے ضرور مل آیا کرے۔

اسے شرمندگی ہونے لگی۔ جمال دین اور حمیدہ کے مقابلے میں وہ کتنا کم ظرف تھا!

''پتر وصال دین، تم حمیدہ اور جمال دین کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے میرے پاس چلے آئے۔ یہ تو زیادتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ پورا دن تو میں اماں اور ابا کے ساتھ رہا ہوں۔ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ہے۔''

''پھر بھی۔ ان کا دل تو نہیں بھرتا ہوگا تمھیں دیکھنے سے۔''

''اماں تو مجھ سے کہتی ہیں ٹھاکر جی کہ ہمارے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا کر۔ نہیں تو عادت ہو جائے گی۔ کہہ رہی تھیں، عادت ہو جائے تو شہر جانے کے بعد کے بہت سے دن بڑے سخت لگتے ہیں۔ بڑی مشکل سے عادت ہوتی ہے۔ وہ کہتی ہیں..... جا کہیں گھوم پھر آ وصال دین۔''

ٹھاکر اس دلیل کو جانتا تھا۔ جب اسکول جانے کے بعد اوتار سنگھ پہلی بار چھٹیوں میں گاؤں آیا تھا تو اس نے یہی سوچ کر اپنی مصروفیات اور بڑھا لی تھیں کہ عادت نہ ڈالنا ہی اچھا ہے۔

تھوڑی دیر اور بیٹھنے کے بعد وصال دین پہلو بدلنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ٹھاکر نے یہ بات بھانپ لی اور اس کی مشکل آسان کر دی۔ ''کیا بات ہے پتر وصال دین؟''

''مجھے اجازت دیں ٹھاکر جی۔ میں گھر جاؤں گا۔''

''اجازت کی کیا بات ہے پتر۔ چلے جاؤ۔''

وصال دین اٹھا۔ جاتے جاتے وہ پلٹا اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھاکر جی، رات کو میں آپ کے پاس آؤں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا؟''

''میں نے کہا نا پتر، یہ تمہارا گھر ہے۔ جب چاہو آؤ۔''

''میں رات کو کھانے کے بعد آؤں گا۔''

''کھانا یہیں کھا لینا پتر..... میرے ساتھ۔'' ٹھاکر نے بے ساختہ کہا۔ کہتے ہی اسے غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ فرماں برداری میں اگر وصال دین مان بھی گیا تو بھوکا ہی

اٹھے گا۔ وہ اس کی موجودگی میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ کھانا کیا کھاتا۔

''وہ ٹھاکر جی.... جب سے آیا ہوں، ابا میرے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔'' وصال دین کے لہجے میں معذرت تھی۔

''مجھے خیال نہیں رہا تھا پتر۔ ٹھیک ہے۔ تم کھانا کھا کر آنا۔''

وصال دین کے چہرے پر تشکر کا تاثر بے حد واضح تھا۔ پھر وہ پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔

رات کو وہ پھر آیا اور اسی طرح نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر کے لیے وہ مطالعے کا وقت تھا۔ وہ بیٹھا پڑھتا رہا۔ اسے بد اخلاقی کا احساس ہو رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وصال دین بات کرنے والا ہے ہی نہیں۔ وہ صرف اس کے سوالوں کا جواب دے گا۔ اور سوال وہ کتنے کر سکتا ہے۔ اصل میں ان کے درمیان مشترک کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ بات کیا کرتے۔

پھر بھی بد اخلاقی کے احساس کو کم کرنے کے لیے ٹھاکر نے کئی بار اس سے چائے شربت کا پوچھا۔ مگر وصال دین نے ہر بار یہی کہا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہوئی تو وہ خود مانگ لے گا۔

یوں وہ قربت ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو بوجھل لگنے لگی۔ اس حد تک کہ مطالعے میں بھی اس کا انہماک متاثر ہونے لگا۔ بلکہ ایسا ہوا کہ آخر میں جو وہ پڑھ رہا تھا، وہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔

بالآخر اس نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔ بات کرنے کو اوتار سنگھ کے سوا کوئی موضوع نہیں تھا۔ چنانچہ وہ وصال دین سے اوتار سنگھ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ کیا کرتا ہے..... کیا مصروفیات ہیں..... صحت کیسی ہے..... کھانے پینے کا خیال رکھتا ہے یا نہیں۔

یہ ایک موضوع تھا، جس پر وصال دین اعتماد سے بات کر سکتا تھا۔ اوتار سنگھ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے لہجے سے محبت چھلک رہی تھی۔ اس کے انداز میں وہ اپنائیت تھی، جو کسی بہت محبوب ہستی کے لیے ہوتی ہے۔

کچھ دیر گزری اور پھر وہی خاموشی۔ لیکن اتنی سی گفتگو ٹھاکر کو بتا گئی کہ وصال دین اوتار سنگھ کو کتنا چاہتا ہے۔

مزید کچھ دیر گزری تو ٹھاکر کو خیال آیا کہ کہیں وصال دین گھر جانے کے لیے اس کے حکم کا انتظار تو نہیں کر رہا ہے۔ کیونکہ رات کافی ہو چکی تھی۔

بات بہت نازک تھی۔ ٹھاکر کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وصال دین کی دل آزاری ہو۔ اس نے لہجے میں دنیا جہان کی نرمی سموتے ہوئے کہا۔ ''پتر وصال دین، رات بہت ہو گئی ہے۔ حمیدہ اور جمال دین تمھارے انتظار میں جاگ رہے ہوں گے۔''

''جب تک آپ جاگ رہے ہیں، میں کیسے جا سکتا ہوں۔'' وصال دین نے جواب دیا۔

ٹھاکر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اس کے جاگنے اور وصال دین کے بیٹھے رہنے میں

اس کے نزدیک کوئی ربط نہیں تھا۔

''آپ کب سوتے ہیں ٹھاکر جی؟'' وصال دین نے اچانک پوچھا۔

''میرا کیا پتا ہے پتر۔ کوئی وقت نہیں ہے سونے کا۔ پر آج کل نیند آ جاتی ہے۔ پہلے تو رات رات بھر جاگتا تھا۔'' ٹھاکر نے جواب دیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اسے وصال دین کو گھر بھیجنا ہے۔ ''پتر...... اب تم گھر جاؤ۔''

''آپ سوئیں گے تو میں گھر جاؤں گا ٹھاکر جی۔''

''کیوں پتر؟''

''مجھے آپ کے پاؤں دبانے ہیں۔''

ٹھاکر کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔ ''یہ اوتار سنگھ نے کہا ہے تم سے؟''

''جی ہاں۔'' وصال دین نے کہا۔ پھر جلدی سے وضاحت کی۔ ''بھائی نے...... میرا مطلب ہے چھوٹے ٹھاکر نے چلتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کا خیال رکھوں۔ لیکن میں اس سے بھی پہلے یہ سب سوچ چکا تھا۔ میری چھٹیاں پہلے ہو رہی تھیں اور چھوٹے ٹھاکر کی بعد میں۔ پہلے تو میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر نے زبردستی مجھے بھیجا۔ ورنہ میں انھیں چھوڑ کر کبھی نہ آتا۔ پھر میں نے سوچا کہ چھوٹے ٹھاکر ہر رات آپ کے پاؤں دباتے تھے۔ اب میں دباؤں گا......''

ٹھاکر حیرت سے گنگ تھا۔ اس نے سب کچھ سنا تھا۔ وہ بھی جو کہا گیا اور وہ بھی جو نہیں کہا گیا۔ وصال دین اوتار سنگھ کو بھائی کہنے کا عادی تھا۔ یہ اس کے لیے انکشاف تھا۔ پھر وصال دین نے اس کے لحاظ میں جلدی سے بھائی کو چھوٹے ٹھاکر بنا دیا تھا اور وصال دین کا یہ کہنا کہ وہ اکیلا آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یعنی وہ اوتار سنگھ کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اوتار سنگھ نے زبردستی اسے بھیجا تھا اور کہا تھا کہ پتا جی کا خیال رکھنا۔ پھر وصال دین نے یہ بھی بتا دیا کہ اوتار سنگھ نے صرف اسے پتا جی کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ یہ خیال کس طرح رکھا جائے، یہ فیصلہ وصال دین کا اپنا تھا۔

اس وقت ٹھاکر تک وصال دین کی اپنے لیے اور اپنے بیٹے کے لیے بے پایاں محبت بہ کمال و تمام پہنچ گئی تھی۔ اور وہ ایسی محبت تھی کہ خود پر قابو رکھنے والے راجپوت کی آنکھیں تو نہیں بھیگیں۔ لیکن اسے اپنے سینے میں دل پگھل کر سیال بنتا ضرور محسوس ہوا۔

''تمھیں کیسے پتا کہ تمہارا بھائی اوتار سنگھ میرے پاؤں دباتا تھا؟'' اس نے لفظ بھائی پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وصال دین نے بھی بے ساختہ جواب دیا۔ ''یہ بات تو بھائی نے خود مجھے بتائی تھی...... بہت پہلے۔'' اور اس بار وصال دین کو احساس بھی نہیں ہوا کہ اس نے ٹھاکر جی کے سامنے ان کے بیٹے کو بھائی کہا ہے۔

''مگر بھائی نے تمھیں یہ تو نہیں کہا تھا کہ ہر رات میرے پاؤں دبانا۔''

''جی یہ تو نہیں کہا تھا۔ لیکن میں نے خود سوچ لیا تھا کہ یہ ضرور کروں گا۔''

اس لمحے ٹھاکر کو احساس ہوا کہ گاؤں کے اس مسلمان گھرانے نے راجپوت پتھر میں جونک لگا دی ہے۔ وہ بہت نرم دل ہو گیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی وہ منع کر دے کہ مجھے پاؤں نہیں دبوانے، تو وصال دین چوں بھی نہیں کرے گا۔ وہ اسے جانے کا حکم دے گا تو وہ فوراً واپس چلا جائے گا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وصال دین کا دل دکھے گا۔ وہ ایک بڑی خوشی سے محروم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے کہا۔ ''چلو وصال دین۔''

وہ وصال دین کو اپنے ساتھ اپنے خاص کمرے میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر بلا ارادہ اس نے اپنی ڈائری نکالی اور قلم کھولا۔ اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ وصال دین کی موجودگی میں ڈائری لکھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اب وہ کیا کرے؟

آخر اس نے ڈائری کو واپس رکھ دیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ وصال دین اس کے پاؤں دبانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کسمسایا۔ ''وصال دین، اب تم جاؤ۔''

''آپ سو جائیں گے تو میں چلا جاؤں گا۔''

اب ٹھاکر کو سوچنا پڑا۔ وصال دین کی دل جوئی اپنی جگہ۔ لیکن اس مروت میں اس کا اور جمال دین کا...... دونوں کا نقصان تھا۔ آج وصال دین نے اس کے ساتھ کم از کم چار پانچ گھنٹے گزارے تھے۔ اس کا مطالعہ گیا، اس کا ڈائری لکھنا گیا۔ دوسری طرف وصال دین کو اس تمام وقت میں کوفت کے سوا کیا ملا ہو گا...... سوائے اس وقت کے۔ پاؤں دباتے ہوئے اسے کچھ کرنے کا احساس ہوا ہو گا۔ کچھ خوشی ملی ہو گی۔ ورنہ دو افراد خاموش بیٹھے رہیں۔ ان کے درمیان بات کرنے کو کچھ بھی نہ ہو تو ایسی قربت بوجھ ہی ہوتی ہے۔ یہ تو دونوں کا نقصان ہے۔

وہ سوچتا رہا کہ اس سے بچنے کے لیے کیا کرے۔ بالآخر اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وصال دین کے لیے صرف اتنا کافی تھا کہ اسے پاؤں دبانے کا موقع مل جائے۔ باقی قربت کا بوجھ اس پر سے اتار دیا جائے تو وہ زیادہ خوش رہے گا۔

''سنو وصال دین۔'' اس نے پکارا۔

وصال دین اس کے پاؤں دباتا رہا۔ ''جی ٹھاکر جی۔''

''دراصل میں بہت مصروف ہوتا ہوں۔ تم ایسا کرو، بس ایک وقت آیا کرو۔ رات کو نو بجے آیا کرو۔''

''جی...... بہت بہتر۔''

''تمھیں برا تو نہیں لگا وصال دین۔''

"نہیں ٹھاکر جی۔ آپ کا حکم ماننے میں تو خوشی ہے۔"

ٹھاکر مطمئن ہو گیا۔ اب اسے پاؤں دبانے کے اس دورانیے کو مختصر کرنا تھا۔ اس کی واحد صورت یہ تھی کہ وہ سوتا بن جائے کیونکہ نیند آنی تو آسان نہیں تھی۔ وصال دین کو یقین ہو گیا کہ وہ سو رہا ہے تو وہ چلا جائے گا۔ پھر وہ اٹھ کر ڈائری لکھے گا۔ اس نے اٹھ کر اوتار سنگھ کا تکیہ لیا اور اسے لپٹا کر لیٹ گیا۔

لیکن وصال دین اس کے پاؤں دباتا رہا۔ نجانے کیسے...... مگر اسے معلوم تھا کہ وہ سویا نہیں ہے۔

اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ٹھاکر نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر پتا نہیں کیسے... بہر حال تھوڑی دیر میں وہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو صبح ہو رہی تھی۔ وصال دین کب گیا، اسے معلوم نہیں تھا۔ بس وہ یہ جانتا تھا کہ اس نے بہت اچھی نیند لی ہے اور تازہ دم بیدار ہوا ہے۔ اور یہ کہ رات اس نے ڈائری نہیں لکھی تھی۔

اس روز ٹھاکر نے اپنے کچھ معمولات بدلے۔ رات کا کھانا وہ سات بجے کھا لیتا تھا۔ اس معمول میں تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ البتہ معمول کے مطالعے کے لیے وہ پانچ بجے بیٹھ گیا۔ کھانے کے بعد اس نے چہل قدمی کی۔ پھر اپنی خواب گاہ میں جا کر ڈائری لکھی اور واپس آ گیا۔

نو بجے وصال دین آیا تو وہ مطالعہ کر رہا تھا حالانکہ اصل مطالعہ تو وہ کر چکا تھا۔ اس نے پندرہ بیس منٹ وصال دین کو اپنے سامنے بیٹھنے کا موقع دیا۔ پھر وہ ایک جماہی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو وصال دین، اب میں سوؤں گا۔" اس نے کہا۔

اپنے کمرے میں وہ اوتار سنگھ کے تکیے کو سینے سے لگا کر لیٹ گیا۔ وصال دین اس کے پاؤں دبانے لگا۔ اس رات کیونکہ وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس لیے ذرا ہی دیر میں اسے نیند آ گئی۔

سو اب یہی اس کا معمول تھا۔ اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو وصال دین، اب مجھے نیند آ رہی ہے۔"

❀....❀....❀

جس روز محمود ریاضی پڑھنے آیا تھا، اس دن کے بعد اوتار سنگھ کا دل پڑھائی میں نہیں لگا۔ اس روز اس کے اندر ایسی خوشی، ایسا دبا دبا ہیجان تھا، جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کیفیت کیا ہے۔ اس کی سمجھ میں بس اتنا آیا کہ وہ جس مہان ہستی کی برسوں سے جستجو کر رہا تھا، اب اسے پانے کے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔ یہ یقین اسے کیوں ہوا، یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ بس وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ اسے مل جائے گا اور پھر وہ اس سے وہ محبت کر سکے گا، جو کرنی چاہیے۔ جو وہ برسوں سے کرنی چاہتا ہے۔

اس شام مولوی صاحب نہیں آئے۔ انھوں نے کہہ دیا تھا کہ امتحان کے عرصے میں وہ اسے پڑھانے نہیں آئیں گے۔

"اور چھٹیاں ہوتے ہی میں گاؤں چلا جاؤں گا۔" اوتار سنگھ نے کہا۔

مولوی صاحب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم اس بار بھی چھٹیوں میں مجھ سے پڑھنا چاہتے ہو؟"

"جی مولوی صاحب۔" وہ بولا۔ "تو آپ میرے ساتھ ہی گاؤں چلے چلیں۔"

مولوی صاحب اسکول میں پڑھاتے تھے اور اسکول میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ "تم گاؤں کب جاؤ گے؟" انھوں نے پوچھا۔

"18 تاریخ کو میرا آخری پرچا ہے۔ میں 19 تاریخ کو گاؤں چلا جاؤں گا۔"

"تو تم چلے جانا۔ مجھے 19 تاریخ کو اپنی بھتیجی کی شادی میں شرکت کرنی ہے۔ میں 20 تاریخ کو خود گاؤں پہنچ جاؤں گا۔"

یہ بات طے ہو چکی تھی۔ مگر اب شام ہوئی تو اوتار سنگھ مولوی صاحب کو مس کرنے لگا۔ وصال دین بھی نہیں تھا۔ اسے بڑی شدت سے تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ آخر وہ اٹھا اور کوٹھے پر چلا گیا۔

وہاں بیٹھ کر وہ محمود سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کسی نادیدہ قوت نے اسے درست راستے کی طرف لگا دیا ہے۔ اس کا پہلا قدم صحیح راستے پر اٹھ گیا ہے۔

ایک تو یہ نام اللہ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ اسے نیا نہیں لگا۔ ایسا تھا جیسے وہ پہلے سے اس کے اندر موجود رہا ہو۔ بلکہ اب تو اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس مہان ہستی کو اسی نام سے پکارے گا، اسی نام سے سوچے گا۔

محمود سے گفتگو کر کے اس کی ایک بڑی خلش دور ہو گئی۔ شرک کے مفہوم کو بہت گہرائی میں تو نہیں، لیکن ایک اہم پہلو اور زاویے سے اس نے سمجھ لیا۔ وہ تو خود سوچتا تھا کہ اللہ کا کوئی بیٹا، کوئی رشتے دار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے اندر موجود کوئی کہتا تھا کہ اس جیسا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ورنہ بیٹا کسی حد تک تو باپ جیسا ہوتا ہے۔ محمود نے بتایا کہ اللہ واحد اور احد ہے۔ اب اتنی عربی تو وہ سمجھتا تھا کہ واحد ہونا اس بات کی ضمانت نہیں کہ جسے واحد کہا جا رہا ہے، اس جیسا کہیں کوئی اور نہیں ہے۔ لیکن احد ہونا اس بات کا ضامن ہے۔

دوسری بات جو اس کی سمجھ میں آئی، وہ پاکی اور ناپاکی کے حوالے سے تھی۔ محمود نے بتایا تھا کہ کلمۂ طیبہ ہر ناپاکی کو دور کرتا ہے، خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی۔ یہ بات بھی اوتار سنگھ کی سمجھ میں اپنے اندر سے آتی تھی۔ اپنے باطن میں وہ ایسے کسی کلمے کی ضرورت پہلے سے محسوس کرتا تھا۔ رفع حاجت کے بعد صابن سے خوب رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھونے کے بعد بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔

اسے گندگی کا احساس ستاتا رہتا تھا۔ یہ کلمہ اسے کیا ملا، بہت بڑا خزانہ مل گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اب اپنے ہاتھ کیا، پورے جسم کو اس کلمے کی برکت سے پاک کیا کرے گا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ آدمی کے اندر اس کی بے خبری میں بھی تو ناپاکی ہوسکتی ہے۔ یہ کلمہ تو اس ناپاکی کو بھی دور کردے گا۔

البتہ آسمانی کتابوں کے بارے میں وہ الجھن میں تھا۔ وحی کا تصور تو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ بلکہ وحی پر اسے سنتے ہی یقین آ گیا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ پہلے کون سی کتاب پڑھے۔ محمود نے قرآن کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بات نہیں کی تھی۔ ہاں اس نے ایک بہت اہم بات کہی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ پیغمبر حضرت محمد ﷺ روئے زمین پر آنے والے اللہ کے آخری پیغمبر ہیں اور قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے۔ کیونکہ دین مکمل کردیا گیا ہے۔ اس بات کی اہمیت وہ نہیں سمجھ پارہا تھا۔ بہرحال اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ کسی بھی کتاب کا آخری ایڈیشن ہی مکمل ترین ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے ایڈیشنز میں رہ گیا ہوتا ہے، وہ آخری ایڈیشن میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسے قرآن ہی پڑھنا چاہیے تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اسے ڈر لگنے لگا۔ جس نے زمین آسمان، چاند، سورج، ستارے بنائے ہیں۔ نباتات اگائی ہیں۔ پورا نظام قائم کیا ہے۔ اس کا کلام کیسا ہوگا! یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی کی رہنمائی کے بغیر اسے پڑھ سکے۔ اور اللہ پاک ہے تو اس کا کلام بھی پاک ہوگا۔ اسے پڑھنے کے لیے ناپاکی دور کرنے کے علاوہ بھی کچھ شرائط ہوں گی۔ کون جانے، وہ ان شرائط پر پورا اترتا بھی ہے یا نہیں۔ اس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ اس کا جسم بری طرح لرزنے لگا۔ اور اس خوف سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ خوف بے سبب نہیں۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے ہے اور تنبیہ ہے کہ وہ بغیر اہلیت حاصل کیے اس کا کلام پڑھنے کی کوشش نہ کرے۔

اس لمحے اوتار سنگھ نے فیصلہ کرلیا کہ ابھی وہ قرآن نہیں پڑھے گا۔ حالانکہ یہ ناممکن نہیں تھا۔ وہ قرآن حاصل بھی کرسکتا تھا اور پڑھ بھی سکتا تھا۔ لیکن اس کے اندر سے اشارہ موصول ہورہا تھا کہ ابھی اسے اس کی اجازت نہیں۔ ہاں ابھی وہ کلمۂ طیبہ سے استفادہ کرکے خود کو پاک کرنے کی پیہم کوشش کرتا رہے گا۔

ان فیصلوں کے بعد اس کے اندر ایسی طمانیت اُبھری، جو اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھی۔ اس کے نزدیک وہ بھی ایک اشارہ تھا۔ اللہ اس کے فیصلوں کی تائید کررہا تھا...... اسے بتارہا تھا کہ اس نے درست فیصلے کیے ہیں۔

''مالک...... چھوٹے ٹھاکر!'' رنجنا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''کیا بات ہے رنجنا؟''

''رات ہوگئی ہے مالک۔ بھوجن کرلیں۔''

اس لمحے اوتار سنگھ کو شدت سے وصال دین یاد آیا۔ جس روز وہ نیچے والی کی آواز سن کر بے خود ہوا تھا، وصال دین نے ہی آ کر اسے چونکایا تھا۔ وہ اداس ہوگیا۔ آج وصال دین اس کے ساتھ نہیں ہے۔ ''چلو...... میں آتا ہوں۔''

رنجنا چلی گئی۔ وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ زینے سے اترتے ہوئے اسے محمود کی ایک اور بات یاد آئی۔ محمود نے کہا تھا کہ اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو کسی عالم سے بات کرو۔ مولوی صاحب یقیناً عالم ہیں۔ اس نے سوچا۔ اب میں ان سے معلومات حاصل کروں گا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اوپر کچھ اور فیصلہ ہوچکا ہے۔ اب وہ مولوی برکت علی کی آواز کبھی نہیں سن سکے گا!

❁......❁......❁

کانتی پرشاد جی کھانا کھا کر اُٹھ گئے۔ اوتار سنگھ نے رنجنا سے پوچھا۔ ''دوپہر والا کھانا بچا ہے؟''

''جی مالک...... لاؤں؟''

''ہاں لاؤ۔''

رنجنا شامی کباب اور کوفتے لے آئی۔ ''میٹھا بعد میں دوں گی چھوٹے ٹھاکر۔''

اوتار سنگھ کو وہ کھانا اب بھی اچھا لگ رہا تھا۔ ''کیسا لگا چھوٹے ٹھاکر؟'' رنجنا نے اس سے پوچھا۔

''بہت اچھا...... بہت مزے دار۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''ان کا میری طرف سے شکریہ ادا کردینا۔''

''موسی بول رہی تھیں، یہ تو تم لوگوں کا حق ہے۔ تم ہمارے مہمان بھی ہو اور پڑوسی بھی۔''

''بڑی محنت کی ہوگی بوانے۔''

''بوانے؟ ہر چیز حور بانو نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی چھوٹے ٹھاکر۔''

''حور بانو کون ہے؟''

''سب سے بڑی بہن۔''

اب اوتار سنگھ اس سے زیادہ کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ تین بہنیں ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جس آواز سے اسے محبت ہوئی ہے، وہ کس کی تھی۔

اور کچھ ہوا نہ ہوا، اسے سوچنے کے لیے بہت کچھ مل گیا...... اور وہ بھی خوش امیدی ابھارنے والا۔ رنجنا اسے بتاتی تھی کہ نیچے کھانا پکانا بوا کی ذمے داری ہے یا گھر کی مالکن کی۔ لڑکیاں کھانا پکانے میں دلچسپی نہیں لیتیں۔ اس اعتبار سے یہ غیر معمولی بات تھی کہ اس کی طرف سے فرمائش ہونے پر ایک ایسی لڑکی، جسے کھانا پکانے میں کوئی دلچسپی نہ ہو، اکیلی اتنی محنت کرے اور کئی طرح کے کھانے تیار کرے۔ اس کا کیا سبب ہوسکتا ہے؟ یہ کہ وہ اس میں دلچسپی لیتی ہو؟ اس سے

محبت کرنے لگی ہو؟

اوتار سنگھ نے خود کو ٹوکا۔ یہ خیال خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسی کوئی وجہ سامنے نہیں ہے کہ نیچے رہنے والی کسی لڑکی کو اس سے محبت ہو جائے۔ نہ اس نے ان میں سے کسی کو دیکھا ہے۔ نہ ان میں سے کسی نے اسے دیکھا ہے۔

لیکن بنیادی طور پر اوتار سنگھ کا محبت کا تصور حقیقی بالکل نہیں تھا۔ بلکہ یکسر افسانوی تھا۔ خوش فہمی والی تنبیہہ اس کے حلق سے کیسے اُتر سکتی تھی۔ اسے خود بھی تو ایسے ہی..... نا قابل یقین انداز میں محبت ہوئی تھی..... صرف آواز سن کر۔ اسے جس سے محبت تھی، اس نے آج تک اسے دیکھا نہیں تھا۔ تو ایسی محبت کسی اور کو بھی اس سے ہو سکتی ہے۔

اور اوتار سنگھ محبت کو آسمانی جذبہ سمجھتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ اوپر والا خود کسی کے دل میں کسی کی محبت ڈالتا ہے۔ یہ ایسی دلیل تھی، جس کا خوش فہمی کی تنبیہہ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

چنانچہ اوتار سنگھ نے اس گمان کو قبول کر لیا۔ اس کے نتیجے میں پہلی بار اسے ایسی سرشاری ملی، جس نے اسے بے خود کر دیا۔ سرشار تو وہ اپنی یک طرفہ محبت میں بھی تھا۔ مگر دو طرفہ محبت کے تصور کا تو لطف ہی اور تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ امتحانوں کی فکر رہی نہ پڑھائی کی لگن۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ سارا سال پوری لگن کے ساتھ محنت کرنے والا تھا۔ اس لیے نقصان کا احتمال نہیں تھا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ۔ مگر پاکی کا تصور اس کے ذہن پر چھا چکا تھا۔ رفع حاجت کا تو معاملہ ہی اور تھا۔ اس میں تو ہاتھ پاک کرنا لازم تھا۔ وہ تو عام حالات میں بھی ہاتھ دھوتا تو کلمہ طیبہ پڑھتا۔ منہ دھوتا تو بھی کلمہ پڑھتا۔ نہاتا تو بھی کلمہ پڑھتا اور کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے اسے خیال آتا کہ اسے تو معلوم ہی نہیں کہ اس کے وجود کی کون سی کوٹھری میں، کون سے گوشے میں ناپاکی گھسی ہوئی ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ دل کی گہرائیوں سے کلمۂ طیبہ مسلسل پڑھنا شروع کر دیتا۔ پڑھتا ہی چلا جاتا۔ یہاں تک کہ اسے احساس ہونے لگتا کہ وہ بہت ہلکا پھلکا اور اندر سے بہت صاف ستھرا ہو گیا ہے۔

اور دن میں کئی بار وہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر پکارتا۔ ''اے اللہ، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنا راستہ دکھایا۔ اپنی طرف بلایا۔ اے اللہ، اب مجھے چھوڑ نہ دینا۔ مجھے سیدھا راستہ دکھاتے رہنا۔ گمراہ نہ ہونے دینا مجھے۔''

پہلے وہ ایک اَن دیکھی ہستی کو بغیر اس کا نام جانے پکارتا تھا۔ مگر اب یہ نام اللہ اس کے وجود کی، دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا..... اسے بھا گیا تھا۔ اب وہ اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔

❀.....❀.....❀

کتابِ سوم

نصف النہار

امتحان شروع ہو گئے۔ ایک دن پرچا ختم ہونے کے بعد اوتار سنگھ اور ارجن ایک ساتھ باہر آئے۔ ارجن اوتار سنگھ کا کلاس فیلو تھا اور جے پور میں رہتا تھا۔ اوتار سنگھ کی اس سے اچھی خاصی علیک سلیک تھی۔

''امتحان کے بعد کیا ارادہ ہے؟'' ارجن نے پوچھا۔

''گاؤں چلا جاؤں گا۔''

''تو میرے ساتھ جے پور ہوتے ہوئے جاؤ۔''

اوتار سنگھ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیوں......کوئی خاص بات ہے؟''

''بڑا میلہ شروع ہونے والا ہے نا۔''

اوتار سنگھ کو یاد آیا۔ کیدو چاچا پچھلے سال اسے میلے میں لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ اس وقت اس کا جی چاہنے لگا۔ کیوں نہ وہ میلہ دیکھ کر گاؤں جائے۔ ماسٹر جی کو رگھو اور رنجنا کے ساتھ گاؤں بھیج دیا جائے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اوتار سنگھ اب پوری آزادی اور خود مختاری کے ساتھ نقل و حرکت کرنا چاہتا تھا۔ یہ کیا کہ وہ بچوں کی طرح ہو کہ وہ اکیلے گاؤں بھی نہیں جا سکتے۔

پھر اسے ایک خیال اور آ گیا۔ تاج محل کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا اس نے اور اسے تاج محل دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ تاج محل، جسے دنیا میں محبت کی سب سے بڑی نشانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے سوچا، کالج میں پہنچنے کے بعد آدمی کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے ثبوت کے طور پر اور اپنا اعتماد بڑھانے کے لیے وہ اکیلا میلہ دیکھنے جے پور جا سکتا ہے۔ تو لگے ہاتھوں تاج محل کیوں نہ دیکھ لے۔

''تمھارے جے پور سے آگرہ کتنی دور ہے؟'' اس نے ارجن سے پوچھا۔

''تھوڑی ہی دور ہے۔ بلکہ بہت قریب کہو۔'' ارجن نے جواب دیا۔ پھر وہ مسکرایا۔

''تاج محل دیکھنے کا ارادہ ہے؟''

''ہاں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ جے پور سے آگرہ چلے جانا۔''

اوتار سنگھ نے اپنے دل میں یہ پروگرام طے کر لیا۔
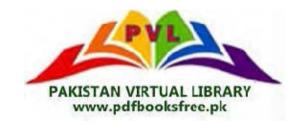
لیکن آخری پرچے سے دو دن پہلے ماسٹر جی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ انھیں بہت تیز بخار تھا اور الٹیاں بھی لگ گئی تھیں۔ اوتار سنگھ انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

''بخار ایک دم نہیں اترے گا۔ وقت لگے گا۔'' ڈاکٹر نے ماسٹر جی کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ ''دوا میں دے رہا ہوں۔ کمزوری بہت ہو جائے گی۔ انھیں کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

اوتار سنگھ ماسٹر جی اور رگھو کو اپنے پروگرام کے متعلق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ لیکن اب ماسٹر جی کو اس حال میں چھوڑ کر جانے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔

''تم اپنا پروگرام خراب مت کرو۔'' ماسٹر جی نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کوئی بڑی پریشانی کی بات نہیں۔ طبیعت سنبھلے گی تو میں رگھو کے ساتھ گاؤں آ جاؤں گا۔ ویسے بھی تو مجھے ان کے ساتھ ہی آنا تھا۔''

''لیکن ماسٹر جی، آپ کو اس حال میں......''

ماسٹر جی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میرا خیال رکھنے کو رگھو اور رنجنا یہاں ہیں نا۔''

''ہاں چھوٹے مالک، آپ چنتا نہ کرو۔'' رگھو بولا۔

مگر استاد کا معاملہ تھا۔ اوتار سنگھ کا دل نہیں مانتا تھا۔ ماسٹر جی اور رگھو کے پیہم اصرار پر وہ جانے کے لیے راضی تو ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے اس نے ڈاکٹر سے تفصیلی بات کی۔ اس سے ماسٹر جی کے ٹھیک ہونے تک ہر روز گھر پر آ کر انھیں دیکھنے کا وعدہ لیا اور پیشگی فیس ادا کر دی۔ پھر اس نے ماسٹر جی کو بھی کچھ رقم دی اور رگھو کو بھی۔ اس کے باوجود اسے یہ احساس ستا رہا تھا کہ وہ کڑے وقت میں انھیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہے۔

بہرحال اب وہ جے پور جانے کے لیے تیار تھا!

❀......❀......❀

سہ پہر کے وقت وہ جے پور پہنچ گئے۔ ارجن اوتار سنگھ سے اپنے گھر چلنے پر اصرار کر رہا تھا۔ لیکن اوتار سنگھ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

''پھر کبھی کچھ دن کے لیے آؤں گا تو تمھارے ہاں رکوں گا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''تو آج کہاں قیام کرو گے؟''

''کیوں، تمھارے شہر میں ہوٹل نہیں ہیں؟'' اوتار سنگھ نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

''کیوں نہیں۔ ہر طرح کے ہوٹل ہیں۔ آؤ، تمھیں لے چلوں۔''

اوتار سنگھ کے لیے ہوٹل کی کوالٹی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسے تو بس رات گزارنی تھی......اور رات کیا، رات کے بھی صرف چند گھنٹے۔ صبح ہی اس کا ارادہ آگرہ کے لیے نکلنے کا تھا۔

ارجن اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں اس نے کمرا لیا۔ ارجن دو گھنٹے بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اوتار سنگھ نہانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے سامان رکھتے ہی کپڑے نکالے اور باتھ روم میں گھس گیا۔

نہاتے ہی اسے بھوک لگنے لگی۔ حالانکہ دوپہر کا کھانا وہ کھا چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ کمرے میں ہی چائے کے ساتھ بسکٹ منگوا لے۔ لیکن اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ ارجن کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ وہ اس وقت سے استفادہ کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا، کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومے پھرے گا۔ راستے میں ہی کہیں بھوک کا سامان بھی ہو جائے گا۔

یہ سوچ کر وہ ہوٹل سے نکل آیا۔

جے پور اسے پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا...... بہت اپنا اپنا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صحراؤں کا پروردہ تھا اور جے پور صحرائی شہر تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی وہاں کی گرمی نے اسے گاؤں کی یاد دلائی تھی۔ گلابی شہر (Pink City) کہلانے والے اس شہر کو ایک نظر دیکھ کر ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ یہ ثقافت سے چھلکتا ہوا شہر ہے......رنگین ثقافت کا نمائندہ شہر!

چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اس نے چائے کے ساتھ بسکٹ کھائے۔ پھر سب سے پہلے اس نے پوچھ پوچھ کر بس کے اڈے کا رخ کیا۔ وہاں سے اسے پتا چلا کہ آگرہ جانے والی پہلی بس صبح چھ بجے روانہ ہوتی ہے۔ وہ اس کے لیے بہت مناسب تھی۔ آگرہ میں اسے کافی وقت گزارنے کا موقع مل جاتا۔

وہاں سے وہ بازار آیا اور وہاں گھومتا پھرا۔ بازار بارونق تھا۔ دکانیں آراستہ بھی تھیں اور ہر طرح کے مال سے بھری ہوئی بھی۔ کپڑے کی دکانیں دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ دہلی سے تو وہ کچھ نہیں لے سکا تھا۔ لیکن یہاں اس نے سوچ لیا کہ وہ پتا جی، اماں، چاچا جی اور ویر جی کے لیے کچھ خریدے گا۔ مگر ابھی وہ کچھ خریدنے کے ارادے سے نہیں نکلا تھا۔ اس نے سوچا، خریداری رات کو کر لے گا۔

وہاں مورتیوں کی ایک بہت بڑی دکان بھی تھی۔ بھگوان، ہنومان، کالی ماتا، سرسوتی......سبھی کی مورتیاں وہاں موجود تھیں......اور ہر سائز میں بعض بت تو بہت بڑے بڑے بھی تھے۔ وہ یونہی تفریحاً دکان میں چلا گیا۔ اس نے مختلف مورتیوں کی قیمت معلوم کی۔ خریدنا تو اسے کچھ تھا نہیں۔ وہ دل میں اس مضحکہ خیز تصور پر سوچ رہا تھا اور ہنس رہا تھا کہ بھگوان بھی بازار میں بکتا ہے اور دوسرے خدا بھی۔ جو چاہے خرید لے۔ وہ بھگوان، وہ دیوتا، جن سے جاہل لوگ پرارتھنا کرتے ہیں، اپنی منوکامنائیں جن سے مانگتے ہیں، وہ تو خود کو بکنے کی حقارت اور ذلت سے بھی نہیں بچا سکتے۔ کیا اس میں کوئی قدرت ہو سکتی ہے، جو خود کو بکنے سے بھی نہیں بچا سکے۔ یہ تو بھگوان کی توہین ہے کہ وہ چند سکوں میں بک جاتا ہے۔

دکان سے نکل کر اوتار سنگھ دل ہی دل میں کلمۂ طیبہ پڑھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ مورتیوں کی دکان میں جا کر شاید وہ ناپاک ہو گیا ہوگا۔ اس لمحے اس کے دل میں عجب سا جذبہ پیدا ہوا...... اللہ کے لیے محبت کا جذبہ۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اللہ کے لیے کچھ ایسا کرے، جس سے اللہ خوش ہو...... بہت خوش۔ اس کے ذہن میں موہوم سا خیال تھا کہ وہ ایسا کچھ کر سکتا ہے۔ کیا؟ یہ وہ فی الحال نہیں جانتا تھا۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ کوشش کرے گا تو وہ آسانی سے جان بھی جائے گا۔ وہ ہوٹل پہنچا تو ارجن اس کا انتظار کر رہا تھا!

❀......❀......❀

اس سے پہلے اوتار سنگھ نے صرف اپنے گاؤں کا میلہ دیکھا تھا۔ درحقیقت وہ ٹھاکروں کی گڑھی کا میلہ نہیں تھا۔ بلکہ اردگرد کے تین اور گاؤں بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔ لیکن جے پور کا میلہ دیکھ کر اوتار سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اتنے بڑے میلے کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

وہاں ہر طرح کی تفریحات تھیں۔ کھیل تماشے تھے۔ سرکس بھی تھا۔ کرتب بھی دکھائے جا رہے تھے۔ جسمانی مقابلے بھی ہو رہے تھے۔ اونٹوں کی دوڑ ہونے والی تھی۔ کبڈی اور کشتی کے مقابلے دیکھنے والوں کا بڑا ہجوم تھا۔

دوسری طرف میلے میں بازار سے بھی بڑا بازار لگا تھا۔ وہاں بلاشبہ سینکڑوں اسٹال تھے۔ ہر چیز کا اسٹال تھا۔ کہیں کپڑا بک رہا تھا تو کہیں عورتیں چوڑیاں پہن رہی تھیں اور زیورات دیکھ رہی تھیں۔ وہاں کئی جوتشی بھی تھے۔ ایک بوڑھی عورت تھی، جو لوگوں کا ہاتھ دیکھ کر ان کی قسمت کا حال بتا رہی تھی۔

عورتوں کی دلچسپی یا تو خریداری میں تھی یا جھولوں میں۔ لیکن جھولوں کے پاس بچوں کا ہجوم سب سے زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزوں کے اسٹالز پر سب سے زیادہ رش تھا۔

اوتار سنگھ اس رونق میں ارجن کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ لیکن وہ بہت کھویا کھویا تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا، جو اسے اِدھر اُدھر توجہ نہیں کرنے دے رہا تھا۔ یہ کہ اسے کچھ کرنا ہے...... اللہ کو خوش کرنے کے لیے...... اس سے اظہارِ محبت کے لیے! بس وہ یہ سوچے جا رہا تھا کہ کیا کرے۔

بس ایک چیز ایسی تھی، جس پر وہ توجہ دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اور وہ تھا لٹھیا بازی کا مقابلہ۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ لٹھیا بازی میں اسے خود کمال حاصل تھا۔ چاچا جمال دین نے یہ ہنر اسے اور ویر جی کو سکھایا تھا۔ وہ اس فن میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اور ان کا کہنا تھا کہ وہ دونوں بہت اچھے شاگرد ہیں اور ان کے اندر اس فن کی قدرتی صلاحیت ہے۔ ان دونوں کو کارکردگی دکھانے کا ایک موقع مل چکا تھا، جب انھوں نے اپنے اوپر حملہ کرنے والوں کو نہ صرف مار بھگایا تھا۔ بلکہ انھیں زخمی کر کے اٹھنے کے قابل [illegible] چھوڑا تھا۔ اس موقعے پر ا[illegible] ثابت ہو گئی تھی۔

اس نے لٹھیا بازی کا مقابلہ ہوتے دیکھا تو مسحور ہو کر رہ گیا۔ وہ جس طرح داد دے رہا تھا اور تنقید کر رہا تھا، اس نے ارجن کو چونکا دیا۔ ''لگتا ہے، تم لٹھیا بازی جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''بس یونہی تھوڑی سی شدبد ہے۔'' اوتار سنگھ نے بے دھیانی میں کہا۔

''تمھارے تبصروں سے تو لگتا ہے کہ تم اس کی فنی باریکیوں سے بھی واقف ہو۔'' ارجن بولا۔

''میں نے کہا نا، تھوڑا بہت سیکھا ہے میں نے۔''

''کہاں...... کس سے سیکھا؟''

''گاؤں میں...... چاچا جمال دین سے۔''

''تو تم مقابلے میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟''

سچ تو یہ ہے کہ مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اوتار سنگھ کا دل مچل رہا تھا۔ اب تک جو اس نے دیکھا تھا، وہ لٹھیا بازی کا کوئی اچھا معیار نہیں تھا۔ اپنی فطری انکساری کے باوجود وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہاں اس کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے۔

لیکن دل کے مچلنے کے باوجود اس کا میدان میں اترنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ نمایاں ہونا اسے یوں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر یہاں جے پور میں اسے لگ رہا تھا کہ اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ نمایاں نہ ہو۔ وجہ اسے معلوم نہیں تھی۔

''نہیں...... میں اتنا اچھا بھی نہیں ہوں۔'' اس نے منکسرانہ لہجے میں کہا۔

ارجن کو مایوسی ہوئی۔

وہ میلے میں گھومتے پھرے۔ اوتار سنگھ نے خریداری وہیں سے کر لی۔ اس نے پتا جی اور چاچا جمال دین کے لیے پگڑی خریدی۔ ماں کے لیے چادر...... اور ویر جی کے لیے کپڑے اور ایک قلم۔

آخر اوتار سنگھ نے میلے سے واپسی کا ارادہ کیا۔ ارجن کو اس سے اختلاف تھا۔ ''ابھی تو بہت وقت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی تو رونق اور بڑھے گی۔''

''میں کل صبح چھ بجے والی گاڑی سے آگرہ جانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے ساڑھے چار، پانچ بجے اٹھنا ہوگا۔'' اوتار سنگھ نے معذرت کی۔

اسی وقت ارجن کے چند دوست اسے مل گئے۔ ''تم واپس جا رہے ہو...... ابھی سے!'' ان میں سے ایک نے کہا۔

ارجن نے اوتار سنگھ کو ان سے متعارف کرایا۔ وہ لوگ ارجن کو روک رہے تھے۔ لیکن ارجن اوتار سنگھ کو اکیلا چھوڑنے کو بداخلاقی سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ وہ انکار کر رہا تھا۔

"تم رک جاؤ نا۔ میں تو ہوٹل جا کر سو جاؤں گا۔" اوتار سنگھ نے اسے سمجھایا۔ "تم اپنی تفریح کیوں خراب کرتے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں۔ جلدی سو جاؤں گا اور میلہ تو کل بھی رہے گا۔" ارجن نے کہا۔

لیکن اوتار سنگھ اصرار کرتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ارجن مروت میں اس کی وجہ سے اپنی تفریح خراب کرے۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ ارجن کے دوستوں کو کئی مہینوں کے بعد اس سے ملاقات کا موقع ملا ہے اور وہ ان کے بیچ دیوار بن رہا ہے۔

آخر اوتار سنگھ نے ارجن کو قائل کر لیا۔ دونوں گلے ملے۔ ارجن نے وعدہ لیا کہ اگلی بار وہ چند روز کے لیے آئے گا اور اس کے گھر مہمان ہوگا۔ پھر اوتار سنگھ ارجن کو میلے میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

اب اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا...... وہی اللہ کے لیے کچھ کرنے کا خیال۔

اور وہ خیال اس کے لیے بہت بے چین کر دینے والا تھا۔ کیونکہ اسے اس سلسلے میں کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سڑک پر چلتے چلتے وہ ایک بڑے مندر کے سامنے رک گیا۔ چند لمحے کھڑا وہ دیکھتا رہا۔ پھر مندر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن مندر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے قدم ہچکچا رہے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ وہاں کیوں جا رہا ہے۔ پوجا کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اس کے اندر جانے کی وجہ عقیدت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس جذبے سے تو وہ برسوں پہلے جان چھڑا چکا تھا۔

اس نے بے اختیار زیرِ لب کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مندر میں گھسنے کے بعد اسے باطنی طور پر ناپاکی کا احساس ہو رہا تھا۔ اور اسے دور کرنے کی ایک بے حد موثر ترکیب اس کے پاس تھی۔

اندر جا کر اس نے جائزہ لیا۔ مندر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سامنے بھگوان کا ایک بہت بڑا بت تھا۔ سائیڈ والی دیوار کے ساتھ دیگر کئی دیوتاؤں کے نسبتاً چھوٹے بت رکھے تھے۔ بھگوان کے بڑے بت کے پہلو میں ایک دروازہ تھا، جو یقیناً مندر کے اندرونی حصے کی طرف کھلتا تھا۔ اس طرف پجاری اور اس کے چیلوں کے کمرے ہوں گے۔

بڑے بت کو دیکھتے ہوئے اس کے اندر شدید ناپسندیدگی اُبھری۔ ان چند لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی بے چینی دور ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اللہ سے اظہارِ محبت کے لیے، اسے خوش کرنے کے لیے وہ کیا کر سکتا ہے۔ محمود نے بتایا تھا کہ اللہ سب سے زیادہ شرک کو ناپسند کرتا ہے اور اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کرتا اور مندر شرک کا اجتماعی مقام ہے اور بت شرک کا ذریعہ۔ تو اگر وہ یہاں شرک پر وار کرے گا تو اللہ اس عمل کو پسند کرے گا۔

ایک دم ہی وہ پُرجوش ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ یہاں اکیلا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بڑے بت کا جائزہ لیا۔ اسے چھو کر دیکھا۔ اسے تھوڑی سی تشویش ہوئی۔ بت نہ صرف بھاری تھا بلکہ بہت سخت اور مضبوط بھی لگ رہا تھا۔

اب وہ صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔ فی الوقت تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پہلا قدم تو یہ تھا کہ وہ اپنی صبح کی روانگی منسوخ کرے۔ کل کا دن یہاں گزارے، تیاری کرے اور پھر یہاں واپس آئے۔ اپنا کام کرے اور نکل جائے۔

اسے اندازہ تھا کہ وقت بہت مناسب ہے۔ وہ ایسا مندر تھا، جو عام دنوں میں سونا نہیں رہتا ہوگا۔ اس کے سونے پن کا سبب میلہ تھا۔ اور میلہ کل بھی جاری رہے گا۔ مندر میں ہجوم ہوتا تو اس کا کام دشوار ہو جاتا۔

اب اسے بڑی احتیاط سے منصوبہ بنانا تھا۔

ضروریات کیا تھیں؟ کچھ چیزیں تو اسے کل بازار سے خریدنی تھیں۔ اصل چیز مندر میں اس کے لیے سازگار ماحول کا ہونا تھا۔ اس کے لیے اسے کچھ سوچنا اور کرنا تھا کہ مرنے میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو اور وہ سکون سے اپنا کام کر سکے۔ اس کے لیے اس کے ذہن میں ایک منصوبے کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔

بت کے پہلو والا دروازہ کھلا اور پجاری اندر آیا۔ موٹے تازے بڑے پیٹ والے پجاری نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ "آؤ بالک...... پوجا کر لی؟"

اوتار سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا۔

پجاری نے تھالی اٹھائی، اس کے ماتھے پر تلک لگایا اور اسے پرشاد دیا۔

اوتار سنگھ کو کراہت کا احساس ہوا۔ تلک کا تو وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن پرشاد وہ ہرگز نہیں کھاتا اور وہ جلدی جلدی کلمہ پڑھنے لگا تھا۔ اس نے جیب سے کچھ بڑے نوٹ نکالے اور پجاری کی طرف بڑھا دیے۔

پجاری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ تاہم اس نے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔ "یہ کس لیے مالک؟"

"آپ کے لیے۔" اوتار سنگھ نے کہا۔ "میں بہت دور سے آیا ہوں۔ پنڈت جی۔ میں نے آپ کو سپنے میں دیکھا تھا۔"

پنڈت کی باچھیں کھل گئیں۔ لڑکا اسے کوئی بڑی آسامی لگ رہا تھا۔ "کیا دیکھا تھا بالک؟" اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے سپنے میں اپنی سورگ باشی ماتا جی کو دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھیں...... جے پور جاؤ۔ وہاں کے بڑے مندر کے پجاری کو بھینٹ دو۔ اور اس سے گیتا کا پاٹھ سنو مگر اکیلے۔

میں ......

"تم نے کہا تھا بالک کہ تم نے مجھے سپنے میں دیکھا تھا؟"

"جی مہاراج۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں مندر کے اندر کسی کمرے میں ہوں۔ شاید آپ کا کمرا ہے۔ وہاں میں آپ کے کچھ چیلوں کے ساتھ بیٹھا ہوا آپ سے گیتا کا پاٹھ سن رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ اور آپ کے چیلے میری لائی ہوئی مٹھائی کھا رہے ہیں۔ پھر میں آپ کو ماتا جی کے کہنے کے مطابق پانچ سو روپے دے رہا ہوں۔ بس اتنا ہی دیکھا تھا میں نے۔"

پنڈت تو نہال ہو گیا۔ دو سو روپے اسے پہلے ہی مل چکے تھے اور پانچ سو روپے ملنے کا امکان سامنے تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم بہت بھاگیہ وان ہو بالک۔ تمہارا سپنا اوش سچا ہے۔ تم نے مجھے سپنے میں ایسا ہی دیکھا تھا۔"

"جی وہ آپ ہی تھے مہاراج۔ پرنتو آپ کا کمرا......" اوتار سنگھ کے لہجے میں ہلکا سا شک تھا۔

اب وہ شک دُور کرنا پجاری کی ذمے داری تھی۔ پانچ سو روپے کا سوال تھا۔ "چلو...... میں تمھیں اپنا کمرا دکھاتا ہوں۔"

"یہ مندر کا دروازہ کھلا رہتا ہے؟"

"یہ بھگوان کا گھر ہے بالک۔ یہاں بری نیت سے کوئی نہیں آ سکتا۔ پجاری نے بڑے یقین سے کہا۔

اوتار سنگھ دل ہی دل میں ہنسا۔ بھگوان اس کی نیت سے بے خبر تھا۔ دل کا حال تو صرف اللہ جانتا ہے۔

"دروازہ ہم رات گیارہ بجے بند کرتے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

پجاری اسے اندر لے گیا۔ وہاں ایک بڑا احاطہ تھا، جس کے دو اطراف کمرے بنے ہوئے تھے۔ تیسری سمت ایک اور دروازہ تھا۔ وہ شاید مندر میں رہنے والوں کے لیے باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ اوتار سنگھ کو سارے کام آسان ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

پجاری کا کمرا دوسرے کمروں سے بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ اس میں پچاس سے زیادہ افراد آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔

"تم نے سپنے میں یہی کمرا دیکھا تھا نا بالک؟" پجاری کے لہجے میں اصرار تھا۔

"لگتا تو یہی ہے۔"

"اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔" پنڈت نے زور دے کر کہا۔

"آپ کے چیلے کتنے ہیں؟"

"نو ہیں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ میں نے چیلے زیادہ دیکھے تھے۔" اوتار سنگھ کوئی کمی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

"لگتا ہے نا۔ پرنتو دیکھے نو ہی ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے۔" اوتار سنگھ نے بے دلی سے کہا۔ پھر بولا۔ "مگر یہاں کمرے تو زیادہ ہیں۔"

"تو چھ دیوداسیاں بھی ہیں نا بالک۔" پجاری نے جلدی سے کہا۔

اوتار سنگھ کو غلطی کا احساس ہو گیا۔ اب اسے نبھانا تھا۔ "ارے ہاں مہاراج، میں نے سپنے میں چھ دیوداسیاں بھی دیکھی تھیں۔ وہ بھی گیتا کا پاٹھ سن رہی تھیں اور انھوں نے بھی میرے ہاتھ سے پرشاد کھایا تھا۔"

"اوش دیکھا ہوگا۔ سچے سپنے میں بھول تو ہو سکتی ہے۔ پرنتو کوئی کمی نہیں رہتی۔" پانچ سو روپے کے لیے پجاری سب کچھ قبول کر سکتا تھا۔

"جی مہاراج۔"

"میں اپنے چیلوں اور داسیوں کو بلاتا ہوں۔ پھر پاٹھ سناؤں گا۔"

اوتار سنگھ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ ابھی تو اسے بہت تیاری کرنا تھی۔ "آج نہیں مہاراج، یہ کام کل کریں گے۔"

پنڈت بے صبرا ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "کیوں بالک۔ آج کا دن تو شبھ ہے۔"

"میں نے سپنے میں گروار کا دن دیکھا تھا اور رات گیارہ بجے کے بعد کا وقت۔" اوتار سنگھ نے کہا۔ "اور سپنا سچا ہے تو سب کچھ ویسے ہی ہوگا، جیسے میں نے سپنے میں دیکھا تھا۔ آپ، چیلے اور دیوداسیاں میرے ہاتھ سے مٹھائی بھی کھائیں گی۔ پھر میں آپ کو بھینٹ دوں گا۔"

"اوش ویسا ہی ہوگا بالک۔"

"اور میں نے سپنے میں مندر کا دروازہ بھی بند دیکھا تھا۔"

وہ تو گیارہ بجے کے بعد بند ہوتا ہی ہے۔"

"تو میں کل گیارہ بجے آؤں گا مہاراج۔"

"میں انتظار کروں گا بالک۔"

اوتار سنگھ مندر سے نکلا تو اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اس کی بے چینی دور ہو چکی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ وہ ہوٹل گیا اور نہا دھو کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن سونے سے پہلے بہت دیر تک وہ اپنے منصوبے کی نوک پلک درست کرتا رہا۔ یہ سوچتا رہا کہ کل اسے کیا کیا کرنا ہے۔

سوتے وقت وہ مطمئن تھا کہ اس نے کبھی کوئی جھول نہیں چھوڑا ہے۔ البتہ اگلا دن بڑی مصروفیت کا تھا۔

❀……❀……❀

اگلی صبح سب سے پہلے اوتار سنگھ ایک مٹھائی کی دکان پر گیا۔ ''مجھے پانچ سیر لڈو بنوانے ہیں۔'' اس نے حلوائی سے کہا۔

''دو روپے سیر ہوں گے۔'' حلوائی نے کہا۔

''پیسوں کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ لڈو ایسے ہوں کہ کوئی کھائے تو اس کا ہاتھ ہی نہ رکے۔''

حلوائی نے اسے غور سے دیکھا۔ ''پھر قیمت بڑھ جائے گی، تین روپے سیر دوں گا۔ لڈو ایسا ہو گا کہ آدمی کھائے تو کھاتا ہی چلا جائے۔''

''مجھے منظور ہے۔ مگر ایک بات اور ہے۔'' اوتار سنگھ نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''بولو مہاراج۔''

''اصل میں ہم کچھ دوست ہیں کالج کے۔ ساتھ ہی یہاں آئے ہیں میلہ دیکھنے۔ میں ان کے ساتھ شرارت کرنا چاہتا ہوں...... یونہی مذاق میں۔''

''میں سمجھ گیا۔ لڈوؤں میں بھنگ ملا دوں؟'' حلوائی مسکرایا۔

''نہیں۔ یہ تو پرانا ہو چکا۔'' اوتار سنگھ بولا۔ ''میں تمھیں منہ مانگی قیمت دوں گا۔ لڈوؤں میں بے ہوشی کی دوا ملانی ہو گی۔ تیز اثر کرنے والی...... ایسی کہ رات کو آدمی کھائے تو پھر دوپہر کو ہی اٹھے۔''

حلوائی نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے بابو جی؟''

''ارے نہیں۔ بتایا نا، میرے کالج کے دوست ہیں۔ پچھلی بار میں ان کے مذاق کا نشانہ بنا تھا۔''

حلوائی چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ لیکن دس روپے سیر دوں گا۔''

''منظور ہے۔''

''کب چاہئیں لڈو؟''

''رات ساڑھے دس بجے۔''

''تیار ملیں گے۔ پرنتو پورے پچاس روپے پیشگی لوں گا۔''

''نہیں۔ آدھے ابھی اور آدھے لڈو لے جانے کے وقت۔''

''نہیں بابو جی۔ میں تو پورے پیسے پیشگی لوں گا۔ دیکھو نا، تمھارا ارادہ بدل گیا تو میرا تو نقصان ہو گا نا۔ وہ لڈو تو میں کسی کو بیچ بھی نہیں سکتا۔''

اوتار سنگھ نے کچھ دیر ہچکچانے کی اداکاری کی۔ حلوائی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اتنا تگڑا گاہک ہاتھ سے نکلے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر لڑکا پھسلنے لگا تو آدھے پیسے ہی پکڑ لے گا۔ وہ نہیں آیا، تب بھی فائدہ ہی ہے۔ دس روپے کے لڈو ہوں گے اور پچیس پہلے

ہی مل رہے ہیں۔

بالآخر اوتار سنگھ نے جیب سے پچاس روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ ''اچھا...... بے ہوشی کی دوا سے لڈو کے ذائقے میں تو فرق نہیں پڑے گا؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بابو جی۔ تم بے فکر رہو۔ کھانے والے کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''بس تو میں ساڑھے دس بجے آؤں گا۔ دکان بند تو نہیں کرتے تم؟''

''میلے کے دنوں میں تو آدھی رات تک دکان کھلی رہتی ہے بابو جی۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔''

اگلا مرحلہ زیادہ مشکل تھا۔ اس کے لیے اوتار سنگھ کو بہت دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ اسے ایک کلہاڑی اور ایک ہتھوڑا خریدنا تھا۔ لیکن اس کے لیے اس کی کچھ شرائط تھیں۔ یہ ضروری تھا کہ دونوں چیزیں سائز میں چھوٹی ہوں۔ تاکہ وہ انھیں اپنے لباس میں بآسانی چھپا کر لے جا سکے۔ ہلکی ہوں تو اور بھی بہتر ہے۔ لیکن کلہاڑی بہت تیز ہو۔ کیونکہ بت بہت بھاری تھا...... اور سخت بھی معلوم ہوتا تھا۔

وہ درجنوں دکانوں میں گیا۔ لیکن موثر ترین کلہاڑی وہ تھی جو بڑی بھی تھی اور بھاری بھی۔ اور اسے تو اس پر بھی شبہ تھا کہ وہ بڑی اور بھاری کلہاڑی بھی اس بت کا کچھ بگاڑ سکے گی۔ دوسرے وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ زیادہ آواز ہو اور لوگ متوجہ ہوں۔ اسے تو بڑی خاموشی سے اپنا کام کر کے نکل آنا تھا۔

بالآخر ایک دکان پر اسے اپنے مطلب کی چیزیں مل گئیں۔ دونوں چیزیں باہر کی تھیں اور دیکھنے میں بے ضرر لگتی تھیں۔ پہلی نظر میں تو وہ بھی دھوکہ کھا گیا۔ ''نہیں بھئی، اس کلہاڑی سے تو لکڑی بھی نہیں پھٹے گی۔'' اس نے دکاندار سے کہا۔

''بابو جی، غور سے دیکھو اس کی دھار۔'' دکاندار بولا۔ ''یہ تو لوہا بھی کاٹ دے گی۔''

اوتار سنگھ نے دھار پر انگلی رکھی ہی تھی کہ سرخ رنگ کی لکیر نمودار ہو گئی۔ کلہاڑی کی دھار بلاشبہ بہت تیز تھی۔ لیکن اہم سوال یہ تھا کہ اس بت کا بھی کچھ بگاڑ سکے گی یا نہیں۔ ''میں ذرا اور دیکھ لوں۔ شاید اس سے بہتر کچھ مل جائے۔'' اس نے کہا۔

''دیکھ لو بابو جی۔ بازار موجود ہے۔ پرنتو اس سے اچھی چیز ملے گی نہیں۔''

اوتار سنگھ نے پورا بازار چھان مارا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ دکاندار کا چیلنج بجا تھا۔ آخر اسے لوٹ کر وہیں جانا پڑا۔

کلہاڑی اور ہتھوڑا خریدنے کے بعد اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ وہ ہوٹل جا کر سکون سے سو گیا۔

شام کو وہ میلے کے لیے تیار ہو کر نکلا۔ اس کی مہم میں تو ابھی کافی وقت پڑا تھا۔

گزشتہ روز کے برعکس اس روز میلے میں اس کا دل لگا اور اس نے خوب تفریح کی۔ وجہ

یہ تھی کہ پچھلے روز وہ ایک الجھن میں تھا جبکہ آج نہ صرف وہ الجھن دور ہو چکی تھی۔ بلکہ وہ خوش تھا کہ آج کچھ کرنے والا ہے...... ایک ایسا کام جو شاید اللہ کو پسند آئے۔

وہ گھومتا پھرا۔ اس نے جسمانی مقابلے دیکھے۔ لیکن ان میں حصہ لینے کے خیال کو اس نے رد کر دیا۔ جو اصل کام وہ کرنے والا تھا، اس کے لیے اس کا یہاں نمایاں ہونا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یہاں کوئی اسے نہیں جانتا تھا۔ بعد میں بات کھلے گی تو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اسے کہاں ڈھونڈیں۔

اسے ڈر تھا کہ کہیں ارجن سے سامنا نہ ہو جائے۔ مگر خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

نو بجے تو وہ میلے سے نکل آیا اور ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اب اسے اصل کام کے لیے تیاری کرنی تھی۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا یہ سوچنا کہ اس شہر میں کوئی اسے جانتا پہچانتا نہیں، کتنا غلط ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ اس شہر میں پہلی بار آیا تھا۔ لیکن اس شہر میں آٹھ افراد ایسے تھے جو نہ صرف یہ کہ اسے جانتے تھے، پہچانتے تھے، بلکہ اس کے لیے جذبات بھی رکھتے تھے۔ یہ اس کے وہ کرم فرما تھے، جو اس کی خاطر گڑھی تک آئے تھے، مہیش پور میں رہے تھے، جنھوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ مگر اپنے زخمی ساتھیوں کو اٹھا کر فرار ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ان میں سے تین افراد اس وقت میلے میں موجود تھے۔ کرتارا، رگھبیر اور ہنس دھر۔ اوتار سنگھ کا ان سے سامنا نہیں ہوا تو محض اس لیے کہ یہ کاتب تقدیر کی اسکیم میں نہیں تھا۔ ورنہ ان تینوں کو بھی دارو کے بعد سب سے زیادہ جسمانی مقابلوں میں دلچسپی تھی۔ جو مقابلے اوتار سنگھ نے بڑی دلچسپی سے دیکھے، انھیں دیکھنے والے تماشائیوں میں وہ تینوں بھی شامل تھے۔ فرق یہ تھا کہ وہ دائرے کے ایک جانب تھے اور اوتار سنگھ دوسری جانب۔

دنیا کے بارے میں دو محاورے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دنیا اتنی بڑی ہے کہ کوئی بچھڑ جائے تو اس کے دوبارہ ملنے کی کوئی ضمانت نہیں۔ دوسرا یہ کہ دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ لوگ بار بار ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں...... بغیر ارادے کے ملتے ہیں۔ اس معاملے میں دونوں محاوروں کو درست ثابت ہونا تھا...... مگر مختلف اوقات میں۔

نو بجے تو انھیں اپنا سب سے بڑا شوق یاد آیا...... دارو! میلے میں اس کا بندوبست بھی تھا۔ وہ تینوں اس طرف چل دیے۔

شراب کی ایک سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ تمام منفی چیزوں کو ابھارتی ہے۔ دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے تو شعور کو بیکار کر کے لاشعور اور تحت الشعور کو جاگر کرتی ہے۔ یہ جن منفی جذبوں کو ابھارتی ہے، ان میں سب سے ہلکا اور شریفانہ جذبہ دکھ ہے۔ شرابیوں کو پینے کے بعد اپنے ایسے

ایسے دکھ یاد آتے ہیں، جن کا ان کی موجودہ زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا ہوتا۔ اور نشے میں وہ دکھ انھیں بہت اہم اور بہت بڑے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ نفرت، حسد، بغض، کینہ اور بڑی محرومیاں خواہ وہ ان کے لیے اچھی ہی ہوں، انھیں ستانے لگتی ہیں۔ شاید شراب کو حرام قرار دیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو۔

پہلے جام کے بعد ان تینوں کو وہ عورتیں یاد آئیں، جو انھیں نہیں مل سکی تھیں۔ دوسرے جام نے انھیں باتونی کر دیا۔ وہ دنیا جہان کی بے سروپا باتیں کرنے لگے۔ کیونکہ شراب ان کے شعور کو معطل کر کے لاشعور کو کرید رہی تھی۔ تیسرے جام نے ان کی نفرتیں اور دشمنیاں ابھار دیں۔

ان کے درمیان ایک نفرت، ایک دشمنی قدرِ مشترک تھی...... اور وہ تھی اوتار سنگھ سے نفرت اور اس سے دشمنی۔ لیکن تینوں کے لیے اس کی شدت کے درجے الگ الگ تھے۔ کرتارے کے لیے اس کی اہمیت سب سے کم تھی۔ اس لیے کہ وہ اس کا ذاتی معاملہ نہیں تھا۔ وہ جسونت کا دوست تھا اور جسونت کی کیدار ناتھ سے دوستی تھی۔ اور کرتارا یاروں کا یار تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ کوئی اوتار سنگھ نامی لڑکا کیدار ناتھ کے راستے کی رکاوٹ ہے اور اسے دور کرنا ہے تو اس نے ہامی بھر لی۔ حالانکہ اس نے لڑکے کو دیکھا تک نہیں تھا۔ بات وہی تھی۔ وہ اس کا ذاتی معاملہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے بات کی اور انھیں لے کر چل دیا۔ یہ الگ بات کہ وہ وہاں سے ناکام واپس آئے۔ کرتارے کو اس بے عزتی کی وجہ سے اوتار سنگھ سے نفرت تھی۔

رگھبیر کی نفرت اور دشمنی کرتارے سے زیادہ تھی۔ وہ کرتارے کی دوستی کی وجہ سے اس اسکیم میں شامل ہوا تھا۔ اس نے اپنے چار جواں مرد ساتھیوں کو دو عام سے کم عمر لڑکوں سے مار کھاتے دیکھا تھا۔ وہ میدان میں کودنا چاہتا تھا۔ لیکن کرتارے نے اسے روک دیا تھا۔ کرتارا اپنے دوست جسونت کی ہدایت پر محتاط تھا۔ اس لیے گرمی کے ان لمحوں میں بھی دماغ سے سوچ رہا تھا۔ تو وہ لڑکا اوتار سنگھ رگھبیر کی مردانگی کے جسم پر لگا ہوا وہ زخم تھا، جو کسی بھی مرہم سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔

لیکن سورج کو اوتار سنگھ سے کبھی نہ مٹنے والی دشمنی تھی۔ اسے اس سے ایسی شدید نفرت تھی کہ وہ اس کے چہرے کو بھی کبھی نہیں بھلا سکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ان دو کم عمر اور بظاہر عام سے نظر آنے والے لڑکوں کو ختم کرنے کے ارادے سے حملہ آور ہونے والوں میں شامل تھا۔ اور اوتار سنگھ کی لاٹھی نے پہلا وار اسی پر کیا، اس کے بعد وہ لڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ ایسی ذلت تھی، جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

ان سب کو وہ ذلت آمیز مہم یاد تھی۔ وہ آٹھ افراد اس مہم پر گئے تھے اور آٹھ ہی واپس بھی آئے تھے۔ مگر اس طرح کہ ان میں چار ناکارہ ہو چکے تھے اور دیگر چار انھیں اونٹوں پر لاد کر وہاں سے فرار ہوئے تھے۔

واپس آنے کے بعد ان کے درمیان تند و تیز بحثیں ہوئی تھیں۔ کیونکہ شریر کے گھاؤ تو

بھر گئے تھے۔ لیکن آتما کے گھاؤ بھرنے والے نہیں تھے۔ چاروں مقابلہ کرنے والے دوسرے چاروں پر برہم تھے کہ انھوں نے بزدلی دکھائی۔ ان چار میں سے تین کرتارے پر برہم تھے کہ کرتارے نے انھیں میدان میں اترنے نہیں دیا۔

لیکن کرتارا اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ اصل میں ایک فرق تھا۔ اس نے اپنے یار جسونت کے کہنے پر اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جبکہ اس کے دیگر ساتھیوں کے لیے انعام مقرر تھا۔ وہ کام پورا کر کے آتے تو مالا مال ہو جاتے۔ تو اوتارے کو تو جسونت کی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔ کرتارے کی منطق اپنی جگہ پکی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ آٹھوں بیک وقت بھی میدان میں اترتے تو دونوں لٹھیا باز لڑکے انھیں لٹا دیتے۔ پھر وہ پکڑے جاتے۔ وہ ٹھاکر کے قہر کا شکار ہوتے اور ٹھاکر انھیں کبھی نہ بخشتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جسونت کے یار کیدار ناتھ کا پول کھل جاتا اور یہ کیدار ناتھ کو گوارا نہیں تھا۔

اس وقت چار جام حلق سے اترتے ہی سب سے پہلے سورج کو اوتار سنگھ کی یاد آئی۔ وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگا۔

''او تجھے کیا ہو گیا یارا؟'' رگھبیر نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

''مجھے کیا ہونا ہے۔ پہلے سے ہوا ہے...... مجھے اوتار سنگھ ہوا ہے۔ میں اس کا خون پینا چاہتا ہوں۔''

''اسے بھول جا سورج۔'' رگھبیر نے اسے تھپکی دی۔ ''سمجھ لے، ہم نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔''

''کیسے بھول جاؤں؟ اس کا چہرہ تو ہمیشہ میری نظر میں رہتا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' رگھبیر نے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔ ''چل...... ہم دونوں اس کے گاؤں چلتے ہیں۔ اب اسے ٹھکانے لگا کر ہی آئیں گے۔ اب تو ہم نے لٹھیا بازی بھی سیکھ لی ہے۔ دیکھ لیں گے اسے۔''

''ہاں...... چلو......'' سورج اٹھنے لگا۔

کرتارے نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ وہ جب بھی پینے کے لیے بیٹھتے تھے، یہی کچھ ہوتا تھا کرتارے کو یاد تھا کہ اسے کب کیا کرنا ہے۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ ناکام ہو کر واپس آئے تھے تو انھوں نے فوراً ہی دوسرے حملے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ انھوں نے ایک ماہر لٹھیا باز کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ لیکن تیاری مکمل ہونے سے پہلے ہی کیدار ناتھ جسونت سے بات کرنے جے پور آیا تھا اور اس کے بعد جسونت نے کرتارے سے کہا تھا...... ''اب اس لڑکے کی طرف دیکھنا بھی نہیں...... بات الٹ گئی ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میرے یار کا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

کرتارا جسونت کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے اپنے سب ساتھیوں سے وچن لے لیا تھا۔ لیکن وہ

جب بھی پی کر بہکتے تو اس وچن کو بھول جاتے اور اسے یاد دلانا پڑتا۔

اس وقت بھی اس نے یہی کہا۔ ''مجھ سے کیا ہوا وچن یاد ہے؟'' اس نے سورج کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکے کو چھونا بھی نہیں ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟ یہاں سینے میں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔'' سورج نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''جلنے دے۔ جلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ پر جب تو دارو پیتا ہے تو یہ بھڑکتی ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟''

''یا تو پیا نہ کر۔ یا اتنی پیا کر کہ یہ آگ اس سے بجھ جائے۔'' کرتارے نے بے پروائی سے کہا۔ ''یہ لے اور پی۔''

وہ پیتے رہے۔ کرتارے نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

کچھ دیر بعد سورج اٹھ کھڑا ہوا۔

''لو۔ کہاں چلا میرے یار۔'' رگھبیر نے لہک کر پوچھا۔

''بس میں جاؤں گا۔ اسے ڈھونڈوں گا۔ کیا پتا، وہ مل ہی جائے۔'' سورج نے کہا۔

کرتارا کچھ کہنا بھی چاہتا تھا کہ رگھبیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دبا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ سورج سے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ تو جا کر اسے ڈھونڈ۔ مل جائے تو مجھے بھی بتانا۔''

''ضرور بتاؤں گا۔'' سورج نے کہا اور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف چل دیا۔

کرتارے نے سوالیہ نظروں سے رگھبیر کو دیکھا۔ ''تم نے کیوں جانے دیا اسے؟''

''جانے دو یارا۔ ڈھونڈے گا تو کچھ دل ہی بہل جائے گا۔ آگ تو ٹھنڈی ہو گی۔ اب وہ یہاں اسے ملنے سے تو رہا۔''

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

❀......❀......❀

ٹھاکر پرتاپ سنگھ اب بڑی بے چینی سے بیٹے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب وصال دین کو دیکھ کر اسے سکون کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ بڑی شدت سے اوتار سنگھ کی یاد آتی تھی۔ گزشتہ رات اس نے وصال دین سے پوچھا تھا۔ ''میرے پتر کے امتحان کب ختم ہو رہے ہیں؟''

وصال دین نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''آج ان کا آخری پرچا تھا۔''

یہ سن کر ٹھاکر بے چین ہو گیا۔ ''تب تو اسے آ جانا تھا۔ وہ رکنے والا تو نہیں۔''

''کسی وجہ سے رک گئے ہوں گے ٹھاکر جی۔ کل آ جائیں گے۔''

سو آج صبح ہی سے ٹھاکر بیٹے کی راہ تک رہا تھا۔ دوپہر کو اس سے کھانا بھی نہیں کھایا

گیا۔اب تو اوتار سنگھ کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔اس نے سوچا۔

شام ہوگئی۔وہ حویلی کے باہر چھڑکاؤ کرا کے، کرسیاں لگوا کے بیٹھ گیا۔اس کی نظریں آنے والے راستے پر جمی تھیں۔

پھر ٹھاکر نے مولوی برکت علی کو اکیلے آتے دیکھا تو اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔وہ خود اٹھ کران کی طرف لپکا۔''کیا بات ہے مولوی صاحب؟اور لوگ کہاں ہیں؟''اس نے پوچھا۔''وہ لوگ تو نہیں آسکے ہیں۔''

''پر کیوں؟''

''کانتی پرشاد جی بیمار ہوگئے ہیں۔وہ آنہیں سکتے۔اوتار سنگھ نے رگھو اور رنجنا کو ان کے پاس رکنے کو کہا ہے۔''

ٹھاکر اور پریشان ہوگیا۔''تو آپ اوتار سنگھ کو تو اپنے ساتھ لے آتے۔''

''میں گھر ہوتا ہوا آیا ہوں۔اوتار سنگھ وہاں تھا ہی نہیں۔وہ تو کل ہی روانہ ہوگیا تھا۔''

ٹھاکر کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔''پر وہ یہاں نہیں آیا۔''

''اس نے کہا تھا کہ وہ جے پور جارہا ہے۔میلہ دیکھے گا۔پھر آگرہ جائے گا۔تاج محل دیکھنے۔''مولوی صاحب نے وضاحت کی۔''میرا اندازہ ہے کہ وہ کل یا پرسوں یہاں پہنچے گا۔''

اس طرف سے اطمینان ہوا تو ٹھاکر کو دوسری فکر لگ گئی۔''پہلی بار وہ اکیلا نکلا ہے۔''اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں ٹھاکر صاحب۔وہ بہت عقل مند ہے۔اب وہ کالج میں ہے۔اسے پریکٹیکل لائف کے لیے تیار ہونا ہے۔ساری عمر انگلی پکڑ کر تو نہیں چلے گا۔اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت سمجھ دار اور اہل ہے۔''

ٹھاکر کو فخر کا احساس ہوا۔واقعی......اس کا بیٹا کالج میں پڑھتا ہے۔جوان ہو چکا ہے۔

ٹھاکر نے مولوی صاحب کی خوب تواضع کی۔اوتار سنگھ کی فکر کم ہوئی تو اسے خیال آیا کہ ابھی دو رات پہلے اس نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس پر عمل پیرا کیسے ہو۔اس سلسلے میں وہ کسی سے بات بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اب اس نے سوچا کہ وہ اس سلسلے میں مولوی صاحب سے مدد لے سکتا ہے۔پہلے اسے ان کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔شاید اس لیے کہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس سال بھی آئیں گے۔

اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے کے بارے میں کسی سے بات کرنے کا تصور ہی اس کے لیے سنسنی خیز تھا۔مولوی صاحب یقیناً اس کی مدد کرسکیں گے۔اس نے سوچا، رات کو وہ ان سے بات کرے گا۔

اس رات وصال دین آیا تو ٹھاکر نے اس سے کہا۔''پتر وصال دین، آج مجھے ایک بہت ضروری کام کرنا ہے۔آج تم چلے جاؤ۔''

''جی ٹھیک ہے۔''وصال دین نے کہا۔پھر اسے اوتار سنگھ کا خیال آیا۔''بھائی......میرا مطلب ہے، چھوٹے ٹھاکر نہیں آئے۔''

''نہیں پتر۔وہ میلہ دیکھنے چلا گیا ہے۔شاید کل آئے۔''

وصال دین چلا گیا۔

رات کے کھانے کے بعد ٹھاکر مولوی صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔''مولوی صاحب، مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے......''

مولوی صاحب نے اس کام کے بارے میں سنا تو پہلے تو ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔پھر انھوں نے ہیجان سے لرزتی آواز میں کہا۔''کیا آپ کو پورا یقین ہے؟''

ٹھاکر نے اثبات میں سر ہلا دیا!

❁......❁......❁

کلہاڑی بہت تیز تھی۔اوتار سنگھ نے اس کے لیے چمڑے کا میان نما غلاف بھی خرید لیا تھا۔اب وہ بے فکر ہو کر اسے اپنے لباس میں چھپا سکتا تھا۔زخمی ہونے کا خطرہ بھی نہ رہتا۔دوسری طرف اس نے ہتھوڑا بھی رکھ لیا تھا۔

پوری تیاری کے ساتھ وہ ٹھیک وقت پر ہوٹل سے نکل آیا۔

مٹھائی والے کے پاس وہ ٹھیک ساڑھے دس بجے پہنچا۔مٹھائی والا اسے دیکھ کر خوش ہوگیا۔''تمھارے لڈو تیار ہیں بابو جی۔''اس نے مٹھائی کے ایک ٹوکرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ نے جیب سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''چکھ کر نہیں دیکھو گے بابو جی؟''مٹھائی والے نے پوچھا۔

اوتار سنگھ کو لگا کہ وہ اس سے مذاق کر رہا ہے۔اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''تم جانتے ہو کہ یہ لڈو میں نے اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے بنوائے ہیں۔''

''پرنتو تمھیں کیسے پتا چلے گا کہ لڈو کتنے عمدہ ہیں۔''

''مجھے تمہاری بات پر بھروسہ ہے۔''

''پر میں تعریف سننا چاہتا ہوں۔''حلوائی نے ایک لڈو اس کی طرف بڑھایا۔

''میں نے کہا نا، مجھے نہیں چکھنا۔''

''گھبراؤ نہیں بابو جی۔یہ لڈو بے ہوش کرنے والا نہیں ہے۔''

اوتار سنگھ نے اب بھی لڈو لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''اصل میں آرڈر کی مٹھائی ہم کچھ زیادہ ہی بناتے ہیں۔'' حلوائی نے وضاحت کی۔ ''یہ لڈو بھی زیادہ بنے تھے۔ پانچ سیر تولنے کے بعد میں نے ان میں بے ہوشی کی دوا ملا دی اور انھیں ٹوکرے میں رکھ دیا۔ یہ لڈو صاف ہے۔ کھا کر دیکھو۔ تا کہ پتا چلے کہ میں نے قیمت غلط نہیں لی ہے۔ ایسا لڈو پورے جے پور میں کوئی نہیں بنا سکتا۔''

اوتار سنگھ ہچکچا رہا تھا۔ پہلی بار وہ اکیلا پردیس میں نکلا تھا۔ اور اس کی جیب میں خاصی رقم بھی تھی۔ اب وہ لڈو کھا لیتا اور اس میں بے ہوشی کی دوا ہوتی تو وہ لٹ بھی سکتا تھا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ چلتا پھرتا بے ٹھکانہ آدمی تو ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ لیکن مستقل دکان کرنے والا دکان دار ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ البتہ وہ لڈو نہیں کھائے گا تو دکان دار اس پر شک بھی کر سکتا ہے۔''

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد بالآخر اس نے لڈو لیا اور کھا کر دیکھا۔ لڈو واقعی بہت عمدہ تھا۔ ''واقعی تم نے کمال کر دیا۔'' اس نے دل کی گہرائی سے تعریف کی۔ اتنا لذیذ لڈو تو میں نے دہلی میں نہیں کھایا۔''

دکان دار خوش ہو گیا۔ ''تو تم دہلی سے آئے ہو بابو جی؟''

''ہاں۔''

اوتار سنگھ نے مٹھائی کا ٹوکرا لیا اور چل دیا۔ اب بس اسے مندر پہنچنا تھا۔

❁......❁......❁

سورج جھومتا جھامتا میلے سے باہر آیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا نے اس کے نشے کو اور تیز کر دیا۔ وہ اس وقت صرف اور صرف اس لڑکے اوتار سنگھ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بس ایک بار وہ مل جائے اور وہ اسے ٹھکانے لگا کر اپنا بدلہ لے لے تو اس کی آتما کو شانتی مل جائے۔ لڑکے کے مل جانے کے خیال پر وہ مٹھیاں بھینچتا، دانت پیستا اور ہاتھ کو یوں لہراتا، جیسے لاٹھی گھما رہا ہو۔

''مل جائے تو دیکھ لوں گا اسے۔'' وہ بہ آواز بلند غرایا۔ ''اب تو مجھے بھی لٹھیا چلانی آتی ہے۔''

قریب سے گزرتے ہوئے راہ گیروں نے اسے بلند آواز میں خود کلامی کرتے دیکھا تو مسکرا دیے۔ نشے میں آدمی کیا کچھ نہیں کرتا۔

سورج مندر کے سامنے سے گزرا اور بڑھتا چلا گیا۔ مندر سے کافی آگے جانے کے بعد اچانک اس نے نظر اٹھائی تو وہ لڑکا آتا دکھائی دیا، جس کی اسے تلاش تھی۔ اس کا نشہ جیسے ہرن ہو گیا۔ ''یہ یہاں کہاں؟'' وہ بڑبڑایا۔ نشے میں وہ اسے جے پور میں تلاش کر رہا تھا۔ لیکن ذرا سا ہوش آیا تو اسے یہ بات ناقابل یقین لگی۔ ''کہیں مجھے چڑھ تو نہیں گئی؟''

وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ لڑکا ابھی خاصا دور تھا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا تھا اور وہ اپنی دھن میں چلا آ رہا تھا۔

سورج نے کئی بار ہاتھوں سے آنکھوں کو مل ڈالا۔ مگر لڑکا سچ مچ وہی تھا۔ وہ وہیں کھڑا اس کے پاس سے گزرنے کا انتظار کرتا رہا۔ قریب سے دیکھوں گا تو پتا چلے گا۔ اس نے دل میں کہا۔

لڑکا ہر قدم اس سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور ہر قدم پر سورج کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ نشے کا دھوکہ نہیں۔ یہ سچ مچ وہی لڑکا ہے۔ نشہ ہوتا تو قریب آتے ہوئے لڑکے کی صورت بدلتی۔

اب لڑکا عین اس کے سامنے تھا...... اور وہ وہی تھا۔ اس کی صورت تو وہ آج تک نہیں بھول سکا تھا۔

وہ ایک پل کی بات تھی۔ وہ وہیں کھڑا رہ گیا اور لڑکا مٹھائی کا ٹوکرا لیے آگے نکل گیا۔

سورج بہت تیزی سے پلٹا اور اضطراری طور پر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن لڑکا اس کے ہاتھ کی پہنچ سے دور جا چکا تھا۔

سورج لڑکے کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ انتقام کا موقع ہے جو قسمت نے اسے دیا ہے۔ آج...... اسی وقت وہ اسے ختم کر سکتا ہے۔

لیکن کیسے؟ نشے سے نکلنے کی کوشش میں اُلجھتے ذہن نے سوال اٹھایا۔

واقعی! اس نے سوچا۔ اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ لٹھیا نہ خنجر۔

کوئی بات نہیں۔ دل نے کہا۔ اس کے پاس بھی تو کچھ نہیں۔ وہ تو مٹھائی کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے ہے۔ اسے جسمانی طور پر زیر کیا جا سکتا ہے۔

اس ایک پل میں سورج پر اپنے کتنے ہی بھید کھل گئے۔ اتنے عرصے سے وہ صرف اس لڑکے کی نفرت، انتقام کی آرزو میں اپنے اندر نہیں پال رہا تھا۔ اس کی بے خبری میں ایک اور چیز بھی اس کے اندر پل رہی تھی...... اور وہ تھا اس لڑکے کا خوف۔ پچھلے معرکے نے اسے اس لڑکے سے خوف زدہ کر دیا تھا۔ کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ اس لڑکے نے اس جیسے تین شہ زوروں کو اس دن زمین چٹا دی تھی۔ آٹھ افراد کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نے پوری طرح سمجھ لیا۔ ہاں...... وہ اس سے خوف زدہ ہے۔ وہ اکیلا اس سے نہیں لڑ سکتا۔ لاٹھی ہوتی، خنجر ہوتا، تب بھی وہ اس سے نہ لڑ پاتا۔

لیکن ایک اچھی بات تھی۔ لڑکا اس کے شہر میں تھا اور اکیلا تھا۔ یہ اس سے نمٹنے کا بہت اچھا موقع تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب وہ کیا کرے۔

وہ اس کے پیچھے چلتا رہا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اسے یہ معلوم کرنا ہے کہ لڑکا یہاں کہاں رہ رہا ہے۔ دوسرے مرحلے میں وہ اپنے ساتھیوں کو اس کے اور اس کے ٹھکانے کے بارے میں بتائے۔ لیکن کرتارا اس معاملے میں اعتبار کے قابل نہیں۔ جسونت نے اسے منع کر دیا ہے۔ کہا ہے کہ لڑکے کو بھول جائے اور یاروں کا یار کرتارا اپنے یار کی بات نہیں ٹالے گا۔ وہ انھیں کچھ نہیں

کرنے دے گا۔

ہاں رگھبیر کام کا آدمی ہے۔ وہ اس سے اتنی ہی نفرت کرتا ہے، جتنی وہ کرتا ہے اور راجو اور گوپال ہیں، جنھوں نے اس دن لڑکے سے زخم کھائے تھے۔ بس تو وہ جا کر رگھبیر کو بتائے گا۔ پھر وہ راجو اور گوپال سے بات کریں گے۔ اور اس کے بعد انتقام!

وہ چلتے چلتے ٹھٹھک گیا۔ لڑکا بڑے مندر میں چلا گیا تھا اور پجاری سے بات کر رہا تھا۔

سورج وہیں کھڑا ہو گیا۔ اسے لڑکے کا پیچھا کر کے اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا تھا۔

پانچ منٹ ہو گئے۔ لڑکا تو باہر نہیں آیا۔ البتہ مندر کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

سورج وہیں کھڑا رہا۔ اسے یقین تھا کہ لڑکا باہر آئے گا۔ تب وہ اس کا پیچھا کر کے اس کا ٹھکانہ معلوم کرے گا۔

دیر ہو گئی۔ آدھا گھنٹا گزرا...... پھر ایک گھنٹا ہو گیا۔ لڑکا باہر نہیں آیا۔ کھڑے کھڑے، پہلو بدلتے بدلتے اس کی ٹانگیں دکھ گئیں۔ مگر نہ دروازہ کھلا، نہ لڑکا باہر آیا۔ اب سورج اور امکانات پر غور کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں لڑکے کا ٹھکانہ معلوم ہو گیا تھا۔ جس انداز میں وہ مندر میں گیا اور وہیں رک گیا، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ مندر ہی میں ٹھہرا ہوا ہے۔

اب بس اسے جا کر رگھبیر سے بات کرنی تھی۔ رگھبیر بھی یقیناً خوش ہو گا۔ پھر وہ مل کر کچھ کریں گے۔

وہ میلے کی طرف جانے کے لیے چلا۔ لیکن اسے خیال آیا کہ اب تک تو میلہ اجڑ چکا ہو گا۔ یار لوگ گھر جا چکے ہوں گے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ رگھبیر کے گھر جائے۔ وہ وہیں ملے گا۔ یہ سوچ کر وہ رگھبیر کے گھر کی طرف چل دیا۔

❀......❀......❀

بڑے پجاری نے بے حد پُرتپاک انداز میں اوتار سنگھ کا خیر مقدم کیا۔ ''آؤ بالک، پدھارو۔''

اوتار سنگھ نے بہ اکراہ اسے نمسکار کیا۔ ''میں ٹھیک وقت پر آیا ہوں نا مہاراج۔''

''اوش بالک اوش۔''

چند لمحے گزر گئے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے۔ اوتار سنگھ اس بات کا منتظر تھا کہ پجاری مندر کا دروازہ بند کرے اور اسے اندر لے کر چلے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ پجاری کو بھی اس سے کوئی توقع ہے، جو پوری نہیں ہو رہی ہے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ بات کیا ہے۔

''اب دیر کس بات کی ہے مہاراج؟'' بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''کچھ بھی نہیں بالک۔ تم بس پوجا کر لو، بھگوان کی آرتی اتار لو۔ پھر ہم اندر چل کر پاٹھ کریں گے۔''

اوتار سنگھ کو اب دکھاوے کے لیے بھی وہ شرک گوارا نہیں تھا۔ پوجا تو وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن مصلحت ضروری تھی۔ ایسا نہ ہو کہ پنڈت اس کی طرف سے مشتبہ ہو جائے۔ ''پوجا بھی ضرور کروں گا مہاراج اور آرتی بھی اتاروں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پرنتو پہلے مجھے اپنی سورگ باشی ماتا جی کی منوکامنا پوری کرنی ہے۔ تاکہ ان کی آتما کو شانتی ملے۔ پہلے مجھے اپنا سپنا پورا کرنا ہے۔ پوجا تو میں پاٹھ سننے کے بعد ہی کروں گا۔''

''جو اچھا تمہاری بالک۔ میں دروازہ بند کر لوں۔'' پجاری دروازے کی طرف بڑھا۔

مندر کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد پجاری نے بڑے بت کے ساتھ والا دروازہ کھولا۔ ''آؤ بالک۔''

اوتار سنگھ اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہاں پجاری کے چیلے اور دیوداسیاں پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ پجاری ایک موٹے گدے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ ''آؤ بالک، تم یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔''

اوتار سنگھ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اب اسے یہ فکر تھی کہ اس وقت کمرے میں موجود لوگوں کے سوا اور کوئی مندر میں موجود تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا کھیل خراب ہونے کا خطرہ تھا۔ اب یہ بات وہ پوچھے تو کیسے!

''مہاراج، اور کوئی موجود ہو تو اسے بھی بلا لیں۔'' بالآخر اس نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ مندر میں موجود سبھی منش اس پاٹھ میں شریک ہوں۔''

پجاری مسکرایا۔ ''اس وقت ان لوگوں کے سوا مندر میں کوئی نہیں ہے بالک۔''

''تو ٹھیک ہے مہاراج۔''

پجاری نے گیتا کا پاٹھ شروع کیا اور ادھر اوتار سنگھ کو کراہت کا شدید احساس ہونے لگا، جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ چند منٹ میں ہی اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ اٹھ کر بھاگ جانے کو جی چاہنے لگا۔ اچانک ہی اسے خیال آیا اور وہ دل ہی دل میں کلمۂ طیبہ پڑھنے لگا۔ اس سے [illegible] لیکن گھبراہٹ اس کے باوجود رہی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ پاٹھ جلد از جلد ختم ہو اور اسے اس مصیبت سے نجات ملے۔

اُدھر پجاری کے ذہن میں پانچ سو روپے کی خطیر رقم کا تصور تھا۔ چنانچہ وہ اس لڑکے کو خوش کر دینا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ بہت جم کر گیتا پڑھ رہا تھا۔

لمحے گزرتے رہے۔ کلمہ پڑھتے پڑھتے اوتار سنگھ اونگھنے لگا۔ اب وہ سب کچھ اسے خواب جیسا لگ رہا تھا۔

❀......❀......❀

رگھبیر کو میلے سے واپس آئے۔ بہ مشکل آدھا گھنٹا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

بے وقت کی اس دستک نے اسے حیران کر دیا۔ وہ اٹھ کر دروازے پر گیا۔

اس نے دروازہ کھولا تو سورج اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سورج کے چہرے سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے پاس کوئی سنسنی خیز خبر ہے۔ ''کیا بات ہے یارا۔ تو ابھی گھر نہیں گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''بات کیا ہے؟''

''اندر بیٹھ کر بتاؤں گا۔ بڑی خبر ہے۔'' رگھبیر نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ ''آ جا...... پر تو نے نیند خراب کر دی۔''

''خبر سنے گا تو تیری نیند اُڑ جائے گی۔''

''اب سنا بھی دے۔ آدھی رات ہو چکی ہے۔'' رگھبیر جھنجلا گیا۔

''خبر یہ ہے کہ وہ لڑکا اوتار سنگھ جے پور آیا ہوا ہے۔''

''کس نے بتایا تجھے؟ جسونت نے؟''

''ارے میں نے خود دیکھا ہے اسے...... اپنی آنکھوں سے۔''

''تب تو تو نے اسے ختم بھی کر دیا ہوگا۔'' رگھبیر نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''پر تیرے کپڑوں پر خون کے داغ واضح نظر نہیں آ رہے ہیں۔''

''تو مذاق سمجھ رہا ہے؟''

''تو اور کیا سمجھوں؟''

''میرے پاس خنجر نہیں تھا۔ ورنہ میں اسے مار کر ہی آتا اور کپڑوں پر خون کے داغ بھی ہوتے۔'' سورج نے غصے سے کہا۔

''دیکھ سورج، ہمیں پہلے ہی پتا تھا کہ تو آج اس چھوکرے کو ضرور دیکھے گا۔''

سورج بہت سوچ سمجھ کر رگھبیر کے پاس آیا تھا۔ لیکن وہ اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

رگھبیر جانتا تھا کہ اس کے دوستوں میں شراب کی سب سے کم سہار سورج ہی کو ہے۔ وہ بہت جلدی بہک جاتا تھا اور وہ لڑکا تو مہینوں سے اس کے سر پر سوار تھا۔ ''سن سورج، گھر جا کر سو جا۔ صبح آ کے بتانا۔ تب میں ضرور مان جاؤں گا۔''

''میں نشے میں ضرور تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر میرا نشہ ختم ہو گیا تھا۔'' سورج نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں رگھبیر۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔''

''اچھا...... ذرا جم کے بتا۔ اسے کہاں دیکھا تو نے؟''

سورج نے پوری تفصیل سنا دی۔

رگھبیر سوچ میں پڑ گیا۔ جو کچھ سورج نے بتایا تھا، وہ ناممکن نہیں تھا۔ یہ میلے کے دن تھے۔ عجب نہیں کہ اوتار سنگھ میلہ دیکھنے آیا ہو۔ لیکن یہ امکان اپنی جگہ تھا۔ رگھبیر نشے میں کچھ بھی دیکھ سکتا تھا...... اور خاص طور پر اس لڑکے کو!

اس نے پوری تفصیل کئی بار سنی۔ کریدتے ہوئے سوالات کیے کہ کہیں بیان میں فرق ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔

''اور تجھے یقین ہے کہ وہ مندر سے باہر نہیں آیا؟'' رگھبیر نے پوچھا۔

''میں پورا ایک گھنٹا مندر کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ دروازہ بند ہو گیا تھا۔''

''اگر وہ اوتار سنگھ ہی تھا تو یقیناً مندر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میں کرتارے سے بات کروں گا۔''

''کرتارے سے نہیں۔ وہ ہمیں کچھ کرنے نہیں دے گا۔ راجو اور گوپال کے پاس چل۔''

''اس وقت؟'' رگھبیر نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''دیکھو یار، وہ مندر میں ہی ہے نا۔ ہم صبح مل کے طے کریں گے۔ پھر چل کر اسے دیکھیں گے۔ اگر وہ وہی ہے......''

''میں جو کہہ رہا ہوں کہ میں نے اسے دیکھا ہے۔'' سورج نے برا مان کر کہا۔

''تو ٹھیک ہے۔ کل کوئی ترکیب سوچ لیں گے۔ جا، گھر جا کر سو جا۔ صبح آنا۔ پھر راجو اور گوپال کے پاس چلیں گے۔''

سورج کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن رگھبیر کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

❀......❀......❀

پجاری بہت جم کے گیتا پڑھ رہا تھا!

اوتار سنگھ کے لیے ایک ایک پل بھاری تھا۔ وہ اس وقت عجیب کیفیت میں تھا۔ جو کچھ کرنے کا اس نے سوچا تھا، اس کا تصور ہی اس کے جسم میں سنسنی دوڑا رہا تھا۔ جسم میدانِ عمل میں اترنے اور عمل کرنے کو مچل رہا تھا۔ ایسے میں ساکت بیٹھنا اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ اسے پاٹھ ختم ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

دوسری طرف پجاری اوتار سنگھ کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی اصل خوشی کیا ہے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ تو اسے کوفت میں مبتلا کر رہا ہے۔

اوتار سنگھ اس دوران کلمۂ طیبہ پڑھتا رہا تھا۔ ورنہ پاٹھ سن کر تو اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

جیسے تیسے پاٹھ ختم ہوا اور اوتار سنگھ نے سکون کی سانس لی۔ ''لو بالک، تمہارا سپنا پورا ہوا۔'' پجاری نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''ابھی کہاں مہاراج! ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔'' اوتار سنگھ معنی خیز لہجے میں بولا۔

پجاری مسکرا دیا۔ اسے پانچ سو روپے کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے لڈو نکال کر تھالی پر رکھے اور ایک لڈو اوتار سنگھ کی طرف بڑھایا۔

''نہیں مہاراج۔ یہ کام تو میرا ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا اور تھالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ''یہ لیجیے۔'' اس نے لڈو پجاری کی طرف بڑھایا۔

پجاری نے لڈو کھایا اور چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔ ''واہ بالک...... بہت مزے کا ہے۔''

''خاص طور پر بنوایا ہے مہاراج۔ ایک اور لیں۔''

پجاری نے ایک لڈو اور لے لیا۔ اوتار سنگھ نے وہاں بیٹھے پجاری کے چیلوں اور دیو داسیوں کو بڑے احترام سے لڈو پیش کیے۔ لڈو تھے ہی لذیذ۔ سبھی نے دوسرا لڈو بھی لیا۔ اب اسے لڈو کی تاثیر کا انتظار تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر حلوائی نے صحیح کام نہیں دکھایا تو......

''تم بھی تو لو بالک۔'' پجاری نے اس سے کہا۔

''میں تو اپنے سپنے پر عمل کر رہا ہوں مہاراج۔'' اوتار سنگھ کا لہجہ مضحکہ اُڑانے والا تھا۔ ''اور میں نے سپنے میں خود لڈو نہیں کھایا تھا۔''

پجاری نے اسے یوں دیکھا، جیسے اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا ہو۔ اس لمحے اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑھک گیا۔

''ارے...... یہ کیا ہو گیا مہاراج کو؟'' ایک چیلا گھبرا کر اٹھا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ نیند آ رہی ہو گی مہاراج کو۔'' اوتار سنگھ نے بے پروائی سے کہا۔

لیکن چیلے اور دیوداسیاں پجاری کو پُرتشویش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کبھی وہ اوتار سنگھ کو بھی سوالیہ نظروں سے دیکھتے۔ پھر ان میں سے دو ڈھیر ہوئے تو باقی سراسیمہ ہو گئے۔ اب انھیں کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

دیوداسیاں زیادہ گھبرائی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن گر پڑیں۔

دس منٹ کے اندر اندر وہ سب بے ہوش ہو چکے تھے۔ پھر بھی اوتار سنگھ نے اپنے اطمینان کے لیے ایک ایک کو ہلا جلا کر دیکھا۔ لیکن کسی کو ذرا بھی ہوش نہیں تھا۔

اوتار سنگھ کمرے سے نکل آیا۔ پجاری نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہاں موجود سب لوگ اس کے کمرے میں موجود ہیں۔ لیکن وہ بے احتیاطی کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے اندرونی حصے کو، اس کے ایک ایک کمرے کو دیکھا۔ تب کہیں وہ مطمئن ہوا۔ وہاں واقعی کوئی نہیں تھا۔ جو لوگ تھے، سب پجاری کے کمرے میں بے ہوش پڑے تھے۔ یعنی اب وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا کام کر سکتا تھا۔

اس نے مندر کے بیرونی ہال کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولا اور ہال میں چلا آیا۔ چند لمحے وہ بھگوان کے بڑے بت کے سامنے کھڑا اسے گھورتا رہا۔ ''تو تم بھگوان ہو؟'' اس نے چیلنج

کرنے والے لہجے میں کہا۔ ''تم یہ پوری کائنات چلا رہے ہو۔ یہ نظام تم نے قائم کیا ہے۔ یہی بات ہے نا۔''

ہال میں خاموشی سنسنا رہی تھی۔ اوتار سنگھ کی سانسوں کے سوا وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔

''تب تو تمھاری شکتیوں کی کوئی حد نہیں ہونی چاہیے۔ تم زندگی اور موت دیتے ہو۔ تو تم کسی کو بھی بچا سکتے ہو اور تمھیں تو دل کا حال بھی معلوم ہونا چاہیے۔ تمھیں علم ہونا چاہیے کہ میں یہاں کس نیت سے آیا ہوں۔'' اوتار سنگھ سرگوشی میں کہے جا رہا تھا۔

چند لمحے وہ بت کو یوں دیکھتا رہا، جیسے اس کے جواب کا انتظار کر رہا ہو۔ مگر بتوں میں جنبش کہاں ہوتی ہے۔

''بول نہیں سکتے تو کم از کم اشارہ ہی کر دو۔ تم پلکیں جھپکو گے تو میں سمجھوں گا کہ تم ہاں کہہ رہے ہو۔''

پتھر کا بت خاموش اور بے حس و حرکت تھا۔

''کیسے بھگوان ہو تم؟ تم میں تو اظہار کی قدرت بھی نہیں۔ تمھیں نہیں معلوم کہ میں یہاں کیوں...... کس لیے آیا ہوں۔ کیا سوچ کر آیا ہوں۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں ملامت تھی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر اوتار سنگھ نے کہا۔ ''چلو...... میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ یہ جو تمھارے شریک ہیں......'' اس نے چھوٹے بتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تمھارے...... تمھارے ساتھی...... میں انھیں توڑنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم انھیں بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرو گے۔ ہو سکتا ہے، تم مجھے موت دے دو۔''

اوتار سنگھ نے اپنے لباس میں سے کلہاڑی اور ہتھوڑا نکالا۔ ''یہ دیکھو...... میں یہ ہتھیار لایا ہوں۔ میں انھیں توڑ ڈالوں گا۔ روک سکتے ہو تو روک لو۔''

اوتار سنگھ کلہاڑی اور ہتھوڑا لے کر چھوٹے بتوں کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے اسے چھوٹے بت کو نشانہ بناتا تھا اور اس کے خیال میں اس کے لیے کلہاڑی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کلہاڑی زمین پر رکھ دی اور ہتھوڑا سنبھال لیا۔

اس نے پلٹ کر بڑے بت کو دیکھا۔ ''تم تو کچھ بھی نہیں کر رہے ہو۔ آخر یہ تمھارا کارندہ ہے۔ اسے بچاؤ نا۔'' اس نے چیلنج کیا۔

پھر اس نے ہتھوڑے سے سب سے چھوٹی مورتی پر وار کیا۔ ایک ہی وار میں ٹوٹ گئی۔ اوتار سنگھ ٹھٹکا۔ لیکن اگلے ہی لمحے مطمئن ہو گیا۔ آواز اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اسے محتاط رہنا تھا۔ رات کے سناٹے میں آوازوں کا حجم بڑھ جاتا ہے اور وہ دور تک جاتی ہیں۔

اس کی اس احتیاط کا سبب خوف ہرگز نہیں تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ کام ادھورا چھوڑنا اسے گوارا نہیں تھا۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کارروائی کے بعد وہ پکڑا

گیا تو لوگ اسے ختم کر ڈالیں گے۔ اس کی تو اسے پروا ہی نہیں تھی۔ اسے تو بس یہ خیال تھا کہ نادان لوگ جن بتوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا کر شرک کر کے اللہ کو ناخوش کرتے ہیں، انھیں توڑ دے تاکہ اللہ خوش ہو کہ اس نے بساط بھر سامانِ شرک کا خاتمہ کیا ہے۔ اور اس کی ایک غرض اپنی بھی تھی جو پہلی مورتی کو توڑنے کے بعد اس کی سمجھ میں آئی۔ آدمی کے اندر بھی بت ہوتے ہیں۔ اس نے بچپن سے اب تک اپنے اندر کے بتوں کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔ مگر آج وہ اپنے اندر کے بچے کھچے بت بھی توڑ دینا چاہتا تھا۔

اس نے ٹوٹی ہوئی مورتی پر مزید ضربیں لگائیں۔ ''دیکھو...... میں نہیں چاہتا کہ یہ قابل شناخت رہیں۔'' اس نے بڑے بت کی طرف رخ کر کے کہا۔ ''میں ان کو پہچانے جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گا۔''

پہلی مورتی کو چورا چورا کرنے کے بعد وہ دوسری مورتی کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں میں وہ بھی چورا چورا ہو گئی۔

اب وہ ہنومان کی مورتی کے سامنے کھڑا تھا۔ ''تم اگر اللہ کے بنائے ہوئے بندر ہوتے تو کبھی میرے ہاتھ نہ آتے۔ میں تمھیں پکڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ کیوں...... غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟''

چند لمحے سناٹا رہا۔ اوتار سنگھ بت کو متوقع نظروں سے گھور رہا تھا۔

''جواب نہیں دے سکتے نا۔ بھاگو گے کیسے؟ تمھیں تو منش نے بنایا ہے نا۔ لو اب بچو۔''

اس نے وار کیا۔ مورتی ٹوٹ گئی۔ وہ اسے اور کوٹتا رہا۔

اب وہ گنیش کی مورتی کے سامنے تھا۔ ''تم اگر اللہ کے بنائے ہوئے ہاتھی ہوتے تو تمھارے سامنے ٹھہرنے کی مجھے مجال بھی نہ ہوتی۔ تم سامنے آتے تو میں جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن تم منش کے بنائے ہوئے ہو اور منش تمھیں توڑ بھی سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے گنیش کی مورتی بھی توڑ ڈالی۔

اب وہ کالی کے بت کے سامنے کھڑا تھا۔ ''اور تم؟ تمھارا شراپ تو مشہور ہے۔ تم تو جیون بھینٹ لیتی ہو۔ تم مجھے شراپ نہیں دو گی؟ میں تمھیں توڑنے والا ہوں۔''

وہ بت کافی بڑا تھا۔ ہتھوڑے کا وار ناکافی ثابت ہوا۔ تب اوتار سنگھ نے پہلی بار کلہاڑی اٹھائی۔ کلہاڑی کے ایک ہی وار نے بت کو زمیں بوس کر دیا۔ اس کے بعد اوتار سنگھ نے ہتھوڑا استعمال کیا۔ مورتی کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے وہ اس سے باتیں بھی کیے جا رہا تھا۔ ''سنو...... میں تمھارے شراپ کا انتظار کروں گا۔''

اس بت کے بعد اب وہاں بس ایک ہی بت سلامت رہ گیا تھا...... بھگوان کا بت۔

''اب میں ذرا اس بڑے کی خبر لے لوں۔'' اس نے کالی کے ملبے سے کہا۔

وہ بھگوان کے بت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''یہ سب تو گئے۔'' اس نے حقارت سے

کہا۔ ''اور تم نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ کیا اب یہ بھی تمھارا اعتبار کریں گے۔''

پتھر کا بت، جہالت کا خدا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

''چلو، ان کی چھوڑو۔ دیکھیں، تم خود کو بچا سکتے ہو یا نہیں۔''

وہ بت بیٹھی ہوئی حالت میں بھی اس سے اونچا تھا۔ اوتار سنگھ نے کلہاڑی سے اس کی گردن پر وار کیا۔ اس کے ہاتھ کو زبردست جھٹکا لگا۔ ایسا لگا تھا کہ کلہاڑی کسی دھات سے ٹکرائی ہے۔ اوتار سنگھ نے دیکھا، بت کا کچھ بھی نہیں بگڑا تھا۔

اس نے دوبارہ وار کیا۔ مگر وہی کیفیت تھی۔ اس نے تیسری بار کوشش کی۔ پھر وہ دیوانہ وار کلہاڑی گھماتا گیا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ کافی آواز ہو رہی ہے۔ باہر کسی کو گڑبڑ کا احساس بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اس کا آخری کام تھا اور اب اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس اس بت کو زمیں بوس کرنا چاہتا تھا۔

وہ پوری قوت سے کلہاڑی گھما رہا تھا...... گھمائے جا رہا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں نہا گیا۔ وہ ہانپنے لگا۔ اس کے بازو دکھ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ روکا اور بت کو غور سے دیکھا۔ بت کی گردن پر، جہاں وہ وار کر رہا تھا، بس ہلکا سا نشان تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بت کسی چٹان سے تراشا گیا ہے اور بعد میں اس پر پینٹ کر دیا گیا ہے۔

اوتار سنگھ ہاتھ روک کر سوچنے لگا۔ جو کلہاڑی اس کے پاس تھی، اس کی دھار بہت تیز تھی اور پتھر بھی ایسے نہیں ہوتے کہ ٹوٹ ہی نہ سکیں۔ دھاتیں بھی کٹ جاتی ہیں۔ پتھر کی تو بساط ہی کیا ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ یہ بت نہیں ٹوٹ رہا ہے۔

اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ اسے اللہ سے مدد مانگنی چاہیے۔ اس نے دل میں اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ، میری مدد فرما۔ پھر اسے کچھ اور خیال آیا۔ اس نے کلہاڑی ہاتھ میں لی اور بلند آواز میں لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہتے ہوئے کلہاڑی کا وار کیا۔

جو کچھ ہوا، اس کے نتیجے میں وہ خود کو سنبھال نہ سکا۔ اس کا جسم غیر متوازن ہوا اور وہ گر پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ کلہاڑی نے بت کی گردن کو ایسے کاٹ دیا تھا، جیسے چھری مکھن کو کاٹ ڈالتی ہے۔ بت کا سر بہت بھاری تھا۔ پُرشور انداز میں دھڑ سے فرش پر گرا۔

اس آواز نے زمین پر گرے ہوئے اوتار سنگھ کو دہلا دیا۔ چند لمحے وہ ساکت و صامت زمین پر پڑا رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جو شور ہوا ہے، اس کا کوئی ردِعمل ظاہر ہوتا ہے یا نہیں۔

لیکن اندر باہر، ہر طرف سناٹا تھا۔ بت کا سر فرش پر گرنے کی بازگشت بھی دم توڑ چکی تھی۔

بالآخر وہ اٹھا اور اس نے سر کٹے بت کو دیکھا۔ اسے حیرت تھی کہ بت پر جو ناکام وار اس نے پہلے کیے تھے، وہ اس آخری وار سے زیادہ کاری اور طاقت ور تھے۔ اس بار تو اس کے بازوؤں میں پہلے جیسی طاقت بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس وار نے کام کر دکھایا۔ تو یہ اس کی دعا

کا نتیجہ تھا یا کلمۂ طیبہ کی طاقت!

اوتار سنگھ نے اِدھر اُدھر سے کچھ کچھ سن کر حاصل کیا تھا۔ مگر وہ یقینی طور پر کچھ نہیں جانتا تھا۔ اللہ پر وہ یقین رکھتا تھا۔ لیکن اس نے باقاعدہ اسلام تو قبول نہیں کیا تھا۔ کلمہ طیبہ کو وہ بجا طور پر پاکی کا ضامن سمجھتا تھا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ وہ کلمہ حق ہے جو باطل کی بڑی سے بڑی قوت کو لمحوں میں پاش پاش کر دیتا ہے۔ اسے اس کلمے کی باطل شکنی کی قوت کا ادراک نہیں تھا۔

وہ کلمہ طیبہ پڑھ کر بڑے بت پر وار کرتا رہا اور بت کے ٹکڑے اُڑتے رہے۔ یہاں تک کہ بت زمیں بوس ہو گیا۔ وہ مزید وار کر کے اسے ناقابل شناخت بنانے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔

اب مندر ایک ایسی تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا، جو دیکھنے والوں کو ناقابل یقین لگتی۔

اوتار سنگھ کے بازو شل ہو چکے تھے۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ لیکن خوش اور مطمئن تھا۔ اس نے اللہ کو خوش کرنے کے لیے ایک کام کیا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ اللہ اس سے خوش ہے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ بڑا بت اس سے نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اللہ کی تائید اور مدد ہی کے نتیجے میں ٹوٹا تھا۔

چند لمحے وہ وہاں بیٹھ کر سانسیں درست کر رہا تھا۔ دل تو چاہتا تھا کہ وہ وہیں لیٹ کر سو جائے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔ ہوٹل جا کر وہ آرام کر سکتا ہے۔ لیکن وہ بھی تھوڑی دیر۔ کیونکہ اسے صبح چھ بجے آگرہ جانے والی گاڑی پکڑنی ہے۔

اس نے کلہاڑی اور ہتھوڑا اپنے کپڑوں میں چھپایا اور مندر کے اندرونی حصے میں چلا آیا۔ وہاں بھی سناٹے کا راج تھا۔ وہ پجاری کے کمرے میں گیا۔ وہاں سب لوگ ویسے ہی پڑے تھے، جیسا وہ انھیں چھوڑ کر گیا تھا۔

وہ گلی میں کھلنے والے دروازے کو کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے دروازے کو بھیڑ دیا۔ پھر وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ انسان تو درکنار اسے راستے میں کوئی کتا بھی نظر نہیں آیا۔ وہ ہوٹل کی طرف بڑھتا رہا۔

ہوٹل پہنچ کر وہ نہایا۔ پھر اس نے پانچ بجے کا الارم لگایا اور سو گیا!

❀ .... ❀ .... ❀

وہ ایسی رات تھی کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ مولوی صاحب کے کمرے سے آنے کے بعد اس نے ڈائری اٹھائی اور اس میں لکھنا شروع کر دیا۔

نیند نہ آنے کی وجہ کوئی پریشانی نہیں تھی۔ بلکہ آج تو وہ بہت خوش تھا...... اتنا خوش جتنا وہ صرف اوتار سنگھ کی پیدائش پر ہوا تھا۔ پہلی بار اسے معلوم ہوا تھا کہ خوشی نیند بھی اُڑا دیتی ہے۔

اس نے ڈائری بند کر کے رکھی، لائٹ آف کی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ لیکن آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس نے اوتار سنگھ کا تکیہ اٹھا لیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔

وہ تکیہ سینے سے لگتے ہی اسے نیند آ جاتی تھی۔ مگر اس رات ایسا نہیں ہوا۔ یہ الگ بات کہ وہ اوتار سنگھ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا انتظار ختم ہونے والا تھا۔ اوتار سنگھ کو آج آنا تھا اور جب وہ آئے گا تو وہ اس سے وہ اہم بات کرے گا۔

اس خیال سے اس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ دماغ میں اندیشے سر سرانے لگے۔ وہ کسی بھی طرح یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کی بات سن کر اوتار سنگھ کا ردعمل کیا ہو گا۔ کیا وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا؟ کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ کیا وہ اس بڑھاپے میں منتوں مرادوں والے اکلوتے بیٹے سے محروم ہو جائے گا؟ یہ سوالات اسے پریشان کر رہے تھے۔

لیکن ایک خیال بے حد خوش آئند تھا۔ اوتار سنگھ اسے ایک غیر معمولی نعمت کی طرح غیر معمولی حالات میں ملا تھا اور اس کے بعد جو واقعات پیش آئے، وہ بھی غیر معمولی تھے اور ٹھاکر پیچھے پلٹ کر دیکھتا تو یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ اس کا بیٹا بہت نیک، سعادت منداور فرماں بردار تھا۔ یہی نہیں، وہ فیض رساں بھی تھا۔ آج ٹھاکر پرتاپ سنگھ جو کچھ بھی تھا، پہلے سے بہت اچھا تھا...... اور وہ بیٹے کے فیض ہی کی وجہ سے تھا۔ تو وہ اس بیٹے کو حقیقت بتائے گا تو امکان تو یہی ہے کہ وہ ناراض نہیں ہو گا بلکہ شاید وہ بھی .....

لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو؟ ایک نکیلے سوال نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا۔

بے ساختہ جواب بھی فوراً ہی ابھرا۔ تو کوئی بات نہیں۔ میں اس بیٹے کو خود چھوڑ دوں گا...... اس بیٹے کو جو میرے لیے وجہ زندگی ہے اور جب اس کو چھوڑ دوں گا تو سانس لینے کے سوا سبھی کچھ چھوڑ دوں گا۔ میں نکل جاؤں گا کسی لمبے سفر پر..... اور کہیں نہیں رکوں گا۔ کبھی نہیں رکوں گا۔

پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے خود سے کہا۔ اللہ مالک ہے۔ جو وہ چاہے گا، وہی ہو گا۔ پھر پروا کیا کرنی۔

اور اس خیال سے اس کا دل مطمئن بھی ہو گیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اب سونے کا وقت تو نہیں رہا۔ اب تو اسے اٹھنا تھا اور ایک بہت اہم کام کرنا تھا۔ اس کام کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔

وہ اٹھا اور کمرے سے نکل آیا!

❀ .... ❀ .... ❀

الارم کی آواز پہلے تو اسے خواب کا ہی حصہ لگی..... لیکن اَن مِل اور بے جوڑ حصہ! اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور اس وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں۔ خواب کا تاثر ایسا گہرا تھا کہ اسے نکلنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ الارم کی آواز نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے نکل ہی نہ پاتا۔ اسی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ الارم کی

آواز سرہانے کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گھڑی کا الارم بند کر دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھا۔ مگر اس کے دماغ پر وہ خواب طاری تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

خواب میں اس نے ایک بے حد روشن چہرے اور دمکتی پیشانی والے بزرگ کو دیکھا تھا۔ وہ ایک صحرا میں کھڑا تھا۔ تا حدِ نظر ریت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا...... نہ کوئی راستہ، نہ کسی راستے کا نشان۔ اور پیاس ایسی تھی کہ زبان میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ وہ پریشان اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ کچھ فاصلے پر وہ بزرگ اسے نظر آئے۔

اس نے ان کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس میں ایک قدم بڑھانے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ نجانے کب سے وہ اس صحرا میں بھٹک رہا ہوگا۔ اور صحرا نے اس کی ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔

وہ بے بسی محسوس کر رہا تھا کہ وہ بزرگ اس کی طرف بڑھنے لگے۔ چند لمحوں میں وہ اس کے قریب آ گئے۔ تب وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''آپ کیسے ہیں بیٹے؟'' ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

اوتار سنگھ کو ایسا لگا کہ یہ سب کچھ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ''میں ٹھیک ہوں بابا۔'' اس نے کہا اور پھر اسے یاد آ گیا۔ وہ بچپن میں ان سے ملا تھا۔ ''میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں نا بابا؟''

''ہاں۔ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔''

اوتار سنگھ بھی ریت پر بیٹھ گیا۔ بزرگ نے اب بھی اس کے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ ''تمھیں بہت پیاس لگ رہی ہے نا؟'' انھوں نے پوچھا۔

اوتار سنگھ نے انھیں اپنی زبان دکھائی۔ وہ موٹی بھی ہو رہی تھی اور اس پر کانٹے بھی ابھرے ہوئے تھے۔

''بہت مبارک ہے یہ پیاس۔'' بزرگ نے کہا۔

''مگر بہت ستا رہی ہے۔''

''بجھ جائے گی اور جتنی دیر میں بجھے گی، اتنا ہی نفع ہوگا تمھیں۔ بجھنے کو تو یہ ابھی بجھ جائے۔ اس ریت کو پانی بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ لیکن ابھی مالک کی مرضی نہیں ہے۔ اس نے تو ہر کام کا مناسب ترین وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اس پیاس کو برداشت کرنے کا بہت بڑا صلہ ملے گا تمھیں۔ یہ تمہاری عبادت ہے، ریاضت ہے۔''

''میں کیا کروں بابا؟'' اوتار سنگھ نے بے بسی سے پوچھا۔

''چلتے رہو۔ منزل پر پہنچو گے تو پیاس بھی بجھ جائے گی۔''

''مگر مجھے تو راستہ بھی معلوم نہیں۔ مجھے صحیح اور غلط کی تمیز بھی نہیں۔''

''جس پر تم چل رہے ہو، وہی تمہارا راستہ ہے اور درست راستہ ہے۔''

''کتنی دیر لگے گی بابا؟''

''یہ تو وہی جانتا ہے۔ اس کی مرضی ہو تو برسوں کی مسافت پل بھر میں طے ہو جائے۔ تم پلک جھپکو تو منزل کے سامنے کھڑے ہو۔ یہ بھی اس کی نعمت ہے۔ اور مسافت کا طویل ہو جانا بھی اس کی نعمت ہے کیونکہ اس میں سختی اور ریاضت ہے۔ اب یہ اس کی مرضی کہ کسی کو وہ پہلی نعمت دیتا ہے اور کسی کو دوسری۔ دونوں صورتوں میں بندے کو بس شکر ادا کرنا چاہیے۔ یاد رکھو، پریشانی بھی نعمت ہے اور آسانی بھی۔ اور ہر نعمت اس کی آزمائش بھی ہے۔ ایک نعمت سے بندہ گھبرا کر شکایت پر آ جاتا ہے اور ناشکری کرتا ہے۔ دوسری نعمت میں تکبر کرتا ہے اور ناشکری اور اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ عافیت صرف شکر ادا کرتے رہنے میں ہے۔''

''مگر مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا بابا۔ مجھے تو کچھ علم ہی نہیں۔''

''علم تو تمھیں ہر قدم پر ملتا رہا ہے اور ملتا رہے گا۔''

''مگر میں کچھ بھی نہیں جانتا۔''

''وقت آنے پر سب کچھ جان جاؤ گے۔ بس چلتے رہو۔ اسی طرح قدم بڑھاتے رہو۔''

''ٹھیک ہے بابا۔ میں بس اللہ کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہی تو میں خوش خبری لایا ہوں تمھارے لیے۔ تم نے جو کچھ اللہ کے لیے کیا، اللہ اس سے خوش ہوا۔ اس نے قبول فرمایا۔''

اوتار سنگھ خوش ہو گیا۔ وہ اپنی پیاس اور زبان کے کانٹے بھول کر مسکرا دیا۔

''لیکن میں تمھیں خبردار کرنے بھی آیا ہوں۔ ایک لمحے میں آدمی اپنے کیے کرائے پر پانی بھی پھیر دیتا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

اوتار سنگھ گھبرا گیا۔ ''میں سمجھا نہیں بابا۔''

''بندے کو اپنے کسی عمل پر پھولنا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ وہ اس کے رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ توفیق بھی وہی دیتا ہے، قوتِ عمل بھی اسی کی دی ہوئی ہے، راستہ بھی وہی بناتا ہے اور بندے کے اندر عمل کی تلقین بھی وہی ڈالتا ہے۔ بندے کا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اچھا عمل کر کے خود پر فخر کر لیا تو سب کچھ تباہ کر لیا۔ دوسری بات یہ کہ اللہ کے لیے کچھ کرو تو اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ جتنی بھاری قیمت ادا کرو گے، عمل اتنا ہی مقبول ہوگا۔ مگر قیمت ادا کرنے کے بعد کے آداب بھی ہیں۔ قیمت ادا کر کے پچھتائے، غم کیا، افسوس تو سب کچھ ختم۔ جتنی بڑی قیمت ادا کرو، اتنی ہی خندہ پیشانی سے رہو۔ اللہ کے عام بندوں میں اور خاص بندوں میں یہی فرق ہوتا ہے۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا بابا۔''

"ابھی کیسے سمجھ سکتے ہو۔ وقت آئے تو میری یہ بات یاد رکھنا۔ میں نے تمھیں بتایا ہے کہ تم نے جو کچھ کیا، وہ اللہ نے قبول فرمایا۔ اس کا بہت بڑا صلہ ملے گا۔ لیکن اس کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کرنی ہوگی۔ وہی تمہاری آزمائش ہوگی اور اس میں اللہ ہی تمہاری مدد کرے گا۔"

یہ کہہ کر بزرگ نے اس کے دونوں ہاتھوں کو چھوا اور آنکھوں سے لگایا۔ وہی وہ وقت تھا، جب الارم کی آواز اس کی سماعت میں پڑی......

اوتار سنگھ خوش ہوگیا۔ اے اللہ، آپ کا شکر ہے۔ میں نے آپ کو خوش کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہا۔ آپ نے مجھے راستہ دکھایا اور کچھ کرنے کا موقع دیا۔ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ بے شک سب کچھ آپ کی طرف سے ہے۔

وہ چونکا۔ اسے یاد آیا کہ اسے تو آگرہ جانا ہے۔ وہ تازہ دم اور خوش و خرم تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے سفر کی تیاری شروع کردی۔

صبح چھ بجے وہ آگرہ جانے والی گاڑی میں بیٹھا تھا!

❀......❀......❀

سورج سنگھ کے لیے وہ سونے کی رات نہیں تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس نے سونے کی کوشش نہ کی ہو۔ کیونکہ جاگنے کا کچھ حاصل نہیں تھا۔ لیکن نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ چار بجے کے قریب اس نے سونے کا ارادہ ختم کردیا۔ اس نے سوچا تھا کہ صبح سات بجے وہ رگھبیر کے پاس جائے گا۔

لیکن پانچ بجے تو وہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دس بجے تھے، دن چڑھ گیا تھا۔

اس نے منہ ہاتھ دھویا، دانت صاف کیے اور ناشتہ کیے بغیر ہی گھر سے نکل آیا۔

وہ رگھبیر کے گھر پہنچا تو رگھبیر نے اسے تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو سویرے ہی آدھمکے گا۔ مگر تو نے اتنی دیر کردی۔ لگتا ہے، نشہ اتر گیا تیرا۔"

"مجھے نشہ تھا ہی نہیں...... بس صبح ہوتے ہوتے نیند آ گئی تھی۔"

"تجھے یاد ہے، رات تو میرے پاس آیا تھا؟"

"کہہ تو رہا ہوں کہ میں نشے میں نہیں تھا۔ مجھے سب یاد ہے۔" سورج نے جھنجلا کر کہا۔

"یہ بھی یاد ہے کہ تو نے مجھ سے کیا بات کی تھی۔"

"ہاں ہاں، یاد ہے۔ وہ لڑکا اوتار سنگھ یہاں آیا ہوا ہے۔"

"چل پھر راجو اور گوپال کے ساتھ چلتے ہیں۔"

وہ دونوں راجو کے گھر جانے کے ارادے سے نکل آئے۔ لیکن آدھے راستے میں ہی راجو انھیں مل گیا۔ اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ گوپال، کرتارا اور جسونت بھی تھے۔

"کہاں چل دیے تم دونوں؟" کرتارے نے ان سے پوچھا۔

"تم لوگوں سے ہی ملنے کے لیے نکلے تھے۔" رگھبیر نے کہا۔

کرتارے نے بہت غور سے انھیں دیکھا۔ "کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟"

"ایک بڑی بات ہے۔" رگھبیر جھجکنے لگا۔

"کچھ بول تو سہی۔"

مگر رگھبیر ہچکچا رہا تھا۔ کرتارے کے اصرار پر اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "یہ سورج کہتا ہے کہ اس نے رات اس لڑکے اوتار سنگھ کو دیکھا ہے۔"

"تو پھر؟"

"یہ رات نشے میں تھا۔ ہم سب ساتھ ہی بیٹھے پی رہے تھے۔ اسے چڑھنے لگی تو یہ یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ اوتار سنگھ کو تلاش کرے گا۔ شراب چڑھتی ہے تو یہ ہمیشہ یہی کرتا ہے۔ پھر آدھی رات کو یہ میرے گھر آیا اور کہنے لگا کہ اس نے اسے بڑے مندر میں جاتے دیکھا ہے۔"

کرتارا ہنسنے لگا۔ مگر جسونت بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ "تو اب تو اتر گیا ہوگا نشہ؟" کرتارے نے پوچھا۔

"نہیں یارا۔ یہ کہتا ہے، وہ سچ مچ وہی تھا۔"

"تو پھر؟" اس بار کرتارے کا لہجہ کڑا تھا۔

رگھبیر کے بولنے سے پہلے ہی سورج بول اٹھا۔ "پھر یہ کہ ہمارے لیے یہ بدلہ لینے کا بہت اچھا موقع ہے۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ اسے بھول جاؤ۔" کرتارا بولا۔

"راجپوت کے لیے بے عزتی بھولنے کی چیز نہیں ہوتی یارا۔"

"سورج ٹھیک کہہ رہا ہے کرتارے۔" راجو اور گوپال نے بہ یک آواز تائید کی۔

"کرتارے...... میں نے کہا تھا کہ اب اسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ ان سے کہو کہ اسے بھول جائیں۔" جسونت نے پہلی بار زبان کھولی۔ وہ بے حد سخت لہجے میں کرتارے سے مخاطب ہوا تھا۔

"ہمارے درمیان یہ فیصلہ ہو چکا تھا۔" کرتارے نے دوستوں سے کہا۔

رگھبیر نے کرتارے کا ہاتھ پکڑا اور بڑی لجاجت سے بولا۔ "میری ایک بات...... الگ چل کر۔"

کرتارا چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر جسونت کی طرف متوجہ ہوا۔ "چلو یارا، بات سننے میں کیا جاتا ہے اپنا۔"

کرتارا ان دونوں کو الگ لے گیا۔ "دیکھو مجھے یقین نہیں ہے کہ سورج کی بات پکی ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ نشے میں تھا اور نشے میں وہ اپنے باپ کو بھی اوتار سنگھ سمجھ سکتا

ہے۔"

"تو ہم کیا کریں؟" جسونت نے بگڑ کر کہا۔

"عقل سے کام لو۔ اگر وہ اوتار سنگھ تھا اور مندر میں ٹھہرا ہوا تھا تو اب تک جا چکا ہوگا اور وہ اوتار سنگھ نہیں تھا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" رگھبیر نے انھیں سمجھایا۔ "سورج کی تسلی کے لیے مندر تک جانے میں ہمارا کیا بگڑ جائے گا۔"

"اور اگر وہ اوتار سنگھ ہی ہے اور اس وقت بھی مندر میں موجود ہے تو۔" جسونت نے سوال اٹھایا۔

"اس کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن ایسا ہوا تو دیکھ لیں گے۔"

"جب امکان ہی نہیں ہے تو ضرورت کیا ہے۔"

"دوست کی تسلی تو ہو جائے گی۔ یاری میں فرق نہیں آنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے یارا۔" کرتارے نے جسونت سے کہا۔ "رگھبیر کی بات مان لینی چاہیے۔"

"تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔" جسونت نے بے دلی سے کہا۔

❁.....❁.....❁

صبح سویرے پوجا کے لیے آنے والے آئے اور انھیں مندر کا دروازہ بند ملا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مندر کا دروازہ تو صبح ہی کھل جاتا تھا۔ بہر حال انھوں نے سوچا کہ کسی وجہ سے دیر ہوگئی ہے۔ ابھی دروازہ کھل جائے گا۔ وہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ مشکل سے آٹھ دس افراد ہوں گے۔ ان میں بھی ایک کے سوا سب عورتیں تھیں۔ دروازے پر دستک دینے کی ان میں ہمت نہیں تھی کہ کہیں پجاری ناراض نہ ہو جائے۔

ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔

کچھ دیر بعد پوجا کے لیے آنے والے آٹھ دس افراد پھر جمع ہو گئے۔ اب دن چڑھ آیا تھا۔ وہ لوگ بھی تبصرے کرتے رہے۔ لیکن دروازہ کھلوانے کی کوشش انھوں نے بھی نہیں کی۔

اسی طرح لوگ آتے اور جاتے رہے۔ مجمع لگنے کی نوبت بہر حال نہیں آئی۔

لیکن ساڑھے دس بجے جو لوگ مندر کے بند دروازے کے سامنے کھڑے تھے، وہ واضح طور پر تشویش میں مبتلا تھے۔ انھیں یہ بند دروازہ بہت غیر معمولی بات لگ رہا تھا اور وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس بار ان میں مردوں کی تعداد تین تھی۔

وہ چھ دوست مندر کے پاس پہنچے تو انھوں نے لوگوں کو مندر کا دروازہ پیٹتے پایا۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟" جسونت بڑبڑایا۔

"کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔" سورج نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

"چل کر پوچھیں گے تو پتا چلے گا۔"

ویسے تو مندر کا بند دروازہ ہی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلا رہا تھا۔ دروازہ پیٹنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ "ایسا آج تک نہیں ہوا کہ مندر کا دروازہ صبح سویرے ہی نہ کھل گیا ہو۔" دروازہ پیٹا جاتا رہا۔ لیکن اندر نقل و حرکت تھی نہ کوئی آواز۔ وہاں تو موت کا سا سکوت طاری تھا۔

"گلی میں دروازہ ہے۔ اسے دیکھیں۔" گوپال نے کہا۔

"ہاں..... ضرورت پڑی تو اسے توڑا بھی جا سکتا ہے۔" راجو بولا۔

وہ گلی کی طرف چل دیے۔ ان کے ساتھ وہ تینوں مرد بھی تھے، جو مندر کا دروازہ پیٹ رہے تھے۔ عورتیں وہیں رہ گئیں۔

انھوں نے چھوٹے دروازے پر دستک دی۔ مگر وہ ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی کھل گیا۔

"ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔" اس بار کرتارا بڑبڑایا۔

وہ سب چند لمحے ہچکچاتے رہے۔ مگر بالآخر اندر داخل ہو گئے۔

ایک ایک کر کے وہ کمروں میں جھانکتے پھرے۔ مگر وہ خالی تھے۔ آخر بڑے پجاری کے کمرے میں انھیں وہ سب لوگ نظر آئے۔

وہ بڑا عجیب منظر تھا۔ دیوداسیاں اور چیلے بے ترتیب بکھرے پڑے تھے۔ بڑا پجاری بھی بے ہوش تھا۔ مگر سانسوں کی وجہ سے اس کی موٹی توند اوپر نیچے نہ ہو رہی ہوتی تو وہ یہی سمجھتے کہ وہ مر گیا ہے۔

انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں لڈوؤں کا ایک ٹوکرا رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سورج سنگھ نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ "یہ اسی کی حرکت ہے۔"

جسونت نے اسے گھور کر دیکھا۔ "دوسرے لوگوں کی موجودگی میں تم اس کی بات نہیں کرو گے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

لیکن سورج نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ "میں نے تمھیں بتایا تھا نا کہ وہ مٹھائی کا ٹوکرا لے کر مندر میں داخل ہوا تھا۔ یہ وہی ٹوکرا ہے۔" وہ رگھبیر سے مخاطب تھا۔

دوسرے تین مرد اس کی بات بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ "پرنتو ہوا کیا ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"اسے سمجھاؤ۔ ہم بعد میں اکیلے میں بات کریں گے۔" کرتارے نے رگھبیر سے کہا۔

مگر اتنی دیر میں سورج پوچھنے والے کو جواب دے رہا تھا۔ "جو ہوا ہے، نظر آ رہا ہے۔ وہ بھنگ کے لڈو لایا تھا۔ یہ سب لوگ اسی کے اثر میں ہیں۔"

"تم نے اسے دیکھا تھا؟" دوسرے آدمی نے پوچھا۔

''ہاں، کہہ تو رہا ہوں۔ دیکھا تھا۔''

''تم اسے جانتے ہو؟'' یہ تیسرا تھا۔

رگھبیر نے سورج کا ہاتھ تھاما اور اسے تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ ''سورج، جو بات ہمیں دوستوں کو اکیلے میں کرنی ہے، وہ سب کے سامنے نہ کر۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ابھی تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا ہوا ہے۔''

''میں کیوں چپ رہوں؟''

''میں کہہ رہا ہوں نا۔'' رگھبیر کے لہجے میں سختی تھی۔

''ٹھیک ہے۔''

وہ دونوں اندر آئے۔ وہاں باہر کے تین آدمیوں میں سے ایک جسونت سے کہہ رہا تھا۔ ''تمھارے متر کی بات ٹھیک لگتی ہے۔ پرنتو اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''ہمیں کچھ نہیں معلوم۔'' جسونت نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب انھیں ہوش میں لایا جائے، تبھی کچھ پتا چلے گا۔''

ان میں سے وہ آدمی باہر نکل گئے۔ ایک وہیں رہ گیا۔ وہ بے ہوش لوگوں کو ہوش میں لانے کی کوشش میں ان لوگوں کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ راجو باہر سے پانی کی بالٹی لے کر آیا تھا اور وہ سب ان لوگوں پر پانی ڈالتے ہوئے انھیں ہلا رہے تھے۔

مگر بے ہوش لوگوں کی آنکھیں کسی طرح کھل ہی نہیں رہی تھیں۔ ادھر گلی کے دروازے سے اور لوگ بھی اندر آ گئے تھے اور مزید لوگ مسلسل آئے جا رہے تھے۔ سب اپنی اپنی کہے جا رہے تھے۔ مندر کا اندرونی حصہ آوازوں سے بھر گیا تھا۔

بالآخر سب سے پہلے پجاری ہی کو ہوش آیا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر چیخا۔ ''ارے..... میرے پانچ سو روپے!''

''ہوش میں آؤ پنڈت جی۔'' راجو نے اسے ہلا ڈالا۔ ''بتاؤ، یہ سب کیا ہے۔''

پجاری شروع ہو گیا۔ ''وہ ایک بالک تھا.....''

''میں نے کہا نا، وہ وہی تھا۔'' سورج نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

''چپ رہو، بات سننے اور سمجھنے دو۔'' کرتارے نے اسے ڈپٹا۔

پنڈت کا دماغ اب بھی چکرا رہا تھا۔ لیکن سنبھل سنبھل کر اس نے بتانا شروع کیا۔ دوسروں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے والے بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ادھر ہجوم کافی بڑھ گیا تھا۔ جسونت کافی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بار بار کرتارے سے سرگوشی میں بات کرتا۔ کرتارا بھی متفکر تھا۔

پجاری نے اپنی پوری کتھا سنا ڈالی۔ ''لڈو کھانے کے بعد میں دیکھتے ہی دیکھتے بے

ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔''

''پرنتو اس کا کچھ مطلب تو ہے۔'' کسی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، یہ چوری کا معاملہ ہے۔ یہاں قیمتی چیزیں بھی تو ہوں گی۔''

''یہ بات نہیں۔ اسے پیسے کی ضرورت نہیں۔'' سورج نے جلدی سے کہا۔ ''وہ بڑے پیسے والے لوگ ہیں۔''

''تم اسے جانتے ہو؟''

''ہاں..... اچھی طرح۔ وہ ٹھاکروں کی گڑھی کے پرتاپ سنگھ کا بیٹا اوتار سنگھ تھا۔''

لیکن پنڈت کو چوری کی بات لگ گئی تھی۔ وہ جلدی سے کمرے میں رکھی تجوری کی طرف لپکا۔ اس نے چابی لگائی اور تجوری کھول کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے سر ہلایا اور آسودہ آواز میں بولا۔ ''بھگوان کی کرپا سے سب ٹھیک ہے۔''

''سب ٹھیک تو ہو نہیں سکتا۔'' کسی نے کہا۔ ''اس نے سب کو مذاق میں بے ہوش تو نہیں کیا ہوگا۔''

''تم اس کا حلیہ بتاؤ۔'' سورج نے پجاری سے فرمائش کی۔

پجاری اوتار سنگھ کا حلیہ بتا رہا تھا اور سورج اپنے ساتھیوں کو فاتحانہ نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ جسونت کے علاوہ وہ بھی اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔

''مان گئے نا کہ وہ اوتار سنگھ ہی تھا۔'' سورج نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''یہ تو دیکھو کہ وہ کیا کر کے گیا ہے۔'' راجو بولا۔

اس پر پجاری کو کچھ خیال آیا۔ دراصل ابھی وہ دوا کے اثر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا تھا۔ اس کا دماغ دھندلایا ہوا سا تھا۔ بہرحال وہ کمرے سے نکلا اور مندر کے بیرونی حصے کی طرف کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ سب لوگ اس کے پیچھے تھے۔

پجاری دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ پاگلوں کی طرح اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

دوسرے لوگ بھی اندر گھسے۔ اور ان سب کا بھی برا حال ہو گیا۔ اب لوگ اندر گھستے جا رہے تھے اور واویلا بڑھتا جا رہا تھا۔

مندر کا منظر بہت عجیب تھا۔ لگتا تھا کہ لوہے کے کسی ہاتھی نے اسے روند ڈالا ہے۔ بات صرف اتنی سی نہیں تھی کہ وہاں کوئی بت سلامت نہیں تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ وہاں یہ بتانا بھی مشکل تھا کہ کہاں کون سا بت رہا ہوگا۔ وہاں تو صرف ملبہ تھا۔

ان سب کے لیے وہ گویا قیامت تھی۔ ردِعمل سب کا الگ الگ تھا۔ کوئی فرش سے سر ٹکرا رہا تھا تو کوئی دیوار سے۔ کوئی ہاتھ ٹیکے بیٹھا تھا تو کوئی دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ پجاری پاگلوں کی طرح

اِدھر سے اُدھر بھاگتا پھر رہا تھا، جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ وہ کیا کرے۔

جسونت نے کرتارے کو اشارہ کیا اور کرتارے نے دوسرے ساتھیوں کو۔ وہ سب خاموشی سے باہر نکل آئے۔ مندر میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ بتوں کو توڑے جانے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔

❀……❀……❀

دوستوں کی میٹنگ زیادہ دیر نہیں چلی۔ جسونت کے لیے اب بھی اس بات کی اہمیت تھی کہ کیدار ناتھ نے اسے منع کیا تھا…… بتایا تھا کہ اگر اوتار سنگھ کو کچھ ہو گیا تو اس کا معاملہ بننے کے بجائے بالکل ہی بگڑ جائے گا۔ وہ اب بھی یہی چاہتا تھا کہ اوتار سنگھ کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

پہلے تو کرتارے نے معاملہ سنبھال لیا تھا۔ ورنہ جو لوگ وہاں سے زخمی ہو کر آئے تھے، وہ تو بدلہ لینے پر مصر تھے۔ مگر کرتارے نے انھیں سمجھایا کہ یاری دوستی ہی کی خاطر وہ اس کام کے لیے تیار ہوئے تھے اور اب یاری دوستی ہی کی خاطر اس سے بچنا ہے۔

لیکن اب خود کرتارے نے جسونت کو سمجھایا۔ ''دیکھو یارا، دھرم دوستی سے بڑا ہوتا ہے۔ اب میں کسی کو سمجھا نہیں سکتا۔''

''پھر بھی……''

''بات صرف ہم لوگوں کی نہیں، پورے شہر کی، اپنے دھرم کی عزت کی ہے۔'' گوپال نے جسونت کی بات کاٹ دی۔ ''اب اگر ہم چاہیں بھی تو اس معاملے سے الگ نہیں رہ سکتے۔''

''گوپال ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''یقین نہ آئے تو باہر چل کر دیکھ لو۔'' گوپال نے چیلنج کیا۔

وہ سب باہر آ گئے۔ باہر فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں لوگ جمع تھے اور اس موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔ وہ لوگ ان کے پاس سے گزرتے رہے اور ان کے کانوں میں باتیں پڑتی رہیں۔

''پر وہ تھا کون؟''

''وہ کوئی بھی تھا، ہمارے شہر کا ایک آدمی اسے جانتا ہے۔''

''اور وہ آدمی کون ہے۔''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ کوئی بتا رہا تھا کہ ایسا ایک آدمی ہے۔''

انھیں نہیں معلوم تھا کہ اس وقت وہ آدمی ان کے پاس سے گزر کر جا رہا ہے۔

''سورج کو بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی۔'' جسونت نے تاسف سے کہا۔

''وہ…… کوئی ہمارے دیوی دیوتاؤں کا اپمان کرے اور ہم [illegible] جانتے [illegible]

ہونٹ سی لوں۔'' سورج نے چیخ کر کہا۔

''سورج کا کوئی دوش نہیں۔'' کرتارا بولا۔

وہ کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک شخص نے سورج کو پہچان لیا۔ وہ لپک کر اس کے پاس آیا۔ ''تم نے ہی کہا تھا نا کہ تم اس مورکھ کو جانتے ہو۔''

ان کے گرد لوگ جمع ہونے لگے۔ ''ہاں…… میں جانتا ہوں کہ وہ کون تھا۔'' سورج نے کہا۔

''وہ کوئی مُسلا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''نہیں……راجپوت ہے۔ اوتار سنگھ نام ہے اس کا۔ پتا کا نام ٹھاکر پرتاپ سنگھ ہے۔''

''چھی چھی چھی……راجپوت ہو کر ایسی حرکت!''

''کل یُگ اسی کو کہتے ہیں بھائی۔'' کوئی بولا۔

''اچھا……وہ رہتا کہاں ہے؟''

''ایک گاؤں ہے……ٹھاکروں کی گڑھی۔'' سورج نے بتایا۔

لوگ پوچھے جا رہے تھے اور سورج جواب دے رہا تھا۔ اسی دوران جسونت اور کرتارا وہاں سے چلے گئے۔ اصل میں جسونت نے اسے اشارے سے وہاں سے ہٹنے کو کہا تھا۔

''کتنے گھر ہوں گے اس گاؤں میں؟'' کسی نے سورج سے پوچھا۔

''سو سے اوپر ہی ہوں گے۔ بڑا گاؤں ہے۔'' سورج نے کہا۔

''تم ہمیں راستہ دکھاؤ گے؟'' ایک جوشیلا جوان آگے بڑھا۔ ''ہم اس گاؤں کا نام و نشان مٹا ڈالیں گے۔''

اسے دیکھ کر چند اور جوان آگے بڑھ آئے۔ ''ہم بھی تمھارے ساتھ ہیں۔''

''کیوں نہیں۔ کوئی جائے نہ جائے، میں اور میرے متر وہاں جائیں گے اور اس لڑکے کو ختم کر کے ہی آئیں گے۔'' سورج نے اپنے دوستوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر اسے جسونت اور کرتارے کہیں وہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔

''اوش جائیں گے۔'' راجو نے کہا۔ ''پرنتو پورا گاؤں پھونکنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف دوشی کو سزا دینی ہے۔''

اب چاروں دوستوں کو خیال آ رہا تھا کہ انھیں جسونت اور کرتارے کی بات بھی رکھنی ہے۔ معاملہ کافی پیچیدہ ہو گیا تھا۔ ''بالکل ٹھیک۔ گاؤں کے نردوش لوگوں کو کیوں سزا دی جائے۔'' رگھبیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ دوشی کو ہمارے حوالے کر دیں۔'' جوشیلے جوانوں میں سے ایک نے کہا۔

''اور ایسا نہ ہوا تو ہم پورا گاؤں [illegible] ڈالیں گے۔'' دوسرا بولا۔

"تو کب چلو گے؟" تیسرے نے سورج سے پوچھا۔

سورج نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ "ہم تو تیار ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ابھی نکل کھڑے ہوں گے۔"

"ہمیں ایک گھنٹا دو۔ ہم تیار ہو کر آتے ہیں۔ چوک پر ملیں گے۔"

"خیال رکھنا۔ ٹھاکروں سے مقابلہ ہے۔" کسی نے چیلنج کیا۔

"دیکھ لیں گے۔" کئی غراہٹیں اُبھریں۔

مجمع چھٹنے لگا۔ چاروں دوست گوپال کے گھر کی طرف چل دیے۔ "یہ کرتارا کہاں گیا؟"

"جسونت کے ساتھ ہوگا۔ وہ اس معاملے میں ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہمیں تو موقع مل گیا ہے۔ آج وہ نہیں بچے گا۔"

❀......❀......❀

جسونت کرتارے کا ہاتھ پکڑ کر تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ "جلدی کیا ہے یارا؟" کرتارے نے احتجاج کیا۔

"جلدی تو ہے۔" جسونت نے کہا۔ "ہمیں ان لوگوں سے پہلے ٹھاکروں کی گڑھی پہنچنا ہے۔"

"کن لوگوں سے پہلے؟"

"تم نہیں سمجھ رہے، یہ لوگ وہاں حملہ کرنے جائیں گے۔"

"تو پھر؟"

"کیدو نے کہا تھا کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا تو اس کا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ اور اب اس لڑکے کی زندگی خطرے میں ہے۔ ہمیں جا کر کیدو کو خبردار کرنا ہے۔ تاکہ وہ لوگ اسے پہلے ہی اسے چھپا دیں یا اسے کہیں بھیج دیں۔" جسونت نے کہا۔

"یہ بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے جسونت۔ اچھا یہی ہے کہ ہم اس معاملے سے الگ رہیں۔" کرتارے نے اسے سمجھایا۔

"تو بے شک نہ چل۔ میں تو جاؤں گا۔ تو جانتا ہے کہ میرے لیے یاری دھرم سے بڑھ کر ہے۔"

"تو مجھے کیوں گالی دیتا ہے۔ چل، میں ہر حال میں تیرے ساتھ ہوں۔" کرتارے نے بڑے پیار سے کہا۔ "بول کیا ارادہ ہے۔"

"بس سیدھے ٹھاکروں کی گڑھی چلیں گے۔"

"گھر پر تو کہہ دوں۔"

"اس وقت ہم ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس وقت نکلنا ہے۔ دیر ہو گئی تو ہم

کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے یارا۔" کرتارے نے سپر ڈال دی۔

❀......❀......❀

ایک گھنٹے بعد وہ چاروں چوک میں پہنچے تو وہاں تین جوان آدمی پہلے سے موجود تھے۔ انھیں کچھ مایوسی ہوئی۔ "صرف تین!" گوپال بولا۔

"انتظار کرو۔ ابھی اور آ جائیں گے۔" راجو نے کہا۔

گوپال ان تینوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ان میں سے ایک کے پاس تلوار نظر آ رہی تھی۔

"تم لوگ کیا لائے ہو؟" اس نے باقی دونوں سے پوچھا۔

"میرے پاس خنجر ہے۔"

"میرے پاس طمنچہ ہے۔" تیسرا بولا۔

"حملہ کرنے کے لیے کتنے آدمی ہونے چاہئیں تمھارے خیال میں؟" پہلے نے سورج سے پوچھا۔

سورج چند لمحے سوچتا رہا۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ پچھلی بار وہ آٹھ کڑیل جوان گھات لگا کے اس لڑکے کو شکار کرنے گئے تھے اور وقت آیا تو چار زخمیوں کو لے کر واپس آئے تھے بلکہ کرتارے کا کہنا تھا کہ اگر وہ جذباتی ہو جاتا تو وہ آٹھوں وہیں شکار ہو جاتے اور پکڑے جاتے۔ تو چھپ کر وار کرنے میں یہ حال تھا۔ مگر اب تو وہ کھل کر حملہ کرنے جا رہے تھے۔ اس کے دل میں وسوسے آنے لگے۔ جانے والوں میں کون تھڑ دلا ہے، کب بھاگ کھڑا ہوگا، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

مگر اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ بات غیرت کی...... اور اس سے بڑھ کر دھرم کی تھی۔ "سو ڈیڑھ سو آدمی ہونے چاہئیں۔" اس نے کہا۔

"پر ہم تو صرف سات ہیں۔"

"آدھا گھنٹا اور دیکھ لیتے ہیں۔" سورج نے کہا۔

"اب تو چاہے اکیلے جانا پڑے، میں ضرور جاؤں گا۔" راجو تاؤ کھاتے ہوئے بولا۔

وقت گزرنے لگا۔ پھر لوگ ایک ایک دو دو کر کے آنے لگے۔ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی تو کسی کے پاس بلم تھا۔ سورج کو مایوسی ہونے لگی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ تعداد میں کمی کا بہانہ بنا کر مہم کو منسوخ کر دے گا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے دیکھا۔ تعداد چالیس پر پہنچ چکی تھی۔ "یہ تو ناکافی ہیں۔" اس نے رگھبیر سے کہا۔

"تو پھر؟"

"میرا خیال ہے، آج رہنے دیں۔"

"چوٹ وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔" رگھبیر بولا۔ "ورنہ رات گئی تو بات گئی۔"

"لیکن کم تعداد میں ڈر ہے......"

"میں جانتا ہوں۔ ابھی اور انتظار کرتے ہیں۔"

ایک گھنٹے میں تعداد سو سے بڑھ گئی۔ اب ہتھیاروں کا جائزہ لیا گیا۔ حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ طمنچوں اور بندوقوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سورج کو متفقہ طور پر سردار چن لیا گیا۔

اب سوال یہ تھا کہ سفر کیسے کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ اس کے پاس دو ٹرک ہیں۔ یوں یہ بات بھی بن گئی۔

بالآخر انھوں نے سفر شروع کر دیا۔

❁......❁......❁

جسونت اور کرتارا کیدار ناتھ کے گھر پہنچے۔ پتا چلا کہ وہ کسی کام سے قریبی گاؤں گیا ہوا ہے۔ "وہ آتے ہی ہوں گے ویر جی۔" کیدار ناتھ کی بیوی نے کہا۔

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اب بہتر یہی تھا کہ وہ براہِ راست ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو خبردار کریں۔

"آپ اندر آ جائیں نا۔" کیدار ناتھ کی بیوی نے کہا۔

"نہیں۔ ہم حویلی جا رہے ہیں۔ کیدو آ جائے تو اسے اُدھر ہی بھیج دینا۔"

وہ دونوں حویلی کی طرف چل دیے۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ وہاں موجود تھا۔ اسے پتا چلا کہ جے پور سے مہمان آئے ہیں تو اس نے انھیں بلوا لیا۔

وہ آئے تو وہ انھیں غور سے دیکھتا رہا۔ "میں نے آپ لوگوں کو پہچانا نہیں۔"

"ہم کیدار ناتھ جی کے دوست ہیں۔" جسونت نے کہا۔

تمہید کا موقع نہیں تھا۔ کرتارے نے کہا۔ "ہم خبردار کرنے آئے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کی جان خطرے میں ہے۔"

ٹھاکر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ چہرے پر سختی چھا گئی۔ "کیسے؟ اور کیوں؟"

جسونت نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ اسی دوران ٹھاکر کو دیکھ کر انھیں بار بار ایسا لگا کہ وہ اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔

"تمھیں وشواس ہے کہ وہ اوتار سنگھ ہی تھا۔"

"پکا وشواس ٹھاکر جی۔ پر آپ چھوٹے ٹھاکر کو بلا کر پوچھ لیں۔"

"وہ تو ابھی تک واپس ہی نہیں آیا ہے۔" ٹھاکر نے اطمینان سے کہا۔

جسونت اور کرتارے کو یقین نہیں آیا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ٹھاکر جھوٹا اور بزدل بھی نہیں ہو سکتا۔ پر اکلوتے بیٹے کی محبت بڑی چیز ہوتی ہے۔

"اب آپ کیا کریں گے؟" جسونت نے پوچھا۔

"تیاری کریں گے۔ اور حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیں گے۔"

"وہ بڑی تعداد میں آئیں گے۔"

"ہم لڑائی کے دوران گنتی نہیں کرتے۔ ہاں لڑائی کے بعد کٹے ہوئے سر گنتے ہیں۔"

ٹھاکر حویلی کے باہر آ بیٹھا اور اس نے اپنے ملازم اِدھر اُدھر دوڑا دیے۔ تھوڑی ہی دیر میں گاؤں کے تمام مرد وہاں جمع ہو گئے۔ ان میں جمال دین اور وصال دین بھی تھے۔ مولوی صاحب بھی باہر نکل آئے تھے۔

"یہ لوگ جے پور سے خبر لائے ہیں کہ ہمارے گاؤں پر حملہ ہونے والا ہے۔" ٹھاکر نے کہا۔ اس نے ہاتھ سے جسونت اور کرتارے کی طرف اشارہ کیا۔

"تو مالک، ہم نے چوڑیاں تو نہیں پہن رکھی ہیں۔" ایک مزارعہ بولا۔

"ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔" دوسرے نے کہا۔

"ہمیں ان کی تعداد کا اندازہ نہیں۔ وہ بہت زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"ٹھاکر جی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں تو لڑنا ہے۔" جمال دین بولا۔

ٹھاکر نے ایک گہری سانس لی۔ "تم لوگوں نے یہ نہیں پوچھا کہ حملے کا کارن کیا ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن میں تمھیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ میرے پتر اوتار سنگھ نے جے پور کے بڑے مندر میں تمام بت توڑ ڈالے ہیں۔ تم سب جانتے ہو کہ اوتار سنگھ واپس نہیں آیا ہے کہ میں اس سے پوچھوں کہ یہ آرودھ سچا ہے یا جھوٹا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر یہ سچ بھی ہے تو میں اوتار سنگھ کا بال بانکا نہیں ہونے دوں گا۔ میں لڑوں گا۔"

ٹھاکر کی بات سن کر سب سناٹے میں آ گئے تھے۔ کوئی کچھ بھی نہیں بولا۔

"اب میرا کہنا یہ ہے کہ تم میں سے جس کا جی چاہے، گاؤں چھوڑ دے۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی اور جس کا جی نہ چاہے وہ لڑائی میں حصہ نہ لے۔ ہم ٹھاکر لوگ ویسے بھی اپنی جنگ آپ ہی لڑتے ہیں۔"

یہ سن کر جہاں کچھ لوگوں نے سکون کی سانس لی، وہاں کچھ لوگ تڑپ گئے۔ "ہم آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں ان داتا۔" ان میں سے ایک نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "جیون بھر نمک کھایا ہے آپ کا۔"

"تو جو میرے ساتھ ہیں، وہ اس طرف آ جائیں۔" ٹھاکر نے کہا۔

کچھ لوگ اس طرف آ گئے۔ دوسرے لوگ نظریں چرا رہے تھے۔

ٹھاکر نے بنسی دھر کو حکم دیا کہ حویلی سے اسلحہ نکال کر لائے۔ اسلحہ ہر طرح کا تھا۔ اس میں پستول، بندوقیں اور کارتوس بھی تھے اور نیزے، تلواریں اور کلہاڑیاں بھی۔ "جس کا جو جی

چاہے، لے لے۔''

لوگوں نے اپنی پسند کے ہتھیار اٹھا لیے۔

''ہم گاؤں کے باہر ہی ان کا مقابلہ کریں گے۔'' ٹھاکر نے اعلان کیا۔ ''تم سب وہاں پہنچ جاؤ۔ میں آتا ہوں۔''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ میں لڑائی میں آپ کا ساتھ نہ دوں۔'' مولوی صاحب نے جوش سے کہا۔

''آپ مہمان ہیں۔ مجھ پر کرپا کریں اور اندر چلے جائیں۔''

مولوی صاحب اندر چلے تو گئے۔ لیکن ان کی کیفیت عجیب تھی۔ ان کے لیے تو یہ بہت بڑی خوش خبری تھی۔ اوتار سنگھ ان سے عربی پڑھتا رہا تھا۔ اور اب اس پر بت شکنی کا الزام تھا۔ انھیں تو ایسا لگ رہا تھا کہ اس گاؤں میں اللہ نے ان کے لیے سعادتیں ہی سعادتیں لکھ دی ہیں۔ انھوں نے سوچ لیا کہ بت شکنوں کی اس لڑائی میں وہ ہر حال میں بت شکنوں کا ساتھ دیں گے۔

ادھر ٹھاکر کی گاؤں والوں سے بات چیت کے دوران جسونت اور کرتار سنگھ نے مولوی صاحب کو دیکھا تو ان کے درمیان معنی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ بیٹے نے بھگوان اور دیوتاؤں کا اپمان کیا اور باپ گھر میں ایک مُسلے کو لیے بیٹھا ہے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ اوتار سنگھ پر جو آرودھ لگایا گیا ہے، وہ سچا ہے۔

پھر جب ٹھاکر نے اعلان کیا کہ اگر اس کا بیٹا دھرم کا مجرم ہے، تب بھی وہ اس کے لیے لڑے گا، تو ان دونوں کا دل برا ہو گیا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسی وقت وہاں سے نکل جاتے اور حملہ آوروں سے جا ملتے۔ لیکن کرتارا جسونت کا لحاظ کر رہا تھا اور جسونت کیدار ناتھ کے مفاد میں چپ تھا۔

مولوی صاحب اندر گئے تو جسونت نے پوچھا۔ ''یہ مُسلا کون ہے آپ کے ہاں؟''

''یہ میرے پتر کے استاد ہیں۔'' ٹھاکر کے لہجے میں بدمزگی تھی۔

ان دونوں کو احساس ہو گیا کہ ٹھاکر کو ان کا مُسلا کہنا برا لگا ہے۔

اسی وقت کیدار ناتھ چلا آیا۔ وہ گھر گیا تھا، جہاں اس کی پتنی نے اسے دونوں دوستوں کے متعلق بتایا تھا۔ وہ فوراً ہی حویلی چلا آیا اور وہاں پہنچا تو خاصا پریشان اور وحشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ باہر بھی اسے غیر معمولی سرگرمیاں دکھائی دی تھیں۔

اس نے جسونت اور کرتارے کو نظر انداز کر دیا۔ ''کیا بات ہے ٹھاکر ویر، یہ لڑائی کی تیاری کیسی؟'' اس نے ٹھاکر سے پوچھا۔

''تمھارے متروں نے جو بتایا ہے، اس کے بعد ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔'' ٹھاکر نے جواب دیا۔

کیدار ناتھ نے جسونت کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جسونت نے اسے سب ماجرا سنا

دیا۔ ''ٹھیک ہے ٹھاکر ویر۔'' کیدار ناتھ نے ٹھاکر سے کہا۔ ''ہم لڑیں گے۔ پر اوتار سنگھ پتر کہاں ہے؟''

''وہ تو واپس ہی نہیں آیا ہے ابھی۔'' ٹھاکر نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ حالانکہ وہ تشویش بس ظاہری تھی۔ اس کے لیے تو یہ مقام شکر تھا کہ اوتار سنگھ یہاں موجود نہیں ہے۔ لیکن اس نے کیدار ناتھ کی آنکھوں میں ابھرتی چمک دیکھ لی تھی۔ ویسے بھی وہ کیدو پر بھروسا نہیں کرتا تھا۔ اب اس صورتِ حال میں وہ اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اوتار سنگھ کہاں ہے۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ بے حد نامناسب ہے۔

''بھگوان چھوٹے ٹھاکر کی سہائتا کرے۔ میں چلتا ہوں ٹھاکر ویر۔ مجھے بھی تیاری کرنی ہے۔ ان دونوں کو ساتھ لے جاؤں۔''

ٹھاکر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کیدار ناتھ ان دونوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

ٹھاکر تھوڑی دیر صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے دوستوں کی طرف سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔

جو ہونا ہے، سو ہونا ہے۔ دیکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اسے تیاری کرنی تھی۔

تہ خانے میں جا کر اس نے اپنے ہتھیار جسم پر سجائے اور باہر نکل آیا۔

❁……❁……❁

کیدار ناتھ کے گھر میں تینوں دوست سر جوڑے بیٹھے تھے۔ کیدار ناتھ بار بار ہاتھ ملتا تھا اور تاسف سے سر ہلاتا تھا۔ ''کاش…… میں اس وقت موجود ہوتا۔ کاش میں تمھیں مل جاتا۔'' وہ بار بار یہی کہے جا رہا تھا۔

''تم نے تو مجھ سے یہی کہا تھا کہ اس معاملے سے ہاتھ اٹھا لیں۔ اس میں تمہارا نقصان ہے۔'' جسونت نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

''سمے سمے کی بات ہوتی ہے یارا۔'' کیدو نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کیا پتا تھا کہ بھگوان ایسا موقع دے گا۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''وقت نہیں ہے۔ ورنہ میں تمھیں سمجھا دیتا۔''

''پرنتو تم چاہتے کیا ہو؟''

''جو میں چاہتا ہوں، وہ تو اب ہو کر رہے گا۔ اور میں دونوں باپ بیٹوں کو جیتا نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لڑائی میں دونوں مر جائیں گے تو یہاں سب کچھ میرا ہوگا۔''

"پتا نہیں، کیا ہوگا۔ پر میں تو تمہاری خاطر یاروں کا بھی برا بن گیا اور دھرم کا بھی۔" جسونت نے افسوس سے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری بگڑی بات بھی بن جائے گی۔ اب میری بات دھیان سے سنو۔ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ گاؤں سے دور رک کر تم آنے والوں کا انتظار کرو۔ وہ آئیں تو انھیں بتاؤ کہ تم یہاں ٹھاکر کی طاقت دیکھنے آئے تھے اور وہ تم نے دیکھ لی ہے۔ اب تم ان کے ساتھ ہو۔"

"اس سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا۔"

"میں صرف ٹھاکر اور چھوٹے ٹھاکر کی موت چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لوگ یہاں اور خاص طور پر حویلی میں لوٹ مار کریں۔ تمھیں ان کو اس سے روکنا ہوگا۔ انھیں سمجھانا کہ انھیں بس اس اپمان کا بدلہ لینا ہے۔ صرف ٹھاکر اور اس کے پتر کی جان لینی ہے۔"

"ضروری نہیں کہ وہ مان بھی لیں۔"

"تب تو کوشش اور ضروری ہے۔"

❁ ❁ ❁

ٹھاکر کی گفتگو سننے کے بعد گاؤں کی آبادی تین دھڑوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ گاؤں میں سوا سو کے قریب مرد تھے۔ ایک دھڑا یہ کہتا تھا کہ جے پور کے مندر میں جو کچھ ہوا، اگر وہ اوتار سنگھ نے کیا تو ٹھاکر پر اور گاؤں پر بھگوان کا شراپ آ کر رہے گا۔ وہ گاؤں چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

دوسرا دھڑا اس پہلے گروہ کا ہم نوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ گاؤں چھوڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ اس لڑائی میں غیر جانب دار رہنا چاہتے تھے۔

اور تیسرا دھڑا وہ تھا جو ٹھاکر پر جان قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔

ان تینوں گروہوں کے درمیان بات ہوئی۔ ٹھاکر کے وفادار دوسرے لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کڑے وقت میں ٹھاکر کا ساتھ نہ چھوڑیں۔

"بات دھرم کی ہے۔ چھوٹے ٹھاکر کا دھرم تو بھرشٹ ہوگیا۔" پہلے گروہ میں سے ایک شخص نے کہا۔ "اس کی کرنی ہم کیوں بھگتیں۔"

"دھرم کی بات نہ ہوتی تو ہم جان دے دیتے۔ پر ٹھاکر جی کا ساتھ نہ چھوڑتے۔" دوسرے نے کہا۔

"ہمارے لیے تو ٹھاکر کی سیوا ہی دھرم ہے۔" ٹھاکر کے وفاداروں میں سے ایک بولا۔

مفاہمت نہ ہوئی تو ٹھاکر کے ہتھیار بند وفادار ٹھاکر کی ہدایت پر گاؤں کی سرحد کی طرف چل دیے۔ جمال دین اور وصال دین ان کے ساتھ تھے۔

ان کے جانے کے بعد گاؤں میں رہنے کے حامی لوگوں میں سے ایک نے پہلے گروہ

سے پوچھا۔ "یہ بتاؤ، گاؤں چھوڑ کر جاؤ گے کہاں؟"

اس پر خاموشی چھا گئی۔ اس سوال کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

"یہاں تمھارے گھر بار ہیں، زمینیں ہیں۔" دوسرے نے کہا۔ "تم جانتے ہو، تمھیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ سوچو، بال بچوں کو لے کر کہاں جاؤ گے۔ کیا کرو گے۔ بھوکے مر جاؤ گے۔"

"سچ کہتے ہو۔ پر ہم کیا کریں۔"

"گاؤں مت چھوڑو۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے گھروں پر سفید جھنڈے لگا دیں گے۔"

"لڑائی ہوتی ہے تو سفید جھنڈا کسی کو نظر نہیں آتا۔ پھر یہ تو دھرم کی لڑائی ہے۔"

اس بات نے گاؤں میں رہنے والوں کو ہلا دیا۔ بات غلط نہیں تھی۔

کافی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ گھروں پر سفید جھنڈے لہرا دیے جائیں۔ لیکن لوگ اپنے بال بچوں کو لے کر گاؤں سے باہر نکل جائیں۔ لڑائی میں اگر نقصان ہوا تو صرف گھروں کا ہوگا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد وہ واپس آ سکتے ہیں۔ آگے ان کے نصیب۔

اس پر عمل شروع ہوگیا!

❁ ❁ ❁

ہتھیار بند ٹھاکر گاؤں کی سرحد پر پہنچا تو لوگوں نے...... ٹھاکر کی جے...... کے نعرے لگا کر اس کا سواگت کیا۔ ٹھاکر نے جائزہ لیا۔ ان کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہوگی جبکہ کیدو کے متروں کا کہنا تھا کہ حملہ آور سو ڈیڑھ سو سے کم نہیں ہوں گے۔

ٹھاکر پریشان ہوگیا۔ حملہ آور شہر سے آ رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ان میں سے بیشتر کے پاس آتشیں اسلحہ ہوگا۔ اور یہاں بیشتر لوگ وہ تھے، جو طمنچہ یا بندوق چلانا بھی نہیں جانتے تھے۔ تو یہ تھوڑے سے لوگ ان لوگوں کے سامنے کتنی دیر ٹھہر سکیں گے۔

ٹھاکر موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ لیکن یہ جو اس کے وفادار تھے، جو اس پر جان نچھاور کرنے چلے آئے تھے، ان کی یقینی موت کا خیال اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ وہ اکیلا لڑے اور اکیلا مرے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ انھیں نہیں سمجھا سکتا۔

پھر بھی کوشش تو کرنی ہی تھی۔ اس نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ ان میں سے کوئی پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھا۔

اب ٹھاکر کو کچھ سوچنا تھا۔ یہاں کھلے میدان میں وہ چالیس افراد بڑی آسانی سے ختم ہو جاتے۔ تعداد کم ہو تو مدافعانہ جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ ایسی جنگ کھلے میدان میں نہیں لڑی جا سکتی۔

ہاں جنگل میں کامیاب رہتی ہے۔ اب یہاں جنگل تو تھا نہیں۔ البتہ بستی تھی۔

''میں نہیں سمجھتا کہ یہاں ان سے الجھنا مناسب ہوگا۔ حویلی کی طرف چلو۔'' ٹھاکر نے فیصلہ سنایا۔

حویلی پہنچ کر ٹھاکر کو جنگی حکمت عملی پر غور کرنا تھا۔ لڑائی کس طرح لڑی جائے کہ جانی نقصان کم سے کم ہو۔

''حویلی کا پھاٹک بند کر دیا جائے۔'' سندرداس نے تجویز پیش کی۔

''نہیں۔ ہم بزدل نہیں ہیں۔'' ٹھاکر نے فوراً ہی اسے رد کر دیا۔

اسی وقت کیدار ناتھ بھی آ گیا۔ وہ بھی مشاورت میں شریک ہو گیا۔

ٹھاکر کو سب سے زیادہ فکر ان لوگوں کی تھی، جو روایتی ہتھیاروں سے لڑنے والے تھے۔ وہ ان کے بچاؤ کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ وہاں اسے اور کیدار ناتھ کو ملا کر سترہ آدمی ایسے تھے، جو آتشی اسلحہ استعمال کرنا جانتے تھے۔ تو ایک صورت یہ تھی کہ وہ سترہ افراد حویلی میں بند ہو کر فائرنگ کر کے حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔ یہ طے تھا کہ کھلے میدان میں ہونے کی وجہ سے حملہ آوروں کو بہت تیزی سے جانی نقصان اٹھانا ہوگا۔ اور امکان تھا کہ لاشیں دیکھ کر وہ بھاگ کھڑے ہوں۔ لیکن یہ انداز ٹھاکر کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ کھل کر لڑنے والا آدمی تھا۔ اس کے پاس راجپوت کا روایتی دماغ تھا۔ مگر یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ تلوار، لاٹھی اور نیزے والے 25 افراد کی جان اس طرح بچ سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ انھیں لڑائی سے دست بردار ہونے پر آمادہ کر لے۔

اس نے یہ تجویز پیش کر دی۔ ''یہ لڑائی صرف ان لوگوں کو لڑنے دی جائے جو بندوق اور طمنچہ چلا سکتے ہیں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا اَن داتا۔'' وکرانت نے جلدی سے کہا۔

لیکن جن لوگوں کے تحفظ کی بات ہو رہی تھی، وہ دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے اور حویلی میں بند ہو کر وہ عضو معطل بن کر رہ جاتے۔ ''ایسا کرتے ہیں ٹھاکر جی کہ آپ بندوق والوں کو لے کر حویلی میں چلے جائیں۔ پہلے ہمیں مقابلہ کرنے دیں۔'' جمال دین نے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو ہم انھیں بھگا دیں گے۔''

''وہ بہت زیادہ ہوں گے جمال دین۔''

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ٹھاکر جی۔ حوصلہ تعداد سے بڑا ہو تو جیت جاتا ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے مالک۔'' سندرداس نے کہا۔ ''اور ہم ختم ہو جائیں تو آپ اندر بند ہو کر لڑتے رہیں۔''

یہ ٹھاکر کو گوارا نہیں تھا۔

مگر دور سے نعروں کی قریب آتی آواز سنائی دی تو انھوں نے سمجھ لیا کہ اب بحث کا

وقت نہیں رہا۔ عمل کا وقت آ پہنچا ہے۔

اسی وقت مولوی برکت علی بھی باہر آ گئے!

❁......❁......❁

جسونت اور کرتار سنگھ گاؤں کے باہر جا کھڑے ہوئے تھے اور آنے والوں کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سامنے سے گرد اڑتی دکھائی دی۔ پھر دو ٹرک نمودار ہوئے۔ وہ قریب آئے تو جسونت نے ہاتھ اٹھا کر انھیں رکنے کا اشارہ کیا۔

دونوں ٹرک رک گئے۔ اگلے ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ سورج بیٹھا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ عقبی حصے سے رگھبیر اور گوپال کود کر آ گئے۔ پچھلے ٹرک سے راجو بھی اتر آیا۔

''تم لوگ یہاں؟'' سورج نے حیرت سے کہا۔

''تمھیں دھرم کی لاج بھی نہیں رہی۔'' رگھبیر کے لہجے میں ملامت تھی۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' کرتار نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہم نے یہاں آ کر تمھارا کام آسان کر دیا ہے۔''

''ذرا ہمیں بھی سمجھاؤ۔''

''دیکھو...... ہم نے کیدار ناتھ سے بات کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اوتار سنگھ کو اس اپرادھ کی سزا ملنی ہی چاہیے۔''

''اس کے لیے ہمیں کیدار ناتھ کے آشیرباد کی ضرورت نہیں۔''

اس دوران اونٹوں پر سوار اور مسلح لوگ آئے اور وہاں رک کر ان کی باتیں سننے لگے۔

''ہم نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے بات کی اور اس سے کہا کہ وہ اپنے اپرادھی بیٹے کو ہمارے حوالے کر دے۔ پرنتو اس نے انکار کر دیا۔ وہ لڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔''

''تو ہم بھی یہاں اسی لیے آئے ہیں۔'' سورج نے کہا۔

''وہ تمھارا یار کیدار ناتھ۔ یہاں نظر نہیں آ رہا ہے؟'' رگھبیر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ ٹھاکر کے ساتھ ہے۔ لیکن اصل میں وہ ہماری طرف ہے۔ وہ موقع پا کر ٹھاکر کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''اور تم کہہ رہے تھے کہ تم نے یہاں آ کر ہمارا کام آسان کر دیا ہے؟''

''ہاں۔ ہم کام کی جان کاری لے کر آئے ہیں۔ ٹھاکر کے ساتھ مشکل سے پچاس آدمی ہوں گے۔ لیکن ان کے پاس اسلحہ بہت ہے۔ طمنچوں اور بندوقوں کی کمی نہیں۔''

''پچاس آدمی، بس!'' سورج نے حقارت سے کہا۔ ''اور ادھر دیکھو۔ ہم دو سو سے اوپر

جسونت نے جائزہ لیا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔ دو سو تو نہیں لگتے۔''

''اور لوگ گاڑی سے آ رہے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم اچھی طرح سے بدلہ لیں گے۔''

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ گاڑی سے آنے والی ٹولیاں بھی آتی نظر آئیں۔

کرتارے نے کہا۔ ''ذرا الگ تو چلو۔ کچھ بات کرنی ہے۔''

چاروں دوست ان کے ساتھ اکیلے میں چل دیے۔ ''کہو، کیا بات ہے؟'' سورج نے کہا۔

''بات یہ ہے کہ کیدو کی جان خطرے میں نہیں پڑنی چاہیے۔'' جسونت کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اسے وہاں رکنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' سورج بولا۔ ''اب یہ اتنے لوگ اسے پہچانتے تو نہیں ہیں نا۔''

''کیدو نے کہا ہے کہ ٹھاکر کو ختم کرتے ہی وہ جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگائے گا۔ تب لڑائی ختم کر دی جائے۔''

رنگھبیر نے جسونت کو غور سے دیکھا۔ ''صاف صاف کہو۔ کیا کہنا ہے۔''

جسونت ہچکچا رہا تھا۔ ''حویلی میں لوٹ مار نہیں ہونی چاہیے۔''

''اب اتنے لوگوں پر ہمارا زور تو نہیں چل سکتا ہے۔'' سورج نے بے بسی سے کہا۔ ''پھر بھی میں کوشش کروں گا۔ یہ بتاؤ، وہ لڑکا اوتار سنگھ کہاں ہے۔''

''ٹھاکر کہتا ہے کہ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔''

''تب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ اسے تلاش کرنے کے لیے حویلی میں ضرور گھسیں گے۔ انھیں نہیں روکا جا سکتا۔''

جسونت جانتا تھا کہ سورج ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس پہلو سے تو انھوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ''حملہ کب کرو گے؟''

''ابھی آنے والوں کا انتظار کرنا ہے۔ میں پوری طاقت سے ایک بار حملہ کرنا چاہتا ہوں۔''

دور سے آنے والوں کی ایک اور ٹولی آتی نظر آ رہی تھی۔

❀.....❀.....❀

دیکھتے ہی دیکھتے پھاٹک کے باہر دو ٹرک آ کر رکے اور مسلح لوگ ٹرکوں سے کود کود کر اترنے لگے۔ ان میں وہ دونوں بھی تھے، جنھوں نے ٹھاکر کو آ کر خبردار کیا تھا۔

وہ آگے آئے اور انھوں نے پکار کر کہا۔ ''ٹھاکر پرتاپ سنگھ، ہم تم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے اپرادھی پتر کو ہمارے حوالے کر دو۔ یہ جھگڑا یہیں ختم ہو جائے گا۔''

''میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔'' ٹھاکر نے پرسکون لہجے [illegible] بلند آواز میں کہا۔ ''[illegible]ت جان دے دیتے ہیں۔ پر آن کا سودا نہیں کرتے [illegible] کہا، وہ تیجر پر تیر

ہے۔''

''تو پھر تمھیں بھی کوئی نہیں بچا سکتا۔''

حویلی کے احاطے میں ٹھاکر کے جاں نثاروں نے دیکھا کہ اونٹوں پر سوار اور پیدل لوگ الگ آ رہے ہیں۔ وہ بہت بڑا مجمع تھا۔ ان کی تعداد دو سو سے اوپر ہی ہوگی۔

''مالک...... آپ بندوق والے لوگ اندر چلے جائیں۔'' سندر داس نے گڑگڑا کر کہا۔

''جس کو جانا ہو وہ چلا جائے۔ میں نہیں جاؤں گا۔'' ٹھاکر کے لہجے میں عجیب سا جاہ و جلال تھا۔

اسی وقت باہر حملہ آوروں نے جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگایا اور دھاوا بول دیا۔

حویلی کے اندر سے سب سے پہلے لاٹھیاں سنبھالے ہوئے جمال دین اور وصال دین حملہ آوروں پر جھپٹے۔ ان کی رفتار اتنی تیز تھی اور وہ یوں پینترے بدل رہے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ایک بجلی سی کوندر ہی تھی۔ ابھی وہ یہاں تھے اور اگلے پل وہاں۔ دوسری طرف حملہ آور تھے کہ پھاٹک سے احاطے میں گھسے چلے آ رہے تھے۔

لوگوں کے کسی بہت بڑے مجمعے میں لٹھیا باز کتنا کامیاب رہتا ہے، اس کا تصور کرنا ناممکن ہے۔ اسے وہی سمجھ سکتا ہے، جس نے کسی ماہرِ فن لٹھیا باز کو سینکڑوں کے درمیان لاٹھی چلاتے دیکھا ہو اور وہاں تو وہ دو تھے۔ لاٹھی اس طرح گھوم رہی تھی کہ ایک لکیر سی نظر آتی تھی۔ لیکن لاٹھی کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا اور مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے لاٹھی خالی نہیں گھوم رہی تھی۔ لوگ اس کی ضرب کا نشانہ بن رہے تھے۔

دوسری طرف ٹھاکر بھی تلوار سونت کر میدان میں اتر گیا تھا۔ اس کے جاں نثار بھی اس کے ساتھ تھے۔

دوستوں کی ٹولی باہر ہی تھی۔ وہ ایک بار لٹھیا باز بچوں کو بھگت چکے تھے اور ویسے بھی وہ اندھا دھند میدان میں کود پڑنے کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے سوچ لیا تھا کہ پہلے باہر رہ کر جائزہ لیں گے۔ انھیں ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا تھا۔

اندر جو نقشہ بنا، اس نے ان پر ثابت کر دیا کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔ پچھلی بار مار کھانے کے بعد انھوں نے خود بھی لٹھیا بازی سیکھی تھی۔ مگر اب جمال دین کو دیکھ کر انھیں احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس فن کی الف بے سے بھی واقف نہیں ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ اپنے زعم میں لاٹھیاں لے کر میدان میں نہیں اُترے۔

''اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ میں نے اس دن بزدلی کیوں دکھائی تھی؟'' کرتارے نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''یاد ہے، میں نے کہا تھا کہ ہم بیس بھی ہوتے تو وہ ہمیں گرا دیتے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' رنگھبیر [illegible] کہا کیونکہ [illegible] روز کرتا [illegible] سے بحث [illegible]

نے ہی کی تھی۔ ''مگر اسی وقت کچھ کرو۔ ورنہ یہ دونوں تو تباہی مچادیں گے۔''

کرتارے کو اندازہ تھا کہ دونوں لٹھیاباز اب تک بیس سے زائد افراد کو ناکارہ کر چکے ہیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ''بس ایک ہی صورت ہے۔ بندوق سے انھیں نشانہ بنانے کی کوشش کرو۔''

ان میں صرف گوپال ہی ایسا تھا، جس کے پاس طپنچہ تھا۔ اس نے نشانہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو چھلاوا بنے ہوئے تھے۔ گولی ایسے متحرک ہدف کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ الٹا ان کے تین افراد نشانہ بن گئے۔

''کیا کر رہے ہو؟ تم تو اپنوں ہی کی جان لے رہے ہو۔'' کرتارے نے جھنجلا کر کہا۔

''میں گولی چلاتا ہوں۔ مگر اس سے پہلے ہی وہ جگہ چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔''

''لڑکا اتنا تیز نہیں ہے۔ اس کا نشانہ لو۔'' جسونت نے مشورہ دیا۔

اس چکر میں ان کے دو اور آدمی کام آ گئے۔

''واپس بلا لو لوگوں کو۔'' کرتارے نے کہا۔ ''ہمیں خوب سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھانا ہوگا۔''

سورج نے آسمان کی طرف دیکھا۔ تیزی سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ اس نے حملہ آوروں کو پکارا۔ ''واپس آ جاؤ۔''

لیکن پسپا ہو کر باہر آتے آتے ان کے چھ سات آدمی اور کام آ گئے۔''

❀......❀......❀

لڑائی رک گئی۔ ٹھاکر نے جائزہ لیا۔ احاطے میں انسانی جسموں کا ڈھیر تھا۔ ان میں اپنے پرائے کو تو پھر بھی شناخت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن زندہ اور مردے کو پہچاننا بہت مشکل تھا۔

بہر حال اس کے لیے یہ مرحلہ اتنا مشکل نہیں تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو گنا اور اسے اندازہ ہو گیا۔ اس کے 14 ساتھی کم ہو چکے تھے۔ اب ان میں کتنے زندہ تھے، یہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے احاطے میں پڑے لوگوں کو ٹٹولنا پڑتا۔ فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ دشمن پسپا ضرور ہو گیا تھا۔ لیکن پھاٹک کے باہر موجود تھا۔ اور اس کے پاس آتشی ہتھیار بھی تھے۔

مگر ایک بات بے حد حوصلہ افزا تھی۔ احاطے میں پڑے لوگوں میں اگر 14 اس کے ساتھی تھے، تو دشمنوں کی تعداد 60 سے کم نہیں تھی۔ ٹھاکر نے دیکھا تھا اور جانتا تھا کہ جمال دین اور وصال دین نے دشمن کو بہت بھاری نقصان پہنچایا ہے۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔

''مالک...... اب اندر بند ہو کر لڑنا ہمارے لیے بہتر رہے گا۔'' وکرانت نے ٹھاکر سے کہا۔

بات ٹھاکر کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اندھیرے میں فائرنگ ہوتی تو نقصان میں وہی لوگ

رہتے۔ لیکن ٹھاکر کا دل نہیں مان رہا تھا۔

ایسے میں جمال دین نے آہستہ سے کہا۔ ''ٹھاکر جی، ہمیں اپنے زخمیوں کی فکر کرنی چاہیے۔''

ٹھاکر نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ کچھ مضطرب اور اداس نظر آ رہا تھا۔ ٹھاکر کو اچانک ہی وصال دین کا خیال آ گیا۔ ''وصال دین کہاں ہے؟'' اس نے تڑپ کر پوچھا۔

''وہ تو یہاں نہیں ہے ٹھاکر جی۔''

''تو کیا..... تو کیا؟'' ٹھاکر سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔

جمال دین نے کچھ نہیں کہا۔ صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو چلو۔ دیکھتے ہیں۔ کوئی زخمی ملے تو اسے لے آئیں گے۔''

''نہیں ٹھاکر جی۔ ایسے میں تو وہ آسانی سے ہمیں نشانہ بنا لیں گے۔'' وکرانت بولا۔

''تو کیا اپنے زخمیوں کو ایسے ہی چھوڑ دیں۔'' ٹھاکر نے جھنجلا کر کہا۔

''وکرانت ٹھیک کہہ رہا ہے ٹھاکر جی۔'' جمال دین نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ اکیلے آدمی کا کام ہے۔ میں کالی چادر اوڑھ کر احتیاط سے جاؤں گا۔ انھیں اندھیرے میں پتا بھی نہیں چلے گا اور ٹھاکر جی، یہ بھی ٹھیک ہے کہ اب ہمیں بند ہو کر لڑنا پڑے گا۔ پر میں وہاں کسی کام نہیں آ سکوں گا۔ اس لیے مجھے اپنے حصے کا کام باہر ہی کرنے دیں۔''

وہ پہلا موقع تھا کہ ٹھاکر نے جمال دین کو اتنا بولتے سنا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جمال دین بند ہو کر لڑنے سے پہلے ہی خود کو ٹھاکر پر قربان کر دینا چاہتا تھا۔ جمال دین باہر والوں پر ٹوٹ پڑنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مر جائے گا۔ لیکن دس بیس آدمی ضرور گرائے گا۔

اس لمحے ٹھاکر کو پوری طرح اندازہ ہوا کہ وہ جمال دین سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اس نے جمال دین کا ہاتھ تھام لیا۔ ''نہیں جمال دین، میں تمھیں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ ہم ساتھ لڑیں گے۔ ساتھ مریں گے۔''

''آج تو وفاداری کا حق ادا کرنے کا موقع ملا ہے، ٹھاکر جی۔ مجھے نہ روکیں۔'' جمال دین نے کہا۔ ''اس وقت اپنی لاشیں دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو رہے ہوں گے۔ انشاء اللہ میں انھیں بھاری نقصان پہنچاؤں گا۔ پھر ممکن ہے کہ وہ بھاگ کھڑے ہوں۔''

''جمال دین ٹھیک کہہ رہا ہے مالک۔'' سندر داس نے تائید کی۔ ''میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ میں بھی حویلی میں بند ہو کر کسی کام کا نہیں رہوں گا۔''

جمال دین نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ٹھاکر سے بولا۔ ''بس کالی چادریں منگوا دیں۔''

ٹھاکر ہچکچا رہا تھا۔ مگر وہ بہر حال اندر گیا اور دو کالی چادریں لے آیا۔ وہ جمال دین کو

اکیلے نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔

جمال دین اور سندر داس نے چادروں میں خود کو لپیٹا اور ٹھاکر کے ہاتھ چومے۔

''ہمیں آشیرواد دیں ٹھاکر جی۔'' سندر داس نے کہا۔

''خدا حافظ جمال دین۔'' ٹھاکر نے زیرِلب کہا۔

❀......❀......❀

اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ اماوس کی رات تھی...... روشنی سے محروم رات۔ حملہ آوروں کے حوصلے بہت پست تھے۔ اصل میں وہ کوئی منظم گروہ نہیں تھا۔ وہ محض افراد تھے، جو قیادت اور منصوبہ بندی سے محروم تھے۔ سورج کی پکار پر احاطے سے باہر آنے کے بعد انھوں نے اندر کا منظر دیکھا تو وہ ڈر گئے۔ احاطہ لاشوں سے پڑا ہوا تھا اور اب ایک گھنٹے بعد اندھیرے میں انھیں لاشیں اور زیادہ نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے بیشتر خوف زدہ تھے۔

''ہم نے اندھادھند یلغار کر کے غلطی کی۔'' سورج کہہ رہا تھا۔

''تو یہ بات تمھیں پہلے کہنی چاہیے تھی۔'' ایک سورما نے جھلا کر کہا۔ ''دیکھ لو۔ ہمارے کتنے لوگ مارے گئے۔''

''اور تم لوگ خود تو اندر گئے ہی نہیں۔'' ایک اور نے للکارا۔

''اسی لیے زندہ ہیں۔'' جسونت نے کہا۔ ''لڑائی دماغ سے لڑی جاتی ہے۔''

''ایک دوسرے سے مت لڑو۔ یہ سوچو کہ اب کیا کرنا ہے۔'' کسی نے کہا۔

''ہمیں سب سے زیادہ نقصان لٹھیا بازوں سے پہنچا ہے۔'' سورج نے کہا۔ ''وہ سامنے آئے تو دور سے دور ہٹنے کی کوشش کرو۔ اس طرح بندوق یا غلیل چلانے والا کوئی انھیں آسانی سے نشانہ بنا سکے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس بندوقیں اور غلیلیں ہیں، وہ ایک جگہ ہو جائیں اور ایک جگہ رہیں۔ انھیں پھاٹک کے پاس رہنا چاہیے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ہم اندر گھسیں گے۔ تو یہ لوگ سب سے آگے ہوں گے۔ اندر اب تھوڑے لوگ ہیں۔ انھیں ایک ایک کر کے نشانہ بنانا ہوگا۔ تب جیت ہماری ہوگی۔''

اس کا مثبت ردِعمل ہوا۔ بندوقوں اور غلیلوں والے لوگ آگے آئے اور پھاٹک کے پاس جمع ہو گئے۔ لیکن منفی ردِعمل بھی کم نہیں تھا۔ روایتی ہتھیاروں والے لوگ پہلے ہی لاٹھی چلانے والوں سے خوف زدہ تھے۔ انھوں نے اپنے بے شمار لوگوں کو گرتے دیکھا تھا۔ سورج کی بات سن کر ان کا خوف اور بڑھ گیا۔ وہ مارنے کے لیے آئے تھے۔ لیکن مرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ان میں سے بیشتر جی چھوڑ بیٹھے تھے۔ اب انھیں پیچھے ہٹنے کا موقع ملا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ وہ یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ اندھیرا ان کے لیے پردے کا کام کر رہا تھا۔

وہ لوگ ایک ایک دو دو کر کے پیچھے کھسکتے رہے۔ ان کی تعداد کم ہوتی رہی۔ جو خود کو کا

کیے بیٹھے تھے، وہ انھیں بھاگتے دیکھ کر متزلزل ہو گئے اور خود بھی نکل بھاگنے کی سوچنے لگے۔

چھ دوستوں کی ٹولی اب پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ انھیں پتا بھی نہیں چلا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔

❀......❀......❀

وہ دونوں متحرک سائے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ اندھیرے میں مدغم ہو گئے۔ ٹھاکر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انھیں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ جھک کر بھاگتے ہوئے احاطے میں آگے بڑھے۔ پھر وہ کسی لاش سے ٹکرائے۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب انھیں سینے کے بل رینگنا ہوگا۔ سینے کے بل رینگتے ہوئے وہ آگے بڑھے۔ ابتدا میں جو لاشیں انھیں ملیں، وہ انھیں نہیں پہچان سکے۔ یہ اسی بات کا ثبوت تھا کہ وہ دشمنوں کی لاشیں ہیں۔ پھر جمال دین کو ایک شناسا چہرہ نظر آیا...... خون میں نہایا ہوا۔ وہ رندھیر تھا۔ جمال دین نے اسے ٹٹول کر دیکھا۔ وہ مر چکا تھا۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھے، جمال دین کا دل ڈوبنے لگا۔ بات پوری طرح سمجھ میں آ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ احاطے میں کوئی زخمی نہیں ملے گا۔ وہ سب مر چکے ہیں۔ جو بھی زخم کھا کر ایک بار گرا، وہ اٹھ نہیں سکا ہوگا۔ دوسرے لوگ اسے روندتے ہوئے چلے گئے ہوں گے۔

جمال دین کا سینہ دکھ سے بھر گیا۔ تو میرا وصال دین اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ عمر بھر کی کمائی لٹ گئی۔ وہ بیٹا، جس کے بارے میں وہ سوچتا تھا وہ اس کی نسل کو آگے بڑھائے گا، وہ مر گیا۔ تو اب کیا بچا......؟ کچھ بھی نہیں!

پھر اس دکھ سے طمانیت کی ایک لہر اٹھی۔ اس کا دل شکر سے بھر گیا۔ اللہ نے عزت کی موت عطا کی ہے اس کے بیٹے کو۔ وہ ایک بت شکن کے دشمنوں، مشرکوں سے لڑتے ہوئے مرا ہے۔ اللہ کی مرضی ہوئی تو اسے شہید کا رتبہ ملے گا۔ اور یہی نہیں، اس نے جان دے کر حق نمک بھی ادا کر دیا۔

اچانک اسے وصال دین نظر آ گیا۔ اس کا چہرہ حیرت انگیز طور پر روشن لگ رہا تھا۔ اور اس کے سینے میں ایک نیزہ پیوست تھا۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا کہ وصال دین سانس لے رہا ہے۔ اس نے اس کی نبض ٹٹولی، سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ مگر وہاں سناٹے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

جمال دین نے جھک کر بڑی محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔ ''مجھے تم پر فخر ہے میرے بیٹے۔'' وہ بڑبڑایا۔

اگلے ہی لمحے اس کے سینے میں آگ سی دہک اٹھی۔ ''اب میری باری ہے۔ میں بھی آ رہا ہوں بیٹے۔'' اس نے سرگوشی میں بیٹے سے کہا۔

جب وہ چلا تھا تو اسے افسوس تھا کہ وہ اپنی لاٹھی چھوڑ کے جا رہا ہے۔ لیکن مجبوری تھی۔

لاٹھی اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتی۔ اسے جس طرح بڑھنا تھا، وہ لاٹھی لے کر نہیں چل سکتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ وہ موت سے ڈرتا ہو بلکہ وہ تو مرنے کا مصمم ارادہ لے کر چلا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ مشرکوں کو مار کر مرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ زخمیوں کی تلاش کے دوران کوئی گولی بغیر لڑے اسے زندگی سے محروم کر دے۔

مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اللہ جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ لاٹھی لے کر نہیں آیا۔ اب وہ زندہ بھی ہے اور اسے لاٹھی بھی مل گئی ہے۔ اس نیزے سے بہتر کون سا ہتھیار ہو سکتا ہے، جو اس کے بیٹے کے خون میں بھیگا ہوا ہے۔ وہ اسی نیزے سے دشمنوں کو مارے گا... اپنے بیٹے کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لے گا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ حویلی کے پھاٹک کے بہت قریب تھا۔ اب احتیاط کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا اور وصال دین کے سینے سے نیزہ نکالنے لگا۔ کام اتنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن جس نزاکت سے وہ یہ کام کرنا چاہتا تھا، اس نے اسے دشوار بنا دیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ نیزہ اس کے اپنے سینے میں گڑا ہے۔ نکالتے ہوئے اسے یہ خیال ستا رہا تھا کہ اس کے بیٹے کو تکلیف نہ ہو۔ پہلی گولی چلی تو وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ اور وہ گولی اس کے جسم کو تقریباً چھوتے ہوئے گزری تھی۔ وہ تیزی سے جھکا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس ایک ثانیے میں اس نے بہت کچھ سوچ لیا۔ اس کا بیٹا زندہ نہیں تھا، مر چکا تھا۔ اور اسے مرنے سے پہلے بہت کچھ کرنا تھا۔ حملہ آور بھلے نہ بھاگیں۔ لیکن وہ انھیں اتنا نقصان پہنچائے کہ ان کی کمر ٹوٹ جائے اور ٹھاکر کا بوجھ ہلکا اور کام آسان ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرے ہوئے بیٹے کے سینے سے نیزہ بھی نکالے اور دشمن کی گولی کا نشانہ بھی نہ بنے۔

بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا پاؤں بیٹے کے سینے پر رکھا اور نیزے کو نیچے سے تھام کر پوری قوت سے اوپر کھینچا۔ نیزہ نکلا تو وہ خود کو سنبھال نہ سکا اور ایک طرف لڑھک گیا۔

اس لڑھکنے نے اسے بچا لیا۔ ورنہ وہ گولی اس کے ضرور لگتی۔ چند لمحے وہ ساکت پڑا رہا۔ پھر نیزے کو آگے کی طرف سرکاتے ہوئے وہ سینے کے بل آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے سمت بھی تبدیل کر لی تھی۔

کچھ آگے جا کر اس نے چادر کا بوجھ اتارا۔ اب اگلے مرحلے میں وہ اس کے لیے رکاوٹ ہی ثابت ہوتی۔ پھر وہ کھڑا ہوا۔ اس نے نیزے کو لاٹھی کے انداز میں پکڑا اور اسے گھما کر دیکھا۔

اس لمحے ایک گولی اور چلی۔ وہ بال بال بچا۔

اس نے بلند آواز میں نعرۂ تکبیر بلند کیا...... اللہ اکبر! پھر وہ نیزے کو لاٹھی کی طرح گھماتا، پینترے بدلتا پھاٹک کی طرف بڑھا۔ اب اس کی رفتار ایسی تھی کہ اس کے جسم کو دیکھا ہی

نہیں جا سکتا۔ اس رفتار سے تو وہ کبھی حرکت میں آیا ہی نہیں تھا۔

روشنی کی لکیر بنا وہ پھاٹک سے نکل آیا!

❁......❁......❁

گوپال پھاٹک پر جمع طمنچہ برداروں کی قیادت کر رہا تھا۔ وہ حملہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ طے یہ پایا تھا کہ وہ لوگ آگے ہوں گے اور روایتی ہتھیار والے پیچھے۔ اب وہ سورج کی آواز کے منتظر تھے۔

دوسری طرف سورج اور اس کے دوست عقب کی صورتِ حال دیکھ کر بھونچکا رہ گئے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے ساتھیوں کی بڑی تعداد چپکے سے میدان چھوڑ گئی ہے۔

''ہمیں فوراً حملہ کرنا ہوگا۔'' کرتارے نے کہا۔ ''ورنہ یہاں صرف ہم ہی رہ جائیں گے۔''

''کائر کہیں کے۔'' سورج کے لہجے میں حقارت تھی۔

یہ وہ وقت تھا کہ پھاٹک کے قریب کھڑے ایک بندوق بردار نے احاطے میں تحرک محسوس کیا۔ وہ تحرک بھی برائے نام تھا کیونکہ جس شخص کو وہ دیکھ رہے تھے، وہ تو جیسے اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا۔

''وہ......وہ دیکھو۔'' بندوق بردار نے گوپال سے کہا۔

گوپال نے احاطے کی طرف دیکھا۔ اور اندازے سے گولی چلا دی۔

تحرک اس بار نیچے کی سمت تھا۔

گوپال نے دوسری گولی چلائی۔ بندوق بردار نے بھی گولی چلانے کو اپنا حق سمجھا۔ آخر تحرک کو پہلی بار اس نے ہی دیکھا تھا۔

اب اندر پھر سکوت اور اندھیرا تھا۔ ''اسی جگہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے فائر کرتے رہو۔'' گوپال نے ہدایت کی۔

انھوں نے چند فائر کیے۔ لیکن جواب میں کوئی چیخ نہیں سنائی دی۔ وہ رک گئے۔

پھر اچانک دلوں پر ہیبت طاری کرنے والا وہ نعرہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک سایہ پورے قد سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، جسے وہ گھما رہا تھا۔ پھر لاٹھی کی گردش کی رفتار بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اب وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

نعرے کی ہیبت نے انھیں شل کر کے رکھ دیا تھا۔ اس میں ان کے وہ قیمتی سیکنڈ ضائع ہو گئے، جن میں وہ اسے نشانہ بنا سکتے تھے۔ پھر وہ سایہ حرکت میں آیا......اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حرکت بھی اتنی تیز ہو گئی کہ وہ ایک تاریک بگولہ بن کر رہ گیا، جو ان کی طرف لپک رہا تھا۔

''دور ہٹو......تیزی سے ہٹو۔'' گوپال چلایا۔

سب نے اس ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جمال دین بہت تیزی سے ان کے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ لاٹھی کے انداز میں گھمایا جانے والا وہ نیزہ بہت تباہ کن ثابت ہوا۔ جمال دین پھاٹک سے گزر کر پیچھے کی طرف پہنچا، جہاں وہ لوگ تھے، جو پہلے ہی متذبذب تھے۔ وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ جسے موقع ملا، اس نے راہِ فرار اختیار کی۔

ادھر گوپال نے احاطے میں داخل ہو کر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ''اندر گھس جاؤ اور فائرنگ کرتے رہو۔'' اس نے پھاٹک پار کرتے ہوئے کہا۔

یوں یہ لڑائی دو رخ میں تبدیل ہو گئی۔ یہ حملہ آوروں کے لیے نقصان دہ تھا کیونکہ وہ دو جگہ تقسیم ہو گئے تھے۔ جن لوگوں کے پاس آتشی اسلحہ تھا، وہ اب احاطے میں تھے اور فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

دوسری طرف روایتی ہتھیاروں والے لوگ تھے، جن پر جمال دین قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کے نتیجے میں کم وقت میں زیادہ لوگ ناکارہ ہو گئے اور اس سے بڑی بات یہ ہوئی کہ بڑی تعداد میں لوگ فرار ہو گئے۔

لیکن ابتدائی چند منٹ میں ٹھاکر کے ساتھیوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ اچانک حملہ ان کے لیے خلافِ توقع تھا۔ وہ سب ایک جگہ تھے۔ اس لیے اندھا دھند فائرنگ ان کے لیے بے حد خطرناک ثابت ہوئی۔ ٹھاکر کو چیخوں سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کئی ساتھیوں سے محروم ہو گیا ہے۔

''فائرنگ کرو...... مسلسل۔'' اس نے پکار کر کہا۔

احاطے میں داخل ہونے والے حملہ آوروں کو سب سے زیادہ نقصان احاطے میں پڑی لاشوں سے ہوا۔ وہ ان لاشوں سے الجھ کر گرے۔ دوسری طرف ٹھاکر کے ساتھی سنبھل گئے تھے اور جم کر فائرنگ کر رہے تھے۔ حملہ آوروں کا جانی نقصان بہت تیزی سے ہو رہا تھا۔

جمال دین کو احساس ہوا کہ پھاٹک کے قریب کھڑے حملہ آوروں نے حویلی پر دھاوا بول دیا ہے تو وہ پلٹا۔ ویسے بھی یہاں میدان صاف ہو چکا تھا۔ اسے صرف گنتی کے حملہ آور نظر آ رہے تھے۔

وہ پھاٹک کی طرف تیزی سے لپکا کہ ٹھاکر کی مدد کو پہنچے۔ اچانک وہ ایک لاش سے الجھ کر گرا۔ قریب ہی گرے ہوئے ایک زخمی حملہ آور نے ہاتھ میں تھاما ہوا خنجر بہت تیزی سے اس کے سینے میں گھونپ دیا۔

باہر اب کیدار ناتھ کے دوستوں کے سوا کوئی نہیں رہا تھا۔ باقی سب لوگ راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔ انھوں نے جمال دین کو گرتے دیکھا تو اس کی طرف جھپٹے۔ راجو نے تیزہ جمال دین کے سینے میں اتار دیا۔

مرتے وقت جمال دین کے دل میں سکون اور ہونٹوں پر کلمہ تھا۔

جمال دین کو دم توڑتے دیکھ کر انھوں نے سکون کا سانس لیا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں اب صرف وہ تین تھے...... راجو، کرتارا اور سورج۔ ''سب بھاگ گئے۔'' سورج نے نفرت میں بجھے لہجے میں کہا۔

''جسونت اور رگھبیر بھی نظر نہیں آ رہے ہیں۔'' راجو بولا۔

''وہ کائر نہیں ہیں۔ کام آ گئے ہوں گے۔'' کرتار نے تڑپ کر کہا۔

''اب کرنا کیا ہے؟'' راجو سورج کی طرف مڑا۔

''اندر چلو...... اپنے ساتھیوں کے پاس۔''

وہ تینوں پھاٹک پر پہنچے اور اندر داخل ہوئے۔ دو طرفہ فائرنگ ہو رہی تھی۔ کبھی کوئی چیخ سنائی دیتی...... کبھی دور کی اور کبھی نزدیک کی۔ نزدیک کی چیخ بتاتی تھی کہ ان کا کوئی ساتھی کم ہوا ہے۔ جبکہ دور کی چیخ ان کے لیے ایک دشمن کے کم ہونے کی نوید تھی۔

وہ دس قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ سورج چیخ مار کر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔

''لو...... سورج بھی گیا۔'' راجو نے اداس لہجے میں کہا۔

❁......❁......❁

''ٹھاکر جی میں فائرنگ کر رہا ہوں۔ آپ اندر چلے جائیں۔'' وکرانت نے کہا۔

''میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

''مالک، اب ہم صرف تین رہ گئے ہیں۔ آپ، میں اور رنجیت۔''

ٹھاکر نے پہلی بار سر گھما کر دیکھا۔ وکرانت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ لیکن دشمنوں کی فائرنگ میں بھی اب زور نہیں تھا۔ اس سے لگتا تھا کہ ان کی تعداد بھی بہت کم رہ گئی ہے۔

''ٹھیک ہے۔ تم لوگ بھی اندر چلو۔''

باہر اب سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ ان کے لیے باہر رہنا اب خطرناک ثابت ہوتا۔ دشمن بھی انھیں اب سائے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ان کی تعداد دس بارہ کے لگ بھگ ہو گی۔

پہلے ٹھاکر اندر گیا، پھر رنجیت اور آخر میں وکرانت۔

اندر روشنی ہو رہی تھی اور کیدار ناتھ اور مولوی برکت علی وہاں موجود تھے۔

''میں دروازہ سنبھالتا ہوں اَن داتا۔'' وکرانت نے کہا۔ ''آپ اور رنجیت کھڑکی کی اوٹ میں رہ کر فائر کریں۔ ہم انھیں ایک ایک کر کے مار گرائیں گے۔''

''ٹھاکر ویر...... باقی سب لوگ کہاں ہیں۔'' کیدار ناتھ نے پوچھا۔

''بس ہم ہی بچے ہیں۔'' ٹھاکر نے کہا۔ ''لیکن دشمن بھی زیادہ نہیں [illegible]۔''

رنجیت نے ایک کھڑکی سنبھال لی تھی اور وکرانت دروازے سے فائر کر رہا تھا۔ ٹھاکر دوسری کھڑکی کی طرف چلا گیا۔

وہ ایک ایک کر کے حملہ آوروں کو شکار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اب باہر صرف چار سائے نظر آ رہے تھے۔ اجالا بھی اچھا خاصا ہو گیا تھا۔ اس صورتِ حال نے وکرانت کا اعتماد بڑھا دیا۔ وہ غیر محتاط ہو کر دروازے سے نکلا۔ اگلے ہی لمحے فائر کی آواز کے ساتھ وہ الٹ کر واپس آ گرا۔ حملہ آور دیوار سے چپکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وکرانت کے باہر نکلتے ہی اس نے فائر کیا۔ لیکن وکرانت کی گولی بھی کام کر گئی تھی۔

اسی وقت رنجیت کی توجہ وکرانت کی طرف تھی۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ گولی کب اس کے سر میں گھس گئی۔

یہ وہ موقع تھا، جس کا کیدار ناتھ کو انتظار تھا۔ اب ٹھاکر اکیلا رہ گیا تھا۔ اب صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ اس کے بعد کیدار ناتھ کا برسوں کا خواب پورا ہو جاتا۔

اس نے جیب سے طمنچہ نکالا۔ ٹھاکر کھڑکی کی اوٹ میں باہر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک فائر کیا۔ باہر سے ایک کربہہ چیخ اور کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اب صرف دو حملہ آور زندہ تھے۔

کیدار ناتھ نے طمنچہ سیدھا کیا اور ٹھاکر کے سر کا نشانہ لیا۔ یہ وہ لمحہ تھا، جب مولوی برکت علی نے اسے دیکھا۔ وہ کیدار ناتھ سے کافی دور تھے اور گولی چلنے سے پہلے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ تاہم وہ اس طرف جھپٹے اور ساتھ ہی انھوں نے چیخ کر کہا۔ ''ٹھاکر جی...... عقب میں دوستوں سے ہشیار...... ٹھاکر جی۔''

ٹھاکر ان کی چیخ سن کر پلٹا۔ اس پلٹنے نے اسے بچا لیا۔ وہ سیدھا ہوا۔ گولی اس کے سر کے بجائے بائیں کندھے کے نیچے سینے کے اوپری حصے میں لگی۔ اس دوران مولوی صاحب کیدار ناتھ تک پہنچ چکے تھے۔ کیدار ناتھ نے تیزی سے رخ بدلتے ہوئے مولوی صاحب پر بہت قریب سے فائر کیا۔ اس دوران ٹھاکر کو کیدار ناتھ پر گولی چلانے کا موقع مل گیا۔

کیدار ناتھ گرنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب قریب ہی گرے ہوئے تھے۔ ٹھاکر ان کی طرف بڑھا۔ ''مولوی صاحب، اتنے کم وقت میں آپ نے کتنے احسان کر دیے مجھ پر۔'' وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''احسان کیسا ٹھاکر جی۔'' مولوی صاحب نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''میرے نصیب میں یہ سعادتیں لکھی تھیں مجھے تو افسوس ہے کہ آپ کو بچا نہ سکا۔''

دروازے پر آہٹ سی محسوس کر کے ٹھاکر تیزی سے گھوما اور اس نے فائر بھی کر دیا۔ اس بار گرنے والا کیدار ناتھ کے ان دو دوستوں میں سے ایک تھا، جنھوں نے آج رات حملے سے خبر

دار کیا تھا۔

ٹھاکر نے پلٹ کر دیکھا تو مولوی صاحب دم توڑ چکے تھے۔ خود اس کا حال یہ تھا کہ اس کے زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازے کے عین سامنے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں صرف دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ باہر ایک حملہ آور ابھی موجود ہے اور اسے ٹھکانے لگانا ہے۔ دوسری ایک خواہش تھی۔ کم از کم اپنے بیٹے کے آنے تک وہ زندہ رہے اور اس کے لیے وہ دعا ہی کر سکتا تھا۔

طلوعِ آفتاب کا وقت تو ابھی دور تھا۔ لیکن صبح ہو رہی تھی۔ اور خون بہنے کی وجہ سے ٹھاکر کو شدید کمزوری ہو رہی تھی۔ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگتی تو وہ ہاتھ سے اپنے سینے کے زخم کو دبوچ لیتا۔ تکلیف اسے ہوش میں لے آتی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آخری حملہ آور آئے تو وہ غشی میں ہو اور حملہ آور کا نشانہ بن جائے۔ وہ طمنچہ تھامے اس آخری حملہ آور کا منتظر تھا۔

❁......❁......❁

دن چڑھ چکا تھا۔ گاؤں کے وہ لوگ، جنھوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا، صحرا میں فاتح حملہ آوروں کی واپسی کے منتظر تھے۔ انھیں واپس جاتا دیکھتے تو وہ گاؤں واپس جاتے۔

''بہت دیر ہو گئی۔ اب تک تو انھیں آ جانا چاہیے تھا۔'' رمیش نے کہا۔

''وہ لوگ لوٹ مار کر رہے ہوں گے۔'' ہردیال بولا۔

''ایسا تو نہیں کہ وہ سب ختم کر دیے گئے ہوں۔'' پوار نے کہا۔

''کیا بات کرتے ہو۔ وہ سینکڑوں تھے۔'' یشونت نے تڑپ کر کہا۔ وہ وہاں موجود لوگوں میں سب سے زیادہ با اثر تھا۔

''پر اپنے ٹھاکر جی تو شیر ہیں شیر۔'' پوار کے لہجے میں ستائش تھی۔

''کچھ بھی ہو۔ اب ہمیں گاؤں جانا ہی ہو گا۔'' یشونت نے کہا۔

''ٹھاکر جی کو کیا منہ دکھائیں گے۔'' راجو بولا۔

بہت سے لوگ شرمندہ نظر آنے لگے۔ ''سچ ہے، ہم نے بہت برا کیا۔'' بہت سی آوازیں ابھریں۔

''برا ہم نے نہیں کیا، چھوٹے ٹھاکر نے کیا ہے۔ یشونت نے بھڑکتے لہجے میں کہا۔ ''ٹھاکر اور چھوٹا ٹھاکر بھگوان کے دوشی ہیں۔ انھوں نے مندر کا اپمان کیا۔ شرم انھیں آنی چاہیے۔ اب ایک بات طے کر لو۔ اگر اپنے گاؤں کو بھگوان کے شراپ سے بچانا ہے تو ہمیں اپرادھیوں کو سزا دینی ہو گی۔ ٹھاکر اور چھوٹا ٹھاکر اگر زندہ ہیں تو ہم انھیں ختم کریں گے۔''

اس پر وہاں ہلچل مچ گئی۔ ٹھاکر کی سب عزت کرتے تھے۔ وہ تو ٹھاکر کا ساتھ نہ دینے پر شرمندہ ہو رہے تھے۔ اتنے بڑے اقدام کی...... ٹھاکر کے خلاف بغاوت کی تائید کیسے کر سکتے

تھے۔لیکن ان کے دلوں میں یہ خوف بہر حال تھا کہ اوتار سنگھ نے بہت برا کیا ہے اور ان پر بھگوان کا شراپ آ کر رہے گا۔وہ دودلی کا شکار ہو رہے تھے۔

یشونت نے ان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔وہ دھرم کے حوالے سے انھیں اکساتا رہا۔پھر اس نے کہا۔''اور سوچو،ٹھاکروں کے ختم ہونے کے بعد جو زمین جس کے پاس ہے،وہ اس کی ہوگی۔وہ مالک ہوگا اس زمین کا۔''

زمین کا خواب بہت بڑا تھا۔سب کی وفاداری ڈول گئی۔

''اور ٹھاکر دھرم کا شروع ہی سے کچا تھا۔'' یشونت نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔''سوچو،ہم سب سے زیادہ وہ اس مُسلے جمال دین کی عزت کرتا تھا۔اسے برابری کا درجہ دیتا تھا۔اس کے بیٹے کو یہ سب کچھ تو کرنا ہی تھا۔''

خاصی بحث وتمحیص کے بعد بالآخر سب قائل ہو ہی گئے۔یشونت جانتا تھا کہ ان میں سے بہت سے ٹھاکر کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکیں گے۔لیکن کچھ لوگ تو اس کا ساتھ بہر حال دیں گے۔اسے یقین تھا کہ اول تو ٹھاکر زندہ ہی نہیں ہوگا اور ہوا بھی تو اس کے ساتھ دو چار لوگ ہی ہوں گے۔

وہ گاؤں کی طرف چلنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ رمیش نے کہا۔''میرا خیال ہے،سمے نکل چکا۔اب تو بھگوان کا شراپ ہی جھیلنا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' یشونت نے پوچھا۔

''آسمان کو دیکھ لو۔''

انھوں نے دیکھا۔آسمان سرخ ہو رہا تھا اور ہوا ساکت تھی۔

''میرے پتا جی نے جو نشانیاں بتائی تھیں،ان کے مطابق یہ سرخ آندھی ہے۔اب کچھ بھی نہیں رہے گا۔سب ختم ہو جائے گا۔'' رمیش کی آواز لرز رہی تھی۔

''چلو......گاؤں کی طرف چلو۔اپنے گھروں تک تو پہنچو۔اور موقع ملے تو ٹھاکر کو ختم کر دو۔شراپ ٹل جائے گا۔''

وہ گاؤں کی طرف چل دیے۔

❁ ❁ ❁

اوتار سنگھ کندھے سے بیگ لٹکائے تیز قدموں سے بڑھ رہا تھا۔اسے پریشانی بھی تھی اور تشویش بھی کہ گاؤں کے باہر زمینوں پر کوئی کام کرتا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

وہ گاؤں کی حد میں داخل ہوا تو اس کی تشویش اور بڑھ گئی۔وہاں ہر طرف سناٹا تھا۔زندگی کے آثار ہی نہیں تھے۔پھر اس کی نظر فضا میں چکراتی ہوئی چیلوں پر پڑی۔اور وہ جگہ وہ تھی

جہاں اس کے اندازے کے مطابق حویلی تھی۔

اوتار سنگھ کا دل چاہ رہا تھا کہ پہلے اماں کے پاس جائے اور انھیں وہ چادر دے جو وہ ان کے لیے جے پور سے لایا تھا۔لیکن گاؤں میں قدم رکھتے ہی اس کا دل اندیشوں سے بوجھل ہو گیا تھا۔کوئی نامعلوم حس اسے بتا رہی تھی کہ گاؤں میں کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔

اس احساس کے ساتھ اس کے قدم تیز ہو گئے۔اس کا رخ حویلی کی طرف تھا۔

حویلی نظر آئی تو اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔پھاٹک کے سامنے لاشیں ہی لاشیں تھیں۔اب وہ تقریباً بھاگ رہا تھا۔لاشوں کو پھلانگتے ہوئے وہ انھیں دیکھ کر پہچاننے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔لیکن وہ سب اس کے لیے اجنبی تھے۔پھر اسے ان میں ایک جانی پہچانی لاش نظر آئی......سندر داس کی لاش!

وہ پھاٹک سے گزرا۔احاطہ بھی لاشوں سے اٹا پڑا تھا۔اب بھاگنا ممکن نہیں تھا۔لاشوں کے اس ڈھیر میں اسے شناسا چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔پھر ایک لاش دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔اس کے حلق سے چیخ نکلی۔''ویر جی۔'' اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''ویر جی......ویر جی۔'' وہ اسے ہلا رہا تھا۔

لیکن وصال دین کے سینے میں بہت گہرا زخم تھا۔خون اب جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔یہ جاننے کے لیے کہ وہ مر چکا ہے،اسے ٹٹولنے کی ضرورت نہیں تھی۔

لگتا تھا،وقت ٹھہر گیا ہے۔وہ وصال دین کا سر اپنے زانو پر رکھے بیٹھا تھا۔اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔''یہ کیا ہو گیا ویر جی،یہ کیا ہو گیا۔'' وہ بڑبڑا رہا تھا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔

پھر ایک چیل نیچے آ کر جھپٹی تو وہ چونکا۔اس نے بڑی نرمی اور آہستگی سے وصال دین کا سر زمین پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ ویر جی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور اسے جلد سے جلد دوسروں کی خبر لینی ہے۔

سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے اسے کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔وہ سب مر چکے تھے اور ان میں چاچا جمال دین بھی تھا۔

وہ آگے بڑھ گیا۔وہ حویلی کے اندر کی صورتِ حال جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

حویلی کا صدر دروازہ کھلا تھا۔عین دروازے پر اندر کی جانب دو لاشیں پڑی تھیں۔وہ انھیں نہیں جانتا تھا۔لیکن اندر کے منظر نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔سامنے دیوار سے ٹک کر پتا جی بیٹھے تھے۔ان کے سامنے خون کا چھوٹا سا تالاب تھا۔ان کے قریب ہی مولوی برکت علی اور چاچا کیدار ناتھ تھے۔وہ دونوں مر چکے تھے۔

چند لمحے وہ ساکت کھڑا وہ منظر دیکھتا رہا۔ اس وقت بس ایک ہی بات اچھی لگ رہی تھی۔ پتا جی زندہ تھے۔ ان کے سینے کا زیر و بم ان کی زندگی کا ثبوت تھا۔ ان کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں اور وہ غشی کی حالت میں تھے۔

''پتا جی!'' اس نے انھیں پکارا۔ اپنی آواز خود بھی اسے اجنبی لگی۔

ٹھاکر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہونٹ لرزے۔ لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

اوتار سنگھ نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور اس کی طرف لپکا۔

ٹھاکر بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نیم جاں ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھائے، باہیں پھیلائیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے دونوں ہاتھ بے جان ہو کر پہلو سے جا ملے۔

اوتار سنگھ نے اسے لپٹا لیا۔ ''یہ...... یہ سب کیا ہو گیا پتا جی؟''

ٹھاکر کے ہونٹ ہلے۔ کمزور سی آواز ابھری۔ لفظ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

''وہ...... جے پو...... جے پور...... والے......''

اوتار سنگھ کو بات سمجھنے کے لیے کسی دانش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب سمجھ گیا تھا۔

''آپ...... آپ ٹھیک ہو جائیں گے پتا جی۔''

ٹھاکر نے نقاہت سے سر ہلایا۔ سر کی وہ جنبش اس کی ناتوانی کی گواہ تھی۔ اس نے اشارے سے کان قریب لانے کو کہا۔ اوتار سنگھ کان اس کے ہونٹوں کے پاس لے گیا۔ ''میں بس...... تمھارے...... زندہ......'' ٹھاکر سے جملہ پورا نہیں کیا جا رہا تھا۔ ''مجھے...... بہت باتیں...... پرنتو...... سمے...... نہیں۔''

''بولیں...... بولیں پتا جی۔''

''تہ خانے...... سب تمہارا...... ویلی جا...... پڑھو...... یہاں...... نہیں۔''

ٹھاکر اٹک اٹک کر کہے جا رہا تھا۔ اوتار سنگھ کی سمجھ میں سب کچھ آ رہا تھا۔ ''سچ کہنا...... بت تم...... نے...... توڑے...... ؟''

اوتار سنگھ صرف ایک لمحے جھجکا۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''جی پتا جی۔''

ٹھاکر کی آنکھیں چمکیں۔ پھر بڑی کوشش کر کے اس نے اوتار سنگھ کا ماتھا چوم لیا۔ ''اب میں...... سکون...... مر......''

ٹھاکر ہانپنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ بولا۔ ''بڑی بات...... تم سے...... سے نہیں...... جلاتا نہیں...... دفن کرنا......''

اتنا تو اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ پتا جی اسے کوئی بڑی اور اہم بات بتانا چاہتے تھے۔ لیکن ان سے بولا نہیں جا رہا ہے۔ بعد کی بات میں تھوڑی الجھن تھی۔ شاید وہ چاچا جمال دین اور ویر جی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ شاید نہیں...... یقیناً یہی بات ہے۔

اسی لمحے ٹھاکر کی نظریں باہر آسمان پر پڑیں۔ اس کی نگاہوں میں چوکنا پن آ گیا۔

''اوتا...... لال آندھی...... سب ختم...... تم جاؤ...... میرا حکم...... جاؤ......'' لفظ اس کے ہونٹوں پر ٹوٹ گئے۔ ''تہ خانہ چھوڑ...... جاؤ...... میرا حکم......'' اب اس کے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بے تابی اور تحکم تھا۔ ''مت رکو...... جاؤ......''

''میں جاؤں گا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں۔ میں آپ کا حکم مانوں گا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ پھر ایک جھٹکا لگا اور سب کچھ ساکت ہو گیا۔

اوتار سنگھ پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ٹھاکر مر چکا تھا۔ اب اوتار سنگھ کو صرف اس کے حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ اس نے باپ کے پاؤں چھوئے۔ پھر اٹھا اور مولوی صاحب کے پاؤں چھوئے۔ ''آپ سے تو مجھے بہت کچھ سیکھنا سمجھنا تھا۔'' وہ بڑبڑایا۔

جانے سے پہلے وہ ٹھاکر کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کلمہ پڑھتا رہا، جیسے اسے پاک کر رہا ہو۔

پر وہ نکل آیا۔ باہر ہوا بند تھی۔ ہر طرف خوف ناک سکوت تھا اور آسمان سرخ ہو رہا تھا۔ اسے یاد آیا۔ پتا جی نے کہا تھا...... لال آندھی۔ اور انھوں نے اسے چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تہ خانے جا کر کچھ رقم لے لے۔ لیکن پتا جی کا آخری حکم ماننا زیادہ ضروری تھا۔

وہ تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اچانک اسے اماں کا خیال آیا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اماں سے ملے بغیر چلا جائے۔ بلکہ وہ اماں کو ساتھ لے کر جائے گا۔ اس نے اپنا رخ ویر جی کے گھر کی طرف کر لیا۔

یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ اماں ایک پوٹلی ہاتھ میں لیے دروازے پر کھڑی ہیں۔ وہ جا کر ان سے لپٹ گیا۔ ''اماں...... چاچا اور ویر جی......''

''مجھے پتا ہے۔ وہ شہید ہو گئے۔'' حمیدہ کے لہجے میں طمانیت اور ٹھہراؤ تھا۔ اس نے نرمی سے اوتار سنگھ کو خود سے علیحدہ کیا۔ ''وقت نہیں ہے بیٹے۔ تمھیں فوراً یہاں سے نکل جانا ہے۔''

اوتار سنگھ کو حیرت ہوئی۔ اماں بھی وہی کہہ رہی تھیں، جو پتا جی نے کہا تھا۔

''یہ پوٹلی لو اور فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ لال آندھی آ رہی ہے۔''

اوتار سنگھ نے پوٹلی لی۔ ''اس میں کیا ہے اماں؟''

''شہر پہنچ کر دیکھ لینا۔ وقت ضائع نہ کرو۔ جاؤ...... چلے جاؤ۔''

''اماں...... میں تو تمھیں لے کر جاؤں گا۔''

''میں نہیں جا سکتی بیٹے۔''

''تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔'' اوتار سنگھ بچوں کی طرح مچل گیا۔ ''اب تمھارے سوا کون بچا ہے میرا۔ میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''دیکھ اوتار سنگھ، میری بات غور سے سن۔ تجھے شہر جانا ہے اور پڑھائی پوری کیے بغیر واپس نہ آنا۔'' وہ پہلا موقع تھا کہ حمیدہ کے لہجے میں اوتار سنگھ کے لیے سختی اور تحکم تھا۔

''میں تمھیں چھوڑ کر کیسے جاؤں اماں۔ میں تمھیں نہیں کھونا چاہتا۔''

''اللہ کی جو مرضی۔ بندے کا کام تو صرف قبول کرنا ہے۔'' حمیدہ کا لہجہ اور سخت تھا۔ ''اور تو تو سدا کا فرماں بردار ہے۔ میری بات کیوں نہیں مانتا۔ میں ماں ہوں تیری۔ اور پہلی بار تجھے حکم دے رہی ہوں۔''

حمیدہ کی یہ بات سن کر اوتار سنگھ مکھن کی طرح پگھل گیا۔ ''میں مانوں گا اماں۔ ضرور مانوں گا۔''

''وقت نہیں ہے۔ تجھے یہاں سے بھاگنا ہے۔ یہاں آفت آنے والی ہے......''

''تو اماں تم......''

''میں نہیں جا سکتی اوتار سنگھ۔ یہاں تیری کچھ امانتیں ہیں۔ ان کی رکھوالی کرنی ہے مجھے۔ یہ میرا وعدہ ہے تو جب بھی واپس آئے گا، میں انشاء اللہ تجھے یہاں ملوں گی۔ تیری امانتیں تجھے دوں گی۔ میرا رب مجھے امانت واپس دیے بغیر نہیں مرنے دے گا۔ اب تو جا۔''

اور اوتار سنگھ کے دل کو جیسے قرار آ گیا۔ وہ حمیدہ سے لپٹ گیا۔ ''ٹھیک ہے اماں۔ میں جا رہا ہوں۔''

حمیدہ نے اسے ذرا ہٹایا اور اس کی پیشانی چوم لی۔ ''جا بیٹا...... رب راکھا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اب بھاگ کر جا اور جب تک طاقت ہو، بھاگتے رہنا۔ رکنا نہیں۔''

اس کے لہجے میں کوئی بات تھی، جو اوتار سنگھ کو اس کے کہنے پر لفظ بہ لفظ عمل کرنے پر اکسا رہی تھی۔ اس نے پوٹلی سینے سے لگائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا۔ لیکن پلٹ پلٹ کر اماں کو دیکھ رہا تھا، جو اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

پھر وہ مڑا اور اماں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

وہ دوڑتا رہا...... دوڑتا رہا۔ اچانک اسے تبدیلی کا احساس ہوا۔ پہلے ہوا بالکل بند تھی اور فضا پر خوف ناک سکوت طاری تھا۔ مگر اب ہوا کی سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ہوا چل رہی ہے اور ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن ایسا بس لگتا تھا۔ ہوا چلتی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ بھاگنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہا تھا۔ مگر اب بھاگنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ منہ کھول کر پھیپھڑوں میں ہوا کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہاں تو ہوا جیسے تھی ہی نہیں۔ سینے میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور سانس لینے کی

کوشش کرتا رہا۔

ہوا کی سنسناہٹ اب شور میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ شور بھی بڑھتا جا رہا تھا، اوتار سنگھ حیران تھا کہ اس سے تو سانس بھی نہیں لی جا رہی ہے۔ ہوا ہے کہاں؟ اور ہوا نہیں تو ہوا کا یہ شور کیسا ہے؟

بیٹھے بیٹھے اس نے پلٹ کر دیکھا اور دہل کر رہ گیا۔ وہ منظر ہی ایسا تھا۔ اس لمحے کے بعد وہ اس منظر کو کبھی بھول نہیں سکا۔

اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا تیز دوڑا ہے...... اور اتنا دور نکل آیا ہے۔ گاؤں کے تو آثار بھی نہیں تھے۔ وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اور اب وہ اندازہ ہی لگا سکتا تھا کہ گاؤں وہاں ہے۔

اور اوپر آسمان پر، جہاں اس کے اندازے کے مطابق اس کا گاؤں تھا، گاؤں سے بیس گنا بڑے حجم کا ایک سرخ بگولہ دھیرے دھیرے گھومتا ہوا نیچے اتر رہا تھا وہ زمین سے بس کچھ ہی فاصلے پر تھا۔

اسے اماں کی بات یاد آئی۔ اماں نے کہا تھا...... رکنا نہیں، چلتے رہنا۔ وہ اٹھا اور چلنے لگا۔ اگرچہ ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا اور آگے بڑھتا رہا۔ ہوا کی سنسناہٹ اب مہیب شور میں تبدیل ہو گئی تھی۔

پھر اچانک وہ شور ایک دھماکے میں تبدیل ہو گیا۔ اس لمحے اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ گرا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہاں دیکھنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ آسمان سے جیسے خشک خون برس رہا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں بھر گیا۔ اس نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن دیر تک وہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں ہوا۔

چند لمحوں میں اسے احساس ہوا کہ آسمان سے ریت برس رہی ہے اور وہ دب رہا ہے۔ وحشت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اماں نے کہا تھا...... یہاں آفت آنے والی ہے...... اور اماں نے کہا تھا...... اب بھاگ کر جا اور جب تک طاقت ہو، بھاگتے رہنا، رکنا نہیں۔

اب اس کی سمجھ میں اماں کی کہی ہوئی ہر بات کی اہمیت آ گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اگر وہ بیٹھا رہا تو زندہ ریت میں دفن ہو جائے گا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن لگتا تھا کہ ریت نے اسے جکڑ لیا ہے۔ اس سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بے بسی کے احساس نے اسے شل کر کے رکھ دیا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور سانس کے ساتھ ریت اندر جا رہی تھی۔ دم گھٹنے لگا تھا اور سانس لینا ناممکن ہوا جا رہا تھا۔

اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ بچ نہیں سکتا۔ اچانک اس بے بسی میں بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر کلمہ مچلا...... لا الہ الا اللہ...... اور جیسے ریت نے اسے اپنی آہنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سرخ ریت کے سمندر میں تیر رہا ہے۔ کچھ بھی دیکھنا ممکن

نہیں تھا اور ایسے میں سمت کا احساس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بس اسے اتنا خیال تھا کہ اسے ہوا کی مخالف سمت میں چلنا ہے۔ ہوا کے ساتھ ہوا کے رخ پر جائے گا تو ریت میں دفن ہونا مقدر بن جائے گا۔

نجانے کتنی دیر وہ اندھا دھند ہوا سے لڑتا آگے بڑھتا رہا۔ کلمہ زبان سے ادا کرنے کی تو اس میں طاقت نہیں تھی۔ البتہ دل میں وہ اسے پڑھے جا رہا تھا۔ اور آگے بڑھتا ہوا ہر قدم اذیت ناک تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ شور اور ہوا کا دباؤ بتدریج کم ہو رہا ہے...... کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ مگر اب بھی وہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں تھا۔ پھر بھی وہ بڑھتا رہا۔ ہر قدم پر کم ہوتے شور اور ہوا کے دباؤ نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ وہ عافیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔

پھر اچانک فضا پرسکون ہو گئی۔ اس کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ وہ بیٹھ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں اماں کی دی ہوئی پوٹلی ہے۔ دوسرے ہاتھ سے وہ آنکھیں مسل رہا تھا۔ بالآخر دھندلا دھندلا سہی، اسے کچھ نظر آنے لگا۔

وہ سڑک کے قریب تھا اور دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بڑھا۔ سڑک کے کنارے پہنچ کر اس نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی......

❀......❀......❀

اسے یاد نہیں کہ وہ گھر کیسے پہنچا اور وہ گھر پہنچا تو رگھو اور رنجنا پریشان ہو گئے۔ اس کا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کا سر اور تمام کپڑے سرخ ریت سے اَٹے ہوئے تھے اور وہ ایک پوٹلی کو سینے سے دبوچے ہوئے تھا۔

رنجنا نے نیچے جا کر بتایا تو بہادر علی اور چھمن بوا اوپر آ گئے۔ انھوں نے گیلے کپڑے سے اس کا سر اور چہرہ صاف کیا۔ بخار بہت تیز تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے بدلتے رہے۔ صبح کاذب کے وقت اس کا بخار اُتر گیا۔ پھر وہ بے خبر ہو گیا۔

دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی۔ رنجنا اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مگر فوراً ہی اسے کمزوری کا احساس ہونے لگا۔ "میں...... میں یہاں کیسے پہنچا؟"

رنجنا کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ "آپ کا بہت برا حال تھا مالک۔ ساری رات بخار رہا ہے۔"

اوتار سنگھ کو اچانک سب یاد آ گیا۔ وہ خواب تھا یا...... اس کا ذہن الجھنے لگا۔ اسی لمحے اسے اپنے کپڑوں پر اور بستر پر سرخ ریت نظر آئی۔ وہ گھبرا کر بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ تو وہ خواب نہیں تھا...... خوفناک حقیقت......! اس کے ساتھ ہی اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔

"میرے پاس ایک پوٹلی تھی۔" وہ بولا۔

"ہاں مالک۔ میں نے رکھ دی ہے سنبھال کر۔ ابھی لاتی ہوں۔"

رنجنا اٹھ ہی رہی تھی کہ باہر سے کسی نسوانی آواز نے پکارا۔ "رنجنا...... او رنجنا......"

"ارے...... نیچے والی بیگم صاحبہ ہیں۔" رنجنا باہر لپکی۔

اوتار سنگھ اب سوچ رہا تھا کہ پوچھنے والوں کو کیا بتائے گا...... اور کس حد تک بتانا مناسب ہوگا۔ یہ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ پوری حقیقت بتانا بے حد خطرناک ہے۔ سوال یہ تھا کہ جو کچھ وہ چھپائے گا، وہ بتانے کے لیے اور بہت لوگ بھی تو موجود ہیں۔ تب کیا ہوگا۔

وہ ان سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ رنجنا پوٹلی لیے اندر آئی۔ "یہ لیجیے چھوٹے ٹھاکر۔" اس نے اماں کی دی ہوئی پوٹلی اس کی طرف بڑھائی۔ "اور وہ نیچے والی بیگم صاحبہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔"

اوتار سنگھ گھبرا گیا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ کہیں انھیں...... "جی...... جی ہاں جی؟"

"ہم تمھارے دکھ میں برابر کے شریک ہیں بیٹا۔" دروازے کی اوٹ سے شفیق نسوانی آواز سنائی دی۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس دکھ کی بات کر رہی ہیں۔

"ہم جانتے ہیں کہ تم اپنا سب کچھ کھو کر آئے ہو۔" بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں۔ "یہ دکھ بہت بڑا ہے۔ مگر بیٹے، اللہ صبر بھی دیتا ہے آدمی کو۔ تمھیں بھی صبر آ جائے گا۔ دیکھو بیٹے، اللہ کی مرضی کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ یہ اس کا کرم ہے کہ تم زندہ سلامت بچ کر نکل آئے۔ اب اسے اپنا ہی گھر سمجھو اور ہم سے کوئی تکلف نہ کرنا۔ سمجھ لینا کہ ان لوگوں کے بدلے میں ہم لوگ تمھیں مل گئے ہیں۔"

اوتار سنگھ حیران تھا۔ "آ آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟"

"اخبار میں چھپا ہے۔ ٹھاکروں کی گڑھی تھا نا تمھارے گاؤں کا نام؟"

"جی...... جی ہاں۔"

"وہ اور اس علاقے کے دس گاؤں سرخ آندھی نے تباہ کر ڈالے۔ لوگ زندہ دفن ہو گئے۔ کسی گاؤں کا نشان تک نہیں رہا۔"

اوتار سنگھ کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ وہ کیا چھپائے گا۔ سب کچھ ساری دنیا کو معلوم ہو گیا۔ "اخبار ہوگا آپ کے پاس؟" اس نے کہا۔

"جی۔ رنجنا، یہ اخبار چھوٹے ٹھاکر کو دے دو۔"

رنجنا گئی اور اس سے اخبار لا کر اوتار سنگھ کو دیا۔

"اور بیٹے، جو کچھ میں نے کہا ہے، رسماً نہیں کہا ہے۔ یہ گھر تمہارا گھر ہے اور ہم سب

لوگ تمہارا خاندان۔ اب میں چلتی ہوں۔"

اوتار سنگھ کا دل تشکر سے بھر گیا۔ کتنی پیاری، نرم دل اور دردمند خاتون ہیں یہ بیچے والی۔ اس نے سوچا۔ پھر وہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سرخ آندھی اور اس کی تباہی کی خبر اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی تھی۔ اخبار کے مطابق گیارہ گاؤں ریت کے نیچے دفن ہو گئے تھے۔

لیکن پورا اخبار چھاننے پر بھی اسے جے پور کے بارے میں کوئی خبر نظر نہیں آئی۔ نہ ہی کوئی ایسی خبر تھی کہ جے پور سے لوگوں کی بھاری تعداد ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ کرنے گئی تھی۔ وہ معاملہ کیسے دبا ہوا ہے، یہ اوتار سنگھ کی سمجھ سے باہر تھا۔

بہر حال اس نے ایک بات سمجھ لی۔ قدرت اس معاملے کو راز رکھنا چاہتی ہے تو اسے بھی زبان کھولنے سے گریز کرنا ہوگا۔

اس نے اخبار ایک طرف رکھا اور اماں کی دی ہوئی پوٹلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

پوٹلی کھول کر وہ حیران رہ گیا۔ اس میں بہت سارے۔۔۔ بہت سارے روپے تھے اور ان کے نیچے، بہت بھاری، سونے کے زیورات!

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ حویلی سے خالی ہاتھ نکلا تھا اور اماں گھر کے دروازے پر یہ سب کچھ لیے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ تاکہ پردیس میں وہ مفلسی سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

اس نے ایک بار پھر رقم کو اور زیورات کو دیکھا۔ وہ اتنا کچھ تھا کہ ساری زندگی عیش سے گزاری جا سکتی تھی!

⊛⋯⊛⋯⊛

سانحہ جتنا بڑا ہو، اس کا اثر اتنی دیر تک رہتا ہے۔ یہاں سانحہ بہت بڑا تھا۔ لیکن اس حد تک افسانوی تھا کہ ثبوت اور شواہد کی موجودگی کے باوجود بار بار محض ایک ڈراؤنا خواب لگنے لگتا تھا۔ مگر پھر ثبوت سامنے آتے اور وہ حقیقت نظر آنے لگتا۔

چند روز وقت کے ساتھ اس آنکھ مچولی میں گزرے تو اوتار سنگھ نے تسلیم کر لیا کہ وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی۔ لیکن جو کچھ ہو چکا تھا، جو کچھ وہ کھو چکا تھا، اسے قبول کرنے کے لیے اور وقت درکار تھا۔ آدمی بڑے المیوں کو بتدریج قبول نہ کرے تو پاگل ہی ہو جائے۔

چوتھے دن اوتار سنگھ مولوی برکت علی کے گھر گیا۔ مولوی صاحب کا بڑا لڑکا اس کا ہم عمر ہی تھا۔ اوتار سنگھ چلا تو گیا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کہنا کیا ہے اور بات کہاں سے شروع کرنی ہے۔

"میرا نام اوتار سنگھ ہے۔" اس نے کہا۔

"جی۔۔۔ بابا آپ کا بہت تذکرہ کرتے ہیں۔ بڑی تعریف کرتے ہیں آپ کی۔"

"بس اُن کی محبت ہے۔"

"لیکن بابا تو آپ کے گاؤں گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے، چھٹیوں میں آپ کو پڑھانا ہے۔" لڑکے کے لہجے میں الجھن تھی۔ "آپ گاؤں نہیں گئے؟"

"میں گیا تھا۔ تین دن پہلے واپس آیا ہوں۔" اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد اٹک اٹک کر بولا۔ "میں کوئی اچھی خبر نہیں لایا ہوں۔"

لڑکے کا چہرہ فق ہو گیا۔ تاہم اس نے کہا کچھ نہیں۔ سوالیہ نظروں سے اوتار سنگھ کو تکتا رہا۔

اوتار سنگھ اس مرحلے سے خوف زدہ تھا۔ یہ نئی ذمے داری اس کے لیے بالکل نئی۔۔۔۔۔۔ اور بہت بڑی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ بہت بڑا۔ جبکہ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مگر یہ چیز اس کی فطرت میں تھی کہ وہ ذمے داری سے منہ موڑنے والا نہیں تھا۔

چند لمحے وہ کچھ کہنے کے لیے حوصلہ مجتمع کرتا رہا۔ لیکن ایک نوجوان لڑکے کو یہ بتانا کہ اس کا باپ مر چکا ہے، آسان کام نہیں تھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اسے لفظ نہیں مل رہے تھے۔

اس وقت کے لیے وہ اخبار ساتھ لایا تھا۔ اس نے لڑکے کی طرف اخبار بڑھا دیا۔

لڑکا اب بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اخبار کی طرف دیکھنے کا اسے حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

"یہ خبر پڑھیں۔۔۔۔۔ سرخ آندھی والی۔" اوتار سنگھ نے اشارہ کیا۔

لڑکے نے اخبار کھولا اور خبر پڑھنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھا کر اوتار سنگھ کو دیکھا۔ "کوئی بھی نہیں بچا؟"

"اخبار میں تو یہی لکھا ہے۔ گیارہ گاؤں یوں ختم ہو گئے، جیسے تھے ہی نہیں۔"

"لیکن۔۔۔۔۔ لیکن آپ۔۔۔۔۔؟"

اوتار سنگھ سمجھ گیا کہ لڑکا اس سے کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ تھا، جہاں اسے محتاط رہنا تھا۔ وہ پوری حقیقت نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ آندھی آنے سے پہلے وہ حویلی پہنچا تھا تو مولوی صاحب شہید ہو چکے تھے۔ اور انہیں گولی لگی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ وہاں گیا بھی تھا۔ "میں تاج محل دیکھنے آگرہ چلا گیا تھا۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اوپر والے کو میری زندگی منظور تھی۔"

دیکھتے ہی دیکھتے لڑکے کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ لیکن اس کی آنکھیں چھلکی نہیں۔ وہ ضبط کر رہا تھا۔ اس نے نارمل سے بلند آواز میں کہا۔ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن."

وہ جملہ عربی میں تھا۔ اوتار سنگھ کو مشق نہیں تھی۔ ورنہ وہ عربی اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ اس نے سنا، ذہن میں دہرایا اور ترجمہ کرنے لگا۔ بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اس طرف جانا

ہے۔ وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔ یہ کیسا صبر دینے والا جملہ ہے!

لڑکے نے اسے چونکا دیا۔ ''میں امی کو یہ خبر کیسے سناؤں گا؟''

اوتار سنگھ کو جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس وقت اندر کی جانب کھلنے والے دروازے سے نسوانی آواز سنائی دی۔ ''صادق علی، ذرا یہاں آیئے۔''

''میں ابھی آتا ہوں۔'' لڑکے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور دروازے سے اندر چلا گیا۔

ایک منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ ٹرے پر شربت کا ایک جگ اور دو گلاس تھے۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور دونوں گلاسوں میں شربت انڈیلا۔ پھر اس نے ایک گلاس اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

اوتار سنگھ بری طرح گڑبڑا گیا۔ وہ یہاں ایک بری خبر لے کر آیا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے وہ مولوی صاحب کی موت کا ذمے دار تھا۔ اگر وہ مولوی صاحب کو ساتھ لے کر گیا ہوتا تو......

''یہ...... میں...... میں نہیں پی سکوں گا۔''

''دیکھیں...... آپ مہمان ہیں اور امی کو ابھی کچھ معلوم نہیں۔'' صادق علی کے لہجے میں التجا تھی۔

''میں...... میں کیسے پی سکتا ہوں۔'' اوتار سنگھ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''آپ دیکھیں۔ میں بھی تو پی رہا ہوں۔'' لڑکے نے گلاس اٹھایا اور شربت کا ایک گھونٹ لیا۔ ''بابا کہتے تھے...... موت اللہ کا حکم ہے۔ وہ تو مقررہ وقت پر، اللہ کے مقرر کردہ طریقے پر آتی ہے۔ آدمی نہ ایک پل زیادہ جی سکتا ہے نہ ایک پل کم۔''

اوتار سنگھ نے جیسے تیسے وہ شربت پی لیا۔

''اب مجھے امی کو بتانا ہے۔'' لڑکے نے کہا۔ ''آپ یہ اخبار مجھے دیں گے؟''

لڑکا بھی اسی کی طرح دشواری محسوس کر رہا تھا۔ اوتار سنگھ نے اخبار اسے دے دیا۔ وہ اندر چلا گیا۔

پھر لڑکا واپس آ گیا اور اس نے اخبار اسے دے دیا۔ اسی لمحے دروازے کے اس طرف سے نسوانی آواز میں کہا۔ ''بیٹے...... ہم تمھارے شکر گزار ہیں کہ تم نے یہ خبر ہم تک پہنچائی۔ ورنہ نجانے کب تک ہم بے خبر رہتے۔''

اوتار سنگھ کو حیرت ہوئی۔ ہندوؤں میں ہوتا تو اسے منحوس قرار دیا جاتا۔ یہاں شکریہ ادا کیا جا رہا تھا۔

''خالہ...... مولوی صاحب میرے لیے پتا سمان تھے۔ ان کا اس طرح سے جانا میرے لیے ذاتی نقصان ہے۔ لیکن آپ کا نقصان تو بہت بڑا ہے۔''

''اللہ جو کرتا ہے، بہتر ہوتا ہے اور اللہ کی مرضی کو خوش دلی سے مان لینے میں ہی عافیت ہے۔''

اوتار سنگھ نے جیب سے دو سو روپے نکالے اور صادق علی کی طرف بڑھائے۔ ''یہ کیا ہے؟'' صادق علی نے ہاتھ بڑھائے بغیر پوچھا۔

''یہ مولوی صاحب کی فیس ہے۔''

''اب اس پر ہمارا کوئی حق نہیں۔'' دروازے کے اس طرف سے مولوی صاحب کی بیوہ نے کہا۔

''ایسا نہ کہیں۔ میں ہر ماہ یہ رقم آپ کو دے کر جاؤں گا۔ یہ میرے پتا جی اور مولوی صاحب کے درمیان معاہدہ تھا۔ آپ یہ نہیں لیں گے تو میرے پتا جی کی آتما ہمیشہ بے چین رہے گی۔''

چند لمحوں کی ہچکچاہٹ آمیز خاموشی کے بعد خاتون نے بیٹے کو پکارا۔ ''صادق علی، رقم لے لو بیٹے اور بیٹے اوتار سنگھ، تمھارا شکریہ۔ میرے خاوند تمھارا تذکرہ ہمیشہ بہت اچھے الفاظ میں کرتے تھے۔ دعا بھی کرتے تھے تمھارے لیے۔ اب وہ نہیں تو ہم سب تمھارے لیے دعا کریں گے۔''

اوتار سنگھ وہاں سے نکلا تو اس کے سینے سے بہت بھاری بوجھ ہٹ چکا تھا۔

❁......❁......❁

بعد میں اوتار سنگھ ہمیشہ سوچتا رہا کہ مولوی صاحب کے گھر جانا اس کے لیے بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ وہ وہاں سے بہت کچھ سیکھ کر آیا تھا۔ وہاں سے اسے زندگی اور موت کا واضح تصور ملا تھا اور صبر کا جو عملی مظاہرہ اس نے دیکھا تھا، وہ اس کے لیے مشعل راہ بن گیا تھا۔ ورنہ شاید وہ صبر نہ کر پاتا۔ امتحان کا نتیجہ آنے تک چھٹیاں تھیں۔ اس دوران وہ صرف سوچتا رہا...... سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ واقعات کس طرح پیش آئے ہوں گے۔ انھیں ترتیب دینے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ٹھاکروں کی گڑھی میں اس نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ دیکھا تھا۔ لیکن اسے سمجھنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ وہ اب وہ سب کچھ یاد کر کے سمجھنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے تو اس نے گاؤں کی ویرانی دیکھی تھی۔ دن کے وقت ٹھاکروں کی گڑھی میں کھیت سنسان تھے۔ ان میں کوئی کام کرنے والا نہیں تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہاں غیر معمولی صورت حال ہے۔

پھر وہ بڑھا تو حویلی کے پھاٹک کے سامنے اسے لاشیں دکھائی دیں۔ ان میں صرف ایک لاش جانی پہچانی تھی...... سندرداس کی لاش! پھر وہ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ احاطہ لاشوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہاں اسے ویرجی، چاچا جمال دین اور کئی شناساؤں کی لاشیں نظر آئیں۔

اسے حویلی کا منظر یاد آیا۔ صدر دروازے پر دو اجنبیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ انھیں

یقیناً پتاجی نے شوٹ کیا تھا اور پتاجی زخمی تھے۔ لیکن زندہ تھے۔ انھوں نے اس سے ٹوٹی پھوٹی گفتگو بھی کی تھی۔

اسے یاد آیا کہ پتاجی کی پشت پر بائیں کندھے کے نیچے گولی لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ان پر گولی پیچھے سے چلائی گئی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ وہ گولی کسی دشمن کی طرف سے نہیں، بلکہ کسی دوست کی طرف سے آئی تھی۔ اور وہاں صرف دو افراد ایسے تھے، جو پتاجی پر گولی چلا سکتے تھے...... چاچا کیدار ناتھ اور مولوی صاحب۔ کیدار ناتھ کے ہاتھ میں طمنچہ تھا۔ جبکہ مولوی صاحب کے ہاتھ خالی تھے۔

اب اوتار سنگھ کے لیے اصل صورتِ حال کا تصور کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ کیدار ناتھ کو اس نے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ کبھی اسے دوستوں میں شمار نہیں کیا تھا۔ وہ اسے کبھی قابل اعتبار نہیں لگا تھا۔ اس نے پتاجی پر پیچھے سے وار کیا ہوگا۔ مولوی صاحب کی مداخلت کی وجہ سے اس کا نشانہ خطا ہوا ہوگا اور یوں مولوی صاحب پتاجی پر قربان ہو گئے ہوں گے اور پتاجی نے کیدار ناتھ کو شوٹ کیا ہوگا۔

اب وہ پتاجی کے ساتھ گزارے ہوئے آخری لمحوں کو پھر سے جی رہا تھا۔ انھوں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ جے پور والوں نے حملہ کیا تھا۔

اس سلسلے میں وہ صرف قیاس آرائی ہی کر سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جے پور والوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس کا تعلق ٹھاکروں کی گڑھی سے ہے۔ جبکہ جے پور میں کوئی اسے جانتا بھی نہیں تھا۔

وہ چونکا۔ نہیں...... جے پور میں کوئی مجھے جانتا تھا۔ اسی نے بتایا ہوگا۔ وہ ارجن تھا...... اس کا اسکول کا دوست۔

اب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ارجن کس طرح اس معاملے میں ملوث ہوا ہوگا اور کیسے اس نے ٹھاکروں کی گڑھی کا پتا بتایا ہوگا۔

بہرحال جس طرح بھی ہوا ہو، یہی ہوا ہوگا۔ جے پور سے مشتعل لوگوں کا لشکر گاؤں پر حملہ کرنے گیا ہوگا۔ اوتار سنگھ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ گاؤں کے تمام لوگوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا اور وہ گاؤں میں بھی نہیں تھے۔ تو شاید وہ گاؤں چھوڑ گئے ہوں گے۔ البتہ پتاجی کے وفاداروں نے ان کا ساتھ دیا تھا اور ان پر قربان ہو گئے تھے۔ اور پتاجی......! وہ ایک اپنے ہی کی مکاری کا شکار ہو گئے تھے۔

ٹھاکر کے ساتھ گزرے ہوئے وہ آخری لمحے اوتار سنگھ کی یادداشت پر پوری ترتیب اور صحت کے ساتھ نقش ہو گئے تھے۔ وہ ان کی ٹوٹی ہوئی باتیں جوڑ کر پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔ پتاجی نے اس سے کہا تھا کہ بس وہ اس سے ملنے، اسے دیکھنے کے لیے زندہ تھے۔ وہ جئیں گے نہیں۔ اور انھوں نے کہا تھا کہ انھیں اس سے بہت ساری باتیں کرنی تھیں۔ لیکن نہ ان کے پاس وقت ہے نہ طاقت۔

پھر انھوں نے کہا کہ تہ خانے میں جو کچھ ہے، وہ اس کا ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ دہلی جا کر پڑھے۔ گاؤں میں نہ رکے۔ وہاں نہ رہے۔ یہ الگ بات کہ آسمان کی سرخی دیکھ کر انھوں نے اس سے اصرار کیا کہ وہ تہ خانے کے مال کو بھول جائے اور جان بچا کر نکل لے۔ وقت کم ہے۔ انھوں نے کہا...... رکو مت، چلے جاؤ۔ اور ان کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ فوری طور پر نکلا، تب بھی بہ مشکل بچا تھا۔

پھر ٹھاکر نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا جے پور میں بت واقعی اس نے توڑے ہیں۔ اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ وہ لمحہ اس کے لیے بڑی آزمائش کا تھا۔ وہ جھجکا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ سچ بولے گا تو مرتے ہوئے باپ کو تکلیف پہنچائے گا۔ پتاجی کو صدمہ ہوگا۔ لیکن آخر اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن اس کے اعتراف پر پتاجی کا ردِعمل اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔ وہ خوش ہوئے تھے اور انھوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ایسا کیوں ہوا۔ لیکن یہ بات صرف پتاجی ہی بتا سکتے تھے اور اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ تو یہ بات اب اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔ بہرحال یہ طے تھا کہ اس کے بت توڑنے پر پتاجی خفا نہیں تھے، بلکہ خوش تھے۔

اس کے بعد پتاجی نے کہا تھا کہ وہ اسے ایک بڑی بات بتانا چاہتے ہیں۔ لیکن وقت نہیں ہے۔ وہ بڑی بات بھی اب اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر پتاجی نے ایک مبہم بات کہی تھی...... جلانا نہیں۔ دفن کرنا۔ اب یہ بات وہ اپنے لیے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس نے یہی نتیجہ نکالا تھا کہ وہ ویرجی اور چاچا جمال دین کے بارے میں کہہ رہے ہوں گے۔

پھر انھوں نے لال آندھی کے آثار دیکھ کر اسے فوراً جانے کا حکم دیا تھا۔ پھر مرنے سے پہلے آخری لمحے میں ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ لیکن کوئی آواز نہیں تھی۔ اس لمحے وہ پتاجی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں کی وہ جنبش اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی، جیسے وہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اور ہونٹوں کی وہ جنبش اسی کی یادداشت پر نقش ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ چشم تصور سے دیکھتا تو اسے ہلتے ہوئے وہ ہونٹ نظر آ جاتے۔

اور پھر پتاجی کو ایک جھٹکا لگا تھا اور سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ پتاجی مر گئے تھے۔

اور اماں! اماں اس کے ساتھ آنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انھوں نے پہلی بار ماں بن کر اسے حکم دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا...... تجھے شہر جانا ہے اور پڑھائی پوری کیے بغیر واپس نہیں آنا ہے اور انھوں نے کہا تھا کہ وہ اس کی امانتوں کی رکھوالی کریں گی اور انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی واپس آئے گا، وہ اسے ملیں گی اور اس کی امانتیں اسے واپس دیں گی۔ انھوں نے کہا

تھا...... میرا رب امانت واپس کیے بغیر مجھے مرنے نہیں دے گا۔

اور اب خبر چھپی تھی کہ گیارہ گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ اماں کیسے بچی ہوں گی؟ اماں کیسے بچ سکتی ہیں! تو اماں کا وعدہ؟

کچھ بھی ہو، اس نے سوچا۔ مجھے اماں سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہوگا۔ پڑھائی مکمل کیے بغیر میں گاؤں واپس نہیں جاؤں گا۔ مگر گاؤں ہے کہاں؟ گاؤں نہ سہی، مگر میں جاؤں گا تو۔ دیکھنے اماں وعدہ پورا کرتی ہیں یا نہیں۔

ان لمحوں سے دوبارہ گزرنے کے بعد اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کا سب کچھ کھو گیا ہے...... ایک ہی ہلے میں! محبت کرنے والا باپ، چاچا جمال دین، جس نے اسے محبت کا پہلا سبق سکھایا تھا...... چھوٹے ٹھاکر، جس سے محبت کریں، اس پر کبھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ اب آپ کو اس سے محبت نہیں رہی ہے۔ کچھ چھن جانے کا دکھ برا ہوتا ہے...... وصال دین، دنیا کی وہ واحد ہستی جسے وہ بھائی سمجھتا تھا۔ اور مولوی صاحب، جن سے وہ عربی پڑھتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ان سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ اور اماں، جنھوں نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ واپسی پر اسے ضرور ملیں گی۔ لیکن جہاں وہ تھیں، وہاں سے میلوں تک کوئی انسان زندہ نہیں بچا تھا۔

وہ سب لوگ اس کی زندگی کا محور و مرکز تھے...... زندگی کی رونق تھے۔ اور وہ سب کے سب بیک وقت اس سے چھن گئے تھے۔ یہ سوچ کر اس کے اندر غم کی ایسی مہیب موج اٹھی کہ اسے لگا کہ اس کا دل دھڑکنا چھوڑ دے گا۔ سینہ چٹخنے لگا تھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ اندر سے پگھل رہا ہے...... سیال میں تبدیل ہو رہا ہے...... اور ذرا سی دیر میں اپنی آنکھوں سے بہہ کر ختم ہو جائے گا۔ بشرطیکہ اس سے پہلے ہی آنکھیں نہ بہہ گئی ہوں۔

اور ایسا ہو جاتا کیونکہ وہ پہاڑ جیسا غم تھا...... اس کے وجود، اس کی طاقت سے بہت بڑا۔ مگر اسی لمحے اس کی سماعت میں مولوی صاحب کے بیٹے کی آواز گونجی ”بابا کہتے تھے، موت اللہ کا حکم ہے۔ وہ تو مقررہ وقت پر، اللہ کے مقرر کردہ طریقے پر آتی ہے۔ آدمی نہ ایک پل زیادہ جی سکتا ہے نہ کم۔“

اور اس کے اندر پگھلنے کا وہ عمل رک گیا۔ ارے...... ہر کوئی اپنے مقررہ وقت پر گیا...... اللہ کے مقرر کردہ طریقے پر۔ اور یہ تو اس نے ماں کے دیہانت پر ہی سمجھ لیا تھا کہ اوپر والا صبر نہ دے تو آدمی کسی اپنے کے مرنے کا غم نہ جھیل سکے اور خود بھی مر جائے۔

اس کے بعد ایک بار اور اس پر کڑا وقت آیا۔ اس روز وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کتنا اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں بچا۔ اس کے سارے پسندیدہ لوگ ایک ساتھ ہی اس سے چھن گئے۔

یہ سوچتے ہوئے اسے غم کا شدید احساس ہوا اور دم گھٹنے لگا۔ پھر اچانک ہی اس کے

اندر ایک تلخی ابھری۔ یہ سب ہوا کیوں؟ اس نے سوچا۔ جے پور والوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیوں کیا؟ اگر اس نے اس روز جے پور کے اس مندر میں بتوں کو نہ توڑا ہوتا تو وہ حملہ نہ ہوتا اور وہ حملہ نہ ہوتا تو وہ سب لوگ...... اور ان کے علاوہ بہت سے لوگ مارے نہ جاتے۔

اس کے وجود میں خود ملامتی کی ایک تند لہر اٹھی۔ قریب تھا کہ وہ اس میں بہہ جاتا۔ مگر اسی لمحے اسے اس خواب کا خیال آ گیا، جو بتوں کو توڑنے والی رات اس نے جے پور کے ہوٹل میں دیکھا تھا۔

وہ خواب بھی اسے پوری جزئیات سمیت یاد تھا۔ بابا نے کہا تھا...... پریشانی بھی نعمت ہے اور آسانی بھی۔ اور ہر نعمت آزمائش بھی ہے۔ عافیت صرف شکر ادا کرتے رہنے میں ہے۔ اور انھوں نے خوش خبری سنائی تھی کہ اس نے جو کچھ اللہ کے لیے کیا، اللہ اس سے خوش ہوا۔ اس نے قبول فرما لیا۔ مگر انھوں نے خبردار کیا تھا کہ آدمی ایک لمحے میں اپنے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ اللہ کے لیے کچھ کرو تو اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ جتنی بھاری قیمت ادا کرو گے، عمل اتنا ہی مقبول ہوگا۔ مگر قیمت ادا کرنے کے بعد کے آداب بھی ہیں۔ قیمت ادا کر کے پچھتائے، غم کیا، افسوس کیا تو سب کچھ ختم۔ جتنی بڑی قیمت ادا کرو، اتنی ہی خندہ پیشانی سے رہو۔ انھوں نے کہا تھا، وقت آئے تو یہ بات یاد رکھنا۔ تم نے جو کچھ کیا، اللہ نے قبول فرمایا۔ لیکن اس کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کرنی ہوگی۔ وہی تمہاری آزمائش ہوگی اور اس میں اللہ ہی تمہاری مدد کرے گا۔

ایک پل میں اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کا خواب سچا تھا۔ اس نے اللہ کو خوش کرنے کے لیے کچھ کیا اور اللہ اس سے خوش ہوا۔ اس کی اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اور اب وہ افسوس کر رہا تھا...... پچھتا رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے پیارے زندگی گنوا بیٹھے۔ تو اس کا وہ عمل تو ضائع ہونے والا تھا۔ وہ آزمائش میں ہارنے والا تھا۔ اور خواب ایسا سچا تھا کہ اس آزمائش میں اللہ نے ہی اس کی مدد کی تھی۔ اسے خواب یاد دلایا تھا۔

ایک پل میں اس کی سوچ بدل گئی۔ مولوی صاحب کے کہنے کے مطابق جو لوگ مرے تھے، انھیں اسی وقت، اسی طرح سے مرنا تھا۔ اگر وہ ان کی موت پر افسوس کرتا ہے، اس کا ذمے دار خود کو سمجھتا ہے تو وہ گویا اپنے اس عمل کی مذمت کر رہا ہے جو اس نے اللہ کو خوش کرنے کے لیے کیا۔

وہ پوری جان سے لرز کر رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی اور کامیابی کے باوجود اپنی ناکامی کا سامان کر رہا تھا۔ وہ تو بس اللہ نے ہی اسے بچا لیا۔ وہ دل میں اللہ سے معافی مانگتا رہا اور شکر ادا کرتا رہا۔

عجیب بات ہوئی کہ اس کے بعد اس نے کبھی کسی مرنے والے کا غم نہیں کیا!

❁......❁......❁

نیچے والے اوتار سنگھ کے حق میں پوری طرح بدل گئے تھے۔ان کے نزدیک وہ المیہ بہت بڑا تھا، جو رونما ہوا تھا۔ 18 سال کا نوجوان ایک ہی لمحے میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھا تھا۔اس کا باپ ہی نہیں ختم ہوا،اس کا گاؤں ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔وہ بے چارہ تو گھر کا تصور بھی کھو بیٹھا۔

سرفراز بیگم بہت حساس خاتون تھیں۔جوانی میں انھیں بیوگی کا دکھ ملا تھا۔اور بیٹے سے وہ محروم تھیں۔انھیں اوتار سنگھ کا غم بہت بڑا لگا۔حور بانو کی بھی یہی کیفیت تھی۔بلکہ وہ تو اخبار میں وہ خبر پڑھنے کے بعد گھنٹوں روتی رہی تھی۔نور بانو اور گلنار بھی اس کی ہمدردی سے سرشار تھیں۔اور چھمن بوا کا تو یہ حال تھا کہ بیٹھے بیٹھے خیال آتا تو ان کی آنکھیں چھلک جاتیں۔

نیچے سب لوگ اپنے اپنے طور پر چھوٹے ٹھاکر کے دکھ کا تصور کرتے اور کڑھتے۔لیکن حور بانو تو اس سے محبت کرتی تھی۔وہ تو اب ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتی رہتی۔بار بار اسے اپنے آنسو پونچھنے پڑتے۔

اب ہر روز چھمن بوا نیچے سے چھوٹے ٹھاکر کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر جاتیں۔سرفراز بیگم کو معلوم تھا کہ وہ ان کے ہاں کے کھانے پسند کرتا ہے۔چند روز بعد رنجنا اس واقعے کے بعد پہلی بار نیچے آئی۔سرفراز بیگم اس کے پاس بیٹھ گئیں۔وہ بہت لٹی پٹی اور غم زدہ لگ رہی تھی۔

''یہ تم نے اپنا کیا حال بنالیا ہے رنجنا۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔

''بس بڑی بیگم، من ہی نہیں لگتا کسی کام میں۔مجھے تو وشواس ہی نہیں ہوتا کہ پورا گاؤں، سارے لوگ ختم ہو گئے۔اور وشواس آئے تو دل پھٹنے لگتا ہے۔'' وہ بیٹھے بیٹھے رونے لگی۔

سرفراز بیگم نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔''صبر کرو رنجنا۔وہاں تمھارے رشتے دار بھی تھے؟''

''میرے ماتا پتا بھی تھے اور میرے رگھو کے گھر والے بھی تھے۔کچھ بھی نہیں بچا۔'' رنجنا ہاتھ ملنے لگی۔

''دکھ تو بہت بڑا ہے۔لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں رنجنا۔''

''پر صبر آتا ہی نہیں بڑی بیگم۔''

''شکر کرو۔تمھارے پاس رگھو تو ہے۔اپنے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھو۔اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا۔'' سرفراز بیگم نے دکھ سے کہا۔پھر پوچھا۔''یہ بتاؤ، تمھارے چھوٹے ٹھاکر کا کیا حال ہے۔وہ تو بہت غم کرتا ہوگا۔''

''وہ تو مہان ہیں بڑی بیگم۔'' رنجنا کے لہجے میں فخر تھا۔''میں نے انھیں دکھ کرتے نہیں دیکھا۔الٹا مجھے اور رگھو کو دلاسہ دیتے ہیں، سمجھاتے ہیں۔کہتے ہیں، جو ہونا تھا، وہ بھگوان کی اِچھا تھی سو ہو گیا۔وہ تو کہتے ہیں، شکر ادا کرو کہ کسی کا ساتھ اتنے دنوں تک مل گیا۔''

سرفراز بیگم یہ سن کر بہت حیران ہوئیں۔ہندوؤں میں یہ تصور اور شکر کی بات۔وہ انھیں

ویسے بھی غیر معمولی لگا تھا۔

''کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے بڑی بیگم کہ ان کے شریر میں ہمارے ٹھاکر جی کی آتما آ گئی ہے۔'' رنجنا بولی۔''ہم سے اتنے چھوٹے ہیں۔بچے تھے ہمارے سامنے۔مگر بات کرتے ہیں تو ہم لوگ خود کو بچہ سمجھنے لگتے ہیں۔''

''پھر بھی غم تو ہوگا انھیں۔''

''بھگوان جانے۔میرے پتا جی کہتے تھے کہ ٹھاکر لوگ اپنے اندر کا حال کسی کو معلوم نہیں ہونے دیتے۔کمزوری دکھانے کو توہین سمجھتے ہیں۔ویسے بڑی بیگم، آپ ٹھیک کہتی ہیں۔دکھ تو ہوگا انھیں۔''

''یقیناً ہوگا۔اچھا یہ بتاؤ، وہ باتیں بہت کرتے ہیں۔''

''نہیں بڑی بیگم۔بات تو وہ بہت ہی کم کرتے ہیں۔ہاں سوچتے بہت ہیں۔اب تو پھر بھی بات کرنے لگے ہیں...... شاید ہمیں دلاسہ دینے کے لیے۔پہلے تو بغیر کام کے بات ہی نہیں کرتے تھے۔ہاں پڑھنے بیٹھیں تو بہت بولتے ہیں...... بہت سوال کرتے ہیں۔''

قریب بیٹھی حور بانو بہت غور سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔اس روز اس کی محبت دو چند ہو گئی۔چھوٹے ٹھاکر میں تمام خوبیاں بڑے لوگوں والی تھیں۔

اُدھر رنجنا کے جانے کے بعد سرفراز بیگم بھی چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں سوچتی رہیں۔انھیں رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کم از کم وہ اس لڑکے کی ایک محرومی تو کسی حد تک دور کر سکتی ہیں۔وہ اسے ماں کی محبت دے سکتی ہیں۔

لیکن کیسے؟ انھوں نے سوچا۔وہ اس کی ماں بن جائیں اور اسے کہیں کہ وہ اس گھر کو اپنا گھر اور گھر کے تمام لوگوں کو اپنا سمجھے۔وہ اس کے لیے اپنا پردہ ختم کر سکتی ہیں۔لیکن اس سے آگے...... ! وہ تین جوان بیٹیوں کی ماں تھیں۔بن باپ کی بیٹیاں ویسے بھی بہت بڑا بوجھ ہوتی ہیں۔پھر یہاں تو مذہب کا فرق تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بچیاں بہت اچھی، بہت نیک ہیں۔لیکن جوانی ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔کوئی معصوم سی بھول بھی ہو گئی تو وہ اللہ کے ہاں اپنے مرحوم شوہر کو کیا منہ دکھائیں گی۔اللہ کو کیا منہ دکھائیں گی۔

بس اس ایک خیال سے وہ جھجکتی رہیں۔ورنہ ان کا دل تو چاہتا تھا کہ وہ جائیں اور چھوٹے ٹھاکر سے یہ سب کچھ کہہ دیں۔وہ اس پر حیران بھی تھیں کہ ان کے دل میں اس کے لیے یہ کیسی محبت پیدا ہو گئی ہے۔پھر انھیں خیال آیا کہ شاید اس کا سبب ان کی محرومی ہے۔انھیں بیٹے کی کیسی آرزو تھی۔لیکن وہ ان کے نصیب میں تھا ہی نہیں۔تو اب وہ محرومی ان کے لیے چھوٹے ٹھاکر کی محبت بن گئی ہے۔

وہ بیٹیوں کی خاطر اس محبت سے منہ موڑے بیٹھی رہیں۔خود سے لڑتی رہیں۔لیکن پھر

کچھ ایسا ہوا کہ ان کی ساری احتیاط دھری رہ گئی اور اس غیر مسلم کی محبت ایک منہ زور دھارے کی طرح انھیں بہالے گئی۔

ہوا یہ کہ اس روز رنجنا ان کے پاس آئی اور انھیں کچھ نوٹ دیے۔

انھوں نے حیرت سے نوٹوں کو دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ کس لیے رنجنا؟'' ان کی سمجھ میں واقعی کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

اپنی حیرت کے جواب میں انھیں رنجنا کے چہرے پر بھی حیرت نظر آئی۔ ''بھول گئیں بڑی بیگم۔ یہ کرائے کے پیسے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر نے بھجوائے ہیں۔''

''یہ...... اب میں یہ نہیں لے سکتی۔'' انھوں نے گھبرا کر کہا۔ ''میں نے کہا تا کہ یہ گھر اب تم لوگوں کا ہے۔ چھوٹے ٹھاکر کا ہے۔ لو یہ چھوٹے ٹھاکر کو واپس دے دو۔''

لیکن رنجنا کا ہاتھ مٹھی بن گیا۔ ''میں...... میں چھوٹے ٹھاکر کا حکم کیسے ٹال سکتی ہوں۔ ان کی بات ماننا تو میرا دھرم ہے بڑی بیگم۔''

''میں جو کہہ رہی ہوں۔'' سرفراز بیگم نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''مجھے شما کر دیں بڑی بیگم۔'' رنجنا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کا اور چھوٹے ٹھاکر کا معاملہ ہے۔ میں تو ان سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

بات سرفراز بیگم کی سمجھ میں آ گئی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں خود بات کروں گی تمھارے چھوٹے ٹھاکر سے۔'' انھوں نے کہا۔

رنجنا چلی گئی۔ سرفراز بیگم نے وہ روپے ایک طرف رکھ دیے۔ ہاتھوں میں وہ انھیں ڈنک مارتے لگ رہے تھے۔

ویسے انھیں حیرت ہو رہی تھی۔ ہر ماہ یہ روپے انھیں ملتے تھے اور وہ رکھ لیتی تھیں۔ لیکن اس بار انھیں یہ خیال تک نہیں آیا کہ یہ مکان کا کرایہ ہے۔ یعنی صرف چند روز میں انھوں نے دل کی گہرائیوں سے چھوٹے ٹھاکر کو اپنا بیٹا مان لیا تھا۔

انھوں نے سوچا، شام کو وہ خود جا کر چھوٹے ٹھاکر سے بات کریں گی۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ نے بھی نیچے والوں کی تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ وہ بہت حساس اور سمجھ دار تھا۔ اس کا مشاہدہ بہت اچھا اور گہرا تھا۔ تبدیلیوں کو محسوس کر لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ان دنوں تقریباً ہر روز نیچے سے کچھ نہ کچھ بھیج دیا جاتا تھا اور وہ نیچے سے آئی ہوئی ہر چیز بہت شوق سے کھاتا تھا۔

دوسرے اب چھمن بوا اس سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ورنہ پہلے کبھی وہ سامنے نہیں آئی تھیں۔

خود اس نے اپنی توجہ رنجنا اور رگھو پر مرکوز کر لی تھی۔ انھیں اس کی ضرورت بھی تھی۔ وہ ان کا دکھ سمجھ سکتا تھا۔ ان کا سب کچھ ٹھاکروں کی گڑھی کے ساتھ سرخ ریت کے نیچے دفن ہو چکا

تھا۔ رشتے دار، گھر والے، دوست، سہیلیاں، گھر بار...... کچھ بھی تو نہیں بچا تھا اور وہ پردیس میں تھے۔ اور ان کا اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔

اوتار سنگھ نے ایک بار...... صرف ایک بار ان کے دکھ سے اپنے دکھ کا موازنہ کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ ہر اعتبار سے ان سے بہتر ہے۔ دیکھا جائے تو ان کی طرح اس کا بھی سب کچھ کھو گیا تھا۔ لیکن فرق تھا۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے مٹتے دیکھا تھا۔ بلکہ وہ تو خود بھی زندہ دفن ہوتے ہوتے بچا تھا۔ آدمی اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لے تو بالآخر اسے صبر آ جاتا ہے۔ لیکن جس نے دیکھا نہ ہو، اسے صبر نہیں آتا۔ ایسے ہی جیسے کوئی کھو جائے اور یہ علم نہ ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے، تو آدمی کو کبھی صبر نہیں آتا۔ مرے ہوئے کو تو وہ جلد یا بہ دیر بھول ہی جاتا ہے۔ سو رنجنا اور رگھو کو صبر نہیں آتا تھا اور یہ فطری بھی تھا۔

دوسرا فرق یہ تھا کہ ان دونوں کا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ جبکہ اوتار سنگھ اماں کو جیتا چھوڑ کر نکلا تھا اور اماں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ پڑھائی مکمل کر کے واپس آئے گا تو وہ اسے ملیں گی...... اس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اور اماں اس کے لیے بہت اہم تھیں۔ تو اس کے لیے ایک امید تھی کہ کوئی اس کا ہے...... اور اس کی راہ تک رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ عقل سے سوچتا تو یہ اسے ممکن نہ لگتا۔ اماں کیسے بچی ہوں گی۔ جہاں گیارہ گاؤں ریت کے نیچے دفن ہو گئے ہوں، وہاں ان میں ایک گاؤں میں ایک عورت کیسے زندہ بچ سکتی ہے۔ تو وہ امید و بیم کی کیفیت تھی۔ لیکن امید تھی تو سہی۔

ہاں...... اسے پچھتاوا ہوتا تھا کہ کیوں اماں کی بات مان کر، وہ اکیلا وہاں سے نکل آیا۔ وہ اماں کو اپنے ساتھ لا سکتا تھا۔ وہ اماں کو زبردستی گود میں اٹھا کر لے آتا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ انھیں موت کے منہ میں اکیلا چھوڑ کر نکل آیا۔ اس کے پاس اس کوتاہی کے لیے بس ایک عذر تھا۔ اس نے حویلی کے باہر اور حویلی میں جو کچھ دیکھا تھا، وہ اس کے شاک میں تھا۔ اس کی سمجھ بوجھ متاثر ہو چکی تھی۔ ایسے میں آدمی نہ تو سوچ پاتا ہے، نہ درست فیصلہ کر سکتا ہے۔

اور ایک تیسرا فرق بھی تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو کچھ اس نے کھویا، وہ اس کوشش کی قبولیت کی نشانی تھی، قربانی تھی اور خواب میں اسے یہ بات سمجھا بھی دی گئی تھی کہ اسے دکھ نہیں کرنا ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ موت اپنے مقررہ وقت پر، طے شدہ طریقے سے آتی ہے اور اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ آدمی کو صبر کرنا پڑتا ہے اور صبر اسے اللہ دیتا ہے۔ جبکہ رنجنا اور رگھو کے پاس ایسا کوئی سہارا نہیں تھا۔ ان کے لیے تو وہ غیر فطری موت تھی۔ ایک ناگہانی مصیبت تھی، جس نے ان کا سب کچھ ختم کر دیا۔

چنانچہ وہ ان کی دل جوئی کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ سخت تو وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ لیکن اس سانحے کے بعد وہ ان کے لیے بہت نرم ہو گیا۔ وہ ان کی ذاتی ضرورتوں کا خیال کرتا۔ انھیں چیزیں

خرید کرلا دیتا۔ ان سے باتیں کرتا اور صبر کی تلقین کرتا۔ اب وہ کھانا ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھاتا۔ ویسے یہ مرحلہ اس کے لیے بڑا سخت ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ کھانا تو دور کی بات، وہ تو اس کے ساتھ بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

''سنو.....اب تم دونوں ہی میرا پریوار ہو۔'' اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔

رگھو دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا۔ ''نہیں چھوٹے ٹھاکر..... ہم تو آپ کے سیوک ہیں۔''

''سیوک تھے کبھو۔ اب تو میرا تم دونوں کے سوا کوئی نہیں۔ میں نے کہا نا، تم میرا پریوار ہو۔''

''نا مالک..... یہ ہم سے نہیں ہوگا۔'' رنجنا گڑگڑانے لگی۔ ''ہماری جگہ تو آپ کے پیروں میں ہے۔''

اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ نرمی سے انھیں نہیں سمجھا سکتا۔ چنانچہ اس نے تیور بدل کر کہا۔

''تو تم میرے سیوک ہی رہنا چاہتے ہو نا۔ پر تم تو اچھے سیوک بھی نہیں ہو۔''

یہ سن کر وہ دونوں پوری جان سے لرز گئے۔ ''مالک..... حکم کرو تو جان بھی دے دوں۔'' رگھو بولا۔

''تو میرا حکم کیوں نہیں مانتے۔'' اوتار سنگھ نے کڑے لہجے میں کہا۔

چاروناچار وہ دونوں اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ لیکن ان سے کھایا نہیں جارہا تھا۔

اوتار سنگھ جانتا تھا کہ صدیوں پرانی نسلی عادت چھوٹنے میں وقت تو لگے گا۔ مگر اسے اس مشکل کام کو آسان کرنے کا طریقہ بھی آتا تھا۔ وہ انہی کے جیسے لقمے لے رہا تھا اور انہی کی رفتار سے کھا رہا تھا۔

وہ دونوں اس کے ساتھ بیٹھنے کی وجہ سے گھبرائے ہوئے تھے۔ پہلے تو انھیں پتا ہی نہیں چلا۔ لیکن آخر رنجنا کو اس کا احساس ہوگیا۔ ''مالک..... چھوٹے ٹھاکر، آپ نے ٹھیک سے بھوجن نہیں کیا ہے۔'' وہ بولی۔

''جتنا تم نے کھایا ہے، اتنا ہی میں نے کھایا ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''اور روز یہی ہوگا۔ مجھے کھلانے کے لیے تم دونوں کو ڈھنگ سے کھانا ہوگا۔''

''پر ٹھاکر جی، آپ کا بڑھتا ہوا شریر ہے۔ آپ کی اور ہماری ضرورت میں فرق ہے۔'' رگھو بولا۔

''وہ فرق میں جانتا ہوں۔ تم لوگ پیٹ بھر کر کھاؤ گے تو میں بھی پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔''

یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ ان دونوں نے جلدی ہی سمجھوتہ کرلیا۔ اس کے باوجود رنجنا کو فکر لگی رہتی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر کمزور ہو رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ٹھیک سے کھانا نہیں کھاتا ہے۔ چنانچہ وہ رگھو سے کھانے پر اصرار کرنے لگی۔

پھر اوتار سنگھ نے رگھو کو چاچا اور رنجنا کو موسی کہنا شروع کردیا۔ وہ انھیں احساس دلا رہا تھا کہ اس کے لیے ان کے سوا کوئی نہیں ہے اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ لیکن نوکر اور مالک کے درمیان جو حجاب ہوتا ہے، وہ مٹنے والا نہیں تھا۔

اس رات وہ کھانے کے بعد معمول کے مطابق کچھ دیر کوٹھے پر چہل قدمی کرتا رہا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

کچھ دیر بعد رنجنا کمرے میں آئی۔ ''چھوٹے ٹھاکر، وہ بڑی بیگم آپ سے ملنے آئی ہیں۔''

اوتار سنگھ نے چونک کر دیکھا۔ اتنی دیر میں سرفراز بیگم اس کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ان کے اس طرح سامنے آنے کی اسے توقع نہیں تھی۔ ''ماں جی..... آپ.....؟''

''کیوں؟ میں آ نہیں سکتی تمھارے پاس؟'' سرفراز بیگم کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

''کیوں نہیں ماں جی۔ گھر ہے آپ کا۔''

''مگر میں تو تمہارا گھر سمجھتی ہوں۔ یہی شکایت لے کر آئی ہوں۔''

شکایت کا سن کا اوتار سنگھ اور گھبرا گیا۔ ''مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ماں جی؟'' اس نے پوچھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ کھڑی ہوئی ہیں۔ اس نے گھبرا کر کرسی اٹھائی اور ان کے پاس لے گیا۔ ''آپ بیٹھیں نا ماں جی۔''

سرفراز بیگم بیٹھ گئیں ''آپ بھی بیٹھئے نا۔''

''آپ کے سامنے بیٹھنا اچھا نہیں لگے گا۔''

''کیوں؟ بیٹے ماں کے سامنے نہیں بیٹھتے کیا؟'' سرفراز بیگم نے کہا۔

اوتار سنگھ جھجکتے جھجکتے بیٹھ ہی گیا۔ ''میں سوچ رہا ہوں ماں جی کہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے۔''

سرفراز بیگم نے بند مٹھی کھولی۔ مڑے ہوئے نوٹ ان کی ہتھیلی پر پھیل گئے۔ ''میں اس غلطی کی بات کررہی ہوں۔'' انھوں نے کہا۔

''جی..... میں سمجھا نہیں۔ یہ کیا ہے؟''

''یہ تم نے مجھے بھجوائے تھے۔ رنجنا لائی تھی۔''

اوتار سنگھ کی سمجھ میں بات آگئی۔ ''اوہ، یہ..... یہ تو مکان کا کرایہ ہے۔''

''مگر میں نے پچھلی بار تم سے کہا تھا کہ اب یہ تمہارا گھر ہے۔ میرا مکان نہیں۔''

اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ ''میرے دل میں بڑی قدر ہے اس بات کی۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔ ''لیکن ماں جی، یہ لین دین کا معاملہ اس سے الگ ہے۔''

''لیکن اب میں تم سے یہ پیسے نہیں لے سکتی۔''

''آپ شاید غلط سمجھ رہی ہیں ماں جی۔ ہمارا سب کچھ ختم ہو گیا۔ لیکن ماں جی، میرے پاس اتنا ہے کہ زندگی بھر ختم نہیں ہوگا۔ اگر میں مفلس ہو گیا ہوتا تو آپ سے تکلف نہ کرتا۔ لیکن ہوتے ہوئے نہ دوں تو میرے پتا جی کی آتما اشانت رہے گی۔''

''غلط میں نہیں سمجھ رہی، تم سمجھ رہے ہو۔'' سرفراز بیگم کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''میں نے اس دن بھی کہا تھا کہ میں یہ سب رسماً نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ اسے اپنا گھر ہی سمجھو اور ہم سے کوئی تکلف نہ کرنا۔ سمجھ لینا کہ ان لوگوں کے بدلے تمھیں ہم لوگ مل گئے ہیں۔ اب ہم سب لوگ تمہارا خاندان ہیں۔ آج میں پھر کہہ رہی ہوں کہ میں نے وہ رسماً نہیں کہا تھا......''

''میں نے ایسا سمجھا بھی نہیں ماں جی۔ آپ کی سچائی مجھ تک پہنچ گئی تھی۔''

''افسوس تو یہی ہے کہ نہیں پہنچی۔ کسی ماں کا بیٹا لکھ پتی ہو تو کیا ماں اس سے گھر میں رہنے کا کرایہ وصول کرتی ہے...... کر سکتی ہے؟ اور کوئی بیٹا لکھ پتی ہو تو کیا وہ گھر میں رہنے کے صلے میں ماں کو کرایہ ادا کرتا ہے؟ میں نے تمھیں مفلس نہیں سمجھا۔ بس بیٹا سمجھنے کے بعد میں تم سے کرایہ نہیں لے سکتی۔ ہاں میں نے تمھیں رسماً بیٹا کہا ہوتا تو لے لیتی۔ بلکہ مجھے تو خوشی تھی کہ تم نے پہلی بار مجھے پکارا تو ماں جی کہہ کر پکارا۔ لیکن آج تم نے میرا دل توڑ دیا......''

''یہ بات نہیں ماں جی۔'' اوتار سنگھ نے شرمندہ لہجے میں کہنے کی کوشش کی۔

''نہیں۔ مجھے بات پوری کرنے دو۔'' سرفراز بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔ 'آج تم نے رنجنا سے کرایہ بھجوایا تو میں نے سمجھ لیا کہ تم نے میری بات کو رسمی سمجھا تھا۔ اسی لیے میں ثابت کرنے چلی آئی۔ میں زندگی بھر بہادر علی کے سوا کسی نامحرم کے سامنے نہیں آئی۔ اور بہادر علی اماں جان کے زمانے کا ملازم ہے...... گھر کے فرد جیسا۔ مگر اپنے شوہر کے انتقال کے بعد میں نے بہادر علی سے بھی پردہ کیا۔ لیکن آج میں تمھارے سامنے ہوں کیونکہ تمھیں بیٹا سمجھتی ہوں۔'' یہ کہتے کہتے ان کی آواز رندھ گئی۔ ''اور میں آج تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم جب چاہو، نیچے آؤ۔ میری بیٹیاں بھی تم سے پردہ نہیں کریں گی۔ تم ہمارے لیے گھر کا فرد ہو۔ تم میرے بیٹے ہو چھوٹے ٹھاکر۔''

اوتار سنگھ کو اپنے سینے میں دل پگھلتا محسوس ہوا۔ وہ اٹھا اور اس نے جھک کر سرفراز بیگم کے پاؤں چھو لیے۔ پھر وہ سیدھا ہوا اور اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''لائیے...... یہ پیسے مجھے دے دیجیے۔ مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے یہ گستاخی کی۔ آپ کا دل دکھایا۔''

سرفراز بیگم آنسوؤں کے درمیان مسکرا دیں۔ انھوں نے نوٹ اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیے۔

''یہ بتائیں، آپ کیسی ماں ہیں کہ آپ کو اپنے بیٹے کا نام بھی نہیں معلوم؟'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''میں نے جاننا ہی نہیں چاہا بیٹے۔ مجھے تم کو چھوٹے ٹھاکر پکارنا ہی اچھا لگتا ہے۔

''دعا کیجیے گا کہ میں آپ کے لیے بیٹا ہی ثابت ہوں۔ یہ بڑی ذمے داری ہے۔''

''بیٹوں کو خود کو بیٹا ثابت کرنا نہیں ہوتا۔ بس وہ بیٹے ہوتے ہیں۔ اب میں چلتی ہوں اور چھوٹے ٹھاکر، جو میں نے کہا ہے، وہ یاد رکھنا۔ مجھے دہرانے پر مجبور کبھی نہ کرنا۔ سمجھ رہے ہو نا؟''

اوتار سنگھ سمجھ رہا تھا۔ وہ اسے کہہ رہی تھیں کہ وہ جب چاہے، نیچے آ سکتا ہے۔ اس سے کسی کا پردہ نہیں۔

❁......❁......❁

سرفراز بیگم کی وہ دعوت اوتار سنگھ کی محبت کے لیے کسوٹی بن گئی۔ بڑی بات یہ تھی کہ بالکل ابتدا ہی میں اسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ اس کی محبت کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے۔ شاید ایسا اس لیے ہوا کہ وہ بنیادی طور پر سوچنے والا آدمی تھا۔ ہر بات پر سوچنا، غور کرنا، تجزیہ کرنا اور پھر فیصلہ کرنا اس کی فطرت میں تھا۔

اب تک اس کی محبت بے سمت اور نظریاتی تھی۔ اس کے عشق کا آغاز ایک آواز سے ہوا تھا اور ایک ہی پل میں وہ آواز اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔ اس آواز نے اس کے پورے وجود پر سپردگی طاری کر دی تھی۔ وہ کیفیت اسے آج بھی یاد تھی۔ اردو کے کسی رومانوی شعر میں وہ کیفیت نہیں تھی، جو اس آواز نے اسے دی تھی۔ وہ ایسی کیفیت تھی، جسے وہ خود بھی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے دل میں اس آواز والی کے لیے جو پہلا جذبہ ابھرا، وہ احترام کا تھا۔ پھر وہ عقیدت تک پہنچا۔ اسے لگا کہ وہ آواز اسے عبادت پر اکسا رہی ہے۔ اس کے بعد یہ خواہش ابھری کہ وہ اس آواز والی کے روبرو بیٹھا ہو اور وہ آواز سن رہا ہو، اور وقت ٹھہر جائے۔ یہاں تک کہ زندگی تمام ہو جائے۔ اس کے بعد ہی تو اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس ان دیکھی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔

اسے آج بھی یاد تھا۔ وہ اس بات پر جھنجلایا تھا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہی ہے، وہ اس کے لیے نامانوس ہے۔ اسے سمجھ نہیں سکتا۔ اور یہ بات تو اس نے فوراً ہی سمجھ لی تھی کہ وہ پڑھ رہی ہے کیونکہ وہ گفتگو کا انداز نہیں تھا۔

اس جھنجلاہٹ کے نتیجے میں اس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش وہ الفاظ بھی سمجھ سکتا۔ وہ آواز بہت خوبصورت تھی۔ لیکن پڑھنے کا انداز اس سے بھی خوبصورت تھا...... یقین تھا کہ جو کچھ وہ پڑھ رہی ہے، وہ خوبصورت ترین ہے کیونکہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود آواز، لحن اور الفاظ کی وہ اکائی اس کے اندر خوبصورت ترین جذبے جگا رہی تھی۔ اسے سن کر اس کا جی چاہتا تھا کہ زمین پر ماتھا ٹیک دے اور ساکت ہو جائے۔ کس کے سامنے......؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ تب اس نے سوچا تھا...... شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔

بچپن سے سوچنے والے اوتار سنگھ نے رومانوی شاعری سے، اپنے استاد کی تشریحات سے اور اپنے غور وفکر سے یہ بات سمجھ لی تھی کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے اور ہو یوں جاتی ہے کہ اوپر والا کسی کے دل میں کسی کی بھی محبت ڈال دیتا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ انسانی نسل کا ارتقا محبت کے دم سے ہے۔ دنیا میں سب سے سچی محبت ماں باپ کی محبت ہوتی ہے۔ اور وہ اوپر والے کی عطا ہے۔ محبت نہ ہوتی تو انسانی نسل ختم ہو چکی ہوتی۔ بچے کو کوئی خطرہ لاحق ہو تو کمزور عورت ماں بن کر بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتی۔ انسان تو بڑی چیز ہے، اس نے ننھے چوزے کے لیے مرغی کو بلی کے سامنے ڈٹتے، لڑتے اور بھگاتے دیکھا تھا۔

تو اس کا نظریہ یہ تھا کہ محبت وہ ہوتی ہے، جو اوپر والا کسی بھی لمحے کسی کو کسی کے لیے دے دیتا ہے اور وہ بے لوث، بے غرض ہوتی ہے۔ وہ کچھ مانگتی ہے، نہ شرطیں عائد کرتی ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ تو جواب میں محبت کیا، ذرا سی توجہ کا مطالبہ بھی نہیں کرتی۔

جب اوتار سنگھ کو یہ گمان ہوا کہ اسے اس آواز والی سے محبت ہوگئی ہے تو قدرتی طور پر اس نے یہی سمجھا کہ وہ محبت اس کے دل میں اوپر والے نے ڈالی ہے۔ لیکن اس بات کی تصدیق کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تھی۔ وہ طبعاً حسن پرست تھا۔ ہر چیز میں خوبصورتی اور حسن دیکھنا چاہتا تھا اور خوبصورتی اسے اچھی بھی لگتی تھی۔ اس لڑکی کی اس نے آواز سنی تھی، اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آواز کی خوبصورتی اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ لڑکی حسین بھی ہوگی۔ چنانچہ اپنی محبت اس کی اپنی نظر میں مشتبہ ہوگئی۔ اگر وہ لڑکی کبھی سامنے آئی اور وہ بدصورت ہوئی تو کیا وہ اس کے لیے پہلے جیسی محبت محسوس کر سکے گا؟

الفاظ سمجھنے کی خواہش پیدا ہوئی تو یہ جاننا ضروری ہوگیا کہ وہ کون سی زبان ہے۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ بات شاید اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ وہ اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کر سکتا تھا تو پوچھتا کیسے۔ وہ تو اتفاق سے اسے وصال دین سے معلوم ہوگیا کہ وہ عربی زبان ہے۔ تب اسے اپنی آرزو پوری کرنے کی کوشش کا موقع ملا اور وہ مولوی صاحب سے عربی سیکھنے لگا۔

اب اوتار سنگھ اتفاق کو نہیں مانتا تھا۔ برسوں پہلے اس نے سمجھ لیا تھا کہ جسے انسان اتفاق سمجھتا ہے، وہ اوپر والے کی منصوبہ بندی ہوتی ہے، جو انسان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بے بسی اور عاجزی میں وہ اسے اتفاق قرار دے دیتا ہے۔ تو گویا اس کے علم میں یہ بات آنا کہ آواز والی لڑکی عربی پڑھتی ہے، درحقیقت اوپر والے کی منصوبہ بندی تھی۔ اس کے نزدیک یہ اس کے اس اندازے کی تصدیق تھی کہ اس کے دل میں وہ محبت اوپر والے نے ڈالی ہے۔ اسے اپنی محبت پر اعتماد ہوگیا۔ تب اس نے یہ سمجھ لیا کہ وہ لڑکی کتنی ہی بدصورت کیوں نہ ہو، اس سے اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

اس نے بڑی لگن سے عربی پڑھی۔ مولوی صاحب بھی استادِ کامل ثابت ہوئے۔ لیکن مولوی صاحب اس کی رفتار پر حیران تھے۔ وہ اس کی رفتار کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ اس کی رفتار کے پیچھے محبت کی طاقت ہے۔ وہ جلد سے جلد عربی زبان پر قدرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک دن اس کی سماعت اس آواز سے محروم ہوگئی۔ شروع میں تو وہ بہت پریشان ہوا۔ مگر پھر اسے پتا چلا کہ وہ آواز تو اس کے اندر موجود ہے۔ جب اس کا جی چاہے تو اس کے اندر کوئی خودکار بٹن دب جاتا ہے اور وہ آواز اپنی تمام تر خوبصورتی اور رعنائی سمیت اس کی سماعت میں رس گھولنے لگتی ہے۔ مگر وہ لفظوں سے محروم آواز تھی...... صرف آواز، لہجہ اور لحن!

اس محرومی سے اسے بس ایک نقصان ہوا۔ وہ اپنی عربی کی استعداد نہ جانچ سکا۔ وہ یہ نہ جان سکا کہ جو کچھ وہ لڑکی پڑھتی ہے، وہ اسے سمجھنے کے قابل ہوا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اسی کے لیے تو وہ یہ سب جتن کر رہا تھا۔

اوتار سنگھ نے کبھی نہیں چاہا، کبھی نہیں سوچا کہ وہ آواز والی لڑکی کو دیکھے۔ اسے محبت ہوگئی تھی اور وہ بس محبت کیے جا رہا تھا۔ کالج میں اسے اس محبت کی سچائی کا یقین بھی مل گیا تھا۔ امرتا، ریتا اور پشپا بے حد حسین لڑکیاں تھیں۔ اور وہ بچہ نہیں تھا، جانتا تھا کہ اس کے ایک اشارے پر وہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آ گریں گی۔ لیکن اس نے کبھی ایک پل کے لیے بھی ایسا نہیں سوچا بلکہ وہ جب بھی انھیں دیکھتا، اسے آواز والی لڑکی کا خیال آ جاتا اور اس کے اندر کا موسم ویسا ہی خوبصورت ہو جاتا، جیسا پہلی بار اس کی آواز سن کر ہوا تھا۔

سو وہ اپنی اس نظریاتی محبت کے سحر میں گم تھا۔ وہ محبت اس کے وجود میں ایک پُرسکون جھیل کی طرح تھی۔ لیکن اب سرفراز بیگم نے اس جھیل میں ایک کنکر اچھال دیا تھا۔ جھیل کا سکون درہم برہم ہوگیا۔ جھیل کی سطح پر دائرے ہی دائرے نمودار ہوئے اور وہ بے چین ہوگیا۔

پہلی بار اس نے سوچا کہ وہ نیچے جا سکتا ہے۔ کوئی اس سے پردہ نہیں کرے گا، تو وہ پریشان ہوگیا۔ وہاں تین لڑکیاں تھیں۔ وہ اسے کیسے پہچانے گا۔ دل نے جھٹ کہا...... یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اس کی آواز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا ہے۔

وہ اسے دیکھ سکے گا۔ اس کی محبت مکمل ہو جائے گی۔ اس تصور نے ہی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی۔ اس کا جی چاہا کہ اسی وقت نیچے چلا جائے...... اسے دیکھ لے۔ وہ خوشی اس کے لیے بالکل نئی اور انوکھی تھی۔

لیکن وہ رکھ رکھاؤ والا آدمی تھا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ اس وقت جانا مناسب نہیں۔ اس نے سوچا...... کل دیکھیں گے۔

سرخ آندھی والے واقعے کے بعد سونا اس کے لیے مسئلہ بن گیا تھا۔ قدرتی بات تھی

کہ پتا جی، ویر جی اور چاچا جی اسے یاد آتے تھے اور اسے یہ بھی خیال تھا کہ اسے ان کا دکھ نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ اس کی قربانی رائیگاں ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف دکھ ایک فطری چیز تھا۔ دکھ پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا ...... کسی کا زور نہیں چلتا۔ وہ تو چپکے سے خیال کی طرح آتا ہے...... دبے پاؤں...... جیسے کوئی چور ہو۔ پھر پتا بھی نہیں چلتا کہ کب اور کیسے وہ دل، دماغ پر...... پورے وجود پر چھا گیا ہے۔ پتا چلتا ہے تو آنکھوں سے آنسو چھلک رہے ہوتے ہیں۔ اس کا تجربہ اسے ماتا جی کی موت پر ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ دکھ کی طرف سے چوکنا رہتا تھا۔ ایک بار تو بے خبری میں اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ تو بروقت اسے خیال آ گیا اور اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس کے بعد سے وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچنے سے بھی بچنے لگا تھا۔ وہ شعوری طور پر اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ ان لوگوں کو یاد نہ کرے۔

لیکن سوتے وقت بچھڑے ہوئے لوگ خاص طور پر یاد آتے تھے۔ یہ بات وہ کبھی نہیں سمجھ سکا کہ غم نہ کرنے کی جدوجہد میں اس نے غم کو خود پر طاری کر لیا ہے۔ اگر وہ ایک بار کھل کر غم کر لیتا...... رو لیتا، تو اس کے بعد دھیرے دھیرے، بہ تدریج وہ غم اس کے دل و دماغ سے محو ہو جاتا۔ لیکن اسے تو بس یہی فکر تھی کہ اس کی قربانی اکارت نہ ہو جائے۔ اللہ کو خوش کرنے کے بجائے وہ اسے خفا نہ کر بیٹھے۔

سو بستر پر لیٹنے سے پہلے وہ سر اٹھا کر پکارتا...... اے اوپر والے، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے پیدا کیا...... وہ سب کچھ دیا جو میرے پاس ہے۔ مجھے راستہ دکھایا، جس کی وجہ سے میں نے تجھے خوش کرنے کی کوشش کی۔ اب اسے قبول بھی فرما لے اور مجھے ناشکرے پن سے بچائے رکھ۔

اس کے باوجود بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھوں میں کسی نہ کسی مرنے والے کا چہرہ پھر جاتا...... کبھی وہ پتا جی ہوتے تو کبھی ویر جی۔ کبھی وہ مولوی صاحب ہوتے تو کبھی چاچا جی۔ اور وہ گھبرا کر، خوف زدہ ہو کر زور سے سر جھٹکتا۔ مجھے کسی کا دکھ نہیں کرنا ہے۔ وہ خود کو یاد دلاتا۔

ایسے میں کلمہ ہی اس کی ڈھال بن گیا تھا۔ وہ کلمہ پڑھنا شروع کرتا...... پورے دھیان سے...... ارتکاز کے ساتھ۔ مفہوم کے شعور کے ساتھ۔ اور کلمہ پڑھتے پڑھتے وہ سو جاتا۔

لیکن اس رات ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ آواز والی لڑکی کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ الفاظ کے بغیر اس کی آواز اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ لیکن اس کا تصور بے چہرہ تھا۔ اس پردہ دار لڑکی کو اپنے تصور میں چہرہ دینے کی گستاخی وہ نہیں کر سکتا تھا۔

بالآخر اسی کیفیت میں وہ سو گیا۔ رات بھر بغیر خد و خال...... بغیر نین نقش کے وہ خواب میں اسی کو دیکھتا رہا!

❀......❀ ❀

اگلی صبح اوتار سنگھ سو کر اٹھا تو وہ اسی کیفیت میں تھا، جس میں سویا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا

تھا کہ اڑ کر نیچے پہنچ جائے۔ ناشتے تک وہ اپنی اس خواہش کو دبائے بیٹھا رہا۔ مگر ناشتے کے بعد ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی بے چینی، اس کا اضطراب بڑھتا گیا بلکہ وہ ایک ایسی تڑپ میں تبدیل ہو گیا، جو اسے قدم اٹھانے پر اکسا رہی تھی۔

بالآخر اس کے قدم اٹھے اور وہ زینے پر آ گیا۔ اس کی چال میں عجیب سی بے تابی اور مستانہ پن تھا، جو کم از کم اس کے لیے نیا تھا۔ ان لمحوں میں اپنا آپ خود اسے بھی اجنبی لگ رہا تھا۔

مگر زینے پر اترتے اترتے اچانک وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ وہ کیا کر رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور کیوں جا رہا ہے؟ یہ وہ چبھتے ہوئے سوال تھے، جنھوں نے اچانک ہی اس کے قدموں سے تحرک چھین لیا تھا۔

چند لمحے وہ ساکت کھڑا رہا، جیسے وہ سوال اس کی سمجھ میں ہی نہ آئے ہوں۔ پھر اس کے اندر جواب ابھرا...... میں اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔

اندر کی عدالت میں وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں ایک اور سوال کیا۔

"تمھیں یہ حق کس نے دیا؟"

"ماں جی نے۔"

"تو تم ماں جی کے بیٹے کی حیثیت سے ماں جی کی بیٹی کو دیکھنے جا رہے ہو؟"

اس ایک لمحے میں اوتار سنگھ کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا۔ اس کی شرمندگی نے اسے سمجھا دیا کہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں، جتنا نظر آتا ہے۔ اس معاملے میں کوئی بڑی گڑبڑ ہے اور یہ عدالت زینے پر نہیں لگائی جا سکتی۔

وہ پلٹا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اپنے کمرے میں، اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے پہلی بار اس معاملے کو ہر رخ، ہر زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔

اب پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ماں جی کے دل میں اس کے لیے کیسی سچی اور خالص محبت پیدا ہوئی ہے۔ اس کا ثبوت ان کی قربانی تھی۔ جو عورت پردہ کرنے والی ہو، جس نے شوہر کی موت کے بعد گھر کے آبائی ملازم سے بھی پردہ کیا ہو، وہ اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے برسوں کی ریاضت ترک کر دی۔ یہ اتنا بڑا ایثار تھا، جو صرف سچی محبت کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں، اس نے اپنے گھر کے تمام دروازے اس پر کھول دیے۔ اپنی بچیوں کا پردہ بھی اٹھا دیا۔ تو جواب میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے ایک اچھا اور سچا بیٹا بن کر دکھانا ہوگا۔

سوال یہ تھا کہ ماں جی کے رشتے سے ان کی بیٹیاں اس کے لیے کیا ہیں؟ بہن ہی نا! یہ الگ بات کہ ان میں سے ایک کی آواز سن کر وہ پہلے ہی اس کی محبت کا اسیر ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے یہ بات کبھی کسی کو نہیں بتائی تھی...... کسی کو بھی نہیں! اور یہ رازداری اس نے صرف اپنی محبت کو رسوائی

سے بچانے کے لیے، برتی تھی۔ تو کیا اب اسے اس رسوائی کی کوئی پروا نہیں رہی ہے؟

اسے احساس ہوا کہ اب تو اس کی ذمے داری اور بڑھ گئی ہے۔ ماں جی نے اتنے خلوص سے اسے بیٹا کہا ہے تو اسے بھی بیٹا بن کر دکھانا پڑے گا۔ اس لحاظ سے اس کا نیچے جانا تباہ کن ثابت ہوگا۔

یہ وہ موقع تھا کہ اس نے بہت عرصے کے بعد اپنی محبت پر غور کیا۔ اب تک اس کی محبت بے طلب تھی۔ وہ جس سے محبت کرتا تھا، اس کی اس نے صرف آواز سنی تھی اور اسے دیکھنے کی کبھی آرزو بھی نہیں کی تھی۔

لیکن اس وقت اس کے پاس ایسا کوئی موقع بھی نہیں تھا۔ جبکہ اب اسے موقع مل رہا ہے۔ تو اب اسے دیکھنے کی آرزو اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اسے دیکھ بھی لے تو اس کا حاصل کیا ہے؟

یہ تو اسے اب بھی یقین تھا کہ وہ دیکھنے میں کیسی ہی ہو، اسے اس سے کوئی غرض نہیں۔ کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کے لیے نہیں۔ درمیان میں مذہب کی دیوار ہے۔ وہ مسلمان ہے...... اور مسلمان اس معاملے میں بہت پکے ہوتے ہیں۔ یہ بات اسے کالج کی ساتھی نادرہ نے سمجھا دی تھی۔ اس کا ہر انداز بتاتا تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ لیکن دوسری لڑکیوں کے برعکس اس نے کبھی بلا واسطہ اس کا اظہار کسی طرح بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کالج میں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھی۔ یہاں تو معاملہ ایک پردہ دار لڑکی کا تھا، جو گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالتی تھی۔ اور وہ دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا۔ اللہ کا نام لیتا تھا۔ لیکن تھا تو وہ ہندو ہی۔ مسلمان اور ان کے طور طریقے اسے اچھے لگتے تھے لیکن وہ مسلمان تو نہیں تھا۔ ہاں، ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک وہ کائنات کا نظام چلانے والی مہان ہستی کو کھوجتا آیا تھا۔ اس کی جستجو، اس کی تلاش اب بھی جاری تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ لیکن وہ کسی لڑکی کی خاطر دھرم تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ خواہ وہ اس سے کتنی ہی محبت کرتا ہو۔ اس تلاش کے سامنے اس محبت کی حیثیت ثانوی تھی۔

اگر وہ نیچے جاتا ہے، اس لڑکی کو دیکھتا ہے تو اس سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ امکان یہ ہے کہ وہ ماں کے حوالے سے اسے بھائی کا مقام دے گی۔ اور وہ اسے محبت کی نظر سے دیکھے گا۔ محبت میں وارفتگی ہوتی ہے۔ کہیں اس کی نظروں نے بھید کھول دیا تو وہ اس کے سامنے...... اور سب سے بڑھ کر ماں جی کے سامنے کتنا شرمندہ ہوگا۔ کوئی نہیں مانے گا کہ وہ پہلے سے اس سے محبت کرتا ہے۔ ماں جی تو یہی سمجھیں گی کہ اس نے ان کی دی ہوئی رعایت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ ان کی نظروں میں حقیر ہو جائے گا اور اس کی محبت رسوا ہو جائے گی۔ پھر کوئی عورت کسی محروم کو بیٹا نہیں بنائے گی۔

اور اگر بالفرضِ محال اوپر والے نے اس لڑکی کے دل میں بھی اس کی محبت ڈال دی تو......؟

یہ خیال بے حد خوش آئند تھا۔ اس کی دھڑکنوں کی لے بدلنے لگی۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس طرح پیچیدگی اور بڑھ جائے گی۔ اس میں تو ماں جی کے گھر کی بڑے پیمانے پر رسوائی کا خدشہ ہے۔ ان دنوں سیاسی صورتِ حال ویسے ہی خراب تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کے معاملے پر اختلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج بڑھا رہا تھا۔

نہیں...... بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی محبت کو پہلے جیسا ہی رہنے دے۔ کسی کو چاند سے محبت ہو جائے تو وہ اس کی چاندنی میں نہا تو سکتا ہے، ہاتھ بڑھا کر اسے چھو تو نہیں سکتا۔ محبت سے جمالیاتی حس کی نمو ہے۔ بس اتنا کافی ہے۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی نیچے نہیں جائے گا۔ وہ خطرناک رعایتوں سے استفادہ نہیں کرے گا۔

اس نے فیصلہ کر تو لیا۔ لیکن جس بے چینی اور اضطراب سے وہ دوچار ہوا، وہ اس کے لیے نیا بھی تھا اور پریشان کن بھی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپنی بے طلبی کھو بیٹھا ہے اور طلب کے عذاب میں گرفتار ہو گیا ہے۔

وہ کوئی کمزور آدمی نہیں تھا۔ لیکن طلب طاقت ور لوگوں کو بھی کمزور کر دیتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے اس کے اندر اتنی شدت سے نیچے جانے کا خیال مچلتا کہ اس کے قدم خود بہ خود زینے کی طرف اٹھ جاتے۔ زینے پر ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ جبکہ دوسرا اس کے پہلو میں تھا اور نیچے والے گھر میں کھلتا تھا۔ بے اختیار کئی بار وہ اس دروازے تک پہنچ بھی گیا، جو شاید دونوں طرف سے بند رہتا تھا۔ ہر بار وہ خود کو روک کر...... باندھ کر اوپر لے آیا۔

تین دن میں اوتار سنگھ کو تجربہ ہو گیا کہ طلب کتنی طاقت ور ہوتی ہے۔ وہ مولوی محمد حسین آزاد کو پڑھ چکا تھا۔ جانتا تھا کہ طلب کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اور انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ ایک خواہش پوری ہو تو دو نئی خواہشیں سر اٹھاتی ہیں۔ اور دو پوری ہو جائیں تو چار۔ اس معاملے میں گربہ کشتن روزِ اوّل ضروری ہے۔ اگر وہ دل کے پہلے ہی مطالبے کے سامنے سپر ڈال دے گا تو ایک کے بعد ایک مطالبات اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جائیں گے۔ انسان طلب کا عادی ہو جائے تو کسی حال میں مطمئن اور خوش نہیں رہتا۔ آج وہ نیچے جانے کو مچل رہا ہے تو کل اسے دیکھنے کو بے تاب ہوگا۔ پھر اظہارِ محبت کی بے چینی ہوگی۔ اس کے بعد اسے چھونے کی...... اور نجانے یہ سلسلہ کہاں رُکے گا۔

وہ سمندر کی طرح بپھرتی بے چینی اور اضطراب سے لڑتا رہا۔ زینے پر جا کر واپس آتا

رہا۔ لیکن اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ طالب کا گلا گھونٹ کر رہے گا!

❀....❀....❀

سرفراز بیگم چھوٹے ٹھاکر کو بیٹا بنا کر آئیں تو بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ چھوٹے ٹھاکر کے لیے ان کی مامتا ایسے امڈی تھی کہ اتنا پیار انھیں اپنی کسی بیٹی پر بھی نہیں آیا تھا۔ ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ان کی برسوں پرانی بیٹے کی آرزو پوری ہوگئی ہے۔

لیکن اس رات وہ سونے کے لیے لیٹیں تو ان کا دل وسوسوں سے بھر گیا۔ بیٹا پانے کی خوشی میں انھیں احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کتنی بڑی بات کہہ آئی ہیں۔ اسے نبھانا کتنا مشکل ہے، یہ وہ اب سوچ رہی تھیں۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں جو کچھ جانتی تھیں، اس کی روشنی میں سوچ رہی تھیں۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ وصال دین کو وہ بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ لیکن بہن کیا ہوتی ہے، یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ رنجنا بتاتی تھی کہ وہ کبھی لڑکیوں میں نہیں رہا۔ اس کا بہن خانہ خالی ہی رہا تھا۔ ماں سے بھی وہ کم عمری ہی میں محروم ہوگیا تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ اسے لڑکیوں کا کوئی تجربہ نہیں۔ وہ ایک ایسے کالج میں پڑھتا تھا، جہاں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ دوسرے انھوں نے تھوڑی دیر میں یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس کی تربیت بہت اچھی ہوئی ہے۔ وہ بہت شائستہ مزاج اور خوش اطوار لڑکا تھا۔

مگر وہ اس کا کیا کرتیں کہ آگ اور تیل کی قربت کو ہمیشہ منع کیا گیا ہے۔ اور انھوں نے آگ اور تیل کو قریب کرنے کا سامان کر دیا تھا۔ اب بہرحال وہ کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ واپس نہیں آسکتا تھا۔ انھوں نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ اسے بیٹا بنانے کے بعد انھیں یہی کہنا تھا۔ ان کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بیٹا ہوگا تو گھر میں آئے گا بھی۔ ان کی نیت اچھی ہے تو انشاء اللہ نقصان بھی نہیں ہوگا۔

اگلی صبح انھوں نے اس سلسلے میں بچیوں سے بات کی۔ یہ بھی ضروری تھا کہ انھیں پہلے سے اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا جائے۔

انھوں نے تینوں بچیوں کو سامنے بٹھا کر کہا۔ ''میں نے چھوٹے ٹھاکر کو بیٹا بنا لیا ہے۔ اب وہ ہمارے گھر کا ایک فرد ہے۔ اس رشتے سے وہ تمہارا بھائی ہوا۔'' ''اللہ، کتنا اچھا لگے گا اماں۔ مجھے تو ہمیشہ یہ سوچ کر افسوس ہوتا تھا کہ اللہ نے ہمیں بھائی نہیں دیا۔'' گلنار نے چہک کر کہا۔ وہ اس خبر سے کھل اٹھی تھی۔ ''وہ گھر میں آئے گا تو تم لوگ اس سے پردہ نہیں کرو گی۔'' سرفراز بیگم نے مزید کہا۔ اب وہ غور سے لڑکیوں کے چہرے دیکھ رہی تھیں۔ گلنار تو خوش نظر آرہی تھی۔ حور بانو کی آنکھوں میں ایک پل کو ایک تاثر سا چمکا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ بے تاثر ہوگئیں۔ اس تاثر کو سرفراز بیگم نے دیکھا تو لیکن سمجھ نہیں سکیں۔ بہرحال یہ طے تھا کہ اس کا ردِعمل منفی نہیں تھا۔

لیکن نور بانو کی طرف دیکھ کر انھیں تشویش ہونے لگی۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کا تاثر بالکل واضح تھا۔ ''کیا بات ہے نور بانو۔ تم اتنی چپ کیوں ہو؟'' انھوں نے اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں اماں۔''

''تمھیں کوئی اعتراض ہے؟''

''آپ ماں ہیں۔ آپ کے فیصلے پر ہم اعتراض کیسے کرسکتے ہیں۔''

اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اسے اعتراض ہے۔ سرفراز بیگم عقل مند خاتون تھیں۔ جانتی تھیں کہ اعتراض کا دبا رہنا اچھا نہیں۔ اس کا اظہار ہونا چاہیے۔ اظہار معاملات کی سنگینی کو کم کر دیتا ہے۔ ''نہیں نور بانو، ایسا نہیں۔ تمھیں اعتراض کا حق ہے۔ تم کھل کر اعتراض کرسکتی ہو۔ کہو، کیا بات ہے؟''

نور بانو اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ ''اماں..... یہ گستاخی ہوگی۔''

''میں اجازت دے رہی ہوں۔''

''اماں..... میں سمجھتی ہوں کہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔'' نور بانو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''یہ بات تم کیوں کہہ رہی ہو؟'' سرفراز بیگم نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ان رشتوں کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہوتی جو انسان خود بنا لیتا ہے۔'' نور بانو بولی۔ ''کسی کو بیٹا بنا لیا جائے تو وہ حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا۔ اسے وہ حقوق حاصل نہیں ہوسکتے، جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ نہ بیٹا بنانے والے پر اس کے تمام فرائض واجب ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک جذباتی معاملہ ہے۔''

سرفراز بیگم سمجھ گئیں کہ وہ سورۂ احزاب کے حوالے سے بات کر رہی ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ بولے بیٹے زید بن حارث کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنایا ہے۔ اب وہ اس سے اختلاف نہیں کرسکتی تھیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد انھوں نے کہا۔ ''لیکن بیٹا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یتیموں پر خاص طور پر شفقت فرماتے تھے اور یہ اللہ کا حکم بھی ہے۔''

''اماں، ہر معاملے میں اعتدال کا حکم بھی تو دیا گیا ہے۔ آپ چھوٹے ٹھاکر پر بے شک شفقت کریں۔ لیکن آپ کے بیٹا کہہ دینے سے وہ آپ کا بیٹا اور ہمارا بھائی نہیں بن جائے گا۔ ہمارے لیے اس کے سامنے آنا جائز نہیں۔''

''تم اماں سے بحث کر رہی ہو۔'' حور بانو نے اسے ٹوکا۔ ''ماں کی نافرمانی کو بھی تو منع کیا ہے اللہ نے۔''

''اماں نے مجھے اجازت دی ہے۔ بلکہ اصرار کیا ہے۔'' نور بانو نے کہا۔ ''اور والدین کا حکم اگر اللہ کے حکم سے متصادم ہو تو والدین کی نافرمانی بری بات نہیں۔ اللہ کے حکم کے سامنے تو

کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔"

"تم بدتمیزی کر رہی ہو۔" حور بانو نے سخت لہجے میں کہا۔ "ایک شخص پر جو کم عمر بھی ہے، اتنا بڑا سانحہ گزرا ہے کہ اس کا سب کچھ لٹ گیا۔ دکھ سے اس کا کیا حال ہوگا۔ ایسے میں اسے ہمدردی کی ضرورت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب ہمارے سوا اس کا کوئی نہیں۔ وہ کرائے دار کی حیثیت میں سہی، ہمارے ہی گھر میں رہتا ہے۔ ہم اس کے نزدیک ترین پڑوسی ہیں۔ اس کی دل جوئی ہماری انسانی ذمے داری ہے۔ اللہ اس سے منع نہیں فرماتا۔"

"میں اس کی دل جوئی کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن مجھے اس رشتے سے اختلاف ہے۔ ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ کسی کافر اور مشرک سے رشتہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ میں پردہ ختم کرنے کے خلاف ہوں۔" نور بانو کے لہجے میں قطعیت تھی۔

حور بانو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ کافر اور مشرک کے حوالے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ نور بانو نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ چھوٹے ٹھاکر کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد وہ خود بھی تو اسی پہلو سے سوچتی رہی تھی۔ لیکن جب اسے پتا چلا کہ وہ عربی پڑھتا ہے اور اپنے استاد سے قرآن سنتا تو اس کے دل نے کہا تھا کہ وہ مشرک نہیں ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ اسلام بھی قبول کر لے اور اس کے قرآن سننے کی گواہ تو خود نور بانو تھی۔

چنانچہ اس نے تڑپ کر کہا۔ "تم تو ایسے بات کر رہی ہو، جیسے وہ انسان ہی نہیں ہے اور ذرا یہ تو بتاؤ، وہ کیسا کافر اور مشرک ہے جو قرآن کی تلاوت سنتا ہے اور عربی پڑھتا ہے۔"

یہ سن کر سرفراز بیگم چونکیں اور انھوں نے غور سے حور بانو کو دیکھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"نور بانو سے پوچھ لیں۔"

سرفراز بیگم نور بانو کی طرف مڑیں۔ ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی نور بانو نے کہا۔ "یہ سچ ہے۔ لیکن اماں، آپ ہی بتائیں، کیا اس بات سے اس کے کفر اور شرک میں کوئی فرق پڑتا ہے۔"

"فرق کیوں نہیں پڑتا۔" حور بانو بولی۔ "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہے۔"

سرفراز بیگم اس اطلاع سے اچنبھے میں بھی تھیں اور خوش بھی ہوئی تھیں۔ مگر وہ جانتی تھیں کہ نور بانو کا موقف درست ہے۔ دین کے خلاف جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور انھیں نور بانو پر فخر ہو رہا تھا۔ پڑھائی رائیگاں نہیں تھی۔ اس نے بچیوں میں دین کی سمجھ پیدا کی تھی۔ بلکہ عملی زندگی میں اس کی افادیت بھی ثابت کر دی تھی۔

چند لمحے سوچنے کے بعد انھوں نے کہا۔ "مجھے احساس ہو گیا ہے کہ جذباتیت میں میں حد سے گزر گئی تھی۔ اب بات میرے منہ سے نکل چکی ہے اور میں نے چھوٹے ٹھاکر سے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے رسماً یہ بات نہیں کہی ہے۔ لیکن میں تم لوگوں کو مجبور نہیں کروں گی۔ چھوٹے ٹھاکر کو

میں سمجھا کہ معذرت کر لوں گی۔"

"میں آپ کی بات رکھوں گی اماں۔" حور بانو نے کہا۔

"اور میں تو انھیں بھائی ہی سمجھوں گی۔" گلنار بولی۔

نور بانو خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا۔

❁ .... ❁ .... ❁

ان کی سوچیں مختلف تھیں، محرکات جدا تھے۔ لیکن مشترک بات یہ تھی کہ وہ سب حالت انتظار میں تھے۔ انھیں اپنے گھر میں چھوٹے ٹھاکر کی آمد کا انتظار تھا۔

سرفراز بیگم ڈر رہی تھیں۔ ان کا ڈر دودھاری تلوار کی طرح تھا۔ انھیں احساس تھا کہ انھوں نے گھر کی عزت کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ انھیں انگلیاں اٹھنے کا خوف بھی تھا اور یہ ڈر بھی تھا کہ انھیں چھوٹے ٹھاکر کے سامنے شرمندگی ہوگی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ نور بانو اس کے سامنے ہرگز نہیں آئے گی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کی آمد کی منتظر تھیں۔ ان کی کیفیت ایسی تھی، جیسے برسوں کے بعد ان کا بچھڑا ہوا بیٹا گھر آ رہا ہو۔

حور بانو کے لیے وہ بے حد ہیجانی خوشی میں لپٹا ہوا انتظار تھا۔ لیکن اسے اپنا ہیجان چھپائے رکھنا تھا۔ کیونکہ اس کے دل میں چور تھا۔ اس کے لیے یہ تصور ہی بے حد سنسنی خیز تھا کہ چھوٹا ٹھاکر نیچے آئے گا...... گھر کے فرد کی طرح۔ وہ اسے دیکھ سکے گی۔ اس کی باتیں سن سکے گی۔ اس سے باتیں کر سکے گی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے حجاب آئے گا۔ وہ اس کے سامنے شاید چند لمحوں سے زیادہ نہیں بیٹھ سکے گی اور شاید اس کے روبرو اس کی زبان بھی نہ کھلے۔ بہرحال وہ دور سے سہی، چپکے چپکے اسے دیکھتی تو رہے گی، اس کی باتیں سنتی تو رہے گی۔ اس کے لیے یہ چھوٹی سی معصوم سی خوشی بھی بہت بڑی تھی۔ اس سے آگے، اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے، یہ اسے معلوم ہی نہیں تھا۔

خوشی گلنار کو بھی اتنی ہی تھی۔ مگر اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اسے چھپائے۔ وہ کھل کر اس کا اظہار کر رہی تھی۔ بھائی اس کے لیے ایسی نعمت تھا، جس کی اسے بچپن سے آرزو تھی۔ لیکن پھر اس نے اس پر صبر کر لیا تھا۔ یہ تسلیم کر لیا تھا کہ یہ نعمت اس کے نصیب میں ہے ہی نہیں۔ اب اسے بیٹھے بٹھائے ایک بھائی مل رہا تھا تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ تو ہر لمحے اس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ گھر میں وہ واحد ہستی تھی، جسے چھوٹے ٹھاکر کی آمد کے تصور سے کوئی خوف نہیں تھا۔ صرف خوشی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ خود اوپر جاتی اور چھوٹے ٹھاکر کا ہاتھ تھام کر کہتی...... ٹھاکر بھیا، آؤ میرے ساتھ گھر چلو۔

اور نور بانو تھی، جسے ماں پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اماں نے اتنی بڑی بات کہہ کیسے دی۔ اب وہ چھوٹا ٹھاکر نیچے آئے گا...... اور وہ اس کے سامنے نہیں آئے گی، تو اماں کی بات جائے گی۔ انھیں شرمندگی ہوگی اور وہ ٹھاکر اس کے بارے میں کیا سوچے گا...... یہ کہ وہ کتنی

نافرمان ہے۔ماں کی بات نہیں مانتی۔لیکن اللہ کے حکم کے سامنے وہ کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتی تھی ...... کسی کا لحاظ نہیں کرسکتی تھی۔اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

اس روز ان سب کا عجیب حال تھا۔ان کے کان زینے کے بغلی دروازے پر لگے تھے۔

شام کے وقت اس دروازے پر دستک ہوئی۔ سب کے دل دھڑک اٹھے۔ چھمن بوا دروازہ کھولنے چلی گئیں۔

مگر آنے والی رنجنا تھی!

رنجنا نے کچھ دیر ان لوگوں سے باتیں کیں۔ پھر وہ چلی گئی۔

رات ہوگئی۔سرفراز بیگم کی اعصابی کشیدگی کا یہ حال تھا کہ اس روز انھیں چھوٹے ٹھاکر کے لیے آلو پالک میتھی کی بھجیا بنوانے کا خیال بھی نہیں آیا،جس کے بارے میں وہ جانتی تھیں کہ وہ بہت شوق سے کھاتا ہے۔

اگلا دن پچھلے دن سے زیادہ سخت تھا۔گھر کی فضا کشیدہ تھی۔نور بانو نے خود کو بہنوں سے الگ تھلگ کرلیا تھا۔زیادہ بات تو وہ ویسے بھی نہیں کرتی تھی۔لیکن اس روز تو وہ ماں سے بھی ہم کلام نہیں ہوئی۔انھوں نے کچھ پوچھا تو اس نے جواب دے دیا۔اس کی ناراضی ایک کھلی ہوئی بات تھی۔

ویسے اس روز انھیں یقین تھا کہ چھوٹا ٹھاکر نیچے ضرور آئے گا۔لیکن اس روز تو دروازے پر کوئی دستک ہی نہیں ہوئی۔

شام کو گلنار سرفراز بیگم کے پاس آبیٹھی۔''اماں..... ٹھاکر بھیا آئے کیوں نہیں؟''

سرفراز بیگم کو اس پر پیار آگیا۔ان کے جوڑے ہوئے اس رشتے کے حوالے سے وہ بھائی کے لیے کیسے تڑپ رہی تھی۔''اب مجھے کیا پتا بیٹا۔وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔''

''کہیں انھوں نے ہماری بحث تو نہیں سن لی اماں؟''

سرفراز بیگم نے اسے بہت غور سے دیکھا۔تینوں بہنوں کے درمیان ڈیڑھ ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔یعنی وہ حور بانو سے تین سال اور نور بانو سے ڈیڑھ سال چھوٹی تھی۔مگر کہتے ہیں نا کہ گھر کا سب سے چھوٹا بچہ ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔تو وہ اتنی بڑی ہوکر بھی چھوٹی سی بچی ہی تھی۔''اے ہے گلنار، کیا بولا گئی ہو۔ نیچے کمرے میں ہونے والی بات اوپر والے کیسے سن سکتے ہیں۔''انھوں نے کہا۔

''تو پھر وہ کیوں نہیں آئے اماں؟''

''اب یہ تو مجھے نہیں معلوم۔''

''تو آپ خود انھیں بلالیں نا۔''

''نہیں بیٹا۔ مجھے اس سے جو کہنا تھا، وہ میں کہہ چکی۔اور اس پر شرمندہ بھی ہوں۔اب

غلطی نہیں کروں گی۔''

''آپی بہت خراب ہیں اماں۔'' گلنار کے لہجے میں سختی تھی۔

''ایسا مت کہو گلنار۔حور بانو نے جو کہا، وہ بالکل درست تھا۔''

تیسرے دن دوپہر کے وقت اچانک سرفراز بیگم کی شرمندگی اور ہر خوف مٹ گیا۔ مامتا کے سوا کچھ نہیں رہا۔دو دن ہوگئے۔ میں نے بچے کی خبر تک نہیں لی۔انھوں نے سوچا اور چھوٹے ٹھاکر سے ملنے کو بے تاب ہوگئیں۔

''میں ذرا اوپر جارہی ہوں۔''انھوں نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ خود پر جبر کیے بیٹھا تھا۔اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ بلانے پر بھی نیچے نہیں جائے گا۔ اس کے لیے دھیان بٹانا کچھ مشکل بھی نہیں تھا۔ایک ایسا مسئلہ تھا، جس پر وہ اکثر سوچتا رہتا تھا۔

جے پور میں جو کچھ ہوا تھا، وہ اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔اخبار میں ٹھاکروں کی گڑھی کی لال آندھی میں تباہی کی خبر تو چھپی تھی۔لیکن جے پور والوں کے حملے کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ البتہ اس نے اپنے گاؤں میں حویلی کے سامنے اور حویلی کے احاطے میں ان حملہ آوروں کی لاشیں دیکھی تھیں۔اس کا اندازہ تھا کہ ان کی تعداد سو سے اوپر ہی ہوگی۔اسے حیرت تھی کہ کسی شہر کے اتنے آدمی کہیں مارے جائیں اور ہلچل بھی نہ مچے، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بہر حال اس نے مناسب یہی سمجھا تھا کہ کسی سے ان واقعات کا تذکرہ نہ کرے۔

اب کچھ ہی دنوں میں امتحان کا رزلٹ آنے والا تھا۔اس کے بعد کالج کا سلسلہ پھر شروع ہوجاتا۔کالج جانے پر اس کی ملاقات ارجن سے ہونی تھی۔وہ اس وقفہ سے ڈر بھی رہا تھا اور اس کا سامنا بھی کرنا چاہتا تھا۔ارجن سے ملاقات پر سب کچھ واضح ہوجاتا۔

اس وقت بھی وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ نیچے سے بڑی بیگم آگئیں۔انھوں نے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی۔

''ماں جی، کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں چھوٹے ٹھاکر۔اللہ کا شکر ہے۔''

اوتار سنگھ کو ان کا جواب بہت اچھا لگا۔لیکن چھوٹے ٹھاکر کہہ کر پکارا جانا اچھا نہیں لگا۔

''آپ مجھے بیٹا کہتی ہیں ماں جی اور چھوٹے ٹھاکر کہہ کر پکارتی ہیں۔''اس نے بڑے ادب سے اعتراض کیا۔''مجھے اچھا نہیں لگتا ماں جی۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے خیال نہیں کیا اور تمھیں یہ تکلیف پہنچی۔اب ایسا نہیں ہوگا۔''سرفراز بیگم نے کہا۔''اچھا، یہ بتاؤ، تمھاری ماں تمھیں کیسے پکارتی تھی؟''

''ماتا جی!''اوتار سنگھ نے کہا اور چند لمحوں کے لیے ماتا جی کی یاد میں کھو گیا۔ بہت

عرصے کے بعد اس نے انھیں اس طرح یاد کیا تھا۔ ان کی صورت اس کی نگاہوں میں پھر گئی۔ ''ماتا جی مجھے پتر کہہ کر بلاتی تھیں۔ کبھی میرے چھوٹے ٹھاکر بھی کہتی تھیں۔''

''تب تو تمھیں میرا چھوٹے ٹھاکر کہنا برا نہیں لگنا چاہیے تھا۔''

''دیکھیں ناماں جی، ایک فرق ہے۔ ماتا جی کی زبان، ان کی بولی اور تھی۔ وہ تو پتا جی کو بھی ٹھاکر جی کہہ کر پکارتی تھیں۔''

''میں سمجھ گئی۔ میں تمھیں چھوٹے ٹھاکر کہوں تو تمھیں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔''

''جی ماں جی، یہی بات ہے۔''

''اچھا۔ مجھے بتاؤ تو تمہاری ماتا جی کیسی تھیں؟''

''لفظ ماں تو اچھائی کی، بڑائی کی، محبت کی ضمانت ہے ماں جی۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

سرفراز بیگم اس کے جواب کی گہرائی سے حیران ہوگئیں۔ انھیں احساس ہوگیا کہ وہ بہت حساس، ذہین اور سوچنے والا لڑکا ہے۔

''ماتا جی مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ میں ان کے لیے بھگوان کا سب سے بڑا تحفہ ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ کس طرح منتوں مرادوں کا بیٹا تھا۔ ماتا جی کے بیاہ کے برسوں بعد اس وقت پیدا ہوا تھا، جب ماتا جی اولاد کی طرف سے مایوس ہو بیٹھی تھیں۔ وہ خوب باتیں کرتا رہا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ ماتا جی کے متعلق بات کرنے کو ترسا ہوا تھا۔ کبھی کسی نے اس موضوع پر بات ہی نہیں کی تھی کہ ایسا موقع ملتا۔ اب موقع ملا تھا تو اسے ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ ''ماتا جی میرے لیے اپنے ہاتھ سے کھانا بناتی تھیں۔ میرا ہر کام خود کرتی تھیں۔ کسی کو نہیں کرنے دیتی تھیں۔''

''تمھیں تو ان کے انتقال کا بہت دکھ ہوا ہوگا؟''

''بہت زیادہ ماں جی، بہت زیادہ۔ پہلے تو لگا کہ میں بھی مر جاؤں گا۔ پھر جیسے آہستہ آہستہ زخم ٹھیک ہوتا جاتا ہے، میں انھیں بھولنے لگا۔ مجھے اس پر افسوس ہوا کہ میں اتنی اچھی ماتا جی کو اتنی آسانی سے بھول گیا......''

''اللہ آدمی کو صبر دیتا ہے بیٹے۔ ورنہ آدمی کسی محبت کرنے والے کو کھو کر مر جائے۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔

''تبھی تو پہلی بار میری سمجھ میں یہ بات آئی تھی۔'' اوتار سنگھ بولا۔

''کون سی بات؟'' سرفراز بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ اوپر والا اپنی مخلوق سے بہت محبت کرتا ہے۔ آدمی کو زخم لگتا ہے تو زخم پر مرہم وہی رکھتا ہے۔''

سرفراز بیگم کی حیرت اور بڑھ گئی۔ ''تمہاری ماتا جی کا انتقال کب ہوا تھا؟'' انھوں نے پوچھا۔

''پانچ سال ہو چکے ہیں۔''

''اتنے عرصے سے تم ماں سے محروم ہو۔'' سرفراز بیگم نے تاسف سے کہا۔

''نہیں ماں جی۔ میں اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''میں پیدا ہوا تو میری ایک ماں تھی۔ لیکن تین دن بعد مجھے دوسری ماں بھی مل گئی۔''

''دوسری ماں! وہ کیسے؟''

''میرے ویرجی تھے نا، ان کی ماں میری دوسری ماں تھیں...... تھیں نہیں، ہیں۔''

''ویرجی تم وصال دین کو ہی کہتے تھے نا؟''

''جی ماں جی۔ وہ سچ مچ میرے بھائی تھے۔'' اوتار سنگھ وصال دین کے تذکرے پر اداس ہوگیا۔

''تو وہ تو مسلمان تھا۔'' سرفراز بیگم کے لہجے میں شاک تھا۔ ''تو کیا تمھارے پتا جی نے......''

ایک ثانیے میں اوتار سنگھ کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کیا سمجھ رہی ہیں۔ اسے افسوس ہوا، اس نے بات ہی ایسے پیرائے میں کہی تھی۔ ''نہیں ماں جی...... ایسا سوچیے گا بھی نہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''ماں جی، سچی محبت کا رشتہ اوپر والا بناتا ہے۔ وہ دلوں میں محبت ڈالتا ہے۔ ایسے رشتے نہ کبھی ٹوٹتے ہیں، نہ خراب ہوتے ہیں۔ پتا جی نے مجھے بتایا تھا کہ میری زبان سے جو پہلا لفظ ادا ہوا، وہ اماں تھا۔ اماں کہہ کر ہی میں نے بولنا سیکھا تھا۔''

''حیرت کی بات ہے۔'' سرفراز بیگم کے لہجے میں بھی بے پناہ حیرت تھی۔

اوتار سنگھ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ ایک پل میں اس نے سمجھ لیا کہ ماں جی کیا سوچ رہی ہیں اور جو کچھ بھی سوچ رہی تھیں، وہ غیر فطری نہیں تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ اس کے پتا جی بڑے زمین دار تھے...... گاؤں کے مالک۔ اور جاگیر دار کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تو گویا انھوں نے...... اماں...... اس سے آگے اس سے سوچا بھی نہیں گیا۔ اس کے مرے ہوئے باپ کی کردار کشی ہو رہی تھی۔ یہی نہیں، اماں کی پاک دامنی پر حرف آرہا تھا۔ اسے یہ سب نہیں ہونے دینا تھا۔ روکنا تھا۔

پچھلی بار گرمیوں کی چھٹیوں میں پتا جی نے اسے ایک راز کی بات بتائی تھی اور کہا تھا کہ وہ کبھی یہ بات کسی سے نہ کہے۔ ''میں تمھیں صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم بے خبر نہ رہو۔ بے خبری میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھو۔ حمیدہ بہن تمہاری ماتا جی کی طرح ہے......''

لیکن اب اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ اسے وہ بات ماتا جی کو بتانا پڑے گی۔ ''ماں جی، میں

آپ کو ایک راز کی بات بتا رہا ہوں۔ کسی سے کہیے گا نہیں۔''
سرفراز بیگم سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ جیسے خود کو کسی بڑے دھماکے کے لیے تیار کر رہی ہوں۔
اوتار سنگھ نے جو کچھ پتاجی سے سنا تھا، وہ انھیں بتا دیا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے سنتی رہیں۔

سب کچھ سننے کے بعد چند لمحے تو وہ سناٹے کی سی کیفیت میں بیٹھی رہیں۔ پھر انھوں نے کہا۔ ''کیسی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین بات ہے۔ میں نے سنا ہے کہ راجپوت اپنے خون میں ملاوٹ کسی طرح گوارا نہیں کرتے۔''

''بالکل ٹھیک ہے ماں جی۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں لے رہا تھا اور رو رو کر الگ توانائی ختم کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے اور اب میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تو میں مر جاؤں گا۔ اور میں شاید بیس برس کی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا بچہ تھا۔ پتاجی کو ہار ماننا پڑی۔'' اوتار سنگھ نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولا۔ ''اس بات کا علم میرے ماتا پتا اور ویر جی کے ماں باپ کے سوا کسی کو نہیں تھا اور پتاجی نے اس کے بعد اماں، چاچا جی اور ویر جی کو اتنی عزت دی کہ اپنے کسی رشتے دار کو بھی نہیں دی تھی۔ اماں کو وہ حمیدہ بہن کہتے تھے اور اس عزت کی خاطر ہی انھوں نے یہ راز مجھے بتایا۔ انھوں نے کہا تھا، حمیدہ بہن تمھاری ماں ہے۔ اسے ماتا سمان سمجھنا۔ کبھی گستاخی نہ کرنا۔''

سرفراز بیگم نے جو کچھ سنا تھا، اسے ہضم کرنے، ترتیب دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چند لمحے بعد انھوں نے کہا۔ ''تمھارے پتاجی بلاشبہ بڑے آدمی تھے۔ احسان ماننا بڑی بات ہے۔ اللہ کو بہت پسند ہے۔''

اوتار سنگھ نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے ایک غلط تاثر زائل کر دیا تھا۔
''تو اب تم دوسری ماں سے بھی محروم ہو گئے۔'' سرفراز بیگم نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔
''لیکن اللہ نے تمھیں ایک اور ماں دے دی۔''
''نہیں ماں جی، اماں زندہ ہیں۔ اماں مجھے چھوڑ کر نہیں گئیں۔'' اوتار سنگھ نے تڑپ کر کہا۔ ''اب بھی میری دو مائیں ہیں۔''

سرفراز بیگم نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''پورا گاؤں ختم ہو گیا۔ آس پاس کا کوئی گاؤں نہیں بچا۔ پھر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو۔''

''مجھے معلوم ہے ماں جی۔ میں ان سے......'' اوتار سنگھ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے بروقت احساس ہو گیا کہ وہ ایک اور راز فاش کرنے جا رہا تھا۔ ''میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ ان کی موجودگی محسوس کر سکتا ہوں۔'' اس نے جلدی سے بات بدل دی۔ پھر اس نے وہ سچی بات کہہ دی، جو وہ کہہ سکتا تھا۔ ''اور اماں جب آخری بار مجھ سے ملی تھیں تو انھوں نے مجھ سے انشاء اللہ کہہ کر

وعدہ کیا تھا کہ میں تعلیم مکمل کر کے واپس آؤں گا تو وہ مجھے ملیں گی۔ وہ اللہ پر بہت بھروسہ کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ ان کے وعدے کی شرم رکھے گا۔''

سرفراز بیگم نے ہمدردانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ وہ اپنی اماں سے بے حد محبت کرتا ہے...... غیر معمولی محبت! اس کے پتاجی بھی اس گاؤں میں تھے اور اماں بھی۔ اس نے باپ کی موت کو تو تسلیم کر لیا۔ لیکن اماں کی موت کو تسلیم نہیں کرتا۔ حالانکہ دونوں کے امکانات ایک جیسے تھے۔ خیر...... ان کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اس کی یہ امید توڑ دیں۔ انھوں نے آہستہ سے کہا۔ ''جو اللہ کرے گا، اسی میں تمھاری بہتری ہوگی بیٹے۔''
''جی ماں جی۔ مجھے بھی اس بات کا یقین ہے۔''

❁......❁......❁

سرفراز بیگم اس بار نیچے آئیں تو سوچنے کا بہت سامان لے کر آئی تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اوتار سنگھ ان کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ انھوں نے بچیوں سے تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن جب بھی وہ فرصت میں ہوتیں، اسی کے بارے میں سوچنے لگتیں۔

کیسی ناقابلِ یقین کہانی تھی...... پریوں کی کہانی! برسوں کی دعاؤں، منتوں اور مرادوں کے بعد ایک راجپوت جاگیردار کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ماں کے دسترخوان پر دودھ کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن وہ ماں کا دودھ قبول نہیں کرتا۔ پھر وہ بے زبان بچہ دودھ مانگتا ہے تو ایک مسلمان عورت کا۔ اور ہندوؤں کے اس گاؤں میں وہ واحد مسلمان گھرانہ ہے۔ راجپوتوں کی آن یہ گوارا نہیں کرتی کہ بچہ ان کا ہو اور اسے دودھ کوئی اور پلائے۔ چلو وہ کسی عام ہندو عورت کا دودھ طلب کرتا تو بھی ماننے والی بات تھی۔ لیکن وہ تو ایک مسلمان عورت کا دودھ مانگ رہا ہے۔ مسلمان، جسے عام ہندو بھی ملیچھ کہتے ہیں۔ راجپوت یہ کیسے گوارا کرے۔

لیکن وہ بچہ بھی تو راجپوت ہے۔ ننھا سا بچہ اور ایسی ضد کہ زبردستی بھی اس کے منہ میں کچھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ وہ رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا ہے، سست روی سے موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تین دن ہو گئے ہیں اور اس کے منہ میں کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی۔ اس ماں پر کیا گزر رہی ہوگی، جو بیس برس سے بچے کو ترس رہی تھی۔ اب اس کی آرزو پوری ہوئی ہے۔ اس کے پاس بچہ بھی ہے اور دودھ بھی۔ لیکن بچہ اس کا دودھ قبول نہیں کر رہا ہے۔ یہ کیسی توہین ہے مامتا کی کہ دودھ میں کوئی خرابی نہیں۔ لیکن بچہ کسی اور کا دودھ مانگ رہا ہے...... وہ بھی ایک مسلمان عورت کا۔

آخر مامتا جیت جاتی ہے۔ ماں کو اپنا بچہ چاہیے۔ چاہے وہ کسی کا دودھ پیے۔ چاہے وہ اس کی مامتا کی توہین کرے۔ بس وہ زندہ رہے۔ چاہے وہ اسے ماں بھی نہ کہے۔ یہ حوصلہ اور یہ ظرف اللہ نے صرف ماں کو دیا ہے۔

ماں بچے کی زندگی بچانے کے لیے اپنی مامتا میں شراکت برداشت کر لیتی ہے۔ اس کا

بچہ چاہے اس کا نہ رہے، لیکن زندہ رہے۔ لیکن راجپوت باپ مزاحمت کرتا ہے۔ مگر کب تک۔ بچے کی زندگی اور موت کا سوال سامنے ہو تو وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

راجپوت اپنی جان دے سکتا ہے، آن نہیں گنوا سکتا۔ چنانچہ بچے کی ضد پوری کی گئی ..... لیکن رازداری کے ساتھ۔ دونوں فریقوں کے سوا کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔ اسے اور اس کے بچے کو کوئی طعنہ نہ سننا پڑے۔

وہ پریوں کی کہانی لگتی تھی۔ لیکن سرفراز بیگم جانتی تھیں کہ وہ حقیقت ہے اور اس کی مدد سے وہ بہت کچھ سمجھ رہی تھیں۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ چھوٹے ٹھاکر کا باپ بڑا انسان تھا۔ ویسے تو اسے رنجنا بھی بتاتی رہی تھی کہ بڑے ٹھاکر میں جاگیرداروں والی کوئی بات نہیں تھی۔ نہ وہ رعونت اور غرور نہ وہ جاگیرداروں والے شوق۔ لیکن اب جو بات سامنے آئی تھی، وہ بڑے لوگوں والی تھی۔ وہ یقیناً بہت اچھا انسان تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنا مطلب پورا کرانے کے بعد اس پورے گھرانے کو قتل کرا دیتا..... اپنا راز رکھنے کے لیے۔ لیکن نہیں۔ اس نے یہ سمجھا کہ دودھ پلوانا اس کی مجبوری ہے اور دودھ پلانے والی کا اس پر اور بچے پر احسان ہے۔ اس کے صلے میں اس نے عزت دی۔ بلکہ اسے دودھ پلانے والی کی عزت کا اتنا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے اس نے اپنے بیٹے کو بھی اس راز سے آگاہ کر دیا اور اس عورت کی ماں جیسی عزت کرنے کی تلقین بھی کی۔

اور یہ چھوٹا ٹھاکر اسی باپ کا بیٹا تھا!

پھر سرفراز بیگم نے ایک اور زاویے سے سوچا۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن ایک نوزائیدہ بچے کا اس طرح کی ضد کرنا ایک بہت غیر معمولی بات ہے۔ اور یہی نہیں، اس بچے نے وہ ضد پوری بھی کرائی۔ اب نور بانو کے کہنے کے مطابق وہ عربی پڑھتا ہے، قرآن سنتا ہے تو اس میں حیرت کی بات نہیں۔ جس بچے نے مسلمان عورت کا دودھ پیا ہو، اٹھارہ سال اس عورت سے ماں جیسی محبت کی ہو، وہ ایسا کر سکتا ہے۔ کہتے ہیں، دودھ کی بڑی اہمیت ہے۔ شخصیت کی تعمیر دودھ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ عربوں میں تو اس بات کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

ان کے دل میں چھوٹے ٹھاکر کی محبت اور بڑھ گئی۔ ان کا جی چاہا کہ نور بانو سے سختی سے کہیں کہ اسے آئندہ کبھی مشرک نہ کہے کیونکہ ان کا دل کہتا ہے کہ ایک دن وہ اللہ پر ایمان لائے گا۔ لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھیں۔ یہ دودھ والی دلیل کوئی سند نہیں تھی۔

❀.....❀.....❀

حور بانو کی ان دنوں عجیب کیفیت تھی۔ وہ ہر وقت غصے اور جھنجلاہٹ کا شکار رہتی۔ بلکہ اسے چڑچڑاپن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کوئی بہت محبوب شے ملتے ملتے دور ہو جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ آدمی اس پر اپنا ردِعمل بھی ظاہر نہ کر پائے۔

اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب چھوٹا ٹھاکر نیچے آیا کرے گا۔ اس یقین نے اسے تصور کی

دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ وہ سوچتی رہی تھی کہ وہ نیچے آئے گا تو وہ کیا کیا کرے گی۔ وہ شرم و حیا والی باپردہ لڑکی تھی۔ اس کے دل میں معصوم سی خواہشیں تھیں۔ وہ اماں کی طرح بیٹھ کر اس سے بات تو نہیں کر سکتی تھی۔ دل چاہنے کے باوجود بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی چھوٹے ٹھاکر کا اپنے گھر کی طرح نیچے آنا جانا اس کے لیے ایک ایسی نعمت تھا، جسے مانگنے کا اس نے تصور تک نہیں کیا تھا اور وہ نعمت اسے بن مانگے مل رہی تھی۔

جس روز اماں نے انھیں یہ بات بتائی اور اس سے پردہ نہ کرنے کو کہا، وہ پورے دن تصور میں کھوئی رہی کہ وہ کیا کیا کرے گی۔ مگر ابتدا ہی میں اسے کئی بہت عجیب جھٹکے لگے۔ ایسی دشواریاں سامنے آئیں، جن کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

چھوٹا ٹھاکر اماں کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے اس کے پاس جاتی ہے۔ ''السلام وعلیکم......''

اسے پہلا جھٹکا لگا۔ ارے..... وہ تو ہندو ہے۔ وہ اسے سلام نہیں کر سکتیں۔ دور سے نور بانو کی مشتعل نگاہیں اس کے جسم میں چبھ رہی ہیں۔ اب وہ کیا کرے.....؟

وہ تیزی سے کچھ سوچنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہاں..... یہ ٹھیک رہے گا۔ '' کیسے ہیں آپ.....''

یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں اسے مخاطب کیسے کروں گی؟ امی نے اسے بیٹا بنایا ہے تو اس رشتے سے اسے بھائی کہنا چاہیے۔ لیکن صرف بھائی یا بھیا کہنے کا کوئی سوال نہیں۔ یہ وہ کیسے گوارا کر سکتی ہے اور اس کا نام اسے معلوم نہیں۔ ہاں..... وہ چھوٹے ٹھاکر کہلاتا ہے۔

'' کیسے ہیں آپ چھوٹے ٹھاکر بھائی.....؟'' وہ کہتی ہے۔

لیکن یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ طویل بھی ہے۔ اس سے اوپری پن جھلکتا ہے۔

'' کیسے ہیں آپ چھوٹے ٹھاکر بھیا.....؟'' وہ ترمیم کرتی ہے۔

یہ کچھ بہتر ہے۔ اس میں روانی ہے۔ لیکن اچھا اب بھی نہیں لگ رہا ہے۔ ایک لفظ کم ہونا چاہیے..... اس سرے سے یا اس سرے سے۔

''ٹھاکر بھیا......''

نہیں۔ یہ بھی نہیں۔

''آپ کیسے ہیں چھوٹے ٹھاکر؟''

یہ اسے اچھا لگا۔ بس یہ ٹھیک ہے۔ اس میں وہ بھی خوش ہے اور کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔

چھوٹا ٹھاکر سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہے..... آنکھوں میں سوال ہے۔ ''یہ میری بڑی بیٹی ہے..... حور بانو۔'' اماں جلدی سے تعارف کراتی ہیں۔

"جی..... میں ٹھیک ہوں۔" چھوٹا ٹھا کر کہتا ہے۔

"چائے لاؤں آپ کے لیے؟" وہ اس سے پوچھتی ہے۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ چائے تو تمھیں بغیر پوچھے لانی چاہیے تھی۔" اماں بناوٹی خفگی سے کہتی ہیں۔

"میں نے سوچا، شاید یہ شربت پسند کریں۔"

"نہیں، چائے ہی ٹھیک ہے۔"

وہ باورچی خانے میں جاتی ہے، چائے بنا کر لاتی ہے اور اسے دیتی ہے۔ پھر وہ وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔

اب وہ دور ایک کتاب لیے بیٹھی ہے اور چپکے چپکے اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے، وقت رک جائے، وہ یونہی سامنے بیٹھا رہے اور وہ چپکے چپکے اسے دیکھتی رہے۔

پھر اچانک وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی چوری پکڑی جاتی ہے۔ وہ یوں گڑبڑاتی ہے کہ اسے نظریں جھکانے کا خیال بھی نہیں آتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر وہ گھبرا کر کتاب پر جھک جاتی ہے۔

اس پورے دن وہ جاگتی آنکھوں اسی طرح کے خواب دیکھتی رہی۔ شام کو زینوں والے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکی۔ اس کا بس چلتا تو وہ دوڑ کر جاتی اور دروازہ کھول دیتی۔ بہرحال وہ خود کو سنبھالے بیٹھی رہی۔ لیکن اس کا دل سینے میں جیسے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

مگر وہ چھوٹا ٹھا کر نہیں تھا۔ رنجنا تھی۔

رات ہوئی تو وہ مایوس ضرور تھی لیکن آس بہرحال نہیں ٹوٹی تھی۔

اگلے روز بھی وہی کچھ ہوا۔ مگر شدت پچھلے روز جیسی نہیں تھی۔ ہاں، رات ہونے پر مایوسی گزشتہ روز سے زیادہ تھی۔ اور آس کمزور ہو گئی تھی۔

تیسرے روز اسے نور بانو پر غصہ آنے لگا۔ نور بانو نے ہی ہنگامہ مچایا تھا کہ چھوٹے ٹھا کر کو گھر میں نہیں آنا چاہیے..... اور ان کا اس کے سامنے آنا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آواز اوپر گئی ہو اور چھوٹے ٹھا کر نے سن لیا ہو۔ اتنا کچھ سننے کے بعد وہ بھلا نیچے آ سکتا تھا اور کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اس نے اماں سے بھی یہ بات کہی۔ لیکن اماں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ گفتگو اندر والے کمرے میں ہوئی تھی۔ اور وہاں کی آواز اوپر جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بعد میں اس نے خود بھی غور کیا تو اسے تسلیم کرنا پڑا کہ اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

کچھ بھی ہو، اس کے دل میں نور بانو کے لیے چڑ بیٹھ گئی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ نور بانو

نے غلط کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا، ٹھیک کہا۔ لیکن دل کے معاملات تو خودکار ہوتے ہیں۔ وہ نور بانو سے کھنچ گئی۔ اس نے کچھ پوچھا تو مختصر سا جواب دے دیا۔

اس روز اماں خود اوپر گئیں اور جا کر بیٹھ ہی گئیں۔ دو گھنٹے بعد وہ واپس آئیں تو خوش نظر آ رہی تھیں۔ لیکن انھوں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ بھی نہیں بتایا۔ حور بانو کو کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ دل میں چور جو تھا۔

لیکن اس بار وہ مایوس ہو گئی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ چھوٹا ٹھا کر کبھی نیچے نہیں آئے گا۔

❁......❁......❁

دو دن اور گزر گئے۔ سرفراز بیگم کو یقین ہو گیا کہ چھوٹا ٹھا کر نیچے نہیں آئے گا۔ وجہ انھیں نہیں معلوم تھی۔ انھیں تجسس بھی بہت تھا لیکن وجہ وہ اس سے پوچھنا نہیں چاہتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے نیچے نہ آ کر ان کی غلطی کی تلافی کر دی تھی اور انھیں اللہ کے سامنے شرمندگی سے بچا لیا تھا۔ اب پوچھنے میں یہ ڈر بھی تھا کہ اس کے نیچے آنے کا راہ پھر نہ کھل جائے۔ یہ بات نہیں کہ وہ ایسا نہ چاہتی ہوں۔ دل تو ان کا اب بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ بیٹا بن کر نیچے آئے اور ان کے پاس بیٹھے اور باتیں کرے۔ لیکن ان کے منہ سے بچیوں کے پردہ نہ کرنے کی جو بات نکل گئی تھی، وہ اس پر پچھتا رہی تھیں۔

تیسرے دن انھوں نے بڑے اہتمام سے لوکی کا حلوہ بنایا اور چھمن بوا کے ہاتھ اوپر بھجوانے کے بجائے خود ہی لے گئیں۔ اس بار ان کے انداز میں حقیقی ماؤں والا اعتماد تھا۔ انھوں نے رنجنا سے پوچھا۔ "چھوٹے ٹھا کر کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں بڑی بیگم۔" رنجنا نے جواب دیا۔

وہ چھوٹے ٹھا کر کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ اسی لمحے وہ اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اس نے ان کی آواز اور رنجنا کا جواب سن لیا تھا۔ "آیئے ماں جی، کیسی ہیں آپ؟" اس نے پوچھا اور دروازے سے ہٹ کر انھیں راستہ دیا۔

"ٹھیک ہوں بیٹے۔ تمھارے لیے لوکی کا حلوہ لائی ہوں۔" انھوں نے اپنے ہاتھ سے چمچہ بھر حلوہ اسے کھلایا۔

"واہ ماں جی، بہت مزے کا ہے۔" چھوٹے ٹھا کر نے چٹخارا لے کر کہا۔

"کیوں نہ ہو۔ تمھارے لیے بنایا ہے۔ اس میں محبت کا ذائقہ بھی ہے۔" سرفراز بیگم بولیں۔ "ہر روز تھوڑا سا کھایا کرو۔ یہ بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔"

"شکریہ ماں جی۔ اچھا اب بیٹھیے تو۔ یہ بتائیں، کیا پئیں گی؟ چائے یا شربت؟"

سرفراز بیگم ایک لمحے کو ہچکچائیں۔ پھر انھوں نے کہا۔ "چائے پی لوں گی۔"

چھوٹا ٹھا کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ رنجنا حلوہ لے کر اندر چلی گئی۔ اسے چائے بھی بنانی

تھی۔

''اور سنائیں ماں جی، گھر میں سب ٹھیک ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے بیٹے۔ سب ٹھیک ہیں۔''

چند لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر سرفراز بیگم کو اب بھی اس کے ماں باپ کے بارے میں تشنگی تھی۔ انھوں نے گفتگو کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ ''تم یہاں آئے تو تمہاری ماتا جی کا انتقال ہو چکا تھا؟''

''جی ماں جی۔ میں ماتا جی کے دیہانت کے چھ ماہ بعد یہاں آیا تھا۔''

''مجھے یہ بتاؤ، تمہاری ماتا جی کیسی تھیں؟''

''ماں کے بارے میں تو اتنا کہنا ہی کافی ہے ماں جی کہ وہ ماں ہے۔'' چھوٹے ٹھاکر نے سادگی سے کہا۔ ''اس کے بعد تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔''

کیسا خوبصورت اور سچا جواب ہے۔ سرفراز بیگم نے دل سے سوچا۔ پھر بولیں۔ ''تمہاری ماتا جی خوش نصیب تھیں کہ انھیں اتنے برسوں کے بعد ملا تو تم جیسا بیٹا ملا۔ کیسے خوش ہوتی ہوں گی وہ تمھیں دیکھ دیکھ کر۔''

''جی ماں جی۔ بہت خوش ہوتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی میں انھیں بہت پریشان کر دیتا تھا۔''

''یہ تو ذہانت کی دلیل ہے۔ اس میں پریشانی کیسی؟''

''ماتا جی سیدھی سادی دھرم کی پکی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں روز ان کی طرح پوجا کیا کروں۔ میں یہ پوچھتا تھا کہ یہ پوجا کیوں کی جاتی ہے۔ بھگوان کون ہے؟ کیا سچ مچ ایسا ہے؟ کیا اسے دیکھا جا سکتا ہے...... وہ سامنے آتا ہے؟ اگر اسے کسی نے نہیں دیکھا تو اس کا بت کیسے بنا لیا؟ یہ بھگوان کیسا شکتی والا ہے کہ اپنے بت پر بیٹھی بدتمیز مکھی کو بھی نہیں اڑا سکتا...... سزا نہیں دے سکتا!''

سرفراز بیگم حیران تھیں۔ ان کے سامنے چھوٹے ٹھاکر کی شخصیت کا یہ نیا رخ آ رہا تھا۔ ایسا آدمی مشرک کیسے ہو سکتا ہے...... اور ہو بھی تو مشرک رہ تو نہیں سکتا۔ شاید اس لیے انھیں اس پر ایسا پیار آتا تھا۔

چھوٹا ٹھاکر ان کی کیفیات سے بے خبر اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا۔ ''ماتا جی کے پاس علم نہیں تھا۔ ان کے پاس میرے اعتراضات کے جواب نہیں تھے۔ وہ میرے سوالات پر جھنجلاتی تھیں۔ چڑتی تھیں...... کہتی تھیں، بس تم میری خوشی کے لیے پوجا کر لیا کرو۔ میں کہتا تھا، ماتا جی، میں آپ کو خوش کرنے کے لیے پوجا کروں گا تو وہ بھگوان کی پوجا تو نہیں ہوگی۔''

بات ٹھیک تھی۔ بندہ کسی انسان کو خوش کرنے کے لیے اللہ کی عبادت کرے تو اللہ اسے قبول نہیں کرتا۔ وہ اس سے خوش بھی نہیں ہوتا بلکہ ناراض ہوتا ہے۔ سرفراز بیگم نے سوچا۔ پھر بولیں۔ ''کچھ تو کہتی ہوں گی تمہاری ماتا جی؟''

''وہ کہتی تھیں، پرکھوں سے یہ پوجا چلی آ رہی ہے۔ ہمارے دادے پردادے اسی طرح پوجا کرتے رہے ہیں۔ تو ہم کیسے چھوڑ دیں؟''

سرفراز بیگم کو یاد آیا کہ قرآن پاک میں کئی جگہ اللہ نے لوگوں کے کفر کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ وہ لوگ دلیل میں اپنے آبا و اجداد کے عمل کو پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ہم ان دیوی دیوتاؤں کی پرستش کیسے چھوڑ دیں، جنھیں ہمارے آبا و اجداد پوجتے آئے ہیں۔

''تو تمھیں اس میں کیا اعتراض تھا بیٹے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''دیکھیں ماں جی، انسان تو زندگی بھر غلطی کرتا رہتا ہے۔ ایک وقت میں وہ ایک نظریہ قائم کرتا ہے۔ آگے جا کر وہ غلط ثابت ہو جائے تو اس کی اصلاح کر لیتا ہے۔ جو غلط ثابت ہونے کے باوجود اس نظریے پر ڈٹا رہے، وہ جاہل ہوتا ہے۔ آدمی کے تسلیم نہ کرنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ اور آدمی کے تسلیم کرنے سے کوئی غلط بات درست نہیں ثابت ہوتی۔ میں ماتا جی سے کہتا تھا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے دادے پردادے غلطی پر ہوں۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ یہ سن کر ماتا جی کو غصہ آتا تھا۔ لیکن میری محبت میں وہ اسے پی جاتی تھیں۔ وہ مجھ سے خوشامد کرتی تھیں کہ بس میں ان کی خوشی کے لیے پوجا کر لیا کروں۔''

''تو پھر؟ تم کیا کرتے تھے؟''

''ماتا جی کی خاطر میں پوجا کر لیا کرتا تھا۔ جس روز ماتا جی کا دیہانت ہوا، پتا جی نے مجھے بلا کر کہا...... تمہاری ماتا جی کی حالت اچھی نہیں۔ بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ اس روز میں پہلی اور آخری بار اپنی مرضی سے ماتا جی کے کمرے میں گیا۔ میں نے پوجا کی اور بھگوان سے پرارتھنا کی کہ میری ماتا جی کو جیون دے دو۔ اسے مرنے نہ دو۔ میں پوجا کر کے نکلا تو پتا چلا کہ ماتا جی جا چکی ہیں۔ پھر میں آخری بار پوجا کے کمرے میں گیا۔ میں نے بھگوان سے کہا...... میں نے کبھی تجھے نہیں مانا۔ میں نہیں مانتا کہ تجھ میں کوئی شکتی ہے۔ تو تو خود کو بھی نہیں بچا سکتا۔ کسی اور کو کیا بچائے گا۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تجھ سے کچھ مانگا۔ آج کے بعد تجھ سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ تجھ میں کوئی شکتی ہے تو مجھے شراپ ضرور دینا۔ میں تیرے شراپ کا انتظار کروں گا۔'' چھوٹے ٹھاکر نے گہری سانس لی۔ پھر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔ ''اس دن کے بعد ماں جی میں نے کبھی پوجا نہیں کی۔''

وہ سب کچھ سننا اتنا غیر متوقع اور اثر انگیز تھا کہ سرفراز بیگم سن ہو کر رہ گئیں۔ چھوٹا ٹھاکر بھی خاموش ہو گیا تھا۔ سرفراز بیگم کچھ دیر اسی کیفیت میں بیٹھی رہیں۔ پھر انھوں نے کہا۔ ''تو تم اپنی ماتا جی کی موت کی وجہ سے بھگوان سے دور ہو گئے؟''

''نہیں ماں جی، یہ بات نہیں۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا، بھگوان دیوتاؤں کو کبھی مانا ہی نہیں۔ میری عقل نہیں مانتی تھی۔ وہ تو بس وقت پڑنے پر تنکے کے سہارے

والی بات تھی۔ ایسے میں آدمی کسی سے بھی امید لگا لیتا ہے۔'' چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ پھر انھیں غور سے دیکھا۔ ''ایسا تو آپ بھی کرتی ہوں گی۔''

''میں تو بھی سب کچھ اللہ سے مانگتی ہوں..... اور اس ایمان کے ساتھ مانگتی ہوں کہ وہ سب کچھ دے سکتا ہے۔ لیکن جانتی ہوں کہ اصل چیز اس کی مرضی ہے۔ وہ چاہے تو دے اور چاہے تو نہ دے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ جو کچھ کرتا ہے، بہتر ہوتا ہے۔ میں مانگتی ہوں بھکاریوں کی طرح، غلاموں کی طرح...... عاجزی سے۔ میں اس سے شرطیں نہیں لگاتی۔''

چھوٹا ٹھاکر کچھ شرمندہ نظر آنے لگا۔ ''میں بھی اللہ سے شرطیں نہیں لگاتا ماں جی۔'' وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی شرمندگی تھی۔ ''وہ تو بھگوان کا معاملہ تھا۔ اس کے بارے میں جو کچھ بتایا جاتا ہے، میں نے اس پر کبھی یقین نہیں کیا۔ ویسے ماں جی، آپ نے بہت اچھی بات کہی۔ میں نے بھیک مانگنے والوں کو دیکھا ہے۔ اپنے جیسے انسانوں کے سامنے وہ ہاتھ پھیلاتے ہیں تو بھی عاجزی سے اور وہ بھیک نہ دے تو اس سے لڑتے نہیں۔ میری سمجھ میں ایک بات آ گئی ماں جی۔ اللہ سے مانگتے ہوئے تو ایسی عاجزی ہونی چاہیے، ایسی کہ.....'' اسے کوئی مثال نہیں سوجھ رہی تھی۔ ''بس میں سمجھ سکتا ہوں۔ بیان نہیں کر سکتا۔'' چند لمحے بعد اس نے بے بسی سے کہا۔ ''اور اکڑ تو ہونی ہی نہیں چاہیے۔''

''بالکل۔'' سرفراز بیگم نے جوش سے کہا۔ ''اور یاد رکھو۔ اللہ کو اپنے بندے کا کچھ مانگنا بہت اچھا لگتا ہے۔ بلکہ اللہ سے مانگنا ہی تو بندگی ہے۔ لہٰذا بندے کو چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر ضرورت کے لیے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہیے۔ اللہ دعا ضرور قبول کرتا ہے۔ ہاں اس کی حیثیت نہ ہو تو دعا کا صلہ دنیا میں نہیں ملتا۔ لیکن دعا رائیگاں نہیں ہوتی۔ وہ یہاں نہ دے تو آخرت میں اور بڑھا کر دیتا ہے۔''

''آپ نے مجھے بہت بڑی، بہت کام کی بات بتائی ہے ماں جی۔ اب تو میں ہر چیز اللہ سے مانگوں گا۔ مگر یہ بتائیں کہ یہ آخرت کیا ہے۔''

یہ وہ لمحہ تھا کہ سرفراز بیگم کو جھٹکا لگا۔ اپنے جوش میں انھیں یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں ایک ہندو سے کر رہی ہیں اور لگتا بھی کیسے، وہ تو ایمان والوں کی طرح بول رہا تھا۔ اب انھیں اچانک احساس ہوا کہ وہ اللہ کا نام لے رہا ہے...... اور عقیدت اور احترام سے لے رہا ہے۔ وہ چند لمحے حیرت سے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں۔ ''چھوٹے ٹھاکر، تم اللہ کو کیا جانو؟''

جواب میں چھوٹے ٹھاکر نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''نہیں جانتا ماں جی۔ لیکن جب سے ہوش سنبھالا ہے، جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جستجو میں لگا ہوا ہوں۔ یہی تو مقصد ہے میری زندگی کا۔''

''لیکن اللہ! تمھیں تو بھگوان کہنا چاہیے تھا۔''

''نہیں ماں جی۔ میری عقل مجھے بتاتی ہے کہ یہ کائنات کا مربوط نظام ایک ہستی کا قائم کیا ہوا ہے۔ وہی اسے چلا رہا ہے۔ میں اسے کھوج رہا ہوں۔ مجھے اس کا نام بھی معلوم نہیں۔ لیکن یہ نام اللہ میرے دل کو اچھا لگا۔ اب میں اسے اللہ ہی کہتا ہوں۔'' چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے کچھ پوچھا تھا، جس کا جواب ماں جی نے اسے نہیں دیا ہے۔ ''ماں جی، یہ آخرت کیا ہے؟''

سرفراز بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ بتائیں، نہ بتائیں۔ پھر انھوں نے سوچا کہ اس نے پوچھا ہے تو بتانا ان پر فرض ہے۔ ''یہ ہم مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے۔ جسے اللہ نے پیدا کیا ہے، اسے مرنا بھی ہے۔ لیکن اللہ نے ایک دن مقرر کیا ہے، جس کا علم کسی کو نہیں۔ وہ دن آئے گا، جسے قیامت کہتے ہیں تو یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور اللہ کے حکم سے تمام مردے جی اٹھیں گے۔ پھر ہر شخص کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ نیکیاں زیادہ ہوں گی تو جنت ملے گی۔ برے اعمال کے نتیجے میں دوزخ ملے گی۔ یہ آخرت ہے۔ اس کے بعد کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی ہے۔ اس میں جہنم نصیب ہو تو اللہ ہی اپنی رحمت سے نکالے تو نکالے۔''

خاموشی چھا گئی۔ چھوٹے ٹھاکر کے چہرے پر خوف تھا۔ اور وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔
سرفراز بیگم اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد انھوں نے کہا۔ ''تم یہ سوچ رہے ہو نا کہ مرنے کے بعد اللہ آدمی کو کیسے زندہ کرے گا؟''

چھوٹا ٹھاکر بری طرح چونکا۔ ''نہیں ماں جی۔ یہ بات اللہ نے ہی بتائی ہے نا؟''

''ہاں۔ اللہ نے قرآن پاک میں خود یہ فرمایا ہے۔''

''تو پھر میں یہ کیسے سوچ سکتا ہوں۔'' چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ ''اللہ نے کہا ہے تو یہ ہو کر رہے گا۔ وہ تو مہان شکتی والا ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔''

سرفراز بیگم کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ قرآن پاک میں اللہ نے بتایا ہے کہ اسی بات پر تو کافر سب سے زیادہ بحث کرتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے کفر میں آگے بڑھتے گئے۔ وہ سوچ رہی تھیں، یہ کیسا مشرک ہے کہ اللہ کے کہنے پر ایسا یقین رکھتا ہے۔ یہ کیسی غیر معمولی بات ہے۔

''تو یہ بتاؤ کہ تم کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟'' انھوں نے اس سے پوچھا۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آخرت میں میرا کیا ہوگا؟ مجھے تو یہ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں نے تو کچھ اچھا کام کیا ہی نہیں۔ اتنے برسوں سے تو میں بس کھوج میں لگا ہوا ہوں۔ کتنا وقت ضائع کر دیا میں نے۔'' چھوٹے ٹھاکر کے لہجے میں پریشانی تھی۔

سرفراز بیگم کو اس پر پیار آ گیا۔ ''حق کی تلاش میں صرف ہونے والا وقت ضائع نہیں

ہوتا۔ اسے تو اللہ کے ہاں عبادت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔" انھوں نے اسے سمجھایا۔ "اور ابھی تمہاری عمر کیا ہے۔ اچھے کام کرنے کو عمر پڑی ہے۔ اور برے تو تم ہو بھی نہیں۔"

"جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے ماں جی کہ ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہے اور صرف اللہ کو معلوم ہے۔ تب سے مجھے ہر وقت یہ خیال رہتا ہے۔ ایسا کوئی قانون نہیں کہ آدمی بوڑھا ہو کر ہی مرے۔ موت تو کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ آدمی کو اپنا ہوم ورک ہر لمحے کرنا چاہیے۔"

سرفراز بیگم لرز کر رہ گئیں۔ ارے...... انھیں تو مسلمان ہو کر موت کا خیال بھی نہیں آتا۔ اور یہ مشرک جوان لڑکا آخرت کی فکر کر رہا ہے۔ نہیں، اسے تو مشرک کہا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ تو گناہ ہے۔ وہ دل میں توبہ کرنے لگیں۔

"اچھا بیٹے، میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

چھوٹا ٹھاکر بھی اٹھ گیا۔ اس نے سر جھکایا اور سرفراز بیگم نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

❀......❀......❀

اس روز ماں جی اسے سوچنے کے لیے بہت کچھ دے گئیں۔ آخرت! اب وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ ذہن کے وہ دریچے کھل رہے تھے، جن کی موجودگی کا اب تک اسے علم نہیں تھا۔

امتحان! امتحانوں کی وہ کیسی فکر کیا کرتا ہے! پاس ہونے کی کتنی اہمیت ہے اور فیل ہونے کا کتنا خوف ہے۔ مگر سب سے بڑے امتحان کی اسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ اس میں فیل ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے جہنم میں جا پڑا تو؟

مگر ابھی اسے جنت اور دوزخ کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں تھیں۔ اس لیے اس کا خوف بھی بڑا نہیں تھا۔

پھر بھی آخرت کی فکر اسے ستانے لگی۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ جو اللہ نے دنیا بنائی ہے تو یہ کوئی کھیل تماشہ تو نہیں۔ ایسا نہیں کہ آدمی کو اللہ نے بے مقصد پیدا کیا ہو کہ وہ یہاں زندگی گزارے، کبھی روئے۔ کبھی خوشی سے سرشار ہو تو کبھی غم سے نڈھال۔ کبھی عیش میں گم ہو تو کبھی پریشان۔ اور وقت آنے پر مر جائے۔ کھیل ختم! اسے حیرت ہونے لگی کہ اس نے پہلے اس سلسلے میں کیوں نہیں سوچا۔ یہ تو بڑی اہم بات ہے۔ زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہے نا۔ اور اب وہ مقصد سامنے آ گیا ہے۔ زندگی دراصل ایک امتحان ہے۔ اللہ نے انسان کو زندگی دی...... بے شمار نعمتوں کے ساتھ اور بتا دیا کہ یہ ایک امتحان ہے۔ پاس ہونے کا انعام ہے اور فیل ہونے کی سزا۔

اہم سوال یہ تھا کہ امتحان کیا ہے؟

جانوروں کو صرف جبلت دی گئی ہے، عقل نہیں۔ آدمی کو عقل دے کر تمام مخلوقات پر فوقیت دی گئی ہے۔ اسی عقل کی بنیاد پر امتحان ہے۔ اسی کی وجہ سے تو حساب لیا جائے گا۔ تبھی تو جزا اور سزا ہو گی۔

وہ مشاہدے کا آدمی تھا۔ اس نے دیکھا تھا، عام جانوروں کی جبلت میں احسان مندی تھی۔ کتے کو ایک بار روٹی کھلا دو۔ زندگی بھر تمھارے سامنے دم ہلاتا رہے گا۔ بلی کو ایک بار دودھ دے دو، بار بار تمہاری طرف آئے گی۔ یعنی ان کی احسان مندی شکر گزاری ہے۔ جس کتے کو آپ نے ایک بار کھانے کو کچھ دے دیا، وہ آپ کے ایک اشارے پر کچھ بھی کر دے گا۔ جان بھی دے دے گا۔

اور ایک آدمی ہے۔ جانتا ہے کہ اللہ نے اسے پیدا کیا۔ تمام جان داروں میں عزت عطا فرمائی۔ مرتبہ دیا۔ عقل جیسی نعمت دی۔ لیکن وہ اس کی وفاداری اور تابع داری نہیں کرتا۔ یعنی وہ ناشکرا اور احسان فراموش ہے۔ کیا یہ عقل کی وجہ سے ہے۔ اس لیے کہ جبلت اور فطرت تو احسان مانتا ہے۔ ہاں...... یہی بات ہے۔ عقل کی وجہ سے تو نہیں، ہاں عقل کو غلط استعمال کرنے کی وجہ سے ہے۔

تو امتحان تو سمجھ میں آ گیا۔ زندگی کا مقصد ہے پیدا کرنے والے کی بندگی۔ اس کا شکر ادا کرنا۔ اس کی اطاعت کرنا۔ اس کا حکم ماننا۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرتا رہا ہے۔ وہ جو اپنے پیدا کرنے والے سے سب سے بڑھ کر محبت کرنا چاہتا تھا، ابھی تک اس کے کھوج میں لگا تھا۔ اسے ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے احکامات کیا ہیں۔ وہ کن باتوں کا حکم دیتا ہے اور کن باتوں سے منع کرتا ہے۔ یہ سب اسے جاننا ہے۔ تبھی تو وہ امتحان دینے کے قابل ہو گا۔

اب وہ کیا کرے؟ اسے کیسے ڈھونڈے؟ اس کے بارے میں کیسے معلوم کرے؟ اب تک تو وہ اپنی عقل سے، اپنے اندر کی نشانیوں کی مدد سے اسے کھوج رہا ہے۔ لیکن ایسے تو کام نہیں چلے گا۔

اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اللہ کی کتابیں موجود ہیں۔ یہی سب سے اچھا اور معتبر ذریعہ ہے۔ لیکن قرآن کے بارے میں اسے خبردار کر دیا گیا تھا کہ اسے پاک ہوئے بغیر نہیں چھوا جا سکتا۔ البتہ بائبل کے بارے میں کسی نے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تھی۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بائبل پڑھے گا۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ بازار گیا اور کتابوں کی دکان سے ایک بائبل لے لی۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس نے دکان دار سے کہا۔ "مجھے جنت اور دوزخ کے موضوع پر کوئی اچھی اور جامع کتاب بھی چاہیے۔"

دکان دار نے کئی کتابیں نکال دیں۔ اس نے ان میں سے ایک کتاب منتخب کر لی۔ اب وہ مطالعے کے لیے تیار تھا!

❀......❀......❀

اس بار سرفراز بیگم ضبط نہیں کر سکیں۔ انھوں نے تینوں بچیوں کو اپنے پاس بٹھایا۔ ''میں تمھیں کسی بات پر مجبور نہیں کرنا چاہتی۔'' انھوں نے کہا۔ ''لیکن تمھیں بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔''

وہ تینوں انھیں متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ نور بانو کے انداز میں چوکنا پن تھا۔

''میں تمھیں نصیحت کر رہی ہوں کہ چھوٹے ٹھاکر کو کبھی مشرک اور کافر نہ کہنا۔ بلکہ ایسا سوچنا بھی نہیں۔''

''ایسا تو صرف آپی ہی کہتی ہیں۔'' گلنار نے چیخ کر کہا۔

''آپ یہ نصیحت کس بنیاد پر کر رہی ہیں۔'' نور بانو نے معترضانہ لہجے میں پوچھا۔

سرفراز بیگم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی حور بانو بول اٹھی۔ ''صاف اور واضح حکم ہے کہ کافر کو بھی کافر نہ کہو۔ کسی بھی وقت اللہ کی ہدایت اسے نصیب ہو گئی تو وہ ایمان لے آئے گا۔ اور تمھیں شرمندگی ہو گی۔ تمھیں نہیں معلوم کہ کون ایمان پر مرے گا اور کون کفر پر۔''

''مجھے کسی کو کافر اور مشرک کہنے کا شوق نہیں ہے۔ نہ میں نے کبھی کہا تھا۔'' نور بانو نے نرم لہجے میں کہا۔ ''بات پردے کی تھی۔ نامحرم مومن ہو تو اس سے بھی پردے کا حکم ہے۔ جب چھوٹے ٹھاکر کو گھر میں بلانے اور اس سے پردہ ختم کرنے کی بات ہوئی تو مجھے مجبوراً اس انداز میں بات کرنی پڑی اور میں بھی اس پر قائم ہوں کہ جو میں نے کہا، درست تھا۔ اللہ کے حکم کے مطابق تھا۔''

''تم لوگوں نے آپس میں الجھنا شروع کر دیا۔'' سرفراز بیگم جھنجلا گئیں۔ ''میں نے تم لوگوں کی بھلائی کی خاطر تمھیں نصیحت کی تھی۔''

''میں پھر پوچھوں گی کہ آپ یہ نصیحت کس بنیاد پر کر رہی ہیں۔''

''جو کچھ میں نے چھوٹے ٹھاکر سے سنا ہے اور جتنا میں نے اسے سمجھا ہے، اس کی بنیاد پر تمھیں سمجھا رہی ہوں۔'' سرفراز بیگم بولیں۔ ''وہ تو حق کی جستجو کر رہا ہے۔ وہ اللہ کا نام لیتا ہے۔ اس نے کبھی بتوں کی پوجا نہیں کی۔''

''یہ تو وہ کہہ رہا ہے نا'' نور بانو نے حقارت سے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سرفراز بیگم نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

''میرا مطلب ہے کہ وہ آپ کے دل میں جگہ بنانے، آپ کے گھر میں گھسنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ وہ پیدائشی ہندو ہے۔''

''تم نے حد کر دی ہے بدگمانی کی......'' حور بانو کو غصہ آ گیا۔

''تم لوگ آپس میں مت الجھو۔ مجھے بات کرنے دو۔'' سرفراز بیگم نے ہاتھ اٹھا کر حور

بانو کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نور بانو، مجھے نہیں معلوم کہ تم یہ بدگمانی کس بنیاد پر کر رہی ہو۔ گھر میں گھسنا ہوتا تو وہ اب تک یہاں آ چکا ہوتا۔ خود میں نے اسے دعوت دی تھی۔ لیکن ایک ہفتہ ہو گیا اس بات کو اور وہ اب تک نہیں آیا۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ آئے گا بھی نہیں......''

''یہ لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں اماں۔'' نور بانو اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔ ''وہ اپنا اچھا تاثر جمانا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے اصرار کروانا چاہتا ہے......''

''اور میں اس سے اصرار کرتی۔ لیکن پچھلی بار تم لوگوں سے جو گفتگو ہوئی تو میں نے اس سے کہا بھی نہیں۔''

''اب دیکھ لیں۔'' نور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''اسے تو نہیں معلوم کہ ہمارے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔ اسے حیرت ہو گی کہ آپ نے دوبارہ اس سے آنے کو کیوں نہیں کہا اور وہ چاہتا ہے کہ آپ اس سے اصرار کریں۔''

نور بانو کی دلیل ایسی تھی کہ ایک لمحے کو تو سرفراز بیگم بھی ہل گئیں۔ پھر انھوں نے سنبھل کر کہا۔ ''میں اس سے ملی ہوں۔ میں نے گھنٹوں اس سے باتیں کی ہیں میں جانتی ہوں کہ وہ نہ جھوٹا ہے نہ مکار۔ اور اس نے جو پوجا پاٹھ نہ کرنے کی بات کی ہے تو مجھے متاثر کرنے کی غرض سے نہیں کی۔ وہ تو ایک قدرتی عمل ہے۔ اللہ کی طرف سے ہے۔ جو تفصیل مجھے معلوم ہے، وہ تو میں نے تمھیں نہیں بتائی۔''

''مجھے سننی بھی نہیں ہے۔'' نور بانو نے بے زاری سے کہا۔

حور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے نور کہ تمھیں چھوٹے ٹھاکر سے چڑ ہے۔'' وہ بولی۔ ''بتاؤ تو ایسا کیوں ہے؟''

''تمھارے دماغ کی خرابی ہے باجی۔'' نور بانو نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم لوگ پھر الجھنے لگیں آپس میں۔'' سرفراز بیگم جھنجلا گئیں۔ ''سنو...... میرا کام سمجھانا تھا۔ میں نے تمھیں سمجھا دیا۔ اب کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو میں کیا کروں۔'' ان کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''اب تم جانو۔''

❀......❀......❀

اوتار سنگھ نے بائبل کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس مطالعے میں ارتکاز نہیں تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اس دوران اسے مسلسل ابہام کا خیال ستاتا رہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ جم کر مطالعہ نہیں کر پاتا تھا۔ اس کا دھیان اچٹ جاتا تھا۔

ایسے ہی ایک موقعے پر اس نے دوسری کتاب کی ورق گردانی کی۔ اس میں اس کا دل لگ گیا۔ اس نے وہ کتاب شروع کی تو اس سے چھوڑی نہیں گئی۔ وہ کتاب ختم کر کے ہی رکا بلکہ رکا تو جب بھی نہیں۔ ایک ہفتے میں اس نے چار پانچ مرتبہ وہ کتاب شروع سے آخر تک پڑھ لی۔

اس کتاب نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ دوزخ کی تفصیلات نے اسے لرزا دیا...... دہشت زدہ کر دیا۔ یہ تو اس نے سمجھ لیا تھا کہ زندگی ایک امتحان ہے۔ مگر یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنا بڑا امتحان ہے۔ فیل ہونے کی سزا اتنی ہولناک اور پاس ہونے کا انعام اتنا بڑا۔ جہنم کے فرشتوں کی جو اس نے تفصیل پڑھی تو کئی دن تک وہ اسے خواب میں ڈراتے رہے۔

نکیرین کے باب میں جو اس نے پڑھا، اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ قبر میں سوال جواب۔ وہ جانتا تھا کہ موت کسی کو بھی، کسی بھی لمحے دبوچ سکتی ہے۔ اگر وہ اسی وقت مر جائے تو قبر میں وہ کیا جواب دے گا۔ وہ کیا کہے گا؟ وہ تو نہ اِدھر ہے نہ اُدھر۔ وہ تو بھٹک رہا ہے۔ کیا وہ تفتیش کرنے والے فرشتوں سے یہ کہے گا کہ اسے مہلت نہیں ملی۔ ابھی تو وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے موت آ گئی۔ یہ جواب اسے بچا تو نہیں سکے گا۔

کتاب میں قیامت کا حال بھی تھا۔ وہ اس کی سمجھ میں زیادہ آسانی سے آ گیا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ جس نے کامل حساب کتاب سے سب کچھ بنایا ہے، سیاروں کی باہمی کشش سے یہ نظام قائم کیا ہے، وہ بنانے کی نسبت کہیں زیادہ آسانی سے وہ سب کچھ تباہ کر سکتا ہے۔ نظام میں ایک معمولی سا خلل واقع ہو جائے تو لمحوں میں سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

چند روز تو وہ خوف زدہ رہا۔ لیکن انسانی فطرت ہے کہ خوف انتہا کو پہنچ کر مٹ جاتا ہے۔ اور اوتار سنگھ تو ویسے بھی سوچنے والا آدمی تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ سب افسانے ہیں۔ اللہ نے انسان کو نیک بنانے کے لیے اسے ڈرانے کا سامان کیا ہے۔ ورنہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک مرتا ہے تو دو پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی جاری و ساری رہتی ہے اور رہے گی۔ بس اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ نیک عمل کرتا رہے اور برائیوں سے بچے۔ لیکن جو کچھ اس نے پڑھا تھا، وہ اسے مکمل طور پر رد نہیں کر سکا۔ اسے یہ خیال رہتا تھا کہ اس کے دونوں کندھوں پر حساب لکھنے والے موجود ہیں اور اس کا ایک ایک عمل تحریر کیا جا رہا ہے۔ اسے چوکنا رہنا چاہیے۔

دوسری طرف اسے خیال آیا کہ ماتا اور پتا جی سے فرشتوں نے سوال جواب کیے ہوں گے تو ان پر کیا گزری ہو گی۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ وہ کم از کم حقیقت کو سمجھنے کی کوشش تو کر رہا ہے...... جستجو تو کر رہا ہے۔ وہ دونوں تو اس سے بھی محروم تھے۔ وہ تو بھگوان کو مانتے تھے...... برہما، وشنو اور شیو کو مانتے تھے۔ گویا شرک کرتے تھے۔ تب اسے ایک عجیب خیال آیا۔ ماتا جی تو بچ گئی ہوں گی۔ ان کی تو چتا جلائی گئی تھی۔ وہ دفن تھوڑا ہی کی گئی تھیں اور سوال جواب تو قبر میں مردے کو اٹھا کر کیے جاتے ہیں۔ جہاں مردہ راکھ میں تبدیل ہو گیا ہو، وہاں یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے۔ البتہ پتا جی کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ ان کی چتا کو آگ نہیں دکھا سکا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہی ختم ہوئے تھے اور وہ ریت کے تلے دفن ہوئے تھے......

اس پر اسے ایک بات یاد آئی۔ پتا جی نے اس سے کہا تھا...... جلانا نہیں، دفن کرنا......

یہ بات پہلے بھی اس کے لیے الجھن کا باعث بنی تھی۔ یہ بات پتا جی اپنے لیے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ کیسے کہہ سکتے تھے! اس کا خیال تھا کہ انھوں نے یہ بات چاچا جی اور ویر جی کے لیے کہی ہو گی۔

بہر حال اس کے پتا جی قدرتی طور پر سہی، لیکن دفن ہوئے تھے اور وہ سوال جواب کے مرحلے سے گزرے ہوں گے۔ لیکن نہ وہ ان کے لیے کچھ کر سکا تھا، نہ اب کر سکتا ہے۔ ہاں وہ اپنی سمت درست کر لے تو ان کے لیے شاید کچھ کر سکے۔

ان دو کتابوں کے مطالعے نے (ایک کا جزوی اور دوسری کا تفصیلی مطالعہ) اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب تک جو اپنے طور پر وہ جستجو کرتا رہا تھا۔ تو اس کے انداز میں یک سوئی اور سکون تھا۔ یہی حال اس کی سوچوں کا تھا۔ ان میں ٹھنڈک تھی، سکون تھا۔ لیکن اب ان میں جہنم کی گرمی، اضطراب اور خوف در آیا تھا۔ وہ وہی تھا...... پہلے جیسا۔ لیکن اس کی کیفیت بدل گئی تھی۔

اس نے سوچا، کیا مطالعہ آدمی کو مضطرب اور بے سکون کر دیتا ہے؟ اس سوچ کے ساتھ دلیل بھی تھی۔ اس مطالعے نے اسے انتشار بھی دیا تھا اور مضطرب اور بے چین بھی کیا تھا بلکہ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے اب تک کے کیے کرائے پر پانی بھی پھر گیا ہے۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس کا یہ سفر شروع کہاں سے ہوا تھا۔ اس وقت سے، جب اسے لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس کے سفر کا آغاز مشاہدے سے ہوا تھا۔ مشاہدے کے نتیجے میں اس کے ذہن میں سوالات ابھرے تھے۔ اس کے پاس جواب نہیں تھے۔ جواب اسے استادوں سے ملے تھے۔ ماسٹر جی اس کے پہلے استاد تھے۔ پھر ماتا جی اور اماں تھیں......

ماسٹر جی کا خیال آیا تو وہ بری طرح چونکا۔ اسے شرمندگی ہونے لگی۔ کب سے اس نے ماسٹر جی کو نہیں دیکھا تھا...... اور اسے ان کا خیال، ان کی یاد بھی نہیں آئی تھی۔ وہ جب گاؤں جا رہا تھا تو ماسٹر جی بیمار تھے۔ ان کی ہی وجہ سے رگھو اور رنجنا بھی گاؤں نہیں جا سکے تھے۔

اور جب وہ واپس آیا اور اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو اس نے رگھو سے ماسٹر جی کے بارے میں پوچھا۔

''ان کی طبیعت آپ کے جانے کے دوسرے روز سنبھل گئی تھی مالک۔'' رگھو نے بتایا۔ ''اس سے اگلے روز انھوں نے اپنے گھر جانے کو کہا۔ کہتے تھے، بچے بہت یاد آ رہے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کی واپسی تک ان کے ساتھ وقت گزار آؤں۔ کہہ رہے تھے، فکر نہ کرنا...... میں آپ ہی واپس آ جاؤں گا۔''

اب اتنے دن ہو گئے تھے اور وہ واپس نہیں آئے تھے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں نے ان کی فکر بھی نہیں کی۔ نجانے وہ کس حال میں ہوں۔ اوتار سنگھ کو افسوس ہونے لگا۔ اس نے سوچا، اب وہ پہلی فرصت میں ان کے بارے میں معلوم کرے گا۔

خیر، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ استاد کی رہنمائی کے بغیر مطالعہ نقصان دہ ثابت ہو سکتا

ہے۔ خاص طور پر دین کا مطالعہ!

یہ بات اس کے دل کو لگی۔ اس کا خوف اور اس کے اندر کی مایوسی اور پژمردگی ختم تو نہیں ہوئی۔ البتہ کم ضرور ہوگئی۔ وہ سوچ رہا تھا، مولوی صاحب زندہ ہوتے تو ان سے اسے مدد ملتی۔ اب وہ اپنے لیے استاد کہاں سے تلاش کرے۔ گرد و پیش میں اسے ایسا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

پھر اس کا دھیان بٹ گیا۔ جس امتحان کا اسے خوف نہیں تھا، اس کا نتیجہ آ گیا تھا۔ وہ پاس ہو گیا تھا!

❀......❀......❀

سرفراز بیگم کرتے پر کڑھائی کر رہی تھیں۔ پائجامہ وہ پہلے ہی سی چکی تھیں۔ یہ کام کرتے ہوئے انھیں کیسی خوشی ہو رہی تھی، اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ بیٹے کے لیے کپڑے سینے کی خوشی ان کے لیے بالکل نئی تھی۔

کرتا مکمل کر کے انھوں نے استری کے لیے کوئلے دہکائے۔ بڑی محبت اور نفاست سے انھوں نے کپڑے استری کیے اور تہ کر کے رکھ دیے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد انھیں خیال آیا کہ اگر چھوٹے ٹھاکر کو یہ کپڑے اچھے نہیں لگے تو کیا ہوگا۔ ویسے تو وہ گھر پر قمیص پائجامہ ہی پہنتا تھا۔ کم از کم دھوتی میں تو انھوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

انھوں نے اس خیال پر دل ہی دل میں خود کو جھڑک دیا۔ آدمی اپنی خوشی کے لیے کوئی کام کرے اور اس کے بعد اندیشے لے کر بیٹھ جائے، یہ بھی کوئی بات ہے۔ انھوں نے محبت سے لباس سیا ہے تو انشاء اللہ وہ اسے محبت ہی سے پہنے گا۔ محبت تو دل سے دل تک پہنچنے کا راستہ خود ہی بنا لیتی ہے۔

انھوں نے سوچا، شام کو یہ تحفہ لے کر جائیں گی۔ ویسے بھی اس کی صورت دیکھے کئی دن ہو گئے ہیں۔

لیکن شام کو رنجنا مٹھائی کا بڑا ڈبہ لے کر آ گئی۔ ''یہ لیجیے بڑی بیگم۔ چھوٹے ٹھاکر نے یہ مٹھائی بھجوائی ہے۔''

''اس کے ساتھ کوئی خوش خبری بھی تو ہو گی۔'' سرفراز بیگم نے ڈبہ لیتے ہوئے کہا۔

''جی بڑی بیگم۔ چھوٹے ٹھاکر امتحان میں پاس ہو گئے ہیں۔''

سرفراز بیگم کو خوشی تو بہت ہوئی۔ لیکن دھچکا بھی لگا۔ کیسا بے مروت لڑکا ہے یہ۔ کتنی غیریت برتتا ہے۔ کم از کم یہ خوش خبری تو خود آ کر سنا دیتا۔ اس بہانے تو وہ نیچے آ سکتا تھا۔

انھوں نے مٹھائی کھلاتے ہوئے بیٹیوں سے بھی یہ بات کہی۔ ''اور تم کہتی ہو کہ وہ نیچے آنے کے لیے ہم سے اصرار کروانا چاہتا ہے۔'' انھوں نے نور بانو سے کہا۔ ''اس نے تو اس جواز سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔''

''اس سے تو میری بات کی تائید ہی ہوتی ہے اماں۔'' نور بانو نے دھیرے سے کہا۔ ''دل میں کوئی بات ہو، تبھی آدمی اتنی احتیاط کرتا ہے۔''

''تم پھر شروع ہو گئیں۔'' حور بانو نے اسے ٹوک دیا۔ پھر ماں سے بولی۔ ''اب اس مسئلے پر بات ہی نہ کیا کریں اماں۔ نور بانو کا تو وہی حال ہے.... مرغے کی ایک ٹانگ۔ ویسے مجھے یقین ہو چکا ہے کہ چھوٹے ٹھاکر کو ہماری باتوں کی سن گن ضرور ہو گئی ہے۔''

''اللہ ہی جانے۔'' سرفراز بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اچھا...... میں ذرا اوپر جا رہی ہوں۔''

ان کے اٹھنے کے بعد نور بانو نے آہستہ سے کہا۔ ''اماں کو بھی عجیب محبت ہوئی ہے چھوٹے ٹھاکر سے۔ اس پر ممتا لٹانے کو بے قرار رہتی ہیں۔ دن رات ایک کر کے کرتا کاڑھا ہے۔ اب وہ دے کر آئیں گی۔''

''تم تو بس یونہی علامہ بنی پھرتی ہو۔ تم کہاں سمجھ سکتی ہو یہ بات۔ یہ محبت ہے...... محبت!'' حور بانو نے جل کر کہا۔

''میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں باجی۔''

حور بانو نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ ''کیا واقعی؟ یقین نہیں آتا۔'' اس کے لہجے میں تضحیک تھی۔

نور بانو اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ''تمھارے یقین کرنے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا باجی۔ یہ سچ ہے کہ میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ لیکن اللہ کے حکم سے روگردانی کبھی نہیں کر سکتی۔''

''بس بڑے بڑے الفاظ بول سکتی ہو تم۔'' حور بانو نے اٹھتے ہوئے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

ادھر اوپر جاتے ہوئے سرفراز بیگم سوچ رہی تھیں کہ ان کی محبت یقیناً سچی ہے۔ وہ اس محبت کی وجہ سے چھوٹے ٹھاکر کے لیے کپڑے سی رہی تھیں۔ آج کرتا مکمل ہوا اور آج ہی اس کا نتیجہ نکلا۔ اب یہ امتحان میں پاس ہونے کا انعام کہلائے گا۔

❀......❀......❀

وہ اوتار سنگھ کے سامنے بیٹھی، اسے محبت سے تک رہی تھیں۔ پھر انھوں نے اس کی طرف وہ کپڑے بڑھائے۔ ''یہ میں نے تمھارے لیے کپڑے سیے ہیں۔ آج ہی کرتا مکمل ہوا اور آج ہی تم پاس ہوئے۔ اب اسے اپنا انعام سمجھ لو۔''

اوتار سنگھ نے کپڑے لے لیے اور شوخ لہجے میں بولا۔ ''انعام تو میں الگ سے لوں گا۔ یہ تو آپ ویسے ہی میرے لیے سی رہی تھیں۔''

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ انعام الگ سے ملے گا۔" سرفراز بیگم کو اس کے ردِعمل نے خوش کر دیا۔

اوتار سنگھ کرتے کو کھول کر اس کی کڑھائی کا جائزہ لے رہا تھا...... انگلی پھیر کر محسوس کر رہا تھا۔ سرفراز بیگم کا دل پھر اندیشوں سے بھر گیا۔ کیا پتا، یہ اسے پسند نہ آئے۔ انھیں گھبراہٹ ہونے لگی۔

"یہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے سیا ہے...... ؟ یہ کڑھائی بھی؟" اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں...... خود سیا ہے، خود کاڑھا ہے۔ لیکن......"

"معاف کیجیے گا ماں جی۔ میں ابھی آیا۔" ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اوتار سنگھ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔

سرفراز بیگم کو پھر اندیشے ستانے لگے۔ شاید اسے اچھا نہیں لگا......

لیکن وہ کمرے میں واپس آیا تو وہی کرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ سرفراز بیگم اسے دیکھتی رہ گئیں۔ ویسے بھی وہ بہت خوبصورت اور وجیہہ لڑکا تھا۔ لیکن کرتے اور پائجامے میں تو وہ بہت ہی حسین لگ رہا تھا۔

"اب بتائیں، آپ کیا کہہ رہی تھیں؟" اس نے انھیں چونکا دیا۔

وہ چونکیں تو لیکن اس کیفیت سے نہ نکل سکیں۔ وہ وارفتگی سے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

"میں کہہ رہی تھی کہ یہ سیتے وقت میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمھیں یہ لباس اچھا بھی لگے گا یا نہیں۔" انھوں نے اسی کیفیت میں دل کی بات کہہ دی۔ حالانکہ اب اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔

"اس کا جواب تو عملی طور پر میں دے چکا ہوں۔" اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔ "مگر یہ بتائیں کہ آپ نے یہ بات سوچی کیوں؟"

"میں نے تمھیں کبھی کرتا پہنے ہوئے نہیں دیکھا نا، اس لیے۔"

"ماں جی، یہ تو اتنا خوبصورت اور نفیس ہے اور پھر آپ نے اتنی محبت سے خود سیا ہے اور خود کڑھائی کی ہے کہ میں اسے ہمیشہ فخر اور محبت سے پہنوں گا مجھے تو اس میں ماتا کی نرمی اور ٹھنڈک بھی محسوس ہو رہی ہے۔"

سرفراز بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

"اور میں ایک بات بتاؤں ماں جی۔ میں نے ہمیشہ اچھا لباس پہنا۔ مگر باہر کا سلا ہوا۔ ماتا جی کو سینا آتا ہی نہیں تھا۔ اماں کو بھی میں نے کبھی سلائی کرتے نہیں دیکھا۔ یہ پہلا لباس ہے جو کسی نے میرے لیے اپنے ہاتھوں سے سیا ہے اور یہ اتنی باریک اور نفیس کڑھائی ہے کہ میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ آپ نے اس پر کتنی محنت کی ہے۔ کتنا وقت لگایا ہے۔ یہ تو میری زندگی کا سب سے

قیمتی لباس ہے ماں جی۔"

سرفراز بیگم کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ اچھا قدر داں بھی تھا۔

"مگر یہ بتائیں ماں جی کہ آپ نے میرا ناپ لیے بغیر ٹھیک میرے ناپ کے کپڑے کیسے سی دیے۔ اس پر مجھے حیرت ہے۔"

سرفراز بیگم کا دل محبت اور مامتا سے لبالب بھر گیا۔ "میں تمھیں سچ مچ اپنا بیٹا سمجھتی ہوں چھوٹے ٹھاکر اور کسی ماں کو اپنے بیٹے کا ناپ لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کی نگاہوں کی پیمائش سچی ہوتی ہے۔"

اوتار سنگھ نے اپنا جائزہ لیا۔ پھر پوچھا۔ "میں کیسا لگ رہا ہوں ماں جی؟"

"بہت اچھے...... بالکل مغل شہزادوں کے جیسے۔"

اوتار سنگھ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ "مجھے انعام میں ایسا ہی جوڑا اور دیں گی نا؟"

"ایک نہیں، کئی جوڑے دوں گی انشاء اللہ۔" سرفراز بیگم نے خوش ہو کر کہا۔ پھر بولیں۔ "ارے...... میں نے تمھیں پاس ہونے کی مبارک باد تو دی ہی نہیں۔ بہت بہت مبارک ہو بیٹے۔ اللہ تمھیں ہر امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔"

اوتار سنگھ کے لیے وہ بہت بڑی دعا تھی۔ کیونکہ اس تذکرے پر اسے زندگی کے امتحان کا خیال آ گیا تھا۔

"لیکن بیٹے، مجھے تم سے ایک شکایت ہے۔" سرفراز بیگم نے اچانک کہا۔

اوتار سنگھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "مجھ سے ایسی کیا غلطی ہو گئی ماں جی؟"

"ہو سکتا ہے، تمھارے نزدیک بڑی بات نہ ہو۔ مگر مجھے تو بڑی بات ہی لگی۔ اسی لیے شکایت کر رہی ہوں۔"

"کچھ بتائیں تو ماں جی۔"

اس جذباتی لمحے میں سرفراز بیگم ہر احتیاط بھول گئیں۔ اس وقت وہ بس ایک ماں تھیں، جسے اپنے بیٹے سے بدلحاظی کی شکایت تھی۔ "ادب کا تقاضہ تھا بیٹے کہ تم خود مٹھائی لے کر نیچے آتے، مجھے یہ خوش خبری سناتے اور اپنے ہاتھ سے میرا منہ میٹھا کراتے۔ تم نے تو غیروں کی طرح رنجنا کے ہاتھ مٹھائی اور خوش خبری بھیج دی۔ کیا بیٹے ماں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں؟" وہ جیسے پھٹ پڑیں۔

اوتار سنگھ کا چہرہ فق ہو گیا۔ "آپ کا دل دُکھا ماں جی۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ لیکن میرے اس عمل میں گستاخی اور بے ادبی نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی بدنیتی تھی۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن مجبوری بھی ہوں ماں جی۔"

"تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نیچے...... میرے گھر کبھی نہیں آؤ گے!"

"جی ماں جی۔"

"تو مجھے اس کی وجہ بھی بتادو۔"

اوتار سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی ہچکچاہٹ واضح تھی۔ "یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"میں جاننا چاہتی ہوں۔ یہ ضروری ہے میرے لیے۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتا ماں جی۔ اور سچ بولوں گا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے برا سمجھنے لگیں گی۔"

سرفراز بیگم کا دل دھڑک اٹھا۔ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟ کہیں نور بانو کا خیال درست تو نہیں؟ وہ پریشان ہو گئیں۔ لیکن انھیں اس کی یہ ادا اچھی بھی لگی کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ "سچ بولنے سے کبھی نہیں ڈرو۔ اور ماں کا دل تو بہت بڑا ہوتا ہے۔ وجہ تو تمھیں بتانی ہوگی۔"

"بات یہ ہے ماں جی کہ میں اگر آپ کا بیٹا ہوں تو مجھے گھر کی عزت کا خیال بھی رکھنا ہے۔" اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں آپ کے گھر بیٹے کی طرح آؤں اور پاس پڑوس والوں کے علم میں یہ بات آئے تو باتیں بنیں گی۔ کوئی کسی کی زبان تو پکڑ نہیں سکتا۔ اپنی عزت کا خود خیال رکھنا ہوتا ہے اور اب آپ کے گھر کی عزت میری عزت ہے۔"

اس کی بات کی سچائی نے سرفراز بیگم کے دل کو چھو لیا۔ لیکن انھیں احساس ہو رہا تھا کہ بات صرف اتنی نہیں ہے۔ "اس طرح سوچنا تو تمھاری بڑائی اور اچھائی کی دلیل ہے۔ اس پر میں تمھیں برا کیسے سمجھ سکتی ہوں۔" انھوں نے کہا۔ "بہتر یہ ہے کہ مجھے پوری بات بتاؤ۔"

"آپ مجھ سے وہ کیوں سننا چاہتی ہیں، جو میں کہنا نہیں چاہتا۔" اوتار سنگھ بے بسی سے بولا۔ "میں کہہ رہا ہوں نا کہ میرا آپ کے گھر آنا آپ کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نیچے نہیں آؤں گا۔"

"نہیں۔ مجھے پوری بات بتاؤ۔ ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم مجھے ماں نہیں سمجھتے۔"

"ٹھیک ہے۔ تو سن لیجیے۔" اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "دیکھیے ماں جی۔ آدمی تو خطا کا پتلا ہوتا ہے۔ کچھ پتا نہیں، کب کہاں بہک جائے۔ میں بہن سے محروم رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بھائی بہنوں کے ساتھ کیسے ہوتے ہیں۔ بہنوں کے ساتھ کیسا رویہ ہوتا ہے ان کا۔ اور میں بھی آدمی ہوں۔ کبھی میری نظر بھی بہک گئی، چاہے ایک لمحے کے لیے بہکے، تو میں تو ساری زندگی کے لیے اپنی نگاہوں میں گر جاؤں گا۔ مجھے ہمیشہ پچھتاوا رہے گا کہ ماں جی نے مجھ پر بیٹے کا سا اعتبار کیا اور میں نے اس اعتبار کو دھوکہ دیا اور اس شرمندگی میں میں آپ کو بھی کھو بیٹھوں گا۔ میں جانتا ہوں ماں جی کہ کوئی بھی انسان کسی بھی لمحے کسی کمزوری کا شکار ہو سکتا ہے۔ میں خود کو ایسی کسی آزمائش میں کیوں ڈالوں، جس میں ہار کر میں محبت کرنے والی ماں کو کھو بیٹھوں۔"

سرفراز بیگم مبہوت ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کتنا اچھا تھا...... کتنا سمجھ دار...... کتنا حساس۔ اور اتنی سی عمر میں وہ دور اندیش بھی ہے۔ اتنے آگے تک کی کیسے سوچ لیتا ہے۔ اور وہ کیسا

سچ بولنے والا ہے کہ اس نے اتنا بڑا سچ بول دیا اور وہ کتنے لحاظ والا ہے۔ اس نے صرف اپنی کمزوری کی بات کی۔ یہ نہیں کہا کہ ان کی کسی بچی پر بھی کوئی کمزوری حاوی آ سکتی ہے...... اور اس کے نتیجے میں بھی شرمندہ وہی ہوگا۔ واقعی...... اس کے لیے تو ان کے گھر آنا جانا ہر طرح سے خسارے کا سودا تھا۔

خاموشی گہری اور طویل ہو گئی تھی۔ اوتار سنگھ مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ نظریں اٹھانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اور سرفراز بیگم کی خاموشی نے اسے چور بنا دیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیسا سوچ رہی ہیں...... ان کا کیا ردِعمل ہے۔ وہ ان کے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔

اور سرفراز بیگم کو اس پر ایسی محبت آئی تھی کہ وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔

وہ کچھ نہ بولیں تو اوتار سنگھ نے نظریں اٹھائے بغیر ڈرتے ڈرتے کہا۔ "کیا میں نے یہ سچ بول کر آپ کو کھو دیا ماں جی؟"

سرفراز بیگم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ چند لمحے تو وہ اس کی بات سمجھیں ہی نہیں۔ بات سمجھ میں آئی تو وہ اٹھیں۔ انھوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھرا اور بے حد محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔ "نہیں بیٹے۔ تم تو مجھے پہلے سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے ہو۔ تم جیسے بیٹے تو نصیب والوں کو ملتے ہیں۔ مجھے تو تم پر فخر ہے بیٹے۔ اب ذرا سر تو اٹھاؤ۔ اِدھر دیکھو تو۔"

اوتار سنگھ نے نظریں اٹھائیں۔ اسے ان کی آنکھوں میں محبت اور ممتا کا سمندر موج زن نظر آیا۔ "شکریہ ماں جی۔" اس نے دھیرے سے کہا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ اب بھی کھسیایا ہوا تھا۔

"ماں اور بیٹے کے درمیان شکریے کا لفظ کبھی نہیں آتا۔"

اس لمحے سرفراز بیگم کے دل میں بے اختیار ایک تند...... بے حد منہ زور خواہش ابھری۔ کاش...... کاش یہ لڑکا مسلمان ہوتا۔ اور وہ اسے داماد بنا لیتیں۔ اس کی اخلاقی خوبیاں قابلِ رشک تھیں۔

اگلے ہی لمحے انھوں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ اپنے اندر کے مسائل میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ باہری دنیا کا اسے کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ باہر کی فضا کتنی بدل رہی ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے نعروں کی آوازیں سن کر وہ چونکا۔ اس نے سماعت پر زور دے کر سننے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے رگھو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تو ہر روز ہوتا ہے مالک۔" رگھو نے کہا۔ "مسلمان جلوس نکالتے ہیں۔ الگ ملک مانگ رہے ہیں نا۔"

اوتار سنگھ کوٹھے پر گیا۔ وہ خاصا بڑا جلوس تھا۔ اس میں بچوں کی اکثریت تھی۔ لیکن بڑے بھی شامل تھے۔ آگے موجود شخص نے سبز رنگ کا ایک پرچم اٹھا رکھا تھا۔ وہ قیادت کر رہا تھا۔ وہ کہتا...... پاکستان کا مطلب کیا...... پیچھے والے ایک آواز ہو کر جواب دیتے ...... لا الہ الا اللہ۔

پاکستان! تو یہ ہے اس ملک کا نام جو یہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ نام اسے اچھا لگا...... اپنا اپنا سا اور پاکستان کا مطلب ہے...... اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یعنی اس ملک میں صرف وہی لوگ ہوں گے، جو عبادت میں اللہ کا شریک کسی کو نہ بنائیں۔ لیکن نجانے کیوں اسے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ اس نعرے میں آدھا کلمہ تھا، پورا نہیں۔ اس نے دل ہی دل میں پورا کلمہ پڑھا۔

جلوس آگے نکل گیا۔ نعروں کی آوازیں دھیمی ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں۔ وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ اس روز پہلی بار اسے احساس ہوا کہ شہر کی فضا میں ایک ممکنہ تبدیلی سانس لے رہی ہے۔ وہ اچھی ہے یا بری، یہ اندازہ وہ نہیں لگا سکتا تھا۔

لیکن چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک اور جلوس نمودار ہوا۔ وہ جوابی جلوس تھا۔ باہر دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ اس جلوس میں ہندو اور سکھ شریک ہیں۔ وہ قریب آئے تو اسے ان کے نعرے سنائی دیے۔ بٹ نہ سکے گا ہندوستان۔ بٹنے نہ دیں گے پاکستان۔ اس دھرتی سے نکلو مُسلو۔ ہندوستان ہمارا ہے۔ اپنا ترنگا اپنی آن، بھارت ماتا اپنے پران۔

دونوں جلوسوں کا تضاد بے حد واضح تھا۔ ایک طرف کے نعروں میں ایک وطن کے خواب کی محبت تھی تو دوسری طرف دہکتی ہوئی شدید نفرت تھی۔ ایک طرف جسمانی حرکات وسکنات کی زبان میں نرمی اور عزم تھا تو دوسری طرف سختی اور جارحیت۔ یہ دو گروہ تھے جو تصادم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ فضا میں جو ممکنہ تبدیلی اسے محسوس ہو رہی ہے، اس میں انسانی خون اور تشدد کی بو رچی ہوئی ہے۔

وہ نیچے چلا آیا۔ لیکن وہ نہایت فکرمندی سے اسی بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

اس روز اس نے رگھو سے ماسٹر جی کے بارے میں پوچھا۔ ”ماسٹر جی جاتے وقت تمھیں اپنے گھر کا پتا تو دے کر گئے ہوں گے؟“

”نہیں مالک۔“

”تم نے پوچھا بھی نہیں۔“

”پوچھا تھا مالک۔ وہ بولے، پتے کا تمھیں کیا کرنا ہے۔ میں خود ہی دو چار دن میں واپس آ جاؤں گا۔“

اور اب اس بات کو تقریباً دو مہینے ہو گئے تھے اور وہ واپس نہیں آئے تھے۔ اوتار سنگھ کو تشویش ہونے لگی۔ کہیں ماسٹر جی زیادہ بیمار تو نہیں ہو گئے۔ ورنہ وہ آ جاتے۔ کہیں وہ......؟ اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک ہی جگہ ایسی تھی، جہاں سے اسے ماسٹر جی کا پتا معلوم ہو سکتا تھا۔ ماسٹر جی اسی اسکول میں پڑھاتے رہے تھے، جس میں وہ پڑھتا تھا۔ جب وہ پتا جی کے ساتھ گاؤں آئے تو ریٹائر ہو چکے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے ہی ماسٹر جی کو پتا جی سے متعارف کرایا تھا اور ان کی سفارش کی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ہی ماسٹر جی کا پتا معلوم ہو سکے گا۔ لیکن ان دنوں اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ اسکول اب یکم اگست کو کھلے گا۔ تبھی کچھ معلومات ہو سکیں گی۔

❁……❁……❁

کالج کھل گئے۔ ابتدا میں تو پڑھائی ویسے بھی کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ اب پڑھائی کا ماحول ہے ہی نہیں۔ وہاں تو اب سیاسی گفتگو زیادہ ہوتی تھی۔ ٹیچرز کو بھی پڑھانے میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ادھر دوستوں کے دلوں میں بھی دوری ہو گئی تھی۔ محمود اور رام گوپال اب بھی ساتھ بیٹھتے تھے۔ اختلاف رائے تو ان کے درمیان پہلے ہی تھا۔ لیکن اب ان کے درمیان نفرت اور شدید کھنچاؤ تھا۔ درحقیقت وہ دو ایسی قوموں کے نمائندے تھے، جو ایک بے حد دھماکہ خیز تصادم کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

اوتار سنگھ کو گرد و پیش سے ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ وہ اندر کی دنیا میں دلچسپی لینے والا ایسا شخص تھا، جو اندر کی دنیا کو باہر کے حوالوں سے اور باہر کی دنیا کو اندر کے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ حالاتِ حاضرہ سے اتنا بے خبر بیٹھا رہا۔ اپنے اندر کی دنیا میں مگن، اندر کی دنیا کے مسائل میں گم۔

یہ جولائی 46ء کا عرصہ تھا۔ اس عرصے میں وہ خود پسند (Introvert) نہیں رہا، Extrovert ہو گیا۔ اندرونی دنیا کے باطنی مسائل دب کر رہ گئے۔ اس لیے کہ اب اس کے پاس ان پر سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس وقت پورا ملک بارود کے سلگتے ہوئے ڈھیر پر بیٹھا تھا اور کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ بڑے پیمانے پر خون ریزی کا خدشہ اسے حقیقت میں بدلتا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس صورتِ حال سے بے تعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں آدمی کنارہ کش ہو کے، غیر جانب دار ہو کے گزارہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ جہاں پوری قوم کا معاملہ ہو، وہاں آدمی چاہے تو بھی غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ کبھی وہ خود بہ خود ملوث ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے، کبھی لوگ زبردستی اسے ملوث کر دیتے ہیں اور ایسی بے اختیاری میں اس بات کی بھی ضمانت نہیں ہوتی کہ وہ درستی پر ہے۔ اس لیے اوتار سنگھ صورتِ حال کو پوری طرح سمجھنا اور اس کے بارے میں درست فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ تا کہ اگر کسی بھی مرحلے پر، کسی بھی حد تک اسے کسی فریق کا ساتھ دینا پڑے تو وہ غلطی نہ کرے۔ اس کا ساتھ دے، جس کا موقف درست اور جائز ہو۔

اس کے نتیجے میں وہ اخبارات میں دلچسپی لینے لگا۔ اور اخبارات بھی وہ دونوں جانب

کے پڑھتا تھا۔

اخبارات پڑھنے شروع کیے تو اسے حیرت بھی ہوئی اور خود پر افسوس بھی ہوا۔ اتنا کچھ ہو چکا تھا اور اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ پاکستان کو وہ مسلمانوں کا خواب سمجھتا تھا۔ لیکن صورتِ حال بتاتی تھی کہ مسلمان تیزی سے تعبیر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ بات طے تھی کہ انگریز رخصت ہونے والے ہیں۔

16 مئی کو کیبنٹ پلان سامنے آیا۔ اس میں انگریزوں نے تقسیم ہند اور قیام پاکستان مسترد کر دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے شدید ردِعمل نے انھیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے ملک کو تین گروپس میں تقسیم کر دیا۔ پہلے گروپ میں مدراس، بمبئی، متحدہ صوبے، مرکزی صوبے، بہار اور اڑیسہ شامل تھے۔ یہ ہندوؤں کے اکثریتی علاقوں کا گروپ تھا۔ دوسرے گروپ میں پنجاب، اور صوبہ سرحد تھے۔ یہ مسلمانوں کے مغربی اکثریتی علاقوں کا گروپ تھا۔ تیسرے گروپ میں بنگال اور آسام تھے۔ یہ مسلمانوں کے مشرقی اکثریتی علاقوں کا گروپ تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ تینوں گروپ ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کے تحت چلیں۔ دفاع، خارجہ اور مواصلات، یہ تین شعبے مکمل طور پر اس وفاق کے اختیار میں ہوں۔ باقی اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔

کیبنٹ پلان کے دو حصے تھے۔ ایک دستور ساز اسمبلی سے متعلق تھا اور طویل المیعاد تھا۔ دوسرا عبوری حکومت سے تعلق رکھتا تھا اور مختصر المیعاد تھا۔ کیبنٹ مشن نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس پلان کو مسترد کیا جائے یا قبول کیا جائے تو مکمل طور پر۔ اور اگر بڑی سیاسی جماعتیں اس عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کریں گی تو وائسرائے کو اختیار ہوگا کہ اپنی مرضی کے کسی بھی گروپ کو حکومت بنانے کی دعوت دے۔

مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے یہ اسکیم قبول کر لی۔ وائسرائے نے محمد علی جناح کو یقین دہانی کرائی کہ عبوری حکومت 12 ارکان پر مشتمل ہوگی۔ ان میں 5 کانگریس کے 5 مسلم لیگ کے، ایک سکھوں کا اور ایک ہندوستانی عیسائیوں کا نمائندہ ہوگا۔ جبکہ کانگریس 5 کانگریسی اراکین (تمام ہندو) 4 مسلم لیگی اراکین، ایک غیر مسلم لیگی مسلمان رکن، ایک غیر کانگریسی ہندو رکن، ایک شودر، ایک انڈین عیسائی، ایک سکھ اور ایک کانگریسی عورت پر مشتمل 15 رکنی کابینہ کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس ڈیڈ لاک کو ختم کرنے کے لیے وائسرائے نے 16 جون کو کچھ تجاویز پیش کیں۔ ان کی رو سے عبوری حکومت 14 اراکین پر مشتمل ہوگی۔ جن میں 6 کانگریسی، 5 مسلم لیگی، ایک سکھ، ایک انڈین عیسائی اور ایک پارسی شامل ہوگا۔ مسلم لیگ نے یہ تجویز قبول کر لی۔ لیکن کانگریس نے اس بنیاد پر اسے مسترد کر دیا کہ اس میں قوم پرست مسلمانوں کا کوئی نمائندہ نہیں ہے۔

وائسرائے نے کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی بڑی پارٹی اس تجویز کو قبول نہیں کرتی تو بھی حکومت

تشکیل دیتے وقت کوشش کی جائے گی کہ وہ ممکنہ طور پر تمام سیاسی طبقوں کی نمائندہ حکومت ہو۔

کانگریس کے انکار کے بعد مسلم لیگ کو توقع تھی کہ وائسرائے کانگریس کے بغیر عبوری حکومت تشکیل دے گا۔ لیکن وائسرائے کے پیچھے ہٹنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا جھکاؤ کانگریس کی طرف ہے۔ چنانچہ 27 جولائی کو مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجاویز قبول کرنے سے انکار کر دیا اور 16 اگست کو برطانوی حکومت کے خلاف راست اقدام کا دن منانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے فوراً بعد کلکتہ میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ بڑی تعداد میں مسلمان مارے گئے۔

ان فسادات نے اوتار سنگھ کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرنے میں حق بہ جانب ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا، تو ہندو اپنی اکثریت کی بنیاد پر مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھیں گے اور انھیں کچل ڈالیں گے۔

❀……❀……❀

یکم اگست کو اسکول کھل گئے۔ اوتار سنگھ ہیڈ ماسٹر سے ملنے کے لیے گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے اسے بڑی عزت سے بٹھایا۔ ''کیسے ہو اوتار سنگھ؟''

''جی ٹھیک ہوں۔''

''ہماری یاد کیسے آ گئی؟''

اوتار سنگھ شرمندہ ہو گیا۔ ''اس اسکول کو اور آپ سب اساتذہ کو تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ علم حاصل کرنا آپ ہی لوگوں سے سیکھا ہے میں نے۔''

''ہمیں تم پر فخر ہے اوتار سنگھ۔ تم بہت ہونہار شاگرد ہو۔'' ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''تمھارے پتا جی کیسے ہیں؟''

''ان کا تو دیہانت ہو گیا سر۔'' اوتار سنگھ نے انھیں تفصیل بتائی۔

''مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔'' ہیڈ ماسٹر نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

''میں آپ کے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔''

''کہو...... میں کیا کر سکتا ہوں تمھارے لیے۔''

''میرے استاد تھے، جن کی سفارش آپ نے کی تھی۔ وہ اس اسکول سے ہی ریٹائر ہوئے تھے...... کانتی پرشاد جی۔''

''ہاں...... ہاں، مجھے یاد ہے۔''

''مجھے ان کا پتا چاہیے۔''

''پتا؟ وہ تو شاید پرانے ریکارڈ میں ہی مل سکے گا۔ اچھا...... میں دیکھتا ہوں۔'' انھوں نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا تو انھوں نے ایک پرچے پر کچھ لکھ کر اسے دیا۔ ''یہ بنسی دھر کے پاس

لے جاؤ۔ اس سے کہو، یہ فوری طور پر چاہیے۔''

چپراسی چلا گیا۔

''آدھے گھنٹے کے بعد بنسی دھر خود آیا اور کانتی پرشاد جی کا پتا ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔

اوتار سنگھ ہیڈ ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل آیا۔

❀......❀......❀

وہ اچھا خاصا مکان تھا۔ اوتار سنگھ نے دروازے پر دستک دی تو سات آٹھ سال کا ایک لڑکا سامنے آیا۔

''کانتی پرشاد جی یہیں رہتے ہیں نا؟'' اوتار سنگھ نے اس سے پوچھا۔

''یہ نام تو میں نے کبھی نہیں سنا۔''

اوتار سنگھ گڑبڑا گیا۔ ''تمھارے پتا جی کا کیا نام ہے؟'' اسے یہ ڈر تھا کہ پرانا پتا ہے۔ نجانے اب ماسٹر جی وہاں رہتے بھی ہوں گے یا نہیں۔

''رام پرشاد۔''

اسی لمحے اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''گنگا...... او گنگا۔ کون آیا ہے رے؟''

پھر اس جوان عورت نے قریب آ کر باہر جھانکا۔ ''کون ہیں آپ؟ کس سے ملنا ہے؟'' اس نے اوتار سنگھ سے پوچھا۔

''کانتی پرشاد جی سے۔''

''کون کانتی پرشاد...... ارے...... تم کہیں باپو کو تو نہیں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ اسکول میں پڑھاتے تھے۔''

عورت نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تم انھیں کیسے جانتے ہو؟''

اوتار سنگھ کو یہ بات عجیب لگی کہ وہ دروازے پر کھڑی تفتیش کر رہی ہے۔ پہلے تو وہ کانتی پرشاد جی کو ان کے نام سے بھی نہیں پہچانتی تھی۔ ''میں ان کا شاگرد ہوں۔ کئی سال سے وہ میرے ساتھ رہے ہیں......''

''ارے...... تو وہ تم ہو۔ آؤ...... اندر آؤ۔''

وہ اسے اندر لے گئی۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی خاصا بڑا صحن تھا۔ صحن کے پار سامنے کے رخ پر کمرے بنے ہوئے تھے۔ کونے والے کمرے کے پہلو میں زینہ تھا۔ اوپر بھی دو کمرے بنے تھے۔

وہ اسے نیچے کے ایک کمرے میں لے گئی۔ اب اس کا انداز بدل گیا تھا۔ ''آپ یہاں بیٹھیے۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے لیے شربت لاتی ہوں۔''

اوتار سنگھ نے کھڑے کھڑے کمرے کا جائزہ لیا۔ ''سنیے...... ماسٹر جی کہاں ہیں؟ مجھے

ان سے ملنا ہے۔'' اس نے کہا۔

وہ کمرے سے جاتے جاتے پلٹی۔ ''وہ...... وہ تو......'' وہ کہتے کہتے رکی۔ اوتار سنگھ کا دل گھبرانے لگا۔ کہیں ماسٹر جی......؟

''وہ تو اپنے کمرے میں ہیں۔'' بالآخر اس نے جملہ پورا کیا۔

''مجھے ان سے ملوا دیجیے۔'' اوتار سنگھ نے لجاجت سے کہا۔ ''میں ان کے لیے ہی آیا ہوں۔''

''میں ابھی شربت لائی۔ آپ پی لیں۔ پھر ان سے مل لیجیے گا۔''

''شربت کی کچھ ایسی ضرورت نہیں اور وہ میں ان کے کمرے میں ہی پی لوں گا۔''

اس کا منہ کھل گیا۔ نجانے وہ حیرت تھی یا خوف۔ ''آپ یہیں پی لیں۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ جھنجلا گیا۔ ''شربت کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں یہاں ماسٹر جی سے ملنے آیا ہوں۔ آپ مجھے ان سے ملوا دیں۔''

''اچھا، آئیں میرے ساتھ۔'' عورت کے انداز سے لگا کہ وہ اپنی جھنجلاہٹ اور غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔

وہ صحن میں آئے۔ عورت نے سامنے ایک چھوٹی سی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ وہاں ہیں۔ جاؤ ان سے مل لو۔''

اوتار سنگھ کو وہ کوٹھری دور سے ہی عجیب لگی۔ اتنے کمروں کے ہوتے ہوئے ماسٹر جی اس تنگ کوٹھری میں کیوں رہ رہے ہیں۔ بہرحال وہ اس طرف بڑھنے لگا۔ درمیان میں اس نے پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ عورت اب بھی دروازے پر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے پایا تو اس نے منہ پھیر لیا، اور کمرے میں چلی گئی۔

اوتار سنگھ کوٹھری کے دروازے پر ٹھٹھکا۔ اندر اندھیرا تھا۔ بالآخر اس نے اندر قدم رکھا۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ مگر پھر چند لمحوں میں اس کی نظر اندر کے اندھیرے سے ہم آہنگ ہو گئی۔ تب جو کچھ اس نے دیکھا، اس نے اسے دہلا دیا۔

کوٹھری اس کے اندازے سے بھی بڑھ کر تنگ تھی۔ کونے میں دیوار سے ایک جھلنگا چارپائی تھی، جس پر ایک استخوانی وجود بکھرا ہوا تھا۔ نقوش نظر آنے کے باوجود وہ ماسٹر جی کو پہچان نہیں سکا۔ وہ تو جیسے چرمرا کر رہ گئے تھے۔ چہرے پر بھی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں تھا اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔

وہ بے تابی سے ان کی طرف لپکا۔ چارپائی کی پٹی پر ٹکتے ہوئے اس نے ان کے ہاتھ

تھام لیے۔ ''ماسٹر جی...... ماسٹر جی...... یہ کیا ہو گیا آپ کو؟''

ماسٹر جی نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز میں بولے۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں ماسٹر جی اوتار سنگھ۔''

ماسٹر جی نے پہلو بدلنے کی ناکام کوشش کی اور اسے بہت غور سے دیکھا۔ ''تم...... تم یہاں کیوں آ گئے بیٹے۔''

باہر سے گنگا نامی بچے کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکار رہا تھا۔ ''بابو جی...... بابو جی...... یہ کرسی لے لو۔''

اوتار سنگھ نے دروازے کی طرف رخ کر کے جواب دیا۔ ''اندر لے آؤ۔''

''میں اندر نہیں آ سکتا بابو جی۔ آپ آ کر کرسی لے لو۔''

''اندر نہیں آ سکتے تو واپس لے جاؤ۔'' اوتار سنگھ نے جھنجلا کر کہا۔ پھر وہ ماسٹر جی کی طرف مڑا۔ ''یہ سب کیا ہے ماسٹر جی۔ اور آپ کا اتنا برا حال ہے......''

''مجھے...... مجھے...... ٹی بی...... ہو گئی ہے۔'' ماسٹر جی نے اٹک اٹک کر کہا۔

اوتار سنگھ کے لیے وہ ایسا دھماکہ تھا کہ چند لمحے کو اسے لگا کہ اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ وہ رونے لگا۔ شاید اس وقت وہ نہ روتا تو اسے کچھ ہو جاتا۔ ''میں بہت برا ہوں...... بہت غیر ذمے دار ہوں ماسٹر جی۔''

''ایسا نہ کہو بیٹے......''

''دو مہینے ہو گئے اور میں نے آپ کی خبر تک نہیں لی۔ یہ غیر ذمے داری ہی تو ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''لیکن آپ واپس کیوں نہیں آ گئے؟''

''اس بیماری کے ساتھ کیسے آتا۔'' ماسٹر جی کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''یہ تو لگنے والی بیماری ہے بیٹے۔'' اچانک وہ چونکے۔ ''یہاں سے اٹھ جاؤ بیٹے۔ تمھیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھیں یہ بیماری لگے......''

''مجھے کچھ نہیں ہو گا ماسٹر جی۔'' اوتار سنگھ نے تڑپ کر کہا۔ ''اور ہو جائے تو بھی مجھے پروا نہیں۔ آپ نے مجھے علم جیسی دولت دی ہے۔ اگر مجھے آپ کی بیماری لگ جائے تو مجھے قبول ہے......''

''میرے اپنے بچے بھی میرے پاس نہیں آتے۔'' ماسٹر جی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور رونے لگے۔

اوتار سنگھ نے کوٹھری کا تفصیلی جائزہ لیا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ لوہے کے کچھ پرانے ٹرنک اوپر تلے رکھے تھے۔ ان کے پاس چند گٹھریاں تھیں۔ ایک ناکارہ سلائی کی مشین بھی پڑی تھی۔ گرد کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مدت سے وہاں جھاڑو نہیں دی گئی۔ کوٹھری میں کوئی کھڑکی،

کوئی روزن نہیں تھا۔ گھٹن بہت زیادہ تھی۔ ہوا کا کوئی گزر ہی نہیں تھا۔ دھوپ بھی صرف صبح کے وقت تھوڑی دیر کے لیے آتی ہو گی۔

پٹی پر بیٹھے بیٹھے اس کی کمر دکھ گئی تھی۔ اس نے پہلو بدلا تو اس کے پاؤں برتن سے ٹکرائے۔ اس نے نیچے دیکھا۔ وہ ایک پلیٹ تھی، جس میں تھوڑی سی دال بچی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک چنگیر تھی، جس میں موجود آدھی روٹی سوکھ کر لکڑی ہو چکی تھی۔ وہ برتنوں کو اٹھانے کے لیے جھکا تو اسے وہ بڑا تسلا نظر آیا، جو یقیناً تھوکنے کے کام آتا تھا۔ وہ بہت گندا ہو رہا تھا۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں لمحوں میں سب کچھ آ گیا۔ ماسٹر جی کا دکھ، ان کا رونا۔ انھوں نے اپنے بچوں سے بہت محبت کی تھی۔ ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ کئی برس وہ اس کے ساتھ رہے۔ پتا جی انھیں معقول فیس دیتے تھے اور ماسٹر جی کے اپنے اخراجات نہیں تھے۔ وہ سب کچھ بچوں کو بھیج دیا کرتے تھے۔ مگر آج ان پر وقت پڑا تھا تو ان کے بچوں نے انھیں کاٹھ کباڑ کی طرح اس کوٹھری میں پھینک دیا تھا۔ اچھوت بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ان کے بچوں کو نقصان کا احساس ہو رہا ہو گا۔ وہ ایک باقاعدہ آمدنی سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ الٹا ماسٹر جی ان پر بوجھ ہو گئے تھے۔

اچانک ماسٹر جی پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ ان سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اوتار سنگھ نے سہارا دے کر انھیں اٹھایا۔ پھر اس نے تسلا ان کے سامنے رکھ دیا۔ کھانسی کے دورے کے باوجود ماسٹر جی نفی میں سر ہلائے جا رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس تسلے کو چھوئے بھی۔

''آپ میری فکر نہ کریں ماسٹر جی۔ تھوک دیں۔''

مجبور ہو کر ماسٹر جی نے تسلے میں تھوکا۔ کھانسی کا دورہ رکا تو ماسٹر جی کا چہرہ تھوک سے لتھڑ چکا تھا۔ اوتار سنگھ نے رومال نکالا اور ان کا منہ پونچھ دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ابھی آتا ہوں ماسٹر جی۔''

وہ کوٹھری سے نکلا۔ عورت اور بچہ کچھ دور کھڑے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل آیا۔

❀......❀......❀

ڈاکٹر نے جتنی دیر ماسٹر جی کا معائنہ کیا، اس سے زیادہ دیر تک کوٹھری کا تفصیلی جائزہ لیا۔ پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ یہاں کب سے ہیں؟''

اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ آخر اس نے جواب دیا۔

''ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا ہو گا۔''

''آپ کیسے بیٹے ہیں۔'' ڈاکٹر نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس بیماری میں ایسے ماحول میں رہنا ان کے لیے مہلک ہے۔ کیا آپ یہ بات نہیں سمجھتے؟ یہ گرد، یہ گندگی ان کے مرض کو اور بڑھا دے گی۔ انھیں صاف ستھرے ماحول، روشنی، تازہ ہوا اور اچھی غذا کی ضرورت ہے۔ ان

کے لیے یہ چیزیں دوا سے بڑھ کر ہیں اور آپ نے انھیں اس کوٹھری میں مرنے کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔"

اوتار سنگھ نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ کانتی پرشاد جی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر اسی لمحے کمرے میں ایک جوان آدمی داخل ہوا۔ اس میں ان کے پرانے دور کی شباہت تھی۔ اس نے منہ پر رومال رکھا ہوا تھا۔ "تم کون ہو؟" اس نے آتے ہی گھٹی گھٹی آواز میں اوتار سنگھ سے پوچھا۔

"میں اوتار سنگھ ہوں...... ماسٹر جی کا شاگرد۔" اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ کے پاس آنے سے پہلے ماسٹر جی میرے ہی پاس رہتے تھے۔"

"میں بدری پرشاد ہوں...... ان کا بیٹا۔" جوان آدمی نے کانتی پرشاد جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اوتار سنگھ کے ساتھ اس کا رویہ اب مودبانہ تھا۔

ڈاکٹر حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ "آئی ایم سوری مسٹر اوتار سنگھ۔ میں نے بلاوجہ آپ کو برا بھلا کہا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں واقعی اپنی غفلت اور بے خبری پر شرمندہ ہوں۔ دو مہینے میں ماسٹر جی کو بھولا رہا۔ میں قصوروار ہوں۔"

"بہرحال جو کچھ میں نے آپ سے کہا، اصولاً مجھے ان سے کہنا چاہیے تھا۔" ڈاکٹر نے بدری پرشاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ "لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان پر کچھ اثر ہوگا۔"

بدری پرشاد کھسیا گیا۔ "دیکھیے، ہم سے جو بن پڑا، ہم نے کیا۔ اپنی حیثیت کے مطابق ڈاکٹر کو دکھایا، دوا دی۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں۔ یہ مرض ہی لاعلاج ہے۔"

"آپ کی حیثیت کا مجھے علم نہیں۔" ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "لیکن جو آپ نے کہا، وہ بھی دیکھ رہا ہوں۔ آپ کے منہ سے تو ابھی تک رومال بھی نہیں ہٹا۔ انھیں یہاں جس طرح کھانا دیا جا رہا ہے، اس کا آپ کی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں اور آپ کے انداز سے مجھے پتا چل گیا کہ انھیں یہاں پھینکنے کے بعد آپ پہلی پہلی بار آئے ہیں۔ ذرا یہ تو بتائیں، انھیں کھانا دینے کون آتا ہے یہاں؟"

"گھر کی ملازمہ ہے......"

"وہ آپ کی حیثیت کا ثبوت ہے اور یہ جس حال میں ہیں، اس سے آپ کی سنگ دلی ظاہر ہوتی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ پھر وہ اوتار سنگھ کی طرف مڑا۔ "باہر چلیں۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ بدری پرشاد ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

دروازے پر پہنچ کر ڈاکٹر رکا۔ "ان کا مرض بہت بڑھ چکا ہے۔ اب آپ ان کے ساتھ ایک ہی بھلائی کر سکتے ہیں۔"

"بتائیے ڈاکٹر صاحب۔"

ڈاکٹر اب بدری پرشاد کو پوری طرح نظرانداز کر رہا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم، آپ افورڈ کر سکیں گے یا نہیں۔"

"ماسٹر جی کے لیے میں سب کچھ افورڈ کر سکتا ہوں۔" اوتار سنگھ نے کہا۔ "آپ بتائیے تو۔"

"جتنی جلد ہو سکے، انھیں کسی پہاڑی مقام پر لے جائیں۔ کسی سینی ٹوریم میں داخل کرا دیں۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ کوئی مقام تجویز کریں۔"

"شملہ بہتر رہے گا۔ آپ کہیں تو میں وہاں کے ایک سینی ٹوریم کو لیٹر لکھ دوں گا۔"

"تو آپ لکھ دیں۔ میں ماسٹر جی کو کل ہی لے جاؤں گا۔"

بدری پرشاد کو توہین کا احساس ہونے لگا۔ "آپ لوگ یوں فیصلے کر رہے ہیں، جیسے پتا جی کا کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر......"

"میں ان کے پوچھنے والوں کو دیکھ چکا ہوں۔" ڈاکٹر نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔ "برسوں بعد آپ اس حال کو پہنچیں اور آپ کی اولاد آپ کو اس طرح رکھے تو آپ کی سمجھ میں یہ سب کچھ زیادہ آسانی سے آ جائے گا۔"

"آپ کچھ بھی کہیں، ہماری مرضی کے بغیر آپ پتا جی کو کہیں نہیں لے جا سکتے۔"

"آپ ماسٹر جی کے بیٹے ہیں۔ ان کے حوالے سے میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔" اوتار سنگھ نے بدری پرشاد سے کہا۔ "آپ سے بعد میں بات ہو جائے گی۔" پھر وہ ڈاکٹر کی طرف مڑا۔ "ڈاکٹر صاحب کل مجھے سفارشی خط مل جائے گا؟"

"جی ہاں۔ میرے مطب سے لے لیجیے گا اور ہاں میں کچھ دوائیں لکھ رہا ہوں۔ وہ انھیں دیتے رہیے۔" ڈاکٹر نے دواؤں کا پرچا لکھا اور اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اوتار سنگھ بدری پرشاد کی طرف مڑا۔ "اب فرمائیے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ پتا جی یہیں رہیں اور ان کا علاج بھی ہوتا رہے۔"

بات اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ خودغرض بیٹا اب باپ کی بیماری سے منفعت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پیسہ اوتار سنگھ کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن وہ ماسٹر جی کی سنگ دل اولاد کو کچھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "[illegible] نے ڈاکٹر کی بات توجہ سے نہیں سنی۔ [illegible] اسے ماسٹر

جی کے ساتھ آخری بھلائی کہا ہے۔‘‘
’’ڈاکٹر تو کہتے ہی رہتے ہیں۔‘‘ بدری پرشاد نے بے پروائی سے کہا۔
اوتار سنگھ اسے باپ کی طرف سے بے پروائی اور بے حسی کا طعنہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ’’فیصلہ ماسٹر جی خود کرلیں گے۔‘‘
وہ دونوں پھر کوٹھری میں چلے آئے۔ بدری پرشاد نے پھر منہ پر رومال رکھ لیا تھا۔ اوتار سنگھ نے کانتی پرشاد جی سے کہا۔ ’’ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس کے لیے آپ کو کسی پرفضا مقام پر جانا ہوگا۔‘‘
کانتی پرشاد جی اسے دیکھتے رہے۔ بولے کچھ نہیں۔
’’اب آپ کے سامنے تین راستے ہیں۔‘‘ اوتار سنگھ نے کہا۔ ’’شملہ چلے جائیں۔ وہاں ہر طرح سے آپ کا خیال رکھا جائے گا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر ہفتے آپ سے ملنے آیا کروں گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میرے گھر چلیں اور مجھے خدمت کا موقع دیں۔ تیسری تجویز میری نہیں، آپ کے بیٹے کی ہے۔ آپ یہیں رہیں۔ میں آپ کا علاج کراؤں گا۔‘‘
’’جینا تو بہت دور کی بات ہے۔ میں ان مورکھوں کے پاس مرنا بھی نہیں چاہتا۔‘‘ کانتی پرشاد جی نے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
’’پتا جی، ہمارے ہوتے ہوئے آپ......‘‘
’’رومال تو منہ سے ہٹا لے مورکھ۔ میرے اس شاگرد نے اپنے ہاتھ میں تسلہ اٹھا کر مجھے تھوکنے کا موقع دیا۔ اپنے رومال سے میرا اتھڑا ہوا منہ صاف کیا۔ اسے بیماری لگنے کا ڈر نہیں۔ اور تم لوگوں نے مجھے جانور سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔‘‘ کانتی پرشاد جی نے اوتار سنگھ کا ہاتھ تھام لیا۔ ’’مجھے اپنے ساتھ لے چلو چھوٹے ٹھاکر۔ میں عزت سے سانس لینا بھی بھول چکا ہوں یہاں۔‘‘
اوتار سنگھ نے بدری پرشاد کو دیکھا۔ ’’اب تو اجازت ہے۔‘‘
بدری پرشاد کھسیا کر رہ گیا۔ اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس کا دل دکھنے لگا۔ وہ پھول جیسے ہلکے تھے۔ انہیں ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے وہ کوٹھری سے نکل آیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

❁......❁......❁

کالج کھلنے کے دن تک اوتار سنگھ کو ارجن کی فکر تھی۔ ارجن ہی جے پور والے راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔ کالج کھلے۔ دو تین دن ہو گئے۔ لیکن ارجن کی صورت نظر نہیں آئی۔ ویسے وہ اس کے دوستوں کے حلقے میں تھا بھی نہیں۔
پھر اس نے ارجن کے متعلق معلوم کیا۔ پتا چلا کہ وہ اب تک آیا ہی نہیں ہے۔ کئی دن تک اسے ہر روز یہ دھڑکا رہتا کہ ابھی ارجن اسے نظر آئے گا اور اس پر جھپٹتے ہوئے کہے گا......

کتنے لوگوں کو ختم کرا دیا تم نے!
لیکن ایسا کبھی ہوا نہیں۔
انسانی فطرت ہے کہ کسی بات کا خوف ہو تو اس کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ لیکن وہ ٹلتی رہے تو دھیرے دھیرے خوف مٹ جاتا ہے۔ یہی اوتار سنگھ کے ساتھ ہوا۔ ویسے بھی اس کا معاملہ تھا بھی کچھ عجیب۔ ایسا کھلا معاملہ جس طرح سے پردے میں رہا تھا، اس سے اسے اس معاملے میں کسی بڑی طاقت کی کارفرمائی کا خیال آتا تھا۔
بہرحال چند ہی روز میں وہ ارجن کو بھول گیا۔ سامنے اور اہم معاملات بھی تھے۔
ماسٹر جی کو وہ شملہ کے سینی ٹوریم میں چھوڑ آیا تھا۔ صرف چھوڑ نہیں آیا تھا، اس نے وہاں دو روز رک کر اطمینان کیا تھا کہ وہاں ماسٹر جی کی بہت اچھی دیکھ بھال ہوگی۔
کالج میں پڑھائی کی صورت حال اب بھی ویسی ہی تھی۔ جہاں پورا ملک بے یقینی اور انتشار کی کیفیت میں ہو، وہاں زندگی بھی رک جاتی ہے۔ ان کے خالی پیریڈز کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ ان کے لائبریری میں جانے اور مطالعہ کرنے کا رجحان کم ہو گیا تھا۔ مطالعہ اخبارات تک محدود ہو گیا تھا۔ باہر لان پر اور کامن روم میں دوستوں کی نشستیں ہوتی تھیں۔ ان میں بھی صرف سیاست پر گرما گرم بحث ہوتی تھی۔
’’جناح بے اصول آدمی ہیں۔‘‘ ایک دن ایسی ہی ایک نشست میں رام گوپال نے اعلان کیا۔
’’تم اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔‘‘ محمود نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔
’’میں نے یہ بات اس وقت کہی تھی، جب مسلم لیگ نے کانگریس کے بغیر عبوری حکومت میں شامل ہونا قبول کیا تھا۔‘‘ رام گوپال نے کہا۔ ’’اصل میں مسلم لیگ یہ چاہتی تھی کہ کانگریس عبوری حکومت میں شامل نہ ہو۔‘‘
’’یہ تجزیہ احمقانہ ہے۔ دراصل یہ سوچ کانگریس کی ہے کیونکہ اس نے ملک میں دو اکثریتی جماعتوں [illegible] جیسی حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ مسلم لیگ کانگریس کے وجود سے انکار نہیں [illegible]۔ اسی کی بنیاد پر دو قومی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ مسلم لیگ ملک کی دوسری بڑی سیاسی جماعت ہے اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اسے ملک کے 90 فیصد سے زیادہ مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔ اب ذرا یہ تو دیکھو کہ کانگریس نے وائسرائے کی تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کس بنیاد پر کیا......؟ اس پر کہ اس میں قوم پرست مسلمانوں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں ہے۔ حالانکہ ایسے نام نہاد قوم پرستوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور کانگریس کو ان کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تو موجود ہے نا۔‘‘
’’کانگریس کسی مذہب کو ماننے والوں کی جماعت نہیں۔‘‘ رام گوپال نے بڑے جوش

سے کہا۔ ''وہ تو پورے ملک کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ کانگریس ایک قومی سطح کی سیاسی جماعت ہے جبکہ مسلم لیگ مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والی غیر مذہبی سیاسی جماعت ہے۔''

''میں تھوڑی دیر کو تمہاری بات مان لوں، تب بھی یہ حقیقت تو نہیں بدلے گی کہ مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد ہیں۔ الیکشن میں مسلم لیگ کے امیدواروں کے سامنے بڑے بڑے لوگوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں......''

''ایک تو تم لوگ بحث کرتے ہوئے موضوع سے ہٹ جاتے ہو۔'' فتح سنگھ نے اعتراض کیا۔

''میں موضوع سے نہیں ہٹ رہا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کانگریس کا یہ مطالبہ کہ عبوری حکومت میں قوم پرست مسلمانوں کا نمائندہ ہونا ضروری ہے، دراصل اپنی Strength بڑھانے کے لیے ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایک کانگریسی مسلمان کو مسلم لیگی کی جگہ دی جائے۔ یوں مسلمانوں کا ایک نمائندہ کم ہوگا اور دوسری طرف ان کی طاقت بڑھے گی۔ یہ کانگریس کی بدنیتی کا ثبوت ہے۔''

''اور یہ مسلم لیگ کی بدنیتی ہے کہ کانگریس کے انکار پر میدان خالی پا کر اس نے اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔'' رام گوپال بولا۔

''یہ تو سیاسی اور جمہوری عمل جاری رکھنے کی کوشش تھی۔ ورنہ انگریز تو یہاں رکنے کا بہانہ چاہتے ہیں۔'' محمود نے کہا۔

''تو اب مسلم لیگ پیچھے کیوں ہٹ گئی؟'' رام گوپال نے اعتراض کیا۔

''اصول کی بنیاد پر وائسرائے نے اپنے موقف سے پیچھے ہٹ کر یہ ثابت کر دیا کہ درپردہ وہ کانگریس سے ملے ہوئے ہیں۔ اس جانب داری کے ساتھ مسلم لیگ عبوری حکومت میں صرف استعمال ہوگی۔''

''اور اس جانب داری کے ساتھ تم ان سے پاکستان مانگ رہے ہو۔'' رام گوپال نے مضحکہ اڑایا۔

''پاکستان تو انھیں دینا پڑے گا۔ پاکستان تو ہم لے کر رہیں گے۔'' ٹھنڈے دل و دماغ سے بات کرنے والا محمود ایک دم جذباتی ہو گیا۔

''تم اصول کی بات کرتے ہو۔ مسلم لیگ نے عبوری حکومت سے منہ موڑ کر ثابت کر دیا کہ وہ کانگریس کے ساتھ کسی پلیٹ فارم پر بھی بیٹھنا نہیں چاہتی۔''

''اور میں کہتا ہوں کہ کانگریس کا اعتراض وائسرائے اور کانگریس کی ملی بھگت تھی...... ڈراما تھا۔ کانگریس یہ چاہتی ہے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے کہیں

نمایاں نہ ہونے پائے۔ اس سازش کے ذریعے انھوں نے مسلم لیگ کے لیے عبوری حکومت میں شامل ہونے کا راستہ ہی نہیں چھوڑا۔''

''تو یہ تدبر کی کمی ہے۔'' رچرڈ اچانک بول پڑا۔ ''مسلم لیگ کا ردعمل وہی رہا جو کانگریس چاہتی تھی۔''

''مجھے یقین ہے کہ لیگی قیادت بالآخر درست فیصلہ کرے گی۔'' محمود نے کہا۔

''فیصلہ کر لیا ہے انھوں نے۔'' رام گوپال نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''16 اگست ڈائریکٹ ایکشن ڈے ہوگا۔''

''میں ایک بات بتاؤں۔'' رچرڈ پارسن بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ آزادی کے قابل نہیں ہو۔ تم میں اختلافِ رائے کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ تمھارے اندر تشدد کا رجحان ہے۔ یہ بہت بڑی آبادی کا ملک ہے، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ کلکتہ میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، وہ گواہی دیتا ہے کہ آزاد ہونے کے بعد تم ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہو گے۔ کہیں اختلافِ رائے کو دبانے کے لیے تو کبھی مذہب کے نام پر۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا پاکستان کا مطالبہ بالکل جائز اور فطری ہے۔ متحدہ ہندوستان میں تو ان کی نسل ہی مٹا دی جائے گی۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ سو سال تک تو اس خطے میں کوئی الیکشن خون ریزی کے بغیر نہیں ہوگا۔''

''تم پورے ہندوستان کی توہین کر رہے ہو۔'' رام گوپال نے مشتعل ہو کر کہا۔

''جو دیکھ رہا ہوں، اس کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ دلیل سے تردید کر سکتے ہو تو کرو۔'' رچرڈ نے چیلنج کیا۔

''تم لوگوں کو سیاست کا ہوکا ہو گیا ہے۔'' امرتا بلبلا کر بولی۔ ''کتنی تکلیف دہ گفتگو کرتے ہو۔ میرے تو سر میں درد ہو گیا۔''

''چلو...... اب چائے پلاؤ۔'' پشپا نے کہا۔

وہ سب کینٹین کی طرف چل دیے۔

❀......❀......❀

سرفراز بیگم کو اس بار ایسا سکون آیا تھا کہ کوئی خلش ہی نہیں رہی تھی۔ وہ پوری طرح سے مطمئن ہو گئی تھیں۔ اسی لیے انھوں نے بچیوں سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ حالانکہ بچیاں توقع کر رہی تھیں۔

وہ کچھ بدل گئی تھیں۔ چھوٹے ٹھاکر کا تذکرہ کرنا انھوں نے چھوڑ دیا تھا۔ بچیاں ان کی تبدیلی کو گہری نظر سے دیکھ رہی تھیں۔

ایک دن اس طرح گزر گیا۔ اگلے دن دوپہر کے کھانے کے بعد تینوں بہنیں ساتھ بیٹھی

تھیں۔ سرفراز بیگم دوپہر کے کھانے کے بعد آدھے گھنٹے لیٹنے کی عادی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں تھیں۔

"خلافِ معمول بات نور بانو نے چھیڑی۔" پرسوں اماں اوپر سے ہو کر آئی ہیں تو چپ چپ ہیں۔"

"ہاں آپی، انھوں نے کوئی بات ہی نہیں کی۔"

"مجھے لگتا ہے، غبارے سے ہوا نکل گئی ہے۔" نور بانو نے کہا۔

"کیا مطلب؟" حور بانو نے تنک کر پوچھا۔

"میری بات کی تصدیق ہو گئی ہو گی کسی طرح۔" نور بانو بولی۔ "ورنہ اماں تو اوپر سے آتے ہی چھوٹے ٹھاکر کا قصیدہ پڑھتی تھیں۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ اماں اس معاملے میں ہم سے خفا ہیں...... تمہاری وجہ سے۔" حور بانو نے اسے الزام دیا۔

"جی نہیں۔ میرے کہنے سے کچھ فرق پڑتا تو وہ اوپر جانا ہی چھوڑ دیتیں۔" نور بانو نے تنک کر کہا۔

"دو دن ہو گئے۔ وہ اوپر نہیں گئی ہیں۔" گلنار بولی۔

"اگر وہ اوپر نہیں جاتیں تو سمجھ لو کہ چھوٹے ٹھاکر کی اصلیت کھل گئی ہے۔ میرا کوئی بیچ نہیں اس میں۔"

لیکن اسی شام سرفراز بیگم اوپر چلی گئیں۔

اس بار بھی ان کا رویہ پہلے والا تھا۔ لڑکیاں پھر سر جوڑ کر بیٹھیں۔ "مجھے نہیں لگتا کہ کوئی بڑی بات ہے۔" حور بانو نے کہا۔ وہ نور بانو سے مخاطب تھی۔ "اگر تمہارا اندازہ درست ہوتا تو اماں اوپر جاتی ہی نہیں۔"

"میں اماں کو سمجھتی ہوں۔" نور بانو کے لہجے میں فخر تھا۔ "کوئی بڑی بات ہو جائے تو بھی اوپر جانا نہیں چھوڑیں گی۔ ان کی طبیعت میں وضع داری ہے۔ اسے بیٹا کہا ہے تو عمر بھر نبھائیں گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسے نیچے نہیں آنے دیں گی۔"

"تم سے تو بس کوئی افسانہ نگاری کرا لے۔" حور بانو نے بھنا کر کہا۔ "بے پر کے بھی کوا بنا ڈالتی ہو۔"

"میری سمجھ میں بات آ رہی ہے۔" اچانک گلنار نے کہا۔

"لو...... بھائی کی آرزومند بہن بھی بولی۔" نور بانو نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"کیوں...... یہ کیوں نہیں بول سکتی۔" حور بانو فوراً چھوٹی بہن کی حمایت میں ڈٹ گئی۔

"ہاں گلنار...... بتاؤ، تمہاری سمجھ میں کیا آیا ہے؟"

"اس بار جو اماں اوپر گئی تھیں تو چھوٹے ٹھاکر کے لیے کرتا پائجامہ لے کر گئی تھیں۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔" حور بانو نے کہا۔

"وہ کرتا جو انھوں نے ایک مہینے کی مشقت کے بعد کاڑھا تھا......" نور بانو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"جی...... اور بہت خوبصورت کاڑھا تھا۔" گلنار نے جلدی سے وضاحت کی۔

"تم کچھ کہہ رہی تھیں۔" حور بانو نے گلنار کو آنکھیں دکھائیں۔

"میرا خیال ہے باجی کہ چھوٹے ٹھاکر کو امی کا وہ تحفہ اچھا لگا ہو گا......"

"اتنا خوبصورت لباس کسے برا لگے گا۔" حور بانو نے بے یقینی سے کہا۔

"وہ ہندو ہیں نا...... ہندو کرتا بھی اور طرح کا پہنتے ہیں اور ساتھ میں دھوتی ہوتی ہے۔"

"تو پھر؟"

چھوٹے ٹھاکر نے اس کا اظہار بھی کر دیا ہو گا اماں پر۔ ظاہر ہے، اماں کو یہ بات اچھی نہیں لگی ہو گی۔"

"ہاں...... یہ ممکن ہے۔" نور بانو نے کہا۔

"تو اب اماں جاتی تو ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بات نہیں کرتیں۔"

صورتِ حال ایسی تھی کہ اس سے بہتر کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

سرفراز بیگم کا معمول اب بھی وہی تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ چھوٹے ٹھاکر سے ملنے اوپر جاتی تھیں اور اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر جاتی تھیں۔ لیکن بچیوں سے انھوں نے اس کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ باب مکمل ہو چکا ہے۔

لیکن ایک ماہ بعد یہ بات بھی غلط ثابت ہو گئی کہ فساد کرتے اور پائجامے کی وجہ سے تھا۔

اس روز اماں نے بہادر علی کو بلوایا۔ "بہادر علی، دو تھان لانے ہیں کپڑے کے۔" انھوں نے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کہا۔ "ایک تھان ڈھاکہ کی بہترین ململ کا اور ایک بہت اچھے لٹھے کا۔"

"لے آتا ہوں بیگم صاحبہ۔"

اماں نے چھمن بوا کو پیسے دیے جو انھوں نے بہادر علی کو دے دیے۔

تینوں لڑکیوں کا تجسس سے برا حال تھا۔ "آپ بھی کمال کرتی ہیں اماں۔ گرمیاں رخصت ہو رہی ہیں اور آپ ململ کا تھان منگوا رہی ہیں۔" حور بانو نے کہا۔

"اور پورے تھان کا کریں گی کیا؟" نور بانو نے اعتراض کیا۔

"کرتے ہی بناؤں گی۔ ململ کا اور مصرف کیا ہے!" سرفراز بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اتنے کرتے! اور وہ بھی جاتی گرمیوں میں۔" حور بانو نے کہا۔

"کڑھائی میں مہینے سے کم نہیں لگتا۔ اگلی گرمیاں آنے تک کرتے تیار ہو جائیں گے۔"

"اب اتنا وقت بھی نہیں لگتا اماں۔"

"مجھے تو لگتا ہے۔ بلکہ زیادہ ہی لگتا ہے۔ گھر کے اتنے کام ہوتے ہیں۔ تم لوگ تو ہاتھ بٹاتی نہیں ہو۔" سرفراز بیگم کے لہجے میں ملامت تھی۔ "میں روپیٹ کر ایک کرتا کاڑھ لوں مہینے میں تو یہ بھی بڑی بات ہے۔ پھر اب نگاہ بھی تو پہلے جیسی نہیں رہی۔"

"اچھا ماں...... ایک کرتا مجھے بھی دے دیجیے گا۔ میں بھی کاڑھوں گی۔" نور بانو بولی۔

"یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ اس تھان میں سے کرتے کس کس کے نکلیں گے؟"

"صرف چھوٹے ٹھاکر کے۔ اور کسی کے بھی نہیں۔" سرفراز بیگم کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

ان تینوں کے منہ کھل گئے حیرت سے۔ "اتنے کرتے...... ! چھوٹے ٹھاکر کے لیے؟"

حور بانو نے بے ساختہ کہا۔ "اور ایک کرتا نور بانو بھی کاڑھے گی۔"

نور بانو جھینپی، کھسیائی، ایک لمحے کو ہچکچائی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ انکار کر دے گی۔ لیکن پھر شاید اسے اپنی آن کا خیال آ گیا۔ "لو...... اس میں ایسی کون سی بات ہے۔ کرتا کاڑھنے میں کیا برائی ہے۔ وہ تو میں ضرور کاڑھوں گی۔"

"ایک پر میں بھی کڑھائی کروں گی۔" حور بانو نے کہا۔

"چلو، کر لینا۔" سرفراز بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن سچ یہ ہے کہ میں اس کام میں کسی کا ساجھا نہیں چاہتی۔"

لڑکیوں نے ماں کو حیرت سے دیکھا۔ وہ کتنی محبت کرتی ہیں چھوٹے ٹھاکر سے۔ "تو انھیں وہ کپڑے پسند آئے؟" حور بانو نے پوچھا۔

"اتنے پسند آئے کہ اس نے اسی وقت پہن لیے اور کہنے لگا...... ایسے اور کپڑے سی کر دیں گی مجھے؟"

"اور آپ نے ایک درجن جوڑے دینے کا ارادہ کر لیا۔" نور بانو بولی۔

"تم نے دیکھا نہیں اسے اس لباس میں۔" سرفراز بیگم نے کہا۔ "سچ پوچھو تو مغل شہزادہ لگ رہا تھا وہ۔ اتنا خوبصورت کہ جی چاہے، دیکھتے ہی رہو۔"

یہ سن کر تینوں لڑکیوں کے دل میں کرتا پائجامہ پہنے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھنے کی خواہش مچلنے لگی!

❀......❀......❀

"دیکھ لیا۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ وائسرائے اور کانگریس کی ملی بھگت ہے۔" محمود جوشیلے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کا لہجہ فاتحانہ نہیں تھا۔ "اسے کہتے ہیں یوٹرن۔"

"اسے سیاست کہتے ہیں بچے۔" رام گوپال نے حقارت سے کہا۔ "اب مان لو کہ

مسلمان سیاست میں طفلِ مکتب ہیں۔ انھیں بہت کچھ سیکھنا ہے ہم سے۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ تم الگ ملک لے بھی لو گے تو چلا نہیں سکو گے۔ آخر ہم سے ہی ملنا پڑے گا۔"

"اگر سیاست جھوٹ، مکاری اور منافقت کا نام ہے تو ایسی سیاست کو سات سلام۔"

محمود نے تند لہجے میں کہا۔ "پاکستان نام اس لیے تجویز کیا گیا ہے کہ وہ سرزمین انشاء اللہ ہر گندگی سے پاک ہو گی اور کانگریس کی گندی سیاست کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کا توڑ بھی مسلم لیگ کر لے گی۔"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کانگریس اِن ہو گئی اور مسلم لیگ آؤٹ۔" رام گوپال نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے نمائندے نامزد کیے جا چکے۔ وائسرائے نے اعلان کر دیا۔"

"دیکھ لینا۔ ہم یہ سازش بھی ناکام بنا دیں گے۔"

یہ گفتگو کالج کی کینٹین میں ہو رہی تھی۔ پڑھائی کسی حد تک شروع ہو گئی تھی۔ لیکن سیاسی ماحول کے درجۂ حرارت نے اب بھی اساتذہ اور طلباء کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پڑھائی کا ماحول تھا ہی نہیں۔

ستمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سیاسی صورتِ حال ہر پل رنگ بدل رہی تھی۔ وائسرائے نے 16 مئی پلان سے پسپائی اختیار کی تو مسلم لیگ نے اس کی جانب داری محسوس کرتے ہوئے 27 جولائی کو پلان کی اپنی منظوری واپس لے لی۔ 8 اگست کو کانگریس نے اپنے موقف سے یوٹرن لیتے ہوئے 16 مئی پلان قبول کر لیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مسلم لیگ کو سیاسی منظر سے ہٹانے کی خواہاں ہے اور اس میں وائسرائے اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ سیاسی صورتِ حال اس وقت اور گھمبیر ہو گئی، جب محمد علی جناح کو گرفتار کرنے کی افواہیں گردش کرنے لگیں۔ ردِعمل میں محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ وہ جیل جانے کو تیار ہیں۔

24 اگست کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ تاجِ برطانیہ نے گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کے استعفے منظور کرتے ہوئے نہرو، پٹیل، راجندر پرشاد، آصف علی، راج گوپال اچاریہ، سرت چندر بوس، جون متھائی، سردار بلدیو سنگھ، شفاعت احمد خان، جگ جیون رام، سید علی ظہیر اور سی ایچ بھابھا کو ان کی جگہ ایگزیکٹو کونسل کے لیے نامزد کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ لارڈ ویول نے پانچ غیر مسلم لیگی اراکین کی نشستوں کی تقرری کا اختیار بھی کانگریس کو دے دیا۔ اسی شام وائسرائے نے ریڈیو پر عبوری حکومت کی تشکیل کا اعلان کر دیا۔ اس کے جواب میں محمد علی جناح نے تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کا مسلم لیگ کا مطالبہ شد و مد سے دہرایا۔ تاہم 2 ستمبر کو مسلم لیگ کی نمائندگی کے بغیر عبوری حکومت قائم ہو گئی۔

اوتار سنگھ دوستوں کے سیاسی تبصرے بھی غور سے سنتا تھا اور خود بھی سوچتا تھا۔ اس کا

تجزیہ تھا کہ انگریزوں نے کانگریس کے ساتھ مل کر یہ بہت گہری چال چلی ہے۔ اس کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو مسلمانوں کو مایوس کرنا، دوسرے مسلم لیگ پر ان کے اعتماد میں شگاف ڈالنا۔ یہ فطری امکان اپنی جگہ تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں مسلمانوں کی جانوں کے زیاں کے پیشِ نظر مسلمان بددل ہو کر مسلم لیگ کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لیں اور پاکستان کے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ آزمائش مسلم لیگ کی قیادت کی نہیں، عام مسلمانوں کی ہے۔ اگر اس وقت وہ ڈگمگا گئے تو مسلم لیگ کی قیادت کا تدبر، حوصلہ اور عزم بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ مسلمانوں کی آزمائش اس اعتبار سے بھی سخت تھی کہ ہندو انہیں طعنے دیں گے کہ کتنی آسانی سے مسلم لیگ کو اقتدار سے باہر کر دیا گیا ہے اور یہ کہ یہ بہت بڑی ناکامی ہے۔

اب مسلمان اس آزمائش پر پورے اترتے ہیں یا نہیں، اس کا فیصلہ تو آنے والے وقت کو ہی کرنا تھا۔ اوتار سنگھ تو پہلی بار سیاست اور اقتدار کے کھیل کو عملی شکل میں اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود کو غیر جانب دار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس غیر جانب داری کے نتیجے میں اس کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعے انہیں پاکستان بنانے سے روکنے کی کوشش کی جا رہی تھی، یہ سمجھے بغیر کہ اس طرح تو مسلمانوں کو عدم تحفظ میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ ان کی بقا کی واحد صورت قیامِ پاکستان ہے۔ کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ مسلمانوں کو صرف محبت اور امن سے قائل کیا جا سکتا ہے۔ اوتار سنگھ کے نزدیک قیامِ پاکستان اب ناگزیر ہو چکا تھا۔

''تم کہاں کھوئے ہوئے ہو؟'' ریٹا پارسن نے اُسے چونکا دیا۔

''کہیں نہیں۔ میں تو یہیں ہوں۔''

''کل سیٹرڈے ہے۔ ہمارے گھر پارٹی ہے۔ آؤ گے؟'' ریٹا کے لہجے میں لگاوٹ تھی۔

''سوری، میں تو نہیں آ سکتا۔''

''کیوں؟ ایسی کیا مصروفیت ہے؟''

''میں شہر سے باہر ہوں گا۔''

''پچھلے ہفتے بھی تم شہر سے باہر تھے؟''

''ہاں۔ ویک اینڈ پر میں شملہ جاتا ہوں۔''

''تفریح کے لیے؟''

''نہیں۔ وہاں سینی ٹوریم میں میرے استاد داخل ہیں۔ ویک اینڈ میں ان کے ساتھ گزارتا ہوں۔''

''تو آئندہ ہمیں پارٹی کے لیے کوئی اور دن رکھنا پڑے گا؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

ریٹا بجھ سی گئی۔ ''اس ہفتے مس کر دو نا...... میری خاطر۔''

''سوری۔ ماسٹر جی سے ملنے میرے سوا کوئی نہیں جاتا۔ وہ پورے ہفتے میری آمد کے دن گنتے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ آئندہ میں پارٹی ارینج کرتے وقت اس کا خیال رکھوں گی۔''

❁......❁......❁

اوتار سنگھ ڈاکٹر چارلس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ''مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے ڈاکٹر۔'' اس نے کہا۔ ''ماسٹر جی کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ صرف دو ماہ میں اتنا فرق پڑ گیا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' ڈاکٹر نے بھویں اچکاتے ہوئے اسے دیکھا۔

''جی ہاں۔ جب میں انہیں یہاں لایا تھا تو چلنا درکنار، ان میں بولنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ اب وہ دس منٹ کی چہل قدمی کرتے ہیں۔ اپنی وہیل چیئر پر اِدھر سے اُدھر گھومتے ہیں اور ان کے چہرے پر زندگی کی چمک نظر آتی ہے۔''

''یہ صرف غذا کی وجہ سے ہے۔ غذا آدمی کے ظاہر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جب وہ یہاں آئے تھے تو انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ ہفتوں سے انہوں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا ہے۔ بیماری سے جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن غذا نہ ملنے سے تو بالکل تباہ ہو جاتا ہے۔ اب یہاں انہیں ہر وہ چیز مل رہی ہے، جس کی انہیں ضرورت ہے۔ دودھ، پھل، ہر چیز۔ اس لیے وہ دیکھنے میں بہتر ہو گئے ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے، ان کی صحت بہتر نہیں ہوئی ہے؟'' اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اگزیکٹلی۔ دیکھو مسٹر اوتار سنگھ، میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''تم جب انہیں یہاں لائے تو ان کی بیماری بہت بڑھ چکی تھی۔ ان کے دونوں پھیپھڑے تقریباً ناکارہ ہو چکے ہیں۔ وہ بیماری کے اس اسٹیج پر ہیں، جہاں علاج ممکن نہیں رہتا۔ لیکن ہم ڈاکٹر لوگ ناممکن سے بھی لڑتے رہتے ہیں۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کسی کی زندگی بڑھا نہیں سکتے۔ ہاں زندگی کی کوالٹی بہتر کر سکتے ہیں۔ ان کی تکلیف کم کر سکتے ہیں۔ وہ ہم کر رہے ہیں۔''

اوتار سنگھ مایوس نظر آ رہا تھا۔ ''لیکن مجھے تو اب وہ صحت مند لگتے ہیں۔''

''دیکھو مسٹر اوتار سنگھ، یہ جو ٹی بی ہے نا، یہ بہت دھوکے باز اور پُرفریب مرض ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی اندر سے ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن بظاہر بہت صحت مند دکھائی دیتا ہے۔ ابھی تین دن پہلے مسٹر پرشاد پر شدید اٹیک ہوا تھا۔ مجھے امید نہیں رہی تھی۔ لیکن وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ قوتِ ارادی کے دم سے ہے۔ اور سنو، وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ تمہاری خاطر جینا چاہتے ہیں۔''

''تھینک یو ڈاکٹر فار یوری تھنگ۔ آپ ان کے گھر ہفتہ وار رپورٹ تو بھیج رہے ہیں نا؟''

''ہاں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔''

''وہاں سے کوئی ان سے ملنے نہیں آیا۔''

''نہیں۔ شاید آئے گا بھی نہیں۔ یہاں جہالت بہت ہے۔ اپنے ڈر کی وجہ سے لوگ مریض کے جلد از جلد مرنے کا سامان کر دیتے ہیں۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں شکایت تھی۔

''بہر حال آپ انھیں باخبر رکھیے گا۔''

''میں نے کہا نا۔ یہ میرا فرض ہے۔''

اوتار سنگھ ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔

وہ بہت بڑا سینی ٹوریم تھا۔ وسیع و عریض سرسبز لان تھا۔ کشادہ اور ہوادار کمرے تھے۔ صفائی ایسی تھی کہ دیکھ کر رشک آتا تھا۔ عام طور پر ایک کمرے میں چار مریض ہوتے تھے۔ لیکن اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کو الگ کمرا دلایا تھا۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی دن اسے بتا دیا تھا کہ یہاں جو مریض ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ کسی بھی وقت، بالکل اچانک کسی کا وقت آ جاتا ہے۔ اور اکثر اس ایک موت کے نتیجے میں دوسری موت واقع ہو جاتی ہے۔ دوسرا مریض اپنے سے کہیں بہتر مریض کی موت پر حوصلہ ہار بیٹھتا ہے۔'' "Death usually strikes twice in sueeesoion" ڈاکٹر نے کہا تھا۔ اور اوتار سنگھ نے سوچا تھا کہ ماسٹر جی کو اپنا کمرا ملنا چاہیے۔ وہ اپنے طور پر کہیں بھی آ جا سکتے ہیں۔ اس لیے انھیں تنہائی کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ اور موت کے پلٹنے والے وار سے بھی بچے رہیں گے۔ ایک کمرے میں چوبیس گھنٹے ساتھ رہنے والے مریض کی موت زیادہ اثر انداز ہوتی ہوگی۔

وہ ماسٹر جی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بستر پر لیٹے تھے۔ اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔ ''آؤ اوتار سنگھ، کب سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔'' انھوں نے شکایت کی۔

''سفر لمبا ہے ماسٹر جی۔ کبھی دیر بھی ہو جاتی ہے۔'' اوتار سنگھ نے معذرت کی۔

''میں بھی کیسا آدمی ہوں۔ تم اتنی دور سے آتے ہو اور میں شکایت کر بیٹھتا ہوں۔'' ماسٹر جی نے شرمندگی سے کہا۔

اس شکایت میں جو محبت ہے، وہ مجھے بہت عزیز ہے ماسٹر جی۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''ویسے میں ڈاکٹر سے ملتا ہوا آ رہا ہوں۔ وہ کہہ رہا تھا، آپ نے بہت تیزی سے Recover کیا ہے۔ کچھ ہی عرصے میں آپ یہاں سے جا سکیں گے۔''

''کہاں جا سکوں گا؟ کہاں جاؤں گا؟'' ماسٹر جی نے گھبرا کر پوچھا۔

''میرے ساتھ، میرے گھر۔''

ماسٹر جی نے سکون کی سانس لی۔ ''ارے ڈاکٹر تو بہلاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ

جب تک زندہ ہوں، یہاں رہوں گا۔ یہاں سے مر کر ہی نکلوں گا۔''

''ایسی تو بات نہیں ماسٹر جی۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر تیزی سے موضوع بدلا۔ ''یہ بتائیں، آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

ماسٹر جی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''ضرورتیں کہاں پیچھا چھوڑتی ہیں۔ مگر سب پوری بھی تو نہیں کی جا سکتیں۔''

''مجھے بتائیں نا، شاید میں کچھ کر سکوں۔''

''کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔''

''پھر بھی......''

''دل چاہتا ہے، کاش...... کبھی بچے مجھ سے ملنے آ جاتے۔ بچوں کے بچے بہت یاد آتے ہیں مجھے۔'' ماسٹر جی کے لہجے میں تڑپتی ہوئی حسرت تھی۔

اوتار سنگھ کے دل پر گھونسہ لگا۔ ''اس میں تو میرا قصور ہے ماسٹر جی۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''ان کو میں نے یہاں کا پتا ہی نہیں بتایا۔ اب کے واپس جاؤں گا تو انھیں بتا دوں گا۔''

''تم مہان ہو چھوٹے ٹھاکر۔ لیکن جھوٹ بولتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔'' ماسٹر جی نے بہت پیار سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے۔ تم ایسے نہیں ہو کہ انھیں بے خبر رکھو۔ مگر میں جانتا ہوں کہ وہ میرے مرنے پر بھی نہیں آئیں گے۔''

''آپ اتنی سخت بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''میں ہی تو کہہ سکتا ہوں۔ انھیں پیدا کیا، پالا پوسا میں نے۔ ان کی رگ رگ سے واقف ہوں میں۔ ارے یہ شملہ تو بہت دور ہے...... اتنا دور جیسے دھرتی سے آکاش، انھوں نے تو وہاں مجھے اس کاٹھ کباڑی کوٹھری میں پھینک دیا تھا۔ میں ڈیڑھ مہینے وہاں پڑا رہا۔ وہ ایک گھر میں ہوتے ہوئے مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ کسی پوتے پوتی کی شکل نہیں دیکھی میں نے۔ میں جانتا ہوں، جس روز ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ مجھے ٹی بی ہے، اسی روز میں ان سب کے لیے اور وہ میرے لیے مر گئے تھے۔ تم نہ آتے تو مری مٹی وہیں خراب ہوئی تھی۔ آج میں یہاں عزت سے جی رہا ہوں...... تمھاری وجہ سے۔ ورنہ مجھے تو عزت کی موت بھی نصیب نہ ہوتی۔''

''اچھا چھوڑیے ان باتوں کو۔ آئیے...... لان پر چلیں۔''

''کیا کروں گا وہاں جا کے۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' ماسٹر جی نے آزردگی سے کہا۔

''کرنا کیا ہے، باتیں کریں گے خوب ساری۔ اور یہ نہ بھولیں کہ آپ میرے ماسٹر جی ہیں۔''

''یہ میں کیسے بھول سکتا ہوں۔''

"میرے ذہن میں بے شمار سوال ہیں، جن کا جواب آپ کو دینا ہے اور اس کے لیے کھلی فضا ضروری ہے۔"

ماسٹر جی مسکرائے۔ ان کی آنکھیں چمکیں اور پورا چہرہ ایک دم روشن ہو گیا۔ "یہ تو ہے۔" انھوں نے چہک کر کہا۔ "جب سے تمھیں دیکھا ہے، ایسا ہی دیکھا ہے۔ ہمیشہ سوالات سے بھرے ہوئے ہوتے ہو تم۔ تجسس، جستجو اور تلاش...... یہی زندگی ہے تمہاری۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تمھارے تمام سوالوں کے شافی جواب کبھی نہیں دے سکا۔ مگر خیر...... چلو، آج پھر کوشش کرتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اوتار سنگھ جلدی سے قریب رکھی وہیل چیئر ان کے پاس اٹھا لایا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں ویسے ہی چلوں گا۔" ماسٹر جی نے کہا۔

"ابھی اس پر بیٹھ جائیں۔ بعد میں لان پر چہل قدمی کریں گے۔"

ماسٹر جی وہیل چیئر پر بیٹھ گئے۔ اوتار سنگھ اسے دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔

اسے خوشی تھی کہ اس کی یہ پڑھنے اور سوال کرنے کی ترکیب اب بھی کارآمد ہے۔ اس سے ماسٹر جی کی مایوسی ہمیشہ دور ہو جاتی ہے اور وہ زندگی اوڑھ لیتے ہیں۔ انھیں اپنے کارآمد اور موثر ہونے کا احساس ہوتا ہے اور زندگی میں مقصدیت نظر آنے لگتی ہے۔

وہ لان کی طرف بڑھتے رہے!

❀......❀......❀

سرفراز بیگم چھوٹے ٹھاکر کے لیے کوفتے لے کر اوپر پہنچیں تو وہاں سناٹا تھا۔ "چھوٹے ٹھاکر...... چھوٹے ٹھاکر" انھوں نے پکارا۔

ایک کمرے سے رنجنا نکلی۔ "آیئے بڑی بیگم۔"

"چھوٹا ٹھاکر کہاں ہے؟ میں اس کے لیے کوفتے لائی ہوں۔"

"وہ تو گھر میں نہیں ہیں بڑی بیگم۔ ہفتے کو وہ شملہ چلے جاتے ہیں۔ اتوار کو واپس آتے ہیں۔"

سرفراز بیگم کو حیرت ہوئی کہ وہ بے خبر ہیں۔ اب اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہفتے یا اتوار کو وہ کبھی اس سے ملنے نہیں آئیں۔ "کیوں...... خیریت تو ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"وہ ماسٹر جی وہاں اسپتال میں داخل ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر وہاں جا کر ایک دن ان کے ساتھ گزارتے ہیں۔"

"کون ماسٹر جی؟"

"ماسٹر جی کو نہیں جانتیں آپ۔ وہ ہمارے ساتھ ہی تو یہاں آئے تھے۔"

اچانک سرفراز بیگم کو ماسٹر جی یاد آ گئے۔ "اچھا وہ...... کیا ہوا انھیں؟ تمھارے گاؤں والا

واقعہ ہوا تو وہ یہیں تھے۔"

"جی بڑی بیگم۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ انہی کی وجہ سے تو ہم بھی گاؤں نہیں جا سکے تھے۔"

"تو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی ان کی؟"

"پتا نہیں۔ یہاں تو کچھ ٹھیک ہو گئے تھے۔ ہم سے کہنے لگے کہ گھر جاؤں گا۔ بچوں سے ملنا ہے۔ چلے گئے۔ پھر چھوٹے ٹھاکر واپس آئے تو اپنے دکھ میں ان کو بھولے رہے۔ یاد آیا تو ہم سے پوچھا۔ ہم نے بتایا کہ وہ تو اپنے گھر چلے گئے تھے۔ جب سے واپس نہیں آئے۔"

"پھر وہ تم پر ناراض ہوا ہو گا؟"

"ناراض کہاں ہوتے ہیں چھوٹے ٹھاکر۔ خود پر افسوس کرتے رہے۔ دیر تک دکھ کرتے رہے کہ اتنے دن وہ ماسٹر جی کو بھولے کیسے رہے۔"

"وہ ناراض نہیں ہوتا کبھی؟" سرفراز بیگم نے حیرت سے پوچھا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ یہ زمین دار لوگ غصہ کے بہت تیز ہوتے ہیں۔"

"ہوتے تو ہیں بڑی بیگم۔ پر ہمارے چھوٹے ٹھاکر کو کبھی کسی نے غصہ کرتے نہیں دیکھا۔"

"چلو خیر...... پھر کیا ہوا؟"

"پھر چھوٹے ٹھاکر نے ہم سے پوچھا کہ ماسٹر جی اپنا پتا دے کر گئے ہیں۔ ہم نے کہا، نہیں۔"

"پھر ماسٹر جی ملے کیسے؟"

"چھوٹے ٹھاکر اسکول کھلنے کا انتظار کرتے رہے۔ اسکول کھلے تو وہاں سے ماسٹر جی کا پتا لیا اور ان سے ملنے چلے گئے۔ واپس آئے تو ماسٹر جی ان کے ساتھ تھے۔ اور ماسٹر جی کا اتنا برا حال تھا کہ ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے۔"

"ہوا کیا تھا انھیں؟"

"وہ ہوتی ہے نا تپ دق...... وہ بیماری ہو گئی تھی انھیں۔"

سرفراز بیگم کا ہاتھ بے اختیار اپنے منہ پر جا پہنچا۔ "ہائے میرے اللہ...... ٹی بی!"

"ہاں بڑی بیگم۔ اور ماسٹر جی نے بتایا کہ ان کے بچوں نے انھیں کوٹھری میں ڈال دیا تھا کباڑ کی طرح۔ کوئی اس کوٹھری میں نہیں جاتا تھا۔ ایک نوکرانی اپنے منہ پر کپڑا ڈال کر دور سے ان کے پاس کھانا رکھ جاتی تھی اور بعد میں برتن لے جاتی تھی۔"

"ٹی بی کے مریض کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ لگنے والی بیماری ہے نا۔"

"پر ہمارے چھوٹے ٹھاکر تو رات بھر ماسٹر جی کے پاس بیٹھے روتے رہے۔ کہتے تھے، ماسٹر جی، یہ حال میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں کیسے باپ جیسے استاد کو بھول کر بیٹھ گیا۔ ماسٹر جی میں تو

بولنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ بے چارے بار بار چھوٹے ٹھاکر کے سر پر ہاتھ رکھتے، کچھ بولنے کی کوشش کرتے اور پھر رونے لگتے۔ اس رات چھوٹے ٹھاکر ایک پل نہیں سوئے۔ اگلے روز کالج بھی نہیں گئے۔''

''ہئے ہئے...... یہ بیماری ہی ظالم ہے۔ اپنوں کو بھی دور کر دیتی ہے بیمار سے۔'' سرفراز بیگم نے تاسف سے کہا۔ ''بچوں کا بھی کیا قصور۔ اللہ ہر ایک کو محفوظ رکھے اس بیماری سے۔''

''پر ہمارے چھوٹے ٹھاکر تو ماسٹر جی کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتے رہے۔ اپنے ہاتھ سے انھیں کھانا کھلاتے۔ ان کے برتن خود دھوتے۔ حد یہ کہ ان کا اگال دان بھی اپنے ہاتھوں سے دھویا چھوٹے ٹھاکر نے۔'' یہ کہتے کہتے رنجنا رونے لگی۔ ''میرا من کرتا تھا بڑی بیگم کہ میں مر جاؤں۔'' وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ ''میں نے اور رگھو نے چھوٹے ٹھاکر کے پاؤں پکڑ لیے...... سر رکھ دیا ان کے پیروں میں کہ ماسٹر جی کی سیوا ہم کریں گے۔ پر چھوٹے ٹھاکر نے ڈانٹ دیا ہمیں۔ بولے ماسٹر جی کی سیوا میرا دھرم ہے، تمہارا نہیں۔ انھوں نے مجھے پڑھایا ہے، علم دیا ہے۔ وہ میرے لیے بھگوان سمان ہیں۔ ان کی خدمت میرا فرض ہے۔''

سرفراز بیگم سناٹے کے عالم میں اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر انھوں نے پوچھا۔ ''ماسٹر جی یہاں کتنے دن رکے؟''

''دو دن بڑی بیگم۔ پھر چھوٹے ٹھاکر انھیں شملہ لے گئے...... بڑے اسپتال۔''

''اور اب وہ ہر ہفتے ان سے ملنے شملہ جاتا ہے؟''

''جی بڑی بیگم۔''

سرفراز بیگم کا دل بھر آیا۔ اسی وقت وہ ان کے سامنے ہوتا تو شاید وہ اسے سینے سے لگا لیتیں۔ انھوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہارا چھوٹا ٹھاکر بڑا آدمی ہے رنجنا۔ اللہ نے اسے بہت بڑائی دی ہے۔''

''ہمیں پتا ہے بڑی بیگم۔'' رنجنا پھر رونے لگی۔ ''بھگوان ہمیں سدا ان کے چرنوں میں رکھے۔ ایسا ہوا تو سمجھیں، جیون سپھل ہو گیا اپنا۔''

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ وہ دونوں ہی اوتار سنگھ کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

❁......❁......❁

دسمبر کا مہینہ آ گیا۔ سردیاں شروع ہو گئیں۔ مگر ہندوستان اپنے سیاسی ماحول کے اعتبار سے جون کے مہینے میں جی رہا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔ عقل والوں کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ بلوؤں کی وجہ سے قیام پاکستان ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔

2 ستمبر کو مسلم لیگ کے نمائندوں کے بغیر عبوری حکومت قائم ہو گئی۔ مسلم لیگ کے قائدین نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ انھیں احساس ہو گیا کہ اگر مسلمانوں نے کانگریس کے لیے

میدان کھلا چھوڑ دیا تو یہ ان کے لیے تباہ کن ہوگا۔ ابھی تک تو عام مسلمانوں میں بددلی نہیں پیدا ہوئی تھی بلکہ ان کا جوش و خروش اور بڑھ گیا تھا۔ لیکن بددلی اور اس کے بعد مایوسی پھیلنے میں دیر نہیں لگتی۔

چنانچہ طویل اور مسلسل مذاکرات کے بعد مسلم لیگ بالآخر 25 اکتوبر کو کانگریس کی بالادستی قبول کیے بغیر عبوری حکومت میں شامل ہو گئی۔ اس کونسل کا نائب صدر نہرو کو مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن اس تقرری کا مقصد صرف اور صرف گورنر جنرل کی غیر موجودگی کی صورت میں کونسل کے اجلاس کی صدارت کرنا تھا۔ اس کے پاس کوئی خصوصی اختیار نہیں تھا۔ لیکن وہ ایسے اختیارات کا خواہاں تھا، جو پارلیمانی جمہوریت میں وزیر اعظم کو حاصل ہوتے ہیں۔ مگر مسلم لیگ کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ لیگ دیکھ رہی تھی کہ پٹیل جو کہ ہوم ممبر تھا، گورنمنٹ کی پروپیگنڈا مشینری کو اپنی پارٹی کے مفاد کے سلسلے میں بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔ اس صورتِ حال میں یہ اتحاد تناؤ سے بھرپور شراکت کے مترادف تھا اور اسے ایک طرح کی مسلح جانب داری کہا جا سکتا تھا۔

کالج کا ماحول بھی بے حد کشیدہ تھا۔ محمود اور رام گوپال کے درمیان نفرت اتنی بڑھ گئی کہ اب وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار بھی نہیں تھے۔ رام گوپال نے دوستوں کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ سنا گیا تھا کہ وہ ان دنوں انتہا پسند ہندوؤں کے درمیان رہنے لگا ہے۔

❁......❁......❁

ماسٹر جی کو شملہ میں رہتے چار مہینے ہو گئے تھے۔ ان کی ظاہری حالت تو بہتر تھی۔ لیکن ڈاکٹر ان کے بارے میں پرامید نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مرض بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اور اس مرض میں ظاہری بہتری قابل اعتبار نہیں ہوتی۔

ماسٹر جی اس بات کو بہت محسوس کرتے تھے کہ ان سے ملنے کے لیے اوتار سنگھ کے سوا کوئی نہیں آتا۔ یہ بات نہیں کہ انھیں اپنے بیٹوں سے کوئی اس طرح کی امید ہو۔ لیکن اس کے باوجود ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کا کوئی بیٹا کبھی ان سے ملنے کے لیے آئے۔

اوتار سنگھ کو اس کی فکر لگ گئی تھی۔ وہ ماسٹر جی کی یہ آرزو پوری کرنا چاہتا تھا۔ اسے کوئی امید تو نہیں تھی۔ لیکن اس نے ماسٹر جی کی خاطر کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس شام اس نے بازار سے پھل اور مٹھائیاں خریدیں۔ بچوں کے لیے کھلونے خریدے اور ماسٹر جی کے گھر کی طرف چل دیا۔

اس کی دستک پر دروازہ بدری پرشاد نے کھولا۔ اسے دیکھ کر وہ بڑے تپاک سے مسکرایا اور ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہا۔

اوتار سنگھ کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس پرتپاک خیر مقدم کا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کا تو خیال تھا کہ ان کا رویہ اس کے ساتھ معاندانہ ہوگا۔ اس نے بھی نمسکار کیا۔ ''کیسے ہیں بدری بھیا؟'' اس نے اپنائیت سے کہا۔

''آیئے نا، دروازے پر کیوں کھڑے ہیں۔''

اوتار سنگھ اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ بدری پرشاد نے اسے کمرے میں بٹھایا۔ ''آپ بیٹھیں۔ میں ابھی آیا۔'' اس نے کہا۔ ''اس وقت میرے دونوں بھائی بھی موجود ہیں۔ ان سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔''

''بچوں کو بھی بلا لیجیے گا۔''

تھوڑی ہی دیر میں بدری پرشاد اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ آیا۔ ''یہ میرے بڑے بھائی ہیں رام پرشاد اور یہ سب سے چھوٹا ہے ہری۔''

ان دونوں نے بھی اوتار سنگھ کو بڑے تپاک سے نمسکار کیا۔ ''پتا جی آپ کی بہت باتیں کرتے تھے۔'' ہری پرشاد نے کہا۔ ''بہت تعریف کرتے تھے آپ کی۔''

''آپ سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بچے کہاں ہیں؟''

اسی لمحے دو عورتیں تین بچوں کے ساتھ کمرے میں آئیں۔ ان میں ایک عورت اور سب سے بڑے لڑکے سے وہ پچھلی بار مل چکا تھا۔

''یہ میری بھابھی ہیں رادھا...... یہ میری پتنی سادھنا۔'' بدری پرشاد تعارف کرا رہا تھا۔

''یہ بھیا کا بیٹا گنگا، یہ بھیا کی بیٹی کانتا اور یہ میرا بیٹا مرلی۔''

اوتار سنگھ نے دونوں عورتوں کو نمسکار کیا۔ ''آپ کیسی ہیں بھابھی۔'' پھر پھل اور مٹھائی بڑی بھابھی کی طرف بڑھائی۔ ''ماسٹر جی نے مجھ سے تاکید کر کے کہا تھا اور پیسے دیے تھے کہ آپ لوگوں کے لیے ان کی طرف سے مٹھائی اور پھل لے کر جاؤں۔''

رادھا نے دونوں چیزیں لیں اور سادھنا کے ساتھ کمرے سے چلی گئی۔

اوتار سنگھ نے بچوں کو بلایا اور انھیں کھلونے دیے۔ ''یہ تمھارے دادا جی نے بھجوائے ہیں۔''

''دادو تاں ایں؟'' سب سے چھوٹے مرلی نے تتلاتے ہوئے پوچھا۔

''تمھارے دادو اسپتال میں ہیں۔ تم سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''ماتا جی مجھے دادو کے پاس جانے ہی نہیں دیتیں۔''

''اچھا...... اب تم لوگ جاؤ۔'' رام پرشاد نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔

بچوں کے جانے کے بعد رام پرشاد اوتار سنگھ سے مخاطب ہوا۔ ''آپ نے بہت تکلف کیا اوتار سنگھ جی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ پتا جی یہ سب کچھ نہیں بھیج سکتے۔ ان کے پاس پیسے تھے ہی نہیں۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ماسٹر جی کے پاس پیسے نہیں تھے۔ مگر اب

ہیں اور یہ سب کچھ انھوں نے ہی بھیجا ہے۔ میری طرف ان کی دو مہینے کی فیس تھی۔ وہ میں نے ادا کی اور اب ہر ماہ انھیں فیس دیتا ہوں۔''

رام پرشاد اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''سینی ٹوریم کے اخراجات کم تو نہیں ہوں گے۔''

''وہ تو میری ذمے داری ہے۔ فرض ہے میرا۔ اور یقین کریں، مجھے ماسٹر جی کا نام لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خود بھی لا سکتا تھا۔ یہ حق ہے میرا۔ ماسٹر جی کا پریوار میرا پریوار ہے۔ وہ میرے پتا سمان ہیں تو آپ میرے بھائی ہوئے نا۔''

''چلیں...... ٹھیک ہے۔ یہ بتائیں، پتا جی کیسے ہیں؟''

''یہ تو آپ کو بھی معلوم ہوگا۔ میں نے آپ کا ایڈریس لکھوا دیا تھا۔ سینی ٹوریم والے ہر ہفتے رپورٹ بھیجتے ہوں گے۔''

رام پرشاد حیران نظر آنے لگا۔ ہری نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں بڑے بھیا، ہر ہفتے رپورٹ آتی ہے ڈاک سے۔''

''مجھے نہیں بتایا تم نے؟''

''میں نے سوچا، آپ خوامخواہ پریشان ہوں گے۔''

''کیوں کوئی بہتری نہیں ہوئی۔''

''مرض بہت بڑھ چکا ہے بڑے بھیا۔''

''وہ رپورٹ تو اندر کی بات ہے۔'' اوتار سنگھ نے مداخلت کی۔ ''آپ انھیں دیکھیں گے تو خوش ہوں گے۔ دیکھنے میں وہ صحت مند لگتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں، چہل قدمی کرتے ہیں۔ اور وہ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔''

''آپ ان سے ملنے جاتے ہیں؟''

''ہر ہفتے۔ ویک اینڈ میں ان کے ساتھ ہی گزارتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''کبھی آپ بھی چلیں نا۔''

''کون...... ؟ میں......!'' رام پرشاد نے حیرت سے کہا۔ جیسے یہ تصور بھی اس کے لیے قابلِ قبول نہ ہو۔ ''میں تو نہیں جا سکتا۔ میری تو ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔ اور چھٹی مجھے مل نہیں سکتی۔ آج کل حالات ایسے ہیں......''

اوتار سنگھ نے بدری کی طرف دیکھا۔ ''بھیا تو عام طور پر رات کو ہوتے نہیں ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''گھر اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔''

''آپ میں سے کوئی ایک بار بھی چلے تو ماسٹر جی کو بہت فائدہ ہوگا۔ میں کچھ بھی کر لوں، حقیقی بیٹے کا بدل نہیں ہو سکتا۔''

وہ شرمندہ نظر آنے لگے۔ ''ہاں..... ہری جا سکتا ہے۔'' بدری نے کہا۔

''میں کیسے جا سکتا ہوں۔'' ہری ایک دم پریشان ہو گیا۔

''ہفتے کو اسکول سے چھٹی کر لو۔ اتوار کو تو چھٹی ہوتی ہی ہے۔''

''اور میری ٹیوشنز.....''

''اس سے بھی ایک دن تو چھٹی کر سکتے ہو۔''

ہری کے چہرے پر چند لمحے کشمکش نظر آئی۔ پھر جیسے باپ کی محبت ہر رکاوٹ پر حاوی آ گئی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں چلوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''آپ اب کب جائیں گے؟'' اس نے اوتار سنگھ سے پوچھا۔

''اب کرسمس کی چھٹیاں ہو رہی ہیں نا۔ اس بار پورا ہفتہ گزاروں گا ماسٹر جی کے ساتھ۔''

ہری گھبرا گیا۔ ''اسکول کی تو چھٹیاں ہوں گی۔ لیکن ٹیوشنز کی اتنی چھٹیاں میں نہیں کر سکتا۔ پھر امتحان سر پر آ جائے گا۔'' اس نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''میں امتحان کے بعد آپ کے ساتھ چلوں گا..... مارچ یا اپریل میں۔''

اوتار سنگھ کا دل بہت دکھا، سب سے اچھا بیٹا موت کی دہلیز پر بیٹھے باپ سے ملاقات کے لیے چار ماہ بعد کا وعدہ کر رہا تھا۔ دوسرے تو اس کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ کاش ماسٹر صاحب اس وقت تک زندہ رہیں۔ یہ خوشی تو مل جائے انھیں۔ اس کے دل سے دعا نکلی۔

بہر حال ان لوگوں کی پچھلی بے حسی کے سامنے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

اوتار سنگھ نے چلتے وقت چند نوٹ رام پرشاد کی طرف بڑھائے۔ ''یہ ماسٹر جی نے آپ لوگوں کے لیے بھجوائے ہیں۔''

دوسرے دو لڑکوں کے چہرے سُت گئے تھے!

❀....❀....❀

سردی بہت شدید تھی۔ موسم بدل گیا تھا۔ مگر زندگی کے معمولات نہیں بدلے تھے۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ گھر کے لوگوں کو اس بات کا تو احساس تھا کہ سیاسی موسم بدل گیا ہے۔ مگر وہ باہر کی بات تھی۔ گھر میں اتنی سنگینی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ گھر میں اخبار ہر روز آتا تھا۔ خون ریزی کی خبریں، مسلمانوں کا قتل روز کی بات تھی۔ اس سے گھر کے مکیں خوف زدہ تو تھے۔ لیکن وہ مطمئن بھی تھے کہ اپنے گھر کی چار دیواری میں وہ محفوظ ہیں۔

حور بانو اور نور بانو ابھی تک ایک کرتے کی کڑھائی مکمل نہیں کر سکی تھیں۔ جبکہ سرفراز بیگم تیسرے کرتے کی کڑھائی کر رہی تھیں۔ باریک کام کے لیے ان کی نگاہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ لیکن مشق بہر حال بڑی چیز ہوتی ہے۔ لڑکیوں نے کڑھائی سیکھی تو تھی۔ مگر ابھی نو آموز تھیں۔ بلکہ باقاعدہ کڑھائی کرنے کا تو وہ ان کے لیے پہلا موقع تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ خوبصورتی نے شوق میں

انھوں نے بہت باریک، نفیس اور مشکل ڈیزائن منتخب کیا تھا۔ ہر روز وہ تھوڑا سا کام کرتیں اور ماں کو دکھاتیں۔ بعض اوقات انھیں کام دوبارہ کرنا پڑتا۔

سرفراز بیگم کا معمول اب بھی وہی تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ اوپر جاتیں اور خالی ہاتھ کبھی نہ ہوتیں۔ اوپر وہ کم از کم دو تین گھنٹے گزارتیں۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں ان لوگوں سے بات وہ اب بھی نہیں کرتی تھیں۔

لڑکیوں کو بہت تجسس تھا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اماں نے چھوٹے ٹھاکر کے متعلق بات کرنا کیوں چھوڑ دیا۔ جبکہ وہ اس سے خفا بھی نہیں ہیں بلکہ اس کے لیے ان کی محبت اور بڑھ گئی ہے۔

اس روز نور بانو نے اپنا کڑھائی والا گلا انھیں دکھایا۔ وہ جائزہ لینے کے بعد بولیں۔ ''یہ بوٹا دوبارہ بناؤ بیٹا۔ صفائی نہیں آئی ہے اس میں۔''

''ادھر وہ ہر روز دس بیس مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ اور یہاں ہم ان کے لیے کرتا کاڑھ رہے ہیں..... نفاست اور صفائی سے۔'' نور بانو نے تنک کر کہا۔

سرفراز بیگم نے چونک کر اسے غور سے دیکھا۔ اس کا یہ ردِ عمل غیر معمولی تھا۔ وہ تو بڑے دھیمے، ٹھنڈے مزاج کی لڑکی تھی۔ وہ بات ہی کم کرتی تھی اور سخت بات تو اس کے مزاج میں تھی ہی نہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کے معاملے میں البتہ وہ ترش رو ہو گئی تھی۔

سرفراز بیگم کو غصہ بالکل نہیں آیا۔ انھوں نے بڑی بے رخی سے سرد لہجے میں کہا۔ ''لاؤ بیٹا..... یہ مجھے دے دو۔ میں تو یہ کام تم میں سے کسی سے کروانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ تم لوگ خود ہی گھسیں تھیں اس میں۔''

''جو سچی بات آپ کے لیے نہیں، وہ بھی آپ کو کڑوی لگتی ہے اماں؟''

''یہ بات سچی ہے نہ کڑوی۔ یہ تو جہالت کی بات ہے۔'' سرفراز بیگم نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اول تو جو مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں، وہی اس کے ذمے دار ہیں نہ کہ تمام ہندو، اللہ کے ہاں ہر آدمی اپنے عمل کا جواب دہ ہوگا اور ہندو تو ایسے بھی ہیں کہ جو مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اور دوسرے خیر جانے دو۔''

''بات پوری کریں نا اماں۔''

حور بانو اور گلنار بھی لپک کر آ گئیں۔ ''ہاں اماں، بتائیں نا۔ آپ نے تو ٹھاکر بھیا کے بارے میں بات کرنا ہی چھوڑ دیا۔'' گلنار بولی۔

''کیوں؟ یہ بھی کبھی سوچا تم نے۔''

''بہت سوچا ہے اماں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔'' حور بانو نے کہا۔

''میں نے دیکھا کہ جتنی میں اس کی تعریف کرتی ہوں، تم لوگ اتنا ہی اس سے چڑتے

ہو۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، میں اس کی تعریف نہیں کرتی، حقیقت بیان کرتی ہوں۔ اس لیے میں نے اس کا نام لینا ہی چھوڑ دیا۔''

''صرف نور بانو چڑتی ہے اماں۔ میں اور گلنار تو نہیں چڑتیں۔'' حور بانو نے کہا۔

سرفراز بیگم نے سنی اَن سنی کر دی۔ ''میں جانتی ہوں کہ چھوٹا ٹھاکر کیسا ہے۔ اب تم لوگ میرے سمجھانے، منع کرنے کے باوجود اس کے متعلق بدگمانی کرو تو گناہ گار تو ہو گی نا۔ اور لطف یہ کہ اسے کارِ ثواب بھی سمجھو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارا نقصان کیسے گوارا کر سکتی ہوں۔ اس لیے میں نے اس کا تذکرہ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ کم از کم بدگمانی سے تو بچی رہو گی تم۔''

''اچھا اماں۔ آج آپ ہمیں بتائیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ بدگمانی نہیں کروں گی۔'' نور بانو نے کہا۔

''تو سن لو۔ سب سے پہلے تو میں نے یہ سمجھ لیا کہ چھوٹا ٹھاکر جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ اس کا کمال نہیں۔ اللہ کی رحمت ہے اس پر۔ وہ بچپن سے ہی ہر بات پر غور کرنے والا تھا۔ ماں کے کہنے پر وہ پوجا پاٹھ کرتا تھا۔ لیکن سوال بہت کرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ جو بت اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا، وہ کسی اور کو کیا دے گا۔ ماں کی موت کے بعد اس نے پوجا بالکل چھوڑ دی۔ اس کا یقین ہے کہ کائنات کا نظام چلانے والی ہستی واحد ہے۔ وہ کہتا ہے، جہاں کئی حکمراں ہوں، وہاں فساد ہوتا ہے۔ نظام نہیں چلتا۔ وہ بڑے خلوص سے، محبت سے جستجو کر رہا ہے۔ میں پوری سچائی کے ساتھ کہتی ہوں کہ اسے مشرک یا کافر کہنا اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔

''اور سنو۔ بے شک مجھ سے پہلی بار جذبات میں بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ گھر اس کا ہے۔ ہم سب اس کے گھر کے فرد ہیں اور ہمارے ہاں کوئی اس سے پردہ نہیں کرے گا۔ نور بانو نے احساس دلایا تو مجھے اپنی غلطی محسوس ہوئی۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں ڈرتی رہی کہ وہ آئے گا اور میں گناہگار ہوں گی۔ اب اسے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ میں ہی اوپر جاتی رہی اور میں نے اس سے نیچے آنے کو کہا بھی نہیں۔

''پھر جب وہ امتحان میں پاس ہوا اور اس نے مٹھائی نیچے بھجوائی، تب میں نے بے اختیار دوبارہ غلطی کی۔ میں نے اس سے شکایت کی کہ اسے مٹھائی لے کر خود آنا چاہیے تھا۔ تب اس نے کہا کہ وہ کبھی بھی نیچے نہیں آئے گا۔ وہ وجہ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اصرار کیا تو اس نے وجہ بتائی۔ اس کے بعد میری نظروں میں اس کا مقام اور بلند ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے تم لوگوں سے اس کے بارے میں بات کرنی چھوڑ دی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم لوگ اس کے متعلق بدگمانی کرو اور گناہگار بنو۔ اب وہ وجہ بھی سن لو۔ جس کے تحت وہ کبھی نیچے نہیں آئے گا۔''

انھوں نے سب کچھ بچیوں کو سنا دیا۔ پھر انھوں نے ماسٹر جی کی بیماری اور اس کے عمل کے بارے میں بتایا۔ بچیاں منہ کھولے سنتی رہیں۔ نور بانو کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ خاص طور

پر بہت زیادہ حیران تھی۔

''تو یہ ہے چھوٹا ٹھاکر اصل چھوٹا ٹھاکر۔'' سرفراز بیگم نے آخر میں کہا۔ ''میں تمہاری بھلائی اور بہتری کے لیے نہیں چاہتی کہ تم اس کے متعلق بدگمانی کرو۔ میں خود اس کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ اس کی کوشش قبول فرمائے، اسے اپنا راستہ دکھائے اور بھٹکنے سے بچائے رکھے۔ اور مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں اماں۔'' نور بانو نے کہا۔ ''اور میں اللہ سے سچے دل سے توبہ کروں گی۔''

''اور اب کبھی یہ فکر نہ کرنا کہ وہ نیچے آ جائے گا۔ کیونکہ وہ کبھی نیچے نہیں آئے گا۔''

یہ کہتے ہوئے سرفراز بیگم کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی یہ بات درست نہیں۔ چھوٹا ٹھاکر ایک دن نیچے آئے گا۔

❀……❀……❀

کرسمس اور نیو ائیر کی چھٹیوں سے پہلے وہ کالج کا آخری دن تھا۔ اوتار سنگھ لائبریری میں چلا گیا۔ وہ کچھ کتابیں ایشو کرانا چاہتا تھا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ یہ چھٹیاں ماسٹر جی کے ساتھ گزارے گا۔ ماسٹر جی بھی خوش ہو جائیں گے۔

اس نے تین کتابیں منتخب کیں۔ کتابیں رجسٹر پر چڑھوانے کے لیے وہ لائبریرین کی طرف جا رہا تھا کہ ریٹا پارسن آ گئی۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم یہیں ملو گے۔'' اس نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

''بات کیا ہے؟''

''سکون سے بیٹھو تو بات کروں۔''

وہ وہیں بیٹھ گئے۔ ''ہاں...... اب بولو۔''

''بات یہ ہے کہ تم میرے ہاں کی کئی پارٹیاں مس کر چکے ہو۔''

''میں نے تمھیں وجہ بھی بتائی تھی اور معذرت بھی کی تھی۔'' اوتار سنگھ بولا۔

''اور میں نے قبول بھی کر لی تھی۔'' ریٹا نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب معذرت نہیں چلے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم اپنے ماسٹر جی سے ملنے ہر ویک اینڈ پر جاتے ہو؟''

''ہاں۔ میں نے یہی بتایا تھا تمھیں۔''

''ہمارے ہاں کرسمس پارٹی میں آنا ہے تمھیں اور میں انکار نہیں سنوں گی۔''

اوتار سنگھ مسکرا دیا۔ ''اب میں تمھیں ایک عجیب بات بتاؤں۔ میں نے یہ کتابیں ایشو

کرانے کے لیے نکالی ہیں۔ میں یہ ارادہ کر چکا تھا کہ یہ تمام چھٹیاں میں ماسٹر جی کے ساتھ گزاروں گا۔ وہاں ان کتابوں پر ڈسکشن بھی کرلوں گا ماسٹر جی سے۔''

ریتا کا چہرہ پہلے تو بجھ گیا۔ پھر وہ بولی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ تمھیں اس پارٹی میں ضرور آنا ہے۔''

''میں نے انکار تو نہیں کیا۔ میں تو تمھیں بتا رہا تھا کہ میرا یہ ارادہ تھا۔ اب یہ ہے کہ میں ماسٹر جی کے پاس 26 تاریخ کو چلا جاؤں گا۔''

ریتا کھل اٹھی۔ ''یہ ہوئی نا بات۔ تو تم آؤ گے نا؟''

''ہاں...... ضرور آؤں گا۔''

''تو تم سات بجے آ جانا۔''

''شام سات بجے!'' اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''پارٹیاں تو رات کو دیر سے شروع ہوتی ہیں۔''

''پارٹی تو دس بجے ہی ہوگی۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ تم سات بجے آ جاؤ۔ مجھے تم کو کچھ دکھانا ہے۔''

''لیکن میں......'' اوتار سنگھ ہچکچا رہا تھا۔

''اتنی پارٹیاں مس کی ہیں تم نے۔ میری اتنی سی بات نہیں مانو گے۔'' ریتا کے لہجے میں لجاجت تھی۔

''چلو ٹھیک ہے۔ میں آ جاؤں گا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

وہ یوں خوش ہوئی، جیسے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہو۔ ''وعدہ؟''

''میں کچھ کہتا ہوں تو کرنے کا ارادہ بھی کرتا ہوں۔ اگر کوئی غیر معمولی رکاوٹ آ جائے تو الگ بات ہے۔ ورنہ میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔''

''تھینک یو اوتار سنگھ۔'' وہ پلٹی۔ ''میں تمھیں منتظر ملوں گی۔''

وہ چلی گئی اور اوتار سنگھ اٹھ کر لائبریرین کی طرف چل دیا......

❁......❁......❁

انگریزوں کے لیے وہ بڑا اداس کرسمس تھا۔ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں ان کے اقتدار کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اور وہ اپنے وطن سے دور یہاں تھے تو صرف اقتدار کے لالچ میں ہی تھے۔ اب اقتدار جا رہا تھا تو ان میں بیشتر ایسے تھے، جو اس وقت سے پہلے ہی ہندوستان چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

کرسمس کے دن پارسن فیملی کے درمیان موضوعِ گفتگو یہی تھا۔ ''شاید ہمیں ایک اور کرسمس یہاں منانا پڑے۔'' جیمز پارسن کہہ رہا تھا۔

''مگر اب مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔'' الزبتھ بولی۔ ''اب تو یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔''

''ابھی چند روز پہلے میری کچھ اہم لوگوں سے بات ہو رہی تھی۔'' جیمز نے کہا۔ ''وہ سب متفق تھے کہ اب انڈیا انگریزوں کے لیے محفوظ نہیں رہا ہے۔ ہندو جس طرح مسلمانوں پر حملہ کر رہے ہیں، کسی بھی وقت ان کا رخ انگریزوں کی طرف بدل سکتا ہے۔''

''میں تو اس پر حیران ہوں کہ ہم نے اب تک یہاں حکومت کیسے کرلی۔ یہ اتنا بڑا ملک ہے۔ کروڑوں کی آبادی ہے۔ ہماری تعداد تو کچھ بھی نہیں۔''

''برطانیہ عظمیٰ نے ہر جگہ غداروں کے زور پر حکومت کی ہے۔ بے شک یہاں آبادی بہت زیادہ ہے۔ لیکن غداروں کی کثرت بھی دوسری نو آبادیوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ ورنہ کسی اجنبی ملک میں، اجنبی ماحول، اجنبی موسم میں، جہاں کی زبان اور رسم و رواج بھی مختلف ہوں، چند لاکھ افراد چالیس کروڑ لوگوں پر حکومت نہیں کر سکتے۔''

''مگر اب یہ لوگ سیاسی طور پر بیدار ہو چکے ہیں۔''

''اس کے باوجود بنیادی طور پر یہ لوگ درندے ہیں۔'' جیمز نے کہا۔

''سچ کہتے ہو، مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے یہاں۔'' الزبتھ نے جھرجھری لے کر کہا۔

''ایک چیز نے ہمیں بچایا ہوا ہے اور وہی ہمیں بچائے گی۔'' جیمز بولا۔ ''اور وہ ہے ہمارے مقابلے میں ان کا احساسِ کم تری۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ لوگ قومی سطح پر سو سال تک تو اس احساسِ کم تری سے نہیں نکل سکیں گے، جس میں ہم نے انھیں مبتلا کر دیا ہے۔ سو سال تک یہ ہماری برابری نہیں کر سکیں گے۔''

''لیکن جیمز، مجھے لگتا ہے کہ انتقالِ اقتدار کے موقعے پر یہاں خوں ریزی ہو سکتی ہے۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہوگا۔ دیکھو، وہ ہم سے آزادی چھین نہیں رہے ہیں، مانگ رہے ہیں اور وہ بھی دب کر۔ انگریزوں کے خلاف کوئی گڑبڑ کرنے سے پہلے وہ دس بار سوچیں گے۔ وہ یہ بھی سمجھیں گے کہ آزادی ملنے سے پہلے ہی چھن بھی سکتی ہے۔ انگریزوں کی ہلاکت کے سلسلے میں برطانیہ ان پر فوج کشی بھی کر سکتا ہے۔''

''لیکن جیمز، Mob کی نفسیات میں سوچنے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔'' الزبتھ نے کہا۔

''یہی وجہ ہے کہ بہت لوگ اپنی فیملیز کو واپس بھیج رہے ہیں۔ ابھی واکر فیملی انگلستان واپس گئی ہے۔''

''سنو الزبتھ، تم اور بچے چاہو تو انگلستان واپس جا سکتے ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو فی الحال یہ ممکن نہیں۔''

الزبتھ نے سوالیہ نظروں سے ریتا کو دیکھا۔ ریتا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں ماما، میں تو واپس نہیں جانا چاہتی۔''

"حیرت ہے، تمھیں وطن کا خیال نہیں آتا۔"

جیمز ہنسنے لگا۔ "ہمارے بچے تو یہاں پیدا ہوئے ہیں۔ کبھی گرمیوں کی چھٹیوں میں دو تین بار انگلستان چلے گئے۔ انھیں تو یہی اپنا وطن لگتا ہوگا۔"

"لیکن جیمز، کلچر کا فرق تو بہت بڑا ہے۔"

"ماما، مجھے تو یہاں کا کلچر بہت اچھا لگتا ہے...... سوکلرفل، سوامیزنگ۔ مجھے یہاں کا موسم بھی اچھا لگتا ہے۔ موسم گرما کو ہٹا دیں تو لندن میں بارشوں اور کہر کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ یہاں موسم سرما میں بھی دھوپ میسر ہوتی ہے۔"

"اور مجھے اس کے باوجود دنیا میں لندن سے پیاری کوئی اور جگہ نہیں۔" الزبتھ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ رچرڈ کی طرف مڑی۔ "اور تم کیا کہتے ہو ڈک؟"

"میں اپنی تعلیم نامکمل نہیں چھوڑنا چاہتا ماما۔"

"مگر بھئی میں تو واپس جانا چاہتی ہوں۔"

"چلو، اس پر بعد میں بات کریں گے۔" جیمز نے کہا۔ "فی الحال تو ہمیں وائسرائے کی پارٹی میں جانا ہے۔ تیاری کرو۔ چھ بجے تک پہنچنا ہے۔"

"ڈیڈی، میں تو آپ لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکوں گی۔" ریٹا نے معذرت کی۔

"تم یہ پارٹی مس کرو گی؟" الزبتھ کے لہجے میں حیرت تھی۔ "جانتی ہو، وہاں کیسے کیسے لوگ ہوں گے...... کریم آف ایسٹ انڈیا کمپنی!"

"سوری ماما۔ میں نے کچھ دوستوں کو گھر پر مدعو کیا ہے۔"

"ان میں کوئی بہت خاص دوست بھی ہوگا؟" رچرڈ نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

ریٹا کے رخسار دہک اٹھے۔ "وہ جتنے بھی ہیں، سبھی بہت خاص دوست ہیں۔" اس نے سچائی سے کہا۔

"آل رائٹ۔ کم آن لز۔ تم تیار ہو جاؤ...... اور ڈک تم بھی۔" جیمز نے کہا۔

وہ لوگ تیار ہوئے اور ساڑھے پانچ بجے پارٹی کے لیے نکل گئے۔ "تمام نوکر سرونٹ کوارٹرز میں موجود ہیں۔" جیمز پارسن نے جاتے جاتے ریٹا سے کہا۔ "تم انھیں طلب کر سکتی ہو۔ کک کو بلا کر سمجھا دو کہ تمھاری پارٹی کے لیے اسے کیا کرنا ہے۔"

"یس ڈیڈی۔"

ان کے جانے کے بعد وہ اپنے خاص مہمان کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ سب سے پہلے اس نے کک کو بلایا۔ "دو افراد کے لیے ڈنر تیار کرنا ہے...... رات گیارہ بجے تک۔"

"دو افراد کے لیے!" کک کی آنکھوں میں حیرت چمکی۔ لیکن اس کے لہجے میں صرف تعمیل تھی۔ "یس میم صاب۔ ہو جائے گا۔"

ریٹا نے اسے مینو بتایا۔ کک چلا گیا۔

اب ریٹا کو مشروب کی فکر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اوتار سنگھ شراب نہیں پیتا۔ چنانچہ اس نے اس کے لیے ایک خاص قسم کا شربت تیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کئی مختلف ذائقوں کے ایسنس منگوائے تھے۔ عرقِ گلاب اس کے علاوہ تھا۔ عرقِ گلاب کے بارے میں اس نے کک سے معلومات حاصل کی تھیں۔

اس نے بڑے اہتمام سے اوتار سنگھ کے لیے وہ کاک ٹیل تیار کی اور اسے ایک بڑے جگ میں بھر کے ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیا۔

اب آخری مرحلے میں اسے خود تیار ہونا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اوتار سنگھ وقت کا پابند ہے۔ ٹھیک سات بجے آ جائے گا۔

اس موقعے کے لیے اس نے خاص طور پر سفید رنگ کا بہت خوبصورت ڈریس سلوایا تھا۔ ٹائٹ فٹنگ کا وہ ڈریس کچھ کچھ چھپانے اور بہت کچھ دکھانے والا تھا۔ اس ڈریس کو دیکھ کر ماما نے اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا تھا۔ "ارے ڈارلنگ، ایسا ڈریس تو میں نے تمھاری شادی پر سلوانے کا ارادہ کیا تھا۔"

اور وہ شرما گئی تھی۔

اس پر ماما نے کہا تھا۔ "یہ تو یہاں کی لڑکیوں کی طرح شرماتی ہے۔"

اس وقت وہ ڈریس پہن کر ریٹا نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ بہت حسین لگ رہی ہے۔

اس نے بہت ہلکا میک اپ کیا۔ لیکن اس روز اسے خوشبو کا ہوکا ہو گیا تھا۔ خوشبو اس نے لگائی تھی اور پورا کمرا مہک رہا تھا۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ کوئی طویل انتظار نہیں تھا۔

❀......❀......❀

اوتار سنگھ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ اس نے بازار سے کچھ تحفے بھی خریدے تھے۔ تحفے صرف ریٹا اور رچرڈ کے لیے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ اپنے دوستوں کے والدین کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ اسے خیال آیا کہ آج شاید ان سے ملاقات ہو۔ لیکن بہرحال پہلی ملاقات میں انھیں دیکھے، سمجھے اور جانے بغیر ان کے لیے کوئی تحفہ لے کر جانا اس کے خیال میں ممکن نہیں تھا۔

ریٹا پورچ پر اس کی منتظر تھی۔ وہ فر کا لمبا کوٹ پہنے تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ اس کے

رخسار تمتما رہے تھے اور وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ اس نے باہیں پھیلا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

اوتار سنگھ کو اس طرح کے استقبال کی امید نہیں تھی۔ وہ گڑبڑا گیا۔ ایک لمحے کو بے اختیار وہ اس کی باہوں میں چلا گیا۔ پھر اس نے سنبھلتے ہوئے بڑی نرمی اور احتیاط سے اسے پیچھے ہٹا دیا اور اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میری کرسمس ریٹا۔''

''یو سلی...... تمھیں میرے رخسار پر بوسہ دینا چاہیے تھا۔'' ریٹا نے بناوٹی خفگی سے کہا۔

اوتار سنگھ مسکرایا۔ ''تم جانتی ہو کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ البتہ آج کرسمس ہے۔ اس خوشی میں تمھیں کچھ رعایت مل سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ریٹا کا ہاتھ تھاما، اسے اٹھایا اور اس کے ہاتھ کی پشت کو چوم لیا...... صرف ایک ثانیے کے لیے!

ریٹا کو یوں لگا، جیسے کوئی تتلی اس کے ہاتھ کو چھو کر اڑ گئی ہو۔

وہ دونوں اندر ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ وہاں آتش دان دہک رہا تھا۔ کمرا گرم ہو رہا تھا۔

اوتار سنگھ کو گھر پر چھایا ہوا سناٹا بہت غیر فطری لگا۔ گھر میں لوگ موجود ہوں۔ لیکن خاموشی ہو تو بھی گھر کی اپنی آوازیں ہوتی ہیں۔ وہ لفظ نہیں ہوتے۔ مگر وہ آوازیں گھر میں لوگوں کی موجودگی اور رونق کا اظہار کرتی ہیں۔ مگر یہاں تو گہرا سناٹا تھا۔ بس کبھی کبھی آتش دان میں کوئلوں کے چٹخنے کی آواز سناٹے کو تار تار کر دیتی تھی۔

''ارے...... کوٹ اتارنے میں میری مدد کرو نا۔''

ریٹا نے اسے چونکا دیا۔ اس نے بڑی نزاکت سے فر کا وہ کوٹ اتروایا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ سناٹے میں آ گیا۔ ریٹا اس سفید لباس میں آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ مگر وہ لباس ایسا تھا کہ نظر اٹھانا ناممکن ہو گیا تھا۔ اوتار سنگھ کی نظریں جھک گئیں۔

اوتار سنگھ کا ردِعمل بے حد واضح تھا۔ ریٹا نے دانستہ یہ ظاہر کیا، جیسے وہ اس سے بے خبر ہو۔ بے حد سرسری انداز میں اس نے اوتار سنگھ کا کوٹ اتروانے میں اس کی مدد کی۔ اس دوران غیر محسوس طور پر وہ اس کے اتنا قریب ہو گئی کہ ان کی سانسیں ایک دوسرے کو چھونے لگیں۔

اوتار سنگھ نے جلدی سے کوٹ سے جان چھڑائی اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

ریٹا کا جی چاہا کہ اس کے سامنے کھڑی ہو کر کہے...... مجھے غور سے دیکھو اوتار سنگھ۔ کیسی لگ رہی ہوں میں۔ لیکن نسوانی جبلت نے اسے خبردار کر دیا کہ اس طرح وہ ریلیکس نہیں ہو سکے گا۔ لوہے کو اس طرح گرم کرنا ہے کہ خود لوہے کو بھی پتا نہ چلے۔ وقت کی تو اس کے پاس کمی نہیں تھی۔

''بیٹھ جاؤ نا اوتار سنگھ۔''

اوتار سنگھ تھری سیٹر صوفے پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔

اس وقت ریٹا ایک ایسی عورت تھی، جو اپنے بے حد مشکل محبوب کو ہر قیمت پر تسخیر کرنا

چاہتی تھی۔ اور اس نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ جلد بازی میں کھیل بگڑ جائے گا۔ بے صبرا پن اسے اس کی منزل سے دور کر دے گا۔ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لے۔

وہ اوتار سنگھ کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت یہ تاثر دے رہی تھی کہ وہ خود سے...... اپنی حشر سامانیوں سے یکسر بے خبر ہے۔ یوں وہ اپنے جلوؤں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کر سکتی تھی۔

اوتار سنگھ کو نظریں اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

ان دونوں کے درمیان میز حائل تھی۔ میز پر اوتار سنگھ کے لائے ہوئے تحفے رکھے تھے۔ ''میں اپنا تحفہ کھول کر دیکھ سکتی ہوں؟'' ریٹا نے کہا۔

اوتار سنگھ نے اپنی اعصابی کشیدگی کو اپنی حس مزاح سے کم کرنے کی کوشش کی۔ ''کیوں نہیں۔ میں تحفے لایا ہوں، خالی پیکنگ نہیں۔'' اس نے کہا۔

ریٹا کے لیے دو تحفے تھے۔ ریٹا نے پہلے چھوٹا پیکٹ کھولا۔ اس میں سے عطر کی ایک بے حد خوبصورت شیشی نکلی..... بلور کی بڑے خوبصورت ڈیزائن کی خاصی بڑی شیشی۔

''خوبصورت۔'' ریٹا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''مگر میں اسے کیسے اسپرے کروں؟''

''یہ عطر ہے، پرفیوم نہیں۔ اسے اسپرے نہیں کرتے۔ اس کا ڈھکنا کھولو اور دو تین جگہ ہلکا سا لگا لو۔''

ریٹا نے شیشی کھولی اور اسے سونگھا۔ ''یہ کچھ مختلف ہے۔ مگر خوشبو بہت اچھی ہے۔''

''یہ مشرقی خوشبو ہے۔ تیل میں بنائی جاتی ہے، الکحل میں نہیں۔''

ریٹا نے دوسرا پیکٹ کھولا۔ وہ بے حد نازک، خوبصورت اور نفیس نیکلس تھا۔ ''یہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ شکریہ اوتار سنگھ۔ تمھارے ذوق کی داد دینی پڑے گی۔''

''داد عملی ہونی چاہیے۔'' اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پہن کر داد دو گی تو اچھا لگے گا۔''

ریٹا کہنا چاہتی تھی کہ اپنے ہاتھوں سے پہناؤ گے تو پہنوں گی۔ لیکن وہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت چل رہی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے قدرے بے نیازی سے کہا۔ ''مناسب وقت پر پہنوں گی۔''

اب اوتار سنگھ کو پھر گھر کا سناٹا چبھنے لگا تھا۔ اس نے رچرڈ کے تحفے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رچرڈ کہاں ہے؟''

''گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' ریٹا نے بے پروائی سے کہا۔

اوتار سنگھ ایک دم چوکنا ہو گیا۔ ''تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمھارے گھر پر پارٹی ہے۔''

''وہ تو ہے۔ تمھیں اسی لیے تو بلایا ہے۔'' ریٹا بلی اور چوہے کا کھیل کھیل رہی تھی۔ وہ

دیکھ رہی تھی کہ اس کی توقع کے عین مطابق اوتار سنگھ اعصابی تناؤ میں مبتلا ہو گیا۔ اب اس کا اگلا جواب اس تناؤ کو دور کرے گا تو وہ کافی دیر تک پُرسکون رہے گا۔ بلکہ شاید آخر تک پُرسکون ہی رہے۔

''تو پھر؟ گھر میں تو کوئی موجود نہیں ہے!''

''دراصل عین وقت پر وائسرائے کی پارٹی کی دعوت مل گئی۔ میں نے تمھیں سات بجے بلایا تھا۔ اس لیے میں اس پارٹی میں نہیں گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم یہاں اکیلے میرا انتظار کرو اور بور ہو۔''

اس کی توقع کے عین مطابق اوتار سنگھ نہ صرف ریلیکس ہو گیا۔ بلکہ وہ اس کے لیے زیادہ نرم ہو گیا۔ ''یہ تو زیادتی ہوئی تمھارے ساتھ۔''

اس نے کہا۔ ''وائسرائے کی پارٹی تو بہت اہم تھی۔''

''تمھارے اپائنٹ منٹ سے زیادہ اہم نہیں تھی۔'' ریٹا نے اسے لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ کی ممنونیت بہت واضح تھی۔ ''تم مجھے پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع دے دیتیں تو میں بھی گیارہ بجے آ جاتا۔''

''میں نے کہا نا، میرے لیے تمہاری ملاقات دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہم تھی۔''

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ریٹا نے کہا۔ ''سردی بہت زیادہ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور کونے میں رکھی ڈرنکس کی ٹرالی دھکیل کر لے آئی۔ ''یہ موسم برانڈی کا ہے۔'' اس نے ایسے کہا، جیسے موسم پر تبصرہ کر رہی ہو۔ ''تمھارے لیے ڈرنکس بناؤں؟''

''تم جانتی ہو، میں شراب نہیں پیتا۔'' اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔

''جانتی ہوں اور اس پر تمہارا احترام بھی کرتی ہوں۔ مگر اس لیے پوچھ لیا کہ اس موسم میں برانڈی شراب نہیں، ضرورت ہے۔ برانڈی پیو گے تو جسم میں گرمی آئے گی۔''

''بے شک آئے گی۔ مگر نشہ بھی تو ہوگا۔ ویسے بھی میں موسموں سے لڑنے کا قائل نہیں۔ میں تو انھیں انجوائے کرتا ہوں۔''

''تم عجیب آدمی ہو...... سحر انگیز...... مشرق کے شہزادے۔'' ریٹا نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''مَیں جانتی تھی کہ تم برانڈی نہیں پیو گے۔ اس لیے میں نے تمھارے لیے خاص شربت تیار کرایا ہے۔ تاثیر میں یہ بھی برانڈی سے کم نہیں۔ اس میں مشک کا عرق اور دوسری گرم جڑی بوٹیاں ہیں۔'' اس نے شربت کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک گلاس میں انڈیل کر اوتار سنگھ کی طرف بڑھایا۔ ''اب یہ تو بری بات ہوتی نا کہ میں پیتی رہوں اور تم میرا ساتھ نہ دو۔ اب تمہارا اصول بھی نہیں ٹوٹے گا اور تم میرا ساتھ بھی دیتے رہو گے۔''

اوتار سنگھ نے مشروب لے لیا۔ ریٹا نے اپنے لیے برانڈی کا جام بنا لیا تھا۔ ''اتنا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''ضرورت تو تھی۔ دیکھو نا، اب ہم دونوں انجوائے کریں گے۔''

اوتار سنگھ نے شربت کا گھونٹ لیا۔ شربت خوش ذائقہ اور فرحت بخش تھا۔ مگر اس میں ہلکی سی تلخی تھی جو بری بہر حال نہیں لگ رہی تھی۔ اور ایک بات یہ کہ وہ ہلکا نہیں، کافی بھاری تھا۔ اس نے یہ بات ریٹا سے بھی کہی۔

''کڑواہٹ مشک اور جڑی بوٹیوں کی وجہ سے ہے۔ یہ بتاؤ، تمھیں جسم میں گرمی کا احساس ہو رہا ہے یا نہیں۔''

اوتار سنگھ نے مزید چند گھونٹ لیے۔ ''ہاں...... یہ تو ہے۔'' اس نے کہا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسے مشروب کی خوشبو بہت اچھی لگی تھی۔ سچ یہ ہے کہ ایسا شربت اس نے کبھی نہیں پیا تھا۔

ریٹا اپنے منصوبے کے پہلے مرحلے پر کامیابی سے عمل کر چکی تھی۔ اب دوسرا مرحلہ شروع ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اوتار سنگھ علم دوست ہے۔ علمی مباحث اسے بہت پسند ہیں۔ اس کے لیے اس نے خاص طور پر تیاری کی تھی۔

اس نے پہلے ایک موضوع چھیڑا، پھر دوسرا۔ تھوڑی دیر میں اوتار سنگھ سب کچھ بھول کر گفتگو میں کھو گیا۔ پہلی بار وہ ریٹا کی قربت میں خوش تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے اپنے موقف کے حق میں دلائل دے رہا تھا اور ریٹا بڑی معقولیت سے انھیں تسلیم کر رہی تھی۔ کتابوں کے، دانش وروں اور مفکرین کے حوالے دیے جا رہے تھے۔ اوتار سنگھ یہ بھی بھول گیا کہ سامنے ایک لڑکی...... بہت خوبصورت لڑکی ہے۔

ریٹا نے کہیں بھی معاملات کا ٹیمپو تیز نہیں ہونے دیا۔ اس نے شراب کے معاملے میں بھی احتیاط کی۔ اس نے جام پر جام نہیں لنڈھائے۔ مناسب وقفے کے بعد وہ اپنے لیے دوسرا جام بناتی اور ساتھ ہی اوتار سنگھ کا گلاس بھی شربت سے بھر دیتی۔ کک نے اسے بتایا تھا کہ شربت کا نشہ بہت آہستہ آہستہ، لیکن بہت گہرا ہوگا۔

اوتار سنگھ کی جھجک آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ شربت سے کچھ سرور آ رہا ہے۔ وہ کس قدر رترنگ میں آ گیا ہے۔ ناپسندیدہ گفتگو ہو رہی ہوتی یا وہ تناؤ میں ہوتا تو اسے اس بات کا احساس ہو جاتا۔ لیکن وہاں تو اس کی من پسند گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ اپنے اندر کے ان سوالات پر گفتگو کر رہا تھا، جن کے جواب اسے ابھی تک نہیں ملے تھے۔ اور وہ بہت خوش تھا۔ پہلے وہ نظر اٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ کیونکہ ایسا لگتا تھا کہ ریٹا کا لباس جسم چھپانے کے لیے نہیں، بلکہ جسم کے پُرکشش حصوں کی طرف دعوتی اشارے دینے کے لیے سیا گیا ہے۔ لیکن علمی گفتگو

شروع ہوئی تو اس کے نزدیک جنسی تفریق ختم ہوگئی۔ اب نہ وہ مرد تھا اور نہ ریتا عورت۔ وہ تو دو دوست تھے، جو علمی موضوعات پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ اب وہ ریتا کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کر سکتا تھا اور کر رہا تھا۔ یوں اس کی نگاہ اور ریتا کے لباس کے درمیان ایک خاموش مفاہمت ہو گئی۔ اب وہ لباس اسے اپنے لیے تباہ کن نہیں لگ رہا تھا۔

اوتار سنگھ نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بجے تھے۔ وہ اور مطمئن ہو گیا۔ ابھی دس بجے دوسرے لوگ...... کالج کے ساتھی لڑکے اور لڑکیاں آ جائیں گے۔ ترغیب کے جس خطرے کے احساس نے ابتداء میں اسے چوکنا کر دیا تھا، وہ اب دور کی...... بہت دور کی بات لگنے لگا۔

یہ وہ وقت تھا کہ ریتا نے ٹھیک حساب کتاب سے وہ حساس موضوع چھیڑ دیا...... محبت! محبت جو اوتار سنگھ کے لیے بے حد اہم تھی۔

''محبت کے بارے میں تم کیا سمجھتے ہو اوتار سنگھ۔''

اوتار سنگھ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''محبت میرے نزدیک دنیا کا سب سے طاقت ور جذبہ ہے۔ آفاقی جذبہ۔'' اس نے بلا جھجک کہا۔ ''دنیا کی تمام رونقیں اسی کے دم سے ہیں۔''

ریتا کو پہلی بار اوتار سنگھ کی آواز میں لڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ ''اور سیکس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''

سوال اتنا اچانک تھا کہ اوتار سنگھ سناٹے میں آ گیا۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا۔ احساس ہوا کہ اس کے دماغ پر بھی دھندلاہٹ سی طاری ہو گئی ہے۔ شاید کمرے کے گرم ماحول کا اثر تھا۔ چند لمحے بعد اس نے سنبھل کر کہا۔ ''میرا خیال ہے، ہمیں اس پر بات نہیں کرنی چاہیے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اس کی ضرورت نہیں۔''

''میں پہلی بار تمھیں کسی علمی موضوع سے فرار اختیار کرتے دیکھ رہی ہوں۔'' ریتا کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن میں نے کہا نا کہ اس کی ضرورت نہیں۔''

''تو تم اس سے انکار کرتے ہو کہ زندگی میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔''

''نہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن اس وقت ہم محبت کے موضوع پر بات کر رہے تھے۔''

''محبت اور سیکس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔''

''مگر یہ حقیقت ہے۔ ماں کو بیٹے سے اور باپ کو بیٹی سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔''

''میں اس نظریے کو گمراہ کن سمجھتا ہوں اور یہ بات پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اپنے پتا جی سے عشق تھا۔ میں نے کبھی ماتا جی سے اتنی محبت نہیں کی۔''

''میرے خیال میں تو یہ تمھارے ایب نارمل ہونے کا ثبوت ہے۔'' ریتا نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

اوتار سنگھ کو طرارہ آ گیا...... ''یہ بتاؤ، محبت کی معراج کیا ہے؟''

''مجھے تو نہیں معلوم۔ تم ہی بتا دو۔'' ریتا کا لہجہ اکسانے والا تھا۔

''خدا کی اپنے بندوں سے محبت میرے نزدیک محبت کی معراج ہے۔''

''خدا کی...... آل مائٹی کی محبت اور چیز ہے۔ اسے ہم کبھی پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ بات کرو، جو میری سمجھ میں آئے'' ریتا نے اسے چھیڑا۔

''انسانوں کی بات کرتی ہو تو بندے کی خدا سے محبت، محبت کی معراج ہے۔''

''چلو مان لیا۔ تو پھر؟''

''اور اس محبت میں سیکس کا کوئی دخل نہیں۔'' اوتار سنگھ نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

ریتا گھوم گئی۔ اوتار سنگھ کی ذہانت میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس نے بے ضرر سی بات میں اپنے موقف کے لیے ایک ایسی دلیل نکال لی تھی، جس کی کاٹ نہیں کی جا سکتی تھی۔ ''یہ بھی آسمانی محبت ہے۔'' وہ بولی۔ ''مجھ سے زمینی محبت...... حقیقی محبت کی بات کرو۔''

''چلو ماں کی اپنے بچے سے محبت کی بات کر لو۔''

''میں نے کہا نا کہ اس میں سیکس کا دخل ہوتا ہے۔ تمہارا تجربہ، تمہارا رویہ انفرادی ہے۔ جبکہ یہ ایک مسلمہ نظریہ ہے کہ ماں بیٹے سے زیادہ محبت کرتی ہے اور باپ بیٹی سے۔''

''اور میں کہہ چکا ہوں کہ یہ گمراہ کن نظریہ ہے...... پاکیزہ رشتوں کو داغ دار کرنے کی سازش۔ اس نظریے کو تسلیم کر لیا جائے تو کوئی معاشرہ اچھا معاشرہ نہیں رہے گا۔''

''میرا خیال ہے، یہ بات طے ہو چکی تھی کہ صرف مدلل گفتگو کی جائے گی۔''

''دلیل تو موجود ہے۔ ذرا تصور کرو کہ ایک بے بس نوزائیدہ بچہ جو اپنی کوئی ضرورت پوری نہیں کر سکتا، ماں اس کی ہر ضرورت پوری کرتی ہے۔ خود تکلیف اٹھاتی ہے۔ اسے آرام پہنچاتی ہے۔ خود گیلے میں سوتی ہے، اسے سوکھے میں سلاتی ہے۔ تو تمھارے خیال میں اس محبت بھری نگہداشت کے پیچھے سیکس کارفرما ہے۔ نہیں بھئی، مجھے تو یہ خیال ہی شرم ناک لگتا ہے......''

اوتار سنگھ اب جوش کے عالم میں بول رہا تھا۔

ریتا بے حد مطمئن تھی۔ کچھ تو وہ نشے میں آ چکا تھا اور اب اس جوش کے عالم میں اسے

ہوش نہیں تھا کہ ریٹا نے اس کے سامنے برانڈی کا جام رکھ دیا ہے۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔

"...... اگر میں اس نظریے کو درست مان لوں، تب تو ایک ماں کو اپنی بیٹی کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہی۔ لیکن نہیں۔ وہ اپنی نوزائیدہ بیٹی کا بھی اسی طرح خیال رکھتی ہے، جیسے بیٹے کا۔ اگر مائیں اولاد سے محبت نہ کریں تو اولاد جی ہی نہیں سکتی۔" اب اس کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ کسی دلیل کی ضرورت رہ جاتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے موثر دلیل سے اپنی بات ثابت کر دی۔" ریٹا نے اس کے جام میں پھر برانڈی انڈیل دی۔ "لیکن یہ تو کوئی معقول بات نہیں کہ تم مرد اور عورت کی عام محبت سے انکار کر دو۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ میں تو محبت کی عظمت کا قائل ہوں۔"

"تو مرد اور عورت کی محبت میں سیکس کا دخل تو ہوگا۔"

اب شراب اوتار سنگھ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔ "یہ میں نہیں مانتا۔ یہ تو پھر ہوس ہوئی نا۔"

ریٹا نے اس کی بے بسی محسوس کر لی ہے۔ لوہا گرم ہو رہا تھا۔ "دلیل سے بات کرو اوتار سنگھ۔ مرد اور عورت میں محبت ہوگی تو سیکس کا عنصر بھی ہوگا۔ اب محبت اس حقیقت کو تو نہیں مٹا سکتی نا کہ دونوں کا تعلق مخالف جنس سے ہے اور ان کے درمیان جنسی کشش موجود ہے۔"

"مگر یہ تو دیکھو کہ دنیا کے ہر مذہب میں شادی کا تصور موجود ہے۔ کسی مذہب نے بھی اس معاملے میں انسان کو آزاد نہیں چھوڑا۔ ہر مذہب نے مرد اور عورت کو ایک خاص مرد اور عورت کا پابند کیا ہے۔ ورنہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہ رہتا۔"

ریٹا مسکرائی۔ اس نے نہیں کہا کہ وہ موضوع سے ہٹ رہا ہے۔ اوتار سنگھ کی زبان کی لڑکھڑاہٹ بڑھ گئی تھی۔

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ، تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ میرے اور تمھارے درمیان کیا تعلق ہے؟"

اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "ہم دوست ہیں...... اچھے دوست۔"

"دیکھو میں تمہارا کتنا لحاظ کرتی ہوں۔ ایٹی کیٹس کے مطابق ہمیں ساتھ بیٹھنا چاہیے تھا۔ لیکن میں تم سے دور بیٹھی۔ اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ لیکن تم مجھے دوست سمجھتے ہو نا۔ تو دوست سے دور بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں۔ آؤ میرے پاس آ کر بیٹھو۔" "لیکن تم لڑکی ہو......"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دوستی میں تو سیکس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔" ریٹا مسکرائی۔

"ہمارے درمیان سیکس کا مسئلہ ہے ہی تو نہیں۔ یا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ مسئلہ موجود ہے۔"

اوتار سنگھ کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ شراب کے اثر کی وجہ سے اس کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ بس اس کی سمجھ میں اتنا آیا کہ اس وقت وہ ہچکچا گیا تو ریٹا اس کی بات پکڑ لے گی۔ وہ اٹھا اور دوسرے صوفے کی طرف چلا۔ درمیان وہ میز سے الجھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا دماغ جس دھندلاہٹ کا شکار ہو رہا ہے، اسے نشہ کہتے ہیں۔

ریٹا کے لیے اس کے قدموں کی وہ لڑکھڑاہٹ بہت خوش آئند تھی۔

اوتار سنگھ اس کے برابر آ بیٹھا۔ "اتنی دور کیوں بیٹھے ہو۔" ریٹا نے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم تو دوست ہیں نا۔"

"ہاں...... ہم دوست ہیں۔"

ریٹا نے اس کے سامنے برانڈی کا جام رکھا۔ "پیو نا۔"

اس بار اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ شربت نہیں، شراب ہے۔ "یہ تو شراب ہے۔" اس نے معترضانہ انداز میں کہا۔

"یہ بتاؤ، تمھیں نشہ تو نہیں ہوا۔ تم بہکے تو نہیں؟"

"نہیں۔ لیکن تم مجھے شراب کیوں دے رہی ہو۔"

"یو سلی۔ تمھیں پتا بھی نہیں اور تم چار جام پی چکے ہو۔ دیکھ لو۔ برانڈی سردی دور کر کے جسم کو چست اور توانا کرتی ہے۔ نشہ تھوڑا ہی ہوتا ہے اس سے" اوتار سنگھ کو نشہ تو ہو رہا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ نشہ اس پر اثر کر رہا ہے۔ اس نے دل میں سوچا، بات تو ٹھیک ہے۔ جسم میں گرمی آ گئی ہے اور مجھے نشہ بھی نہیں ہوا۔ نشے میں ہوتا تو بحث میں ریٹا کو کیسے قائل کرتا۔ جبکہ آج وہ خلافِ توقع بہت اچھی دلیلیں دے رہی تھی۔

چنانچہ اس نے جام قبول کر لیا۔

تین چار جام کے بعد وہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہا۔ اب اس کی آواز بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ ایسے میں اس کی نظر ریکلس کے مخملی باکس پر پڑ گئی۔ "تم آچھی ڈوست...... ہو...... ریٹا۔" اس نے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... میں مانتی ہوں۔ میں اچھی دوست نہیں ہوں۔"

"کیوں...... کیوں ناہیں ہو......؟"

"دراصل میں تمہاری دوست نہیں ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں نا۔"

’’محبت کرتی ہو۔تو میرا نیکلس کا تحفہ...... کیوں نہیں۔‘‘

’’تم اپنے ہاتھوں سے پہناؤ گے تو پہنوں گی۔‘‘

’’یہاں نہیں۔‘‘ ریٹا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ’’میرے ساتھ چلو۔سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر دیکھوں گی۔‘‘

’’چلو...... چالو......ابھی چالو......‘‘

ریٹا اسے اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔اوتار سنگھ نے بیڈ روم کا جائزہ لیا اور ستائش لہجے میں بولا۔ ’’بھوت...... بھوت خوبصورت......!‘‘

بیڈ کے پہلو میں وہ بڑی خوبصورت ڈریسنگ ٹیبل تھی، جس میں بڑا آئینہ لگا تھا۔ریٹا اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔اس نے بڑی ادا سے اپنے بال گردن سے ہٹائے اور بولی۔ ’’لو......اب اپنے ہاتھوں سے نیکلس مجھے پہنا دو۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے نیکلس باکس سے نکالا اور اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

اوتار سنگھ نیکلس ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے آیا۔اس کی نظر آئینے میں اپنے اور ریٹا کے عکس پر پڑی۔وہ ایسا ہوش ربا منظر تھا کہ اس کی نظریں بے اختیار بہکنے لگیں۔اس کی انگلیوں میں لرزش تھی۔نیکلس کی ڈوری کسنے میں اسے خاصی دقت ہوئی۔

’’اب دیکھو، کیسا لگ رہا ہے۔‘‘ ریٹا نے اٹھلا کر کہا۔

لیکن اوتار سنگھ کی نظریں نیکلس پر ٹھہر نہیں رہی تھیں۔اس کے وجود میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔اسے اپنے جسم میں ایسی سرکش اور تند کیمیاوی تبدیلیوں کا ادراک ہو رہا تھا، جن سے وہ ناواقف تھا۔اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج ہوگئی تھیں۔کچھ کرنے، کچھ کر گزرنے کی اندھی خواہش میں اس کا جسم پھنک رہا تھا اور اس کا وجود باہر سے ہی نہیں، اندر سے بھی بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔

ریٹا نے آئینے میں اس کے چہرے پر اس کی اندرونی کیفیات کا عکس دیکھا اور مسکرا دی۔اس نے اپنے پتے بڑی احتیاط سے، بڑے ماہرانہ انداز میں کھیلے تھے۔اسے یقین تھا کہ اب اوتار سنگھ اس کے سحر سے نہیں نکل سکتا۔اس کے اندر کا طوفان اسے جلد بازی پر اکسا رہا تھا۔لیکن اس وقت وہ عورت نہیں، صرف ایک شکاری تھی، جو اپنے چالاک اور دشوار شکار کو بچ نکلنے کا کوئی موقع نہ دینا چاہے۔

اس نے اب بھی جلد بازی نہیں کی۔اس نے آئینے میں اوتار سنگھ کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔ ’’میں تمھیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں اوتار سنگھ۔‘‘

اوتار سنگھ اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھا۔ ’’ہم......ہوں......‘‘ اس نے کہا۔

’’یہ تصویر دیکھ رہے ہو۔‘‘ ریٹا نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی اپنی بڑی، فریم میں لگی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

’’تمھاری ہے...... خوبصورت ہے......‘‘ اوتار سنگھ کی آواز میں لرزش بھی تھی اور لڑکھڑاہٹ بھی۔

ریٹا نے دو انگلیوں سے اپنی تصویر کھینچ کے باہر نکال لی۔ ’’اب دیکھو......‘‘

اوتار سنگھ نے ریٹا کی تصویر کے نیچے سے برآمد ہونے والی تصویر کو دیکھا۔وہ تصویر کچھ کچھ اس کی لگ رہی تھی۔کچھ کچھ اس لیے کہ تصویر میں وہ کسی انگریز نائٹ کے گیٹ اپ میں تھا اور گھوڑے پر سوار تھا۔ ’’یہ تو......یہ مجھ سے......ملتی جلتی ہے۔‘‘

’’سلی، یہ تمھاری ہی تصویر ہے۔میں نے ایک آرٹسٹ سے خاص طور پر بنوائی ہے۔‘‘ ریٹا نے کہا۔پھر محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ’’یہ تصویر سامنے بھی رہے تو کوئی مجھے کچھ نہیں کہے گا۔لیکن میں نے محبت کو چھپانے کے آداب تم سے سیکھے ہیں۔‘‘ اس نے اپنی تصویر پھر اس کی تصویر پر لگا دی۔ ’’یہ تصویر بتاتی ہے کہ میں تمھیں کیسا دیکھتی ہوں۔‘‘

لیکن اوتار سنگھ کی نظریں اب تصویر پر نہیں تھیں۔وہ تو مبہوت ہو کر ریٹا کے عکس کو دیکھے جا رہا تھا۔اس کے اندر اٹھنے والا طوفان اور تند ہو گیا تھا۔عین اس لمحے ریٹا پلٹی۔اوتار سنگھ اس کے قریب ہی تھا۔پلٹتے ہوئے وہ اس سے ٹکرائی اور دانستہ لڑکھڑائی۔اوتار سنگھ نے بے ساختہ اسے سہارا دیا۔اور اگلے ہی لمحے وہ اس کی باہوں میں تھی۔

’’چلو......ڈانس کرو میرے ساتھ۔‘‘

وہ رقص کرنے لگے۔لیکن وہ رقص نہیں تھا۔وہ قربت کا بے ربط اور غیر منظم بہانہ تھا۔اوتار سنگھ کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔اس کی سانسیں اور اس کے ہاتھ بہک رہے تھے۔دماغ کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ ’’سوری ریٹا......میں......نہیں کر سکتا۔‘‘ اس نے بہ مشکل کہا۔

’’تمھارے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔آؤ، لیٹ جاؤ۔‘‘ ریٹا نے اسے اس طرح کھینچا کہ وہ خود بیڈ پر گری اور اوتار سنگھ اس کے اوپر گرا۔

اوتار سنگھ کے لیے وہ بجلی کا وہ کڑاکا تھا، جو کب سے رکے ہوئے طوفان کے پھٹ پڑنے کا اعلان کر رہا تھا۔

اور پھر طوفان پوری شدت سے آ گیا!

ریٹا پوری طرح ہوش و حواس میں تھی اور اوتار سنگھ ہوش و حواس سے پوری طرح بیگانہ تھا۔ریٹا چالاک شکاری تھی، جس نے بڑی مہارت اور چابک دستی سے جال پھیلایا تھا اور اوتار سنگھ شکار تھا، جو جال کے خلاف مزاحمت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔لیکن شکار کا انداز شکاریوں کا

سا تھا، جیسے وہ شکار کھیل رہا ہو۔

نہایت قربت کے ان لمحوں میں احساسِ فتح سے معمور ریٹا اب تک احتیاطاً شکاری کا روپ دھارے ہوئے تھی۔ اب جبکہ وہ فتح یاب ہو چکی تھی تو اس کے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں تھا کہ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے۔ بنیادی طور پر وہ عورت تھی اور عورت بن کر ہی وہ ان لمحوں کو صحیح معنوں میں انجوائے کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے شکاری کا لبادہ اتار پھینکا اور عورت بن گئی۔

اور اس کی یہی غلطی اس کی شکست کا سبب بن گئی!

اوتار سنگھ بے خود تھا، اور تیزی سے وحشت کی سرحدوں میں داخل ہو رہا تھا۔

''آئی لو یو اوتار سنگھ۔'' ریٹا نے سرگوشی میں کہا۔ ''میں کب سے ان لمحوں کا خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن میں خواب دیکھنے والی لڑکی نہیں، عملی لڑکی ہوں۔ تعبیر کی فکر کرتی ہوں۔ یہ لمحے میں نے تخلیق کیے ہیں۔''

لیکن اوتار سنگھ کچھ سننے کے قابل نہیں تھا۔

''اب دیکھ لو۔'' ریٹا فاتحانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''تم خدا کی بندے سے اور بندے کی خدا سے محبت کی بات کرتے تھے۔ لیکن وہ آسمان پر کی جانے والی محبت ہے، جو زمین پر نہیں پنپ سکتی۔ علمی بحث کرنا اور بات ہے۔ مگر زمینی حقائق کا سامنا کرنا دوسری بات ہے......''

خدا کا نام سنتے ہی اوتار سنگھ کو لگا کہ اس کے سر پر ٹھنڈے یخ پانی کی پوری بالٹی انڈیل دی گئی ہے۔ اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس نے ایک طویل جھرجھری لی اور پہلی بار ہوش میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا......

ریٹا پارسن بے خبر تھی کہ اس سے ناقابلِ تلافی غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ وہ اس وقت محض ایک عورت تھی، جو اس فتح کے احساس سے سرشار تھی، جس کی وہ طویل عرصے سے آرزو مند تھی۔ وہ اس وقت اپنی اس مایوسی، جھنجلاہٹ اور بے بسی کا بدلہ لینا چاہتی تھی، جس میں اوتار سنگھ کی استقامت نے اسے مبتلا کیے رکھا تھا۔ وہ فاتحانہ لہجے میں کہے جا رہی تھی۔ ''اور وہ لڑکی، جس سے تم محبت کرتے ہو۔ جس کی تم نے صرف آواز سنی ہے۔ جسے تم نے کبھی دیکھا نہیں ہے۔ تم نے کہا تھا کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ لیکن حسن پرست ہونے کے باوجود تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ تم اس اَن دیکھی لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ وہ بھی آسمانی محبت تھی اوتار سنگھ۔ اب دیکھ لو، تم میری خوبصورتی کو عملاً سراہ رہے ہو۔ اس لیے کہ وہ لڑکی محض خیال ہے اور میں گوشت پوست کی جیتی جاگتی حقیقت ہوں۔ خیال کتنا ہی توانا ہو، ایک کمزور حقیقت سے کبھی نہیں لڑ سکتا۔ آج میں تمہاری باہوں میں ہوں اور اس لڑکی کا خیال بھی تمہارے ذہن میں نہیں ہے......''

آواز والی لڑکی کا حوالہ ہوش میں آتے ہوئے اوتار سنگھ کو پوری طرح ہوش میں لے آیا تھا۔ اس حوالے نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اب معاملہ بالٹی کا نہیں تھا، اسے اپنے سر پر یخ پانی کی موٹی دھار مسلسل گرتی محسوس ہو رہی تھی۔ کھلی ہوش مند آنکھوں سے اس نے خود کو اور ریٹا کو جس حال میں دیکھا، اس نے اسے شرمسار کر دیا۔ ارے...... یہ کن پستیوں میں گر گیا ہے وہ۔ ایسا تو اس نے تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ محبت کا، اس کی حرمت اور تقدس کا دعوے دار یہ کہاں آ پہنچا......

اور ریٹا، اس سے بے خبر، آنکھیں موندے اپنا اعلانِ فتح کیے جا رہی تھی۔ ''میں وہ خوبصورت حقیقت ہوں اوتار سنگھ، جس سے تم نظریں نہیں چرا سکتے۔ دیکھو...... مجھے چھو کر دیکھو، میں کتنی حسین ہوں۔ آؤ...... مجھے تسخیر کر لو اوتار سنگھ......'' یہ کہتے ہوئے اچانک اسے احساس ہوا کہ اوتار سنگھ کی پیش قدمی رک چکی ہے۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

اوتار سنگھ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہو گیا اوتار سنگھ، آؤ نا۔'' ریٹا نے اسے کھینچنے کی کوشش کی۔

اوتار سنگھ نے اسے جھٹک دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے قدموں میں اب لڑکھڑاہٹ بھی نہیں تھی۔ ''نہیں ریٹا...... مجھے تم کو چھونے کا کوئی حق نہیں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اور تم جسے آسمانی محبت کہتی ہو، وہی زمین پر کی جائے تو محبت کی معراج ہوتی ہے میں تو محبت کا آدمی ہوں۔ جہاں تک آ چکا ہوں، اس پر ہی عمر بھر خود سے شرمندہ رہوں گا۔ آگے بڑھنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ریٹا تیزی سے اٹھی اور پاگلوں کی طرح اس کی طرف جھپٹی۔ ''اب تم پیچھے نہیں ہٹ سکتے اوتار سنگھ۔ تم جانتے ہو کہ تم سرینڈر کر چکے ہو۔''

لیکن اتنی دیر میں اوتار سنگھ بیڈروم سے نکل چکا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکی۔

اوتار سنگھ ڈرائنگ روم میں کوٹ اسٹینڈ سے اپنا کوٹ اتار رہا تھا۔ ریٹا جا کر اس سے لپٹ گئی۔ ''تم مجھے ایسے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔''

اوتار سنگھ نے نرمی سے اسے ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو کسی ہشت پا کی طرح اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ ''پلیز ریٹا، ہٹ جاؤ۔ مجھے جانے دو۔''

''میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔'' ریٹا پر وحشت طاری تھی۔

''دیکھو ریٹا، میں عورت کی بہت عزت کرتا ہوں۔ مجھے جانے دو۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے؟''

''نہیں۔ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔''

ریٹا نے اسے اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس نے ریٹا کے دونوں ہاتھ سختی سے تھامے اور اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔ ریٹا نے پھر اس سے لپٹنے کی کوشش کی۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

ریٹا کوشش کے باوجود اس سے نہ لپٹ سکی۔ اور وہ چلا گیا۔ ریٹا باہر تک اس کے پیچھے گئی۔ لیکن تماشہ بننے کے خیال سے وہ زبردستی نہیں کر سکی۔ وہ واپس آئی تو اس حال میں کہ اس کا وجود ناکامی اور توہین کے احساس سے پھنک رہا تھا۔

اس نے اپنے لیے جام بنایا اور پینے لگی۔ اس نے پے در پے کئی جام پیے۔ وہ اس توہین کو بھلا دینا چاہتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے نشہ بڑھ رہا تھا، توہین کا احساس اور شدید ہو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو اسے لگا کہ اوتار سنگھ لوٹ آیا ہے۔ ''کم ان۔'' اس نے تمکنت بھرے لہجے میں کہا۔

لیکن آنے والا کک تھا۔ ''کھانا تیار ہے مس صاب۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ ذائقہ نہیں رہے گا مس صاب۔'' کک نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''گیٹ آؤٹ۔ لیو می الون۔'' وہ دہاڑی۔

کک سہم کر چلا گیا۔

وہ پیتی رہی۔ اس کے ہوش و حواس جواب دینے لگے۔ لیکن رد کیے جانے کی توہین کا احساس اب بھی ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ جب اسے احساس ہوا کہ وہ اب بیٹھ نہیں سکتی۔ تو وہ اپنے بیڈروم میں جا کر بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

❀……❀……❀

اوتار سنگھ بڑی عجیب ذہنی کیفیت میں باہر نکلا تھا۔ وہ نشے میں تھا، یہ ایک ایسی حقیقت تھی، جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن ہر آدمی کے اندر کچھ نظریات ہوتے ہیں، جو اس کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں...... زندگی جیسے اہم! وہ زد پر آئیں تو نشے میں ہونے کے باوجود اس کے اندر مدافعت ابھرتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ پوری طرح سوچنے سمجھنے کے قابل تو نہیں تھا۔ لیکن اس احساس نے کہ جس چیز کو وہ بے حد مقدس سمجھتا تھا، اس پر غلاظت کے چھینٹے آئے ہیں، اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس کا ذمے دار وہ خود ہے۔ اس لمحے اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ شرمندہ بھی تھا اور جھنجلایا ہوا بھی۔ وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا، اس لیے خود ملامتی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس چیز نے ایک مہیب موج کی طرح اسے نشے کے سمندر سے اوپر

اچھال دیا تھا...... مگر صرف کچھ دیر کے لیے!

اس کے حواس اس وقت صرف ایک نکتے پر مرکوز تھے۔ اسے اس گندگی، اس غلاظت سے نکلنا تھا۔ یہ اس کا یک نکاتی ہنگامی ایجنڈا تھا اور جس طرح سے ریٹا نے ہنگامہ کیا تھا، اس پر عمل درآمد آسان نہیں لگ رہا تھا۔

اب وہ باہر نکل آیا تو اسے کم از کم یہ سکون ہو گیا کہ محبت کا مقدس تصور اب غلاظت کے چھینٹوں سے محفوظ ہو گیا ہے۔ اس کی شرمندگی، جھنجلاہٹ اور خود ملامتی اب بھی اس کے اندر کہیں موجود تھی۔ لیکن اوپر کا سکون زیادہ اہم تھا۔ پھر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے چہرے سے ٹکرائے تو نشہ پھر گہرا ہونے لگا۔ اس کے قدم پھر لڑکھڑانے لگے۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ سردی اپنے پورے شباب پر تھی۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ کہیں کوئی سائیکل رکشہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ یہ بڑی بات تھی کہ راستہ اسے معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے، کہاں پہنچنا ہے۔

سامنے کچھ فاصلے پر اسے روشنی رقص کرتی نظر آئی۔ روشنی کیا، کبھی وہ آگ لگتی تھی...... اور وہ ایک دائرے کی شکل میں گھومتی ناچتی نظر آ رہی تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ اس کے نشے کا کمال ہے۔

وہ دو پولیس والے تھے، جنھیں رات کے گشت پر مامور کیا گیا تھا۔ دو تین گھنٹے کے گشت نے ان کے جسم میں وقتی طور پر گرمی تو بھر دی تھی۔ لیکن انھیں تھکا بھی دیا تھا۔ ستانے کے لیے وہ ایک دکان کے سائبان کے نیچے بیٹھے تو سردی کا احساس زیادہ ہی ہونے لگا۔ انھوں نے اِدھر اُدھر سے لکڑیاں اور کاغذ جمع کیے، آگ جلائی اور ہاتھ تاپنے لگے۔

انھیں سوٹ پہنے ایک جوان لڑکا لڑکھڑاتا ہوا آتا دکھائی دیا تو وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے جسم اب تک کافی گرم ہو گئے تھے۔

اوتار سنگھ قریب آیا تو انھوں نے اسے للکارا۔ ''کون ہے؟ رک جاؤ۔''

اوتار سنگھ رک گیا اور انھیں غور سے دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''اوہو...... نشے میں بھی ہے۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔

''لگتا ہے، بڑا دن منا کے آ رہا ہے۔'' دوسرے نے تبصرہ کیا۔

''بڑی رات کہو۔'' پہلے نے ترمیم کی۔

اوتار سنگھ خاموش رہا۔ اسے وہ دونوں اِدھر اُدھر ڈولتے نظر آ رہے تھے۔

اچھا لباس قانون کے رکھوالوں کو ہر دور میں مرعوب کرتا رہا ہے۔ اوتار سنگھ آقاؤں کے لباس میں تھا۔ مگر اپنی سرخ و سپید رنگت کے باوجود وہ آقاؤں میں سے نہیں لگتا تھا۔ پھر بھی آقاؤں

کے لباس نے انھیں مرعوب کر دیا۔ ''کہاں سے آ رہے ہو راج کمار؟'' ایک نے پوچھا۔

''کرنل پارسن کے گھر سے۔''

''اوہو...... گورے راجا کے گھر گئے تھے۔ نام کیا ہے تمہارا؟''

''نام سے کیا...... ہوتا...... ہوتا ہے۔ نام تو...... اوتار سنگھ...... ہے۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ نام تو اوتار سنگھ ہے۔ پر ایک خدا کو...... مانتا ہوں۔''

''اور شراب گوروں کی پیتے ہو۔'' پولیس والے نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''تم نے...... مو جھے روکا...... کیوں......؟''

''تمھارے بھلے کے لیے۔ تم مُسلے ہوتے تو سمجھاتے کہ اتنی رات کو اکیلے پھر رہے ہو۔ کوئی چھرا گھونپ دے گا۔ مگر تم تو اوتار سنگھ ہو۔ تمھیں کوئی خطرہ نہیں۔ جانا کہاں ہے تمھیں؟''

لیکن اوتار سنگھ کے دماغ میں مُسلے والی بات پھنس گئی تھی۔ ''چھرا گھونپنے سے پہلے نام بھی پوچھتے ہیں کیا؟'' اس نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

''ہاں...... اُوش پوچھتے ہیں کہ کہیں ہندو جاتی کے ساتھ ظلم نہ ہو جائے۔''

''اور اوتار سنگھ کے اندر...... کوئی محمود ہو تو؟''

''جاؤ بھائی جاؤ۔ تمھیں چڑھ رہی ہے۔ پرنتو یہ بات کسی چھرے والے سے نہ کہنا۔''

''تم ہندو ہو؟''

''ہاں۔''

''تو مسلمان بھی تو ہوں گے پولیس میں۔''

''وہ کہاں نوکری کرتے ہیں۔ ان کو تو راج کرنے کی عادت ہے نا۔ پر اب وہ دن گئے۔ اب تو نوکری بھی نہیں ملے گی۔ غلامی کریں گے غلامی۔''

''جبھی تو وہ...... یہاں نہیں...... رہنا چاہتے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''چھوڑو مہاراج۔ تم جاؤ۔''

اوتار سنگھ چل دیا۔ وہ نشے میں تھا۔ لیکن کچھ باتیں اسے چبھ رہی تھیں۔ سڑکوں پر قتل کیے جانے کا خطرہ صرف مسلمانوں کے لیے تھا۔ ہندو اس سے محفوظ تھے۔ تو ایسے غیر محفوظ ملک میں وہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ جبھی تو وہ الگ ملک مانگ رہے ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ اگر سر سید احمد خان نے انگریزی تعلیم کے حق میں تحریک نہ چلائی ہوتی تو مسلمان بہت پیچھے رہ جاتے۔ بہرحال تعلیم کے میدان میں اب بھی وہ ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے اور یہ بھی حقیقت تھی کہ ان کا ملازمتوں کی طرف رجحان نہیں تھا۔ وہ سنگین حال میں جی

رہے تھے۔ لیکن درحقیقت وہ اب بھی اپنے عظیم الشان ماضی سے چمٹے ہوئے تھے۔ یہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ یہ خود فریبی انھیں کچھ نہیں دے گی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ جانے پہچانے راستوں پر بے اختیار چلتا رہا۔ نشے میں ہونے کے باوجود وہ راستہ نہیں بھٹکا۔ اس کے قدم خودکار انداز میں گھر کی طرف اٹھتے رہے۔

گھر پہنچ کر وہ بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر گیا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا ہے۔

●......●......●

ناشتے کی میز پر سب کو احساس ہو گیا کہ ریٹا کا موڈ بہت خراب ہے۔ ایسے میں رچرڈ کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ اس سے کنارہ کش رہے۔ کچھ پوچھے تو جواب دے دے اور حتی الامکان اس سے الجھنے سے بچے۔

الزبتھ اور جیمز بھی اسے نظرانداز کر رہے تھے۔ لیکن ناشتے کی میز پر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا...... خاص طور پر الزبتھ کے لیے۔

الزبتھ نے ٹوسٹ پر مکھن لگایا اور ریٹا کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ جوس کا گلاس پہلے ہی اس کے سامنے رکھا تھا۔

ریٹا نے کوئی تعرض نہیں کیا اور ٹوسٹ اٹھا کر کھانے لگی۔ وہ اچھی علامت تھی۔

''تمھیں کافی دوں مائی ڈیر؟'' کچھ دیر بعد الزبتھ نے پوچھا۔

''جی ماما۔''

الزبتھ نے کافی کا مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''رات پارٹی میں بہت لوگ تمھیں پوچھ رہے تھے۔'' اس نے کہا۔

''ہوں ہم۔''

''مائیک اینڈرسن تمھیں بہت مس کر رہا تھا۔ بار بار تمہارا پوچھتا۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے مائی بے بی۔''

''یس ماما۔ میں نے کب کہا کہ وہ برا ہے۔'' ریٹا نے بے پروائی سے کہا۔

''اینڈرسنز بھی تو وطن واپس جا رہے ہیں۔'' جیمز پارسن نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

''نیو ائیر وہ وہیں منائیں گے۔ 28 تاریخ کو ان کی روانگی ہے۔'' الزبتھ بولی۔

''واہ...... کرسمس یہاں اور نیو ائیر وہاں۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ۔'' ریٹا نے تبصرہ کیا۔ لیکن اس کے لہجے میں پھیکا پن تھا۔

الزبتھ کو فضا قدرے سازگار محسوس ہوئی۔ ''رات تمہاری پارٹی بہت جلدی ختم ہو گئی

تھی؟'' اس نے بے حد سرسری طور پر پوچھا۔

''نہیں تو ماما۔'' ریٹا نے بے ساختہ کہا۔ پھر سنبھل کر پوچھا۔ ''آپ لوگ کس وقت واپس آئے تھے؟''

''ڈھائی بجے تھے۔'' الزبتھ نے جواب دیا اور تائید طلب نظروں سے شوہر کو دیکھا۔ جیمز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہماری پارٹی ڈیڑھ بجے ختم ہوئی تھی۔'' ریٹا نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''تب بھی جلدی ہی ختم ہوئی نا۔'' الزبتھ نے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ ریٹا جھوٹ بول رہی ہے۔ رات وہ لوگ واپس آئے تو گھر کی ایسی صورت حال ہرگز نہیں تھی، جیسے وہاں پارٹی ہوئی ہو۔ اس پر الزبتھ پارسن کو تشویش ہوئی۔ ریٹا کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے کک سے پوچھ گچھ کی تو اسے سب معلوم ہو گیا۔ ریٹا نے کک کو صرف دو افراد کے ڈنر کے لیے کہا تھا...... اور اس کے پاس صرف ایک مہمان آیا تھا۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ واپس گیا تھا اور اس عالم میں کہ ریٹا چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی، زبردستی اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں رکا تھا، چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ریٹا اکیلی بیٹھی پیتی رہی تھی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور کک کو ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔

الزبتھ پارسن کو یہ سب معلوم تھا لیکن اس نے ریٹا سے کچھ نہیں کہا۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ وہ لوگ پارٹی سے ڈھائی بجے نہیں، بلکہ ایک بجے واپس آئے تھے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی بیٹی محبت کی چوٹ کھائے بیٹھی ہے اور مایوسی سے دوچار ہے۔

اس نے ریٹا کی طرف دوسرا ٹوسٹ بڑھایا۔ ریٹا نے وہ بھی لے لیا۔ ظاہر ہے، وہ رات سے بھوکی تھی۔

''یہ بتاؤ، تمھارے دوستوں نے انجوائے تو خوب کیا نا؟'' الزبتھ نے اچانک پوچھا۔

ریٹا گڑبڑا گئی۔ ''یس ماما، بہت زیادہ۔'' اس نے جلدی سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''اور تم نے؟'' الزبتھ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

''میں نے بھی ماما۔'' ریٹا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''مگر تم خوش تو نہیں لگ رہی ہو۔''

''وہ ماما نیند پوری نہیں ہو سکی ہے نا، اس لیے۔''

الزبتھ اب جو بات کر رہی تھی، وہ ایک منصوبے کے مطابق تھی۔ رات اس نے اس سلسلے میں جیمز سے بھی بات کی تھی۔ وہ دونوں جانتے تھے...... رچرڈ بھی انھیں اشارتاً بتا چکا تھا کہ ریٹا ایک ہندوستانی لڑکے سے محبت کرتی ہے، جو ہندو ہے بلکہ رچرڈ نے اس کی بہت...... بہت

زیادہ تعریف بھی کی تھی۔ رچرڈ نے انھیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کرسمس پر ریٹا نے صرف اوتار سنگھ کو بلایا ہے۔ الزبتھ اس بات سے خوش نہیں تھی۔ لیکن جیمز کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

مگر رات جو کچھ انھوں نے دیکھا اور سنا، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ لڑکا ریٹا میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔ الزبتھ کا کہنا تھا کہ یہ وقت برطانیہ واپس جانے کا تذکرہ کرنے کے لیے مناسب ہے۔ شکستہ دلی کی وجہ سے ریٹا اس وقت مان بھی سکتی ہے۔ لیکن جیمز کا کہنا تھا کہ وہ اس سلسلے میں براہ راست لڑکے سے بات ضرور کرے گا۔

اس وقت الزبتھ نے اس سلسلے میں پہل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ''میں تو بس اب تھوڑے ہی دن تمھارے ساتھ ہوں ریٹا۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب ماما۔'' ریٹا بری طرح چونکی۔

''کرنل ولکسن سے بات ہوئی تھی۔ انھوں نے نیو ائیر کے بعد مجھے بلایا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ جیمز کے علاوہ ہم سب واپس جا سکتے ہیں۔ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ دن لگیں گے۔''

''اوہ ماما۔''

''میں تمھیں بہت مس کروں گی ڈیر۔''

وہ پہلا موقع تھا کہ ریٹا مسکرائی۔ ''نہیں ماما، آپ مجھے مس نہیں کریں گی۔''

''کیوں نہیں کروں گی۔ بہت کروں گی۔ تمھیں نہیں پتا، میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔''

''مجھے پتا ہے ماما۔ مگر آپ مجھے مس نہیں کریں گی۔ کیونکہ میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔''

وہ سب ہکا بکا رہ گئے۔ ''ابھی کل ہی کی بات ہے کہ تم نے منع کر دیا تھا۔'' جیمز نے کہا۔

''کل اور آج میں بڑا فرق ہوتا ہے ڈیڈی۔'' ریٹا نے جواب دیا۔

''تمھیں تو یہاں کا کلچر بھی پسند ہے اور موسم بھی۔''

''لیکن ڈیڈی، یہاں کے لوگ بہت بیک ورڈ ہیں۔'' ریٹا کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ''یہ کتنی ہی تعلیم حاصل کر لیں، روشن خیال کبھی نہیں ہوں گے ان کی قدامت پسندی کبھی ختم نہیں ہوگی۔''

رچرڈ مسکرا دیا۔ وہ بہن کی بات اور اس کے پس منظر کو پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔

لیکن جیمز پارسن سوچ رہا تھا کہ وہ کم از کم ایک بار اس لڑکے اوتار سنگھ سے ضرور ملے گا...... کچھ نہیں تو صرف اپنے تجسس کی تسکین کے لیے۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ شروع ہی سے سحر خیز تھا۔ اوّل تو رات کو وہ جلدی سوتا تھا۔ لیکن دیر سے سوئے تو بھی اس کی آنکھ صبح پانچ بجے کھل جاتی تھی اور اسے صبح کا وقت اچھا بھی بہت لگتا تھا۔

اس صبح بھی وہ معمول کے مطابق اُٹھ گیا۔ لیکن اس کی طبیعت بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔ سر ایسا بوجھل اور بند سا لگ رہا تھا، جیسے وہاں دماغ کی جگہ کوئی بھاری پتھر رکھا ہو۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ حالانکہ صبح اس کا دماغ ہمیشہ تر و تازہ اور روشن رہو تا تھا۔ وہ تو اسی وقت کو پڑھنے اور کچھ یاد کرنے کے لیے سب سے اچھا وقت قرار دیتا تھا۔

دوسرا احساس اسے یہ ہوا کہ اس کے منہ کا ذائقہ بہت کڑوا ہو رہا ہے۔ اس نے سوچا، شاید یہ لعاب کی وجہ سے ہے۔ لیکن باتھ روم میں جا کر تھوکنے، دانت صاف کرنے اور کلیاں کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ منہ میں تھوک بار بار آ رہا تھا اور وہ بے حد کڑوا بھی تھا۔

تیسرا احساس اسے یہ ہوا کہ اس کا جی متلا رہا ہے۔ وہ بار بار جھرجھری لیتا۔ ایسا لگتا کہ ابھی اسے قے ہو جائے گی۔ لیکن قے ہوئی نہیں بہرحال اسے بری طرح گھبراہٹ ہونے لگی۔

یہ صبح آخر اتنی مختلف کیوں ہے، اس نے گھبرا کر سوچا۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے۔

اگلے ہی لمحے اسے بڑا شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ اسے رات کی باتیں دھندلی دھندلی یاد آئیں۔ ریٹا کے گھر جانا، شربت پینا، اس شربت کی کڑواہٹ اور اس کے سلسلے میں ریٹا کی وضاحت۔ وہ سب صوری یادیں تھیں، جیسے کوئی فلم بہت تیز چلائی جا رہی ہو...... اور وہ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر...... مگر بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے گھبرا کر سر جھٹکا۔ آگے جو کچھ تھا، وہ فی الحال اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جتنی بات سمجھ میں آ گئی تھی، فی الوقت اتنی ہی بہت تھی۔

اس کے منہ کی کڑواہٹ اور متلی کے احساس میں اور اضافہ ہو گیا۔ شاید اس لیے کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ رات وہ نشے میں تھا۔ ریٹا نے اسے جو شربت پلایا تھا، اس میں شاید شراب کی ملاوٹ تھی۔

منہ کی کڑواہٹ اور بڑھی تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے رنجنا کو پکارا جو باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔

رنجنا دوڑی دوڑی آئی۔ ”کیا حکم ہے چھوٹے مالک؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے ایک پیالی میں بغیر دودھ اور چینی کی تیز چائے لا کر دو۔“

رنجنا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ لیکن کچھ کہنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ اس کا دیکھنے کا انداز ایسا تھا، جیسے اس سے سننے میں کچھ بھول ہو گئی ہو۔

اوتار سنگھ نے اس کی بے یقینی بھانپ لی۔ ”میری بات سمجھ گئی ہونا؟“

”دودھ اور چینی کے بغیر چائے کہاں ہوتی ہے چھوٹے مالک۔“

”بس اُبلے ہوئے پانی میں زیادہ پتی ڈال کر پکاؤ اور وہ مجھے لا دو۔“

رنجنا کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن وہ تعمیل کی عادی تھی۔ ”بہتر چھوٹے سرکار۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اوتار سنگھ بے تابی سے ٹہلتا رہا۔ کڑواہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کیسے اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ اس کڑواہٹ کو کڑواہٹ ہی ختم کر سکتی ہے۔ ورنہ اسے تو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ خمار کا توڑ بلیک کافی ہے...... وہ بھی بغیر شکر کی۔

چند منٹ بعد رنجنا چائے لے آئی۔ اس نے چائے کچھ زیادہ ہی تیز بنا دی تھی۔ اوتار سنگھ نے چائے کا طویل گھونٹ لیا۔ چائے اسے زیادہ کڑوی نہیں لگی...... شاید اس لیے کہ اس کا منہ زیادہ ہی کڑوا ہو رہا تھا۔

چائے کے تین چار گھونٹ لینے کے بعد اچانک اسے احساس ہوا کہ سر اور دماغ کا بوجھل پن دور ہو گیا ہے...... یہی نہیں، دماغ پر جو دھندی چھائی ہوئی تھی، وہ بھی چھٹ گئی تھی۔ اب اس کا جی بھی نہیں متلا رہا تھا۔ بلکہ اسے بھوک لگ رہی تھی۔

تاہم اس نے ابھی ناشتہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پہلے وہ رات کے واقعات کو یاد کرنا اور ان پر سوچنا چاہتا تھا۔

وہ ریٹا کے گھر گیا تھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ریٹا نے اس کی بہت معقول وضاحت پیش کی تھی۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ریٹا کو کرسمس کے وہ تحفے دیے، جو وہ اس کے لیے لے کر گیا تھا۔

وہاں تک سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ گڑبڑ اس وقت شروع ہوئی ہوگی، جب ریٹا نے اپنے لیے برانڈی اور اس کے لیے شربت نکالا تھا۔ یہ بھی اس کا قیاس تھا۔ کیونکہ وہ سب کچھ اسے پوری طرح یاد تھا۔ اسے یاد تھا کہ شربت پینے کے کافی دیر بعد تک وہ نارمل رہا تھا۔

بس ایک بات عجیب تھی۔ شربت عام طور پر میٹھے ہوتے ہیں۔ وہ شربت بھی میٹھا تھا۔ لیکن اس میں کڑواہٹ بھی تھی اور اس نے اس سلسلے میں ریٹا سے پوچھا بھی تھا۔ لیکن اس بار بھی ریٹا نے معقول وضاحت پیش کی تھی۔ اور وہ مطمئن ہو گیا تھا کیونکہ تلخی کے باوجود وہ اسے شربت ہی لگا تھا۔

یہاں اوتار سنگھ ٹھٹکا۔ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ شربت میں شراب کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس نے تو شراب کبھی چکھی ہی نہیں۔ پھر وہ کیسے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ شراب نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ لاشعوری طور پر وہ اس سب کی خواہش کر رہا ہو۔

اب اوتار سنگھ اپنی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اور اس کا ضمیر اس پر

الزام عائد کر رہا تھا۔

چند لمحوں کے لیے وہ گڑبڑا گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر سوچا۔ کیا وہ اس سلسلے میں اپنی صفائی پیش کر سکتا ہے...... کچھ ہے اس کے پاس کہنے کو؟

"یہ سچ ہے کہ میں نے شراب کبھی نہیں چکھی۔ اس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میں شربت کا ذائقہ تو پہچانتا ہوں۔ وہ سو فی صد شربت ہی تھا۔" وہ بڑبڑایا۔

"سو فیصد شربت!" ضمیر کی آواز میں چیلنج تھا۔

"سو فیصد نہ سہی۔ ممکن ہے، اس میں کسی نشہ آور شے کی ملاوٹ ہو۔ لیکن اس میں شربت کا ذائقہ واضح اور غالب تھا۔"

"تمھیں اس کی کڑواہٹ پر بھی شبہ نہیں ہوا؟"

"نہیں...... شبہ نہیں ہوا۔ ورنہ میں محتاط ہو جاتا۔"

"حالانکہ ہونا چاہیے تھا۔ شربت ایسی چیز نہیں ہوتی کہ کوئی کسی کو گلاس بھر بھر کر پلاتا رہے۔"

"واقعی، یہ میری غلطی ہے۔ لیکن میں بلاوجہ کسی کے بارے میں بدگمانی کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ میری فطرت ہے۔ اس لیے مجھے شک نہیں ہوا۔"

"بلاوجہ! بدگمانی!" ضمیر نے حقارت سے کہا۔ "وہ تمھیں بتا چکی تھی کہ تم سے محبت کرتی ہے اور تم جانتے تھے کہ وہ آزاد معاشرے کی پروردہ ہے۔"

"مگر جب میں نے اسے بتا دیا کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں تو اس نے افسردگی سے مائی لک کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔"

"نہیں۔ تم جانتے تھے کہ تمہاری محبت کو اس نے مشرق کی حماقت سمجھا ہے۔ اس کے نزدیک تم اب بھی قابل حصول تھے۔ اس نے تمھیں پارٹی میں بلایا اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ سوائے اس کے اور تمھارے۔ تمھیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تمہاری خیالی محبت کو اپنی بے باک محبت سے شکست دینے کی کوشش کرے گی۔"

"میں نے کہا نا کہ میں بدگمانی نہیں کرتا۔" اوتار سنگھ نے کہا۔ "اور پھر وہ دور بیٹھ کر مجھ سے علمی گفتگو کر رہی تھی۔ شبہ کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا میرے پاس۔"

"کارروائی آگے بڑھائی جائے۔" دماغ جج کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے رولنگ دی۔

اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ وہ بہت معقولیت کے ساتھ علمی گفتگو کر رہی تھی۔ پھر اس نے گفتگو کا رخ محبت کی طرف پھیر دیا تھا۔ مگر تھی وہ بھی علمی گفتگو۔

اب وہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے اسے دھندلا سا خیال آ رہا تھا کہ محبت سے جسمانی

ربط تک بات گئی تھی تو وہ بہت پُرجوش ہو گیا تھا اور اس دوران ریٹا نے اسے جو مشروب دیا تھا، وہ شربت نہیں تھا۔ شاید خالص شراب تھا کیونکہ یہی وہ وقت تھا کہ اسے دماغ پر دھندسی چھاتی محسوس ہوئی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ پھر صوری یادیں تھیں۔ لیکن اس باران میں ریل ٹوٹ جانے کی سی کیفیت نہیں تھی۔ بلکہ تسلسل تھا۔

اس نے ریٹا سے اپنے تعلق کو دوستی کہا تھا اور ریٹا نے چیلنج کیا تھا کہ اگر وہ دوست ہیں تو انھیں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنا چاہیے۔ اب وہ اس سے انکار کرتا تو ریٹا کہتی کہ درحقیقت وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ مگر اس سے بے خبر ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھنے کے لیے بڑھا تھا۔ اس وقت اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور وہ یقیناً نشے میں تھا۔ اس لیے کہ اس نے جانتے بوجھتے شراب کے کئی جام قبول کر لیے تھے......

اس کے بعد مسلسل ایسے مناظر تھے، جنھیں وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر فلم بند آنکھوں کے سامنے بھی چلتی رہی۔ شرمندگی اور ندامت بوند بوند اس کے وجود میں ٹپکتی رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں تبدیل ہو گئی۔

اب وہ شرمندگی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یہ میں کہاں پہنچ گیا تھا...... کتنی پستی میں گر گیا تھا میں اور میں بچ نہیں سکتا تھا۔ میں تباہ ہو جاتا، اگر خدا نے مجھے بچا نہ لیا ہوتا۔ ہاں...... اس نے مجھے بچا لیا۔ ورنہ میں محبت کا نام زبان پر لانے تک کے قابل نہ رہتا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"محبت کا نام زبان پر لانے کے قابل تو تم اب بھی نہیں رہے ہو۔" ضمیر نے تلخ تبصرہ کیا۔

جو منظر اس کی نگاہوں کے سامنے پھر رہے تھے، انھیں دیکھ کر اس نے سر جھکا لیا۔ بات درست تھی۔

مگر وہ کیسا لمحہ تھا۔ خدا کے حوالے میں کیسی تاثیر تھی کہ اس کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ اگر ریٹا نے اس لمحے بندے کی خدا سے محبت کا مضحکہ نہ اڑایا ہوتا تو وہ یقیناً ایسے گرتا کہ اٹھنا تو در کنار، کبھی نظر بھی نہ اٹھا پاتا۔ خدا کا نام سنتے ہی اسے ایسا لگا تھا کہ کسی نے اس پر ٹھنڈے پانی کی بالٹی انڈیل دی ہے۔ کیسا خوف طاری ہوا تھا اس پر خود کو ریٹا کے ساتھ اس حال میں دیکھ کر۔

وہ ریٹا کے سحر سے باہر آ گیا تھا...... خدا کے حوالے کی وجہ سے۔ مگر ریٹا کو خبر نہیں تھی۔ اس نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے اَن دیکھی نشے کی محبت کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ اسے کمزور اور بودا قرار دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود کو فاتح سمجھ رہی تھی اور یہ بات اسے پوری طرح ہوش میں لے

آئی اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ ریٹا اپنی فتح پر اترائی نہ ہوتی تو محبت کو اور اوتار سنگھ کو شکست ہو چکی ہوتی۔

وہ سب کچھ یاد کرنے اور سمجھنے کے بعد اوتار سنگھ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہ رونے والا آدمی نہیں تھا۔ لیکن وہ ندامت کے آنسو تھے اسے خود پر شرم آ رہی تھی۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ بس اس کا جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

دیر تک وہ روتا رہا...... دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ پھر جیسے اندر کے سوتے خشک ہو گئے۔ آنسو بھی رک گئے۔ شاید اب اس کے اندر کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ سینہ اسے خالی خالی لگ رہا تھا، جیسے کوئی عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو گئی ہو۔

پھر اچانک ایک تبدیلی آئی۔ اللہ کا نام اس کے کھنڈر وجود میں گونجا اور اس کی زبان پر آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اللہ نے اسے اور اس کی محبت کے تصور کو بچایا ہے۔ اسے اس پر اللہ سے معافی مانگنی چاہیے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اسے بچا لیا۔

یہاں پہنچ کر وہ الجھ گیا کہ معافی مانگنا زیادہ اہم ہے یا شکر ادا کرنا۔ کیونکہ اس کے لیے تو دونوں ہی باتیں اہم تھیں۔ اسے تو یہ کرنا نہیں آتا تھا۔ البتہ شکر وہ زبان سے ادا کر سکتا تھا۔ وہ دیر تک شکر ادا کرتا رہا۔ معافی مانگنے کے خیال سے وہ پھر الجھنے لگا۔ بس وہ زبان سے ہی تو کہہ سکتا تھا کہ اے اللہ، مجھے معاف کر دے۔

مگر یہ کہتے کہتے اسے لگا کہ اس کے سینے میں پھر سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا ہے۔ آنسو اتنی تیزی سے امنڈ کر آئے کہ وہ خود کو سنبھال بھی نہ سکا۔ اب وہ پھر ننھے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ناپاک ہو گیا ہے۔ روتے روتے بھی وہ کلمہ پڑھنے لگا...... یہ سوچ کر کہ یہ کلمہ اس کی ناپاکی کو دور کر کے اسے پاک کر دے گا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ جیسے جیسے آنسو بہہ رہے ہیں، اس کے سینے میں کوئی پتھر ہے جو ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ جیسے وہ اندر سے ڈھل رہا ہے اور جب اس کے آنسو تھمے تو اسے یہ خوش گوار احساس ہوا کہ وہ اب ہلکا پھلکا ہو چکا ہے۔ اس نے تصور میں ان مناظر کو دیکھنا چاہا، جن پر وہ شرمندہ تھا۔ مگر اب وہ بہت دھندلے تھے۔ نہ وہ خود کو واضح طور پر دیکھ پا رہا تھا۔ نہ ریٹا کو۔ وہ تو بس دو ہیولے تھے۔

اس وقت نہ تو وہ توبہ کو سمجھتا تھا اور نہ توبہ قبول ہونے کی علامات کو۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اللہ توبہ قبول کرے تو اپنی رحمت اور مغفرت سے بندے کے دل و دماغ سے اس گناہ کی یاد بھی مٹا دیتا ہے، جس پر اس نے توبہ کی ہو۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اللہ نے اس کی توبہ قبول فرما لی ہے۔

ہلکا ہونے کے بعد وہ ذہنی طور پر اس قابل ہو گیا کہ اس پورے معاملے کو عقل کی کسوٹی پر

پرکھ کر تجزیہ کر سکے۔ اس نے سوچنا شروع کیا تو یہ بات سمجھنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ریٹا نے کچھ بھی اضطراری طور پر نہیں کیا تھا۔ اس نے پوری منصوبہ بندی کی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے، خوب سوچ سمجھ کر اس کے لیے جال بچھایا تھا اور اس نے کہیں بھی جلد بازی سے کام نہیں لیا تھا۔

قدرتی بات تھی کہ اس کے بعد اسے ریٹا پر غصہ آیا۔ اسے ریٹا سے یہ امید نہیں تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے یہ سوچنے کے بعد اس کا غصہ سرد ہو گیا کہ اسے اللہ نے بچا لیا تو شکایت کیسی۔ اور اس کی اپنی غلطیاں بھی تو تھیں، جن سے وہ انکار نہیں کر سکتا۔

اس نے چند باتیں زندگی بھر کے لیے سمجھ لیں اور ذہن نشین کر لیں۔ عورت اور مرد کے درمیان دوستی نہیں ہو سکتی اور عورت سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔ عورت مکر سے کام لینے پر آئے تو اس سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ اللہ ہی بچائے تو بچائے۔

بہر حال اس کے دل میں ریٹا کے لیے جو برائی آئی تھی، اس نے اسے جھٹک دیا۔ ریٹا نے جو کچھ کیا، وہ اپنی بے لگام خواہشات سے مجبور ہو کر کیا۔ اس کے ہاتھ تو کچھ بھی نہیں آیا۔ بلکہ اب شاید وہ ہمیشہ اس سے شرمندہ ہی رہے گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے مزید شرمندہ نہیں کرے گا۔

''چھوٹے مالک، ناشتہ لاؤں؟'' رنجنا نے اسے چونکا دیا۔

''ہاں، جلدی سے لے آؤ۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ ''اور ہاں، میں آج شملہ جا رہا ہوں...... ماسٹر جی کے پاس۔ چار پانچ دن بعد واپس آؤں گا۔''

رنجنا خاموشی سے ناشتہ لانے کے لیے چلی گئی۔

❁......❁......❁

وہ پہلا موقع تھا کہ اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کے ساتھ سینی ٹوریم میں مسلسل پانچ روز گزارے...... پہلا اور آخری موقع!

اس نے ایک قریبی ہوٹل میں اپنے لیے ایک کمرا لے لیا تھا۔ کمرا تو وہ پہلے بھی لیتا تھا، مگر صرف ایک رات کے لیے۔ ہوٹل کے سبھی لوگ اسے پہچانتے تھے حالانکہ ہوٹل میں صرف نہانے دھونے، کھانا کھانے اور ناشتہ کرنے اور رات کو سونے کے سوا وہ رکا بالکل نہیں تھا۔

''اس بار مجھے 31 تاریخ تک کمرا چاہیے ہوگا۔'' اس نے استقبالیہ کلرک سے کہا۔

''جب تک دل چاہے رہیں صاحب۔ آج کل سیزن تو ہے نہیں۔ کمرا بھی آپ کو اچھا والا دوں گا۔''

ماسٹر جی کو پتا چلا کہ وہ پانچ دن رکنے کے ارادے سے آیا ہے تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ انھوں نے بڑی ممنونیت سے اسے دیکھا۔ ''تم میرے کسی اچھے کرم کا پھل ہو اوتار سنگھ۔

حالانکہ میں نے زندگی میں شاید ہی کوئی اچھا کام کیا ہو۔"

"یہ تو اچھے لوگوں کی پہچان ہوتی ہے ماسٹر جی کہ انھیں اپنا کوئی اچھا کام یاد ہی نہیں ہوتا۔" اوتار سنگھ نے کہا۔

"اچھے تو تم ہو اوتار سنگھ۔"

"اگر میں اچھا ہوں تو صرف اس لیے کہ آپ میرے استاد ہیں۔"

ماسٹر جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میری اپنی اولاد نے مجھے چھوڑ دیا۔ تم نہ ہوتے تو میں اس گندی کوٹھری میں کب کا مر کھپ چکا ہوتا۔" انھوں نے رقت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ ایسے نہ سوچا کریں ماسٹر جی۔"

"کیسے نہ سوچوں۔ چار مہینے سے یہاں پڑا ہوں۔ کسی نے نہیں پوچھا مجھے۔ کوئی ایک بار بھی نہیں آیا یہاں؟"

"ارے میں تو آپ کو بتانا بھول ہی گیا۔ میں آپ کے گھر گیا تھا۔ گنگا، کانتا اور مرلی آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔" اوتار سنگھ نے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔

"بچے تو من کے سچے ہوتے ہیں نا۔ وہ تو وہاں بھی میری کوٹھری میں آنے کو تڑپتے تھے۔ پر ان کی کٹھور مائیں انھیں آنے ہی نہیں دیتی تھیں۔"

"وہاں سب آپ کو یاد کرتے ہیں ماسٹر جی۔ آپ کے بیٹے برے نہیں ہیں، مجبور ہیں۔"

"ہاں، مجھے کوٹھری میں اکیلا چھوڑ دینا مجبوری ہی تو تھی۔" ماسٹر جی نے تلخ لہجے میں کہا۔ کوٹھری کی خوف ناک یادیں ان کے اندر کہیں بہت گہرائی میں شکایت بن کر اتر گئی تھیں۔

"رام بھیا کی تو رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ بدری بھیا کی بھی ڈیوٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ ہری بھیا نے میرے ساتھ آنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"کب......؟ اگلی بار؟" ماسٹر جی نے زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ کھسیا گیا۔ "اب تو اسکول کے امتحان سر پر ہیں۔ ٹیوشنز سے بھی چھٹی نہیں کر سکتے وہ۔" اس نے کہا۔ کہہ رہے تھے کہ مارچ یا اپریل میں میرے ساتھ آئیں گے۔"

"مارچ اپریل کا کس کو پتا۔ میں ہوں نہ ہوں۔" ماسٹر جی نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"آپ ایسی باتیں نہ کریں ماسٹر جی۔ ایک دن آپ صحت یاب ہوں گے اور میں آپ کو گھر لے کر جاؤں گا۔"

ماسٹر جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر وہ خاموشی بھی جواب تھی...... یہ جواب کہ انھیں ایسی کوئی امید نہیں۔

اوتار سنگھ نے جلدی سے ایک کتاب ماسٹر جی کی طرف بڑھا دی۔ "آپ موقع نکال

کر اسے پڑھیے گا۔ پھر ہم اس پر بات کریں گے۔"

ماسٹر جی نے کتاب کا سرسری سا جائزہ لیا۔ "اس پر تو ہم اب بھی بات کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم اس کا مطالعہ کر چکے ہو۔"

ان کے درمیان علمی گفتگو شروع ہوئی تو ماسٹر جی اپنا دکھ، اپنی شکایتیں بھول گئے۔ اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ ماسٹر جی کا ذہن اور حافظہ اب بھی پہلے جیسا ہی ہے۔ وہ اس کتاب پر سیر حاصل گفتگو کر رہے تھے۔

رات کو وہ ہوٹل جانے کے لیے اٹھا تو ماسٹر جی بچوں کی طرح ضد کرنے لگے۔ "جانے کی کیا ضرورت ہے یہیں رک جاؤ نا۔" انھوں نے کہا۔

"میں صبح سویرے ہی آ جاؤں گا ماسٹر جی۔"

"میں میڈن سے بات کروں گا۔ یہیں تمھارے لیے پلنگ ڈال دیا جائے گا۔" ماسٹر جی بچوں کی طرح ایکسائیٹڈ تھے۔ مگر اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر اچانک ان کا لہجہ بدل گیا۔ "مگر تم میرے ساتھ کیسے سو سکتے ہو۔ یہ چھوت کا مرض ہے۔ تمھیں لگ گیا تو" اس کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ کہتے کہتے رک گئے انھیں احساس ہو گیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اوتار سنگھ کو ان کی بات سے دلی صدمہ ہوا تھا۔ وہ اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بے اختیار دل کی کیفیت کا عکس اس کے چہرے پر آ گیا تھا اور عین اسی لمحے ماسٹر جی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"یہ بات نہیں ماسٹر جی......" اس نے کہنا چاہا۔

مگر دیکھتے ہی دیکھتے ماسٹر جی کا چہرہ یوں چٹخا، جیسے ساکت پانی میں عکس ایک کنکر پھینکے جانے پر چٹخ جاتا ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

"ماسٹر جی، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ کاش آپ نے مجھے وضاحت کا موقع دیا ہوتا۔ مگر خیر، اب تو میں یہیں رکوں گا۔"

ماسٹر جی نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کرنا چاہا۔ لیکن وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں تھے۔ مدت سے جمع ہونے والا غبار آنسوؤں کی شکل میں نکل رہا تھا۔

اوتار سنگھ لپک کر بڑھا اور ان کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ "ماسٹر جی، آپ نے ایسا کیسے سوچ لیا۔ میں تو آپ کو پتا سمان سمجھتا ہوں۔ دل چھوٹا نہ کریں ماسٹر جی، میں نے تو شروع میں ہی کہا تھا کہ آپ کی صحت یابی تک میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

"اسی لیے تو...... رو رہا...... ہوں۔" ماسٹر جی نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

اوتار سنگھ اس جملے کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ ماسٹر جی کے جملے کا رخ اس کے بیان سے

پہلے حصے کی طرف تھا۔لیکن اس نے سمجھا کہ وہ اس کے آخری جملوں کے حوالے سے جواب دے رہے ہیں۔ ’’اب میں کہیں نہیں جاؤں گا ماسٹر جی۔آپ دل چھوٹا نہ کریں۔میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔‘‘

ماسٹر جی کا گریہ اور بڑھ گیا۔ساتھ ہی وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگے۔

کچھ دیر میں غبار چھٹا تو ماسٹر جی نے اوتار سنگھ کے سامنے ہاتھ جوڑ لیے۔مگر بولنا اب بھی ان کے بس میں نہیں تھا۔چند لمحے بعد انھوں نے کہا۔’’میں ہاتھ جوڑ کر تم سے بنتی کرتا ہوں بیٹے کہ مجھے معاف کر دو۔‘‘

اوتار سنگھ نے بے تابی سے ان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو علیحدہ کیا اور انھیں چومنے لگا۔’’یہ کیا کر رہے ہیں ماسٹر جی...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔مجھے گناہ گار کر رہے ہیں آپ؟‘‘

’’گناہ گار تو میں ہوں بیٹے۔تم تو میرے اپنے بیٹوں سے بڑھ کر میرے بیٹے ثابت ہوئے اور میں نے تمھارے متعلق ایسے سوچا۔میں اتنا کڑوا، اتنا زہریلا ہو گیا ہوں، مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔میں نے امرت رس کی ندی میں اپنا زہر گھول دیا۔اب سمجھ میں آیا ہے کہ امرت رس سچا ہو تو اس میں گرنے والا زہر بھی امرت ہی بن جاتا ہے۔مجھے شما کر دو بیٹے۔‘‘

’’ارے ماسٹر جی، ایسی کوئی بات نہیں۔مجھے تو برا بھی نہیں لگا۔آپ کی بات فطری تھی۔لیکن میں......‘‘

’’تم نے کبھی مجھ سے چھوت چھات نہیں کی۔پھر بھی میں نے تمھیں طعنہ دیا۔بس تم مجھے شما کر دو۔‘‘

’’آپ مجھے گناہ گار نہ کریں ماسٹر جی۔آپ کی کسی بات سے مجھے تکلیف نہیں ہوئی۔مگر اس بات سے ہو رہی ہے۔‘‘

’’تم سچے بیٹے ہو۔تم نے مجھے پتا سمان ہی سمجھا ہے۔مجھے تم پر مان ہے بیٹے۔اب میں یہ بات نہیں کروں گا۔مگر اب تم یہاں نہیں رکو گے۔‘‘

’’آپ کا حکم سر آنکھوں پر ماسٹر جی۔مگر پہلے میں آپ کے پہلے حکم کی تعمیل کروں گا۔آج رات تو میں یہیں رکوں گا۔‘‘

اوتار سنگھ نے اتنی قطعیت کے ساتھ بات کی تھی کہ ماسٹر جی کچھ کہہ نہ سکے۔ویسے بھی وہ شرمندہ تھے۔

❁......❁......❁

اگلی صبح اوتار سنگھ کا دماغ نیند سے بوجھل تھا۔جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔دراصل وہ معمولات کا آدمی تھا، اچھی اور طویل نیند اس کے لیے بہت ضروری تھی اور رات کو کسی بھی وقت

سوئے، صبح پانچ بجے اس کی آنکھ بہر حال کھل جاتی تھی۔اس کے بعد دن بھر وہ سو بھی نہیں سکتا تھا۔نیند پوری نہ ہونے کی صورت میں اس کا یہی حال ہوتا تھا۔

رات شروع میں تو ماسٹر جی کو یہ ملال تھا کہ انھوں نے زبردستی اسے روکا ہے۔لیکن تھوڑی دیر فرائیڈ اور ڈارون کے نظریات پر گفتگو چھڑی تو وہ سب کچھ بھول گئے۔ایسے میں تو انھیں اپنی بیماری بھی یاد نہیں رہتی تھی۔وہ پہلے جیسے ہو جاتے تھے۔وہ اتنے خوش نظر آ رہے تھے کہ مدت سے اوتار سنگھ نے انھیں ایسا خوش نہیں دیکھا تھا۔خود وہ انھیں خوش دیکھ کر بہت خوش تھا۔

نفسیات کا موضوع خود اوتار سنگھ نے نکالا تھا اور اسے فرائیڈ تک لے گیا تھا۔ماسٹر جی تو حیران تھے کہ وہ فرائیڈ کے نظریات پر گفتگو کر رہا ہے۔

’’دیکھو بیٹے...... مرد اور عورت کے درمیان جنسی کشش ایک کائناتی حقیقت ہے۔‘‘ ماسٹر جی نے کہا تھا۔’’انسان کا نسلی ارتقا اس حقیقت پر ہی قائم ہے۔انسان کی جبلت میں جو طاقت ور ترین محرکات ہیں، ان میں بقا اور بھوک کے ساتھ جنس بھی شامل ہے۔‘‘

’’میرے خیال میں جنس کو بقا اور بھوک جیسے محرکات کے ساتھ رکھنا زیادتی ہے ماسٹر جی۔‘‘ اوتار سنگھ نے ان سے اختلاف کیا۔’’بقا خطرے میں ہو یا بھوک حد سے گزر جائے تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے...... اپنی فطرت اور مزاج کے برعکس۔‘‘

’’جنسی خواہش بھی درحقیقت بھوک ہی ہوتی ہے۔ان محرکات کو طاقت ور ترین اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے زیر اثر انسان جانور بن جاتا ہے۔درندگی پر اتر آتا ہے۔کسی کی پروا نہیں کرتا۔کچھ نہیں دیکھتا۔‘‘

’’جنس کا معاملہ مختلف ہوتا ہے ماسٹر جی۔اگر آدمی میں تہذیب ہو تو وہ اس معاملے میں خود کو مذہبی اور معاشرتی اقدار کا پابند رکھتا ہے۔‘‘

’’تہذیب کو یہیں تک محدود کیوں کرتے ہو بیٹے۔یہ طاقت ور ترین محرکات اصل میں انسان کی روحانی آزمائش ہوتے ہیں۔انسان اخلاقی اور روحانی بلندی پر فائز ہو تو ان محرکات کو زیر کر لیتا ہے۔اسی میں تو انسان کی عظمت ہے۔بھوک سے تڑپتی ہوئی ماں روٹی کا ایک ٹکڑا مل جانے پر اسے خود نہیں کھاتی، اپنے کم بھوکے بچے کو کھلا دیتی ہے۔یہ تو چھوٹی بات ہے۔لوگ اپنے حصے کی روٹی کسی اور بھوکے کو بھی دے دیتے ہیں۔بقا کا معاملہ اور سخت ہے۔لیکن ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انسان نے مارنے پر مرنے کو ترجیح دی۔خود کسی کا خون بہانے کے بجائے قتل ہو جانا گوارا کر لیا۔انسان میں بڑا تنوع ہے۔ایک طرف وہ آکاش سے بلند ہے تو دوسری طرف پاتال سے بھی پست۔فیصلہ اس پر ہوتا ہے کہ کس نے اپنے نفس کو کس حد تک فتح کیا ہے۔‘‘

ماسٹر جی کی بات معقول تھی۔لیکن اوتار سنگھ کا دماغ جنسی خواہش کو اتنا طاقت ور محرک

مانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''لیکن ماسٹر جی، جنسی خواہش پر قابو پانا اتنا مشکل نہیں۔''

''تمھیں اس کا تجربہ بھی تو نہیں ہے بیٹے۔''

اب اوتار سنگھ ماسٹر جی کو کیسے بتاتا کہ وہ قدم اکھاڑ دینے والے منہ زور طوفان کا سامنا کر کے آ رہا ہے۔ ''تجربہ تو مجھے بقا اور بھوک کا بھی نہیں ہے ماسٹر جی۔ لیکن عقل تو بتاتی ہے۔ میں بقا، بھوک اور جنسی خواہش کے بحران کا تصور تو کر سکتا ہوں۔ اسی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ جنسی خواہش کو قابو میں رکھنا آسان ہے۔''

''اس لیے تو میں نے اسے بقا اور بھوک کے بعد رکھا ہے ترتیب میں۔'' ماسٹر جی نے ڈپلومیسی سے کام لیا۔ ''مگر بیٹے، بحران کا تصور کرنا اور بات ہے اور اس کا سامنا کرنا اور۔ برسوں نفس کشی اور ریاضت کرنے والے بقا اور بھوک کے محرکات پر قابو پا لیتے ہیں۔ مگر جنسی خواہش ایسا پُرفریب چھپا رستم ہے کہ اس کے سامنے ایک کمزور لمحے میں ان کی ساری تپسیا نشٹ ہو جاتی ہے۔''

اوتار سنگھ کے سامنے اپنا تجربہ تھا۔ اسے دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ اگر خدا کا اور اس کے بعد ان دیکھے محبوب کا طعنہ اسے نہ ہلا دیتا تو وہ بھی ہار جاتا۔ لیکن بہرحال اس نے کوئی نفس کشی اور ریاضت بھی نہیں کی تھی۔

مگر اب وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے گفتگو کا رخ بدلا۔ ''لیکن ماسٹر جی، فرائیڈ کا نظریہ تو احمقانہ، مضحکہ خیز اور گمراہ کن ہے۔ میں اس بات کو کیسے مان لوں کہ ہر رشتے کے پیچھے جنس کارفرما ہے۔''

''یہ تو میں بھی کہتا ہوں۔'' ماسٹر جی نے کہا۔ ''میں نے کبھی اس کی حمایت نہیں کی۔''

انھی باتوں میں چار بج گئے۔ ماسٹر جی کی آنکھیں مندنے لگیں، جماہیاں آنے لگیں۔

لیکن مدت سے کسی اپنے کی قربت کو ترسا ہوا وہ بوڑھا اور بیمار شخص اب بھی سونا نہیں چاہتا تھا۔ اور موضوعات کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ وہ صاحب علم آدمی تھا اور اپنے ہونہار ترین شاگرد سے باتیں کر رہا تھا۔

آخر اوتار سنگھ کو اسے ٹوکنا پڑا۔ ''ماسٹر جی، اب آپ سو جائیں۔''

''ٹھیک ہے۔ روشنی گل کر دو۔''

اوتار سنگھ بھی ماسٹر جی کے ساتھ ہی سویا۔ لیکن اسے سونا تو نہیں کہیں گے۔ کیونکہ اس کی آنکھ سوا پانچ بجے کھل گئی۔ اس نے مزید سونے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے سویا ہی نہیں گیا۔ ماسٹر جی البتہ بے سدھ سو رہے تھے۔

اوتار سنگھ نے جیسٹر پہنا، مفلر لپیٹا اور باہر نکل آیا۔ سردی ایسی تھی کہ اس کے دانت بج رہے تھے۔ مگر ایسے میں بھی وہ چہل قدمی اس کی روح کو شاداب کر گئی۔ صبح کے حسن کا تو وہ ہمیشہ

سے قائل تھا۔

چہل قدمی کے نتیجے میں جسم میں گرمی آئی اور سردی کا احساس کم ہو گیا۔ باہر ایک ہوٹل میں اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ واپس آیا تو ماسٹر جی اب بھی سو رہے تھے۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ کتاب اٹھالی جو اس نے کالج کی لائبریری سے اِشو کرائی تھی۔

لیکن مطالعہ اس وقت اس کے بس میں نہیں تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے جسم اور ذہن کی عجیب کیفیت تھی۔ جسم ایسے ٹوٹ رہا تھا، جیسے وہ رات بھر دوڑتا رہا ہو اور ذہن کا یہ حال تھا کہ نہ وہ سو رہا تھا، نہ جاگ رہا تھا۔

وہ اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ گیارہ بجے کے بعد ماسٹر جی کی آنکھ کھلی۔ لیکن ان کے چہرے پر بھی پژمردگی اور اضمحلال تھا۔ انھوں نے حیرت سے اوتار سنگھ کو دیکھا۔ ''تم سوئے نہیں اوتار سنگھ؟''

''میں تو اپنے وقت پر اٹھ گیا تھا ماسٹر جی اور دن میں مجھے نیند ہی نہیں آتی۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''میں نے تم پر ظلم کیا اوتار سنگھ......''

''ایسی کوئی بات نہیں ماسٹر جی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آپ سے باتیں کرنے کو اور سچ یہ ہے کہ رات میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا......''

''لیکن تمھارا بہت برا حال ہو رہا ہے۔''

''مگر میں بہت خوش ہوں ماسٹر جی۔ اور ایسی خوشی کے لیے ہزار راتیں جاگ سکتا ہوں میں۔''

لیکن خود ماسٹر جی کے معمولات بگڑ گئے تھے۔ سینی ٹوریم میں وہ بڑی منضبط زندگی گزار رہے تھے اور اس کا اثر ان کی صحت پر بہت مثبت پڑا تھا۔ ایک دن کی بے اعتدالی نے ان پر بڑا منفی اثر ڈالا تھا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ ان کے لیے اچھا نہیں۔ انھوں نے ناشتہ دیر سے کیا۔ پھر دوپہر کا کھانا بھی دیر سے کھایا۔ اس کے نتیجے میں رات کو انھیں بھوک ہی نہیں لگی۔ اور دن الگ بے کیف گزرا۔

رات کو انھوں نے خود ہی اوتار سنگھ سے کہا۔ ''تم اب چلے جاؤ بیٹے۔''

''میں رکنا چاہتا ہوں ماسٹر جی۔ لیکن یقین کریں، میں اس لیے نہیں رکتا کہ آپ کی صحت کے لیے دیر تک جاگنا اچھا نہیں ہے۔'' اوتار سنگھ نے بے حد خلوص سے کہا۔ ''میں رکوں گا تو آپ سے باتیں کروں گا۔ آپ کو جگاؤں گا۔ بس یہ بات ہے۔''

''میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا ہے بیٹے۔ بس اب تم جاؤ اور آرام کرو۔ تمھارا بھی برا

حال ہو رہا ہے۔''

اوتار سنگھ کے شملہ میں قیام کے وہ دن کانتی پرشاد کے لیے بے حد خوش گوار تھے۔ دن بھر وہ اوتار سنگھ سے باتیں کرتے۔ رات کو وہ اسے جلدی ہی ہوٹل بھیج دیتے۔ سردی کی راتیں ویسے بھی جلدی آ جاتی ہیں اور دیر تک رہتی ہیں۔

اوتار سنگھ سے باتیں کرتے ہوئے خوشی ان کے چہرے سے پھوٹی پڑتی۔ مگر اچانک، ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے پر دکھ کا سایہ سا لہرا جاتا۔ دراصل اپنے بچوں کی بے نیازی اور بے پروائی ان کے لیے بے حد اندوہناک تھی۔

اچھے دن ہوا کے جھونکے کی طرح جلدی سے گزر جاتے ہیں۔ پل بھر میں جیسے اوتار سنگھ کے قیام کا آخری دن آ گیا۔

''تم کل چلے جاؤ گے اوتار سنگھ۔'' اس شام انھوں نے اداس لہجے میں کہا۔

''ضروری نہیں ہے ماسٹر جی۔'' اوتار سنگھ نے انھیں بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

''کل نہیں تو پرسوں جاؤ گے۔ جانا تو ہے۔''

''میں یہی تو کہہ رہا ہوں ماسٹر جی کہ ضروری نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کے پاس ہی رہوں گا...... آپ کی صحت یابی تک۔ اور پھر آپ کو لے کر ہی گھر جاؤں گا۔''

ماسٹر جی تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔ ''یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا ماسٹر جی؟''

''میں جانتا ہوں کہ میں یہاں سے زندہ واپس نہیں جاؤں گا۔''

''آپ ایسی باتیں نہ کریں ماسٹر جی۔ امید سے ہی سب کچھ ہوتا ہے۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں خفگی تھی۔

''تمھاری خاطر منہ سے نہ کہوں۔ مگر اپنے اندر کا حال تو مجھے معلوم ہے نا۔ اپنی موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا۔''

''اب یہ بات سننے کے بعد تو میں یہاں سے جاؤں گا ہی نہیں۔''

''تمھیں جانا پڑے گا اوتار سنگھ۔ میں ہر ہفتے تمھارے انتظار میں ہی تو جیتا ہوں۔''

''مگر آپ مجھے یہاں رہنے کیوں نہیں دیتے؟''

''میں تمھارا تعلیمی سال خراب کیوں کروں۔ ایسا ہو گیا تو میں ٹھاکر جی کو کیا منہ دکھاؤں

گا۔ ٹھاکر جی کے اور تمھارے کتنے احسان ہیں مجھ پر۔ کیا میں اس کا یہ صلہ دوں گا۔'' ماسٹر جی کی آواز بھرا گئی۔

یہ کہنے کے بعد جو انھوں نے اوتار سنگھ کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں انھیں عجیب سا تاثر نظر آیا۔ اسے دیکھ کر انھیں ایک پل میں اپنی بہت بڑی غلطی کا احساس ہو گیا۔ انھیں شرمندگی بھی ہوئی۔ بیماری کے بعد سے انھوں نے ایک بار بھی بڑے ٹھاکر کی خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ گاؤں کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔

ان کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ان کی نظریں جھک گئیں۔ ''میں بہت کٹھور اور خود غرض ہوں اوتار سنگھ۔ مجھے معاف کر دو۔'' ان کی آواز لرز رہی تھی۔

اوتار سنگھ نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''اب ایسا کیا ہو گیا ماسٹر جی۔ آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔''

''شرمندہ کرتا نہیں، ہو گیا ہوں۔ میں اپنی نظروں میں گر گیا ہوں۔ اپنی بیماری، اپنی پریشانی میں ایسا الجھا کہ مجھے کسی اور کی پروا ہی نہیں رہی۔ میں نے ایک بار بھی ٹھاکر جی کی خیریت نہیں پوچھی۔''

اوتار سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب وہ ان کے دونوں ہاتھ سہلا رہا تھا۔

''کیسے ہیں ٹھاکر جی؟''

''اب تو بس سیرے پاس آپ ہی ہیں ماسٹر جی۔''

ماسٹر جی بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ ان کا سر یوں جھکا ہوا تھا کہ ٹھوڑی سینے سے لگ گئی تھی۔ اور وہ چپکے چپکے رو رہے تھے۔ ان کے آنسو بہے جا رہے تھے۔ ان کے جسم میں لرزش نہ ہوتی تو اوتار سنگھ کو پتا بھی نہ چلتا کہ وہ رو رہے ہیں۔

اس نے ماسٹر جی کو لپٹا لیا اور ان کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ ''آپ نہ روئیں ماسٹر جی۔ ہر زندگی کا انجام تو یہی ہے۔''

لیکن ماسٹر جی نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ کچھ سننے کے قابل ہی نہیں تھے۔ وہ تو اس وقت سوچ رہے تھے۔ ان کے دل میں بار بار یہ خیال آیا تھا کہ اوتار سنگھ نے دو مہینے تک ان کو پلٹ کر پوچھا بھی نہیں۔ ان کی خبر ہی نہیں لی۔ اس خیال سے ان کے اندر اس کے لیے شکایت ابھرتی تھی۔ لیکن دو سبب ایسے تھے کہ وہ اپنی شکایت کو رد کر دیتے تھے۔ ایک تو یہ کہ دو ماہ کی غفلت اپنی جگہ، لیکن دو ماہ بعد اسی اوتار سنگھ نے ان کی ذلت بھری زندگی اور در ماندگی کا مداوا کیا تھا۔ ان پر اتنی عنایتیں کی تھیں کہ اپنی غفلت کی تلافی کر دی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ اس غفلت کے باوجود ان کی اپنی اولاد سے کروڑ درجہ بہتر تھا۔

لیکن ان کی شکایت ایسی تھی کہ ختم نہیں ہوتی تھی، اندر دب جاتی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ بار بار کیوں ابھرتی اور اس شکایت کا تعلق اس مان سے تھا، جو انھیں اوتار سنگھ پر تھا۔ وہ اس پر بیٹوں سے بڑھ کر مان کرتے تھے۔ بیٹوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا، اس پر انھیں اتنی شکایت نہیں تھی، جتنی اوتار سنگھ کی دو ماہ کی غفلت پر تھی۔

مگر اب وہ شرمندہ تھے۔ انھوں نے ایک لمحے کو بھی نہ یہ سوچا، نہ اس سے پوچھا کہ وہ دو مہینے ان کی طرف سے بے پروا کیوں رہا۔ ایسی کیا گزری اس پر ان دو ماہ میں۔ اپنے باپ جیسا ان کا ادب کرنے والا، ان سے اولاد جیسی محبت کرنے والا وہ شاگرد ایسا تو نہیں تھا کہ عام حالات میں ان کی طرف سے ایسی بے پروائی کرتا۔

اب انھیں معلوم ہو گیا تھا اور وہ محسوس کر سکتے تھے کہ اس پر کیا گزری ہوگی۔ وہ جو سال بھر کے بچھڑے باپ سے، اپنے محبوب لوگوں سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ اپنے گاؤں میں، اپنے گھر میں کچھ وقت گزارنے گیا تھا، وہاں اپنی آنکھوں سے سب کچھ...... پورا گاؤں، اپنا باپ، اپنے لوگ ٹنوں ریت کے نیچے دب کر دفن ہوتے دیکھ کر آیا تھا، اس پر ان دو ماہ میں کیا گزری ہوگی۔

وہ شرمندہ تھے...... اس کے اور اپنے ظرف کے فرق پر۔ وہ کتنا بڑا دکھ سینے میں چھپائے ان کی دل جوئی کرتا رہا۔ اور وہ اتنا کچھ ملنے کے باوجود کتنی حقیر سی شکایت دل میں چھپائے بیٹھے رہے۔ اب وہ شرمندہ نہ ہوتے تو کیا کرتے۔

وہ اس سے کہنا چاہتے تھے کہ مجھے معاف کر دو۔ لیکن بات ان کے ہونٹوں پر رک گئی۔

وہ دیکھ چکے تھے کہ اس پر وہ کیسا شرمسار ہوتا ہے، کھسیاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بلند آواز میں...... رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بھگوان مجھے معاف کرے۔ میں بہت کم ظرف اور خود غرض آدمی ہوں۔''

وہ بوجھ ہٹنے کے بعد وہ کھل کر روئے...... اتنا روئے کہ نڈھال ہو گئے۔ اب وہ بڑے ٹھاکر کو یاد کر کے رو رہے تھے۔

اگلی صبح اوتار سنگھ ان سے رخصت ہونے کے لیے آیا تو اس نے ہنس کر کہا۔ ''اس بار تو میں صرف تین دن بعد واپس آ جاؤں گا۔''

''ہوں......'' ماسٹر جی نے بے دھیانی سے کہا۔ وہ کسی اور سوچ میں تھے۔ ''اوتار سنگھ، بیٹے...... میں تم پر ایک بہت بڑا بوجھ ڈالنا چاہتا ہوں۔''

اوتار سنگھ ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ ''حکم کریں ماسٹر جی۔''

''تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے...... بلکہ سب کچھ کیا ہے...... ایک بیٹے کی طرح! تو بیٹے کی طرح میرا ایک آخری کام بھی کر دینا۔''

''آپ حکم تو کریں ماسٹر جی۔''

''میں مر جاؤں تو میری چتا تمہیں جلانا اور میری چتا کو آگ تمہی دینا۔''

''لیکن ماسٹر جی......''

''یہ میری وصیت ہے اوتار سنگھ۔'' ماسٹر جی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں سب ڈاکٹروں سے بات کر چکا ہوں۔ میری چتا میرا کوئی بیٹا نہیں جلائے گا۔ تم جلاؤ گے۔ یہ تمھارے لیے میرا حکم ہے۔''

''مگر ماسٹر جی، وہ لوگ آپ سے ملنے آنا چاہتے ہیں...... اور آئیں گے بھی۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں احتجاج تھا۔

''آئیں گے تو ان کا احسان ہوگا مجھ پر۔ نہیں آئیں گے تو شکایت نہیں کروں گا۔ مگر میرا یہ فیصلہ آخری ہے۔''

اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی!

❁......❁......❁

جنوری کا مہینہ گزر رہا تھا۔ کالج دوبارہ کھلا تو اوتار سنگھ یہ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ ریٹا کا سامنا کیسے کرے گا۔ یہ بات نہیں کہ وہ کسی بھی اعتبار سے اس کا مجرم ہو۔ وہ تو اس کے لیے شرمندگی کا نشان تھی۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ رچرڈ اور ریٹا دونوں غائب تھے۔ کالج کھلے ہوئے پندرہ دن ہو گئے اور وہ نہیں آئے۔ اب اوتار سنگھ اس طرف سے پریشان تھا کہ ان کی غیر حاضری کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اس کا دل وسوسوں میں گھر گیا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کہیں ریٹا نے اس کے نکل جانے کے بعد کوئی الٹی سیدھی حرکت تو نہیں کر لی۔ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔ رچرڈ ہی آ جاتا تو اس سے حقیقت حال معلوم ہو جاتی۔

وہ اس معاملے کی حقیقت جاننے کو بے تاب تھا۔ صرف اسی طرح اس کی پریشانی دور ہو سکتی تھی۔ مگر اس کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بس ایک ہی حل تھا۔ وہ ان کے گھر جا کر معلوم کرے۔ لیکن اس کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اور پھر کون جانے کہ وہاں جانے پر کیا صورتِ حال سامنے آئے اور اس پر اس کی ذمے داری عائد کر دی جائے۔

پھر سیاسی ماحول میں بھونچال آ گیا۔ پورا ہندوستان جیسے کسی آتش فشاں کے دہانے پر تھا۔ وائسرائے نے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس 9 دسمبر 46ء کو طلب کیا تھا۔ اس پر محمد علی جناح نے تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ وائسرائے نے موجودہ صورتِ حال کی سنگینی اور زمینی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور وہ پوری طرح کانگریس کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ انھیں مسلم

لیگ اور ہندوستان کی دیگر سیاسی تنظیموں کی کوئی پروا نہیں۔

دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شیڈول کے مطابق ہوا۔ لیگ کے تمام نمائندے اجلاس میں شریک نہیں ہوئے۔ اجلاس میں چیئر مین کا انتخاب ہوا اور ایک ضابطہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ایک قرارداد منظور کی گئی، جس کے تحت ہندوستان کو وفاقی جمہوریہ قرار دے دیا گیا جبکہ پلان میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ علاقائی آئین کی تشکیل تک وفاقی آئین پر غور نہیں کیا جائے گا۔

دوسری طرف کانگریس پنجاب میں خضر حیات ٹوانہ کی نام نہاد مخلوط پٹھو حکومت کی کھل کر حوصلہ افزائی کر رہی تھی، جو یکے بعد دیگرے شہری حقوق کو غصب کرتی جا رہی تھی۔ پٹھو حکومت نے 24 جنوری 47ء کو مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی تنظیم کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ پولیس نے گارڈز کے ہیڈ کوارٹر پر چھاپہ مارا، جس میں انھیں کافی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ پنجاب کے بیشتر بڑے مسلم لیگی رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے خلاف تحریک شروع ہوئی، جو اتنی پھیلی کہ خضر حیات حکومت کے بس سے باہر ہو گئی۔ نتیجہ یہ کہ حکومت کو مستعفی ہونا پڑا۔

اسی دوران بمبئی، احمد آباد اور کئی شہروں میں اور متحدہ اور وسطی صوبوں اور مدراس کے گاؤں دیہاتوں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ الہ آباد اور کانپور میں تشدد کی وارداتیں معمول بن گئیں۔ کلکتہ میں چھرا گھونپنے کے واقعات جاری رہے۔ ڈھاکہ اور نواکھلی بھی فسادات کی لپیٹ میں آ گئے۔ میرٹھ میں ڑھ مکھتیشر اور بہار میں سرن، پٹنہ، گیا، مونگیر اور بھاگلپور میں ہندو مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہزاروں مسلمان مارے گئے، ان کی جائیدادیں لٹیں اور ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ برصغیر پوری طرح یک طرفہ خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

ان حالات میں برطانیہ کے وزیر اعظم اٹیلی نے 20 فروری کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کا اقتدار جون 48ء سے پہلے ذمے دار ہندوستانیوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

اوتار سنگھ بہت دکھی تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ انگریز کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اگر درست فیصلے کرتے اور کانگریس سے جانب داری نہ برتتے تو اتنی خوں ریزی نہ ہوتی۔ وہ حکمراں تھے۔ انھیں فیصلے کرنے کا اختیار تھا اور کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں ان سے تعاون کرنے پر مجبور تھیں آزادی کی خاطر! اسے لگتا تھا کہ انگریز یہ سب دیدہ و دانستہ کرا رہے تھے۔ ہندوؤں کا چیلنج تھا کہ پاکستان بن بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکے گا۔ اوتار سنگھ کے خیال میں وہ بے بنیادی چیلنج نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ انگریز کانگریس سے ملے ہوئے ہیں اور تقسیم اس غیر منصفانہ انداز میں کی جائے گی کہ پاکستان بن بھی جائے تو تھوڑے ہی عرصے میں ٹوٹ پھوٹ جائے۔

اوتار سنگھ ذہین اور حساس تھا۔ غیر جانب دار بھی تھا۔ لیکن مسلمانوں کے مسلسل جانی نقصان نے اس کی غیر جانب داری ختم کر دی۔ اس پر واضح ہو گیا کہ مسلمان مظلوم ہیں۔ قیام پاکستان کے حق میں تو وہ پہلے ہی تھا۔

فروری کے آخر میں رچرڈ اچانک کالج چلا آیا۔ کلاس میں وہ اوتار سنگھ کے برابر ہی بیٹھا۔ "کیا بات ہے؟ تم لوگ اتنے دن کالج نہیں آئے۔" اوتار سنگھ نے اس سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" رچرڈ نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "بس ایک اہم کام میں الجھے ہوئے تھے۔"

"ریٹا نہیں آئی؟"

رچرڈ نے اسے غور سے دیکھا۔ "کیا تم اسے مِس کرتے رہے ہو؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"مِس تو خیر نہیں کر رہا تھا۔ مگر مجھے تشویش تھی تم لوگوں کی طرف سے۔"

"اور پھر بھی گھر آ کر خیریت دریافت نہیں کی؟"

اوتار سنگھ کھسیا گیا۔ "بس مصروفیات ہی ایسی ہیں۔" وہ بولا۔ "مگر تم نے بتایا نہیں کہ ریٹا کیوں نہیں آئی۔"

"وہ نہیں آ سکتی۔ مگر اس نے تمھارے لیے یہ بھجوایا ہے۔" رچرڈ نے فائل میں سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

اوتار سنگھ نے لفافے کا جائزہ لیا۔ لفافے پر صاف ستھری تحریر میں اس کا نام لکھا تھا۔ اس نے لفافہ جلدی سے اپنی فائل میں رکھ لیا۔ پھر وہ رچرڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم نے اب بھی نہیں بتایا کہ ریٹا کیوں نہیں آئی۔ وہ خیریت سے تو ہے نا؟"

رچرڈ مسکرایا۔ "یہ لفافہ کھول کیوں نہیں لیتے۔ میرا خیال ہے، اس میں تمھارے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ خیریت سے ہے۔"

اس روز پڑھائی میں اوتار سنگھ کا دل نہیں لگا۔ وہ اس لفافے کو اپنے کمرے کی تنہائی میں کھولنا چاہتا تھا۔ کون جانے، اس میں کیا ہو۔ اندازہ تو یہی ہو رہا تھا کہ اس میں خط ہے۔ اور وہ یہ اندازہ بھی لگا سکتا تھا کہ خط میں کرسمس کی اس رات کا تذکرہ ہوگا۔ بلکہ خط اسی کے بارے میں ہوگا۔ اب انداز کیا ہوگا، اس واقعے کے بارے میں ریٹا کا نکتہ نظر کیا ہوگا، اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ البتہ وہ متجسس بہت زیادہ تھا اور وہ تجسس لفافہ کھلنے پر ہی دور ہوتا۔

یہ بڑی بات تھی کہ اس نے جیسے تیسے پورے پیریڈ اٹینڈ کر ہی لیے!

❀......❀......❀

اپنے کمرے میں اوتار سنگھ لفافے کو دونوں ہاتھوں میں یوں تول رہا تھا، جیسے اس کے وزن کا اندازہ لگا رہا ہو۔ اب وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ لفافے میں بس ایک خط ہے۔ تجسس اسے خط کھولنے پر مجبور کر رہا تھا اور خط کھولتے ہوئے وہ ڈر بھی رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اس میں الزام تراشیاں ہوں گی، شکایتیں ہوں گی اور ایسی کہ وہ ان کا جواب بھی نہیں دے سکے گا۔

مگر خط تو بہر حال اسے کھولنا تھا۔ دل کڑا کر کے اس نے لفافہ چاک کیا اور خط نکال لیا۔ دھڑکتے دل سے اس نے خط کی تہیں کھولیں اور اسے پڑھنے لگا۔

پیارے دوست!

صدا خوش رہو!

جس وقت تم یہ خط پڑھ رہے ہو گے، میں یہاں سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ دراصل جو کچھ ہوا...... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں نے جو کچھ کیا، اس کے بعد مجھ میں تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ سامنا کرنا تو بہت دور کی بات ہے، میں اس پر معذرت بھی نہیں کر سکتی۔ شرمندگی کا اظہار بھی نہیں کر سکتی۔ یہ خط بھی صرف اس لیے لکھ رہی ہوں کہ تمھیں اپنے بارے میں سب کچھ پوری سچائی کے ساتھ بتا دوں۔ شاید اس کے بعد تم مجھے معاف کر سکو۔

میں ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی اور پلی بڑھی۔ بہت چھوٹی سی تھی، تبھی سے ہندوستانی لوگوں میں، ان کے کلچر میں، ان کی زبان میں دلچسپی لیتی تھی۔ یہاں کے ڈریس مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ یہاں رنگ ہی رنگ تھے۔ میں یہاں کے رنگ میں رنگنا چاہتی تھی۔ میں نے تعلیم کے لیے انگلینڈ جانے سے انکار کر دیا۔ میں تو یہاں کی زبان سیکھنا چاہتی تھی۔ مجھے کانونٹ بھیج دیا گیا۔

اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں کہیں کی نہ رہی۔ سچ پوچھو تو میرا اپنا کوئی کلچر نہیں۔ نہ میں انگریز ہوں نہ ہندوستانی۔ آدھی اِدھر آدھی اُدھر۔ کانونٹ میں ہندوستانی لڑکیاں بھی تھیں۔ میں نے انگریز لڑکیوں کے مقابلے میں دوستی کے لیے انھیں ترجیح دی۔ تب میری سمجھ میں پہلی بار آیا کہ ہندوستانی لوگ بہت رومینٹک ہوتے ہیں۔ بے حد تخیلاتی، ہندوستانی لڑکیاں [illegible]

خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرتی ہیں۔ ان کی محبت کی بنیاد پاکیزگی پر ہوتی ہے۔ ان کا انداز ایسا ہوتا ہے، جیسے محبت بھی کوئی مذہب ہے۔ کانونٹ میں پڑھنے والی بے حد ماڈرن لڑکیوں کو بھی میں نے محبت کے معاملے میں قدامت پرست ہی پایا۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔ میں شاید پیدائشی طور پر رومان پسند تھی اور تخیلاتی بھی۔ میں نے مشرق کے اس فلسفہ محبت کو اپنا لیا۔ میرے خیالوں میں بھی خوابوں کا ایک شہزادہ بس گیا۔ کانونٹ میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا، جو میرے خوابوں کا وہ شہزادہ ہو۔ میں اس کا انتظار کرتی رہی۔

جب تمھیں دیکھا تو میں نے پہلی نظر میں جان لیا کہ وہ تم ہو۔ میں جواب تک محبت کے بارے میں صرف سوچتی رہی تھی، محبت میں گرفتار ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ یہ کیسی سحر انگیز کیفیت کا نام ہے۔ اب میرے اندر اور باہر...... میرے گرد و پیش میں ہر طرف خوبصورتی ہی خوبصورتی تھی۔ میری ہم نسل سہیلیوں نے جو محبت میں جسمانی اختلاط کو ضروری سمجھتی تھیں، اپنی جو کیفیات بتائی تھیں، میری کیفیت ان سے بہت مختلف تھی۔ تب میں نے سمجھ لیا کہ جسمانی اختلاط انتشار، ٹوٹ پھوٹ اور محبت کے زوال کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ محبت تو اصل میں پاکیزگی، ایثار اور قربانی کا نام ہے۔ محبت کچھ لینے کا نہیں، سب کچھ دے دینے کا نام ہے۔

پھر میں نے پہلی بار تم سے اظہارِ محبت کیا۔ اس وقت میں بہت پُر اعتماد تھی۔ میرے خیال میں مجھ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ میں خوبصورت تھی۔ نسلی اعتبار سے برتر تھی۔ لیکن تم نے بتایا کہ تم پہلے ہی کسی سے محبت کرتے ہو۔ ایک ایسی لڑکی سے، جس کی تم نے صرف آواز سنی ہے۔ کبھی دیکھا تک نہیں ہے۔

میرا پہلا ردِعمل بے حد مہذبانہ تھا۔ میں نے سوچا...... میرا نصیب۔ محبت میں زبردستی نہیں ہوتی۔ وہ تو خود بہ خود ہو جاتی ہے۔ لیکن بعد میں گڑبڑ ہو گئی۔ شاید مشرقی انداز میں سوچنے کے باوجود میں اپنی بنیاد میں مغرب کی لڑکی تھی۔ مجھے اپنے حسن پر بہت غرور تھا۔ شاید محبت کی عظمت کو سمجھنے کے [illegible] عظمت پر، اس کے بنیادی فلسفے پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ تمھارے انکار [illegible] میری انا کو ٹھیس پہنچائی اور اس کے زیر اثر میں نے

تمھارے حصول کو ایک آسان چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ بس یہ بھول گئی کہ انا سر اٹھالے تو محبت کہیں پیچھے رہ جاتی ہے۔ محبت میں تو انا کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

تو میری انا نے مجھے یہ سمجھایا کہ جسم ایک ناقابل تردید حقیقت ہے جبکہ آواز محض ایک گمان ہے۔ اس آواز والی کو تم دیکھو اور وہ کوئی بدصورت لڑکی ہو تو تمھاری محبت پانی کے بلبلے کی طرح ختم ہو جائے گی اور اگر وہ خوبصورت بھی ہو تو مجھ سے زیادہ خوبصورت تو نہیں ہوگی اور ہو بھی تو وہ تو اوجھل ہے جبکہ میں تمھارے سامنے، تمھارے قریب ہوں۔ میں اگر منصوبہ بندی کر کے کوشش کروں تو تم میرے سحر سے نہیں نکل سکتے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میری انا نے مجھے بہت پست کر دیا، گھٹیا بنا دیا اور میں بن گئی۔ میں نے وہ گھٹیا منصوبہ بنایا۔ میں نے تمھارے لیے وہ ملاوٹ شدہ مشروب تیار کرایا۔ پھر میں نے تمھیں بے خیالی میں شراب بھی پلا دی۔ اس سے اندازہ لگا لو کہ تمھیں کردار کے اعتبار سے میں کتنا بڑا آدمی سمجھتی ہوں...... بڑا اور ناقابل تسخیر اور آج میں اپنے اس عمل پر، اس سازش پر اتنی شرمندہ ہوں کہ خود کو معافی کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔ تم میرے چاند تھے۔ میں نے تمھیں داغ دار کرنے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم داغ سے محفوظ رہے۔ اب تم چاہے مجھے معاف کر دو۔ مگر میں اپنے اس گھٹیا پن پر خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

اوتار سنگھ، یہ پورا خط سچا ہے۔ اس میں کہیں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں تم سے محبت کرتی تھی۔ تمھیں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں جسمانی اختلاط کی قائل نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا، صرف تمھیں پانے کی اندھی خواہش میں ہوا۔ میں نے سوچا کہ تم ایسے ہو کہ اگر تم سے لغزش ہوئی تو تم اسے نباہنے کے لیے مجھ سے شادی کر لو گے اور پھر میں تمھاری محبت جیت لوں گی۔

میں اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتی۔ مگر میں نے پہلے خدا کی محبت اور اس کے بعد آواز والی اَن دیکھی لڑکی کی محبت کا طعنہ دے کر اپنا کھیل خراب کر لیا۔ میں اس پر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کیونکہ اسی وجہ سے تم اپنی نظروں میں گرنے سے بچ گئے۔ ورنہ میں زندگی بھر اس پر ملول رہتی۔

دوسری بات یہ کہ اس طعنے ہی کی وجہ سے مجھ پر حقیقی محبت کی عظمت کھلی۔ تم نشے میں دھت تھے۔ لیکن میرے وہ دونوں طعنے تمھیں ہوش میں لے آئے۔ تم سنبھل گئے۔ پستی میں گرنے سے بچ گئے۔ میرا کیا ہے، میں تو تھی ہی پست۔ تمہاری وجہ سے میں بھی بچ گئی۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں۔

یہ اعتراف نامہ میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے پوری سچائی سے لکھا ہے۔ یہ میرا تم سے آخری رابطہ ہے۔ ایک بات اب تک کسی کو نہیں بتائی ہے۔ صرف تمھیں بتا رہی ہوں۔ میرے اس گناہ نے میری روح کو بہت بوجھل کر دیا ہے۔ میں اس کا کفارہ ادا کروں گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی کی تمام خوشیوں اور لذتوں سے ناتا توڑ کر لوگوں کے دکھوں اور ان کی پریشانیوں کو اپناؤں گی۔ میں چرچ جوائن کر کے راہبہ بن جاؤں گی۔ زندگی بھر خدا سے اپنے لیے معافی اور تمھارے لیے سچی خوشیاں، بلند مقام اور بلند مرتبہ مانگتی رہوں گی۔

آخر میں ایک التجا کرتی ہوں۔ جو کچھ اس رات ہوا، اس میں تمہارا ذرہ برابر قصور نہیں تھا۔ تم کبھی اس کے بارے میں شرمندہ ہو یا خود کو مجرم سمجھو تو اس سے میرے گناہوں کے بوجھ میں اضافہ ہوگا۔ کیونکہ سازش میں نے کی تھی۔ قصور وار میں تھی۔ اگر ایک دوست کی حیثیت سے تمھیں میرا ذرا بھی خیال ہے تو خود کو مجرم کبھی نہ سمجھنا بلکہ تم خدا سے میرے لیے دعا کرنا کہ وہ مجھے معاف کر دے اور کاش تم بھی مجھے معاف کر دو۔

خدا ہمیشہ تم پر کرم فرمائے۔ خدا حافظ

تمہاری گناہ گار دوست

ریٹا پارسن

اوتار سنگھ نے خط تہ کر کے دوبارہ لفافے میں رکھ دیا۔ اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ ریٹا کے بارے میں اس کا جو تصور تھا، ریٹا اپنے خط میں اس سے بہت مختلف ثابت ہوئی تھی۔ کیسی عاجزی، کیسی نرمی، کیسا گداز اور کیسی سچائی تھی اس کے خط میں۔ وہ دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔

اوتار سنگھ نے دیکھا تھا کہ عام طور پر غلطی کر کے لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں۔ بلکہ جتنی بڑی غلطی ہو، اتنا ہی اصرار کرتے ہیں۔ غلطی تسلیم کرنا، معذرت کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لیے بڑا ظرف درکار ہوتا ہے اور ریٹا نے خود کو صاحب ظرف ثابت کر دیا تھا۔

پھر اس نے ریٹا کے فیصلے کے بارے میں سوچا۔ چرچ کی ننوں کے بارے میں وہ تھوڑا بہت جانتا تھا۔ ریٹا نے دنیا ترک کر کے نن بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر اس کے خیال میں یہ غلط تھا۔ بلکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ خدا کی اسکیم کے خلاف ہے...... ایک طرح کی بغاوت ہے۔ رومن کیتھولک عقیدے کے پادری اور راہبائیں جو زندگی گزارتے تھے، وہ یکسر غیر فطری تھی۔ اگر دنیا کے تمام لوگ یہ نظریہ اپنا لیتے اور اس طرح کی زندگی گزارتے تو نسل انسانی کا وجود ہی مٹ چکا ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ خدا سے بغاوت تھی۔ دوسری طرف وہ غیر فطری زندگی گناہ کے امکان کو بہت زیادہ قوی کر دیتی تھی۔ فطری تقاضوں کے سامنے ان میں سے کوئی بھی سرنگوں ہوتا تو گناہ کی دلدل میں دھنس کر رہ جاتا۔ اس کے نزدیک اس میں خسارہ ہی خسارہ تھا۔

لیکن وہ یہ بات ریٹا کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔ سمجھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سمجھانے میں اس تعلق کا اظہار ہوتا جو اس کے اور ریٹا کے درمیان تھا ہی نہیں۔ اور وہ پھر سے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے سمجھ لیا کہ وہ اس کی کتابِ زندگی کا ایک چھوٹا سا اور غیر اہم باب تھا، جو ختم ہو گیا ہے۔

❀......❀......❀

حور بانو اور نور بانو کے کرتے مکمل ہو گئے تھے۔ سرفراز بیگم ان کا کام دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ خاص طور پر نور بانو کی کڑھائی نے تو انھیں حیران کر دیا۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ کام اس نے بس مروت میں کیا۔ ورنہ اوتار سنگھ سے تو وہ چڑتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کے ٹالنے والے کام میں اتنی خوبصورتی ہے تو محبت سے کام کرے گی تو غضب ہی ڈھائے گی۔

انھوں نے یہ بات نور بانو سے کہہ بھی دی۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں اماں۔'' نور بانو نے کہا۔ ''کام تو میں نے محبت سے ہی کیا ہے۔ کام محبت سے کیا جائے تو عبادت ہی ہوتا ہے نا اماں۔''

سرفراز بیگم نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ بپھرتی تو آتش فشاں بن جاتی اور نرم ہوتی تو دور سے ہی احساس ہوتا کہ مخمل سے بنی ہے۔ اے اللہ...... اس کے نصیب بہت اچھے کرنا۔ انھوں نے دل میں اس کے لیے دعا کی۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ اس کے لیے فکرمند رہتی تھیں۔ وہ بڑی خوبیوں، بڑے ہنر والی تھی۔ لیکن شکل وصورت کے اعتبار سے بہ مشکل اسے گوارا ہی کہا جا سکتا تھا۔ اب انھیں لڑکیوں کی شادی کی فکر بھی تھی۔ ملک کے حالات ایسے تھے کہ آنے والی کل کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ شہر میں کشیدگی تھی۔ مسلمانوں کے چھرا گھونپنے کی وارداتیں عام ہو گئی تھیں۔ ایسے میں بیوہ عورت۔ عزت اور آبرو

کی طرف سے نہ ڈرے تو کیا کرے۔

ایسا نہیں تھا کہ لڑکیوں کے رشتے آئے ہی نہ ہوں۔ حور بانو کے لیے تو اب تک چار پیغام آ چکے تھے۔ وہ خاندانی اعتبار سے کم تر تھے۔ اور وہ معاشی مضبوطی سے محروم تھے۔ چنانچہ انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ گلنار کے بھی دو رشتے آئے تھے۔ وہ دونوں ہی اچھے تھے۔ لیکن سرفراز بیگم نور بانو کے بیٹھے ہوئے اس کی شادی کیسے کر سکتی تھیں۔ انھیں تو سب سے بڑھ کر نور بانو کے لیے رشتے کا انتظار تھا۔ مگر اس کا کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔

مگر اب جو حالات تھے، ان کے بارے میں سوچ کر وہ پچھتا رہی تھیں۔ انھیں احساس ہو رہا تھا کہ انھوں نے انکار کر کے غلطی کی ہے۔ کچھ نہیں، دو بیٹیاں تو عزت کے ساتھ اپنے گھر کی ہو جاتیں۔ ایک نور بانو ہی تو رہ جاتی۔ اب تو وہ تین گنا بوجھ سر پر لیے بیٹھی تھیں۔

باہر کے حالات ایسے تھے کہ وہ مستقل طور پر پریشان رہنے لگی تھیں۔ بس اوتار سنگھ کی محبت ان کے لیے بڑا سہارا تھی۔ ان کا دل گھبرا جاتا تو وہ اوپر چلی جاتیں۔ اس سے بات کرتے ہوئے وہ سب کچھ بھول جاتیں۔ بس ایسا لگتا کہ برسوں کا بچھڑا بیٹا انھیں مل گیا ہے۔ ان کا سینہ خوشی سے پوری طرح بھر جاتا۔ سچ یہ تھا کہ وہ اس کی قربت میں بہت محظوظ ہوتی تھیں۔

انھیں خوشی اس بات کی تھی کہ اوتار سنگھ بھی ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ ان کا ویسے ہی ادب اور احترام کرتا تھا، جیسے کوئی اچھا بیٹا اپنی ماں کا کرتا ہے۔ وہ ان کی ہر بات بہت غور سے سنتا۔ اور اس دوران اس کی نگاہوں میں محبت ہوتی۔

گھر میں صرف سرفراز بیگم ہی ایسی نہیں تھیں، جو پریشان ہوں۔ بہادر علی ان سے کہیں زیادہ پریشان تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ اس کا تو باہر آنا جانا رہتا تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اسے سب سے بڑھ کر احساس تھا۔ اس کی پریشانی کا سرفراز بیگم کو علم نہیں تھا کیونکہ وہ اس کے سامنے نہیں آتی تھیں۔ لیکن چھمن بوا کو علم تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ بلکہ وہ تو اس کی پریشانی کا سبب بھی جانتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود بھی پریشان رہنے لگی تھیں۔ اکیلی بیٹھی ہوتیں تو تشویش بھرے انداز میں بڑبڑاتیں...... اے اللہ، آبرو رکھ لیجیو۔ بس تیرا ہی آسرا ہے۔

بہادر علی نے ازخود انھیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مگر وہ جہاں دیدہ تھیں۔ بے خبر رہ بھی نہیں سکتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ بہادر علی حکم کا بندہ ہے۔ ہر حکم پر بلا چون و چرا عمل کرتا ہے۔ مگر ایک دن انھیں احساس ہوا کہ نجانے کب اس میں تبدیلی آ گئی ہے۔

ہوا یوں کہ اس رات انھوں نے بہادر علی سے کہا۔ ''آدھا سیر دہی لے آؤ۔''

''ابھی شام کو ہی تو میں دہی لایا تھا۔'' بہادر علی نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

یہ غیر معمولی بات تھی۔ بہادر علی کبھی کسی کام میں حجت نہیں کرتا تھا۔ ''تمھیں اس سے

کیا۔" چھمن بوا نے تنک کر کہا۔ "تم سے جو کہا جائے، وہ کرو۔ بہادر علی زیر لب کچھ بدبدایا۔
چھمن بوا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ "کچھ کہا تم نے؟" انھوں نے تیز لہجے میں کہا۔

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم آ کر دروازہ بند کرلو۔"

"پانچ منٹ تو لگیں گے تم کو دہی لانے میں۔"

"دیر بھی لگ سکتی ہے۔ تم میرے ساتھ چلو اور دروازہ بند کرلو۔" بہادر علی کے لہجے میں قطعیت تھی۔

چھمن بوا سمجھ گئیں کہ بہادر علی کی بات نہ مانی تو وہ نہیں ہلے گا۔ "اچھا چلو۔" انھوں نے غصے سے کہا۔

وہ گئیں اور دروازہ بند کر کے آئیں۔ انھیں اس وقت سچ مچ بہت غصہ آیا، جب دو تین منٹ بعد انھیں اس کی دستک پر دروازہ کھولنے کے لیے جانا پڑا۔ دروازہ کھولنے کے بعد وہ اس پر برسنے ہی والی تھیں کہ اس نے الٹا ان سے باز پرس شروع کر دی۔ "تم نے دروازہ کھولنے سے پہلے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ کون ہے؟"

چھمن بوا نے اسے یوں دیکھا، جیسے ان کے خیال میں وہ پاگل ہو گیا ہو۔ "کیوں پوچھتی۔ دہی لینے تم ہی گئے تھے نا۔ تو واپس بھی تم ہی آئے ہو گے۔"

"دیکھو...... یہ وقت ایسا نہیں۔" بہادر علی کا لہجہ نرم ہو گیا۔ "وقت بہت خراب آ لگا ہے۔ کبھی پوچھے بغیر دروازہ نہ کھولنا۔"

"کیوں بھئی؟"

بہادر علی ایک لمحے کو ہچکچایا۔ پھر بولا۔ "آج کل چوری کی وارداتیں بہت ہو رہی ہیں۔"
چھمن بوا اس کی لمحاتی ہچکچاہٹ دیکھ چکی تھیں۔ انھیں یقین نہیں آیا۔ مگر انھوں نے جرح نہیں کی۔ اس وقت تو انھیں بس دہی کی ضرورت تھی۔

پھر ایک دن ایک بہت غیر معمولی بات ان کے سامنے آئی۔ بہادر علی ڈیوڑھی میں سوتا تھا۔ اس رات چھمن بوا نجانے کس کام سے ڈیوڑھی میں گئیں۔ بہادر علی بے خبر سو رہا تھا۔ اچانک ان کی نظر بہادر علی کی چارپائی پر پڑی۔ سرہانے کی طرف تکیے کے نیچے لوہے کا ایک بڑا اور بھاری سریا رکھا تھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ چارپائی کے دونوں طرف نکلا ہوا تھا۔ اس کی کیا ضرورت پڑ گئی بہادر علی کو۔ انھوں نے سوچا۔ اور وہ بھی سوتے وقت۔ جبکہ یہ گھوڑے بیچ کر سوتا ہے۔

چند لمحے وہ اچنبھے میں رہیں۔ مگر پھر ان کے دل نے کہا کہ یہ بات بے سبب تو نہیں ہو سکتی۔

وہ جس چیز کی تلاش میں آئی تھیں، اندھیرے کی وجہ سے اس کا ملنا آسان نہیں تھا۔

روشنی وہ کرنا نہیں چاہتی تھیں کہ بہادر علی کی نیند خراب نہ ہو۔ حالانکہ انھیں پورا یقین تھا کہ روشنی سے بہادر علی کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ وہ ایسا ہی بے خبر سوتا تھا۔

ذرا دیر میں ان کی نگاہ اندھیرے سے ہم آہنگ ہو گئی۔ وہ ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھیں۔
بہادر علی کی چارپائی کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کا پاؤں کسی چیز میں الجھا اور وہ لڑکھڑا گئیں۔
وہ بہادر علی کا سلیپر تھا۔ ان کی چپل سلیپر میں پھنس گئی تھی۔ سلیپر گھسٹنے کی ہلکی سی آواز ہوئی۔ انھوں نے بڑی مشکل سے اپنے آگے کی طرف گرتے ہوئے جسم کو روکا اور سنبھلنے کی کوشش کی۔

وہ سنبھل تو گئیں۔ مگر اگلے ہی لمحے انھیں جو جھٹکا لگا، وہ ذہنی تھا۔ گہری بے ہوشی جیسی نیند سونے والا بہادر علی سلیپر گھسٹنے کی ہلکی سی آواز سے ہڑبڑا کر اٹھا، اس نے جھپٹ کر سرہانے رکھا سریا اٹھایا اور للکار کر بولا۔ "کون ہے؟ جہاں ہو، وہیں رک جاؤ۔"

چھمن بوا اپنی جگہ بت بن کر رہ گئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ بہادر علی کی آنکھیں ٹھیک سے کھلی بھی نہیں ہیں۔ مگر اس نے سریا اٹھا لیا ہے اور اسے سر سے اوپر بلند کر رہا ہے۔

"بہادر علی...... یہ کیا کر رہے ہو بہادر علی۔" انھوں نے گھبرا کر کہا۔ انھیں ڈر تھا کہ وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکیں گی اور سریا ان کے سر سے ٹکرا چکا ہو گا۔

مگر ان کی آواز سے بہادر علی کو جھٹکا لگا۔ پہلے تو کسی اضطراری عمل کے تحت اس کے سریے والے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ پھر اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اس نے چھمن بوا کو حیرت سے دیکھا۔ پھر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ "ارے چھمن بوا...... تم یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

چھمن بوا کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ انھیں احساس تھا کہ وہ بال بال بچی ہیں۔ غنیمت ہے کہ ان کی زبان کھل گئی۔ ورنہ اگلے ہی لمحے سر کھل جاتا اور زبان ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتی۔ ان سے بولا تو کچھ نہیں گیا۔ بس وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی رہیں۔

"میں نے پوچھا، تم یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت؟"

"کچھ ڈھونڈنے آئی تھی۔ کیا ڈھونڈنے آئی تھی، یہ اب یاد نہیں۔ مگر یہ کیا حرکت ہے۔ تم نے تو مجھے مار ہی دیا ہوتا۔"

"کون سی حرکت؟ کیا کہہ رہی ہو؟" بہادر علی نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھیں نہیں معلوم۔ حالانکہ اب بھی سریا سر سے اوپر اٹھائے کھڑے ہو۔"

بہادر علی کو بات کا احساس ہوا تو وہ کھسیا گیا۔

"اب تو خدا کے لیے اسے رکھ دو۔ میں تو ہول رہی ہوں۔"

بہادر علی کے سریا اٹھائے ہوئے ہاتھ نیچے آئے۔ اس نے سریا دوبارہ سرہانے رکھ

دیا۔ ''بس اب تم جاؤ۔ مجھے سونا ہے۔'' اس نے چھمن بوا سے کہا۔

''ایسے کیسے سونا ہے۔ میری تو نیند اڑا دی تم نے۔'' چھمن بوا نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟''

''مجھے بتاؤ، بات کیا ہے۔ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔''

''مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔''

''یہ سریا سرہانے رکھ کر کیوں سونے لگے ہو تم اور یہ معمولی سی آہٹ پر چونک کر اٹھتے ہو اور حملہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہو۔ ایسا کون سا خوف لاحق ہو گیا ہے تمھیں؟''

بہادر علی گڑبڑا گیا۔ ''خوف؟ کیسا خوف! ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''تو پھر یہ سریا سرہانے کیوں؟ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔''

''ارے وہ...... وہ میں نے بتایا تھا نا کہ آج کل چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ بہادر علی کے لہجے میں بے پروائی در آئی۔

چھمن بوا نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ ''تم جھوٹ بولتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ بس سچ اگل دو۔''

''سچ وہی ہے، جو میں نے بتایا۔''

''تم مجھے جانتے ہو۔ اب تمہاری جان نہیں چھوٹے گی۔''

بہادر علی کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ کندھے جھک گئے۔ وہ جانتا تھا کہ اب جان واقعی نہیں چھوٹے گی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ بتاتا ہوں۔ مگر گھر میں کسی کو پتا نہ چلے۔''

''اے ہے، ایسی کیا بات ہے۔ تم تو ہولائے دے رہے ہو مجھے۔''

''بات یہ ہے چھمن کہ ہندو مسلم فساد کا خطرہ ہے۔ رات کے وقت مسلمان راہ گیر نظر آ جائے تو ہندو چھرا گھونپ دیتے ہیں......''

''تو اس لیے تم اس دن دہی لانے سے گھبرا رہے تھے۔'' چھمن بوا نے طنز کیا۔

''بکومت۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔ موت جب آنی ہے تو آئے گی۔'' بہادر علی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم میری بات سن لو۔ میں باہر آتا جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ شہر میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہندوؤں کے عزائم ہیں کہ مسلمانوں کے گھروں پر منظم حملے کیے جائیں۔ ان کے گھر لوٹے جائیں اور انھیں ختم کر دیا جائے۔ اسی لیے میں محتاط رہتا ہوں۔ بہت بھاری ذمے داری ہے مجھ پر۔ دیکھو نا، جوان بچیوں کا ساتھ ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' چھمن بوا نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ ''مگر گھر کے لوگوں کو بے خبر تو نہیں ہونا چاہیے۔''

''بتانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس کے سوا کیا ہوگا کہ سب پریشان ہو جائیں گے۔ رہی بات بڑی بیگم کی تو وہ بے خبر نہیں ہوں گی۔''

''ہاں۔ پریشان تو وہ رہتی ہیں آج کل۔ لیکن کبھی کوئی بات نہیں کی۔''

''بس اب تم جاؤ۔ مجھے سونے دو۔''

بس اسی دن سے چھمن بوا کو بھی فکر رہنے لگی۔ بیٹھے بیٹھے وہ ہولنے لگتیں۔ گلی میں پتنگ لوٹنے والوں کا شور ہوتا تو وہ ڈر جاتیں۔ معمول کے مطابق گزرنے والے روز و شب ان کے لیے سخت ہو گئے۔

❀......❀......❀

اوتار سنگھ کے لیے کاڑھا جانے والا کرتا مکمل کر کے حور بانو کو جو خوشی ہوئی تھی، وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ خود اوپر جاتی اور اوتار سنگھ کو وہ کرتا دے دیتی۔ لیکن یہ تو کسی بھی طرح اور کبھی بھی ممکن نہیں تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کے معاملے میں تو شروع ہی سے یہ ہو رہا تھا کہ وہ جو چاہتی، اسے معلوم ہوتا کہ وہ ناممکن ہے۔ محبت تو اسے بے اختیار اور بے ارادہ ہوئی تھی بلکہ اس نے اس کے خلاف بساط بھر مزاحمت بھی کی تھی۔ اور اس محبت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد اس کے اندر دو عادتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک تو وہ تاویلیں تلاش کرنے لگی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مشرک سے محبت وہ گوارا نہیں کر سکتی تھی اور ترکِ محبت بھی اس کے بس میں نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی تاویلوں کو جواز بھی میسر آ گیا تھا۔ ایسی باتیں سامنے آئیں کہ صاف لگتا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر مشرک نہیں ہے۔ پھر یہ ہوا کہ اسے اپنی تاویلوں پر پختہ یقین ہو گیا۔ دوسری عادت یہ تھی کہ جو اس کا دل چاہتا اور وہ ممکن نہ ہوتا تو وہ اس کا تصور کر لیتی اور وہ تصور اتنا جان دار اور حقیقت سے اتنا قریب ہوتا تھا کہ اس سے اسے حقیقی تسکین حاصل ہوتی تھی۔

وہ دن بہت خوبصورت تھے اور اسے بہت یاد آتے تھے، جب چھوٹا ٹھاکر شام کو کوٹھے پر بیٹھتا تھا اور وہ بہانوں سے جا جا کر چپکے چپکے اسے دیکھ لیا کرتی تھی۔ مگر پھر استانی جی آنے لگیں تو وہ سلسلہ رک گیا۔ اور ایک دن استانی جی نے چھٹی کی تو اسے پتا چلا کہ چھوٹا ٹھاکر اپنا وہ معمول ترک کر چکا ہے۔ اس کے بعد بھی اس نے کئی بار موقع نکال کر دیکھا۔ لیکن ثابت ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر اب کوٹھے پر نہیں آتا ہے۔ وہ اس کے لیے بہت بڑی محرومی تھی۔ اسے پھر تصور کا سہارا لینا پڑا۔ ابتداء میں تو بڑی بے کیفی ہوئی کیونکہ وہ اس دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔ مگر چند روز بعد رنگ، دوبارہ

جم گیا۔ بلکہ اسے احساس ہوا کہ براہِ راست دیکھنے کے مقابلے میں تصور میں زیادہ گنجائش ہے۔ تصور حقیقت کی طرح محدود جو نہیں ہوتا۔

تو اب کرتے کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ اس کے تصور کو موقع مل گیا۔ اس کے تصور کو گویا ایک کھلونا ہاتھ آ گیا۔ اور اس کے لیے عرصہ بھی کافی تھا۔ اماں ابھی کڑھائی کر رہی تھیں۔ گرمیوں کی آمد میں بھی ابھی کافی دن تھے۔

حور بانو کی محبت تمام نشیب و فراز دیکھ چکی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ ہر روز چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا کرتی تھی۔ مگر اب بہت عرصے سے یہ سلسلہ موقوف تھا۔ محبت کمزور ہو یا سطحی ہو تو ایسے عرصے میں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حور بانو کی محبت کم نہیں ہوئی۔ بلکہ اور بڑھ گئی۔ دوسری طرف بغیر کسی وجہ کے اسے یہ یقین بھی تھا کہ قرآن سنتے سنتے چھوٹا ٹھاکر کسی دن اچانک ایمان لے آئے گا...... مسلمان ہو جائے گا۔

یہ سب کچھ وہ سوچتی رہتی تھی۔ کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس بات نے اسے اور تصوراتی بنا دیا تھا۔ ہر بات...... ہر کام وہ تصور میں کر لیتی تھی۔

اس کرتے کو کاڑھنے میں اسے بہت زیادہ وقت لگا تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ ورنہ کرتا اس سے آدھے وقت میں مکمل ہو گیا ہوتا۔ ایک تو یہ تھا کہ کرتا وہ اکیلے میں لے کر بیٹھتی تھی۔ ایسا کم ہی ہوا تھا کہ کسی کے سامنے اس نے کڑھائی کی ہو۔ کرتا کاڑھنا اس کے لیے چھوٹے ٹھاکر سے ملاقات کے مترادف تھا۔ وہ اکیلے میں بیٹھتی۔ ایک ٹانکا لگاتی، پھر بیٹھ کر اسے انگلی سے سہلاتی، اسے تنقیدی کی نظروں سے دیکھتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اسے ادھیڑ کر دوبارہ سے لگاتی۔ اور کڑھائی کے دوران وہ کرتے کے کپڑے کو کئی کئی بار نرم ہاتھ سے محبت بھرے انداز میں سہلاتی۔ زیادہ تر یہ عمل غیر شعوری ہوتا تھا۔ لیکن کبھی کیا۔ اس کے شعور میں یہ خیال آتا کہ وہ کپڑا نہیں، چھوٹے ٹھاکر کا وجود ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ شرم سے دُہری ہو جاتی۔ چور نگاہوں سے وہ اِدھر اُدھر دیکھتی کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے اور وہ کپڑے سے یوں ہاتھ ہٹاتی، جیسے دہکتے ہوئے انگاروں پر ہاتھ پڑ گیا ہو۔

کئی بار اس نے یہ بھی سوچا کہ چھوٹا ٹھاکر تو اس کی محبت سے بے خبر ہے۔ اگر اسے اس کی محبت کا پتا چل جائے تو کیا ہوگا۔ اس خیال کے آگے امکانات کا بہت بڑا میدان تھا۔ اسی میدان میں وہ کئی زاویوں سے یہ کھیل کھیلتی۔ کسی Version میں چھوٹا ٹھاکر یہ جان کر خوش ہوتا تو کسی میں اس پر برہمی کا اظہار کرتا۔ کسی میں وہ پریشان ہو کر کہتا...... یہ کیسے ممکن ہے۔ تمھارے اور میرے درمیان مذہب کی اتنی بڑی خلیج ہے کہ جسے پاٹا نہیں جا سکتا۔ اور کبھی وہ اعلان کرتا...... اس وقت میں مسلمان نہیں ہوں تو ہندو بھی نہیں ہوں۔ اور میں اسلام کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

چھوٹے ٹھاکر کے ردِ عمل کے مطابق اس کی کیفیات ہوتیں۔ کبھی وہ خوش ہوتی، کبھی اداس ہو جاتی اور کبھی پریشان۔ لیکن ہر حال میں اسے لطف آتا تھا کیونکہ وہ ایک رکی ہوئی کہانی کو آگے بڑھا رہی ہوتی تھی۔

اسے ایک بات پر بڑی حیرت تھی۔ اس نے کرتا مکمل کرنے میں بڑی دیر لگائی تھی۔ لیکن نور بانو کے کرتے کی کڑھائی بھی اس کے ساتھ ہی مکمل ہوئی تھی۔ کیوں؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے حساب سے تو نور بانو کو اتنے عرصے میں دو کرتے مکمل کرنا چاہیے تھے۔ اس نے اتنا سست کام کیوں کیا، اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس نے سوچا، بیگار سمجھ کر رہی تھی نا، اس لیے دیر لگی ہوگی۔ مگر اسی لمحے اس کے کانوں میں نور بانو کے الفاظ گونجے...... کام تو میں نے محبت سے ہی کیا ہے۔ کام محبت سے کیا جائے تو عبادت ہی ہوتا ہے نا اماں۔

حور بانو نے سر جھٹک دیا۔ یہ معما اس کی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔

❀......❀......❀

''تمھارے ماسٹر جی کا کیا حال ہے بیٹے؟'' سرفراز بیگم نے پوچھا۔

''بس ٹھیک ہیں ماں جی۔ پہلے سے تو بہت بہتر ہیں۔'' اوتار سنگھ نے جواب دیا۔

''تمھاری بات سے تو لگتا ہے کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔''

اوتار سنگھ نے نظریں جھکا لیں۔ چند لمحے وہ خاموش رہا۔ پھر بولا تو اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''ڈاکٹروں کا کہنا ہے ماں جی کہ مرض بہت بڑھ چکا ہے۔ یہ بھی میری کوتاہی ہے۔ مجھے پہلے خیال آ جاتا تو شاید یہ صورتِ حال نہ ہوتی۔''

سرفراز بیگم نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور بناوٹی خفگی سے بولیں۔ ''تم ہر الزام اپنے سر لینے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔ تمھارے ماسٹر جی تم سے زیادہ اپنے بیٹوں کی ذمے داری تھے۔''

''اپنی ذمے داری وہ جانیں ماں جی۔ مجھے تو اپنی فکر کرنی چاہیے نا۔ کوتاہی تو مجھ سے ہوئی۔ مجھے فوراً ان کا خیال آ جاتا تو مرض اتنا بڑھنے سے پہلے میں انھیں سینی ٹوریم لے جا سکتا تھا۔''

''یہ بھی تو سوچو کہ اگر تمھیں مزید کچھ دن ان کا خیال نہ آتا تو کیا ہوتا؟''

اوتار سنگھ نے انھیں زخمی نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

''زندگی اور موت صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔'' سرفراز بیگم نے وضاحت کی۔ پھر انھوں نے موضوع بدلا۔ ''ابھی بڑے دن کے موقعے پر تم کئی دن ان کے پاس رہ کر آئے ہو نا۔''

اوتار سنگھ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''جی ماں جی۔ اور ماسٹر جی بہت خوش ہوئے۔''

''یہ بتاؤ، ان کے بیٹے بھی کبھی ان سے ملنے جاتے ہیں؟''

''اپنے اپنے روزگار میں الجھے ہوئے ہیں...... مصروف ہیں وہ۔'' اوتار سنگھ نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن شاید اگلے مہینے ان کا چھوٹا بیٹا میرے ساتھ جائے۔''

''زندگی کی مصروفیات تو چلتی رہتی ہیں بیٹے۔ لیکن بیمار باپ کی خدمت اور عیادت کے لیے کوئی عذر نہیں چلتا اور جب انھوں نے بیمار باپ کو اچھوت بنا کر کوٹھری میں ڈال رکھا تھا، تب کون سی مجبوری تھی انھیں۔ وہ ان کے مرنے کا ہی انتظار تو کر رہے تھے۔''

اوتار سنگھ نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ ''آپ...... آپ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے؟''

''رنجنا نے بتایا تھا مجھے۔''

''مگر میں پھر کہوں گا ماں جی کہ ان کے بیٹوں کی غیر ذمے داری میری کوتاہی کا جواز نہیں ہے۔ مجھے ان سے کیا۔ میں تو اپنی کوتاہی پر کڑھتا ہوں۔''

''اور میں تمھیں یہ سمجھا رہی ہوں کہ اپنے ضمیر پر بلاوجہ بوجھ لینا اچھا نہیں ہوتا۔ اس سے آدمی کمزور ہو جاتا ہے۔ اللہ کی مرضی کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔''

اوتار سنگھ کو مسلمانوں کی یہ بات بہت اچھی لگتی تھی۔ اسے مولوی صاحب کی موت پر ان کے بیٹے اور بیوی کا ردِعمل بھی یاد تھا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماں جی۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''زندگی اللہ کی امانت ہوتی ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے۔ اس میں شکایت کیسی۔'' سرفراز بیگم نے سرد آہ بھر کے کہا۔ ''حالانکہ کسی آدمی کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ کوئی آدمی سائبان کی طرح ہوتا ہے۔ چلا جائے تو غیر محفوظ ہو جانے کا احساس پیچھے رہنے والوں کو ہمیشہ ستاتا ہے۔''

ان کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔ اوتار سنگھ پچھلے کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ پریشان رہنے لگی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ وہ پریشانی ظاہر کرتی ہوں۔ بلکہ وہ آتیں تو ہمیشہ اس کی دل جوئی کرتیں، اس کی فکر کرتیں۔ لیکن اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر پریشان ہیں۔ کوئی فکر انھیں ستا رہی ہے۔

اس وقت اسے موقع مل گیا۔ ''ماں جی...... آپ پریشان کیوں رہتی ہیں آج کل؟'' اس نے پوچھا۔

''کون، میں؟ نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' سرفراز بیگم نے جلدی سے کہا۔

''میں تو کئی دن سے یہ بات محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کو خود ہی بتا دینا چاہیے تھا۔ لیکن

شاید آپ بس زبان سے مجھے بیٹا کہتی ہیں، سمجھتی نہیں۔''

''ایسی کوئی پریشانی تو نہیں۔''

''مطلب یہ کہ کچھ تو ہے۔ تو کیا چھوٹی پریشانی بیٹوں کو نہیں بتائی جاتی؟'' اوتار سنگھ کے لہجے میں شکایت تھی۔

''ایسا کچھ ہے ہی نہیں۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔ ''تم تو بات پکڑ رہے ہو۔''

''نہیں ماں جی۔ سچ یہ ہے کہ آپ مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔ ورنہ پریشان تو آپ ہیں۔ اس سے میں یہی سمجھوں گا کہ آپ مجھے بیٹا نہیں سمجھتیں۔''

سرفراز بیگم کے سینے میں کچھ پگھلنے لگا۔ ''پریشان تو میں ہوں۔ مگر تمھیں پریشان کرنے کا کیا فائدہ۔ جو مدد کرنے والا ہے، اس سے چپکے چپکے مدد مانگ لیتی ہوں۔''

اوتار سنگھ سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ اللہ کی طرف ہے۔ ''لیکن ماں جی، جوان بیٹے اس لیے تو ہوتے ہیں کہ اپنی پریشانی انھیں سونپ دی جائے اور وہ اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔ مسئلے کا کوئی حل نکالیں۔''

''اب اتنے بڑے بھی نہیں ہو تم۔'' سرفراز بیگم نے معاملے کی سنگینی کم کرنے کے لیے ذرا شگفتگی سے کہا۔

''عمر سے کچھ نہیں ہوتا ماں جی۔ میں تو ماں، باپ...... بہت کچھ کھو چکا ہوں۔ میں چھوٹا نہیں ہوں ماں جی۔ آپ بتائیں، کیا پریشانی ہے آپ کو؟''

''کیا کہوں بیٹا۔ بس یہ خیال آتا ہے کہ گلنار کے ابا ہوتے تو ڈھارس رہتی۔'' سرفراز بیگم کی آواز بھرا گئی۔

''آپ خود ہی کہتی ہیں کہ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے اور پھر جوان بیٹا تو ہے نا۔ آپ بات تو بتائیں۔''

''بس بیٹا، یہ ملکی حالات سے ڈر لگنے لگا ہے۔ شہر کے حالات بھی اچھے نہیں ہیں اور یہ موئی دلی تو ہر دور میں اجڑتی رہی ہے۔ اب دیکھ لو، ہر روز چار چھ مسلمانوں کے چھرا گھونپ دیا جاتا ہے۔ اب تو اخبار پڑھنا بھی چھوڑ دیا میں نے۔ بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔''

''آپ پریشان نہ ہوں ماں جی۔ آپ تو گھر میں محفوظ ہیں نا۔''

''نہیں بیٹے۔ میں جانتی ہوں۔ یہ آگ ابھی اور بھڑکے گی۔ اللہ محفوظ رکھے۔ نجانے کتنے گھر جلیں گے اس آگ میں۔ میں نے سنا ہے...... منظم حملوں کا ارادہ بھی ہے متعصب ہندوؤں کا۔ میرے ساتھ جوان بیٹیاں ہیں۔ ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں میں۔'' ان کی آنکھیں بھیگ آئیں اور آواز لرزنے لگی۔

اوتار سنگھ دہل کر رہ گیا۔ وہ تو باہر جاتا تھا۔ حالات سے بہت زیادہ واقف تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ ماں جی نجانے کب سے عدم تحفظ کے احساس میں، اس خوف میں گرفتار تھیں۔ اس نے کبھی ان کی ڈھارس نہیں بندھائی، ان کی دل جوئی نہیں کی۔ اس نے بیٹا ہونے کا حق بالکل ادا نہیں کیا۔ وہ کتنا غیر ذمے دار ہو گیا ہے۔ اپنے سوا کسی کا ہوش نہیں ہے اسے۔ کیا وہ خود غرض ہو گیا ہے۔ وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ جی چاہتا تھا، زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

وہ اٹھا اور سرفراز بیگم کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس نے ان کے دونوں ہاتھ محبت سے تھام لیے۔ ''میں بہت شرمندہ ہوں ماں جی۔ میں الٹا آپ سے شکایت کر رہا تھا کہ آپ مجھے بیٹا نہیں سمجھتیں۔ مجھے اپنی پریشانی نہیں بتاتیں۔ حالانکہ اس پر تو مجھے خود سوچنا چاہیے تھا۔ مجھے خود آپ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ میں بہت شرمندہ ہوں ماں جی۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔''

سرفراز بیگم تو ہکا بکا رہ گئیں۔ ''ارے نہیں بیٹے...... اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔'' وہ دل میں سوچ رہی تھیں کہ یہ کیسا لڑکا ہے۔ ہر بات کو اپنی ذمے داری سمجھتا ہے اور پھر خود کو غیر ذمے دار سمجھ کر خود ملامتی میں مبتلا ہوتا ہے۔ شرمندہ ہوتا ہے اور تلافی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

پھر اوتار سنگھ نے ایسی بات کہی کہ سرفراز بیگم ہل کر رہ گئیں۔ ''دیکھیں ماں جی، بظاہر تو میں ہندو ہوں اور آپ کا بیٹا بھی ہوں۔ اب یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں ہندو نہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو منزل کی تلاش میں بھٹکتا ہوا ایک راہی ہوں۔ مگر میرا بظاہر ہندو ہونا یہاں فائدہ مند ہے۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی آپ کے گھر کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ آپ آج کے بعد اس طرف سے بالکل پریشان نہ ہوں۔''

''مگر بیٹا، تم خود اکیلے......''

''آپ مجھے نہیں جانتیں ماں جی۔ چاچا جمال دین نے مجھے لٹھیا چلانا سکھایا تھا۔ بیس تیس کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا اور پھر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''اور ویسے بھی ہندو کسی ہندو پر تو ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔ تم واقعی سچے بیٹے ہو۔''

اوتار سنگھ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر اسے مکمل اطمینان نظر نہیں آیا۔ ''آپ مطمئن نہیں ہوئیں ماں جی۔ مگر یقین کریں، میرے جیتے جی کوئی آپ کی دہلیز نہیں پھلانگ سکتا۔ کوئی آپ کی عزت کو میلی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھ پر بھروسہ کریں ماں جی۔ میں ہوں نا۔''

سرفراز بیگم نے اس کے دونوں ہاتھ اٹھائے اور انہیں لبوں سے لگا لیا۔ ''میں مطمئن ہو گئی بیٹا۔ جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے ماں پریشان کیسے ہو سکتی ہے۔''

اوتار سنگھ مسکرایا۔ ''اور آپ نے مجھے معاف بھی کر دیا نا؟''

''کس بات پر؟''

''میری بے خبری پر...... میری غیر ذمے داری پر۔''

سرفراز بیگم ہنس دیں۔ ''اگر تم غیر ذمے دار ہو تو سب کو ایسا ہی غیر ذمے دار ہونا چاہیے۔''

''نہیں ماں جی۔ آپ معاف نہیں کریں گی تو میری تسلی نہیں ہو گی۔''

''اچھا بیٹے...... معاف کیا۔''

اوتار سنگھ کی کہی ہوئی وہ بات سرفراز بیگم کبھی نہیں بھولیں کہ وہ ہندو نہیں ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ منزل کی تلاش میں بھٹکتا ہوا راہی ہے۔ اس دن کے بعد مرتے دم تک وہ اس کے لیے ہر نماز میں دعا کرتی رہیں۔ اے اللہ، اپنے اس بندے کو صراطِ مستقیم پر لے جایئے۔ اے اللہ اسے اپنا راستہ دکھا دیجیے۔ اے اللہ، اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو اہلِ ایمان میں ہوتی ہیں۔ اسے ایمان سے نواز دیجیے اے اللہ......

❁......❁......❁

اس دن کے بعد اوتار سنگھ کو بے کلی لگ گئی۔ اس نے سرفراز بیگم سے جو کچھ کہا تھا، صرف زبانی نہیں تھا۔ وہ اس نے پوری سچائی سے کہا تھا اور اس پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس دن سے اس نے وہ ذمے داری قبول کر لی۔

اس کے نتیجے میں اس کے معمولات بدل گئے۔ وہ جلدی سونے کا عادی تھا لیکن پہلی ہی رات کھانا کھانے کے بعد وہ کوٹھے پر چلا گیا۔ کتاب لے جانے کا اس نے تکلف نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ پڑھ نہیں سکے گا۔

رات دس بجے کے بعد سناٹا ہو جاتا تھا۔ وہ دس بجے سو جاتا تھا۔ مگر اس رات وہ جاگ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھا وہ آسمان کو تکتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو ٹہلنے لگا۔ بار بار جا کر وہ گلی میں جھانکتا، مکان کے صدر دروازے کو دیکھتا۔ کوٹھے پر اس نے دانستہ روشنی کی تھی۔ تاکہ کوئی حملہ آور اس طرف آئے تو سمجھ لے کہ وہاں لوگ جاگ رہے ہیں۔

دو بجتے بجتے وہاں کافی سردی ہو گئی۔ وہ کوئی چادر یا شال بھی نہیں لایا تھا۔ سردی سے اس پر کپکپی چڑھنے لگی۔ ڈھائی بجے کے قریب وہ نیچے آ گیا۔ اس کے خیال میں اب خطرے کا وقت نہیں تھا۔

وہ بستر پر لیٹا اور رضائی اوڑھ لی۔ جسم کو گرمی ملی تو اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ اصولاً اسے گہری نیند سو جانا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ نیند کے عالم میں اسے خیال آیا کہ اگر اس وقت حملہ ہو جائے تو اسے تو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اس سے اٹھا بھی نہیں گیا اور

وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا۔ اس کے بعد تو یہ معمول ہو گیا۔ رنجنا پہلی رات تو بے خبر رہی۔ لیکن دوسری رات اسے پتا چل گیا۔ وہ اور رگھو اسے بلانے کے لیے اوپر آئے۔ لیکن اس نے سختی سے انھیں منع کر دیا۔ وہ دونوں اس کی بے چینی اور اضطراب دیکھتے رہے۔ رنجنا کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن رگھو سمجھ گیا تھا۔

''تم لوگ سو جاؤ جا کر۔'' اوتار سنگھ نے ان سے کہا۔

''لیکن مالک آپ......؟''

''مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''تو آپ نیچے چلیں۔ میں سر میں تیل لگا دوں گی۔ نیند آ جائے گی۔''

''مگر مجھے سونا نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ کتاب اوپر لانا ضروری ہے۔ ''مجھے پڑھائی کرنی ہے چلو...... کتابیں تو لے آؤں۔''

وہ نیچے آیا اور اپنی کتابیں اٹھائیں۔ پھر ان لوگوں کو سو جانے کی تاکید کر کے وہ اوپر چلا گیا۔

رنجنا نے رگھو کو مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''کیا ہو گیا ہے چھوٹے ٹھاکر کو؟''

''وہ پریشان ہیں۔'' رگھو نے کہا۔

''یہ کیسی پریشانی ہے کہ رات بھر چھت پر ٹہلتے رہیں۔''

''فسادات کا خطرہ ہے نا۔ وہ نیچے والوں کی حفاظت کے خیال سے جاگتے ہیں۔''

''ہائے رام۔'' رنجنا کا ہاتھ سینے پر پہنچ گیا۔ ''تو کیا گھر پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔''

''ہاں۔ ابھی تو منصوبے بن رہے ہیں۔ پرنتو یہ ہو کر رہے گا۔''

رنجنا پریشان ہو گئی۔ ''تو چھوٹے ٹھاکر کیا کر سکتے ہیں؟''

''جو کر سکتے ہیں، اوش کریں گے۔ راجپوت ہیں وہ۔ جان پر کھیل جائیں گے ان کی حفاظت کے لیے۔''

''تو چنتا نہ کر۔ جا کے سو جا۔''

''اور تم؟''

''میں تو جاگوں گا۔ مالک جاگے اور میں سوؤں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''تو میں بھی کیسے سو سکتی ہوں۔''

وہ دونوں بھی جاگتے رہے۔ اوتار سنگھ نیچے آ کر سونے کے لیے لیٹا تو وہ دونوں بھی سوئے۔

ایک ہفتہ گزرا تو وہ معمول اوتار سنگھ کی صحت پر اثر انداز ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں کے

نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے۔ آنکھیں ہر وقت متورم رہنے لگیں۔ رنگت بھی سنولانے لگی۔ اسے یہ احساس بھی ستا رہا تھا کہ اس کی ذہنی صلاحیتیں ماند پڑنے لگی ہیں۔

ایسے میں ایک دن سرفراز بیگم نے اسے دیکھا تو دھک سے رہ گئیں۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹے؟''

''جی ماں جی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''مگر تمہاری حالت تو کچھ اور بتا رہی ہے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے...... جھلسی ہوئی رنگت......''

''کچھ نہیں ماں جی۔ نیند پوری نہیں ہو رہی ہے نا۔ آج کل پڑھائی کا زور ہے۔''

''مگر اتنا نہ کرو کہ صحت متاثر ہونے لگے۔''

رنجنا پہلے سے اس کی یہ حالت دیکھ کر کڑھ رہی تھی۔ لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ سرفراز بیگم کی بات سننے کے بعد اس سے رہا نہیں گیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اوتار سنگھ سے کہا۔ ''ایک بنتی کروں مالک؟''

''ہاں رنجنا، کہو۔''

''جب تک پڑھائی کا زور ہے، آپ دن میں دو گھنٹے سو لیا کریں۔''

اوتار سنگھ کے دل کو یہ بات لگی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے دن میں نیند نہیں آتی تھی۔ مگر اس نے سوچا، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگلے دن کالج سے واپس آ کر اس نے کھانا کھایا۔ نیند پوری نہ ہونے کے نتیجے میں اس کی بھوک بھی کم ہو گئی تھی۔

کھانا کھا کر وہ لیٹا تو اسے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ اور وہ دو گھنٹے کا ارادہ کر کے لیٹا تھا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد آپ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

یوں یہ دوپہر کی نیند بھی اس کے معمولات میں شامل ہو گئی۔

ایک رات وہ کوٹھے پر ٹہلتے ٹہلتے تھک کر کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ نیچے سے دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ وہ لپک کر اٹھا، اپنی لاٹھی اٹھائی اور تیزی سے لپکا۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لیکن کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''کون ہے؟'' اس نے للکار کر کہا۔

جواب نہیں ملا تو وہ پھر چلایا۔ رات کے سناٹے میں اپنی آواز اسے بہت بلند آہنگ لگی۔ وہ نیچے اترنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ جواب مل گیا۔

''میں ہوں بہادر علی چھوٹے ٹھاکر۔'' اس کے ساتھ ہی بہادر علی کی صورت نظر آئی۔

''اتنی رات کو ایسے دروازہ نہ کھولا کریں آپ۔'' اوتار سنگھ نے سخت لہجے میں کہا۔

بہادر علی نے اس کے لہجے پر چونک کر اوپر دیکھا تو اس کے [illegible]

''اتفاق سے کھولنا پڑ گیا۔ ورنہ میں خود بڑی احتیاط کرتا ہوں۔'' انھوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم اوپر کیا کر رہے ہو چھوٹے ٹھاکر۔''

''میں پڑھ رہا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا اور پیچھے ہٹ آیا۔

نیچے بہادر علی نے دروازہ بند کیا۔ اسے بڑی آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اکیلا نہیں۔ ان کا ہندو کرائے دار بھی ان کے تحفظ کی فکر کرتا ہے...... راتوں کو جاگتا ہے۔ اس کا بوجھل پن کافی حد تک کم ہو گیا۔

دو بجے کے بعد اوتار سنگھ نیچے چلا آیا۔ صبح اسے ماسٹر جی سے ملنے کے لیے جانا تھا۔

یہ ماسٹر جی والا معمول اب اس کے لیے کشمکش کا باعث ہو گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ماسٹر جی بھی اس کی ذمے داری تھے اور دوسری طرف اس گھر کا تحفظ بھی اس کی ذمے داری تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ماسٹر جی کے پاس نہ جائے۔ اور وہ وہاں جانے کے لیے نکلتا تو اسے یہ فکر رہتی کہ گھر کو بے آسرا چھوڑ کر جا رہا ہے۔ وہاں وہ ایک رات ہوٹل میں گزارتا۔ مگر اس کا دل گھر میں اٹکا رہتا۔ اس سے سویا ہی نہ جاتا۔ ہر پل وہ وسوسوں میں گھرا رہتا۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔

ویسے اپنی وہاں کی ذمے داری وہ رگھو پر چھوڑ کر آتا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے بڑی رازداری سے رگھو کو سب کچھ سمجھا دیا تھا اور اسے کہہ دیا تھا کہ اس معاملے میں اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرنی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اس طرح مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔ لہٰذا ہفتے میں ایک بار یہ اذیت اس کے لیے لازمی ہو گئی تھی۔

اسکولوں کے امتحانات ہو چکے تھے۔ وہ ماسٹر جی کے گھر گیا تھا...... اس امید پر کہ شاید اس بار ان کا کوئی بیٹا اس کے ساتھ چلا جائے۔ لیکن ہری پرشاد نے اس بار بھی مصروفیت کا عذر پیش کر دیا۔ دوسرے دونوں تو پہلے ہی اس عذر کے تحت انکار کر چکے تھے۔

اس بار اوتار سنگھ ان کی بے حسی پر بہت جھنجلایا تھا۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب ان لوگوں سے کبھی نہ امید رکھے گا، نہ چلنے کو کہے گا۔

❁......❁......❁

سرفراز بیگم چھوٹے ٹھاکر کی طرف سے فکر مند تھیں۔ اس کی صحت میں انھیں بہت بڑا فرق نظر آیا تھا۔ انھوں نے اسے ٹوکا بھی تھا اور اس نے وجہ بھی بتائی تھی کہ وہ رات کو بہت دیر تک جاگ کر پڑھائی کر رہا ہے۔ لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے خیال میں یہ امتحانوں کا عرصہ تو تھا نہیں کہ وہ پڑھائی میں اتنی محنت کرتا۔ بہرحال اس معاملے میں وہ مزید جرح تو نہیں کر سکتی تھیں۔

اگلی بار وہ گئیں تو وہ سو رہا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ دن میں انھوں نے اسے

کبھی سوتے نہیں دیکھا تھا۔ انھیں ڈر لگا کہ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔ ''کیا ہوا رنجنا۔ خیریت تو ہے؟'' انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔

''جی بڑی بیگم۔'' رنجنا ان کا مطلب نہیں سمجھی۔ ''خیریت ہے۔''

''یہ چھوٹا ٹھاکر کیوں سو رہا ہے اس وقت۔ پہلے تو کبھی دن میں سوتے نہیں دیکھا۔''

''وہ...... رات کو بہت دیر تک جاگتے ہیں نا بڑی بیگم۔ میں نے کہا، دن میں گھنٹے دو گھنٹے سو لیا کریں۔''

''اتنی رات تک کیوں جاگنے لگا ہے یہ؟''

رنجنا ایک لمحے کو ہچکچائی۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔ ''پڑھائی کرتے ہیں نا بڑی بیگم۔''

سرفراز بیگم نے اس کی وہ ہچکچاہٹ دیکھ لی تھی۔ معاملہ ان کے نزدیک اور پُراسرار ہو گیا تھا۔ عجیب معما تھا۔ بہرحال انھوں نے اس خلش کو ذہن سے جھٹکا اور غور سے سوتے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے جو حلقے تھے، وہ اس وقت اتنے گہرے نہیں لگ رہے تھے۔ انھیں اطمینان ہوا کہ نیند سے بہرحال فرق پڑا ہے۔ یعنی صحت میں کوئی بڑی خرابی نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا تو اسے دیکھ کر وہ اس کی صحت کی طرف سے اور مطمئن ہو گئیں۔ اس کی رنگت بھی بحال ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ نیچے چلی آئیں۔

جو معما ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ گزشتہ رات خود بہ خود حل ہو گیا۔ عشاء کے آدھے پونے گھنٹے بعد سو جانا ان کا معمول تھا۔ مگر رات اچانک گلا خشک ہونے کے احساس کے ساتھ ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھیں تو گھبرائی ہوئی تھیں۔ جاگنے کے ذرا دیر بعد انھیں احساس ہوا کہ وہ گھبراہٹ پیاس کی تھی۔

وہ اٹھیں اور انھوں نے پانی پیا۔ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ انھیں خیال آیا کہ اب جاگ گئی ہیں تو وضو ہی تازہ کر لیں۔ اس ارادے سے وہ غسل خانے جانے کے لیے دالان میں نکلیں۔ اوپر کوٹھے پر روشنی دیکھ کر وہ چونکیں۔ مگر وہ چونکنا بس ایک لمحے کا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے انھیں خیال آ گیا کہ آج کل او[illegible]ت کو دیر تک پڑھائی کر رہا ہے۔

انھوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ جالیوں کی درزوں سے اوپر کا منظر بالکل صاف تو نہیں، البتہ ٹکڑے ٹکڑے نظر آ رہا تھا۔ چھوٹا ٹھاکر کرسی پر بیٹھا تھا۔ انھوں نے بہت غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن انھیں اس کے ہاتھ میں کتاب نظر نہیں آئی۔

وہ وضو کرنے کے لیے غسل خانے میں گئیں۔ واپس آئیں تو ان کی نیند اچٹ گئی تھی۔ وہ دالان میں بچھے تخت پر دراز ہو گئیں۔ اوپر چھوٹا ٹھاکر بدستور کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کتاب اب بھی نہیں تھی۔

ذرا دیر بعد چھوٹا ٹھاکر اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں کتاب اب بھی نہیں تھی۔ وہ کوٹھے پر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلنے لگا۔ ہر چند منٹ بعد وہ ٹہلتے ٹہلتے بیرونی دیوار کے پاس رکتا اور باہر گلی میں جھانکنے لگتا۔ چند لمحے وہاں رکنے کے بعد وہ پھر چہل قدمی شروع کر دیتا۔

ایک گھنٹا ہو گیا اور وہ ٹہلتا رہا۔ سرفراز بیگم کو ایسا لگا کہ وہ خود ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی ہیں۔ ان کی ٹانگیں دُکھنے لگی ہیں۔ یا اللہ، یہ لڑکا پڑھتا ہے یا رات بھر ٹہلتا رہتا ہے۔ ابھی تک تو اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھی نہیں۔ وہ بڑبڑائیں۔ اور کتنا ٹہلتا ہے یہ۔ ٹانگیں نہیں دکھ جاتی ہوں گی۔ صحت تو خراب ہونی ہی ہے۔ اوپر کوٹھے پر چھوٹا ٹھاکر ان کی موجودگی سے بے خبر ٹہلے جا رہا تھا۔ اب اس کی رفتار کچھ کم ہو گئی تھی۔ شاید تھکن کی وجہ سے!

یا اللہ...... یہ لڑکا کس لیے جاگے جا رہا ہے؟ کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟ وہ پھر بڑبڑائیں۔ اس بار ان کے لہجے میں بے زاری تھی۔ وہ جو بیرونی دیوار کے پاس کچھ دیر رکتا تھا اور پھر باہر گلی میں جھانکنے لگتا تھا، اس کا یہ انداز انھیں کچھ مشتبہ سا لگنے لگا۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔ انھوں نے سوچا۔ لیکن اگلے ہی لمحے انھیں اپنی سوچ پر افسوس ہونے لگا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کو بہت مضبوط کردار کا لڑکا سمجھتی تھیں۔ انھوں نے اس کے بارے میں ایسی بات سوچی ہی کیوں۔ وہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتی رہیں۔

کچھ دیر بعد چھوٹا ٹھاکر دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا۔ شاید ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تھا۔

لیکن اگلے ہی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ چھوٹا ٹھاکر کرسی سے یوں جھٹکے سے اٹھا، جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اور وہ اٹھا تو سرفراز بیگم کو اس کے ہاتھ میں لاٹھی نظر آئی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے بیرونی دیوار کی طرف لپکا۔ اس نے گلی میں جھانکا اور للکار کے کہا۔ ''کون ہے؟''

سرفراز بیگم اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ چھوٹے ٹھاکر کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ کوئی خطرہ محسوس کر رہا ہو۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کو صاف دیکھ رہی تھیں۔ ایک لحہ گلی میں جھانکنے کے بعد چھوٹا ٹھاکر پلٹ ہی رہا تھا کہ دوبارہ گلی کی طرف مڑا اور جھانکنے لگا۔ سرفراز بیگم کو کوئی آواز تو سنائی نہیں دی تھی۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کا ردِعمل بتاتا تھا کہ اسے نیچے سے جواب ملا ہے۔

ایک لمحے بعد اوتار سنگھ نے سخت لہجے میں کہا۔ اتنی رات کو ایسے دروازہ نہ کھولا کریں آپ۔''

سرفراز بیگم کو لگا کہ وہ ان کے دروازے کی بات کر رہا ہے۔ اور اس کے لہجے میں سختی کے ساتھ احترام بھی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی اجنبی سے نہیں، بلکہ کسی شناسا سے بات کر رہا ہے۔

ایک لمحے کو خاموشی رہی۔ سرفراز بیگم کو اب بھی دوسری کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

لیکن چھوٹے ٹھاکر کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ کسی کی بات سن رہا ہو۔

پھر چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ ''میں پڑھ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ آیا۔ اس نے لاٹھی دیوار سے ٹکا کر کھڑی کی اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

سرفراز بیگم کو یقین ہو گیا کہ چھوٹے ٹھاکر کی بہادر علی سے بات ہوئی ہے۔ اب انھیں اس کی تصدیق کرنی تھی۔ عام حالات میں وہ اتنی رات کو کبھی ڈیوڑھی کی طرف نہ جاتیں۔ مگر یہ ان کے گھر اور بچیوں کے تحفظ کا معاملہ تھا۔

بہادر علی ڈیوڑھی میں سوتا تھا۔ دروازہ وہ بند رکھتا تھا۔ سرفراز بیگم نے دروازے پر رک کر اسے پکارا۔ ''بہادر علی...... تم جاگ رہے ہو؟''

بہادر علی کے لیے وہ غیر معمولی بات تھی۔ اتنی رات کو بڑی بیگم پکار رہی تھیں۔ ''جی بڑی بیگم، میں جاگ رہا ہوں۔ خیریت تو ہے نا۔'' اس نے دروازہ کھولے بغیر دروازے کے قریب آ کر کہا۔

''چھوٹا ٹھاکر تم سے بات کر رہا تھا؟'' سرفراز بیگم نے پوچھا۔

''جی بڑی بیگم۔'' بہادر علی کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ ''میں نے مجبوری میں بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا تھا۔ پھر بھی اسے پتا چل گیا۔''

''تم حالات سے بے خبر تو نہیں ہو بہادر علی۔'' سرفراز بیگم کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

''ساری زندگی اس گھر کا نمک کھایا ہے بڑی بیگم۔ آپ جانتی ہیں کہ غیر ذمے دار نہیں ہوں۔ میرے جیتے جی اس گھر کی دہلیز کوئی نہیں پھلانگ سکے گا۔ ہر صورتِ حال کے لیے تیار رہتا ہوں۔ لیکن بڑی بیگم، آج مجھے طاقت کا احساس ہو رہا ہے۔ میں اکیلا نہیں۔ اس گھر کی حفاظت کی فکر کرنے والے اور لوگ بھی ہیں اور وہ چوکنا بھی رہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بہادر علی۔ تم آرام کرو۔''

سرفراز بیگم دوبارہ تخت پر آ بیٹھیں۔ چھوٹا ٹھاکر اب بھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور اب بھی اس کے ہاتھ میں کتاب نہیں تھی۔

اس وقت ان کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ دل کو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ لیکن ہر بار، ہر نئے موڑ پر انھیں پتا چلتا تھا کہ وہ ان کے تصور سے بڑھ کر اچھا ہے۔ وہ کتنا سچا ہے۔ جو کہتا ہے، دل سے کہتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ اس کا ثبوت اس وقت ان کے سامنے تھا۔ انھیں یاد آیا، ابھی کچھ دن پہلے ہی تو اس نے ان کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے، ان کے دونوں ہاتھ بڑی محبت سے تھام کر اپنی شرمندگی کا اظہار کیا تھا، ان سے معافی مانگی تھی...... اپنی بے خبری اور غیر ذمے داری پر! اور اس نے ان سے کہا تھا کہ اب وہ پریشان نہ ہوں۔ اس کے ہوتے

ہوئے کوئی ان کے گھر کی دہلیز نہیں پھلانگ سکتا۔ انھوں نے اس کی بات سنی تھی اور مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کسی پختہ ارادے کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہے۔ یہ تو انھیں گمان بھی نہیں تھا کہ اس بات کے بعد وہ ہر رات پہرہ دے کر وہ ذمے داری نبھائے گا۔ اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑ جائیں گے۔ اس کی رنگت پھیکی پڑ جائے گی۔ اس کی صحت خراب ہو جائے گی۔ اس کی یہ حالت تو انھوں نے خود دیکھی تھی۔ اور پھر جب وہ رات میں تھوڑی دیر پہلے، جب وہ بار بار دیوار کے پاس رک کر گلی میں جھانک رہا تھا تو انھیں مشتبہ لگا تھا۔ انھوں نے سوچا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔ یہ خیال آیا تو وہ شرمندگی سے نڈھال ہو گئیں۔ ارے...... انھوں نے ایسے بے غرض اور جاں نثار لڑکے پر اس طرح کا شک کیا، جو اپنی نیند صرف اس لیے قربان کر رہا ہے کہ وہ سکون سے سو سکیں۔

اس لمحے ان کے دل سے ہر خوف، ہر پریشانی مٹ گئی۔ موت جس وقت آنی ہے سو آئے گی۔ جو کچھ ہونا ہے، وہ ہوگا۔ مشیت کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اللہ کو جو منظور ہو، وہ ہو کر رہتا ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ کی مہربانی سے کوئی ہے، جو ان کے، ان کے گھر کے اور ان کی بچیوں کے تحفظ کے لیے جاگتا ہے۔ تو وہ ڈر کس بات سے رہی ہیں...... اور کیوں ڈر رہی ہیں۔

انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ چھوٹا ٹھاکر اب بھی وہیں بیٹھا تھا۔ وہ اٹھیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اب وہ پوری طرح بے فکر تھیں۔

❀......❀......❀

کالج کی فضا بے حد خراب ہو گئی تھی!

جس روز محمود کی موت کی خبر آئی، پورا کالج جیسے سہم گیا۔ محمود بہت زندہ دل اور خوش مزاج لڑکا تھا۔ اس کے مزاج میں دردمندی بھی بہت تھی۔ وہ اپنے نظریات میں بے حد اٹل اور ان کے اظہار میں بے حد پُرجوش بھی تھا لیکن اس کے باوجود وہ کالج کے ہر دل عزیز طلبا میں سے تھا۔ جن لوگوں کو اس سے نظریاتی اختلاف تھا، وہ بھی اس کی عزت کرتے تھے۔ اس لیے کہ نظریاتی اختلاف کو وہ ذاتی نہیں بننے دیتا تھا۔ جن سے اختلافات تھے، وہ ان کے بھی کھلے دل سے کام آتا تھا۔

محمود کی موت کا علم انھیں اخبار سے ہوا تھا۔ رات کو دس بجے کے قریب وہ چاندنی چوک کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس کے ساتھ مسلم لیگ کے تین کارکن بھی تھے۔ ایک سنسان سڑک پر متعصب ہندوؤں کا ایک گروہ ان پر حملہ آور ہوا۔ حملہ آور چاقوؤں، برچھیوں اور بلموں سے مسلح تھے۔ چاروں افراد کو ختم کرنے کے بعد وہ فرار ہو گئے۔

یہ تمام خبریں مصدقہ نہیں تھیں۔ یہ محض اندازے اور قیاس آرائیاں تھیں کیونکہ اس واقعے کا کوئی عینی گواہ نہیں تھا اور اگر تھا تو سامنے بہرحال نہیں آیا تھا۔ تمام اخبارات نے ظاہری

شواہد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنی اپنی پالیسی کے مطابق خبر بتائی تھی۔

بہرحال اس روز کالج میں پڑھائی بالکل نہیں ہوئی۔ پورا کالج تو محمود کے گھر پہنچا ہوا تھا۔ جنازے میں اتنے افراد تھے کہ شاید ہی کسی کو دوسری بار کندھا دینے کا موقع ملا ہوگا۔ محمود کے والد کے حوصلے اور استقامت نے سب کو متاثر کیا۔ غم اور صدمے کے باوجود انھوں نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ بار بار یہی کہتے کہ یہ تو ایک بیٹا تھا۔ پاکستان پر تو وہ ایسے سو بیٹے بھی قربان کر سکتے ہیں۔ کالج کی لڑکیوں نے بتایا کہ گھر میں محمود کی ماں اور بہنوں کا بھی یہی رویہ تھا۔ ان لوگوں کو پہلی بار پتا چلا کہ محمود اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔

اگلے روز کالج کے آڈیٹوریم میں تعزیتی جلسہ ہوا۔ اس جلسے نے کالج کی فضا کو نہایت مکدر اور کشیدہ کر دیا۔ وہ تعزیتی جلسہ کالج کے ایک ہونہار اور ہر دل عزیز طالب علم کی یاد میں ہوا تھا۔ مسلمانوں کی تو بات ہی اور تھی۔ محمود کے قتل کی مذمت تو کالج کے طلبا کی بھاری اکثریت نے کی تھی۔ ان میں ہندو بھی تھے، سکھ بھی اور انگریز بھی۔ اس قتل کی مذمت میں طلبہ یونین بھی پیش پیش تھی۔

یونین کے صدر نے اپنی تقریر میں کہا کہ محمود سیاست کے تشدد بھرے ماحول میں شائستگی، نرمی اور رواداری کا علم بردار تھا۔ اس کی زندگی بھی اس بات کا ثبوت تھی اور موت نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے۔

یہ وہ موقع تھا کہ رام گوپال اور اس کے چند ساتھیوں نے ماحول خراب کر دیا۔ حالانکہ تقریر کے دوران مداخلت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ مگر ایک ایک متعصب ہندو لڑکے نے نہایت بدتمیزی کے ساتھ یونین کے صدر کو چیلنج کیا۔ ''یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اگر محمود اور اس کے ساتھی بھی مسلح ہوتے تو دو ایک لاشیں حملہ آوروں کی بھی ملتیں۔'' یونین کے صدر نے کہا۔

''میرے خیال میں تو یہ حملہ آوروں کی جاں بازی کا ثبوت ہے۔''

''جاں بازی! چار نہتے افراد پر دس بارہ مسلح افراد کے حملہ کرنے کو جاں بازی کیسے کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو بہادری کے اصولوں کے خلاف ہے۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ حملہ کرنے والے دس بارہ تھے؟'' معترض نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ عین ممکن ہے کہ ان کی تعداد پچاس ہو یا اس سے بھی زیادہ۔'' یونین کے صدر نے بھی تمسخرانہ انداز اختیار کر لیا۔

''یہ سب اخبار والوں کے بنائے ہوئے افسانے ہیں۔ محمود اور اس کے ساتھی ان

حالات میں اتنی رات کو نکلے تھے تو وہ مسلح بھی رہے ہوں گے......''

''اور ان کی آتمائیں پرلوک سدھارتے وقت ان کے ہتھیار بھی ساتھ لے گئی ہوں گی۔'' یونین کے صدر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور اب تم یہ بھی کہو گے کہ اصل میں حملہ آور محمود اور اس کے ساتھی تھے۔ اور دوسرے فریق کی لاشیں اخبار والوں نے غائب کر دی ہوں گی......''

''پولیس بھی مُسلوں سے ملی ہوئی ہے۔'' کسی نے پکار کر کہا۔ ''اور گورے بھی اس میں شامل ہیں۔''

اس کے بعد وہ ہلڑ بازی ہوئی کہ تعزیتی جلسہ ختم ہو گیا۔

ایک گھنٹے بعد اوتار سنگھ رچرڈ پارسن کے ساتھ کینٹین میں بیٹھا تھا کہ رام گوپال بھی آ گیا۔ وہ بے تکلفی سے ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''اور سناؤ دوستو، کیا حال ہے؟''

''یہ ہنگامہ آرائی غیر ضروری تھی۔'' اوتار سنگھ نے اس سے کہا۔

''میں تم سے متفق ہوں۔ یہ جذباتی لوگ گڑ بڑ کر دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے میرا منصوبہ دھرا رہ گیا۔''

''اور تمہارا منصوبہ کیا تھا؟'' رچرڈ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے تقریر کرنی تھی اور میں اس میں لوگوں کو بتاتا کہ بھارت ایک ہے اور ایک رہے گا۔ ہم بٹوارا نہیں ہونے دیں گے۔''

''حالانکہ ہندوؤں کی اس پالیسی کی وجہ سے بٹوارا لازمی ہو گیا ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''مسلمانوں کو محبت سے سمجھایا...... قائل کیا جاتا۔ انھیں اچھے مستقبل اور تحفظ کا یقین دلایا جاتا تو شاید بٹوارا رک جاتا۔''

''نہیں رکتا رچرڈ۔ تم ہماری قوم کے مزاج سے ناواقف ہو۔ مسلمان جذباتی طور پر فیصلہ کر چکے ہیں۔ وہ پاکستان بنا کر رہیں گے۔''

''تو پھر اتنے خون خرابے کی کیا ضرورت ہے۔ جب یہ ہونا ہے تو اسے تسلیم کر لو۔'' اوتار سنگھ بولا۔

''پاکستان بنے گا۔ لیکن زیادہ دن نہیں چلے گا اور پاکستان بننے تک ہم مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہیں گے۔ اس سے ان کی طاقت بھی کم ہو گی اور حوصلہ بھی پست ہو گا۔ اب تمام مسلمان تو یہاں سے نہیں جا سکتے نا۔ ہم یہاں سے بھاگنے والے مسلمانوں کو بھی کاٹتے رہیں گے اور یہاں رہ جانے والوں کو بھی مارتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ بچے کھچے مُسلوں کی سمجھ میں آ جائے گا کہ ان کی بقا صرف بھارت میں ہے۔ ہمارا خواب اکھنڈ بھارت ہے۔ میں آج یہی بتانا چاہتا تھا کہ مُسلے پاکستان کا خیال دل سے نکال دیں۔ ورنہ انھیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ میں انھیں

بتانا چاہتا تھا کہ اصل پاکستان وہ ہے، جہاں محمود اور اس کے ساتھی گئے ہیں...... پرلوک میں! وہ نہیں مانیں گے تو جیسے ہم نے محمود اور ان کے ساتھیوں کو پاکستان بھیجا ہے، ویسے ہی دو دو چار چار کر کے ہم ان سب کو پاکستان بھیجتے رہیں گے......''

اوتار سنگھ بہت متحمل مزاج تھا۔ لیکن اس کا تحمل جواب دینے لگا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''رچرڈ، تم اگر بیٹھنا چاہو تو بیٹھو۔ لیکن میں یہ بدبودار گفتگو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔''

جواب میں رچرڈ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں بھی چل رہا ہوں۔''

وہ دونوں جا رہے تھے کہ عقب سے رام گوپال چلایا۔ ''تم کالی بھیڑ ہو اوتار سنگھ اور میں جانتا ہوں کہ ہمارے درمیان کالی بھیڑیں موجود ہیں۔''

اوتار سنگھ پلٹا اور اس کی طرف واپس آیا۔ اس کے بہت قریب آ کر وہ رکا۔ ''کالی بھیڑ میں نہیں ہوں، تم ہو رام گوپال۔ کیونکہ کالی بھیڑیں اکثریت میں کبھی نہیں ہوتیں۔ تم جیسے لوگ اپنے عمل سے امن پسند اکثریت کو رسوا کر رہے ہیں۔ ملک کا ماحول خراب کر رہے ہیں۔''

''امن پسندی...... ہنہہ!'' رام گوپال نے حقارت سے کہا۔ ''یہ بزدلی کو چھپانے والا لفظ ہے۔''

''بزدلی اور بہادری تم کیا جانو۔'' اوتار سنگھ نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ رام گوپال کے گلے کی طرف لپکا۔

رام گوپال کو شاید پہلے سے اندازہ تھا۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ''یہ کیا طریقہ ہے اوتار سنگھ......؟''

''تمھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں رام گوپال۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم نہیں سمجھو گے۔ یہ امن پسندی ہے۔ میں یہیں، اسی وقت صرف اپنے ہاتھوں سے تمھیں ختم کر سکتا ہوں۔ یہ بہادری بھی ہے اور امن پسندی بھی۔ بہادری ایسے کہ میں یہ کر سکتا ہوں اور امن پسندی ایسے کہ میں یہ نہیں کروں گا اور تم جس طرح گھبرا کر پیچھے ہٹے ہو، یہ بزدلی ہے۔ اس وقت تمھارے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ لیکن ابھی تمھارے ساتھ چند کالی بھیڑیں اور ہوتیں اور تمھارے پاس ہتھیار بھی ہوتے تو تم مجھے کاٹ کر پھینک دیتے۔ یہ بزدلی ہے رام گوپال۔ اور مجھے فخر ہے کہ محمود جیسا بہادر آدمی میرا دوست تھا۔ آئندہ میرے سامنے اس انداز میں کبھی نہ بولنا رام گوپال۔ میں تم جیسے تیس چالیس مسلح افراد سے اکیلا ہی نمٹ سکتا ہوں۔ یاد رکھنا رام گوپال، میں راجپوت ہوں اور بزدلوں سے دوستی نہیں رکھتا۔'' یہ کہہ کر اوتار سنگھ پلٹا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا کینٹین سے نکل گیا۔ رچرڈ پارسن اس کے پیچھے تھا۔

رام گوپال بت بنا کھڑا تھا۔ وہ شاک میں تھا۔ نرم خو، نرم گفتار اوتار سنگھ کا یہ روپ اسی

نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اوتار سنگھ کا لہجہ تو اب بھی سخت نہیں تھا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ نرم تھا۔ لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا، اس نے رام گوپال کو دہلا دیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ رام گوپال کو اس کے کہے ہوئے ہر لفظ پر یقین تھا۔ اس نے جو کہا تھا، وہ کر کے بھی دکھا سکتا تھا۔

رام گوپال صرف متعصب ہی نہیں، بے حد کینہ پرور بھی تھا۔ ٹھیک ہے اوتار سنگھ... میں تمہاری ہر بات یاد رکھوں گا۔ میں وہ موقع نہیں دوں گا تمہیں کہ تم اپنی بات سچ ثابت کر سکو۔ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تم تڑپتے رہو گے اور کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔

❀……❀……❀

تین دن بعد کالج میں امتحان کی تیاری کے سلسلے میں دی جانے والی چھٹیوں کا اعلان ہو گیا۔ نام تو امتحان کی تیاری کا تھا۔ لیکن درحقیقت کالج کے سخت کشیدہ ماحول کی وجہ سے چھٹیاں ایک ہفتہ پہلے ہی شروع کر دی گئی تھیں۔

اوتار سنگھ کے لیے وہ اچھی خبر تھی۔ کالج میں ویسے بھی پڑھائی بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں وقت ہی ضائع ہوتا تھا۔ رات کو کوٹھے پر پہرہ دینے کے دوران وہ بالکل نہیں پڑھتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ کتاب میں ایسا محو ہو جائے گا کہ اسے گرد و پیش کی خبر نہیں رہے گی۔ دن میں دو گھنٹے سونے کے معمول کی وجہ سے پڑھائی کا وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

اب کالج کی چھٹیاں ہوئیں تو اسے پڑھائی کا موقع مل گیا۔ اس نے اپنے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہ کالج جانے کے حساب سے ہی اٹھتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ کالج جانے کے بجائے وہ گھر پر ہی پڑھائی کر رہا تھا۔ جو وقت اس کا کالج سے واپسی کا تھا، اس وقت تک وہ پڑھائی کرتا تھا۔ پھر وہ کھانا کھاتا اور دو گھنٹے کے لیے سو جاتا۔ اٹھنے کے بعد پھر پڑھائی شروع۔ یہاں تک کہ رات کے پہرے کا وقت آ جاتا۔

شہر کی فضا میں کشیدگی اور بڑھ گئی تھی۔ مسلمانوں کے چھرا گھونپنے کے واقعات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ گلی سے گزرنے والے جلوسوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان میں پاکستان مخالف ہندوؤں کے جلوس بھی ہوتے تھے، جن میں سکھ بھی خاصی تعداد میں شامل ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے جلوس البتہ ان کے مقابلے میں زیادہ ہوتے تھے۔ لیکن ان جلوسوں میں بڑی تعداد بچوں کی ہوتی تھی۔

تین چار مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک ہی وقت میں دونوں متحارب جلوس گلی میں داخل ہوئے۔ ایک ایک طرف سے اور دوسرا دوسری طرف سے۔ اس کے نتیجے میں تصادم ہوا۔ ڈنڈے چلے۔ کچھ افراد زخمی ہوئے۔ مگر ہلاکت کی نوبت نہیں آئی۔ اوتار سنگھ اور رگھو ہر بار بیچ میں گئے اور بیچ بچاؤ کرایا۔ ورنہ بات بہت آگے بڑھ جاتی۔

ایسے موقعوں پر اوتار سنگھ کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی لٹھیا اٹھائے اور زیادتی کرنے والے ہندوؤں پر پل پڑے۔ لیکن مصلحت اور حکمت نے اسے روک دیا۔ اگر وہ کھلے عام مسلمانوں کی حمایت کرتا تو وہ اس کی ماں جی کے گھرانے کے لیے نقصان دہ ہوتا۔ ان کے تحفظ کے لیے اس کا خود کو غیر جانب دار ظاہر کرنا ضروری تھا۔

امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ اوتار سنگھ کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا۔ نجانے کیا بات تھی کہ اس بار امتحان اسے بہت بے معنی اور بوجھ لگ رہے تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ان امتحانوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ دے یا نہ دے، کامیاب ہو یا ناکام، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ امتحان کے بعد جو آزادی کا احساس ہوتا تھا، وہ پہلے سے بھی بڑھ کر تھا۔

امتحانوں کے دوران بھی اس کا معمول نہیں بدلا تھا۔ ہفتے میں ایک بار وہ ماسٹر جی کے پاس جاتا اور ان کے ساتھ دن گزارتا۔ ان کی ظاہری حالت تو اب بھی پہلے جیسی ہی تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ اب ماسٹر جی پر کثرت سے کھانسی کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ان کا دورانیہ بھی زیادہ ہو گیا ہے اور شدت بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ منہ سے خون آنا بھی بڑھ گیا ہے۔ مجموعی طور پر صورتِ حال اچھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر عام طور پر مکمل طور پر مایوس تو نہیں ہوئے۔ لیکن ڈاکٹر نے کھل کر کہا کہ صورتِ حال امید افزا ہرگز نہیں ہے۔ علاج کے باوجود مرض بہت بڑھ گیا ہے۔

ایک بار تو اوتار سنگھ کی موجودگی میں ماسٹر جی پر دورہ پڑا۔ اوتار سنگھ سے ان کی تکلیف، ان کی وہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس دوران ماسٹر جی کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ سانس ٹوٹ ہی جائے گی۔ وہ دُہرے ہو ہو جاتے تھے۔ جسمانی طور پر وہ اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ وہ تکلیف ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ ان کا پورا جسم تشنجی کیفیت میں تھا۔ آخر میں ان کے منہ سے جیتا جاگتا خون باہر آیا تھا۔

دورہ تقریباً 25 منٹ جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں ماسٹر جی بے جان ہو کر رہ گئے۔ جس وقت انھیں اس سے نجات ملی تو ان میں آنکھیں کھلی رکھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد تین گھنٹے تو ان پر غشی طاری رہی۔ پھر جب وہ اس غشی سے نکلے تو انھیں تھوڑا سا دلیہ دیا گیا۔ تب کہیں وہ بات کرنے کے قابل ہوئے مگر ان کی آواز تک سے کمزوری عیاں تھی۔

"تم نے دیکھا بیٹے۔" انھوں نے اوتار سنگھ سے کہا۔ "یہ حال ہوتا ہے میرا۔ جب بھی دورہ پڑتا ہے تو میں بھگوان سے موت کی پرارتھنا کرنے لگتا ہوں۔"

"آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ حوصلہ رکھیں ماسٹر جی۔"

"صرف تمہاری خاطر میں لڑ رہا ہوں۔ ورنہ تکلیف سے جی چاہتا ہے کہ حوصلہ چھوڑ دوں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ موت میں بڑی راحت ہے۔"

ماسٹر جی کی اذیت اور بے بسی نے اوتار سنگھ کو دہلا دیا تھا۔ وہ بھی یہی بات سوچ رہا تھا کہ جب زندگی پوری ہو جائے تو موت راحت ہے۔ موت نجات ہے۔ لیکن وہ یہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ بے بسی یہ تھی کہ وہ سوچ خود کار تھی۔ اس پر اس کا اختیار نہیں تھا۔

ماسٹر جی نے اسے چونکا دیا۔ ''اوتار سنگھ، تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟'' انھوں نے نحیف آواز میں پوچھا۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کا ذہن ویسے ہی الجھا ہوا تھا۔ ''کون سا وعدہ ماسٹر جی؟''

''میں نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ میری چتا کو آگ تم ہی دو گے۔''

اس یاد دہانی کے جواب میں کچھ کہنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ماسٹر جی کی حالت نے اسے دکھی کر دیا۔ وہ کچھ عرصہ اس نے بڑی ذہنی اذیت میں گزارا۔ وہ دہلی میں ہوتا تو اس کا دل ماسٹر جی میں اٹکا رہتا۔ اور وہ ماسٹر جی کے پاس ہوتا تو گھر کی فکر لگی رہتی۔ یہی نہیں، اس کے ضمیر پر ایک اور بوجھ آ گیا تھا۔ اب جبکہ وہ کالج نہیں جا رہا تھا تو اسے ماسٹر جی کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہیے تھا۔ بلکہ اصولاً تو اسے کچھ دن ماسٹر جی کے ساتھ گزارنے چاہیے تھے۔ لیکن یہاں تو ایک دن بھی اس کے لیے بھاری ہو جاتا تھا۔ ایسے میں وہ اپنی بے بسی اور تقسیم پر کڑھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کا پہرہ دینے کا معمول اب بھی جاری تھا۔ بلکہ اب تو وہ رات بھر کوٹھے پر رہتا تھا۔ صبح ہوتی تو نیچے آتا۔ اب صبح ناشتے کے بعد وہ دوپہر تک سو لیتا تھا۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

چھمن بوا کو اچانک چھوٹا ٹھاکر بہت برا لگنے لگا تھا!

بہادر علی سے اس رات کی گفتگو کے بعد وہ مسلسل تشویش زدہ اور پریشان رہنے لگی تھیں۔ گلی میں پتنگ لوٹنے والے بچوں کا شور بھی ہوتا تو وہ دہل جاتیں اور دروازے پر جا کر باہر کی سن گن لیتیں کہ کہیں حملہ تو نہیں ہو گیا ہے۔ پاکستان کے حق میں نعرے لگاتا کوئی جلوس گلی میں داخل ہوتا تو بھی ان کی حالت غیر ہو جاتی اور اکھنڈ بھارت والوں کا جلوس آتا تو وہ گویا سولی پر ہی لٹک جاتیں۔

ایک دن تو ان کا بہت برا حال ہوا۔ دروازے سے لگے لگے انھیں یوں لگا کہ وہ اب گریں اور جب گریں۔ ہوا یہ کہ ایک طرف سے مسلمانوں کا جلوس گلی میں داخل ہوا اور دوسری طرف سے ہندوؤں کا جلوس آ گیا۔ دونوں طرف کے نعرے گھل مل گئے۔ آوازوں کا حجم اور لہجوں کی تندی بڑھتی گئی۔ اس سے چیخ پکار اور آہ و زاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ

دونوں جلوسوں میں ٹکراؤ ہو گیا ہے۔ اب چھمن بوا میں دروازہ کھولنے کی ہمت تو نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو وہاں سے بھاگ کر ہٹ جانا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے پاؤں تو جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے۔

اچانک اوپر والے زینوں کی طرف سے لپکتے ہوئے قدموں کی چاپ ابھری۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ قدموں کی چاپ بتاتی تھی کہ اترنے والے دو افراد ہیں۔ اور وہ چھوٹا ٹھاکر اور رگھو ہی ہو سکتے تھے۔

پھر گلی میں چھوٹے ٹھاکر کی آواز ابھری۔ ''ارے ہٹو...... چھوڑو۔ یہ کیا وحشت ہے۔''

چھمن بوا کو اندازہ ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر بیچ بچاؤ کرا رہا ہے۔ چند منٹ میں تصادم تو موقوف ہو گیا۔ لیکن دونوں طرف کی تند و تیز گفتگو اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ آوازوں میں وحشت تھی اور لہجوں میں تیزی اور نفرت۔ شاید اسی لیے چھمن بوا کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آ رہا تھا۔

مگر پھر چھوٹے ٹھاکر کی شائستہ آواز ابھری۔ لہجے میں نرمی اور تحمل تھا۔ اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

''یہ کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔ ہمیشہ سے ساتھ رہنے والے، رشتے داروں سے بڑھ کر ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے والے، بے لوث ایک دوسرے کے کام آنے والے.... آج تم ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو رہے ہو۔ جانوروں کی طرح لڑ رہے ہو......''

لہجے میں ملامت اور شکایت۔

کچھ ملی جلی آوازیں......

''جلوس نکالنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ صرف نفرتیں بڑھیں گی۔ دلوں کے فاصلے بڑھیں گے۔ جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا۔''

مزید آوازیں......

''تم تو اکثریت میں ہو۔ تمہارا رویہ بڑے بھائی جیسا ہونا چاہیے۔''

''یہ لوگ 'بن کے رہے گا پاکستان'...... 'بٹ کے رہے گا ہندوستان' کا نعرہ کیوں لگاتے ہیں۔ ہمیں چڑانے کے لیے؟ تو ہم انھیں سبق بھی نہ سکھائیں۔'' ایک تند آواز ابھری۔

''تم اپنی کہو۔ تم کون ہو؟ ان کی طرف داری کیوں کر رہے ہو؟'' ایک اور تند آواز......

ایک لمحہ ایسی خاموشی رہی، جیسے جواب دینے والا لاجواب ہو گیا ہو۔ پھر چھوٹے ٹھاکر کی آواز ابھری۔ ''میں ہندو ہوں...... راجپوت۔'' اس کی آواز میں جھجک تھی اور لہجے میں فخر۔

''اور میں کسی کی طرف داری نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو دلوں کی نفرت مٹانے کی، آگ بجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' ایک لمحے کا موقف۔ پھر چھوٹا ٹھاکر شاید دوسرے گروہ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ بات تو واقعی غلط ہے۔ جب تمھارے کسی نعرے سے کسی بھائی کی دل آزاری ہوتی ہے تو وہ نعرہ

کیوں لگاتے ہو؟''

''یہ ہمارا عزم ہے۔ پاکستان بن کر رہے گا۔ ہندوستان تقسیم ضرور ہوگا'' ایک کم عمر جذباتی آواز.....

''یہ نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے ہم تمھیں مٹا دیں گے۔''

''ہمیں جان کی پروا نہیں۔ پاکستان پر ایسی سو جانیں قربان.....''

چھوٹے ٹھاکر نے پھر مداخلت کی۔ ''عزم دل میں ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر رہتا ہے۔ نعرہ تو یقین کی کمزوری کی دلیل ہے۔ اگر تمہارا یقین سچا ہے تو اعلان مت کرو..... چیلنج مت کرو۔ تمہارا یقین سچا ہے تو تمہارا خیال حقیقت میں بدل جائے گا۔ نعرے سے فساد ہوتا ہے تو نعرہ مت لگاؤ۔''

''انھیں نعرے لگانے دو۔ ہم انھیں ٹھکانے لگا دیں گے۔''

''ہم تم سے ڈرتے نہیں ہیں۔ ہم تو شہادت کی آرزو کرتے ہیں۔''

''اور ہم تمہاری آرزو پوری کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو آجاؤ.....''

''بس!'' اچانک چھوٹے ٹھاکر نے گرج کر کہا۔ اس کا لہجہ اچانک بدل گیا تھا۔ ''میں تمھیں بتا دوں کہ ہم ہندو بہت روادار ہیں..... اہنسا کے پجاری ہیں۔ تمھیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہمیں اشتعال دلاؤ گے تو وہ پاکستان کم از کم تمھیں کبھی نہیں ملے گا، جس کے تم خواب دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ تم مارے جاؤ گے۔ کان کھول کر سن لو۔ اب اس گلی میں کوئی جلوس نہیں آئے گا۔ کوئی نعرہ نہیں لگے گا۔ یہاں ہندو مسلمان صدیوں سے بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ میں یہاں کی فضا خراب نہیں ہونے دوں گا'' اس نے لاٹھی زور سے زمین پر ماری۔ ''اور یہ بات میں کہہ رہا ہوں۔ جسے اختلاف ہو، وہ مقابلے پر آجائے۔ تم سب کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ میں اس گلی میں صرف امن اور محبت دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہاں سناٹا چھا گیا۔ پھر آوازوں سے لگا کہ دونوں گروہ منتشر ہو گئے ہیں۔ گلی میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد زینے پر اوپر جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چھمن بوا بھی لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دروازے سے ہٹ آئیں۔ اس لمحے سے چھوٹا ٹھاکر انھیں برا لگنے لگا۔ آخر میں اس نے مسلمانوں کو کتنی نفرت اور حقارت سے مخاطب کیا تھا اور اس نے کتنے فخر سے خود کو ہندو اور راجپوت کہتے ہوئے ہندوؤں کی رواداری اور امن پسندی کی تعریف کی تھی۔ اس نے کھلم کھلا اپنے متعصب ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے واضح طور پر جانب داری برتی تھی۔ اور اندرونِ خانہ وہ بڑی بیگم کا بیٹا بنا بیٹھا ہے۔ اسے کہتے ہیں بغل میں چھری اور منہ پر رام رام۔

پریشان اور خوف زدہ تو وہ تھیں ہی۔ اس صدمے کے نتیجے میں انھیں بیٹھے بیٹھے بڑبڑانے، خودکلامی کرنے کی عادت ہو گئی۔ وجہ یہ بھی تھی کہ اب وہ چھوٹے ٹھاکر سے خوف زدہ تھیں اور اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ خوف سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کا اعتبار اس پر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ کسی دن وہ خود ہی بغلی دروازے سے گھر میں گھس آئے گا اور سب کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ اس وہم سے دن بھر وہ اس دروازے کو دیکھتیں کہ اپنی طرف سے بند ہے یا نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے وہ خاص طور پر اس دروازے کو دیکھتیں۔

بڑبڑانے کا معمول ایسا تھا کہ وہ کوئی بھی کام کرتے ہوئے بڑبڑانا شروع کر دیتیں اور انھیں خود بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ بڑبڑا رہی ہیں۔

اس روز بھی وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ ''موئے کافر تو ہوتے ہی منافق ہیں.....''

یہ بات قریب بیٹھی ہوئی نور بانو نے سن لی۔ ''یہ آپ کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں بوا؟''

چھمن بوا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''میں کب بات کر رہی ہوں۔'' انھوں نے کہا ''میں تو چپ بیٹھی ہوں۔''

''کمال ہے بوا۔ آپ بول رہی ہیں اور بولنے سے انکاری بھی ہیں۔ بتائیے نا'' کس کے بارے میں کہہ رہی تھیں آپ۔''

چھمن بوا نے غور سے اسے دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر تو گہری سنجیدگی تھی۔ ویسے بھی نور بانو نہ مذاق کرتی تھی اور نہ ہی کبھی جھوٹ بولتی تھی۔ وہ پریشان ہو گئیں۔ کیا سچ مچ وہ ایسے بول رہی تھیں کہ انھیں خود بھی علم نہیں تھا۔ یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ کیا دماغ چل گیا ہے میرا؟ ارے..... ابھی تو میں ساٹھ کی ہوئی بھی نہیں۔

''اچھا یہ بتاؤ، میں کیا کہہ رہی تھی؟''

''آپ کو نہیں معلوم کہ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔''

''مجھے واقعی نہیں معلوم۔''

نور بانو نے چند لمحے انھیں تولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر ان کی بات دہرا دی۔

چھمن بوا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ کہہ رہی تھی میں؟'' انھیں یقین ہونے لگا کہ وہ سٹھیا رہی ہیں۔

''جی ہاں، یہی کہہ رہی تھیں آپ۔ اب یہ بتائیں، کس کے بارے میں کہہ رہی تھیں؟''

چھمن بوا صرف ایک لمحے کو ٹھٹکیں۔ ''ارے وہی چھوٹا ٹھاکر۔ اور کس کے بارے

میں کہوں گی۔'' انھوں نے جھنجلا کر کہا۔

''چھوٹے ٹھاکر نے ایسا کیا کر دیا؟'' نور بانو کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔

چھمن بوا نے سب کچھ اسے بتا دیا۔

''میں تو پہلے ہی سے کہتی ہوں یہ بات۔'' نور بانو نے کہا۔ ''لیکن اماں تو سچ مچ اسے اپنا بیٹا سمجھتی ہیں۔''

نور بانو سے وہ بات حور بانو اور گلنار تک پہنچی۔ حور بانو یہ سن کر بہت تلملائی۔ لیکن چھمن بوا نے جو بات اپنے کانوں سے سنی تھی، اس کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔

اس طرح یہ بات سرفراز بیگم تک بھی پہنچ گئی۔ کئی دن سے وہ دیکھ رہی تھیں کہ لڑکیاں سر جوڑے بیٹھی سرگوشیوں میں گفتگو کرتی رہتی ہیں۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ بحث کر رہی ہیں۔ کوئی ایسا متنازعہ معاملہ تھا، جس پر وہ متفق نہیں تھیں۔ ان کے استفسار پر نور بانو نے انھیں وہ بات بتا دی۔ سرفراز بیگم تو دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''اماں...... دل چھوٹا نہ کریں۔ اللہ حفاظت کرنے والا ہے۔'' نور بانو نے بڑے خلوص سے انھیں دلاسہ دیا۔ ''بس اندر کے دشمن سے ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ اندر کے دشمن کا پتا چل گیا......''

''بس چپ رہو تم۔'' سرفراز بیگم نے اسے اس طرح ڈانٹا کہ وہ دہل کر رہ گئی۔ اس سے پہلے اماں نے کبھی ایسے درشت لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ تینوں لڑکیاں سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ اماں کی برہمی ان کی سمجھ سے باہر تھی۔

سرفراز بیگم سوچ رہی تھیں کہ انھیں کیا بتائیں، کس طرح سے سمجھائیں۔ وہ جانتی تھیں کہ نور بانو شروع ہی سے چھوٹے ٹھاکر سے چڑتی ہے۔ وہ اسے ضد بھی نہیں دلانا چاہتی تھی۔ مگر سمجھانا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''دیکھو...... تم لوگ ابھی چھوٹی ہو۔ دنیا کا تمھیں کچھ پتا نہیں اور میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ میں آدمی کو پہچانتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس وقت جو کچھ میں تم سے کہوں، وہ تمھیں ہمیشہ یاد رہے۔ اسے کبھی نہ بھولنا تمھیں میری قسم...... تمھارے مرے ہوئے باپ کی قسم......''

تینوں لڑکیاں اور دہل گئیں۔ اماں نے پہلے کبھی انھیں قسم نہیں دی تھی۔ وہ تو اس کے سخت خلاف تھیں۔ ''آپ کہیں اماں، ہم یاد رکھیں گی۔'' حور بانو بولی۔

''چھوٹے ٹھاکر سے تمھیں اللہ واسطے کا بیر ہے۔ میں جب بھی تمھیں سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں تو یہ نور بانو تاویلیں لانے لگتی ہے۔ اس کی اچھائی کو برائی میں بدل دیتی ہے۔ تم

مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ مگر تم خود بے وقوف ہو۔ آج میں تمھیں وہ کچھ نہیں بتاؤں گی، جو میں جانتی ہوں۔ تم اس میں بھی بدنیتی تلاش کر لو گی۔ اس لیے میں تمھیں حکم دے رہی ہوں۔ اسے میری وصیت سمجھ لو......''

ان الفاظ پر تینوں لڑکیاں تھرا کر رہ گئیں۔ لیکن کسی میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

''چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں جس کا جو گمان ہے، بے شک وہ اس پر قائم رہے۔ لیکن میں تمھیں حکم دے رہی ہوں کہ ہمیشہ اس پر ویسا ہی اعتبار کرنا، جیسا مجھ پر کرتی ہو۔ اور اسے اپنا ویسا ہی بہی خواہ سمجھنا، جیسا بہادر علی کو سمجھتی ہو۔ چھوٹے ٹھاکر سے تمھیں کبھی دھوکہ نہیں ملے گا۔ وہ تمہاری ویسی ہی حفاظت کرے گا۔ جیسے بہنوں کے بھائی کرتے ہیں۔ اس سے کبھی نہ ڈرنا اور اس سے بڑھ کر اعتبار کسی پر نہ کرنا۔ سمجھ گئیں۔''

''مگر اماں......'' نور بانو نے کچھ کہنا چاہا۔

''اگر مگر نہیں۔ میں نے تمھیں بہت بڑی قسم دی ہے۔ آگے تم جانو۔'' یہ کہہ کر سرفراز بیگم اٹھ گئیں۔

اس کے بعد انھوں نے چھمن بوا کی خبر لی۔ ''بوا...... تم نے تو حد ہی کر دی۔ ایسے حالات میں تم بچیوں کو ان کے ہمدرد سے برگشتہ کر رہی ہو۔ انھیں بدگمانی میں مبتلا کر رہی ہو۔ ارے بچیوں کو تو ان حالات کا پتا ہی نہیں چلنا چاہیے تھا۔ اور تم نے تو انھیں گھر کے آدمی سے خوف زدہ کر دیا۔''

چھمن بوا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''آپ کس کی بات کر رہی ہیں بڑی بیگم؟'' انھوں نے سہم کر پوچھا۔

''میں چھوٹے ٹھاکر کی بات کر رہی ہوں بوا۔''

''میں نے تو بچیوں کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ تو انھوں نے مجھے بڑبڑاتے ہوئے سن لیا۔ پھر مجھے کھولنا پڑا۔''

''جو ہوا سو ہوا۔ اب آئندہ تم چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں بچیوں سے کبھی بات نہ کرنا۔ یہ میرا حکم ہے۔''

چھمن بوا ان کے سامنے دم نہیں مار سکیں۔ پہلی بار بڑی بیگم نے ان سے اس طرح بات کی تھی۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کی یہ حمایت ان کے حلق سے نہیں اُتری۔ موقع پاتے ہی انھوں نے اس سلسلے میں بہادر علی سے بات کی۔ انھوں نے بہادر علی کو سب کچھ بتایا اور پھر بولیں۔ ''مجھے تو لگتا ہے، چھوٹے ٹھاکر نے بڑی بیگم پر کوئی جادو کر دیا ہے۔''

''جہالت کی باتیں مت کرو۔'' بہادر علی نے الٹا انھیں ڈانٹ دیا۔ ''جانتی بھی ہو، چھوٹا

ٹھاکر اس گھر اور گھر والوں کی حفاظت کے لیے رات بھر پہرہ دیتا ہے۔''
چھمن بوا کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''یہ کیسے کہہ رہے ہو تم؟''
''آنکھوں دیکھی کہہ رہا ہوں۔ اور بڑی بیگم کو بھی یہ بات معلوم ہے۔''
''تو پھر وہ اس دن گلی میں ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا؟'' چھمن بوا نے اچنبھے سے کہا۔
''یہ تو میں نہیں جانتا۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اسے ہم سب کی حفاظت کی فکر ہے۔''
بہادر علی نے بے حد یقین سے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بولا۔ ''ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ ہماری خاطر ہندوؤں میں اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ہندو اسے ہمارا ہم نوا اور محافظ سمجھیں۔ ایسا ہوا تو اس کا کام اور مشکل ہو جائے گا۔''
''تو یہ منافقت تو ہوئی نا۔'' چھمن بوا نے تنک کر کہا۔
''یہ منافقت نہیں۔ اسے مصلحت کہتے ہیں۔ آج کے دور میں یہ سیاست کہلاتی ہے۔ اور یاد کرو، اس دن کے بعد سے ہندوؤں کے جلوس تو رک گئے نا۔ اور مسلمانوں کے جلوس اب بھی نکلتے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر نے انھیں تو کبھی نہیں ٹوکا۔ گلی کا فساد تو بہر حال رک گیا نا۔''
چھمن بوا نے ذہن پر زور دیا۔ بہادر علی کی بات واقعی ٹھیک تھی۔ جس روز چھوٹے ٹھاکر نے دونوں جلوسوں کے شرکا کو سختی سے ڈانٹا تھا اور ہندوؤں کی خاص طور پر حمایت کی تھی، اس دن کے بعد سے ہندوؤں کا کوئی جلوس گلی میں داخل نہیں ہوا تھا۔ مگر مسلمان نہیں رکے تھے اور چھوٹا ٹھاکر بھی اس دن سے جلوس کو روکنے کے لیے نیچے نہیں اترا تھا۔
اس رات چھمن بوا نہیں سوئیں۔ آدھی رات کو وہ دبے پاؤں باہر آئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر ٹہل رہا ہے۔ وہ مطمئن ہو گئیں۔ ساتھ ہی انھیں افسوس ہوا کہ اس کے بارے میں اس طرح کی بات کر کے وہ گناہگار ہوئیں۔ اب وہ اسی طرح اس کا کفارہ ادا کر سکتی تھیں کہ لڑکیوں کو حقیقت بتا دیں۔ لیکن اس کی انھیں ہمت نہیں ہوئی۔ بڑی بیگم نے سختی سے انھیں حکم دیا تھا کہ اب وہ لڑکیوں سے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔
وہ دل پر بوجھ لیے پھرتی رہیں!

❀ ...... ❀ ...... ❀

اوتار سنگھ مطالعہ کرنے کا عادی تھا۔ لیکن ان دنوں اس کے لیے کچھ پڑھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ایسے میں اچانک اسے عربی کا خیال آ گیا۔ اس نے پرانی کاپیاں اٹھائیں اور عربی کو تازہ کرنے لگا۔ آخری دنوں میں مولوی صاحب نے اسے عربی میں کئی کہانیاں لکھ کر دی تھیں۔ وہ انھیں بھی پڑھنے لگا۔ پھر اس نے ان کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کیے ہوئے اردو ترجمے کو عربی میں منتقل کیا اور اس کا موازنہ مولوی صاحب کی لکھی ہوئی کہانیوں سے

کیا۔ اس مشق سے اسے بہت فائدہ ہوا۔ اس کی عربی کی استعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اس معاملے میں اس کی خود اعتمادی بھی بڑھ گئی۔
اس معمول سے اسے بہت فائدہ ہوا۔ اس میں اس کا دل لگتا تھا، اس لیے اسے خوشی بھی ہوئی۔ ورنہ مطالعے میں دل نہ لگنے کے نتیجے میں اس کے لیے وقت گزارنا بھی مسئلہ ہو گیا تھا اور وہ مسلسل اعصابی تناؤ کا شکار رہنے لگا تھا۔ اس خوشی نے اس تناؤ کو کم کر دیا۔
ماسٹر جی کی حالت اور خراب ہو گئی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر ان کے گھر گیا اور ان کے بیٹوں سے بات کی۔ اس نے انھیں یہاں تک بتا دیا کہ کسی بھی وقت انھیں ماسٹر جی کی طرف سے کوئی بری خبر مل سکتی ہے۔ لیکن یہ سن کر بھی ان کے دل نہیں پسیجے۔ انھوں نے پہلے کی طرح اسے ٹرخا دیا۔ ان کی اس بے حسی نے اسے بہت دکھی کر دیا۔
ملکی صورتِ حال بھی اور ابتر ہو گئی تھی۔ مارچ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو انڈیا کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔ اس تقرری پر کانگریس میں خوشی کے شادیانے بجے۔ وجہ یہ تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو سے ماؤنٹ بیٹن کے قریبی تعلقات تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد میں وہ تعلقات کانگریس کے کام آئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کی تشکیل کے معاملے میں جانب داری سے کام لے کر مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ بہت سے ایسے علاقے جنھیں اصولاً پاکستان میں شامل ہونا تھا، پاکستان میں شامل نہ ہو سکے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔
بہر حال جس وقت ماؤنٹ بیٹن نے چارج سنبھالا، پورا ہندوستان یک طرفہ فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں خانہ جنگی میں مبتلا تھا۔ اس صورتِ حال میں مسئلے کا واحد حل تقسیم ہند تھا۔ یعنی ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام ناگزیر ہو چکا تھا۔ 3 جون کو ماؤنٹ بیٹن نے اپنا منصوبہ پیش کیا، جسے ماؤنٹ بیٹن پلان کا نام دیا گیا۔ اس پلان میں 15 اگست 47ء کو اقتدار کی منتقلی کا دن قرار دیا گیا تھا۔
ایک رات جب اوتار سنگھ کوٹھے پر پہرہ دے رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب کا وقت تھا اور وہ تازہ دم تھا۔ اس لیے ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ دیوار کے پاس رکا اور گلی میں جھانکنے لگا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی اور پوری گلی چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔
اچانک اس نے دو افراد کو گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ دونوں جوان لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ وہ انھیں بہت غور سے دیکھتا رہا۔ وہ قریب آئے تو اس نے اسے پہچان لیا۔ جو اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا، وہ اس کا کلاس فیلو رام گوپال تھا۔
''ارے رام گوپال...... تم یہاں؟'' اس نے بے ساختہ اسے پکارا۔
دونوں لڑکوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس وقت عین کوٹھے کے نیچے سے گزر

رہے تھے۔ رام گوپال نے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی نظر آئی۔ ''وہ اوتار سنگھ۔ نمسکار۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ نے جواب میں اسے نمسکار نہیں کہا۔ ''کیسے ہو رام؟''

''ٹھیک ہوں...... ہمیشہ کی طرح۔'' رام گوپال بولا۔ ''تو تم یہاں رہتے ہو؟''

''ہاں۔''

''اتنی رات کو کوٹھے پر کیا کر رہے ہو؟''

''پڑھ رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں اینٹھ گئیں تو سوچا ٹہل لوں۔''

''پڑھائی؟ اور امتحان سے فارغ ہونے کے فوراً بعد۔'' رام کے لہجے میں مسرت تھی۔ پھر وہ مسکرایا۔ ''ہاں بھئی، میں بھول گیا تھا کہ تم تو پورا سال پڑھنے والوں میں سے ہو۔'' مگر پھر اس کے تیور بدلے۔ ''چوکی داری تو نہیں کر رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں اشتباہ تھا۔

''چوکی داری...... کیسی اور کس کی؟'' اوتار سنگھ نے بے پروائی سے کہا۔ ''کوئی خطرہ ہو تو چوکی داری بھی کی جائے۔''

رام گوپال شیطنت بھرے انداز میں ہنسا۔ ''ٹھیک کہتے ہو۔ تمھیں تو کوئی خطرہ نہیں۔''

''میری چھوڑو۔ اپنی کہو۔ تم اتنی رات کو کہاں جا رہے ہو؟''

''گھر جا رہا ہوں۔ یہاں ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔''

''اتنی رات کو تمھیں اس طرح نہیں گھومنا چاہیے۔''

رام گوپال پھر شیطنت سے ہنسا۔ ''میں کوئی مُسلا تو ہوں نہیں کہ مجھے کوئی خطرہ لاحق ہو۔'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ ان بے چاروں نے تو کبھی کسی ہندو پر حملہ نہیں کیا۔''

''یہ کام بزدلوں کے بس کا نہیں اوتار سنگھ۔ یہ تو ہم جیسے بہادر ہی کر سکتے ہیں۔''

''اکیلے اور نہتے آدمی کو گھیر کر دس آدمی ماریں تو یہ تمھارے نزدیک بہادری ہے۔ میں تو اسے بزدلی کہتا ہوں۔''

''وقت قریب آ رہا ہے اوتار سنگھ۔ عنقریب تم ہماری بہادری بھی دیکھ لو گے۔''

''بہادروں کی خاطر مدارات کے لیے میں ہر وقت تیار رہتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن کچھ مناسب نہیں لگتا۔ خوامخواہ کسی کی نیند خراب کریں۔ کبھی مناسب وقت میں آنا۔ ٹھاکروں کی تواضع بھی دیکھ لینا۔'' اس کا لہجہ ذومعنی تھا۔

''ضرور۔ اب تو میں نے گھر دیکھ لیا ہے تمھارا۔'' رام گوپال نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''کسی رن آؤں گا۔ چلتا ہوں۔''

وہ چلے گئے۔ اوتار سنگھ انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ گلی سے نکل گئے۔

اوتار سنگھ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ رام گوپال کا یہاں نظر آنا خالی از علت نہیں تھا۔ یہ ناممکن نہیں تھا کہ وہ یہاں اپنے کسی دوست سے ملنے آیا ہو۔ لیکن یہ بات بھی کم خطرناک نہیں تھی کہ اس کا کوئی دوست یہاں رہتا ہے۔

❁......❁......❁

اس روز اوتار سنگھ سو رہا تھا کہ رگھو نے اسے اٹھا دیا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اوتار سنگھ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا بات ہے رگھو؟ خیریت تو ہے نا؟''

رگھو ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ ''شما کر دینا مالک۔ مجبوری تھی۔ ورنہ آپ کو کبھی نہ جگاتا۔''

''میں پوچھ رہا ہوں، بات کیا ہے؟'' رات بھر کا جاگا ہوا اوتار سنگھ جھنجلا گیا۔

رگھو اور گھبرا گیا۔ ''وہ...... مالک...... وہ...... ڈاکیا آیا ہے۔''

''تو خط لایا ہوگا نا۔''

''کھت نہیں مالک، تار ہے۔ وہ کہتا ہے، دس کھت بھی کرنے ہیں۔''

اوتار سنگھ کی نیند ہوا ہو گئی۔ وہ اٹھا اور زینے کی طرف لپکا۔ اسے تو اب کوئی خط لکھنے والا تھا ہی نہیں۔ تار تو ویسے بھی خطرناک ہے۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ اچھی خبر نہیں ہے۔ اور وہ جانتا تھا کہ تار شملے سے آیا ہے۔

ڈاکیے نے اس سے دستخط لیے اور لفافہ اسے دیا۔ اس نے وہیں کھڑے ہو کر لفافہ چاک کیا اور تار نکال کر پڑھا۔ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود اسے شاک لگا۔ رات ماسٹر جی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسے فوری طور پر شملہ جانا تھا۔

اوتار سنگھ کا ذہن سنسنا رہا تھا۔ زندگی کی اذیت کو موت کے سکون نے نگل لیا تھا۔ اذیت اٹھانے والے ماسٹر جی کو شانتی مل گئی تھی۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اوپر آیا۔ رنجنا اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ ''کیا ہوا مالک؟''

''ماسٹر جی......'' اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی لگی۔ ''ماسٹر جی کا دیہانت ہو گیا۔''

''ہائے رام۔''

اوتار سنگھ کے سنسناتے ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ اچانک اسے ماسٹر جی کی خواہش یاد آئی۔ ماسٹر جی بار بار اس سے کہتے تھے...... بار بار وعدہ لیتے تھے۔ اوتار سنگھ میری چتا کو آگ تم دکھانا۔ اسے ماسٹر جی کی آواز سنائی دی۔ وہ اس سے یہی کہہ رہے تھے۔

وہ خیال اسے یک لخت شاک سے باہر لے آیا۔ ارے...... اسے تو بہت کچھ کرنا ہے۔

کئی ذمے داریاں نبھانی ہیں اسے...... اپنی بھی اور دوسروں کی بھی۔ اس پر اسے ماسٹر جی کے وارث...... ان کے بچوں کا خیال آیا۔ ان لوگوں نے کبھی اپنی ذمے داری کو نہیں سمجھا تھا۔ وہ بار بار ان کے پاس جا کر ان کی خوشامد کرتا تھا کہ کم از کم ایک بار ان میں سے کوئی ماسٹر جی کے پاس چلا چلے...... صرف ماسٹر جی کی خوشی کے لیے۔ ان کا یہ کرب تو کم ہو جائے کہ ان کے اپنے بیٹوں نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ اسے ٹالتے رہے۔ وہ ان سے اتنا نالاں ہوا کہ اس نے آئندہ ان کے پاس نہ جانے کا عہد کر لیا۔

لیکن اب صورتِ حال اور تھی۔ وہ کتنے ہی بُرے سہی، بہرحال وہ یتیم ہوئے تھے۔ ان کا باپ مرا تھا۔ تو اب اسے ان کو اطلاع بھی دینی تھی۔

تار تنہا مجھے نہیں، انھیں بھی بھیجا گیا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ میں نے سینی ٹوریم والوں کو تاکید کی تھی کہ جو اطلاع مجھے دیں، مجھ سے پہلے ان کے گھر والوں کو دیں۔ تو یہ ممکن نہیں کہ انھیں اطلاع نہ ہو۔

کچھ بھی ہو۔ یہ اس کا فرض ہے۔ ذمے داری ہے۔ ضمیر نے اسے ملامت کی۔ ماسٹر جی کے بیٹے اس کے روحانی بھائی ہیں۔ کیا وہ ان کے دکھ میں شریک نہیں ہوگا۔ انھیں سینے سے لگا کر دلاسہ نہیں دے گا۔

ایک نئے عزم سے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔

''رگھو...... رات کو میں نہیں آ سکوں گا۔'' اس نے رگھو سے کہا۔ ''لیکن جلد سے جلد آنے کی کوشش کروں گا...... ''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں مالک؟'' رگھو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' اوتار سنگھ نے تڑپ کر کہا۔ ''تم میرے ساتھ چلے گئے تو گھر کا خیال کون رکھے گا۔''

رگھو کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''لیکن مالک...... ''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ رات کو میری جگہ تمھیں پہرا دینا ہوگا۔ چوکس رہنا۔ جان چلی جائے پر نیچے والوں پر آنچ نہ آئے۔''

اب بات رگھو کی سمجھ میں آئی۔ ''آپ کے حکم پر سب قربان ہے مالک۔ آپ چنتا نہ کریں۔''

''میں چلتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

پہلے وہ ماسٹر جی کے گھر گیا۔ دروازہ ماسٹر جی کی بڑی بہو نے کھولا۔ اوتار سنگھ کو دیکھ کر اسے

لمحے کو وہ جھجکی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ ''آپ...... آپ کو پتا ہے؟''

''جی...... ابھی کچھ دیر پہلے تار آیا تھا۔ مجھے بہت...... ''

''تار یہاں بھی آیا تھا۔ بھگوان نے بڑی دیا کی بابو جی پر۔''

ابھی تک اوتار سنگھ کو اندر آنے کو نہیں کہا گیا تھا۔ ''وہ تو دیا کرتا ہے۔ پر بندے تو اپنا فرض بھی پورا نہیں کرتے۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ پھر بولا۔ ''کسی کو بلا دیں نا۔ میں شملہ جانے کے لیے آیا ہوں۔''

''گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے بچوں کے سوا۔''

''کیوں؟ ہری بھیا کی تو اسکول کی چھٹیاں ہوں گی۔''

''وہ تو بھیا شہر سے باہر گیا ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا۔''

''تو بدری بھیا رات کی ڈیوٹی کر کے آئے ہوں گے۔ انھیں جگا دیں۔''

''کل سے ان کی دن کی ڈیوٹی لگی ہے۔''

اوتار سنگھ نے ایسی بے حسی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے بڑی شدت سے غصہ آیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے تو تار کس نے پڑھا۔ اسے ماسٹر جی کی موت کا پتا کیسے چلا۔ اور وہ اسے اندر کیوں نہیں بلا رہی ہے۔ اسی لیے تا کہ وہ اندر جائے گا تو اسے مردوں کی موجودگی کا پتا چل جائے گا۔ ''اچھا بھابھی، میں چلتا ہوں۔'' اس نے کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

''جل پان تو کرتے جاؤ بھیا۔''

اس نے پلٹ کر غصے سے اس عورت کو دیکھا۔ ''جہاں کریا کرم کا معاملہ ہو، وہاں جل پان کسے یاد رہتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور واپس چل دیا۔

❁......❁......❁

گھر میں عید کا سا سماں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ پچھلے روز چھوٹے ٹھاکر کے لیے سیا جانے والا آخری کرتا بھی مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد استری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب ایک درجن جوڑوں پر استری کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا۔ کوئلوں کی استری تھی اور استری کرنے والی سرفراز بیگم، جو یہ اہتمام چھوٹے ٹھاکر کے لیے کر رہی تھیں۔ ایک ایک سلوٹ دور کی جا رہی تھی۔

سرفراز بیگم خوش بھی تھیں اور بے تاب بھی۔ ان کا حال بچوں جیسا تھا۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اوپر چلی جائیں اور چھوٹے ٹھاکر کو یہ جوڑے دیں۔ اس کے بعد اس کے چہرے پر غیر معمولی خوشی دیکھنا ان کی خواہش تھی۔

اس روز سرفراز بیگم نے کھانے میں بالکل دلچسپی نہیں لی۔ یہ کام انھوں نے چھمن بوا کے سپرد کر دیا اور خود استری کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ایک کرتا استری کرتیں تو اس کے بعد وہ

اسے خس کے عطر میں بساتیں اور پھر تہ کر کے رکھ دیتیں۔

لڑکیوں میں نور بانو تو ان کی اس کیفیت پر جل کڑھ رہی تھی۔ حور بانو اور گلنار بار بار ماں کو تعاون کی پیشکش کرتیں۔ ''اماں...... آپ تھک گئی ہوں گی۔ لائیں، ایک کرتا میں استری کر دوں۔''

''لو...... اس میں تھکن کیسی! میرے لیے تو یہ خوش کرنے والا کام ہے۔ اور ایک جوڑا استری کرنے میں لگتا ہی کیا ہے۔'' سرفراز بیگم کہتیں۔

لیکن یہ بس کہنے کی بات تھی۔ کلف لگے کپڑے پر استری کرنے میں وقت لگتا ہے۔ بہرحال سرفراز بیگم نے دو بیٹیوں کو ایک ایک کرتا کاڑھنے کی اجازت تو دے دی تھی۔ لیکن وہ کسی کو استری کرنے کی سعادت دینے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دوپہر ہوگئی۔ ''اماں...... چلیں کھانا تو کھالیں۔'' نور بانو نے کہا۔

''تم لوگ کھالو۔ میں تو کام ختم کر کے ہی کھاؤں گی۔''

''ارے اماں...... ایسا بھی کیا۔ اور کام تو بہت باقی ہے۔'' نور بانو تنک کر بولی۔

''بہت کہاں۔ بس دو جوڑے ہی تو رہ گئے ہیں۔''

''جس طرح سے آپ کر رہی ہیں تو ان دو جوڑوں میں دو گھنٹے تو لگیں گے ہی۔''

گھر کا اصول تھا کہ دسترخوان پر سب لوگ ساتھ ہی بیٹھتے تھے۔ سرفراز بیگم کہتی تھیں کہ جو دسترخوان پر نہیں بیٹھے گا، اسے بعد میں کھانا نہیں ملے گا۔

انھیں خیال آیا کہ خود اپنا اصول توڑ کر وہ کوئی اچھی مثال قائم نہیں کر رہی ہیں۔ انھیں خود بھی اپنے اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ اور اس کے باوجود یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ آئندہ بھی بچیاں بھی یہی کر سکتی ہیں۔

چنانچہ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''چلو بھئی، دسترخوان لگاؤ۔ پہلے کھانا کھالیں۔''

مگر کھانا بھی انھوں نے بے دلی سے کھایا۔ دل تو ان کا استری میں اٹکا ہوا تھا۔ بچیوں نے یہ بات محسوس کر لی۔ ''اماں...... ٹھیک سے کھانا کھائیں۔'' نور بانو نے انھیں ٹوک دیا۔

''کھا تو رہی ہوں۔''

کھانے کے بعد وہ دوبارہ استری کرنے میں مصروف ہوگئیں۔

وہ آخری جوڑا استری کر رہی تھیں کہ اوپر سے رنجنا آ گئی۔ ''یہ کیا کر رہی ہیں بڑی بیگم؟''

''چھوٹے ٹھاکر کے لیے کپڑے سیے ہیں۔ اب استری کر رہی ہوں۔ چھوٹا ٹھاکر تو گھر میں ہی ہے نا؟''

''نہیں بڑی بیگم۔ وہ تو شملہ گئے ہیں۔''

سرفراز بیگم کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ ہفتے کا دن تو نہیں۔ چھوٹا ٹھاکر تو ہفتے کے دن وہاں جاتا ہے۔ پھر آج کیوں؟ ''خیریت تو ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ماسٹر جی کا دیہانت ہوگیا بڑی بیگم۔''

''اوہ......'' سرفراز بیگم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''تو وہ واپس کب آئے گا؟'' ان کا استری کرنا اب بھی نہیں رکا تھا۔

''کہہ رہے تھے، کل صبح تک آ جائیں گے...... ماسٹر جی کا انتم سمسکار کر کے۔''

''کریا کرم تو یہاں دلی میں ہی ہوگا نا؟''

''نہیں بڑی بیگم۔ وہیں ہوگا...... شملے میں۔''

''ارے...... کیوں؟'' سرفراز بیگم کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''ان کے بچے تو یہاں ہیں...... دلی میں۔ وہ جائیں گے وہاں؟ زندگی میں تو کبھی گئے نہیں۔''

''وہ کہاں جانے والے ہیں بڑی بیگم۔ ماسٹر جی نے چھوٹے ٹھاکر سے وچن لیا تھا کہ ان کی چتا کو آگ وہی دیں گے......''

''ہائے اللہ۔ بیٹوں کے ہوتے ہوئے!''

''جی بڑی بیگم۔ ماسٹر جی نے کہا تھا کہ ان کے بیٹے آئیں اور موجود ہوں تو بھی ان کی چتا کو آگ چھوٹے ٹھاکر ہی دیں گے۔'' رنجنا بولی۔ ''مگر بڑی بیگم ان کے بچے تو اتنے مورکھ ہیں کہ مجھے نہیں لگتا، وہ جائیں گے۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ ایسے ناخلف بچوں سے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی۔'' بڑی بیگم نے کہا۔ پھر آخری کرتے پر عطر لگایا اور اسے تہ کرنے لگیں۔ ''صبح تو آ جائے گا نا چھوٹا ٹھاکر۔'' ان کے لہجے میں بچوں کی سی بے تابی تھی۔

''کہا تو یہی ہے بڑی بیگم۔ اور اب وہ وہاں رکیں گے کیوں؟'' رنجنا نے کہا۔ پھر حیرت سے تمام جوڑوں کو دیکھا۔ ''یہ اتنے سارے کپڑے! یہ سب آپ نے چھوٹے ٹھاکر کے لیے سیے ہیں؟''

''اتنے سارے کہاں، صرف بارہ جوڑے ہیں۔'' سرفراز بیگم نے سادگی سے کہا۔ ''اتنوں ہی کی فرمائش کی تھی اس نے۔''

''چھوٹے ٹھاکر نے خود کہا تھا!'' رنجنا حیران تھی۔

''ہاں، اسے بہت اچھا لگا تھا یہ لباس۔'' سرفراز بیگم نے کہا۔ ''اب یہ کپڑے میں ٹرنک میں رکھ دوں۔ کل وہ آئے گا تو اسے دوں گا۔''

❁......❁......❁

اوتار سنگھ ماسٹر جی کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ مرنے کے بعد ان کے چہرے پر بے پناہ سکون تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور انھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ مرے نہیں، بس گہری نیند سو گئے ہیں۔

تو یہ ہوتی ہے موت! اوتار سنگھ نے سوچا اور زندگی کے ساتھ کتنے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ غم روزگار، غم جاناں، گزرے ہوئے کے پچھتاوے، آج کی مصروفیت اور آنے والے کل کی فکر، نہ ملنے والی محبتوں کا دکھ، لوگوں سے شکایتیں، کتنی بھاری چیز ہے زندگی، پھر بھی آدمی موت سے ڈرتا ہے...... گھبراتا ہے۔ زندگی سے چمٹے رہنا چاہتا ہے۔ بیماری کی بدترین اذیت اٹھا کر بھی جینا چاہتا ہے۔ نہیں سمجھتا کہ موت میں ہی مکتی ہے...... نجات ہے۔

لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ شاید موت کے پہلے مرحلے میں اس کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ موت ہر دکھ سے نجات کا نام ہے۔ تبھی تو مرنے کے بعد آدمی کے چہرے پر اتنا سکون ہوتا ہے۔ ماسٹر جی کے چہرے پر کوئی تاسف نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ انھوں نے باہیں پھیلا کر موت کا استقبال کیا ہوگا۔

''ان کے بچے نہیں آئے؟'' ڈاکٹر براؤن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اوتار سنگھ نے سر اٹھا کر خالی خالی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ اپنے خیالوں میں ایسا گم تھا کہ اس نے ڈاکٹر کی بات نہیں سنی تھی۔ ''کیا کہا آپ نے؟''

''ان کے بچے آج بھی نہیں آئے؟'' ڈاکٹر نے دہرایا۔

''سب مصروف ہیں۔ گھر پر کوئی نہیں تھا چھوٹے بچوں اور عورتوں کے سوا۔''

''ان کا انتظار کرو گے؟''

اوتار سنگھ کے نزدیک وہ بڑی ذمے داری تھی۔ وہ کوئی فیصلہ کن جواب نہیں دے سکتا تھا۔ ''آپ کی کیا رائے ہے ڈاکٹر؟''

ڈاکٹر نے کندھے جھٹک دیے۔ ''مردہ خانے میں لاش دس دن بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔'' وہ بولا۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان کے گھر سے کوئی آئے گا۔ وہ آنے والے ہوتے تو آپ سے پہلے آ چکے ہوتے۔ دوسری بات اُن کی وصیت ہے۔ یہاں انھوں نے ہر ڈاکٹر، ہر نرس، ہر وارڈ بوائے سے یہی کہا کہ ان کی آخری رسومات یہیں ہوں گی۔ اور یہ کہ ان کے بیٹے موجود ہوں یا نہ ہوں، ان کی چتا کو آگ آپ دیں گے۔''

اوتار سنگھ کے دل سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ ''تو ٹھیک ہے۔ میں تیاری کراتا ہوں۔ اس کام میں دیر کرنا مناسب نہیں۔''

وہ باہر چلا آیا۔ اس وقت اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اوپر والا جو کچھ کرتا ہے، اس

میں بہتری ہوتی ہے۔ وہ چاہتا تو ان کے بیٹوں کے دل میں یہاں آنے کا خیال ڈال دیتا اور وہ آ جاتے۔ لیکن کیا ان کی موجودگی میں وہ ماسٹر جی کی وصیت پر عمل کر پاتا۔ وہ یہی سوچتا کہ ماسٹر جی کی چتا کو آگ دکھانے کا اصل حق ان کے بیٹوں کا ہے۔ وہ تو بہت بڑی آزمائش میں پڑ جاتا۔ اس کے لیے اس وقت حتمی طور پر یہ سوچنا مشکل تھا کہ اس صورت حال میں وہ کیا کرتا۔ بہر حال وہ جو بھی کرتا، اس کے نتیجے میں عمر بھر کے لیے اس کے ضمیر پر بوجھ آ جاتا۔ اگر ماسٹر جی کی چتا ان کے بیٹے جلاتے تو وہ عمر بھر یہ سوچ کر کڑھتا کہ اس نے ماسٹر جی کی آخری خواہش پوری نہیں کی۔ ان کے آخری حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اور اگر چتا وہ جلاتا تو اسے عمر بھر یہ پھانس چبھتی رہتی کہ اس نے ماسٹر جی کے بیٹوں سے ان کا حق چھینا ہے۔ انھیں ان کے حق سے محروم کیا ہے۔ واقعی...... اوپر والے کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے کیونکہ وہ سب جانتا ہے۔

اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ ماسٹر جی کی آخری رسومات ادا ہوتے ہوتے دس بج جائیں گے۔ سوال یہ تھا کہ وہ رات کو ہی واپسی کے لیے نکل سکے گا یا نہیں۔ اس نے اِدھر اُدھر معلومات کیں تو پتا چلا کہ آخری گاڑی بارہ بجے روانہ ہوتی ہے۔

اس کے بعد وہ اس کوشش میں لگ گیا کہ ہر کام وقت پر ہو جائے اور وہ رات کو ہی دہلی کے لیے روانہ ہو جائے۔ اسے گھر کی فکر بھی ستا رہی تھی۔

تمام کام آسانی سے ہو گئے۔ سوا نو بجے ماسٹر جی کی ارتھی شمشان گھاٹ لے جانے کے لیے اٹھائی گئی۔ اپنے کندھے پر ارتھی اٹھاتے ہوئے اوتار سنگھ کو یاد آیا کہ وہ ماسٹر جی کو ان کے گھر سے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر ہی اپنے گھر لایا تھا اور آج وہ اور لوگوں کے ساتھ مل کر انھیں ان کے آخری سفر پر لے جا رہا ہے۔ شمشان گھاٹ تک کے سفر میں وہ ماسٹر جی کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو دہراتا رہا۔ کیسے وہ اسے پڑھاتے تھے۔ کیسے وہ ان سے سوال کرتا تھا۔ ٹیڑھے سوالوں پر کیسے وہ گھبراتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں بڑے ٹھاکر ان سے باز پرس نہ کریں۔ کیسے وہ اس طرح کے سوالوں سے بچتے تھے اور کیسے اس کے اصرار پر اس سے وعدہ لیتے تھے کہ وہ یہ بات کسی سے نہیں کہے گا۔ تب وہ اپنی رائے دیتے تھے۔ پھر ان کی بیماری کا عرصہ...... ان کا سینی ٹوریم آنا۔ یہاں اس کا آنا...... ان سے باتیں کرنا۔ ایک ایک لمحہ اسے یاد آتا رہا۔ اس کی آنکھیں خشک رہیں۔ لیکن سینے پر جیسے کوئی بہت بڑا اور بھاری پتھر آ گرا۔ اس بوجھ سے اسے سانس لینا دشوار محسوس ہونے لگا۔

پھر آخری مرحلہ آ گیا۔ ماسٹر جی کی چتا تیار کر دی گئی۔ آگ دکھانے کے لیے جلتی ہوئی لکڑی اس کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ اس لمحے اسے خیال آیا کہ اس نے اتنی موتیں دیکھیں۔ لیکن اس مرحلے سے وہ پہلی بار گزر رہا ہے۔ یہ کام تو وہ اپنے پتا جی کے لیے بھی نہ کر سکا۔ موقع ہی نہیں

ملا اسے۔ وہ تو اپنے باپ کو بے گور و کفن چھوڑ کر آنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ تو خود ہی ریت میں دفن ہو گئے ہوں گے۔ وہ بھی اور چاچا جمال دین بھی اور ویر جی بھی اور مولوی صاحب بھی۔ وہ کسی کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ اپنی جان بچا کر بھاگ آیا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اسے ایسا لگا کہ اس کے سینے پر رکھا ہوا پتھر پگھل رہا ہے۔ کوئی چیز وہاں سے حرکت کر کے اس کے حلق کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

وہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھا اور اس نے ماسٹر جی کی چتا کو آگ دکھا دی۔ اس نے سوچا، چلو کوئی ایک ذمے داری پوری کرنے کا تو موقع ملا مجھے۔

اس وقت رات کے ٹھیک دس بجے تھے!

❀......❀......❀

عین اس وقت دہلی میں لوگوں کے سونے کا وقت تھا!

رگھو نے چھوٹے ٹھاکر کی لاٹھی کو یوں چھوا، جیسے وہ کوئی بہت مقدس چیز ہو۔ پھر اس نے لاٹھی کو اوپری حصے سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کو چھونے سے اسے ایسا لگا، جیسے اس کے جسم میں طاقت کی لہر دوڑ گئی ہو۔

عام حالات میں وہ اس لاٹھی کو چھونے کی جرأت بھی نہ کرتا۔ لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ چھوٹا ٹھاکر اس پر بہت بھاری ذمے داری ڈال کر گیا تھا۔ اور اسے وہ نبھانی تھی۔ چھوٹے ٹھاکر کی موجودگی میں وہ خود کو بہت چھوٹا اور کمزور محسوس کر رہا تھا۔ لاٹھی میں اس کی دلچسپی کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ اسے استعمال کرنا جانتا تھا۔ لٹھیا بازی کے فن سے تو وہ بالکل ناواقف تھا۔ بس اس وقت وہ لاٹھی اس کے لیے چھوٹے ٹھاکر کی حیثیت رکھتی تھی۔ لاٹھی ہاتھ میں تھی تو اسے لگ رہا تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ چھوٹے ٹھاکر اس کے ساتھ ہیں۔

اسے لاٹھی لے کر جاتے ہوئے دیکھا تو رنجنا نے پوچھا۔ ''تم کہاں چلے؟''

''اوپر جا رہا ہوں...... پہرہ دینے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''مالک کا حکم ہے تو ضرورت بھی ہوگی۔''

چھوٹے ٹھاکر کے حوالے پر رنجنا چپ ہو گئی۔ مگر ایک لمحے کے بعد بولی۔ ''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''تو کیا کرے گی چل کر؟''

''تمہارا ساتھ دوں گی اور کچھ تو میرے بس میں نہیں ہے۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ تو سو جا۔''

لیکن رنجنا مصر رہی۔ رگھو نے بھی سوچا، کوئی حرج نہیں ہے۔

اوپر پہنچ کر رگھو ٹہلنے لگا۔ وہ اس وقت پوری طرح اوتار سنگھ کے انداز کی نقل کر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک وہ بیرونی دیوار کے پاس رکتا، چند لمحے نیچے گلی میں جھانکتا رہتا اور پھر ٹہلنا شروع کر دیتا۔

رنجنا بھی اس کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ تھک گئی۔ اس کی ٹانگیں دکھنے لگیں۔ ''اب بس بھی کرو۔'' اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔ ''یوں ٹہلتے رہنا ضروری ہے کیا؟''

''ہاں۔ مالک روز یہی کرتے ہیں۔''

''میں تو تھک گئی۔ رنجنا نے کہا اور کرسی پر جا بیٹھی۔

کچھ دیر بعد رگھو بھی اس کے پاس آ بیٹھا۔ ''اتنا چلتے ہیں چھوٹے ٹھاکر!'' رنجنا نے حیرت سے کہا۔

''نہیں پگلی۔ میں تو جلدی تھک گیا ہوں۔ وہ اتنی جلدی نہیں بیٹھتے۔'' رگھو نے کہا۔

''میری ان کی عمر میں بھی تو فرق ہے۔''

''مالک سے تمہارا کیا مقابلہ۔'' وہ تنبیہی لہجے میں بولی۔

''توبہ توبہ۔ میں چھوٹے ٹھاکر سے کیوں مقابلہ کروں گا۔ میں دھرتی ہوں تو وہ آکاش ہیں۔'' رگھو نے دونوں کان پکڑے اور پھر دونوں ہاتھوں سے رخسار پیٹنے لگا۔ ''میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بہت دیر تک چلتے رہتے ہیں۔ اتنی جلدی نہیں بیٹھتے وہ۔''

''اور رات بھر ٹہلتے ہیں۔ کتنا تھک جاتے ہوں گے۔''

''یہی تو میں بھی سوچتا ہوں۔''

''ہائے رام۔'' اچانک رنجنا نے کہا اور آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا۔

رگھو نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''

''میری الٹی آنکھ پھڑک رہی ہے۔'' رنجنا کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تو کیا ہوا؟ تو اس طرح سے کیوں چیخی؟''

''تم بھی نرے بدھو ہو۔ پتا نہیں، الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہوتا ہے۔ کوئی مصیبت آنے والی ہو تو الٹی آنکھ پھڑکتی ہے۔''

رگھو چند لمحے سوچتا رہا۔ کچھ ایسا ہی ماں بھی کہتی تھی۔ پرنتو...... اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''عورت کی الٹی آنکھ پھڑکنا شبھ ہوتا ہے۔ ہاں عورت کی سیدھی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہوتا

ہے۔“

”تم الٹا بول رہے ہو۔ یہ تو مرد ذات کے لیے ہے۔“

”تم الٹا سمجھ رہی ہو۔“

دونوں میں بحث ہونے لگی۔ ”میری الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہے۔“ رنجنا نے زور دے کر کہا۔

”مردوں کی الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہوتا ہے مورکھ۔ عورت کی الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہے۔“

”ہے بھگوان۔“ اچانک رنجنا نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”میں کہہ رہی تھی نا کہ اشبھ ہوتا ہے۔ سو ہے۔“ یہ کہہ کر وہ زینے کی طرف لپکی۔

”کچھ بتاؤ تو۔ ہوا کیا؟“ رگھو نے پریشان ہو کر پوچھا۔

رنجنا جاتے جاتے پلٹی۔ ”دودھ کی دیگچی چولہے پر رکھ کر آئی تھی میں۔ اب تک یا تو سارا ابل چکا ہوگا۔ یا جل چکا ہوگا، جبھی تو میں کہوں کہ میری الٹی آنکھ کیوں پھڑک رہی ہے۔ ہوا نا اشبھ انجام۔“

وہ نیچے چلی گئی۔ رگھو پھر اٹھا اور ٹہلنے لگا۔

❁......❁......❁

جس وقت اوتار سنگھ نے شملہ میں ماسٹر کانتی پرشاد جی کی چتا کو آگ دی، اس وقت دہلی میں سرفراز بیگم کے گھر میں سب لوگ سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ سرفراز بیگم بہت تھکی ہوئی تھیں۔ درجن بھر جوڑوں پر استری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ جبکہ کپڑوں پر کلف بھی ہو۔ سہ پہر کو وہ اس کام سے نمٹی تھیں اور انھوں نے کپڑے ایک ٹرنک میں رکھ دیے تھے۔

وہ بچوں کی طرح پُر جوش تھیں۔ بس کسی طرح وہ سو جائیں اور اٹھیں تو صبح ہو چکی ہو۔ چھوٹا ٹھا کر واپس آ چکا ہو۔ وہ جائیں اور کپڑے اسے دے دیں۔ وہ کتنا خوش ہوگا۔ اس کی وہ خوشی دیکھنے کے لیے وہ تڑپ رہی تھیں۔

وہ بستر پر لیٹیں اور لیٹتے ہی بے خبر سو گئیں۔

چھمن بوا تو سب سے پہلے سونے اور سب سے پہلے اٹھنے کی عادی تھیں۔ وہ سرفراز بیگم سے پہلے ہی سو چکی تھیں۔ تینوں لڑکیاں بھی سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ نور بانو سب سے آخر میں سوتی تھی۔ اسے سونے سے پہلے مطالعہ کرنے کی عادت تھی۔ مطالعہ کرتے کرتے جب آنکھیں بند ہونے لگتیں تو وہ لائٹ بند کر کے لیٹتی اور لیٹتے ہی سو جاتی۔

نور بانو کو جماہیاں آنے لگیں۔ اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کر ایک انگڑائی لی۔ کتاب کو اس کی جگہ پر رکھ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دونوں بہنیں بستر پر تھیں اور سو چکی تھیں۔ اس

نے روشنی گل کی اور خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حور بانو ابھی تک نہیں سوئی ہے۔

حور بانو جاگ رہی تھی۔ لیکن یہ بات وہ کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے نہ سونے کی ایک خاص وجہ تھی۔ ایک کام تھا، جو اسے سب کے سونے کے بعد کرنا تھا۔

نور بانو پڑھ رہی تھی اور حور بانو چڑ رہی تھی۔ یہ سوتی کیوں نہیں۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ وہ جانتی تھی کہ نور بانو کے سوا باقی سب لوگ سو چکے ہیں۔ اس وقت جاگتی ہوئی نور بانو ہی اس کی راہ کی واحد رکاوٹ تھی۔

نور بانو نے روشنی گل کی اور سونے کے لیے لیٹی تو حور بانو نے سکون کی سانس لی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل تیز دھڑکنے لگا۔ آنے والے لمحوں کا تصور ہی اس کے لیے ہیجان انگیز تھا۔

وہ جانتی تھی کہ نور بانو لیٹتے ہی سو جاتی ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی لمحے وہ اٹھ کھڑی ہو۔ لیکن وہ مکمل احتیاط سے کام کرنا چاہتی تھی۔ کوئی غیر ضروری خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

ایسے میں ایک ایک پل ساعت بن کر گزرتا ہے۔ وقت کی رفتار بھی کم ہو جاتی ہے۔ نجانے کیسے وہ ضبط کر رہی تھی۔

بالآخر اس کے اندازے کے مطابق نور بانو کو لیٹے ہوئے آدھا گھنٹا ہو گیا تو وہ اٹھی اور دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی۔ اس کا رخ اس کوٹھری کی طرف تھا، جہاں صندوق رکھے تھے۔ کمرے کے دروازے پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں بہنیں ساکت تھیں اور سو رہی تھیں۔

کوٹھری کے قریب وہ کمرا تھا، جہاں اماں سوتی تھیں۔ کوٹھری میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اماں کے کمرے میں جھانکا۔ ظاہری آثار بتاتے تھے کہ اماں بھی بے خبر سو رہی ہیں۔ لیکن اسے سب سے زیادہ ڈر اماں سے ہی تھا۔ اماں کی نیند بہت کچی تھی۔ ذرا سے کھٹکے پر اٹھ جاتی تھیں۔

بہر حال وہ پلٹی اور کوٹھری میں داخل ہوئی۔ گھر کا تمام فاضل سامان کوٹھری میں ہی رکھا جاتا تھا۔ وہ اس طرف بڑھی، جہاں صندوق رکھے تھے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ روشنی کی ضرورت ہے۔ وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں گئی اور لیمپ اٹھا لائی۔ کوٹھری میں اس نے لیمپ روشن کیا۔ روشنی کوٹھری سے باہر جا رہی تھی۔ اس لیے اس نے کوٹھری کا دروازہ بھیڑ دیا۔

وہ اوپر تلے تین ٹرنک تھے۔ سب سے نیچے سب سے بڑا اور سب سے چھوٹا اوپر۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی مطلوبہ چیز اوپر والے ٹرنک میں ہی مل جائے گی۔ اس نے لیمپ ایک اونچی جگہ پر رکھ دیا اور اوپر والا ٹرنک کھولا۔

ٹرنک کھولتے ہی اس کا دل خوش ہو گیا۔ اس کی مطلوبہ چیز اوپر ہی موجود تھی۔

اماں نے وہ درجن بھر جوڑے ترتیب اور سلیقے سے رکھے تھے۔ اوپر صرف کرتے تھے اور کرتوں کے نیچے پائجامے۔ اس نے اوپر والے کرتے کو غور سے دیکھا اور چھوا۔ وہ اس کے ہاتھ کا کاڑھا ہوا نہیں تھا۔ اماں نے شاید کرتے اس طرح سے رکھے تھے کہ جس کرتے پر سب سے آخر میں استری کی تھی، وہ سب سے اوپر تھا۔ اور اسے یاد تھا کہ اماں نے سب سے پہلے اس کا کاڑھا ہوا کرتا استری کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کرتا سب سے نیچے ہوگا۔

اس نے بڑی آہستگی اور احتیاط سے ایک ایک کرتا اٹھایا اور دیکھا۔ اپنی کڑھائی کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس کا کاڑھا ہوا کرتا سب سے نیچے تھا۔

اس نے وہ کرتا نکال لیا اور باقی کرتوں کو دوبارہ سلیقے سے ٹرنک میں رکھ دیا۔ ایسے کہ وہ ذرا بھی نہ مسکیں۔

اپنا کاڑھا ہوا کرتا اپنے کندھے پر ڈال کر اس نے آہستگی سے ٹرنک بند کیا، لیمپ بجھایا اور کوٹھری سے نکل آئی۔ اس نے اماں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بدستور بے خبر، اسی کروٹ سو رہی تھیں۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے اس کرتے کو کھولا اور اپنے اوپر چادر کی طرح پھیلا لیا۔ یہ کرتا میں نے کتنی محبت سے کاڑھا ہے چھوٹے ٹھاکر کے لیے۔ اس نے سوچا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ محبت اس تک پہنچ جائے گی۔ لیکن اب رات بھر یہ کرتا میرے ساتھ رہے گا تو میری محبت کی خوشبو اس میں اس طرح بس جائے گی کہ کبھی بھی نہیں مٹے گی۔ وہ وارفتگی سے سوچ رہی تھی۔ اس کرتے میں اب میرے جسم کی خوشبو بھی ہوگی۔ اس خیال سے وہ شرما گئی۔

وہ کرتا اس کے پاس رات بھر کا مہمان تھا۔ کل اماں اسے دوسرے کرتوں کے ساتھ چھوٹے ٹھاکر کو دے آئیں گی اور کون جانے کہ اس کی محبت کی سچائی کی وجہ سے، اس کی خوشبو کی وجہ سے چھوٹا ٹھاکر سب سے پہلے اسے ہی پہنے۔ کیا پتا، وہ یہ کرتا کل ہی پہنے اور کسی طرح اسے دیکھنے کا موقع بھی مل جائے۔ کیسا لگے گا وہ اس کرتے میں...... جیسے مغل شہزادہ! اس کے کانوں میں اماں کے الفاظ گونجے۔

اس خیال نے اسے تصور کی دنیا میں پہنچا دیا، جہاں وہ چھوٹے ٹھاکر کو یہ کرتا پہنے دیکھ سکتی تھی اور دیکھ رہی تھی۔

اس تصور سے کھیلتے کھیلتے نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ نیند پلکوں پر بوجھ بن گئی تھی۔ اچانک اس خیال نے اسے چونکا دیا کہ لیمپ تو وہ کوٹھری میں ہی بھول آئی ہے۔

اس نے سوچا کہ کوٹھری میں جائے اور لیمپ اٹھا لائے۔ لیکن نیند کا غلبہ اس قدر تھا کہ اس میں ہلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ اس نے بے پروائی سے سوچا۔ چھوڑو...... صبح دیکھا جائے گا۔ ویسے بھی مجھے تو صبح سب سے پہلے اٹھنا ہے۔ اگر کسی نے مجھے یہ کرتا اوڑھے ہوئے دیکھ لیا تو......؟ نہیں...... مجھے سب سے پہلے جاگنا ہے اور جا کر اس کرتے کو ٹرنک میں رکھنا ہے۔ تب لیمپ بھی لا کر یہاں رکھ دوں گی۔

اے اللہ...... صبح سب سے پہلے مجھے جگا دیجیے گا۔ اس نے بڑے خشوع و خضوع سے اللہ سے دعا کی۔ میری محبت کا پردہ رکھ لیجیے گا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ اس کی دعا اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو گئی ہے!

❁......❁......❁

بہادر علی نے دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی سیدھی کر کے بچھائی اور ملحقہ کوٹھری میں چلا گیا۔ وہاں اس کا بستر تھا۔ اس کا صندوق تھا، جس میں اس کے کپڑے اور دوسری چیزیں ہوتی تھیں۔ وہ گدا اور چادر لے کر آیا اور چارپائی پر بستر بچھایا۔ پھر وہ تکیہ لے کر آیا۔ اس کے بعد اس نے سریے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ رات کو سونے سے پہلے سریا سرہانے رکھنا وہ کبھی نہیں بھولتا تھا۔ نجانے کب ضرورت پڑ جائے۔

مگر سریا ڈیوڑھی میں نہیں تھا۔ صبح سویرے اٹھنے والا بہادر علی نیند سے بے حال ہو رہا تھا۔ لیکن سریا سرہانے رکھے بغیر تو اسے نیند بھی نہ آتی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ بس اب بستر پر گر جائے۔ لیکن وہ اٹھ کر کوٹھری میں گیا۔ سریا وہاں موجود تھا۔ وہ اسے لایا اور تکیے کے نیچے رکھ کر بستر پر دراز ہو گیا۔

چند لمحوں میں اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ مگر اسے خیال آیا کہ اس نے دعا نہیں مانگی۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا دامن پھیلایا اور دعا کرنے لگا۔

''اے اللہ...... عمر بھر اس ڈیوڑھی کا نمک کھایا ہے۔ نمک حرامی سے بچا لینا اے مالک۔ اے اللہ، تو ہی حفاظت کرنے والا ہے کمزوروں کی۔ اور موت کا وقت بھی تو ہی مقرر کرتا ہے۔ میری دعا ہے اے رب کہ میرے جیتے جی کوئی بری نیت سے اس ڈیوڑھی کو نہ پھلانگ پائے۔''

یہ دعا وہ ہر رات کرتا تھا۔ وہ ان وفادار ملازموں میں سے تھا، جو جان کو مالک کا قرض سمجھتے ہیں اور یہاں تو گھر کا مالک مر چکا تھا۔ اب اس کی بیوہ اور بچیوں کی حفاظت اس کی ذمے داری تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ کوئی حملہ ہوا تو وہ جان دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکے گا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا رب اس کے ساتھ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر حفاظت کرنے والا ہے۔ اور جب اس نے [illegible] چھوٹے ٹھاکر کو پہرہ دیتے دیکھا تھا تو اس کا دل اور مطمئن ہو گیا

تھا۔ اللہ نے اسے زمین پر بھی اکیلا نہیں رہنے دیا تھا۔ اس گھر کا ایک اور محافظ بنا دیا تھا۔

دعا کرتے کرتے اسے نیند آ گئی!

❁......❁......❁

اوتار سنگھ چتا کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا!

اس کے ذہن میں سوچوں کا اژدہام تھا۔ چند گھنٹے پہلے ایک زندگی اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ اور اس وقت وہ وجود جل رہا تھا، مٹ رہا تھا، جو نصف صدی سے زائد عرصے تک ایک حقیقت رہا تھا۔ آج کے بعد وہ ایک گزری ہوئی داستان ہوگا۔ ماسٹر جی کا وجود، ان کا سراپا صرف پیچھے رہ جانے والوں کے تصور میں رہے گا...... ان کی یادوں میں رہے گا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ ماسٹر جی کا عرصہ امتحان پورا ہو چکا ہے۔ اب امتحانی پرچا ان کے ہاتھ سے لیا جا چکا ہے۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ بہت عرصے کے بعد اسے وہ کتابیں یاد آئیں، جن میں اس نے جنت دوزخ کا احوال پڑھا تھا۔ اس کتاب میں قبر کا حال بھی دیا گیا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ اس کی ماتا کی تو چتا جلائی گئی تھی۔ چنانچہ وہ اس تفتیش سے بچ نکلی ہوں گی۔ مگر اس وقت ماسٹر جی کو راکھ میں تبدیل ہونے کے عمل سے گزرتا دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اس کی وہ سوچ بے حد احمقانہ تھی۔ حساب کتاب ہونا ہے تو حساب کتاب ہوگا۔

اس نے سوچا کہ جو ہستی ایسی قدرت والی ہے کہ مرنے کے بعد بھی ہر انسان کو...... زمانہ آغاز سے لے کر لمحۂ آخر تک روئے زمین پر پیدا ہونے اور مرنے والے ہر انسان کو دوبارہ زندہ کر دے، اس سے کون بچ سکتا ہے۔ اس کا بنایا ہوا ہر قانون اٹل، اس کا قائم کیا ہوا ہر نظام مسلسل۔ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ موت بھی تو اس کے حکم سے آتی ہے۔ اب کوئی شخص ریل کے نیچے کٹ کر مر جاتا ہے...... ایسے کہ اس کا جسم بوٹی بوٹی ہو جاتا ہے تو وہ اس کے نظام سے بچ تو نہیں سکتا۔ جواب دہی تو سبھی کو کرنی ہے نا۔

مگر کیسے؟ اس نے سوچا۔

اگلے ہی لمحے جواب اس کے ذہن میں اُبھرا۔ جو قیامت کے دن مردوں کو، جن کے وجود کا کچھ بھی نہیں بچا ہوگا...... ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہوں گی، دوبارہ زندہ کر سکتا ہے تو وہ مرنے کے فوراً بعد بھی آدمی کو یکجا کر دیتا ہوگا...... سوال جواب کے لیے۔ یہ تو زیادہ آسان ہے بہ نسبت ہزار سال بعد اسے زندہ کرنے کے۔

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ بلکہ قیاس کے زور پر وہ اپنے تئیں بہت کچھ سمجھ گیا۔ مرتے وقت چاہے آدمی کا پورا وجود مٹ گیا ہو، اللہ اسے یکجا کرتا ہے اور کسی مقام پر اس کا حساب کرتا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ موت آتما کے شریر سے چلے جانے کا نام ہے۔ لیکن سوال جواب کے اس مرحلے سے گزارنے کے لیے اللہ آتما کو دوبارہ شریر میں لے آتا ہوگا اور تفتیش مکمل ہونے کے بعد آتما پھر چلی جاتی ہوگی۔ اور آتما شریر میں دوبارہ اس وقت آتی ہوگی، جب شریر دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہوگا۔ وہ چاہے جلانے کے نتیجے میں ہو یا تدفین کے نتیجے میں۔

پھر اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ممکن ہے، اللہ نے ہر آدمی کی ایک قبر بھی مقرر کی ہو۔ آدمی کسی طرح بھی مرے اور مرنے کے بعد اسے جلائیں یا دفن کریں، وہ اپنی اس قبر میں کچھ دیر سوال جواب کے مرحلوں سے ضرور گزرتا ہوگا۔ ورنہ جو آدمی سمندر میں ڈوب کر مر جائے اور اس کی لاش بھی نہ ملے، ظاہر دار لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ وہ سوال جواب کے مرحلوں سے بچ گیا۔ لیکن اللہ کا فرمان ہے کہ یہ مرحلہ ہر آدمی کے لیے ہے تو یہ اٹل ہے۔

وہ یہ سوچتا رہا۔ لیکن پنڈت نے اسے چونکا دیا۔ ''یہ لو بالک۔''

اس نے چونک کر پنڈت کو دیکھا۔ وہ ایک ہانڈی اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ ''یہ کیا ہے مہاراج؟'' اس نے پوچھا۔

پنڈت کی نگاہوں میں ایک لمحے کو ملامت ابھری۔ مگر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ ''یہ راکھ ہے تمھارے پتا کی۔''

ہانڈی کے منہ پر لال کپڑا بندھا تھا۔ اوتار سنگھ نے وہ ہانڈی لے لی۔ پنڈت نے کپڑے کا ایک خاصا بڑا تھیلا بھی اسے دیا۔ اس میں ارتھی کے پھول اور کچھ دوسری چیزیں بھی تھیں۔ اس نے وہ تھیلا بھی لے لیا۔

اسپتال کا حساب اس نے پہلے ہی صاف کر دیا تھا۔ نچلے اسٹاف میں جتنے لوگوں کا بھی ماسٹر جی سے تعلق رہا تھا اور جنھوں نے ماسٹر جی کی خدمت کی تھی، ان سب کو وہ انعام دے کر آیا تھا۔ اب تو بس واپسی کا مرحلہ تھا۔

اس نے تھیلے اور ہانڈی کو اپنے بیگ میں رکھا اور لاری اڈے کی طرف چل دیا۔ خوش قسمتی اس کے ساتھ تھی۔ لاری کی روانگی میں تو ابھی وقت تھا۔ لیکن اسے ایک پرائیویٹ کار نظر آ گئی۔

''کہاں جانا ہے بابو جی؟'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اس سے پوچھا۔

وہ یقیناً کسی کی ذاتی گاڑی چلانے والا تھا۔ اور اس وقت گاڑی اس کے پاس تھی۔ وہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر کچھ کما لینا چاہتا تھا۔

''مجھے دہلی جانا ہے۔''

''تو میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو گاڑی کے مقابلے میں مہنگا تو پڑے گا۔ لیکن میں آپ کو اس کے مقابلے میں بہت جلدی پہنچا دوں گا۔''

اوتار سنگھ کے لیے وہ پیشکش بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ تو اس وقت اڑ کر دہلی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پیسے کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

ڈرائیور نے باہر نکل کر اس کے لیے عقبی نشست کا دروازہ کھولا۔ اس نے اپنا بیگ رکھا اور پھر خود اندر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالی۔ ''آپ نے یہ نہیں پوچھا صاحب کہ میں کیا لوں گا؟''

''اس کی مجھے پروا نہیں۔ تم مجھے جلد سے جلد دہلی پہنچا دو۔ جو تم مانگو گے، میں اس سے زیادہ ہی دوں گا۔''

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی!

❀......❀......❀

یہی وہ وقت تھا کہ اٹھارہ بیس افراد کا وہ گروہ اس گلی میں داخل ہوا، جہاں سرفراز بیگم کا مکان تھا۔ جو شخص سب سے آگے تھا، اس نے گلی میں داخل ہوتے ہی منہ پر ڈھاٹا باندھ لیا۔ وہ اس گروہ کا سرغنہ تھا۔

''یہ کیا؟'' اس کے ایک ساتھی نے اعتراض کیا۔ ''کیا تمھیں ڈر ہے کہ کوئی تمھیں پہچان لے گا؟''

سرغنے کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے یہ سوال پسند نہیں آیا ہے۔ ''یہی سمجھ لو۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔'' لہجے میں بے پروائی تھی۔

''کوئی زندہ بچے گا تو پہچانے گا نا۔'' اس کے ایک اور ساتھی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

سرغنے نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تو وہ سب گلی کے سرے پر ہی رک گئے۔ ''میری بات غور سے سن لو۔'' سرغنے نے کہا۔ ''اب کوئی زور سے نہیں بولے گا۔ بات کرنے کی تو ضرورت نہیں۔ ضروری ہو تو آہستہ بولو۔''

''تو کیا ہم ڈرتے ہیں؟'' کسی نے اعتراض کیا۔

سرغنے کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک نظر آئی۔ ''یہ سیاست ہے۔ وقت آنے والا ہے کہ ہم کھل کر بھی کام کریں گے۔'' وہ کہتے کہتے رکا اور چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''اب پہلا کام یہ ہے کہ گلی میں جتنے بھی دروازے ہیں، سب کو باہر سے بند کر دو۔''

اس کی ہدایت پر عمل کیا جانے لگا۔ گلی میں کھلنے والے تمام دروازوں کی کنڈیاں باہر سے بند کر دی گئیں۔

وہ تمام افراد مسلح تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں بلم تھے۔ جو خالی ہاتھ نظر آ رہے تھے، وہ بھی مسلح تھے۔ ان کے پاس خنجر اور کرپانیں تھیں۔

تمام دروازے بند کر دیے گئے۔

اب وہ لوگ سرفراز بیگم کے مکان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ''یہی گھر ہے نا؟'' کسی نے پوچھا۔

''سرغنے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہاں لڑکیاں بھی ہیں نا؟'' کسی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔''

''مزہ آ جائے گا۔'' ایک اور چٹخارہ لیتے ہوئے بولا۔

سرغنہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے برابر والے دروازے کو غور سے دیکھا۔ وہ اسی مکان کے اوپری زینے کا دروازہ تھا۔ اس دروازے کو بند نہیں کیا گیا تھا۔ ''یہ دروازہ بھی بند کر دو۔'' اس نے کہا۔

''اسے بند کرنے کی کیا ضرورت ہے گرو۔ یہاں تو ہم دھاوا بولنے والے ہیں۔''

''جیسا میں کہتا ہوں، ویسا ہی کرو بے وقوف۔'' سرغنے نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ اوپر والوں کا دروازہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس طرف سے کوئی مداخلت ہو۔ وہ ہیں تو ہندو۔ مگر مُسلوں کے ہمدرد ہیں۔''

وہ دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔

''دروازہ کھٹکھٹائیں؟'' کسی نے پوچھا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے بے وقوف۔'' سرغنے نے جھنجلا کر کہا۔ ''بلّم استعمال کرو اور دروازہ توڑ دو۔''

دو بلم والے آگے بڑھ آئے۔ باقی سب لوگ دروازے سے ہٹ گئے۔

❀......❀......❀

رنجنا چائے لے کر کوٹھے پر پہنچی تو رگھو کوٹھے پر ٹہل رہا تھا۔ ''ارے...... تم ٹہلے جا رہے ہو۔ تھکے نہیں؟'' رنجنا نے کہا۔

حقیقت یہ تھی کہ رگھو تھک گیا تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ مالک بھی تو ٹہلتے رہتے ہیں۔

''تھک تو گیا ہوں۔''

''تو بیٹھ جاؤ۔ چائے پی لو۔''

رگھو بیٹھ گیا اور چائے کی پیالی لے لی۔

''یہ بتاؤ۔ ٹہلنے سے کیا فائدہ؟'' رنجنا نے کہا۔

''مجھے کیا پتا۔ پر چھوٹے ٹھاکر ٹہلتے ہیں تو کچھ فائدہ ہوگا ہی۔'' رگھو نے چائے کا

گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میں اور تو مالک کی طرح بدھی مان تو نہیں ہیں نا۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔"

دونوں بیٹھے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ رگھو چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ پھر اس نے خالی پیالی نیچے رکھ دی۔

وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ رنجنا نے کہا۔ "اب پھر کھڑے ہو رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"بیٹھو کچھ دیر۔ تھوڑی دیر سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

رگھو بیٹھ گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب نیچے بند دروازے پر بلموں کی پہلی ضرب پڑی۔

وہ آواز سن کر رگھو تڑپ کر اٹھا۔ "کون ہے نیچے؟" وہ چلایا اور ساتھ ہی وہ دیوار کی طرف لپکا۔ اس نے باہر جھانکا۔ وہاں اسے بڑی تعداد میں لوگ نظر آئے۔ وہ بلموں سے دروازے پر ضربیں لگا رہے تھے۔

"کون ہو تم لوگ؟ کیا کر رہے ہو؟" رگھو نے انہیں للکارا۔

ان میں سے ایک نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا تھا۔ "ڈاکو ہیں...... اور دروازہ توڑ رہے ہیں۔" اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

رنجنا بھی رگھو کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی اور نیچے دیکھ رہی تھی۔ "ہائے رام......" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

رگھو اس طرف لپکا، جہاں چھوٹے ٹھاکر کی لاٹھی تھی۔ اس نے لاٹھی اٹھائی اور رنجنا کی طرف دیکھا۔ "تم نیچے نہیں آنا۔"

رنجنا نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ "وہ اتنے لوگ ہیں۔ تم اکیلے کیا کرو گے۔ مت جاؤ رگھو۔"

"ہٹ جا۔" رگھو نے اسے جھٹک دیا۔ "میں وہی کروں گا جو چھوٹے ٹھاکر ہوتے تو کرتے۔"

لیکن رنجنا نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم انہیں نہیں بچا سکتے۔"

"دو چار کو مار کے مر تو سکتا ہوں۔ مالک کو وچن دیا تھا میں نے۔ کیا اب بزدلوں کی طرح منہ کالا کر کے بیٹھ جاؤں۔ کیا منہ دکھاؤں گا مالک کو۔ مجھے جانے دے۔"

وچن کا سنتے ہی رنجنا نے جھرجھری لی اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "تو میں بھی چلوں گی

تمہارے ساتھ۔"

رگھو نے بحث نہیں کی۔ وہ زینے کی طرف لپکا۔ رنجنا اس کے پیچھے تھی۔

رگھو نے نیچے اتر کر باہر کھلنے والے دروازے کی چٹخنی کھولی اور دروازے کو کھینچا۔ مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے نیچے کے گھر میں کھلنے والے بغلی دروازے کو آزمایا۔ مگر وہ بھی دوسری طرف سے بند تھا۔

باہر سے سنائی دینے والی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھر کا دروازہ توڑ دیا گیا ہے اور حملہ آور اندر گھس گئے ہیں۔

رگھو لاٹھی سے کبھی ایک دروازے پر ضرب لگاتا اور کبھی دوسرے دروازے پر۔ لیکن وہ ایسے کھلنے والے نہیں تھے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اوپر لپکا۔ "کہاں جا رہے ہو؟" رنجنا نے پکارا۔

"دروازے کو توڑنے کے لیے کچھ لاتا ہے۔" رگھو نے پلٹ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔

❁......❁......❁

بہادر علی کی آنکھ اس احساس سے کھلی تھی کہ باہر سے آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ گہری نیند سے اٹھا تھا۔ چند لمحے تو وہ بستر پر لیٹا رہا۔ آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ باہر کئی افراد تھے اور وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

پہلے تو بہادر علی نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ لیکن پھر خطرے کے احساس نے اسے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر باہر سے ایسی ضرب لگائی گئی کہ دروازہ ہل کر رہ گیا۔

اضطراری طور پر بہادر علی کو پوچھنا چاہیے تھا...... للکارنا چاہیے تھا...... کون ہے۔ لیکن خطرے کے احساس نے اس کی تمام حسوں کو مہمیز کر دیا تھا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ یہ سوال بے معنی تھا...... مہمل تھا۔ یہاں تو دروازہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اگر دروازے پر دستک دی گئی ہوتی تب بھی وہ اس سوال کو بے معنی اور مہمل ہی سمجھتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کس نیت سے آئے ہیں۔

بہادر علی کو کافی دن سے یہ خوف تھا...... یہ خدشہ اسے ستا رہا تھا۔ وہ سوچتا کہ جب ایسا ہوگا تو اس کا کیا حال ہوگا۔ وہ گھبرائے گا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جائے گی۔ لیکن خدشہ حقیقت بن کر سامنے آیا تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اتنا پرسکون تھا کہ اسے خود بھی اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی۔

دروازے پر دوسری ضرب لگی تو وہ تکیے کے نیچے سے سریا نکال چکا تھا۔ سریا اٹھا کر وہ

خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کی ایک جانب دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ سریا اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام کر سر سے اوپر اٹھا رکھا تھا۔ چل بہادر علی...... حق نمک ادا کرنے کا وقت آ گیا۔ اس نے خود سے کہا۔

وہ جانتا تھا کہ حملہ آور تعداد میں زیادہ ہوں گے۔ ایسے ہی للکارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے لیے تو بہتر یہی ہے کہ حملہ آوروں کو اس کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہو۔ ان پر اچانک حملہ کر کے وہ ان میں ابتری پھیلا سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ کو ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ ورنہ للکارنے میں تو اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا...... سوائے موت کے! وہ بہت حقیقت پسند بن کر سوچ رہا تھا۔ اللہ کی مشیت اس کے حق میں ہو اور اللہ کی خاص مدد آ جائے تو اور بات ہے۔ ورنہ اس کے سامنے تو بس یہی راستہ تھا کہ ان پر حملہ کرے اور انہیں بساط بھر نقصان پہنچا کر انہیں اندر گھسنے سے روکے۔ یہ وہ اللہ سے دعا ہی کر سکتا تھا کہ ان کے اندر گھسنے سے پہلے اسے موت آ جائے۔ جو کچھ ہوتا ہے، اس کے جیتے جی نہ ہو۔

چوتھی پانچویں ضرب میں بلم دروازے کی لکڑی کو چیرتے ہوئے اندر آئے۔ وہ دیوار سے چپکا سانس روکے کھڑا رہا۔ مزید ضربوں کے نتیجے میں دروازے میں خاصا بڑا موکھا سا بن گیا۔ اس میں سے ایک ہاتھ اندر آیا، جس نے ٹٹول کر چٹخنی ہٹا دی۔

دروازہ کھلا اور جیسے ہی پہلا آدمی اندر آیا، بہادر علی نے پوری قوت سے سریا اس کے سر پر دے مارا۔ وہ آدمی گرا۔ لیکن اس کے پیچھے دو آدمی اور اندر آئے تھے۔ پہلے آدمی کا حشر دیکھ کر وہ بڑی پھرتی سے دائیں بائیں ہو کر اندر لپکے۔ جو بہادر علی کے قریب تھا، بہادر علی نے اس کی کمر پر سریے کا وار کیا اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

بہادر علی دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ مگر وہ اس سے بہت دور تھا۔ اور اتنی دیر میں اور حملہ آور بھی اندر آ گئے تھے۔

اب وہ کھلی جنگ تھی۔ بہادر علی نے فلک شگاف آواز میں نعرۂ تکبیر بلند کیا اور سریے کو اندھا دھند گھمانا شروع کیا۔ لیکن بلموں کی وجہ سے اسے پسپا ہونا پڑ رہا تھا۔ وہ دیوار سے جا لگا۔ اب سریا گھمانے کے لیے اس کے پاس زیادہ جگہ نہیں تھی اور وہ سب ایک ساتھ اس پر یلغار کر رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ ان میں سے دو اور کافروں کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ یہ جئیں گے یا مریں گے۔ بہر حال میں چار کو ضرب لگا چکا ہوں۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

اسی وقت اس کے پیٹ میں ایک بلم لگا۔ اس نے سریے کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا اور گھماتا رہا۔ دوسرا بلم اس کے سینے سے ٹکرایا تو سریا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ دیوار سے ٹک کر بیٹھتا گیا۔ حیرت ہے، مجھے تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔ اس نے سوچا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ چار افراد اسے گھیرے کھڑے تھے۔ دوسرے اندر کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''میری عزت رکھ لے میرے معبود۔'' اس نے زیر لب اپنے رب کو پکارا۔ ''میں نے ہمیشہ یہی دعا کی ہے کہ میرے جیتے جی کوئی بدنیت اس ڈیوڑھی کو نہ پھلانگے۔''

''ہاں بھئی مُسلے...... پاکستان جائے گا؟'' کوئی اس سے پوچھ رہا تھا۔

دوسری طرف گھر میں کھلنے والے دروازے پر ضربیں پڑ رہی تھیں۔ اندر سے چھمن بوا اور بڑی بیگم کے چیخنے...... مدد کے لیے پکارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

بہادر علی نے بولنے کی کوشش کی تو اس کے منہ سے خون ابل پڑا۔ تکلیف اسے اب بھی نہیں ہو رہی تھی۔ ''پاکستان زندہ باد......'' اس نے ٹوٹتی نحیف آواز میں کہا۔

''جے واہ گرو کی۔'' سکھ نے نعرہ لگایا اور اس کی کرپان حرکت میں آئی۔

بہادر علی کی گردن سے خون کا خوارہ بلند ہوا۔ اے اللہ...... کلمہ نصیب فرما دے۔ اس نے دل میں دعا کی۔ اس کے لب ہلے...... لا الہ...... الا اللہ...... خون کے بلبلے اس کے لبوں پر بن رہے تھے، پھوٹ رہے تھے۔ ایک لمحے ہونٹ بے آواز ہلے...... پھر صاف اور واضح آواز...... محمد الرسول اللہ اور خون کا ایک بڑا بلبلہ اس کے ہونٹوں پر ساکت ہو گیا۔

اندر گھر میں کھلنے والا دروازہ ٹوٹا تو بہادر علی اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر چکا تھا۔ اللہ نے اس کی عزت رکھ لی تھی!

❀......❀......❀

رگھو بولایا بولایا پورے گھر میں پھر رہا تھا۔ اسے ایسی کوئی چیز نہیں مل رہی تھی، جو دروازہ توڑنے میں مدد کرتی۔

رنجنا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

رگھو دوبارہ رسوئی میں چلا آیا۔ ''کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔''

''کچھ بتاؤ تو۔ کس طرح کی چیز؟''

''کلہاڑی ہو، کدال ہو، کوئی آری ہو۔''

''ایسی تو کوئی چیز گھر میں ہے نہیں۔''

رگھو جھنجلا گیا۔ وہ بار بار ہاتھ مل رہا تھا۔ ''کیا کروں میں؟'' پھر اس نے لپک کر بڑی، لمبی چھری اٹھائی، جو سبزی کاٹنے کے کام آتی تھی۔

''اس کا کیا کرو گے؟'' رنجنا نے گھبرا کر پوچھا۔

''دروازہ کاٹنے کی کوشش کروں گا۔''

"اس سے کچھ نہیں ہوگا۔"

رگھو نے سل کے پاس رکھا ہوا بٹا اٹھالیا۔ "کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔"

دونوں چیزیں لے کر وہ پھر زینے پر لپکا۔ رنجنا اس کے پیچھے تھی۔ رگھو کی لاٹھی وہیں دروازے کے پاس پڑی تھی۔

رگھو نے باہر والے دروازے پر مناسب جگہ تلاش کر کے وہاں چھری رکھی اور بٹے سے اس کے دستے پر ضربیں لگا کر اسے دروازے میں پیوست کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ذرا دیر میں ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس دروازے کی لکڑی بہت مضبوط ہے۔ ایک طرف تو چھری کی نوک کند ہونے لگی۔ دوسری طرف چھری کا دستہ ٹوٹ گیا اور دھات نمودار ہوگئی۔

مزید کچھ کوشش کے نتیجے میں دروازے سے لکڑی کی کچھ کھپچیاں ٹوٹ کر اڑیں۔

رگھو نے ہاتھ روک لیا۔ وہ مایوس ہوگیا تھا۔ اس نے نیچے کے گھر میں کھلنے والے دروازے کو دیکھا۔ باہر کے دروازے کی نسبت وہ آسان ہدف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اس دروازے پر کوشش شروع کر دی۔

اس کوشش میں اس کے ہاتھ زخمی ہوگئے۔ کئی بار چھری پھسل کر اس کے ہاتھ پر لگی۔

"ہے بھگوان۔ تمہارا ہاتھ گھائل ہوگیا ہے۔" رنجنا نے پریشان ہو کر کہا۔ "چھوڑو نا۔ اس طرح دروازہ نہیں کھلے گا۔"

رگھو نے اپنے زخمی ہاتھ سے بہتا ہوا خون اپنی قمیص پر پونچھا اور جھنجلا کر بولا۔ "تو کیا کروں؟"

"کچھ اور سوچو۔"

اسی وقت دروازے کی دوسری طرف سے ایک دل دوز نسوانی چیخ سنائی دی۔ رگھو پھر چھری لے کر دروازے پر پل پڑا۔

❁....❁....❁

نیچے سب سے پہلے چھمن بوا کی آنکھ کھلی تھی اور اس کا سبب دروازے پر پڑنے والی ضربیں تھیں۔ وہ چونک کر اٹھیں۔ ان کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ اٹھنے سے پہلے ہی ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ بات کیا ہے کیونکہ وہ خوف تو انھیں ہر روز ستاتا تھا۔ آج وہ خوف حقیقت میں بدل گیا تھا۔

جاگتے ہی وہ تیزی سے بڑی بیگم کو جگانے کے لیے لپکیں۔

لیکن سرفراز بیگم پہلے ہی جاگ چکی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ یہی بات انھوں نے چھمن بوا سے پوچھی۔

"ہہ......ہہ......حملہ......بب......بڑی بیگم" چھمن بوا کی آواز بری طرح لرز رہی تھیں۔

سرفراز بیگم یوں بستر سے اٹھیں، جیسے کرنٹ لگا ہو۔ "بچیاں! بچیوں کو کہیں چھپانا ہے۔" وہ بولیں۔

دونوں اندر کی طرف بھاگیں۔ دونوں پوری جان سے کانپ رہی تھیں۔ چھمن بوا باورچی خانے میں گھس گئیں اور سرفراز بیگم بچیوں کے کمرے کی طرف چل دیں۔

کمرے میں نور بانو جاگ چکی تھی۔ مگر نیند میں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، یہ آواز کیسی ہے اور وہ کیوں جاگی ہے؟

سرفراز بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ "جلدی سے اٹھو اور کہیں چھپ جاؤ۔" سرفراز بیگم نے اس سے کہا۔

"کیا ہوا ہے اماں؟"

"یہ سب بتانے کا وقت نہیں ہے۔" سرفراز بیگم نے لرزتی آواز میں کہا۔ "بہنوں کو اٹھاؤ اور کہیں ایسی جگہ چھپ جاؤ، جہاں ظالم تمھیں نہ دیکھ سکیں۔ جلدی کرو میری بچی۔" وہ رونے لگیں۔ "اے اللہ ...... تو ہی حفاظت کرنے والا ہے۔"

نور بانو اپنے برابر لیٹی ہوئی گلنار کو جھنجوڑنے لگی۔ "اٹھ جاؤ گلنار۔ جلدی کرو۔"

سرفراز بیگم نے حور بانو کو جھنجوڑ ڈالا۔

آخر تمام بچیاں اٹھ گئیں۔ حور بانو خود کو رضائی میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کے جسم پر چھوٹے ٹھاکر کا کرتا تھا۔ عجیب بات تھی کہ وہ زندگی اور موت کے اس کھیل میں زندگی بچانے کی فکر کرنے کے بجائے اس فکر میں تھی کہ اس کی خاموش محبت کا راز نہ کھل جائے۔

اس نے سوتے وقت اللہ سے پردہ رکھنے کی دعا کی تھی اور وہ دعا قبول ہوگئی تھی۔ وہ سب سے پہلے تو نہیں اٹھ سکی تھی۔ لیکن وہ لوگ جس صورتِ حال میں جاگے تھے، اس میں کس کو یہ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی کہ کون کس حال میں ہے۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ اس کے جسم پر چھوٹے ٹھاکر کا ایک کرتا چادر کی طرح پڑا ہے۔

"اٹھو تم لوگ جلدی جلدی کہیں چھپ جاؤ۔" سرفراز بیگم کے لہجے میں وحشت تھی۔

"کہاں چھپیں اماں؟"

"جہاں تمہارا دل گواہی دے کہ تم محفوظ ہو۔ لیکن الگ الگ چھپنا۔" سرفراز بیگم نے کہا اور باہر کی طرف لپکیں۔ بچیوں کو اس حال میں چھوڑ کر باہر جانے کو ان کا دل تو نہیں مان رہا تھا۔ لیکن وہ بچیوں کے پاس رہتیں تو ان کے لیے نقصان کا باعث ہی بنتیں۔ اگر وہ اپنی آنکھوں سے بچیوں کو کسی محفوظ جگہ پر چھپا ہوا دیکھ لیتیں تو ان کے دل کو سکون ہو جاتا۔ لیکن اتنی مہلت ان کے پاس نہیں تھی۔ باہر دروازے پر پڑنے والی ضربوں سے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ دروازہ کسی بھی لمحے

ٹوٹ جائے گا۔ اور یہ ضروری تھا کہ دروازہ ٹوٹے تو وہ وہاں موجود ہوں۔ اس طرح وہ اپنی بچیوں کے لیے تھوڑی سی مہلت کما سکتی تھیں۔

"جلدی کرو تم لوگ۔ فوراً چھپ جاؤ۔ اللہ تمھاری حفاظت فرمائے۔" سرفراز بیگم نے کہا اور دل میں کلمہ طیبہ کا ورد کرتی ہوئی باہر نکلیں۔

بچیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کوٹھری کی طرف بڑھیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ یہی سوچ رہی تھیں کہ کاش اماں انھیں چھپنے کی جگہ بھی بتا دیتیں۔ ان کی ٹانگیں ان کے جسم کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہی تھیں۔ ان کے جسم سوکھے پتوں کی طرح لرز رہے تھے۔

جس خوف سے وہ نڈھال تھیں، اس کی نوعیت کا انھیں ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ انھیں کس طرح کا خطرہ لاحق ہے!

❀......❀......❀

حملہ آور دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے انھیں چھمن بوا نظر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں چھری تھی۔ لیکن جسم پر لرزہ طاری تھا۔

سرغنہ سب سے آگے تھا۔ چھمن بوا کو دیکھ کر وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ "تم لوگ بھی وہی دیکھ رہے ہو جو مجھے نظر آ رہا ہے۔" اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

اس کے ساتھی بھی قہقہے لگانے لگے۔ "ہاں گرو۔ اب اس بڑھیا سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔"
چھمن بوا کے ہاتھ سے چھری چھوٹ گئی۔ اسی لمحے ایک بلم ان کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

یہ وہ لمحہ تھا، جب سرفراز بیگم صحن میں نکل کر آئیں۔ "کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" انھوں نے باوقار لہجے میں کہا۔ لیکن ان کی آواز لرز رہی تھی۔

"بتانے سے کیا ہوگا؟" سرغنے نے جواب میں سوال کیا۔

"تم جو چاہو گے مل جائے گا۔ بس جان اور عزت کی امان دے دو ہمیں۔"

"تمھارے احسان کی ضرورت نہیں۔ وہ تو ہمیں یوں بھی مل جائے گا۔" سرغنہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ "کون روک سکتا ہے ہمیں۔"

"میں نے کہا نا کہ جان اور عزت کی امان دے دو ہمیں۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ یہ دونوں چیزیں تمھیں نہیں مل سکتیں تو؟"

"تو میں یہ کہوں گی کہ صرف عزت کی امان دے دو۔ بے شک مجھ سے زندگی چھین لو۔"

سرغنہ پھر ہنسنے لگا۔ "ہاں جیون تو تمھارا پاکستان کے لیے ہے۔ وہ تو تم خوشی سے دے دو گی۔ ہم لے بھی لیں گے۔ مگر عزت تو تمھاری ہندوستان میں ہے۔ ہندوستان کے لیے ہے اور تم

تو اتنی قیمتی بھی نہیں ہو۔ ہمیں تو لڑکیاں چاہئیں تمھاری۔"

"وہ...... وہ تو گھر میں نہیں ہیں۔"

"اوہ...... ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا۔ ورنہ ہم آتے ہی کیوں یہاں۔" سرغنے نے کہا۔ "ویسے یہ تو بتا دو، وہ ہیں کہاں؟"

"وہ آگرہ گئی ہیں...... اپنے چچا کے ہاں۔"

"ہمیں پتا ہے۔ بے خبر نہیں ہیں۔ ہم۔ یہاں سے کوئی اب تک کہیں نہیں گیا۔ ہاں اب جائے گا...... اور جو بھی جائے گا، پاکستان جائے گا۔"

"دیکھو ہم پر رحم کرو۔ ہمارے ہاں کوئی مرد نہیں جو ہمارا تحفظ......"

"تھوڑی دیر پہلے تک ایک تھا۔ اسے ہم نے پاکستان بھیج دیا ہے۔" سرغنے نے کہا۔ پھر اس کے لہجے میں نفرت اور سفاکی در آئی۔ "اس نے ہمیں جو نقصان پہنچایا ہے، اس کا حساب بھی تم سے لینا ہے۔"

"جے ہند۔" اس کے ساتھیوں نے نعرہ لگایا۔

سرفراز بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تو وفادار، نمک خوار بہادر علی اپنے آقا کے گھر کی چوکھٹ پر قربان ہو گیا۔ ان کے سینے میں جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔ چھمن بوا بھی گئیں اور اب ان کی باری ہے۔ کوئی بات نہیں۔ موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔ انھیں اپنی موت کی فکر نہیں تھی۔ انھیں تو یہ پریشانی تھی کہ بچیوں کا کیا ہوگا انھیں فکر تھی تو عزت کی۔ انھوں نے دل ہی دل میں اللہ کو پکارا۔

"گرو...... آگے بھی بڑھنا ہے۔" کسی چیلے نے سرغنے کو چونکا دیا۔

سرغنہ سرفراز بیگم کو گھورنے لگا۔ وہ نگاہیں بے حد گندی...... غلیظ تھیں۔ سرفراز بیگم کے رخسار تمتما اٹھے۔ وہ نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئیں۔

"سنو...... عمر تو زیادہ ہے۔ لیکن ہڈیوں میں رس اب بھی ہے۔" سرغنے نے سرفراز بیگم کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اب جو زیادہ بھوکا ہو، وہ کھانا کھا لے۔"

سرفراز بیگم کا چہرہ فق ہو گیا۔ اپنی عمر کے پیش نظر یہ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی عزت کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ مرنے کے لیے تو وہ تیار تھیں۔ لیکن عزت ہی سے تو وہ سب سے زیادہ ڈرتی تھیں۔ "خدا کے لیے، ہم پر رحم کرو۔" وہ گڑگڑائیں۔

"بھگوان کے لیے کہو تو میں کچھ سوچوں۔" سرغنے نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "لیکن وہ تم کہو گی نہیں۔"

سرفراز بیگم کے ہونٹ بھنچ گئے۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹیں۔ اپنی عزت پر بات آئی تو وہ بچیوں کو بھی بھول گئیں۔

اسی وقت تین چار افراد ان پر ٹوٹ پڑے۔

"چلو......لڑکیوں کو تلاش کریں۔" سرغنے نے باقی لوگوں سے کہا۔

وہ لمحے ایسے تھے کہ شیطان ننگا ہو کر ناچ رہا تھا۔ انسانیت کی تذلیل ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کو مسلمان ہونے اور اپنے لیے الگ وطن مانگنے کی سزا دینے والے اپنی دانست میں تقسیم ہند کے عمل کو روک رہے تھے۔ ان کے سڑے ہوئے بدبودار دماغوں میں یہ بات نہیں آئی کہ اپنے اس عمل سے وہ پاکستان کی ضرورت ثابت کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو جتا رہے ہیں کہ ان کی بقا اس میں ہے کہ پاکستان قائم ہو اور ہمیشہ قائم رہے۔

اس گھر سے پہلی بلند ہونے والی چیخ سرفراز بیگم کی تھی۔ اس کے بعد تو ان کی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔ وہ جس درندگی کا سامنا کر رہی تھیں، اس کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

باقی لوگ گھر میں دندنا رہے تھے۔ انھیں لڑکیوں کی تلاش تھی۔

"یہیں کہیں چھپی ہوں گی۔ ڈھونڈو انھیں۔" سرغنے نے کہا۔

تین چار آدمی کوٹھری میں گھس گئے۔ "اس صندوق کو کھول کر دیکھو۔" کسی نے کہا۔

صندوق کھولا گیا۔ اس میں استری کیے ہوئے کرتے تہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ "اس میں کپڑے ہیں۔" کھولنے والے نے جواب دیا۔

"لاٹھی سے ٹٹول کر دیکھ۔ کیا پتا، نیچے کوئی ہیرا ہو۔"

مگر اس وقت کوئی چلایا۔ "وہ رہی۔"

صندوق کھولنے والے نے بے ساختہ صندوق بند کر دیا اور اس طرف دیکھا۔ وہاں اس کا ایک ساتھی گلنار کو دبوچے کھڑا تھا۔ "باہر لے چل اسے...... گرو جی کے پاس۔" وہ فاتحانہ لہجے میں چلایا۔

اس لمحے حور بانو بھی پکڑی گئی۔

دونوں لڑکیوں کو کمرے میں لے جایا گیا، جہاں سرغنہ موجود تھا۔ "یہ مل گئیں گرو۔" لانے والے نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"تیسری نہیں ملی؟"

"تلاش کر رہے ہیں گرو۔ مل جائے گی۔ جائے گی کہاں؟"

"ڈھونڈو اسے۔"

"کوٹھری میں تو نہیں ہے۔ باہر دیکھتے ہیں۔"

باہر سے سرفراز بیگم کی فلک شگاف دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے میں دونوں لڑکیاں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں تھیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

بالآخر وہ ڈھے گئیں۔

سرغنہ انھیں ناقدانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ "پہلے چھوٹی کا اگھاٹن کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

درندگی کا کھیل شروع ہو گیا۔ باہر اور اندر کی چیخیں گھل مل گئیں۔ تھوڑی دیر بعد باہر کی چیخیں دم توڑ گئیں۔ مگر اندر ایک چیخنے والی کا اضافہ ہو گیا۔ روئے زمین پر کوئی سننے والا نہیں تھا...... سوائے اس ایک کے جو بے بس تھا!

❋......❋......❋

رگھو کی چھری جواب دے گئی تھی اور دونوں ہاتھ لہولہان تھے۔ دروازے کے پار صحن کی طرف سے دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اندر سے بھی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

"میں کیا کروں مالک۔ میں ہار گیا۔" رگھو نے دروازے سے سر ٹکرایا۔ "میں کیا منہ دکھاؤں گا تمھیں مالک۔"

رنجنا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ "ہے بھگوان، یہ کیسا انیائے ہے؟"

رگھو دروازے سے سر ٹکراتا رہا۔ اس کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت وہ تکلیف کے ہر احساس سے بے نیاز تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس کا ماتھا زخمی ہو گیا ہے اور خون بہہ کر اس کے چہرے پر آ رہا ہے۔

رنجنا بہ دستور روئے جا رہی تھی۔ اب اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

گزرتا ہوا ہر لمحہ اذیتوں کی طرح طویل تھا۔ دردناک چیخوں کو سنتے ہوئے لگتا تھا کہ دل پھٹ جائے گا۔ پھر اچانک ہی صحن کی طرف سے سنائی دینے والی چیخیں دم توڑنے لگیں اور آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئیں، جیسے کسی نے زندگی کو آواز سے چھٹکارا دلا دیا ہو۔

لیکن اندر سے سنائی دینے والی چیخوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

رگھو دروازے سے سر ٹکراتا رہا۔ رنجنا روتی رہی۔ سسکتے ہوئے لمحے اٹک اٹک کر، ٹھہر ٹھہر کر گزرتے رہے۔ کتنا وقت گزر گیا تھا، اس کا کوئی پیمانہ نہیں تھا...... نہ اذیت دینے والوں کے پاس، نہ اذیت سے گزرنے والوں کے پاس اور نہ ناکام چارہ گروں کے پاس۔

پھر اچانک ہر طرف موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ بس رات کا سکوت نوحہ گری کر رہا تھا۔

"سب کچھ نشٹ ہو گیا...... سب کچھ۔" رگھو نے دروازے سے زخمی پیشانی ٹکا دی اور رونے لگا۔ رنجنا بھی رو رہی تھی۔

پھر دروازے کے دوسری طرف بھاری قدموں کی چاپیں ابھریں...... پھر اوباش قہقہے،

فحش تبصرے اور گندے جملے۔ یہ سب دور ہوتا گیا۔ پھر گلی کی جانب سے وہی سب کچھ سنائی دیا اور دور ہوتا گیا۔

اب رات کے سناٹے میں رگھو کی سسکیوں اور رنجنا کے گریے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ قیامت صرف ڈیڑھ گھنٹے کے لیے آئی تھی اور سب کچھ تہس نہس کر کے چلی گئی تھی۔

❁......❁......❁

گلی میں گھستے ہی اوتار سنگھ کو یہ احساس ستانے لگا کہ کہیں کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کا احساس غیر شعوری تھا۔ بہرحال وہ چوکنا ہو گیا، جیسے کوئی نامعلوم خطرہ اس کا منتظر ہو۔

پھر اچانک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ ایک گھر کے دروازے کو اس نے باہر سے بند دیکھا۔ پھر دوسرے کو بھی بند پایا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ کوئی بات ضرور تھی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والے دروازوں کو دیکھا۔ وہ سارے بھی بند تھے۔ شاید انہی دروازوں کو اس نے غیر شعوری طور پر دیکھا تھا اور انہی کی وجہ سے اسے گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

اس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ لیکن وہ دونوں طرف کے دروازوں کو بھی دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اب تک گلی میں اسے ایک دروازہ بھی ایسا نظر نہیں آیا تھا، جو بند نہ ہو۔ البتہ ہر گھر میں سناٹا تھا۔ کہیں کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں تھی۔

اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ نیچے والے گھر کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ کھلا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ اسے توڑا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ گلی کے بند دروازوں کو یکسر بھول گیا۔ اس نے بڑھ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ ٹوٹے ہوئے دروازے سے دو قدم آگے اس کے گھر کا دروازہ ہے اور وہ بھی باہر سے بند ہے۔ وہ تو ٹوٹے ہوئے دروازے پر ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔

چند لمحے تو وہ ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اندر جھانکا۔ اندر اندھیرا تھا۔ ابتداء میں تو اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ لیکن پھر نظر اندھیرے سے ہم آہنگ ہوئی تو اسے فرش پر ایک جسم پڑا نظر آیا۔ اور وہ جسم بے حس و حرکت تھا۔

اوتار سنگھ نے وہ چوکھٹ کبھی نہیں پھلانگی تھی۔ وہ ہچکچا رہا تھا۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ یہ تو ڈیوڑھی ہے..... زنان خانے سے بہت دور۔ اور صورت حال ایسی ہے کہ اس کا اندر جا کر دیکھنا ضروری ہو گیا ہے۔

وہ اندر گیا اور اس جسم کے پاس جا کر جھکا۔ وہ خون میں لت پت بہادر علی کی لاش تھی۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کارنس پر لالٹین رکھی تھی۔ مگر وہ روشن نہیں تھی۔ وہ کارنس کی طرف بڑھا۔

مگر اس سے پہلے ہی کسی چیز سے الجھ کر گر پڑا۔

وہ ایک اور لاش تھی!

اب اوتار سنگھ کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کارنس کی طرف بڑھا۔ وہاں لالٹین کے برابر دیا سلائی بھی موجود تھی۔ اس نے لالٹین روشن کر دی اور جائزہ لیا۔ دوسری لاش کسی اجنبی کی تھی اور وہاں جا بجا خون بکھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ میدانِ جنگ ہے۔ بہادر علی کے ہاتھ میں اب بھی لوہے کا سریا تھا۔

اندر کی جانب کھلنے والا دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ اوتار سنگھ چند لمحے یہ سوچ کر الجھتا رہا کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اندر بھی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ کون جانے، وہاں کیا دیکھنے کو ملے۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ اندر ممکن ہے، کسی کو اب بھی مدد کی ضرورت ہو۔ وہ وقت بہرحال پردے کا خیال کرنے کا نہیں تھا۔

اس نے ایک ہاتھ میں لالٹین اٹھائی اور دوسرے میں اجنبی لاش کے قریب پڑا ہوا خنجر اٹھایا اور گھر میں داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی دل ہلا دینے والا ایک منظر اس کے سامنے تھا۔ وہ چھمن بوا تھیں۔ وہ بھی مر چکی تھیں۔

مگر اس کے بعد اس نے جو کچھ دیکھا، اس سے اس کا دل پھٹنے لگا۔ ماں جی کو وہ صرف ایک نظر دیکھ سکا..... اور وہ نظر بھی غیر ارادی تھی۔ ارادے سے نظر بھر کر تو وہ انہیں اس حال میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور جو کچھ اس پھسلتی ہوئی غیر ارادی نظر میں اس نے دیکھا، وہ بھی اس کے حافظے سے محو نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ ان یادوں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کے دل کا..... ضمیر کا بوجھ تھیں۔

وہ ماں جی، جو اسے بیٹا کہتی تھیں، اس کے سامنے ایسی ڈھکی چھپی آتی تھیں کہ چہرے کے نقوش بھی کسی غیر مرئی نقاب میں چھپ جاتے تھے وہ ماں جی آج مرنے کے بعد اس حال میں تھیں کہ ان کے بدن پر کپڑے برائے نام تھے اور اس پھسلتی ہوئی پہلی نظر میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ انہیں بری طرح نوچا کھسوٹا، کاٹا اور بھنبھوڑا گیا ہے۔ ان کے جسم سے جا بجا خون رس رہا تھا اور ان کے چہرے پر خوف اور اذیت کا ملا جلا تاثر جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

اوتار سنگھ نے ان کی لاش سے نظریں چرائیں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب ہی اسے ماں جی کی اوڑھنے والی چادر نظر آئی۔ وہ اس چادر کو اٹھا کر منہ پھیرے پھیرے آگے بڑھا اور اسے ماں جی کے جسم پر ڈال دیا۔

اوتار سنگھ کا دل پھٹ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دل میں ایک ملال

تھا...... پچھتاوا جو کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ ضمیر پر ایک بوجھ تھا۔ شاید اس لیے کہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اس نے اسے ہوش مندوں کے سے انداز میں سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا، اس نے ماں جی سے اس گھر کی، اس گھر کے لوگوں کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا اور وہ یہ وعدہ پورا نہیں کر سکا تھا۔ اس کی ذرا سی غیر ذمے داری کے نتیجے میں ان سب پر قیامت گزر گئی تھی۔

وہ ماں جی کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اور شرمندگی سے روتا رہا۔ میں اپنی ذمے داری پوری نہ کر سکا ماں جی۔ میں اپنا وعدہ نبھا نہ سکا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ میں آپ سب کو تحفظ......

سب کے خیال نے اسے چونکا دیا۔ ارے گھر میں اور لوگ بھی تو ہوں گے۔ کیا پتا، ان میں سے کوئی محفوظ ہو۔ عقل کہتی تھی کہ کوئی نہیں بچا ہوگا۔ ماں جی کو نہیں چھوڑا ظالموں نے تو لڑکیوں کو کہاں چھوڑیں گے۔ لیکن دل کہتا تھا کہ موت تو خدا کے حکم سے ہے۔ اگر کسی کے لیے حکم نہیں ہوا تو وہ تو بچ گیا ہوگا نا۔ اور کون جانے، وہ آواز والی لڑکی بچ گئی ہو......

کوئی ظاہری امکان نہیں تھا۔ لیکن اس کے دل نے امکان کا وہ تنکا بڑی مضبوطی کے ساتھ تھام لیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا۔ اس نے لالٹین اٹھائی اور اندر کی طرف چلا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔

اندر، پہلا کمرا اسے خالی ملا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے اسٹور روم میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کے برابر والا کمرا بھی خالی تھا۔ ”کوئی ہے...... کوئی ہے۔“ اس نے پکارا۔ مگر کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔

وہ سامنے والے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ اس کے دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ گھٹی گھٹی سی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ ایسی آواز تھی، جیسے کوئی اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ آواز اتنی موہوم تھی کہ اسے اپنے اندر موجود امید کی تخلیق لگی۔ اور اس کے پلٹتے پلٹتے وہ موہوم آواز بھی معدوم ہو گئی۔ اس نے سر جھٹکا اور پلٹا۔

وہ اس آخری کمرے میں داخل ہوا۔ اندر کا وہ منظر اتنا روح فرسا تھا کہ اس پر لرزہ چڑھ گیا۔

وہاں دو بستر تھے، جن پر دو لڑکیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کے جسم جس طرح مڑے تڑے تھے، اس کو دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ وہ مر چکی ہیں۔ وہ دونوں بے لباس تھیں اور ان کے جسم لہولہان تھے۔ ان کے جسموں پر کھرونچے بھی تھے اور دانتوں کے نشان بھی۔ لیکن کوئی زخم نہیں تھا۔ اوتار سنگھ تھرا کر رہ گیا۔ پہلی بار وہ دیکھ رہا تھا کہ انسان درندگی پر اتر آئے تو درندے بھی شرما جاتے ہیں۔

اس نے ایک نظر میں وہ سب کچھ دیکھا اور اضطراری طور پر نظر ہٹالی۔ اب وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جو بستر اس کے قریب تھا، اس پر کوئی چادر، کوئی چیز ایسی نہیں تھی، جو پردے کا کام کرتی۔ پھر اسے وہ سفید کرتا نظر آ گیا۔

وہ بکھرے ہوئے وجود سے نظریں چراتے ہوئے اس طرف بڑھا۔ اس نے وہ کرتا اٹھایا اور بے کسی کی موت مرنے والی کے بدن پر ڈال دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑکی ماں جی کی سب سے بڑی بیٹی حور بانو ہے۔ اور جس کرتے سے اس نے اس کی برہنگی کو ڈھانپا ہے، وہ کرتا اس لڑکی نے اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی رات کو اس کرتے کو چادر کی طرح اپنے جسم پر ڈال کر سوئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی اس سے محبت کرتی تھی...... اتنی محبت کہ لوگ کسی سے کم ہی کرتے ہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

اسے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے اس کے جسم پر کرتا ڈالا تھا۔ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ کرتا اس کے جسم کو پوری طرح سے ڈھانپ سکا ہے یا نہیں۔ اس لیے اسے اس طرف دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

وہ دوسرے پلنگ کی طرف بڑھا۔ وہاں چادر موجود تھی۔ اس نے چادر کو اچھی طرح پھیلا کر اس مڑے تڑے وجود پر ڈال دیا۔ اس نے دوسری لڑکی کے چہرے کو دیکھا۔ وہ بہت کم سن تھی۔ یقینی طور پر وہ سب سے چھوٹی بہن ہوگی۔ اس کے معصوم چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ لیکن کھلی آنکھوں میں منجمد اذیت گواہی دے رہی تھی کہ زندگی کی موت سے ہم آغوشی کے لمحے اس کے لیے بہت بھیانک رہے ہوں گے۔

اوتار سنگھ نے بڑی نرمی اور نزاکت سے اس کی آنکھوں کو بند کر دیا۔ اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکی اسے ٹھا کر بھیا کہہ کر پکارنا چاہتی تھی۔ بھیا کہہ کر اس سے لپٹ جانا، اس سے لاڈ کرنا چاہتی تھی۔ بھائی سے محروم وہ لڑکی اسے بھائی سمجھتی تھی اور اس سے بہت محبت کرتی تھی۔

اوتار سنگھ نے دوسری چادر یا کسی اور چیز کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ پھر اسے پلنگ کے پہلو میں فرش پر گری ہوئی وہ چادر نظر آئی۔ اس نے اسے اٹھایا، جھاڑا اور اسے لے کر پہلی لڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ منہ پھیرے پھیرے اس نے لڑکی پر وہ چادر پھیلا کر ڈالی۔ پھر اس نے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ بے حد حسین لڑکی رہی ہوگی۔ لیکن اس کا چہرہ اذیت سے چٹخا ہوا تھا۔ جو چیز چھوٹی لڑکی کی طرف آنکھوں میں تھی، وہ اس لڑکی کے پورے چہرے پر تھی۔ اس چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ چہرہ نہیں، عکس ہے...... اور وہ بھی چور چور آئینے میں نظر آنے والا

عکس، اس کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔

اس لڑکی کی آنکھیں بند کرتے ہوئے اوتار سنگھ سوچ رہا تھا کہ دونوں لڑکیوں میں یہ تضاد کیسا ہے۔ ایک کے چہرے پر سکون اور دوسری کے چہرے پر اذیت۔ پھر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ چھوٹی لڑکی نے موت سے کچھ دیر پہلے خود کو موت کے سپرد کر دیا ہوگا۔ اسے بھیانک حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا ہوگا۔ جبکہ بڑی لڑکی آخری لمحے تک موت اور ذلت...... دونوں سے لڑتی رہی ہوگی۔

اچانک اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ وہ تین بہنیں تھیں۔ تیسری کہاں ہے؟

یہی وہ وقت تھا کہ گھٹی گھٹی سسکیوں کی وہ آواز پھر ابھری...... اور یہ بتدریج بلند آہنگ ہوتی گئی۔ گھٹی گھٹی سسکیاں تو وہ اب بھی تھیں۔ لیکن اتنی گھٹی ہوئی بھی نہیں تھیں۔ آواز سے پتا چل رہا تھا کہ سسکیوں کو گھونٹنے والی اب اپنی قوت سے محروم ہو رہی ہے۔ سسکیاں اس کے ضبط سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔

اوتار سنگھ آواز کی سمت لپکا۔ ساتھ ہی اس نے پھر پکارا۔ ''کون......؟ کہاں ہو تم؟''

اس کی آواز پر ردِعمل یہ ہوا کہ سسکنے والے نے شاید اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں بھینچنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں آواز ہلکی ہوگئی۔

اتنی دیر میں اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ آواز کوٹھری کے اندر سے آ رہی ہے۔ وہ لالٹین اٹھائے کوٹھری میں داخل ہوا۔ خنجر نجانے کب وہ پچھلے کمرے میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ ویسے بھی اس کی اب ضرورت نہیں تھی۔ گھر میں کوئی حملہ آور موجود نہیں تھا۔

وہ کوٹھری میں داخل ہوا تو وہ آواز بے حد موہوم ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ سے سمت کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ بلکہ دھیمی...... بہت دھیمی سی وہ آواز، اسے تو لگتا تھا کہ ہر طرف سے آ رہی ہے۔

اس نے کوٹھری کا جائزہ لیا۔ وہ ویسی ہی کوٹھری تھی، جیسی عام طور پر گھروں میں ہوتی ہیں۔ وہاں گھر کا فاضل سامان رکھا تھا...... مگر بکھرا ہوا نہیں۔ اسے سلیقے سے رکھا گیا تھا۔ سامنے ہی اسے اوپر تلے تین ٹرنک رکھے نظر آئے۔ اس کے برابر ایک بہت بڑا صندوق رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ اس میں بستر رکھے جاتے ہوں گے۔ پہلو والی دیوار کے ساتھ ایک بڑی الماری رکھی تھی اور جو اِدھر اُدھر دوسرا سامان تھا، اس میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ کسی کے چھپنے کی جگہ ہو۔

اس کی نگاہیں اوپر تلے رکھے صندوقوں پر جم گئیں۔ اوپر والا صندوق بھی اتنا بڑا تھا کہ اس میں ایک لڑکی بہ آسانی سما سکتی تھی۔ سسکیوں کی موہوم، گھٹی گھٹی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ اسے لگا کہ آواز اسی صندوق سے آ رہی ہے۔

وہ اس طرف بڑھا۔ ''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میں ہوں اوتار سنگھ۔''

اس کے یہ کہتے ہی سسکیاں ہذیانی چیخوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ''نہیں...... نہیں...... میرے پاس نہ آنا...... خدا کے لیے...... مجھے چھوڑ دو...... رحم کرو مجھ پر......''

آواز سے اوتار سنگھ کو اندازہ ہوا کہ آواز والی پوری طرح ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ خوف اتنا بڑھا ہوا ہے کہ دہشت کی حد کو پہنچ گیا ہے۔ ''ڈرو نہیں، یہ میں ہوں چھوٹا ٹھاکر۔''

آواز پھر گھٹنے لگی۔ اوتار سنگھ نے صندوق کھولا۔ اس میں کرتے رکھے تھے۔ صندوق وہ کافی بڑا تھا۔ اس نے کرتے ہٹائے۔ لیکن لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ لڑکی وہاں نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کہاں ہے۔

اس نے بستروں کے بہت بڑے صندوق کو کھولا۔ اوپر دو تین لحاف مڑے تڑے، بے ترتیب رکھے تھے۔ صندوق کی مجموعی حالت بھی ابتری کی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی تلاشی لی گئی ہے۔

اس نے اوپر کے لحاف گدے اٹھائے تو اسے لڑکی نظر آئی۔ اس کا ہاتھ سختی سے اپنے منہ پر جما تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لیکن کھل جانے کا احساس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور اس کا ہاتھ منہ پر سے ہٹ گیا۔ ''ہٹ جاؤ...... مجھے چھوڑ دو...... رحم کرو مجھ پر......'' وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

اوتار سنگھ نے وہ آنکھیں دیکھیں۔ وہ کیفیت وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ان آنکھوں میں گہری دہشت تھی اور اس کے علاوہ عجیب سا خالی خالی پن تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی...... لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی اور وہ پوری جان سے کانپ رہی تھی...... کسی سوکھے پتے کی طرح!

اور دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی کے دانت بھنچ گئے۔ آنکھیں مندنے لگیں۔ اس کے لرزتے بدن نے ایک طویل جھٹکا لیا اور اگلے ہی لمحے وہ کسی بے جان گڑیا کی طرح ڈھے گئی۔

اوتار سنگھ صرف ایک لمحے کے لیے جھجکا۔ پھر اس نے اس لڑکی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس کا دل سینے میں دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ کم از کم کوئی ایک تو زندہ مل گیا۔ وہ لڑکی کو ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے کوٹھری سے نکلا اور صحن کی طرف چل دیا۔

❁......❁......❁

نور بانو ٹھیک سے جاگی نہیں تھی۔ لیکن اماں کے لہجے اور انداز سے اسے سنگینی کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے چھپنے کے لیے کپڑوں کا ٹرنک منتخب کیا تھا۔ کرتوں کو اپنے اوپر پھیلاتے ہوئے اس نے ٹرنک کو بند کر لیا تھا۔

اندر گھسنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی ہی دبلی پتلی سہی، ٹرنک اس کے لیے

بہت تنگ ہے۔ وہ مڑی تڑی حالت میں دبکی ہوئی تھی۔ دم بھی گھٹ رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ بستروں والا بڑا صندوق چھپنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ لیکن وہاں گلنار چھپ گئی تھی۔ اسکا جی چاہا کہ وہ اس تنگ صندوق سے نکل کر کوئی اور جگہ تلاش کرے۔ لیکن اسے ہمت نہیں ہوئی۔

اسے اتنا تو معلوم تھا کہ گھر پر حملہ ہوا ہے۔ لیکن خطرے کی نوعیت کے بارے میں وہ اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ وہ دبکی بیٹھی کلمے کا ورد کرتی رہی۔ خوف ایسا تھا کہ آیۃ الکرسی اسے یاد نہیں آ رہی تھی۔

ٹرنک میں آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ وہاں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ پھر بھی اسے کوٹھری میں لوگوں کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ کچھ لوگ تھے، جو انھیں ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اور سمٹ گئی۔ خطرہ سر پر آ پہنچا تھا۔

پھر کسی نے ٹرنک کھولا۔ ''اس میں کپڑے ہیں۔'' ٹرنک کھولنے والے نے کہا۔

''لاٹھی سے ٹٹول کر دیکھ۔ کیا پتا نیچے کوئی ہیرا ہو۔'' دوسری آواز نے کہا۔

نور بانو نے ایک آنکھ کی جگہ بنالی تھی اور وہ دم سادھے ہوئے تھی۔ ٹرنک کے پاس کھڑا آدمی اسے بہت بڑے ہیولے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا کہ ایک اور شخص بستروں والا ٹرنک کھول رہا ہے۔ اِدھر اسے اپنا ڈر تھا کہ ابھی کپڑے ہٹا کر دیکھیں گے تو وہ پکڑ جائے گی۔ اُدھر اسے چھوٹی بہن کی فکر تھی۔

پھر بستروں والے صندوق کو کھولنے والا چلایا۔ ''وہ رہی۔''

یہ آواز سنتے ہی ٹرنک کھولنے والے نے بے ساختہ ٹرنک بند کر دیا۔ نور بانو نے سکون کی گہری سانس لی۔ مگر پھر اسے یہ فکر ستانے لگی کہ گلنار کا کیا ہوگا۔ اس پریشانی میں اس نے ٹرنک کو تھوڑا سا کھول لیا۔ تاکہ باہر کی سن گن مل سکے۔

باہر کی آوازوں سے پتا چل گیا کہ حور بانو بھی پکڑی گئی ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ دونوں بہنوں کے چوں کرنے کی آواز بھی اس نے نہیں سنی تھی۔ شاید وہ فرطِ خوف سے گنگ ہو گئی تھیں۔ البتہ کسی نے کہا...... انھیں گروجی کے پاس لے چلو۔

قدموں کی چاپوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سب ان کے کمرے کی طرف جا رہے ہیں۔ نور بانو نے ٹرنک تھوڑا سا اور کھولا۔ چند لمحوں میں اسے یقین ہو گیا کہ کوٹھری میں اب کوئی نہیں ہے۔

نور بانو چند لمحے جھجکتی رہی۔ پھر نجانے کہاں سے اس میں اتنی ہمت آ گئی کہ وہ ٹرنک سے نکل آئی۔ اس نے کرتے سلیقے اور ترتیب سے رکھنے کے بعد ٹرنک بند کر دیا۔ پھر وہ لرزتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

کوٹھری کے دروازے پر رک کر اس نے سر ذرا سا باہر نکالا۔ کمرے کا منظر تو وہ باہر نکلے بغیر نہیں دیکھ سکتی تھی اور باہر نکلنے کی بہرحال اس میں ہمت نہیں تھی۔ کمرے کی آوازیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''تیسری نہیں ملی؟'' کمرے میں کوئی پوچھ رہا تھا۔

''تلاش کر رہے ہیں گرو۔ مل جائے گی۔ جائے گی کہاں؟'' کسی نے جواب دیا۔

''ڈھونڈو اسے۔''

''کوٹھری میں تو نہیں ہے۔ باہر دیکھتے ہیں۔''

باہر...... دوسری طرف سے اسے ماں کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان چیخوں میں ایسی اذیت تھی کہ اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔ حملہ آوروں کی آخری بات سے اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ کم از کم فوری طور پر وہ کوٹھری کا رخ نہیں کریں گے۔ لیکن یہ تشویش بھی ہوئی کہ انھیں اس کے وجود کا علم ہے اور وہ اسے تلاش کر رہے ہیں۔

وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ آئی اور دروازے کے ایک پٹ کو آہستگی سے بھیڑ دیا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی اسے دیکھ لے گا۔

لالٹین ہاتھ میں لیے کچھ لوگ اسے باہر جاتے دکھائی دیے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ اس کی تلاش کے لیے نکلے ہیں۔ باہر سے اماں کی چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں لیکن اندر کمرے میں جہاں اس کی دونوں بہنیں موجود تھیں، خاموشی تھی۔

مگر اس لمحے اسے گلنار کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر گلنار کی نہ رکنے والی چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان چیخوں میں اتنی اذیت تھی کہ انھیں سن کر کوٹھری میں کھڑی نور بانو کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ کھڑا رہنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا۔ وہ بیٹھ گئی۔

باہر سے اماں کی چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ نور بانو نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے تھے۔ ورنہ وہ پاگل ہو جاتی۔ کیونکہ اس کے وجود میں بہن کو بچانے کے لیے لپک کر جانے کی دیوانی خواہش مچل رہی تھی۔ اور یہ پاگل پن ہی ہوتا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ بہن کو تو نہیں بچا سکے گی۔ البتہ خود بھی اسی اذیت سے دوچار ہو جائے گی۔

پھر باہر کی جانب سے اماں کی آخری چیخ سنائی دی۔ وہ دم توڑتی ہوئی چیخ تھی۔ اس کے بعد باہر سناٹا چھا گیا۔ اندر گلنار کی چیخوں میں شدت اور اذیت اور بڑھ گئی تھی۔ پھر اندر سے ایک اور چیخ بلند ہوئی۔ وہ آپی کی چیخ تھی...... حور بانو کی چیخ!

اب کانوں پر ہاتھ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بہنوں کی وہ چیخیں اس کے وجود میں اتر کر بازگشت کی طرح گونج رہی تھیں...... وجود کی دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھیں، ایسے

پرندوں کی طرح، جو کسی تنگ جگہ میں بند کر دیے گئے ہوں اور انھیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہو۔ وہ اِدھر اُدھر دیوانہ وار اڑ رہے ہوں کہ شاید کہیں وزن ہو، جس سے باہر نکلنے کا انھیں موقع مل جائے۔

نور بانو نے غیر ارادی طور پر کانوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے اور کوٹھری سے نکل آئی۔ اب وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ کمزور ہے۔ کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ البتہ خود کو بھی مصیبت میں پھنسا لے گی۔ وہ تو اس وقت جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔

وہ اس کمرے کی طرف بڑھی، جو تینوں بہنوں کی خواب گاہ تھا۔ اس کا انداز اس مکھی کا سا تھا جو چھپکلی کی آنکھوں سے مسحور ہو کر بے اختیار چھپکلی کے کھلے منہ کی طرف بڑھتی ہے۔

اس کے تصور کے کسی تاریک ترین گوشے میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو نہایت معصوم اور بے خبر لڑکی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انسان اس طرح درندہ بھی بن سکتا ہے۔

اس کی دونوں بہنوں کے بدن پر کپڑے کا تار بھی نہیں تھا اور ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے اس کے شل دماغ میں ایک بے بس سوچ سر اٹھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کر رہی تھی...... کہ اسے یہ سب کچھ نہیں دیکھنا چاہیے۔ لیکن ماؤف دماغ اس سوچ کو سننے سے قاصر تھا۔

وہ دیکھتی رہی اور پوری جان سے لرزتی رہی۔ درندے اس کی بہنوں کو نوچ رہے تھے...... کاٹ رہے تھے...... بھنبھوڑ رہے تھے۔ وہ بہنیں جن کے سینوں سے دوپٹہ کبھی اماں اور چھمن بوا کے سامنے بھی نہیں ڈھلکتا تھا، آج نامحرموں کے سامنے بے لباس تھیں۔ وہ چاند تھے، جن پر گہن لگ رہا تھا۔

وہ دیکھتی رہی۔ سن دماغ کا کوئی حصہ اسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا...... یہ کہ اگر وہ پکڑی گئی تو یہی سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہوگا۔ لیکن وہ ایسی کیفیت میں تھی کہ اس پیغام کو سمجھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ خوف ایسا تھا کہ اس نے ہر ممکنہ خوف کو مٹا ڈالا تھا۔

اس کی دونوں بہنوں کی چیخیں اب آسمان کو چھو رہی تھیں۔

وہ یونہی کھڑی رہتی اور پکڑی جاتی۔ لیکن اس لمحے ایک معجزہ ہو گیا۔ کمرے کی دیوار پر لرزتی ہوئی روشنی پڑی...... اور وہ روشنی جیسے اس کے دماغ میں اتر گئی۔ اس کا دماغ ایک دم روشن ہو گیا۔ ایک پل میں وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گئی۔

کمرے میں جو لوگ درندگی کا کھیل کھیل رہے تھے، انھیں نظر اٹھانے کی فرصت نہیں

تھی کہ وہ اسے دیکھ پاتے۔ لیکن دیوار پر تھرکتی لالٹین کی روشن بتا رہی تھی کہ جو لوگ اسے ڈھونڈنے کے لیے گئے تھے، وہ ناکام واپس آ رہے ہیں۔ انھوں نے اسے دیکھ لیا تو پکڑ لیں گے۔ اور انھوں نے پکڑ لیا تو اس پر بھی وہی گزرے گی، جو بہنوں پر گزر رہی ہے۔

حد سے بڑھا ہوا خوف بھی عجیب چیز ہے۔ کبھی تو آدمی کو ہلنے کے قابل نہیں رہنے دیتا اور کبھی اس کو پر لگا دیتا ہے۔

نور بانو کا ٹرانس تو اس روشنی کو دیکھتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ مگر ایک پل میں وہ کوٹھری کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ کہاں تو چند لمحے پہلے تک اس کا دماغ مفلوج تھا اور کہاں یہ کہ اب اس کا دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

کوٹھری کے علاوہ اس کے لیے کہیں پناہ نہیں تھی۔ کوٹھری میں گھس کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وقت بہت کم تھا۔ وہ بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی نظر میں بستروں والے صندوق پر جم گئیں۔

ہاں...... یہ ٹھیک ہے۔ اس نے سوچا۔ انھوں نے گلنار کو اس صندوق میں سے نکالا تھا۔ اب انشاء اللہ کم از کم وہ اس صندوق کو کھول کر نہیں دیکھیں گے۔ یہ سوچ کر وہ اس صندوق کی طرف مڑی۔ مگر لڑکھڑا گئی۔

دراصل بچنے کے خیال نے اس کے جسم میں بجلی ضرور بھر دی تھی۔ لیکن اس کی تھرتھری کا وہی عالم تھا۔ خوف نے رخ ضرور بدل لیا تھا۔ لیکن اصل خوف ذہن کے کسی گوشے میں اب بھی موجود تھا۔

اس نے خود کو سنبھالا اور صندوق میں اتر گئی۔ گلنار کو نکالتے ہوئے ان لوگوں نے بستر بے ترتیب چھوڑ دیے تھے۔ لہٰذا انھیں ترتیب دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے ایک لحاف اور گدا اپنے اوپر گھسیٹ لیا اور صندوق کو بند کر دیا۔

صندوق بند ہوتے ہی اسے ایسا لگا کہ وہ کسی پناہ گاہ میں آ گئی ہے۔ باہر کی تمام آوازیں باہر ہی رہ گئی تھیں۔

محفوظ ہونے کا احساس ہوا تو اس کی نظروں میں بہنوں پر گزرنے والی قیامت کے منظر پھرنے لگے۔ وہ رونے لگی۔ سسکیوں کی آواز بلند ہونے لگی تو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ کہیں یہ سسکیاں ان درندوں کو اس تک نہ لے آئیں۔ عافیت اس میں تھی کہ فی الوقت وہ بہنوں کے بارے میں نہ سوچے۔ یہ کام تھا تو بہت مشکل۔ مگر عزت آبرو اور زندگی داؤ پر لگی تھی۔ اس لیے قدرے آسان ہو گیا۔

اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ اس کے حق میں بہتر ہی تھا۔ ورنہ ممکن

تھا کہ ڈر کر وہ کوئی آواز نکال دیتی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ اسے تلاش کرنے کے لیے کوٹھری میں آئے تھے۔ جس صندوق میں وہ پہلے چھپی تھی، انھوں نے اسے کھول کر دیکھا تھا۔ پھر ان میں سے ایک بستروں والے صندوق کی طرف بڑھا، جہاں وہ چھپی ہوئی تھی تو دوسرے نے اسے ٹوک دیا۔ ''اسے دیکھا جا چکا ہے۔ چھوٹی اسی میں سے نکلی تھی۔''

پھر وہ ناکام ہو کر چلے گئے۔ نور بانو کا پتا بھی نہیں چلا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ بھینچے صندوق میں دبکی رہی۔

نجانے کتنی دیر ہو گئی۔ اسے باہر کا کچھ پتا نہیں تھا اور اندر سوچنے کے لیے اس کے پاس بہنوں کی ابتلا کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ رہ رہ کر وہ منظر اس کی آنکھوں میں پھر رہے تھے اور باہر نکلنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ صندوق کا پٹ ہی تھوڑا سا اٹھا دیتی۔

اب اس کے لیے اپنی سسکیوں کو روکنا مشکل ہو گیا۔ اس کی سسکیاں بلند ہونے لگیں۔

وقت کتنا گزر گیا ہے، اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ تو بس بے بسی سے رو رہی تھی...... سسک رہی تھی۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ اب اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ رونے کی وجہ سے سانس لینا اور دشوار ہو گیا تھا۔ اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ صندوق کا ڈھکنا تھوڑا سا اٹھائے۔ تاکہ تازہ ہوا اندر آئے۔

روتے اور سسکتے ہوئے اس نے صندوق کا ڈھکنا تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ یہ وہ وقت تھا، جب اوتار سنگھ کوٹھری کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس نے اس کی سسکیوں کی آواز سنی۔ لیکن کوٹھری کا رخ کرنے کے بجائے کمرے میں چلا گیا۔

نور بانو میں باہر نکلنے کی ہمت اب بھی نہیں تھی۔ اس نے صندوق کا ڈھکنا مزید اوپر اٹھایا۔ وہ اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن بہنوں پر گزرنے والی قیامت کے منظر نگاہوں میں پھرتے تو اس کی سسکیاں گھٹی گھٹی چیخوں میں تبدیل ہونے لگتیں۔ وہ انھیں روک نہیں سکتی تھی۔

پھر ایک نئی بات ہوئی۔ بہنوں کا خیال آیا تو اسے احساسِ جرم ہونے لگا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔ اس کی بہنوں پر کیسی قیامت گزری تھی اور وہ بے حسی سے تماشہ دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ کچھ کر تو نہیں سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ وہ خود بھی اس درندگی کی بھینٹ چڑھ جاتی۔ اس پر اس نے سوچا کہ ایسا ہوا ہوتا تو اچھا ہی ہوتا۔ کم از کم ضمیر پر بوجھ تو نہ ہوتا۔ اور ابھی تو اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ دونوں بہنوں پر کیا گزری ہے۔ وہ زندہ بھی ہیں یا......

اس سے آگے اس سے سوچا بھی نہیں گیا۔ اس کے اندر متضاد اور ایک دوسرے سے متصادم سوچوں نے اسے اور کمزور کر دیا۔ اس کی سسکیاں اور بلند ہو گئیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ

وہ دھاڑیں مار کر...... چیخ چیخ کر روئے اور خود پر قابو پانا اس کے لیے ناممکن ہوا جا رہا تھا۔ کوشش کے باوجود اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ اس نے کوٹھری کی طرف آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ پھر کسی نے پکارا۔ ''کون...... کہاں ہو تم؟''

اس نے اپنا ہاتھ منہ میں لیا اور چبا ڈالا۔ اس کی گھٹی ہوئی چیخیں معدوم ہو گئیں اور سسکیاں رہ گئیں۔ اسی لمحے صندوق کی جھری سے اس نے کسی کو لالٹین اٹھائے کوٹھری میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے گھبرا کر صندوق کو ڈھکن نیچے کر لیا۔ لیکن اسے پتا نہیں چلا کہ صندوق پوری طرح بند نہیں ہوا ہے۔ بہت چھوٹی سی ایک جھری رہ گئی ہے۔

وہ دہشت سے بے حال ہو گئی تھی۔ اس پر لرزہ چڑھا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنے منہ پر بہت سختی سے جما تھا۔ لیکن وہ اپنی ذری ذری آوازوں کا پوری طرح گلا نہیں گھونٹ پا رہی تھی۔ اسے بس ایک خیال ستا رہا تھا...... اب اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا، جو اس کی بہنوں کے ساتھ ہو چکا ہے اور یہ خیال بے حد روح فرسا تھا۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

قدموں کی چاپ اسے اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ مگر وہ بہت ہلکی تھی۔ حالانکہ اندر آنے والا اب کوٹھری میں آ چکا ہوگا۔ اس سے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ صندوق پوری طرح بند نہیں ہوا ہے اور جیسے اسے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے، اسی طرح کوٹھری میں آنے والے کو اس کی سسکیاں سنائی دے رہی ہوں گی۔ مگر اب اس میں ہلنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ لرزتے ہوئے ہاتھ اس کے قابو میں نہیں تھے۔ وہ صندوق کو پوری طرح بند کرنے کی کوشش کرتی تو زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ اپنی موجودگی کا راز افشا کر دیتی۔

اور تو کچھ نہیں ہوا، اس پر وحشت اور گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ خوف اتنا بڑھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو گئی۔ اب وہ تصور میں اپنے ساتھ وہی کچھ ہوتے دیکھ رہی تھی، جو اس کی بہنوں کے ساتھ ہوا تھا۔

باہر کسی نے کچھ کہا۔ اس نے آواز سنی۔ لیکن ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکی۔ بس اسے یہ خیال آیا کہ آنے والے کے اور ساتھی بھی آ گئے ہیں اور وہ ان سے کچھ کہہ رہا ہے۔ اس کا خوف اور بڑھ گیا۔ اب اسے کوئی نہیں بچا سکتا......

پھر کسی نے صندوق کھول دیا۔ نور بانو کو ایسا لگا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔ اپنا ہاتھ سختی سے منہ پر جمائے جمائے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دل میں دعا کرنے لگی کہ صندوق کھولنے والا لحاف نہ ہٹائے۔

مگر آنکھیں بند ہونے کے باوجود اسے احساس ہو گیا کہ لحاف ہٹا دیے گئے ہیں۔ اب اسے چیخنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اب تو چیخیں روکنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور منہ پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے چلائی۔ ''ہٹ جاؤ۔ مجھے چھوڑ دو۔ رحم کرو مجھ پر۔''

اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ سامنے کوئی تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ سکی۔ وہ بری طرح لرز رہی تھی اور پھر اس کے ہوش و حواس پوری طرح اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ ایک طرف گرتی چلی گئی۔

❁......❁......❁

رگھو اور رنجنا اوپر چلے آئے تھے۔ اور دونوں روئے چلے جا رہے تھے۔ رنجنا کو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ رگھو کے زخمی ہاتھوں اور ماتھے کی فکر کرنی ہے۔ بس وہ تو یہ سوچ کر روئے جا رہی تھی کہ نیچے اتنے پیارے پیارے لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔ اور رگھو اس خیال سے رو رہا تھا کہ مالک کو کیا منہ دکھائے گا۔

کچھ دیر گزری تو انھیں ایسا لگا کہ زینے پر کوئی چڑھ رہا ہے۔ رگھو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے لاٹھی اٹھالی۔

مگر اگلے ہی لمحے لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اوپر آنے والا چھوٹا ٹھاکر تھا اور اس نے ہاتھوں پر ایک لڑکی کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، رگھو تیزی سے اس کے قدموں میں سر رکھ کر بیٹھ گیا۔ ''مجھے شما کر دو مالک۔ میں کچھ نہیں کر سکا۔ مجھے شما کر دو مالک۔''

''رگھو...... ہوش میں آ۔ مجھے راستہ دے۔'' اوتار سنگھ نے اسے ڈانٹا۔

لیکن رگھو نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ ''میں مجبور تھا مالک۔ انھوں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔'' وہ اپنی کہے جا رہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے رگھو۔ انھوں نے گلی کے ہر گھر کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ تو اٹھ جا رگھو۔ مجھے راستہ دے۔''

رگھو اٹھ کھڑا ہوا۔ اوتار سنگھ تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا، جو کبھی اس کے ویر جی...... وصال دین کے استعمال میں رہتا تھا۔ وہاں اس نے لڑکی کو بستر پر لٹایا اور پھر کمرے سے باہر آ گیا۔

رگھو اور رنجنا سر جھکائے کھڑے تھے۔ ''رگھو...... تم جاؤ اور گلی کے تمام گھروں کے دروازے کھول کر آ جاؤ۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''لیکن مالک اپنا دروازہ بھی تو بند ہے۔ کھلا ہوتا تو......''

''میں اڑ کر تو نہیں آیا ہوں رگھو۔ بیچ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ماں جی کے......'' ماں جی کا نام لیتے ہوئے اوتار سنگھ کی آواز بھرا گئی...... ''گھر کا دروازہ ٹوٹا ہوا ہے۔ میری بات دھیان سے سن رگھو۔ ماں جی کے گھر میں جاتے ہی بیچ کا دروازہ اس طرف سے بند کر دینا۔ پھر گلی کے تمام دروازے کھول کر آؤ تو اپنا دروازہ بھی کھول لینا اور اسی سے اندر آنا۔''

بات تو رگھو کی سمجھ میں آ گئی۔ لیکن وہ الجھ گیا۔ لیکن وجہ پوچھنا اس کے مزاج میں ہی نہیں تھا۔ ''جو حکم مالک۔'' اس نے کہا اور جانے کے لیے پلٹا۔

''اور ہاں، ایک بات اور۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''کسی کو نہیں بتانا کہ وہ لڑکی ہمارے گھر میں ہے۔''

رگھو پلٹ کر اس کی بات سن رہا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

رگھو کے جانے کے بعد اوتار سنگھ رنجنا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم بھی دھیان سے سنو رنجنا۔ اندر جاؤ اور اس لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ مگر پہلے دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ اسے سمجھانا کہ وہ محفوظ ہے۔ کہنا کہ وہ چیخے چلائے نہیں۔ زور سے بولے بھی نہیں۔ کسی کو اس کی یہاں موجودگی کا پتا نہ چلے، اسی میں اس کی بہتری ہے۔ جن لوگوں نے حملہ کیا تھا، ممکن ہے ان میں کوئی جان پہچان والا بھی ہو۔ ایسا ہے تو انھیں علم ہوگا کہ تیسری لڑکی موجود نہیں تھی۔ تو وہ اس کے چکر میں رہیں گے۔''

''مگر پڑوسیوں کو تو معلوم ہونا چاہیے چھوٹے ٹھاکر......''

''یہی تو میں نہیں چاہتا۔'' اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''دیکھو، پڑوسیوں کو پتا چلے گا تو وہ لڑکی کو یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ کوئی مسلمان گھر اسے پناہ دے گا۔ مگر مسلمان گھر سب خطرے میں ہیں۔ جبکہ ہمارا گھر محفوظ ہے۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکا اور ماں جی کا پورا گھر ختم ہو گیا۔'' اوتار سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اب میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ لڑکی بچ جائے۔ اسے کچھ نہ ہو۔ میری شرمندگی کچھ تو کم ہو۔''

رنجنا کا دل کٹنے لگا۔ ''آپ فکر نہ کریں مالک۔ وہ مجھے جانتی ہے۔''

''بس تم اس کے پاس جاؤ اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔''

رنجنا کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اوتار سنگھ اکیلا رہ گیا۔ واپسی کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ جو کچھ ہو چکا تھا، اس پر سوچنے کی اسے مہلت ملی تھی۔ اور لڑکی کے بارے میں بغیر سوچے سمجھے اس نے جو فیصلہ کیا تھا، اس پر اسے حیرت ہوئی تھی۔ اس بحران میں اس نے کب

اور کیسے یہ سب کچھ سوچ لیا۔ ویسے یہ حقیقت تھی کہ مسلمانوں کے پاس وہ لڑکی غیر محفوظ رہتی اور اب اس لڑکی کی حفاظت اس کا مشن تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے سات پردوں میں چھپا کر رکھے گا اور اسے کوئی ضرر نہیں پہنچنے دے گا۔

اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے بہت بڑا بحران دیکھا ہے۔ اور ابھی وہ اس پر سوچ نہیں سکتا کیونکہ اس نے سوچنے کی کوشش کی تو اس کی نگاہوں میں ماں جی کی بے یارومددگار لاش بھر گئی۔ پھر وہ دونوں لڑکیاں...... کیا وہ یہ مناظر کبھی بھول سکے گا؟ کیا اس احساسِ جرم سے کبھی اسے نجات مل سکے گی......؟

رگھو آیا تو اسے ان سوچوں سے نجات مل گئی۔ مگر رگھو کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔ اس کی پیشانی زخمی اور چہرہ لہولہان تھا۔ ہاتھ بھی لہولہان ہو رہے تھے۔ ''ارے...... یہ تمھیں کیا ہوا ہے رگھو؟'' اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

رگھو پھر اس کے پیروں میں گر گیا۔ ''مجھے شما کر دو مالک، مجھے شما کر دو۔''

اوتار سنگھ جھنجلا گیا۔ ''میں پوچھ رہا ہوں، ہوا کیا ہے؟''

''آپ کے حکم پر ان کو بچانے کے لیے میں جان بھی دے دیتا مالک۔'' رگھو اب رو رہا تھا۔ ''مگر موقع ہی نہیں ملا۔ بس یہی کچھ کر سکا میں۔''

''میں پھر پوچھ رہا ہوں کہ ہوا کیا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم مالک۔ بس میں چھری سے بیچ کا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''اچھا...... اب چلو میرے ساتھ۔'' اوتار سنگھ نے جھٹکے سے اسے کھڑا کیا۔ اس کے زخم دھلا کر اس کی مرہم پٹی کرنی تھی۔

❀......❀......❀

اس واقعے کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ مارے جانے والوں کی تدفین پہلے ہی دن ہو گئی تھی۔ متاثرہ گھر میں سب سے پہلے محلے کی خواتین داخل ہوئی تھیں۔ ان میں مسلمان بھی تھیں اور ہندو بھی۔ اندر جو کچھ انھوں نے دیکھا تھا، اس نے ان کی روحوں تک کو لرزا دیا تھا۔ پردہ دار عورتوں کی بےلباسی اور ان کے جسموں پر درندگی کے نشانات کوئی کبھی نہیں بھول سکا۔

اس واقعے کے نتیجے میں مسلمان بری طرح سہم گئے تھے۔

نور بانو کو پہلے دن ہوش آیا تو اس کے سامنے ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ رنجنا اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہی تھی۔ نور بانو کے اندر بے شمار چیخیں گھٹی ہوئی تھیں، جنھیں وہ دباتی رہی تھی۔ جانا پہچانا چہرہ دیکھتے ہی اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا......

رنجنا نے گھبرا کر بے ساختہ کہا۔ ''چیخنا مت منجھلی بی بی۔ وہ لوگ تمھیں ڈھونڈتے پھر

رہے ہیں۔''

یہ سنتے ہی نور بانو کے دانت بھنچ گئے۔ آنکھوں سے خالی پن جھانکنے لگا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

رنجنا کو نہیں پتا تھا کہ اس نے بے خبری میں ایک مسئلے کو ہمیشہ کے لیے حل کر دیا ہے۔ یہ جملہ نہ ہوتا تو نور بانو اس طرح چیختی کہ پورا محلہ اکٹھا ہو جاتا۔ اس جملے نے نور بانو کو سمجھا دیا...... یاد دلا دیا کہ وہ چیخے گی...... آواز بھی نکالے گی تو گویا ظالموں کو اپنا پتا دے رہی ہو گی۔

بے چاری رنجنا تو پریشان ہو گئی کہ منجھلی بی بی پھر بے ہوش ہو گئی ہے۔

اس شام کو نور بانو کو دوبارہ ہوش آیا تو اس کے تمام لوگوں کی تدفین ہو چکی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر رنجنا کو دیکھا اور بولی۔ ''تم رنجنا ہی ہو نا۔''

''ہاں منجھلی بی بی۔'' رنجنا کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ''مجھے بھول گئیں؟''

''بھول گئی!'' نور بانو جیسے ذہن پر زور دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''نہیں...... بھولی تو نہیں۔ مگر لگتا ہے، کچھ کچھ بھول گئی ہوں۔'' پھر اچانک اس نے پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

''ہمارے گھر میں۔ اپنے مکان کے اوپری حصے میں۔''

''میں یہاں کیوں آئی ہوں؟ کون لایا ہے مجھے یہاں؟''

رنجنا نے اسے غور سے دیکھا۔ ''آپ کو یاد نہیں۔''

نور بانو نے پھر ذہن پر زور دیا اور اچانک تھر تھر کانپنے لگی۔ ''کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ لیکن زیادہ یاد کروں تو ڈر لگتا ہے...... بہت ڈر لگتا ہے...... اتنا کہ لگتا ہے کہ میں خوف سے مر جاؤں گی۔''

رنجنا پڑھی لکھی نہیں تھی۔ لیکن عقل مند تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ خود سے سب کچھ بتانا ٹھیک نہیں۔ اگر وہ نور بانو کے سوالوں کے جواب دے گی تو ممکن ہے، وہ بھڑک جائے یا پھر سے دورہ پڑ جائے۔ اور خاص طور پر یہ بات کہ اسے چھوٹے ٹھاکر اوپر لائے ہیں۔ ''آپ کو یاد نہیں کہ آپ خود یہاں آئی ہیں۔'' اس نے گول مول بات کی۔

''میں یہاں کیوں آئی؟ پہلے تو کبھی میں یہاں نہیں آئی۔''

''اب یہ تو آپ خود ہی یاد کریں۔''

نور بانو نے پھر ذہن پر زور دیا...... اور اس پر پھر لرزہ چڑھ گیا۔ ''یاد نہیں آتا۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''مگر میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے گھر جاؤں گی۔''

وہ بہت تیزی سے اٹھی تھی۔ رنجنا گھبرا گئی کہ اب اسے کیسے روکے۔ مگر اسی لمحے نور بانو چکرائی اور گر گئی ہے۔ اچھا یہ ہوا کہ وہ پلنگ پر گری تھی۔ اسے چوٹ تو نہیں لگی۔ لیکن جیسے اسے چکر

آیا تھا، اس سے وہ خوف زدہ ہوگئی۔ ''یہ کیا ہوا ہے مجھے؟'' اس نے گھبرا کر کہا۔ ''مجھ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا ہے۔''

رنجنا نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ ''آپ یہاں اس لیے ہیں منجھلی بی بی کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے تو چلی جایئے گا۔'' رنجنا جانتی تھی کہ اسے کمزوری ہے۔ رات سے اب تک اس نے کچھ کھایا بھی تو نہیں تھا۔ بے ہوشی کے دوران اس نے اسے دلیہ کھلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دانت پر دانت سختی سے جمے ہونے کی وجہ سے اس کے حلق میں کچھ بھی نہیں گیا تھا۔

''طبیعت خراب ہو تو آدمی اپنے گھر میں رہتا ہے۔'' نور بانو کے لہجے میں الجھن تھی۔

''اچھا...... اماں کو بلا دو۔''

''بڑی بیگم تو نہیں ہیں۔'' رنجنا نے بے ساختہ کہا۔

''کیوں......؟ وہ کہاں ہیں؟''

رنجنا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ کاش وہ چھوٹے ٹھاکر سے پوچھ سکتی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ بڑی بیگم آگرہ میں اپنے رشتہ داروں کا ذکر کرتی تھیں۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''وہ تو آگرہ گئی ہیں...... آپ کے ماموں کے ہاں۔''

''تو آپی کو بلا دو۔''

''گھر میں کوئی نہیں ہے منجھلی بی بی۔ سب لوگ بڑی بیگم کے ساتھ گئے ہیں۔''

''عجیب بات ہے۔''

''آپ کو بیماری کی وجہ سے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ اچھا...... میں آپ کے لیے دلیہ لاتی ہوں منجھلی بی بی۔''

رنجنا نے بڑی مشکل سے بہلا پھسلا کر اسے دلیہ کھلایا۔ کھانے کے ذرا دیر بعد نور بانو سو گئی۔ سونا کیسا، وہ تو پیٹ بھرنے کے بعد کی غشی تھی۔

رنجنا نے وہ سب کچھ اوتار سنگھ کو سنایا۔ اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''یہ تو قدرت کی مدد ہے۔ ورنہ بڑا مسئلہ ہو جاتا۔ لیکن رنجنا، ہم اسے ڈاکٹر کو بھی نہیں دکھا سکتے۔ تمھیں ہی اسے سنبھالنا ہوگا۔''

''میں کیسے سنبھالوں گی مالک۔ ان کے تو دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔''

''یہ کوئی اثر وثر نہیں ہے۔'' اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اس نے جو کچھ دیکھا ہے، اسے بھول جانا چاہتی ہے۔ تم اس سے اصرار کبھی نہ کرنا۔ بس اسے دھیرے دھیرے سے یاد کرنے کا کہتی رہنا۔ تھوڑا تھوڑا یاد آئے گا تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ ایک دم یاد آئے گا تو اس کے لیے بڑا صدمہ ہوگا۔''

''اور ایک دم سب یاد آ گیا تو؟''

''جیسے ہی کچھ یاد آئے تو بات بدل دینا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بات آگے بڑھانا۔''

رنجنا اب بھی گھبرا رہی تھی۔ مگر چھوٹے ٹھاکر کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

اوتار سنگھ کی بات ٹھیک تھی۔ نور بانو نے جو کچھ دیکھا تھا، اس نے اس کو ذہنی طور پر تقسیم کر دیا تھا۔ ذہن کا ایک حصہ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ جبکہ دوسرا حصہ اسے یاد رکھنے پر مصر تھا۔ یوں وہ ایک عارضی دماغی اختلال میں مبتلا ہوگئی تھی۔

تین دن گزرے تو نور بانو کی کمزوری دور ہوگئی۔ رنجنا نے اس کے کھانے پینے کا بہت خیال رکھا تھا۔

چوتھے دن بیٹھے بیٹھے نور بانو نے کہا۔ ''تمھیں پتا ہے، رات کو ہمارے گھر میں کچھ لوگ گھس آئے تھے۔''

رنجنا کو چھوٹے ٹھاکر کی ہدایت یاد تھی۔ وہ بولی۔ ''ہاں...... مجھے معلوم ہے۔''

''تمھیں معلوم ہے، اس کے بعد کیا ہوا؟'' نور بانو نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں...... یہ تو مجھے نہیں معلوم۔'' رنجنا نے کہا۔ ''تمھیں یاد نہیں؟''

نور بانو ذہن پر زور دے رہی تھی۔ ''کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''اماں گھبرائی ہوئی آئی تھیں اور ہمیں سوتے سے اٹھایا تھا۔ کہنے لگیں...... تم لوگ کہیں چھپ جاؤ۔ جلدی کرو۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''ہم تینوں اٹھ کر کوٹھری کی طرف بھاگیں......'' یہ کہتے کہتے نور بانو پر لرزہ طاری ہو گیا۔

رنجنا نے جلدی سے بات بدلی۔ ''منجھلی بی بی...... تمھیں اپنے پتا جی یاد ہیں۔''

''ابا!'' نور بانو نے برا مانتے ہوئے تصحیح کی۔ ''ہاں...... مجھے ابا یاد ہیں۔ ابا بہت اچھے تھے۔'' اتنی دیر میں وہ نارمل ہوگئی۔ اب وہ جیسے دور کہیں دیکھ رہی تھی۔ ''ابا ہمیں بازار لے کر جاتے تھے۔ عید کے کپڑے ابا خود دلاتے تھے......''

''میرے پتا جی بھی بہت اچھے تھے۔'' رنجنا نے کہا۔ ''ماں باپ سب کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مجھے اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ پتا جی کے مرتے سمے میں ان کے پاس نہیں تھی۔ میں انھیں دیکھ بھی نہیں سکی آخری بار۔''

''تمھارے پتا جی کو کیا ہوا تھا رنجنا؟''

''آپ کو یاد نہیں منجھلی بی بی؟''

''ہاں...... یاد آ گیا۔ تمہارا تو پورا گاؤں ختم ہو گیا تھا اس آندھی میں۔'' نور بانو کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

''ہاں منجھلی بی بی۔ ہمارا تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ ماں باپ، بہن بھائی، سب رشتے دار ریت کے تلے دب کر ختم ہو گئے۔ کریا کرم بھی نصیب نہیں ہوا کسی کو۔'' رنجنا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اس لڑکی کو بہلانے کی کوشش میں اپنے زخم ہرے کر بیٹھی تھی۔

نور بانو ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ ''ایسے نہ رو رنجنا۔ پتا ہے، موت تو اللہ کا حکم ہوتی ہے۔ آنی ہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ بہانہ چاہے کوئی ہو۔ زندہ رہنے والوں کو تو بس صبر کرنا ہوتا ہے...... اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے آپ کو زندگی دی...... مہلت دی۔''

''جس کا بھرا پُرا پریوار ختم ہو گیا ہو...... کوئی بھی نہ بچا ہو، اسے صبر کیسے آ سکتا ہے منجھلی بی بی۔''

''صبر تو کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔'' نور بانو نے رنجنا کا ہاتھ تھام لیا اور اسے سہلانے لگی۔

اگلے روز رنجنا نے پھر بات چھیڑی۔ ''جب لوگ گھر میں گھس آئے اور بڑی بیگم نے آپ لوگوں سے چھپنے کو کہا تو آپ کہاں چھپی تھیں منجھلی بی بی؟''

نور بانو نے ذہن پر زور دیا...... اور اگلے ہی لمحے جیسے وہ ٹرانس میں آ گئی۔ اس کا جسم لرزنے لگا، آنکھیں پھیل گئیں۔ جو کچھ اس پر گزری تھی، جو کچھ اس نے دیکھا تھا، وہ سنانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

رنجنا اس کا ہاتھ تھام کر اسے سہلا رہی تھی۔ ''بس...... اب بس کرو منجھلی بی بی۔ بھول جاؤ وہ سب۔''

''بھولی ہوئی تو تھی۔ کب تک بھولی رہتی۔ اب سب یاد آ رہا ہے۔'' نور بانو نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ پھر وہ چونکی۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ میں بیمار ہوں۔ اس لیے یہاں ہوں اور اماں...... اور سب لوگ آگرہ گئے ہیں۔''

''بیمار تو آپ تھیں منجھلی بی بی۔ اور اب بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہیں۔''

''اماں کہاں ہیں؟ میری بہنیں کس حال میں ہیں؟'' نور بانو کا لہجہ ہذیانی ہو گیا۔ ''میں یہاں نہیں رکنا چاہتی۔ میں نیچے جاؤں گی...... اپنے گھر۔''

رنجنا گھبرا گئی۔ سخت مرحلہ آ گیا تھا۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کا انداز اختیار کیا۔ ''میری بات دھیان سے سنو منجھلی بی بی۔ ہم تم ایک ہی حال میں ہیں۔ ہمارے دکھ ایک جیسے ہیں۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''تمہارا بھی سب کچھ ختم ہو گیا۔ کچھ بھی نہیں بچا منجھلی بی بی۔''

نور بانو یوں بلک کر روئی کہ رنجنا کا دل پھٹنے لگا۔ اس نے نور بانو کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اچھا ہے، رو لے۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اس نے دل میں سوچا۔ لیکن نور بانو کی آواز بلند ہونے لگی تو اسے ٹوکنا پڑا۔ ''منجھلی بی بی...... خود پر قابو رکھو۔ تمہاری آواز گھر سے باہر نہیں جانی چاہیے۔''

نور بانو نے جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا اور عجیب سی نظروں سے رنجنا کو دیکھا۔ ''کیوں؟ تم نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے؟'' یہ کہتے کہتے وہ سہم گئی۔

''نہیں۔ پرنتو تم کو چھپا رکھا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ تم یہاں ہو۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ جنھوں نے تمہارا گھر اجاڑا ہے، ہو سکتا ہے، وہ تمہاری تلاش میں ہوں۔''

نور بانو اور سہم گئی۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ لوگ تیسری لڑکی کو تلاش کر رہے تھے۔ ''مگر تم لوگ بھی تو ہندو ہو۔ میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ محلے میں مسلمان گھر بھی تو ہیں۔ مجھے ان میں سے کسی کے ہاں بھیج دو۔''

رنجنا کے دل پر چوٹ لگی۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو منجھلی بی بی۔ ہم تمھارے گھر میں رہتے ہیں۔ برسوں کا ساتھ ہے ہمارا۔ میں تمھارے گھر میں آتی تھی۔ گھنٹوں بیٹھتی تھی...... میرے مالک کو بڑی بیگم نے بیٹا بنایا تھا۔ اور تم کہتی ہو کہ ہم پر اعتبار نہیں کر سکتیں۔ اپمان کر رہی ہو ہمارا۔'' رنجنا کے لہجے میں شکایت تھی۔

''ہاں...... اب میں کسی ہندو پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ میں نے درندگی دیکھی ہے۔ تم مجھے کسی مسلمان گھر میں پہنچا دو۔''

رنجنا کو غصہ بھی آیا اور جھنجلاہٹ بھی ہوئی۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کے خیال سے وہ اسے پی گئی۔ ''سنو منجھلی بی بی، یہاں سے زیادہ محفوظ تم کہیں بھی نہیں ہو۔ مسلمانوں کے تمام گھر خطرے میں ہیں۔ کسی بھی [illegible] بھی گھر میں وہی کچھ ہو سکتا ہے، جو تمھارے گھر میں ہوا تھا۔ تمھیں اپنی بہنیں یاد نہیں [illegible]''

اس حوالے نے نور بانو کو ہلا کر رکھ دیا۔ بہنوں پر جو اس نے گزرتے دیکھی تھی، وہ اس کی نگاہوں میں پھر گئی۔ وہ پوری جان سے کانپنے لگی۔ کیا اس کے ساتھ بھی وہی سب ہو گا۔ یہ تصور بھی اس کے لیے روح فرسا تھا اور یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ کوئی مسلمان گھر بھی محفوظ نہیں ہے۔ البتہ یہ گھر محفوظ ہے۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیا یہاں وہ محفوظ ہے۔

اسے یاد تھا۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں کبھی اچھا گمان نہیں رکھا تھا۔ اس

کے معاملے میں وہ اماں سے ہمیشہ اختلاف اور بحث کرتی رہی تھی۔ اسے ہمیشہ چھوٹے ٹھاکر کی نیت پر شبہ رہا تھا۔ اور اب تو ہندوؤں کے بارے میں اس کی رائے بہت ہی خراب ہو گئی تھی۔

تو کیا یہ ممکن نہیں کہ یہاں بھی وہ لٹ جائے۔ اس نے سوچا۔

وہ بہت کم عمر تھی۔ لیکن بہت بڑے سانحے کم عمروں کو بھی جہاں دیدہ بنا دیتے ہیں۔ وہ بڑے لوگوں کے انداز میں سوچنے لگی۔ خطرہ یہاں بھی تھا۔ مگر یہاں سے باہر بہت بڑا خطرہ تھا۔ وہ یہاں بھی لٹ سکتی تھی۔ لیکن کم از کم یہاں اس کے ساتھ وہ کچھ نہیں ہوگا، جو اس کی بہنوں کے ساتھ ہوا تھا اور یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے بھی کچھ کر سکتی ہے۔ اور بچاؤ ممکن نہ ہو تو وہ جان بھی دے سکتی ہے۔

اس نے گہری سانس لی۔ وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔ ''تم جانتی ہو، رنجنا دیدی کہ میں پردہ کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ہم سب کو پتا ہے۔ خود دیکھ لو کہ چھوٹے ٹھاکر اس کمرے کے پاس سے بھی نہیں گزرے ہیں۔''

اچانک نور بانو کو ایک خیال آیا۔ ''یہ بتاؤ، مجھے یہاں کون لایا تھا؟''

''چھوٹے ٹھاکر لائے تھے۔'' رنجنا کی نظریں جھک گئیں۔ ''مگر وہ تو مجبوری تھی۔ ان کلمونہوں نے تمہارا دروازہ توڑنے سے پہلے گلی کے تمام گھروں کے دروازے بند کر دیے تھے۔ کوئی اپنے گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر شملہ سے آئے تو انھوں نے تمہارے گھر کا دروازہ ٹوٹا دیکھا۔ اندر گئے تو سب ختم ہو چکے تھے۔ تم بے ہوش تھیں۔ وہ اور کیا کرتے۔''

نور بانو کو شرم بھی آئی اور کراہت بھی۔ لیکن اب وہ سمجھوتہ کرنا سیکھ رہی تھی۔ جو کچھ اس کی بہنوں کے ساتھ ہوا تھا، اس کے مقابلے میں تو چھوٹے ٹھاکر کا آنا اور اسے یہاں لانا بہت بڑی نعمت ہی تھا۔

''اچھا رنجنا دیدی، اب مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

رنجنا وہاں سے ہٹ آئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ نور بانو اکیلے میں اپنے بچھڑے ہوؤں کا غم کرنا چاہتی ہے۔

مگر نور بانو کو چپ لگ گئی تھی۔ اور کھانے پینے میں وہ دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس نے کھانے سے انکار کیا ہو۔ بس اتنا تھا کہ وہ کم...... بہت ہی کم کھا رہی تھی۔ اور وہ دو ہی کیفیات میں نظر آتی تھی۔ یا تو وہ رو رہی ہوتی یا پھر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوتی۔ رنجنا یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ نور بانو کیا سوچ رہی ہے۔ کیونکہ سوچنے کے دوران اس کا چہرہ بے تاثر ہوتا تھا۔

جو کچھ نور بانو پر گزری تھی اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اس نے اس کی پوری شخصیت کو تبدیل کر ڈالا تھا۔ بڑے المیے آدمی کے لیے ہمیشہ انقلابی ثابت ہوتے ہیں۔ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ تبدیلی مثبت ہے یا منفی۔ اس میں آدمی کی عمر اور المیے سے پہلے جو اس کی شخصیت تھی، اس کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

نور بانو کم عمر تھی اور اس کی شخصیت بھی پختہ نہیں تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کی شخصیت زیر تعمیر تھی۔ جس سانحے کی وہ عینی شاہد تھی، وہ بہت بڑا اور بہت الم ناک تھا۔ ایسے سانحے بہت گہرا، بہت دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ بلکہ ان کے اثرات سے آدمی بعض اوقات برسوں بعد بھی متعارف ہوتا ہے۔ وہ زلزلے کی طرح ہوتے ہیں۔ زلزلے کی شدت زیادہ ہو تو ایک طرف تو دیواریں گر جاتی ہیں۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوتا ہے کہ زلزلے سے متاثرہ کھڑی دیوار کو کافی عرصے بعد چھو کر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ اسے تو زلزلے نے ہلا دیا تھا۔ وہ تو بس ایک ہلکے سے دھکے کی محتاج ہے۔

دو دن نور بانو سوچتی رہی۔ اس حقیقت کو اس نے قبول کر لیا تھا کہ جانے والے تو چلے گئے۔ جیسے بھی گئے، ان کا نصیب۔ جو کچھ ہوا، اسے تو بھول جانا ہی بہتر ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ بچ گئی۔ وہ زندہ ہے۔ اب اسے ایسے رہنا ہے کہ جو کچھ بہنوں کے ساتھ ہوا، وہ اس کے ساتھ نہ ہو۔ کیونکہ خطرات تو اتنے ہی ہیں۔

اپنی بقا کا مسئلہ سامنے آیا تو الم ناک سانحہ کہیں بہت پیچھے، بہت اندر گہرائی میں چلا گیا۔ شعور میں صرف اپنے تحفظ کا خیال رہ گیا۔ اس کے لیے اسے سمجھوتے کرنے تھے۔ پہلے کبھی رنجنا کھانے کی کوئی چیز نیچے لاتی تھی تو وہ نہیں کھاتی تھی۔ مگر اب وہ کھانا پڑ رہا تھا۔ نہ کھاتی تو کیا کرتی۔ سو اس نے اتنا سمجھوتہ کر لیا کہ جینے کے لیے کھا لیتی تھی۔ پیٹ بھر کر کھانا وہ بھول گئی۔

ان دو دنوں میں اس نے سوچا اور کچھ فیصلے کر لیے۔

اس روز اس نے رنجنا سے کہا۔ ''میں چھوٹے ٹھاکر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں ابھی بلا لاتی ہوں انھیں۔''

تھوڑی دیر بعد چھوٹا ٹھاکر دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے گلی میں کسی بھی مسلمان کے گھر بھیج دیں۔'' نور بانو نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا آپ یہاں خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں؟''

نور بانو ہر مصلحت، ہر سمجھوتا، ہر احتیاط بھول گئی۔ ''جی ہاں۔ یہاں کئی اعتبار سے میں غیر محفوظ ہوں۔''

"کئی اعتبار سے؟" چھوٹے ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں۔ آپ کے ہاں کھانے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔ یہ ایمان کا معاملہ ہے اور کتنے دن سے میں نے نماز بھی نہیں پڑھی۔"

"نماز تو آپ پڑھ سکتی ہیں۔ یہ آپ کا کمرا بالکل الگ تھلگ ہے۔"

"نماز کے لیے...... قرآن کی تلاوت کے لیے وضو کرنا ہوتا ہے اور مجھے تو لگتا ہے کہ میں اس کمرے میں قید ہوں۔"

"میں سمجھ گیا۔ دیکھیں...... میں نیچے چلا جاتا ہوں۔ وہیں آپ کی ڈیوڑھی میں رہ لوں گا۔ آپ پورے گھر میں گھوم پھر سکیں گی۔ اور میں نیچے سے آپ کے برتن لا دوں گا۔ آپ اپنا کھانا خود پکا لیں۔ تب تو آپ کا ایمان محفوظ رہے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کو آپ کے گھر سے نکالوں، یہ اچھا تو نہیں لگے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ میں کسی مسلمان کے گھر چلی جاؤں۔"

"دیکھیے...... آپ بھی سمجھتی ہیں کہ مسلمانوں کے گھر غیر محفوظ ہیں۔ کسی بھی وقت کسی کے گھر پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ ویسے تو آپ کہیں بھی رہیں، میں آپ کی حفاظت کروں گا۔ میرے جیتے جی آپ پر آنچ نہیں آئے گی۔ لیکن ایک بات اور ہے۔ آپ ایک ہفتہ میرے گھر میں رہنے کے بعد کہیں اور جائیں گی تو لوگ آپ کو اچھا نہیں سمجھیں گے۔ وہ آپ کے بارے میں میری بات ہی سوچیں گے۔"

اس کی شائستگی اور سوچ کی گہرائی نے نور بانو کو متاثر کیا۔ لیکن ہندوؤں سے نفرت اس کے وجود کی گہرائی میں اتر چکی تھی۔ اس نے بے حد کڑوے لہجے میں کہا۔ "آپ کو میری حفاظت کی اتنی فکر کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ میں نے ماں جی سے آپ سب کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا......"

"اور وہ آپ پورا نہیں کر سکے۔" نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کے لہجے میں الزام تھا...... شکایت تھی۔

"میں مجبور تھا۔ مجھے جانا پڑا۔ اسے قسمت ہی کہیں گے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مگر اب کوتاہی نہیں کروں گا۔ آپ شاید نہیں جانتیں، ماں جی نے مجھے بیٹا بنایا تھا۔ اور میں سچ مچ انھیں ماں سمجھتا تھا۔ جو کچھ ہوا، وہ میرے ضمیر پر بوجھ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"

"مگر میں نہ آپ پر بوجھ بننا چاہتی ہوں نہ آپ کے ضمیر پر۔"

"جو آپ چاہتی ہیں، اس میں آپ کا نقصان ہے۔"

"تو پھر میرا مستقبل کیا ہے؟ آپ ساری عمر میری حفاظت تو نہیں کر سکتے۔"

"میں تو کر سکتا ہوں۔ لیکن آپ یہ پسند نہیں کریں گی۔" چھوٹے ٹھاکر نے سادگی سے کہا۔ "آپ کی نظر میں کوئی قابلِ قبول حل ہو تو بتائیں۔"

نور بانو نے چند لمحے سوچا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا کوئی مستقبل تھا ہی نہیں۔ اس کے پاس بچا ہی کیا تھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ "آگرہ میں میرے چچا رہتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"آپ ان کا پتا لکھ دیں۔ میں رگھو کو بھیج کر معلومات کرا لوں گا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ آپ مجھے آگرہ بھجوا دیں۔"

"مسلمان گھرانے تیزی سے ہجرت کر رہے ہیں۔ اس بات کی تصدیق تو ہو جائے کہ وہ لوگ آگرہ میں ہی ہیں۔ پھر میں خود آپ کو وہاں چھوڑ آؤں گا۔"

نور بانو کو اس کی ذمے داری بہت اچھی لگی۔ "چلیں...... ٹھیک ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن اس کام میں دیر نہ کریں۔"

اوتار سنگھ وہاں سے چلا آیا۔

نور بانو کو سکون ہو گیا۔ بس چند ہی دنوں کی بات ہے۔ پھر وہ چچا کے ہاں چلی جائے گی۔

❀......❀......❀

اوتار سنگھ اسی روز نیچے منتقل ہو گیا!

نیچے کے گھر میں جس روز جنازے اٹھے تھے، دروازہ اس نے اسی دن لگوا لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب وہاں لوٹ مار ہو۔ ایک لڑکی زندہ تھی، اور نیچے جو کچھ تھا، اب اسی کا تھا۔ اسے لڑکی ہی کی نہیں، اس کے مال و متاع کی بھی حفاظت کرنی تھی۔

بیچ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اوتار سنگھ نے ڈیوڑھی میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔

اگلے روز اس نے نور بانو کے چچا کا پتا دے کر رگھو کو آگرہ بھیج دیا۔

نور بانو قدرے پُرسکون ہو گئی۔ اب گھر میں وہ آزادانہ گھوم پھر سکتی تھی۔ اس کی نماز کا سلسلہ بھی بحال ہو گیا۔ لیکن رات کی نیند اس کا مسئلہ بن گئی۔ وہ بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہتی تھی۔ نگاہوں میں بہنوں کی بے آبروئی کے اذیت ناک مناظر پھرتے رہتے تھے۔ وہ بہت دیر سے سوتی اور وہ کوئی پُرسکون نیند نہیں ہوتی تھی۔ وہ ڈراؤنے خواب دیکھتی۔ آنکھ کھلتی تو اس کا پورا جسم پسینے میں نہا رہا ہوتا۔

پھر آس کی وہ ڈوری بھی ٹوٹ گئی۔ رگھو نے آ کر بتایا کہ اس کے چچا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان چلے گئے ہیں۔

اس روز اوتار سنگھ اس سے بات کرنے کے لیے آیا۔ "اب میرا کیا ہوگا؟" نور بانو کے

لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''ہم پاکستان چلیں گے اور انھیں تلاش کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو ان تک پہنچادوں گا۔'' اوتار سنگھ نے بے حد اعتماد سے کہا۔

''پتا معلوم نہ ہو تو چھوٹے سے شہر میں کسی کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہوتا اتنے بڑے ملک میں انھیں کیسے تلاش کریں۔''

''سب ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔''

نور بانو کا دن بہر حال اچھا گزرتا تھا۔ یہ احساس کہ وہ اپنے ہی گھر میں ہے اور آزادی سے چل پھر رہی ہے، بہت خوش کن تھا۔ البتہ نیچے جانے کے خیال سے اس پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

پھر ایک دن رنجنا نے اسے کچھ نوٹ دیے۔

''یہ کیا ہے؟'' نور بانو نے ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔

''یہ مکان کا کرایہ ہے اس مہینے کا۔''

''میں...... میں کیا کروں گی ان کا۔''

''رکھیں اپنے پاس۔ اور ہاں، مالک کہہ رہے تھے کہ آپ نیچے سے اپنی تمام قیمتی چیزیں اور نقدی اوپر لے آئیں اور اپنے پاس رکھیں۔''

یہ سب کچھ تو نور بانو نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ''رہنے دو۔ مجھے کیا کرنا ہے کسی چیز کا۔''

''پھر بھی منجھلی بی بی......''

''نہیں۔ مجھ میں نیچے جانے کی ہمت نہیں ہے۔'' نور بانو کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

رنجنا اس کے دل کا حال سمجھ سکتی تھی۔ ''اب کوئی فکر نہ کریں منجھلی بی بی۔ آپ محفوظ ہیں۔''

''میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ میرا دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں اور کوئی میرا اپنا نہیں۔''

''ہم ہیں نا منجھلی بی بی۔''

نور بانو نے کچھ نہیں کہا۔ مگر اس کی وہ خاموشی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ اور رنجنا وہ سب سمجھ رہی تھی۔ اس کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ ہے بھگوان۔ اس نے دل میں سوچا۔ آدمی کا آدمی پر سے اعتبار اٹھ جائے تو کیسا لگتا ہوگا۔

اس رات نور بانو نے پھر ڈراؤنا خواب دیکھا۔ اس کے بعد اس کی نیند اُڑ گئی۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آئی۔ رگھو بھی چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ نیچے ہی رہتا تھا۔ یوں اسے کوٹھا بھی مل گیا تھا۔ دل گھبراتا تو وہ اوپر ہی چلی جاتی۔

وہ کوٹھے پر چلی گئی۔ وہ اندھیری رات تھی...... اماوس کی رات۔ عجیب بات تھی کہ

کوٹھے پر اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہاں کرسی پڑی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ گئی۔ تازہ ہوا میں اس نے گہری گہری سانسیں لیں تو اس کی طبیعت بحال ہوگئی۔

سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ یہ اتنی اندھیری رات کیوں ہے۔ اس پر سوچتے ہوئے اسے یاد آیا کہ رمضان کا چاند ہونے والا ہے۔ جس روز وہ خوف ناک واقعہ ہوا تو شب برات میں دو ہی دن رہ گئے تھے۔ اسی شام تو اماں نے آکا میاں سے کہا تھا کہ کل جا کر شب برات کے لیے سامان لے آنا۔

تو کل پرسوں چاند ہو جائے گا۔ رمضان آ گیا۔ اللہ...... میں کتنی اکیلی ہوگئی۔ رمضان میں کتنی رونق ہوتی تھی گھر میں۔ اب میں اکیلی روزے رکھوں گی! یہ خیال ہی رلا دینے والا تھا۔ وہ روتی رہی...... دیر تک روتی رہی۔

پھر اس نے ایک دم سے آنسو پونچھ دیے۔ اب تو روزوں کی فکر کرتی ہے۔ وہ اٹھ کر منڈھیر کی طرف گئی۔ اس نے باہر جھانکا۔

وہ لمحہ حیرت کا تھا!

نیچے دروازے پر ایک لالٹین رکھی تھی۔ اور لاٹھی اٹھائے ہوئے دو آدمی گلی میں گشت کر رہے تھے۔ پہلے تو وہ ڈر گئی۔ مگر چھوٹا ٹھاکر دروازے کے پاس آیا اور نور بانو نے لالٹین کی روشنی میں اسے دیکھا تو پہچان گئی۔ اس سے پہلے اس نے چھوٹے ٹھاکر کو بس ایک ہی بار دیکھا تھا۔ مگر اس کی وہ جھلک وہ کبھی نہیں بھولی تھی۔

یہ کیا کر رہے ہیں؟ نور بانو نے حیرت سے سوچا۔ آدھی سے زیادہ رات ہو چکی۔ یہ ابھی تک سوئے کیوں نہیں۔

چھوٹا ٹھاکر اور رگھو اب دروازے پر بیٹھ گئے تھے اور ستا رہے تھے۔

نور بانو کچھ دیر وہاں کھڑی رہی۔ پھر پیچھے ہٹ آئی۔ اس کا رخ زینے کی طرف تھا۔

اس بار باورچی خانے میں بھی روشنی تھی اور برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ ''اس وقت کیا کر رہی ہو رنجنا؟''

''چائے بنا رہی ہوں چھوٹے ٹھاکر کے لیے۔''

''اس وقت؟''

''ہاں۔ اس وقت انھیں ضرورت ہوتی ہے نا۔ رات بھر ٹہلتے رہتے ہیں گلی میں۔''

''ہر روز؟''

''جی چھوٹی بی بی، ہر روز۔''

''لیکن کیوں؟''

''پہرہ دیتے ہیں نا۔'' رنجنا نے کہا۔ ''گلی میں مسلمانوں کے گھر ہیں نا۔ ان پر کہیں حملہ نہ ہو۔''

''ہمارا گھر تو لٹ گیا نا۔'' نور بانو نے دکھے دل سے کہا۔

رنجنا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور محبت سے اسے سہلانے لگی۔ ''بس قسمت کی بات ہے۔ منجھلی بی بی۔ مالک گھر میں نہیں تھے۔ وہ ہوتے تو یہ سب کچھ کبھی نہیں ہوتا۔''

نور بانو کو یاد آیا۔ چھوٹے ٹھاکر نے بھی یہی کچھ کہا تھا۔ مگر وضاحت نہیں کی تھی۔ ''تو کیا انھیں پتا تھا کہ یہ سب ہونے والا ہے۔''

''بڑی بیگم نے ان سے کہا تھا کہ انھیں ڈر لگتا ہے۔ مالک نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کے جیتے جی کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس دن سے وہ رات بھر کوٹھے پر ٹہل کر پہرہ دیتے تھے۔ وہ تو ایک مہینے سے پہرہ دے رہے تھے۔''

''تو اس روز کون سی مجبوری آ پڑی تھی کہ وہ گھر میں نہیں تھے۔'' نور بانو کے لہجے میں شکایت تھی۔

''بڑی مجبوری تھی منجھلی بی بی۔ ماسٹر جی کے دیہانت کا تار آیا تھا۔ ماسٹر جی کے بچے تو ان کے پاس جاتے نہیں تھے۔ ماسٹر جی نے مالک سے وچن لیا تھا کہ ان کی چتا کو آگ وہی دیں گے۔ مالک جانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر مجبور تھے۔ وہ رگھو سے کہہ کر گئے تھے کہ بس ایک رات کی بات ہے۔ خیال رکھنا۔''

''لیکن رگھو نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

''ان راکھشسوں نے سب گھروں کے دروازے باہر سے بند کر دیے تھے۔ کوئی بھی گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔''

''تو تمھارے چھوٹے ٹھاکر ہوتے تو کیا کر لیتے۔ وہ بھی باہر نہیں نکل سکتے تھے۔'' نور بانو نے اعتراض کیا۔

''آپ مالک کو نہیں جانتیں منجھلی بی بی۔ وہ کوٹھے پر ہوتے تو نیچے کود جاتے اپنی لاٹھی لے کر۔''

''رگھو کو یہ خیال نہیں آیا؟''

''میں بھی کوٹھے پر تھی رگھو کے ساتھ۔ ہم نے ان راکھشسوں کو آتے دیکھا۔ ہم دونوں نیچے آئے۔ دروازہ بند تھا۔ رگھو پہلے تو باہر کا دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بیچ کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی۔ یہ تو خیال ہی نہیں آیا کہ کوٹھے سے کود کر نیچے پہنچا جا سکتا ہے۔'' رنجنا کہتے کہتے رکی اور چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔ ''رگھو تو شاید کود بھی نہ پاتا۔ چھوٹے ٹھاکر کی بات

اور ہے۔ وہ بڑی آن والے ہیں۔ جان جائے پر وچن نہ جائے۔ اور وہ صرف لاٹھی سے سب کو ختم کر دیتے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔ ان لوگوں کے پاس تو ہتھیار تھے۔''

''چھوٹے ٹھاکر کو لٹھیا بازی آتی ہے۔ گاؤں میں ایک بار چھ سات ڈاکوؤں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر نے لٹھیا سے انھیں مار بھگایا۔ اور اس وقت تو وہ چھوٹے ہی تھے۔''

''موت تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔ موت سے کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا۔'' نور بانو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

یہ جملہ اس نے بے سوچے سمجھے کہا تھا۔ لیکن کہتے ہی اس کی معنویت اس پر پوری طرح روشن ہوگئی۔ ارے...... ایسے تو اس نے سوچا ہی نہیں۔ مگر حقیقت تو یہی ہے اور اس کے لیے اللہ کا حکم نہیں تھا۔ اس لیے وہ بچ گئی۔

پہلی بار اسے صبر آیا۔ اس نے سوچا کہ اسے تو زندگی اور آبرو کے بچنے پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور پہلی بار اس نے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں مثبت انداز میں سوچا۔ اماں چھوٹے ٹھاکر پر جان چھڑکتی تھیں، بڑا مان کرتی تھیں تو کوئی بات تو ہوگی۔ وہ خوامخواہ اسے برا سمجھتی رہی۔ حالانکہ کمزوری اس کی اپنی تھی۔ لیکن اپنی کمزوری کو اس نے اس کی نفرت کا جواز بنا لیا۔

پہلی بار اسے یقین ہوا کہ اب وہ محفوظ ہے!

''میں چائے دے آؤں منجھلی بی بی۔'' رنجنا نے اسے چونکا دیا۔

❁......❁......❁

اب نیچے جانا نور بانو کے لیے ضروری ہوگیا تھا!

نزول قرآن کا مبارک مہینہ آ پہنچا تھا۔ اور وہ پہلا موقع تھا کہ دو ہفتے سے اس نے قرآن پاک نہیں پڑھا تھا۔ یہ درست کہ وہ بڑی آفت اور ابتلا میں تھی اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا ہے۔ لیکن اب قرآن سے دوری کا احساس اسے بہت گراں گزر رہا تھا۔

دشواری یہ تھی کہ وہ ان میں سے کسی سے قرآن پاک نہیں منگوا سکتی تھی۔ اس کے لیے اسے خود ہی نیچے جانا تھا۔ اور نیچے جانے کے تصور سے ہی اس پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ رمضان المبارک کا مہینہ آئے اور وہ قرآن کی تلاوت سے محروم رہے اور اب تو اس کے سارے لوگ تازہ تازہ بچھڑے تھے۔ ان کے ایصال ثواب کے لیے بھی کچھ کرنا تھا۔

اگلی صبح اس نے رنجنا سے کہا۔ ''میں نیچے جاؤں گی۔''

رنجنا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کچھ ضروری چیزیں لانی ہیں۔'' اس نے وضاحت کی۔

مگر رنجنا کی حیرت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ نیچے جانے کو کہہ رہی تھی۔ وہ تو ایک قدرتی بات تھی۔ اسے حیرت اس پر تھی کہ یہ کہتے ہوئے اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ رنجنا یہ سوچ رہی تھی کہ ابھی سے یہ حال ہے تو نیچے جا کر کیا ہوگا۔ وہاں تو منجھلی بی بی کی طبیعت بھی خراب ہوسکتی ہے۔ ''ٹھیک ہے منجھلی بی بی۔'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

نور بانو نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تم چھوٹے ٹھاکر سے بات کرلو۔''

''ان سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر آپ کا ہے۔''

''تم سمجھی نہیں۔ ان سے کہنا، وہاں سے ہٹ جائیں۔''

''وہ تو اس وقت سو رہے ہیں۔ آپ ابھی چلی چلیں۔''

''کیا پتا'' آنکھ کھل جائے۔ انھیں تو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ میں نیچے ہوں۔ نہیں...... پہلے تم انھیں بتا دینا۔''

''تو چھوٹے ٹھاکر کے اٹھنے کا انتظار کرلیں۔ شام کو چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''

اس دوران نور بانو رمضان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رمضان آتے تھے تو اماں سحری اور افطار کے لیے کیسا اہتمام کرتی تھیں۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کھانے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ تو اب بس زندہ رہنے کے لیے کھاتی تھی۔ اب اہتمام کیسا، اس نے سوچا۔ بس روزے ہی تو رکھنے ہیں۔

اس لمحے اس کے کانوں میں اماں کی آواز گونجی۔ ''سحری اور افطاری، دونوں کا اپنی حیثیت کے مطابق اہتمام کرنا چاہیے۔ اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ اور اس مہینے دوسروں کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیے...... خاص طور پر ناداروں کا......''

نور بانو کو یاد تھا کہ افطار سے پہلے اماں افطاری کا سامان سینی پر سجا کر آ کا میاں کے ہاتھ مسجد بھجواتی تھیں۔ پڑوسیوں کے ہاں بھیجنے کا سلسلہ الگ تھا۔

مگر میں یہ سب کیسے کروں گی؟ نور بانو نے سوچا۔ میرے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔

اسی وقت اسے یاد آیا کہ رنجنا نے اسے مکان کا کرایہ دیا تھا۔ پیسے تو ہیں اس کے پاس!

مگر میں افطاری مسجد یا کہیں اور کیسے بھجوا سکتی ہوں۔ کون ہے لے کر جانے والا؟ اور اب اس گھر سے کہیں افطاری بھیجی جائے تو...... یہ تو کسی کو بھی نہیں معلوم کہ میں یہاں رہ رہی ہوں۔ اس نے سرد آہ بھر کے سوچا...... کاش، یہ لوگ مسلمان ہوتے۔

پھر بھی اس نے فیصلہ کرلیا کہ تھوڑا بہت اہتمام ضرور کرے گی۔ اس طرح اللہ بھی خوش ہوگا اور اماں کی روح کو بھی سکون ملے گا۔ پھر اس کے دل میں ایک عجیب خیال آیا۔ وہ ان لوگوں کو

بھی کھلائے گی۔ آخر یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے بغیر کسی لالچ کے اس کی زندگی اور آبرو بچائی ہے اور اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔

اور وہ انکار کردیں تو؟ آخر وہ بھی تو ان کے گھر کا پکا ہوا نہیں کھاتی۔ تو وہ اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کیوں کھائیں گے؟ جیسے وہ انھیں ناپاک سمجھتی ہے، وہ بھی مسلمانوں کو ملیچھ کہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ حق پر ہے اور وہ واقعی ناپاک ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کا انکار کرتے ہیں۔

تو بھلے ہی وہ انکار کردیں، پوچھنا تو اس کا فرض ہے۔

وہ آپ ہی آپ یہ سب کچھ سوچتی رہی اور فیصلے بھی کرتی رہی۔ پھر اس نے ایک فہرست بنائی اور کچھ رقم کے ساتھ رنجنا کو دے دی۔ ''رگھو سو کر اٹھ جائے تو اسے یہ پرچا دے دینا۔ بازار سے یہ سودا لانا ہے۔''

''تو پیسوں کی کیا ضرورت ہے منجھلی بی بی۔''

''اس لیے کہ پیسوں کے بغیر کچھ نہیں آتا۔'' نور بانو نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اور یہ سودا میں منگوا رہی ہوں...... رمضان کے لیے۔''

''ارے...... روزوں کا مہینہ آگیا۔'' رنجنا نے چہک کر کہا۔ وہ رمضان کی رونق دیکھتی رہی تھی۔ اسے روزے بہت اچھے لگتے تھے۔

''ہاں...... شاید آج چاند ہوجائے۔''

''مجھے یہ مہینہ بہت اچھا لگتا ہے۔'' رنجنا نے بے ساختہ کہا۔

نور بانو نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''اچھا...... چھوٹے ٹھاکر سے وہ بات بھی کرلینا۔''

''کرلوں گی منجھلی بی بی۔ آپ فکر نہ کریں۔''

❀......❀......❀

رنجنا اوتار سنگھ کے لیے ناشتہ لے کر گئی تو اس نے نور بانو کی وہ بات کی۔ ''مالک...... منجھلی بی بی کچھ چیزیں لینے کے لیے نیچے آنا چاہتی ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں تو پہلے ہی سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔''

''پر مالک، یہ بات کہتے ہوئے وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔''

''یہ بھی قدرتی بات ہے۔ وہ نیچے آئیں گی تو انھیں اس رات کا ایک ایک پل یاد آئے گا۔'' اوتار سنگھ نے پرُخیال لہجے میں کہا۔ ''وہ جب تک نیچے رہیں، تم ان کے ساتھ ہی رہنا۔''

''جی مالک۔ پر ایک بات اور کہی ہے انھوں نے۔'' رنجنا ہچکچا رہی تھی۔

''تو بتا دُنا۔''

''وہ...... مالک...... مجھے اچھی نہیں لگی وہ بات۔''

''تم بتاؤ تو۔''

''وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ اتنی دیر کے لیے یہاں سے ہٹ جائیں۔''

''تو اس میں کون سی بری بات ہے۔ میں باہر چلا جاؤں گا۔ جب تم انھیں واپس چھوڑ آؤ تو مجھے بتا دینا۔''

''مالک...... مجھے لگتا ہے، ان کی طبیعت بھی خراب ہو سکتی ہے یہاں۔''

''تو میں باہر رہوں گا۔ مجھے بلا لینا۔''

''اور مالک، کل سے شاید روزے شروع ہو رہے ہیں۔''

''اوہ۔ روزوں کا تو بڑا اہتمام ہوتا ہے۔''

''انھوں نے ایک پرچا اور پیسے دیے ہیں۔ رگھو سے سودا منگوانے کو کہا ہے۔ میں نے پیسوں کے لیے منع بھی کیا۔ مگر وہ نہیں مانیں۔''

''یہ تو اچھا ہے۔ اس طرح ان کی خود اعتمادی بڑھے گی۔'' اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پچھلی باتیں بھولنے میں بھی مدد ملے گی۔ ویسے بھی یہ گھر تو انہی کا ہے۔''

''جی مالک۔''

اوتار سنگھ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔ ''سنو رنجنا، تمھیں معلوم ہے نا کہ روزوں میں مسلمان دن میں کھانا نہیں کھاتے۔''

''معلوم ہے مالک۔''

''بس تو خیال رکھنا۔ دن میں کھانا نہیں کھانا۔ ہم لوگ بھی نہیں کھائیں گے۔''

''ٹھیک ہے مالک۔''

''اور رگھو ناشتہ کر لے تو اس کو سودا لانے کے لیے بھیج دینا۔''

❁......❁......❁

نور بانو نے نیچے جانے کے لیے زینے پر پہلا قدم رکھا تو اس کا یہ حال تھا کہ دل سینے میں دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور ٹانگیں یوں لرز رہی تھیں، جیسے اس کے وجود کا بوجھ ان کے لیے بہت زیادہ ہو گیا ہو۔ اسکا جی چاہا کہ وہ پلٹ جائے اور اپنے اس نئے کمرے میں جا کر چھپ جائے، جہاں اسے پناہ ملی ہے۔ لیکن اس نے خود کو یاد دلایا کہ اس مرحلے سے تو گزرنا ہی ہے۔ ورنہ وہ ساری عمر اسی طرح خوف میں مبتلا رہے گی۔

اگر اسے ہر قیمت پر قرآن پاک نہ لانا ہوتا تو شاید وہ واپس ہی چلی جاتی۔

اس نے کوشش کی تھی کہ رنجنا پر اس کا حال نہ کھلے۔ لیکن رنجنا تو پہلے ہی سے اس کی

کیفیت سمجھ رہی تھی۔ بہر حال اس نے نور بانو پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح نور بانو خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرے گی۔

بیچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ابھی اس نے چوکھٹ پھلانگ کر صحن میں قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ وہ جیسے ماضی میں پہنچ گئی۔ بھولی بسری یادیں آواز کا روپ دھار کر اس کی سماعت میں گونجنے لگیں۔

وہ بت بن کر رہ گئی۔ وہ دہلیز پار کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔

''رات کو سونے سے پہلے میں دس بار دیکھتی ہوں کہ بیچ کا دروازہ بند ہے نا۔'' وہ چھمن بوا کی آواز تھی۔

''کیوں بوا؟'' وہ حور بانو تھی۔

''ارے...... وہ موا چھوٹا ٹھاکر! کسی دن دروازہ کھلا ہوا مل گیا تو گھر میں گھس آئے گا۔''

نور بانو کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اب بیچ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ روکنے والا بھی کوئی نہیں۔ اور وہی چھوٹا ٹھاکر اپنے گھر میں اس لیے قدم نہیں رکھتا کہ اس نے .... نور بانو نے اسے منع کر دیا ہے۔

''...... میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ میں آدمی کو پہچانتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس وقت جو کچھ میں تم سے کہوں، وہ تمھیں ہمیشہ یاد رہے۔ اسے کبھی نہ بھولنا۔ تمھیں میری قسم...... تمھارے مرے ہوئے باپ کی قسم ......'' وہ اماں کی آواز تھی۔

نور بانو چونکی۔ حیرت ہے...... یہ اتنی بڑی بات مجھے یاد ہی نہیں رہی۔ یاد ہی نہیں آئی۔

''آپ کہیں اماں۔ ہم یاد رکھیں گے۔'' وہ حور بانو تھی۔

''چھوٹے ٹھاکر سے تمھیں اللہ واسطے کا بیر ہے۔'' اماں کہہ رہی تھیں۔ ''میں جب بھی تمھیں سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں تو یہ نور بانو تاویلیں لانے لگتی ہے۔ اس کی اچھائی کو برائی میں بدل دیتی ہے۔ تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ مگر خود بے وقوف ہو۔ آج میں تمھیں وہ کچھ نہیں بتاؤں گی جو میں جانتی ہوں۔ تم اس میں بھی بدنیتی تلاش کر لو گی۔ اس لیے میں تمھیں حکم دے رہی ہوں۔ اسے میری وصیت سمجھ لو...... چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں جس کا جو گمان ہے، بے شک وہ اس پر قائم رہے۔ لیکن میں تمھیں حکم دے رہی ہوں کہ اس پر ہمیشہ ویسا ہی اعتبار کرنا، جیسا مجھ پر کرتی ہو۔ اور اسے اپنا ویسا ہی بہی خواہ سمجھنا، جیسا بہادر علی کو سمجھتی ہو۔ چھوٹے ٹھاکر سے تمھیں کبھی دھوکہ نہیں ملے گا۔ وہ تمھاری ویسی ہی حفاظت کرے گا، جیسی بہنوں کے بھائی کرتے ہیں۔ اس سے کبھی نہ ڈرنا۔ اس سے بڑھ کر اعتبار کسی پر نہ کرنا۔

کیا مجھے چھوٹے ٹھاکر سے اللہ واسطے کا بیر تھا؟ نور بانو نے دل میں سوچا۔ نہیں...... ایسا

تو نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کمزوری میری اپنی تھی اور میں اس پر اس سے چڑتی تھی۔ اور اماں کی بات تو سچ ثابت ہوئی ہے۔ حرف بہ حرف۔ چھوٹا ٹھاکر اس کی حفاظت کر رہا ہے۔

''کیا ہو گیا منجھلی بی بی، رک کیوں گئیں؟ آئیں نا۔'' رنجنا نے اسے چونکا دیا۔

''آ رہی ہوں۔'' نور بانو نے کہا۔

وہ صحن میں داخل ہو گئی۔ ماضی سے رابطے کے نتیجے میں اس کی دہشت کم ہو گئی تھی۔ اس کے جسم میں لرزش تو اب بھی تھی۔ لیکن پہلے جیسا حال نہیں تھا۔ اب اس کے پاؤں اپنے قابو میں تھے۔

صحن میں اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ جائزہ لے رہی تھی۔ جانا پہچانا گھر نجانے کیوں اسے اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ قرآن پاک لیتی اور اوپر کا رخ کرتی۔ لیکن اس نے سوچا، کون جانے پھر یہاں آنے کا موقع ہی نہ ملے۔ میں پورے گھر کو آخری بار دیکھ لوں۔

اس کے قدم ڈیوڑھی کی طرف اٹھ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر کا دروازہ بند تھا۔ لیکن اب اس پر پہلے کی طرح چلمن نہیں تھی۔ وہ چلمن جس کے توسط سے اس نے چھوٹے ٹھاکر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ دروازے کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دوبارہ لگایا گیا ہے۔

وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ وہاں دو پلنگ بچھے تھے...... آمنے سامنے، دو دیواروں کے ساتھ۔ ایک پلنگ تو وہاں پہلے بھی بچھتا تھا۔ اس پر آکا میاں سوتے تھے۔ باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہاں کاٹھ کباڑ، کئی طرح کے اوزار بکھرے ہوئے تھے۔

اچانک نور بانو کو جھٹکا لگا۔ وہ خیال ہی ایسا تھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر یہاں سوتے ہیں؟'' اس نے رنجنا سے پوچھا۔

''جی منجھلی بی بی۔''

نور بانو اوپر والے گھر میں آزادانہ پھرتی رہی تھی۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کا کمرا دیکھا تھا۔ وہ بہت نفیس کمرا تھا۔ وہاں مسہری تھی۔ نرم دبیز بستر تھا۔ کتابوں کا ایک شیلف تھا، جس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک رائٹنگ ٹیبل تھی۔ ایک طرف ایک آرام کرسی تھی، جس پر آدمی آرام سے نیم دراز ہو جائے اور جی چاہے تو جھولتا رہے۔

نور بانو کو حیرت بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ چھوٹے ٹھاکر کے کمرے کے مقابلے میں ڈیوڑھی تو اصطبل لگ رہی تھی۔ اسے یہ احساس تو تھا کہ اس نے چھوٹے ٹھاکر کو اس کے کمرے کی آسائش سے محروم کر دیا ہے۔ مگر وہ نیچے اس حال میں رہ رہا ہوگا، یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''یہاں کیوں سوتے ہیں تمھارے چھوٹے ٹھاکر۔'' اس نے رنجنا سے کہا۔ ''اندر کسی

کمرے میں آرام سے سو جاتے۔''

''اب میں تو ان سے نہیں پوچھ سکتی منجھلی بی بی۔''

نور بانو ڈیوڑھی سے نکل آئی۔ صحن صاف ستھرا تھا۔ لگتا تھا کہ وہاں صفائی کی جاتی رہی ہے۔ لیکن اندر گھستے ہی اسے لگا کہ جیسے گھر برسوں سے غیر آباد اور اجڑا ہوا ہے۔ ہر چیز ویسی ہی تھی، جیسی اس رات چھوڑی گئی تھی۔ بلکہ ہر چیز پر منوں گرد جم گئی تھی۔ اِدھر اُدھر مکڑیوں نے بے شمار جالے بُن دیے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بیس دن پہلے یہ گھر آباد تھا۔ اس میں چہل پہل تھی۔

اپنے کمرے میں گھستے ہوئے نور بانو کی حالت پھر غیر ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں بری طرح کانپنے لگے۔ اس نے بستر کو دیکھا۔ یہی تو وہ جگہ تھی جہاں اس نے درندگی کا وہ کھیل دیکھا تھا۔ جہاں اس کی بہنیں آبرو اور زندگی دونوں سے محروم ہوئی تھیں۔

اسے سردی لگنے لگی۔ دانت بجنے لگے۔

''کیا ہو رہا ہے منجھلی بی بی؟'' رنجنا نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''مم...... میری...... طط......طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

''جو کچھ ہوا، اسے بھول جائیں۔ وہ ہو چکا۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

نور بانو کو یاد آیا۔ اماں نے یہی بات اور انداز میں کہی تھی۔ اوتار سنگھ بھائیوں کی طرح تمہاری حفاظت کرے گا۔ اس پر اعتبار کرنا ہے۔ یہ میرا حکم ہے...... وصیت ہے۔ اور نور بانو کی طبیعت ایک دم سنبھل گئی۔ ہاں...... اب انشاءاللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

اس کے جسم کی تھرتھری رک گئی۔ اب اس نے بستر کو دیکھا۔ وہ اسی طرح مسکا ہوا تھا۔ مگر دونوں بستروں پر چادر نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی۔ چادریں خون آلود ہوں گی۔ ہٹا دی گئی ہوں گی۔

اس کی نگاہوں میں پھر وہ مناظر پھرنے لگے۔ وہ جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔

اماں کے کمرے میں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی۔ چھمن بوا بھی اسی کمرے میں سوتی تھیں۔ دونوں بستروں کی چادروں پر شکنیں تھیں۔ لگتا تھا، اماں اور چھمن بوا ابھی ابھی سوتے سے اٹھ کر کہیں گئی ہیں اور ابھی واپس آ جائیں گی۔ بس اتنا تھا کہ ہر چیز پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

نور بانو کمرے سے نکل کر کوٹھری کی طرف بڑھی۔ وہاں سے اسے قرآن پاک لینا تھا اور اپنے لیے کچھ کپڑے بھی۔

کوٹھری بھی اسی حال میں تھی، جس میں اسے چھوڑا گیا تھا۔ بستروں والا بکس کھلا ہوا تھا۔ چند لحاف اور گدے نیچے فرش پر گرے ہوئے تھے۔ اسے یاد تھا، اس نے اس بکس میں انہی لحاف گدوں کے نیچے خود کو چھپایا تھا اور جب وہ بکس کھولا جا رہا تھا تو وہ دہل رہی تھی کہ اس کا انجام بھی اپنی بہنوں جیسا ہوگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آنے والا چھوٹا ٹھاکر ہے۔ اور معلوم بھی ہوتا، تب

بھی اس کے خوف میں کمی نہ ہوتی۔ آخر چھوٹا ٹھا کر بھی تو ہندو ہی تھا نا۔

اور جب وہ بکس کھولا گیا تھا تو وہ دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ رنجنا نے بتایا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر اوپر لے گیا تھا۔ اس خیال سے اس وقت بھی اس کے رخسار حیا سے دہک اٹھے۔ اس کا پردہ ختم ہو گیا۔ چھوٹے ٹھاکر نے اسے دیکھا...... بلکہ چھوا بھی۔

اس کے اندر جھنجلاہٹ بھر گئی۔ ایک بار پھر چھوٹا ٹھاکر اسے برا لگنے لگا۔ مگر اماں کی وصیت پھر اس کے کانوں میں گونجی۔ وہ متضاد جذبوں میں گھر گئی۔ چھوٹے ٹھاکر سے اسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ مگر اس میں چھوٹے ٹھاکر کی کسی خرابی کا دخل تھا، نہ اس کے ہندو ہونے کا۔ کیونکہ کسی ہندو سے اسے ایسا بیر نہیں ہوا تھا۔ یہ بیر اس کی اپنی کمزوری کی وجہ سے تھا اور اس کمزوری کے بارے میں کسی سے بات کرنا تو درکنار، وہ تنہائی میں بھی اس پر سوچنے سے گریز کرتی تھی۔ بس چھوٹے ٹھاکر پر اسے غصہ آتا رہتا تھا۔

اس نے جزدان میں لپٹا ہوا قرآن پاک اٹھا لیا۔ اپنے لیے کپڑے اس نے رنجنا سے نکلوائے۔ پھر وہ رنجنا کے ساتھ اوپر چلی آئی۔

اگلی شام رمضان کا چاند نظر آ گیا!

نور بانو چاند دیکھنے کے لیے کوٹھے پر جا رہی تھی کہ رنجنا نے اسے روک دیا۔ ''آپ کا اوپر جانا مناسب نہیں ہے منجھلی بی بی۔''

''کیوں؟'' نور بانو نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''سب لوگ چاند دیکھنے کے لیے اپنے کوٹھے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ آپ اوپر جائیں گی تو سب کو پتا چل جائے گا۔''

بات نور بانو کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

کچھ دیر بعد نقاروں کی آواز سنائی دی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ چاند نظر آ گیا ہے۔

تب نور بانو اپنے سب لوگوں کو یاد کر کے روئی...... اور خوب روئی۔ رنجنا اسے لپٹا کر تھپکیاں دیتی رہی۔ مگر نور بانو کے آنسو کسی طرح تھم ہی نہیں رہے تھے۔

روئی تو وہ پہلے بھی تھی۔ مگر وہ رونا بچھڑنے والوں سے زیادہ اپنے لیے تھا۔ وہ اپنی بے کسی پر بہائے جانے والے آنسو تھے۔ ان آنسوؤں کا اصل محرک خوف اور دہشت تھا۔ جو بہنوں پر گزری تھی، اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور اسے ڈر تھا کہ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے رونا آیا تھا۔ لیکن آج اس کے دل سے ہر خوف دور ہو گیا تھا۔ دہشت مٹ گئی تھی۔ پہلی بار وہ ان کی موت پر روئی تھی۔

اس کے آنسو تھمے تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ اس نے ان کے

ایصالِ ثواب کے لیے اب تک کچھ نہیں کیا ہے۔ چلو اچھا ہوا...... رمضان کا بابرکت مہینہ آ گیا۔ وہ کثرت سے سورۂ ملک پڑھے گی۔

اس رات عشاء کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئی کہ سحری کے لیے بہت سویرے اٹھنا ہوگا۔ لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اندوہناک واقعہ، جس میں اس نے تمام اپنوں کو کھو دیا، آج ہی کی بات ہے۔ ایک اعتبار سے یہ سچ بھی تھا۔ شعوری طور پر تو آج اس نے پہلی بار ہی ان لوگوں کا غم کیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے روتی رہی۔

آدھی رات کے قریب وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔ اب اس سے لیٹا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس کے قدم چھوٹے ٹھاکر کے کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر اس کمرے کو دیکھ کر نیچے والی ڈیوڑھی سے اس کا موازنہ کرنا چاہتی تھی۔

اس نے کمرے میں روشنی کی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر یونہی وہ کتابوں کے شیلف کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ شیلف میں ادبی کتابیں زیادہ تھیں۔ سائنس پر بھی کافی کتابیں تھیں اور کچھ علمی کتابیں بھی تھیں۔

مگر وہاں دو کتابوں کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔ ان میں سے ایک تو بائبل تھی اور دوسری دوزخ اور آخرت کے موضوع پر اسلامی کتاب تھی۔ یہ کتابیں یہاں کیوں ہیں؟ اس نے حیرت سے سوچا۔

اس لمحے اسے کچھ یاد آ گیا۔ ایک بار باجی نے اسے دکھایا تھا۔ کوٹھے پر چھوٹا ٹھاکر کسی مسلمان استاد سے عربی سیکھ رہا تھا۔ یہی نہیں، اس کے بعد استاد نے قرآن پاک کی قرات کی تھی اور چھوٹا ٹھاکر احترام سے سر جھکائے سنتا رہا تھا۔ بلکہ اس پر تو باجی بھی حیران ہوئی تھیں کہ وہ ہندو ہو کر قرآن کی تلاوت سنتا ہے۔

اسے یاد آیا کہ اماں نے کہا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر حق کی جستجو کر رہا ہے۔ وہ اللہ کا نام لیتا ہے۔ اس نے کبھی بتوں کی پوجا نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے گھر میں کوئی اسے کافر اور مشرک کہے یا سمجھے۔ لیکن وہ اس بات پر مصر رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ چھوٹے ٹھاکر کو کافر اور مشرک کہا تھا۔ صرف اپنی کمزوری کی وجہ سے۔ وہ کمزوری جس پر وہ شعوری طور پر سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

تو چھوٹا ٹھاکر سچ مچ حق کی جستجو کرتا رہا ہے! نور بانو نے سوچا۔ دوزخ کے موضوع پر اس کتاب اور بائبل کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ شیلف میں عربی کی بھی کئی کتابیں موجود تھیں۔ نور بانو کو اس پر حیرت ہوئی کہ وہاں قرآن کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ اس کے بغیر تلاشِ حق کیسے مکمل ہو سکتی ہے۔ اور چھوٹا ٹھاکر تو قرآن سنتا رہا ہے۔ پھر یہاں قرآن کیوں موجود نہیں۔

وہ کمرے سے نکل آئی۔ اسے ایسی بے چینی ہو رہی تھی، جیسے وہ کچھ کرنا چاہ رہی ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کیا کرے۔ اپنے کمرے میں جا کر وہ بستر پر لیٹی۔ مگر فوراً ہی اٹھ گئی۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیا چاہ رہی ہے۔ آج رمضان کی پہلی شب تھی۔ اسے کم از کم سات بار سورۂ ملک پڑھنی چاہیے تھی۔

اس نے وضو کیا، قرآن شریف لیا اور کوٹھے کی طرف چل دی۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکون سے تلاوت کرے گی۔

اوپر پہنچ کر اس نے روشنی کی، کرسی پر بیٹھ کر قرآن پاک کو گود میں رکھا اور تلاوت شروع کی۔

چند لمحے بعد اس پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی، جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اسے دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں رہا۔ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

❁......❁......❁

اوتار سنگھ لاٹھی لیے گلی میں گشت کر رہا تھا!

گلی کے اس سرے سے چلتا ہوا وہ اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا تو اسے وہ آواز سنائی دی۔ اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔

وہ بلا شک و شبہ وہی آواز تھی...... وہ آواز جو اس نے پہلی بار سنی تو اسے محبت ہو گئی۔ وہ آواز جسے سنے ہوئے اسے جیسے صدیاں ہو گئی تھیں۔ وہ آواز جسے وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا۔ وہ آواز جو آج بھی اس کی سماعت میں گونجتی تھی۔

پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ آواز سچ مچ کی ہے۔ اس نے یہی سوچا کہ شاید یہ اس کی سماعت کی خواہش اور طلب کا ثمر ہے۔ مگر آواز کے تسلسل نے اسے مزید سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا۔

اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ از خود رفتگی کے عالم میں اس کے قدم خود بہ خود اٹھ رہے تھے۔ وہ گھر کے کھلے دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور صحن میں نکلا۔ یہاں اس کے قدم ایک لمحے کو رکے۔

اب آواز بالکل صاف اور واضح تھی۔ وہ اوپر سے آ رہی تھی۔ اس کے قدم جیسے اس آواز کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ بیچ کے دروازے کی طرف بڑھا اور زینے پر چڑھنے لگا۔

اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے اور کدھر جا رہا ہے۔ بس وہ آواز مقناطیس کی طرح اسے کھینچ رہی تھی۔

باہر رگھو حیران تھا کہ یہ مالک کو اچانک کیا ہو گیا۔ مگر پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔

اوپر والے گھر کے دروازے پر اوتار سنگھ کے قدم ایک لمحے کو رکے۔ پھر وہ مڑا اور کوٹھے کی طرف جانے والے زینے پر چل دیا۔

اوپر پہنچتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ وہ منظر اسے اس دنیا کا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ لڑکی بڑے سلیقے سے چادر میں لپٹی دوپٹہ سر پر رکھے، گود میں کتاب رکھے پڑھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا روشن تھا کہ اس کی روشنی سیاہ دوپٹے کے پار بھی نظر آ رہی تھی۔

ایک لمحے میں اوتار سنگھ نے یہ سب کچھ دیکھا۔ پھر اس کے بعد جیسے اس کی بینائی چلی گئی۔ جیسے بہت گھپ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا، ویسے ہی بہت زیادہ روشنی میں بھی نظر بے کار ہو جاتی ہے اور وہاں تو اتنی روشنی تھی کہ آسمان بھی غائب ہو گیا تھا۔ اب کہیں کچھ بھی نہیں تھا...... سوائے اس آواز کے۔ اوتار سنگھ نے آنکھیں بند کر لیں۔ لگتا تھا کہ آنکھیں کھلی رہیں تو وہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جائے گا۔

لگتا تھا کہ اس کے تمام حواس سماعت میں مرتکز ہو گئے ہیں۔ ایک ایک لفظ یوں صاف سنائی دے رہا تھا، جیسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جا رہا ہو۔ اور سماعت کا جیسے فہم سے گہرا رابطہ تھا۔ وہ ہر لفظ کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ عربی اس نے بڑی لگن اور شوق سے پڑھی تھی۔ اس کی غیر معمولی استعداد کے مولوی صاحب بھی معترف رہے تھے۔ لیکن بہر حال وہ اہل زبان تو نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ایک ایک لفظ کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔

نور بانو اپنی کیفیت میں مستغرق پڑھے جا رہی تھی۔ آخری آیت پڑھنے کے بعد اس نے سورۂ ملک دوبارہ شروع کی۔ ''تبارک الذی بیدہ الملک......'' وہ...... خاسئا و ھو حسیر...... تک پہنچی تھی کہ اس آواز نے اسے چونکا دیا۔

''شروع سے پڑھو...... اور ذرا ٹھہر ٹھہر کر۔''

نور بانو بری طرح چونکی۔ بلکہ ڈر گئی۔ اس نے سر اٹھایا تو اسے احساس ہوا کہ روشنی زیادہ...... بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اور اس نے سر گھما کر دیکھا تو اسے وہ روشن ہیولیٰ نظر آیا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ اوتار سنگھ ہے۔ وہ روشنی کا کمال تھا یا اس کی کیفیت کا، بہر حال اسے ایسا لگا کہ وہ آسمان سے اترا ہوا کوئی فرشتہ ہے، جو اس کے بچھڑے ہوؤں کی خیر خبر لایا ہے اور سورۂ ملک سننے کے لیے آیا ہے۔

''رک کیوں گئیں۔ شروع سے پڑھو...... اور ذرا ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔'' اوتار سنگھ نے آنکھیں بند کیے کیے دھیمی آواز میں کہا۔

نور بانو نے سر جھکایا اور دوبارہ پڑھنے لگی۔ "تبرک الذی بیدہ الملک وھو علی کل شیء قدیر نo"

''بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی۔'' اوتار سنگھ کے لہجے میں عجیب سا جاہ و جلال تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ ''اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

"الذی خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاط وھو العزیز الغفورo"

''وہ ذات جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ آزمائش کرے تمہاری کہ کون تم میں سے زیادہ اچھا ہے عمل میں۔ اور وہ ہے زبردست، بے انتہا معاف فرمانے والا۔''

نور بانو اب گویا اشارے پر پڑھ رہی تھی۔ "الذی خلق سبع سموت طباقاط"

''وہ ذات جس نے بنائے سات آسمان تہ بہ تہ۔'' اور اوتار سنگھ نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ روشنی تو اب بھی ویسی ہی تھی۔ لیکن نگاہ کام کر رہی تھی۔ وہ دیکھ سکتا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ ذہن میں ایک خیال تھا...... آسمان تو ایک ہی نظر آتا ہے۔ پھر سات آسمان......!

مگر وہ عجیب منظر تھا۔ اوپر نیلے آسمان کی روشن چھت تھی۔ پھر وہ جیسے شفاف ہو گیا اور اس کے پار رنگ برنگے کئی آسمان...... شفاف آسمان نظر آنے لگے۔ وہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کے سامنے وہی نیلا آسمان تھا، جو وہ ہر روز دیکھتا تھا۔ اس نے گنے نہیں تھے، رنگوں کی ترتیب بھی وہ نہیں بتا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بس ایک ثانیے کا نظارہ تھا اور ایسا محیر العقول نظارہ کہ وہ ششدر رہ گیا تھا۔ لیکن اتنا وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے روز نظر آنے والے نیلے آسمان کے اوپر چھ مختلف رنگوں کے چھ اور آسمان دیکھے ہیں۔

نور بانو خاموش تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ مگر نجانے کیسے اسے یہ احساس تھا کہ ابھی آگے پڑھنا مناسب نہیں ہے۔ وہ خاموشی اسے بتا رہی تھی، سمجھا رہی تھی کہ فرمائش کرنے والا اپنے مکمل ارتکاز کے ساتھ کسی جستجو میں مصروف ہے۔ وہ خاموشی جیسے ایک بلیغ حکم تھا...... آج نہ پڑھنے کا۔ اور اس کی حیثیت محض ایک معمول کی سی تھی۔

''بے شک اے اللہ۔ میں نے دیکھ لیا۔ میں گواہی دیتا ہوں۔'' اوتار سنگھ کو احساس بھی نہیں تھا کہ یہ اس کی آواز ہے۔

یہ اشارہ تھا آگے پڑھنے کا۔ نور بانو نے اگلی آیت مبارکہ پڑھی۔ "ماتری فی خلق الرحمٰن من تفوت ط"

اب اوتار سنگھ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ ''نہیں دیکھو گے تم

رحمان کی تخلیق میں کوئی بے ربطی۔'' اوتار سنگھ نے اسی کیفیت میں کہا۔ آسمان کے سوا گرد و پیش کی کسی چیز کا اسے احساس نہیں تھا۔

ایک بار پھر اس خاموشی کے تحکم کو اپنے وجود میں گونجتا محسوس کر کے نور بانو خاموش تھی۔ ابھی آگے پڑھنے کا حکم نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں قرآن پاک پر جمی تھیں۔

اوتار سنگھ آگے بڑھ کر منڈیر تک گیا۔ اس کی نگاہیں آسمان کو ٹٹول رہی تھیں، کھوج رہی تھیں...... ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔

ارے...... یہ کیا؟ اس نے حیرت سے سوچا۔ زندگی کے ہر روز آسمان کو میں کئی کئی بار دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے پہلے کبھی یہ محسوس نہیں کیا۔ ارے واقعی...... یہ بیکراں لامتناہی آسمان جو وہاں تک نظر آتا ہے، جہاں تک نظر جاتی ہے۔ جس کی وسعت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ارے...... اتنے بڑے آسمان میں کہیں کوئی بے ربطی نہیں ہے۔ ہر طرف سے ایک سا خم، ایک سی ہمواری۔ انسان چھوٹا سا گنبد بھی بنائے تو خفیف سی اونچ نیچ ضرور ہوتی ہے۔ کوئی مینار بنائے تو کہیں نہ کہیں فرق ضرور پڑ جاتا ہے۔ کچھ نہیں تو وقت گزرنے کے ساتھ کسی طرف سے جھک جاتا ہے اور بوسیدہ بھی ہو جاتا ہے۔ مگر یہ آسمان جو زمین بننے کے بعد سے اب تک قائم ہے، اس کا رنگ بھی پھیکا نہیں پڑا۔ ہر طرف سے ایک سا خم، ایک سی ہمواری۔ کہیں کوئی اونچ نیچ نہیں۔ کہیں کوئی فرق نہیں۔

''وہ ورطۂ حیرت میں تھا۔ اس نے پکار کر کہا۔ ''بے شک اے اللہ۔ میں نے دیکھا اور میں گواہی دیتا ہوں۔ آپ کے آسمان میں کہیں کوئی بے ربطی نہیں۔''

وہ حکم تھا آگے پڑھنے کا۔ نور بانو نے آیت مبارکہ کا اگلا حصہ پڑھا۔ "فارجع البصر ھل تری من فطورo"

''ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھو۔ بھلا نظر آتا ہے تم کو کوئی خلل؟''

چند لمحے خاموشی رہی...... وہی خاموش رہنے کا حکم دیتی ہوئی خاموشی۔ نور بانو منتظر تھی......

پھر اوتار سنگھ کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''دیکھ لیا اے اللہ۔ کہیں کوئی خلل نہیں، کوئی بے ربطی نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں اے اللہ۔''

نور بانو نے اگلی آیت پڑھی۔ "ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا و ھو حسیرo"

''پھر دوڑاؤ نظر۔ بار بار پلٹ آئے گی تمہاری طرف نگاہ تھک کر۔ اور وہ نامراد ہو گی اپنی تلاش میں۔''

نور بانو قرآن پاک پر نظریں جمائے خاموش بیٹھی تھی۔

چند لمحے بعد اوتار سنگھ اپنی اسی گونج دار آواز میں بولا۔ ''اس کی ضرورت نہیں اے اللہ۔ میں نے جان لیا۔ میں نے سمجھ لیا۔ آپ کی ہر بات حق۔ لیکن آپ کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ اس لیے دوبارہ نظر دوڑا رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر اوتار سنگھ منڈیر کی طرف بڑھا۔ اس کی نظریں آسمان کو کھوج رہی تھیں...... روشن نیلے آسمان کو۔ منڈیر کے پاس پہنچ کر وہ چند لمحے آسمان کو متلاشی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ ان نگاہوں میں سچی تلاش تھی۔

پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں بلا کی عاجزی تھی۔ ''بے شک اے اللہ۔ میری نگاہ اپنی تلاش میں نامراد ہو کر لوٹ آئی ہے۔''

اب ہر طرف خاموشی تھی۔ رات کا گہرا سکوت تھا۔ نور بانو یوں دم بہ خود بیٹھی تھی، جیسے یقین ہو کہ ابھی کچھ غیر معمولی...... بہت غیر معمولی ہونے والا ہے۔

اوتار سنگھ اب نظریں جھکائے کھڑا تھا...... کسی گناہ گار کی طرح۔ گرد و پیش میں اب بھی وہی روشنی تھی۔ اور اب تو اسے اپنے اندر...... اپنے وجود میں بھی نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نظر آ رہی تھی۔

پھر جیسے اس کے اندر روشنی کی ایک بہت بڑی موج اٹھی اور اس کے دل سے ٹکرائی۔ اسے لگا کہ اس کا دل نرم ہو رہا ہے۔ پھر اس کا دل جیسے پگھلنے لگا اور پگھلا ہوا وہ سیال اوپر کی طرف اٹھنے لگا۔ وہ گلے تک پہنچا...... اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں تک آ پہنچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ساتھ ہی اس کا وجود ہلکا ہونے لگا...... ہلکا ہوتا گیا۔ اور جیسے جیسے ہلکا ہوتا گیا، وہ اوپر اٹھتا گیا۔ اب آسمان ایسا تھا کہ جیسے وہ ہاتھ بڑھائے تو اسے چھو سکتا ہے۔ پھر اچانک آسمان شفاف ہونے لگا اور کسی باریک دوپٹے کی طرح ہو گیا۔ اس کے پار اسے دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا...... اسے مختلف رنگوں کے آسمان ہی آسمان دکھائی دینے لگے اور وہ اب بھی اڑ رہا تھا۔ ہلکا ہو کر اوپر اٹھ رہا تھا......

اچانک اس کے اندر کسی نے ڈپٹ کر کہا۔ ''کیا اس کے بعد بھی تو کلمہ نہیں پڑھے گا۔''

اوتار سنگھ کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ ''کلمہ؟'' اس نے زیر لب حیرت سے کہا۔ ''یہ [illegible] ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس کی بے وزنی کی کیفیت ختم ہو گئی۔ اس کے جسم کو ایسا جھٹکا لگا، جیسے وہ واقعی آسمان سے زمین پر آ گرا ہو۔

''ہاں...... کلمہ تو مجھے یاد ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''مجھے کلمہ پڑھنا چاہیے۔''

''کون سا کلمہ؟'' اس کے اندر کسی نے سوال اٹھایا۔

''مجھے گواہی دینی ہے۔ میں سمجھ گیا، جان گیا۔ اب گواہی دینی ہے۔''

''تو دیر کس بات کی؟''

اوتار سنگھ کے ہونٹ ہلے۔ پہلے تو کوئی آواز نہیں نکلی۔ پھر آواز نکلی تو بلند ہوتی گئی...... ایسی بلند کہ اس آواز کے سوا کہیں کچھ نہیں رہا۔ ایسے جیسے وہ آواز آسمان کے پار...... آسمانوں کے پار جا رہی ہو۔

''اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ. میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں۔''

اس بار آواز سن کر نور بانو چونکی۔ وہ تو چھوٹے ٹھاکر کی آواز تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ واقعی چھوٹا ٹھاکر ہی تھا اور منڈیر کے پاس کھڑا تھا۔ اور کلمہ بھی وہی پڑھ رہا تھا۔ اور اس کا بدن یوں کانپ رہا تھا، جیسے اس کے اندر بجلی کا کوئی بہت طاقت ور کرنٹ دوڑ رہا ہو۔

''اب پاک بھی ہو جا۔'' اوتار سنگھ کے اندر کسی نے تلقین کی۔

نور بانو کو بہت غصہ آیا۔ اسے جرات کیسے ہوئی اوپر آنے کی۔ کیا یہ نہیں جانتا کہ میں پردہ کرتی ہوں۔ وہ اس پر برسنے ہی والی تھی۔ مگر وہ لمحہ ایسا تھا کہ وہ بھی اس کی اسیر ہو گئی۔ وہ حیرت سے اوتار سنگھ کو دیکھتی رہی۔

اوتار سنگھ کی کپکپی بڑھ گئی۔ مگر اس کی آواز بہت صاف اور گونج دار تھی۔ وہ کلمہ پڑھ رہا تھا...... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ......

❀......❀......❀